جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

جلد ۲۰ | بابت ماہ جنوری ۱۹۳۳ء | نمبر ۱

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

1927

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ دہلی

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

نمبر ۱ | بابتہ ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۳ء

فہرست مضامین

...اے داکسن، پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا

عقیدۂ اعجاز قرآن کی تاریخ

۱۔ دعوے کی ابتدا | قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یأتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظہیراً (۱۷: ۹۰)

اس آیت میں صاف صاف یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ قرآن کا مثل کلام جن و انس کے بس سے باہر ہے۔ مقصد یہاں یہ دکھانا ہے کہ یہ دعویٰ کن حالات کے ماتحت کیا گیا اور کس طرح یہ اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ بن گیا۔ اس بحث کو شروع کرنے سے قبل مناسب ہوگا کہ ہم اس ماحول کا مطالعہ کریں جس میں قرآن نازل ہوا، ان ادبی اسالیب کو دریافت کریں جو اس وقت رائج تھے اور جہاں تک ممکن ہو یہ تحقیق کریں کہ قرآن کا استقبال شروع شروع میں کس طرح کیا گیا۔

زمانۂ قبل اسلام کے عربی ادب کا مطالعہ کرنے والے کی نظر سب سے پہلے اس امر پر پڑتی ہے کہ عرب میں فن کتابت تقریباً معدوم تھا[1]۔ اس حقیقت کا اثر ان کے اسالیب بیان پر بہت گہرا پڑا۔ یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ کسی جماعت کے ادبی خصائص کی بنیاد بڑی حد تک اظہار خیال کے اس طریقے پر ہوتی ہے جو ایک خاص زمانے میں اس جماعت کو میسر آتا ہے۔ عرب لکھنا نہ جانتے تھے اس لئے ان کے خیالات کو لامحالہ زبانی الفاظ کا جامہ پہننا پڑا۔ اس کا اثر خود زبان کی ساخت اور ارتقا پر بھی بہت زیادہ ہوا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ عربی زبان ظہور اسلام سے قبل سادہ اور پرزور تھی، مرادفات اور ترہیب و ترغیب کے الفاظ سے مالا مال تھی۔ جذبات انسانی کے اظہار کی صلاحیت اس میں بدرجہ اتم موجود تھی لیکن ایک مسلسل و مربوط خیال کی ترجمانی اس کے لئے دشوار بلکہ تقریباً ناممکن سی تھی۔ کبھی کبھی منتشر، بے ربط اور پریشان بھی ہو جاتی تھی لیکن ترتیب و انتظام اور دل آویزی میں کمی نہ ہوئی

---

[1] گولڈ زیہر نے اپنی کتاب Muhammedanische Studien (جلد اول صفحہ ۱۱۰) میں اس مسئلے سے بحث کی ہے۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس ریگستانی ہوا کے مانند جس میں اس نے پرورش پائی تھی وہ بھی صاف اور خالص
عربی زبان کے ارتقائی منازل کی تعیین اس وقت ہمارا مقصد نہیں ہے بلکہ ہمیں تو صرف ان اسالیب
سے بحث ہے جو ظہور قرآن کے زمانے میں رائج تھے۔

بلاشبہ سب سے اہم اسلوب شعر تھا جو اس زمانے میں بہت ترقی پر تھا اور یہ اسی سے کہ
عصر جدید میں بھی زمانہ قبل اسلام کو عربی شاعری کا زریں عہد کہا جاتا ہے۔ اس زمانے میں شاعری کی ہر جگہ عز
جاتی تھی اور اس کی خوشنودی کی اتنی ہی کوشش کی جاتی تھی جتنا اس کی ناراضی کا خوف ہوتا تھا۔ کسی فرد
کے لئے یہ انتہائی فخر کا باعث ہوتا تھا کہ ایک مشہور شاعر اس کی مدح کرے اور اسی طرح ایک نامی شاعر کی ہجو
کو ہمیشہ کے لئے بدنام کر دینے کو کافی ہوتی تھی۔ ہر قبیلے کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ اس کا اپنا شاعر ہو اور جس روز
قبیلے میں شاعر پیدا ہوتا تھا وہ اس کے لئے عید کا دن ہوتا تھا۔ عام طور پر اس زمانے میں شاعری قصیدہ کے
لباس میں جلوہ افروز ہوتی تھی۔ قصائد طول میں تو ایک دوسرے سے مختلف ضرور ہوتے تھے لیکن مضامین کے
سے ان میں بہت کم تنوع ہوتا تھا۔ دس مشہور ترین قصائد ہم تک کم و بیش اپنی اصلی حالت میں پہنچے ہیں۔[1]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو :۔

۱ ۔ ابو الفرج الاصفہانی : کتاب الأغانی ۔ بولاق ۱۲۸۵ھ

۲ ۔ ابن قتیبہ : کتاب الشعر والشعراء ۔ لائڈن ۱۹۰۲ء و مصر ۱۹۱۴ء

۳ ۔ عبد القاہر البغدادی : خزانۃ الادب : بولاق ۱۲۹۹ھ

۴ ۔ J. Lyall, Translations of ancient Arabian Poetry (Introduction) London 1885, 2nd Edition 1930.

۵ ۔ " , Introduction to The Mufaddaliyat, Oxford 1918.

۶ ۔ " , A commentary of ten ancient Arabian

... مستشرقوں سے قبل عرب میں نثر کا وجود گویا تھا ہی نہیں۔ اس کی توجیہ دشوار نہیں نثر فن کتابت کا نتیجہ ہے ... میں نثر کی جگہ جس اسلوب نے لی تھی وہ خطب تھے۔ عربوں کی عادت تھی کہ ذرا ذرا سی بات پر خطبے دینے لگتے تھے۔ ان خطبوں کی زبان مسجع ہوتی تھی۔ شعر اور سجع کی سرحدیں ملتی ہیں اور دراصل ان میں صرف یہی بڑا فرق ہے کہ سجع میں بحر اور ردیف کی پابندی نہیں ہوتی اور قافیے کی پابندی میں اتنا تشدد نہیں ہوتا جتنا شعر میں۔ زمانۂ قبل اسلام کے بہت کم خطبے ہم تک پہنچے ہیں لیکن جتنے بھی ہیں وہ ان کے مضامین اور ان کی صورت کے اندازے کے لئے کافی ہیں۔[1]

(بقیہ حاشیہ گزشتہ)

poems, calcutta 1894.

۶. Th. Noeldeke – Beiträge zur Kenntnis der Poesie der alten Araber, Hannover 1864.

۸. R.A. Nicholson – A literary history of the Arabs (Introduction and Chapter III) 3rd Edition London 1930.

۹. Rescher – Abriss der arabischen Literaturgeschichte Bd. I S. 12-95, Stuttgart, 1925.

۱۰. C. Brockelmann – Gesch. d. arab. Literatur Bd. I S. 12-32, Weimar 1898.

[1] ۱۔ الجاحظ ... البیان والتبیین ۔ مصر ۱۳۱۳ھ

۲۔ المبرد ۔ الکامل لائپزگ ۱۸۶۴ء و مصر ۱۳۰۸ھ

۳۔ ابن عبد ربہ ۔ العقد الفرید ۔ مصر ۱۳۱۳ھ

۴. Goldziher – Der Chatib bei den Arabern W.Z.K.M. VI 92-102

ایک دوسرا اسلوب جس میں سجع کا اصلی رنگ نمایاں ہوتا ہے کاہنوں کے اقوال ہیں۔ کاہن اپنی فطرت اور اپنے مقصد سے مجبور تھا کہ مبہم زبان استعمال کرے۔ سجع اس کا موزوں ترین آلہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے گٹھے ہوئے سجع جو پڑھنے یا سننے میں شاندار اور پرشکوہ معلوم ہوتے ہیں لیکن یا تو مہمل ہیں یا ایک سے زیادہ مطالب کے حامل یہ ہے ان تھوڑے سے اقوال کی کیفیت جو کاہنوں کے نام سے ہم تک پہنچے ہیں[1]

یہی گویا وہ اسالیب بیان تھے جن میں قبل اسلام عربوں کی ادبی کاوشیں محدود تھیں۔ عربوں کی کوئی مستقل قیام گاہ نہ تھی۔ وہ اپنے مویشی کے لئے چارے اور اہل وعیال کے لئے غنیمت کی تلاش میں خانہ بدوش پھرا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ادب کا بیشتر حصہ ضائع ہوگیا۔ صرف چند جماعتیں مقیم تھیں جن میں سے سب سے زیادہ اہم وہ جماعت تھی جو عرب کے مقدس شہر مکہ کے اردگرد آباد تھی۔ مکہ کاروانوں کی اس شاہراہ پر واقع ہے جو جنوب و مشرق کو شمال و مغرب سے ملاتی ہے۔ یہاں ہر سال عربوں کا اجتماع ہوتا تھا جو ایک تو حج کے لئے آتے تھے اور دوسرے تجارت کے لئے۔ مکے سے متصل عکاظ میں ایک میلا لگتا تھا جہاں ملک کے ہر حصے سے شعرا اور خطیب جمع ہوتے تھے اور ہزاروں آدمیوں کے مجمعے میں اپنے اشعار سناتے یا خطبے دیتے تھے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں ادبی معیار قائم ہوتا تھا اور جہاں وہ نوجوان جنھیں نام و نمود کی خواہش ہوتی تھی مقابلے کے لئے جمع ہوتے تھے۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ یہیں قرآن بھی نازل ہوا۔

قرآن ایک بالکل نئی چیز تھی۔ ظاہری صورت میں کہیں تو یہ خطبوں سے مشابہ تھا اور کہیں کاہنوں کے اقوال سے۔ یہ اکثر مسجع بھی تھا اور مقفّیٰ بھی لیکن بایں ہمہ تمام موجودہ ادب سے کلیتاً مختلف تھا۔ یہ اس کیفیت کا اظہار تھا جو محمدؐ پر طاری ہوئی تھی۔ اہل مکہ نے اس کو سنا اور حیران رہ گئے۔ ان کے سامنے ایک انسان تھا جو ان کی روایات قدیمہ کی مخالفت کرتا تھا، ان کے دیوتاؤں اور دیویوں کو برا بھلا کہتا تھا۔ جو کہتا تھا کہ ان کی موجودہ زندگی معاصی کی زندگی ہے۔ جس کا دعویٰ تھا کہ خدا صرف ایک ہے اور خود وہ جو کسی طرح ان سے مختلف نہ تھا اس خدا کا رسول ہے۔ انھوں نے اس کے کلام کو جانچنے کی کوشش کی۔ کیا یہ شعر ہے؟ ہاں ممکن تو ہے لیکن یقینی

---

[1] ملاحظہ ہو Encyclopadea of Islam (article Kahin)

نبی کو کوئی شخص کاہن ہے ۔ بہت ممکن ہے کہ نجومی کاہن ہے کہ بجائے مبہم الفاظ کے صاف اور صریح زبان
کا کلام ہے ۔ ان کی حیرت بجائے کم ہونے کے بڑھتی ہی گئی ۔ بھلا وہ ان الفاظ کو جو ان تک ایک معمولی
انسان کی زبان سے ادا ہو کر پہنچتے تھے خدا کا کلام آسانی سے کیوں کر مان لیتے ۔ گھبراہٹ میں انھوں نے
کبھی تو مجنون اور فریب[1] کا الزام رکھا ، کبھی کہا یہ شخص مجنون شاعر ہے[2] کبھی اسے قصہ گو[3] بتلایا اور کبھی جادوگر[4] جو ان
شہر کے دیوتاؤں کو چھین لینا چاہتا ہے[5] ۔ بعض نے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ خود بھی ایسا کلام پیش
کر سکتے ہیں[6] ۔

رسول نے یہ سب سنا ۔ یہ تھا استقبال خدا کے اس کلام کا جو ان کو وحی ہوا تھا ۔ اب اس آواز نے
جو انہیں سنائی دیتی تھی یا اس فرشتے نے جو ان کے پاس خدا کا پیغام لاتا تھا حسب ذیل الفاظ کہے جن کو
انھوں نے کھلے بند سنایا : " ام یقولون تقوله ، بل لا یومنون . فلیاتوا بحدیث مثله ان کانوا صادقین[7] "
(کہتے ہیں اس نے خود بنا لیا ہے ۔ بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان نہیں رکھتے ، اگر یہ سچے ہیں تو ایسا کلام پیش کر دیں)
اس کے بعد " ام یقولون افتراه قل فاتوا بعشر سور مثله مفتریات وادعوا من استطعتم من
دون الله ان کنتم صادقین[8] " (کہتے ہیں کہ اس نے بنا لیا ہے ، کہہ دو کہ اگر سچے ہو تو تم بھی ایسی دس سورتیں
بنا لاؤ اور خدا کے سوا جس کو بلا سکتے ہو بلا بھی لو) ۔ اس کے بعد " ام یقولون افتراه قل فاتوا بسورة مثله
وادعوا من استطعتم من دون الله ان کنتم صادقین[9] " (کہتے ہیں اس نے بنا لیا ہے ، کہہ دو کہ اگر
سچے ہو تو تم بھی ایسی ایک سورة بنا لاؤ اور خدا کے سوا جس کو بلا سکتے ہو بلا بھی لو) ۔ پھر وہ آواز ان لوگوں کو
نبی کے ذریعے سے مخاطب کر کے کہتی ہے " وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتوا بسورة من
مثله وادعوا شهداءکم من دون الله ان کنتم صادقین . وان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا
النار التی وقودها الناس والحجارة ، اعدت للکافرین[10] " (اور اگر تم کو اس میں جو ہم نے اپنے بندے

قرآن [1] ۶-۲۸ [2] ۳۷-۳۵ [3] ۲۱-۸ [4] ۴۷-۲۲ [5] ۴۲-۳۴ [6] ۲۱-۸ [7] ۵۲-۳۴
[8] ۱۱-۱۶ [9] ۱۰-۳۹ [10] ۲-۲۱ و ۲۲ ۔

پر نازل کیا ہے کچھ شک ہو تو اسی طرح کی ایک سورۃ تم بھی پیش کرو اور خدا کے سوا جو تمھارے مددگار ہوں ان کو بھی بلا لو. لیکن اگر ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہیں کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے اور جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔)

یہ تھی مقابلے کی دعوت ان لوگوں کو جو شک کرتے تھے یا سمجھتے تھے کہ قرآن انسان کا کلام ہے۔ یا تو انھوں نے کوشش کی اور ناکام رہے یا سرے سے کوشش ہی نہیں کی. بہر حال وہ کوئی چیز مقابلے کی پیش نہ کر سکے اور کر بھی کیسے سکتے تھے جب تک ان پر بھی وہی کیفیت نہ طاری ہوتی جو محمدؐ پر طاری تھی. اب اس آواز نے پکار کر کہا، "قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل هذا القران لا یاتون بمثله ولو کان بعضهم لبعض ظهیرا"[۵۱] (کہہ دو کہ اگر انس و جن اس بات پر مجتمع ہوں کہ اس قرآن جیسا بنا لائیں تو اس جیسا نہ لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کی مدد ہی کیوں نہ کریں)۔ یہ کھلا ہوا دعویٰ ہے اور اس سے زیادہ صاف دعویٰ ہو بھی نہیں سکتا۔[۵۲]

قرآن میں اس کا کوئی کھلا ثبوت تو نہیں ملتا کہ کسی نے یہ دعوت قبول کر کے مقابلے میں کوئی چیز پیش کی یا نہیں لیکن اس حقیقت سے کہ دعوت مقابلہ کا لہجہ آہستہ آہستہ تیز ہوتا گیا یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ کوئی قابل اعتنا کوشش نہیں ہوئی۔ ابتدا میں تو دعوت عام تھی یعنی یہ کہ ایسا کلام پیش کرو (بحدیث مثله) پھر دس سورتوں پر اکتفا کی گئی اور آخر میں تو بات ایک سورۃ پر آ پڑی۔ پھر آخری دعوت کے ساتھ ساتھ یہ تیقن بھی ہے کہ یہ بالکل ناممکن ہے (ولن تفعلوا)۔ اگر واقعی کوئی اہم کوشش کی گئی ہوتی تو یہ بات قرین قیاس ہے کہ تمام اعتراضات کی طرح اس کا ذکر بھی قرآن میں ضرور ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ بعض آدمیوں نے کوشش کی اور ناکام رہے اور چونکہ انھوں نے کھلے بند مقابلہ نہیں کیا اس لئے قرآن میں بھی اس کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ کسی نے مقابلے کی جرأت ہی نہیں کی

---

[۵۱] قرآن ۱۷: ۹۰

[۵۲] ان آیات کی ترتیب نزول کسی سند کی بنا پر نہیں ہے بلکہ مضمون کے لحاظ سے یہ ترتیب قائم کی گئی ہے۔

غرضیکہ اس بحث سے یہ معلوم ہوگا کہ یہی ایک دلیل قرآن کے معجزہ ہونے کے ثبوت میں پیش کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ بہت سی روایتیں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مشہور کفار اور متکلمین نے جب قرآن کو سنا تو ان پر اس کا بڑا اثر ہوا۔[1]

۲۔ عقیدے کی نشوونما | ایک معمولی خیال کو عقیدہ بننے تک ایک خاصی طویل مدت درکار ہوتی ہے۔ خیال کی اس بالیدگی کے مراتب کی تحقیق اور ان اثرات کی تلاش جنھوں نے کسی عقیدے کو ایک خاص رنگ دے دیا ہو بہت دلچسپ کام ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ بہت مشکل بھی ہے۔ یہ نمو اکثر غیر محسوس ہوتا ہے اور چونکہ خود معاصرین کو اس کا شعور نہیں ہوتا اس لئے بعد کے لوگوں کو قیاس آرائی کرنی پڑتی ہے۔ صرف ایک ہی صورت ممکن ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اس زمانے کی تاریخ کا اس خاص مسئلے کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ کچھ ابھرے ہوئے خطوط نظر آتے ہیں یا نہیں۔

رسولؐ کے انتقال کے بعد فوراً ہی قرآن کی جمع و ترتیب کا کام شروع ہو گیا اور ایک مجموعہ تیار بھی ہو گیا تھا لیکن یہ کام خلیفۂ ثالث عثمان کے عہد میں جا کر کہیں مکمل ہو سکا۔ اسی زمانے میں وہ بدامنی اور خانہ جنگی بھی شروع ہو گئی جس کا سلسلہ۔ چند وقفوں سے قطع نظر۔ ۸۵ھ تک جاری رہا یعنی اس وقت تک جبکہ عبدالملک بن مروان نے تمام مخالفتوں کو دبا کر اپنے بیٹے ولید کے لئے راستہ صاف نہ کر دیا۔ اس خانہ جنگی سے ایک فائدہ ضرور ہوا اور وہ یہ کہ لوگوں کو مسائل پر غور و خوض کی ضرورت محسوس ہوئی۔ علی اور معاویہ کی باہمی کشمکش۔ خوارج کا خروج۔ کربلا کا واقعہ۔ عبدالملک بن مروان اور عبداللہ بن زبیر کی لڑائیاں یہ سب محض نام و نمود یا حکومت اور غلبہ حاصل کرنے کی کوششیں نہیں تھیں بلکہ کم از کم ایک جانب سے تو یہ خلوص نیت اور ضمیر کی آواز کا نتیجہ تھیں۔ سوچنے اور سمجھنے والے لوگ اس فتنے میں بار بار قرآن کی طرف رجوع کرتے تھے اور اسی کو دلیل راہ اور مشعل ہدایت بنا کر اپنے لئے راہ عمل تلاش کرتے تھے۔ اس طرح قرآن کا مطالعہ جو یوں بھی دینداروں کا عام

---

[1] ملاحظہ ہو: ابونعیم۔ دلائل النبوۃ ص ۷۴-۸۰۔ حیدرآباد ۱۳۲۰ھ

مشغلہ تھا اور زیادہ بڑھا لیکن ابھی وہ زمانہ نہیں آیا تھا کہ باقاعدہ تفاسیر کی تالیت شروع ہوتی یا قرآن کے اعتقادی مسائل کی تحقیق و ترتیب کی جاتی۔

ٹھیک اسی زمانے میں اسلام کا سابقہ ایک طرف تو مشرقی عیسائی کلیسا کے ان پرپیچ عقائد سے پڑا جو مرکز خلافت یعنی دمشق و شام میں رائج تھے اور دوسری طرف کوفہ اور بصرہ کی نوآبادیوں میں زرتشتی اور مانوی خیالات سے مسلموں اور غیر مسلموں میں مبادلہ خیال شروع ہوا اور مذہبی بحثوں نے رواج پکڑا۔ غیر مسلموں نے اسلام کی بنیاد یعنی محمدؐ کی رسالت سے انکار کیا۔ اب مسلموں کو اپنے عقائد کے ثبوت میں دلیلیں پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے علاوہ دوسری صدی ہجری کے وسط میں فلسفے اور علوم طبیعی کی کتابوں کے تراجم یونانی، سریانی اور پہلوی سے عربی میں ہونے لگے۔ ان حالات کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ آزاد خیالی کی ایک رو عالم اسلامی میں دوڑ گئی اور ابن المقفع، بشار بن برد، صالح بن عبد القدوس اور عبد الحمید کاتب جیسے لوگ پیدا ہو کر زندیق کہلائے[1]۔ راسخ العقیدہ لوگوں کو نہ صرف غیر مسلموں سے مقابلہ کرنا پڑا بلکہ آزاد خیالوں سے بھی۔ یہ صورت حال قرآن کے مطالعے کی زبردست محرک ہوئی اس لئے کہ مسلمان قرآن ہی کو سرچشمۂ دین و دنیا سمجھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اموی حکومت ختم ہوئی اور عباسی راج شروع ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ مرکز خلافت بھی شام سے عراق کو منتقل ہو گیا۔

اب وہ وقت آگیا تھا کہ عقائد کی باقاعدہ ترتیب شروع ہوتی اور مختلف مذاہب کلامی اور فقہی کی داغ بیل پڑتی۔ چنانچہ معتزلہ کا ظہور ہوتا ہے اور انھیں کے سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے مسئلہ اعجاز قرآن کا ذکر ملتا ہے۔ اس مسئلے سے غالباً پہلے پہل دوسری صدی ہجری کے وسط میں مرتب طور پر بحث کی گئی ہوگی۔

---

[1] لفظ زندیق کیلئے ملاحظہ ہو: 1. H.H. Schaeder, Iranische Beiträge I pp 274 ff (1930)

2. A. Siddiqi, The letter ق and its importance in persian loan words in Arabic.

Proceedings of the 4th Indian Oriental Conference pp 228-231.

قیاس یہ ہے کہ کم از کم تین راستوں سے لوگ اس مسئلے تک پہنچے ہونگے۔ ایک تو تفسیر کا سیدھا راستہ پہنچتا ہی ہے کہ قرآن میں یہ دعویٰ صاف صاف اور کئی جگہ موجود ہے اس لئے ہر مفسر کو اس سے بحث کرنی ضروری تھی۔ سورۂ بقرہ کے شروع میں ہی منکرین کو مقابلے کی دعوت دی گئی ہے اور عام طور پر اسی مقام پر مفسرین اس مسئلے سے بحث کرتے ہیں۔

دوسرے دونوں راستے کلام کی شاہراہ سے نکلتے ہیں۔ ان میں ایک تو پگڈنڈی سے زیادہ نہیں۔ اسے ان معتزلیوں نے طے کیا ہوگا جو مسئلہ خلق قرآن کی پرپیچ گھاٹیوں میں چکر لگانے کے عادی تھے۔ اس طویل بحث کے ساتھ ساتھ کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق لازمی طور پر اس کے اعجاز کا مسئلہ بھی چھیڑا گیا ہوگا اور ہمارے پاس اس کا ثبوت بھی ہے کہ ایسا ضرور ہوا۔

تیسرا راستہ جو ایک عام راستہ ہے اور جس پر چل کر بیشتر وہ مصنفین جن کا ہمیں ذکر کرنا ہے اس منزل تک پہنچے ہیں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ کلام کی عمارت کے دو نمایاں حصے ہیں جن پر ہر گذرنے والے کی نظر جا پڑتی ہیں۔ ایک الٰہیات اور دوسرا نبوت۔ پہلے حصے میں تو ایک چھوٹا سا گوشہ اس مسئلے کو دیا گیا ہے مگر دوسرا حصہ نہ صرف یہ کہ اسی مسئلے کے لئے وقف ہے بلکہ بلا مبالغہ اس کی بنیادیں بھی اسی مسئلے پر ہیں۔

الٰہیات کے تحت خدا کی ذات اور صفات سے بحث کرنے کے بعد متکلم مسئلہ نبوت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ پہلے تو وہ نوع انسان کے لئے نبی کی ضرورت ثابت کرتا ہے، پھر امکان بعثت سے بحث کرتا ہے، اس کے بعد کسی نبی کی صداقت کا معیار متعین کرتا ہے اور آخر میں فرداً فرداً انبیا کا ذکر کرتا ہے۔ یہاں ابتدا موسیٰؑ اور عیسیٰؑ سے ہوتی ہے اور انتہا محمدؐ پر۔ وہ طے کر چکا ہے کہ نبی کی صداقت کی دلیل یہ ہے کہ وہ معجزہ دکھلائے۔ اب کہ وہ محمدؐ کی نبوت کا ثبوت پیش کرنا چاہتا ہے اسے ان کے معجزوں کی تلاش ہوتی ہے۔ سب سے پہلے وہ قرآن کو ہاتھ میں لیتا ہے اور یہاں اسے اتنا کافی مسالہ مل جاتا ہے کہ آگے جانے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ قرآن کا خود یہ دعویٰ ہے کہ اس کا جواب پیش کرنا تمام مخلوق خدا کے لئے ناممکن ہے اس لئے کہ وہ خود خدا کا کلام ہے۔ اب اس سے بڑا معجزہ کون سا ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد اسے ایک حدیث بھی مل جاتی ہے: وما من الانبیاء نبیٌّ إلا أُعطیٰ من الآیات ما مثله آمن علیه البشر وانما کان الذی اوتیته وحیا

اوحاہ اللہ الی فارجو ان اکون اکثرھم تابعا یوم القیامۃ (کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ۔ صحیح بخاری)
کوئی نبی نہیں جسے کوئی نشانی نہ عطا کی گئی ہو کہ لوگ اس پر ایمان لائیں۔ مجھے جو چیز دی گئی ہے وہ الٰہی وحی ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے پیرو سب سے زیادہ ہوں گے۔ یہ مسئلہ اب حل ہو جاتا ہے۔ قرآن ہی محمدؐ کا معجزہ ہے اور پھر کیسا معجزہ ازلی اور ابدی۔

ہم نے دیکھا کہ کس طرح یہ مختلف راستے مختلف قسم کے لوگوں کو ایک ہی منزل کی طرف لے آئے لیکن ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ راستے متوازی ہیں بلکہ یہ ایک دوسرے کو بار بار کاٹتے ہیں جیسا کہ ہم بعد کو دیکھیں گے۔ غالباً یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ اس موقعے پر سیدھا راستہ ہی سب سے دور کا راستہ ثابت ہوا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ تفسیر کی راہ سے اس مسئلے تک پہنچے وہ سب سے بعد کو پہنچے۔ پہلے متکلمین پہنچے اور ہم کہہ چکے ہیں کہ ان میں معتزلہ پیش پیش تھے۔ ان لوگوں کے لئے جو دین اسلام کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں یہ حقیقت بہت ہی جانکاہ ہے کہ معتزلہ جیسے غیر معمولی ذہین متکلمین کی تصانیف کا عشر عشیر بھی اب دستیاب نہیں ہوتا۔ ان کے عقاید اور خیالات کا جو تھوڑا بہت ذکر سننے میں آتا ہے وہ ان لوگوں کی زبانی جو کھلے بندوں ان کے مخالف تھے مثلاً اشعریؒ[11]، بغدادیؒ[12]، ابن حزمؒ[13] اور شہرستانیؒ[14]۔

اس مسئلے پر خصوصاً ان کی رائیں اس قدر اختصار کے ساتھ ہم تک پہنچی ہیں کہ دلائل تو درکنار ان کا مفہوم بھی مشکل سے سمجھ میں آتا ہے۔ اس سلسلے میں جو نام خاص طور پر لئے جاتے ہیں وہ نظامؒ[15]، ہشامؒ[16]، عبادؒ[17] اور مزدارؒ[18] کے ہیں اور کہا یہ جاتا ہے کہ ان کو جمہور مسلمین کی رائے سے قدرے اختلاف تھا[19]۔ باقی معتزلہ غالباً وہی رائے رکھتے تھے جو عام مسلمین۔ ان میں سے اس مسئلے پر صرف جاحظ کی ایک کتاب مذکور ہے جس کا نام نظم القرآن[20] تھا۔ افسوس کہ یہ کتاب اب کہیں نہیں ملتی۔

اب ہمیں ایک بہت ہی اہم کتاب کا ذکر کرنا ہے جس کو صحیح طور پر "اسلام کا نیم سرکاری بیان" کہا گیا ہے۔ کتاب کا نام "کتاب الدین والدولۃ فی اثبات النبوۃ"[21] ہے اور مصنف اس کا علی بن ربن الطبری

---

[11] مقالات الاسلامیین۔ استانبول ۱۹۳۰ء [12] الفرق بین الفرق۔ مصر ۱۳۲۸ھ (بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ پر دیکھئے)۔

چنانچہ وہ خلیفہ متوکل (۲۳۲-۲۴۷ھ/۸۴۷-۸۶۱ء) کا ملازم تھا۔ مصنف نے دیباچے میں ذکر کیا ہے کہ خود خلیفہ نے اس کتاب کی تالیف میں اس کی مدد کی تھی۔ کتاب کا مقصد جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے محمدؐ کی نبوت کو ثابت کرنا ہے چھٹے باب کا عنوان ہے "الباب السادس فی اُمّیة النبی صلی اللہ علیہ وسلم وان الکتاب الذی انزله اللہ علیه وانطقه به اٰیةٌ للنبوة" (نبی کے امی ہونے کے ذکر میں اور اس بیان میں کہ جو کتاب اللہ نے ان پر نازل کی اور ان سے پڑھوائی وہ نبوّت کی نشانی ہے) مصنف کا طرزِ تحریر اور کتاب کے دلائل اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ اس وقت تک یہ مسئلہ علم کلام کے بڑے نظام کا ایک جزو نہیں بنا تھا اور نہ اسے وہ حیثیت حاصل ہوئی تھی جو بعد کو ہوئی۔ وہ تمام مسائل جن کی قسمت میں ایک طویل سلسلے کی کڑیاں بننا تھا

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ)

۳ کتاب الفصل فی الملل والاہواء والنحل۔ مصر ۱۸۹۹-۱۹۰۳ء ۴ کتاب الملل والنحل لندن ۱۸۴۶ء ۵ ابراہیم بن سیار م ۸۴۵ء ۶ الفوطی م ۸۴۲ء (۷) ابن سلیمان الدمیری م ۸۴۰ء یا ۸۶۰ء ۸ عیسیٰ بن صبیح م ۸۴۰ء یا ۸۴۸ء ۹ ملاحظہ ہو مقالات ج ا ص ۲۵ و ۲۶ اور ملل ص ۴۸ ۱۰ ملاحظہ ہو فہرست ص ۲۰ ۱۱ مرتبہ منگانا۔ مصر ۱۹۲۳ء۔

حالاتِ زندگی کے لئے ملاحظہ ہو: Z. D. M. G (neue Folge) Bd. 10, Heft 1/2, S. 38-68

کتاب کے اصلی ہونے کی بحث کے لئے: 1. Mingana: 'Remarks on Tabari's semi official defence of Islam' reprinted from 'the Bulletin of the John Ryland Library' Vol. 9, no. 1, 1925

2. D. S. Margoliouth: 'On the book of Religion and Empire' reprinted from the proceedings of the British Academy Vol. XVI, London 1930, Compare also the Bibliography on page 9 ff.

3. Bouyges in M. F. O. B. X; 242 ff.

ابھی تک اپنی انفرادی حیثیت رکھتے تھے۔ ان سے کبھی کبھی ایک ساتھ بھی بحث کی جاتی تھی مگر بیشتر علیحدہ علیحدہ
میں سے ایک یہ ہمارا مسئلہ بھی تھا۔

دوسری اور تیسری صدی ہجری میں تفسیر پر جو کتابیں لکھی گئیں ہیں بس ان کے نام ہی ہاتھ آتے ہیں۔
اس عہد کی صرف ایک نمائندہ تفسیر جو غالباً بہترین تفسیر ہے موجود ہے اور وہ ابن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) کی ضخیم
تصنیف ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس کی تیسوں جلدیں دستیاب ہو سکتی ہیں[۱]۔ یہ تفسیر اس لئے اور بھی
زیادہ قیمتی ہے کہ یہ گویا مجموعہ ہے ان تمام معلومات کا جو اس عہد میں قرآن سے متعلق لوگوں کو تھے اور اس نے بعد
کے مفسرین کے لئے ماخذ اور نمونے کا کام دیا ہے۔ اس میں اعجاز قرآن کی بحث سورۂ بقرہ کی آیات نمبر ۲۱ و ۲۲
کی تفسیر کے سلسلے میں آتی ہے۔ یہ بحث بالکل سیدھی سادی ہے اور متاخرین کی طرح علم کلام کی اصطلاحوں
سے بھری نہیں ہے اس میں وہی دلائل پیش کئے گئے ہیں جو خود قرآن میں موجود ہیں اور صرف تفسیر و تشریح
پر قناعت کی گئی ہے۔

قدیم تفاسیر میں سے دوسری کتاب جو ملتی ہے وہ حسن بن محمد قمی نیشاپوری (م ۷۲۸ھ) کی ہے[۲]۔ اس میں
بھی اس مسئلے سے بحث اسی مقام پر کی گئی ہے لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ تین چوتھائی صدی میں کتنا فرق پیدا
ہو گیا تھا۔ قمی کا طرز مفسرین کا نہیں بلکہ متکلمین کا ہے اور وہ تمام تر انہی کی اصطلاحیں استعمال کرتا ہے۔ وہ اپنے
حدود سے باہر نکل جاتا ہے اور دوسرے حلقہ ہائے فکر سے دلائل مستعار لاتا ہے۔ بعد کے مفسرین نے طبری سے زیادہ
قمی کی تقلید کی ہے۔ یہ پیوند تفسیر میں بالکل نہیں کھپتا اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ پودا کسی دوسری آب و ہوا میں پھلا
پھولا ہے۔ مگر ابھی کیا یہ تو ایک طویل داستان کی محض ابتدا تھی۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا خانۂ تفسیر پر متکلمین کا
قبضہ بھی بڑھتا گیا اور بجائے توضیح و تشریح کی سادگی کے عقائد و کلام کی پیچیدگی رونما ہوتی گئی۔ ہر فرقہ اپنے
مخصوص عقائد کو قرآن کی مدد سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کے سیدھے
سادے الفاظ کو طرح طرح کے معنی پہنائے جانے لگے۔ اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ یونانی فلسفے کے تصورات

---

[۱] مطبوعہ مصر ۱۳۲۱ھ [۲] تفسیر طبری کے حاشیے پر چھپی ہوئی ہے۔

قرآنی آیات کی مطابقت ثابت کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔

ان چند الفاظ سے غالباً کچھ تھوڑا سا اندازہ اس کا ہوا ہوگا کہ اس عقیدے کی نشو و نما کیوں کر ہوئی۔ اب ہمیں ان تصانیف کا مطالعہ کرنا چاہئے جو اس موضوع پر دستیاب ہوتی ہیں اس لئے کہ بغیر اس کے اس مئلے سے باقاعدہ بحث نہیں شروع ہوسکتی۔ اس تمام مجموعے کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ایک تو اس قسم کی تصانیف ہیں جن میں صرف اسی موضوع سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے وہ جن میں کسی دوسرے نظام کے تحت یہ بحث آئی ہے دوسرے نظاموں میں سب سے اہم معانی و بیان ہے۔ یہ تصانیف ہمارے موضوع کی خصوصی کتابیں بھی کہی جاسکتی ہیں جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہوتا ہے لیکن بعض اہم وجوہ کی بنا پر جن کا ذکر بعد میں آئے گا ان سے علیحدہ بحث کرنا چاہئے۔ دوسرے دو نظام تفسیر اور کلام کے ہیں جن کی نشو و نما کا ایک خاکہ ہم کھینچ چکے ہیں۔

۲۔ خصوصی کتابیں | اعجاز القرآن کے نام سے جن لوگوں نے کتابیں یا رسائل لکھے ہیں ان کے نام حسب ذیل ہیں۔ ان میں سے صرف پہلے دو نام ابن ندیم کی فہرست میں جو ۳۷۷ھ میں مکمل ہوچکی تھی ملتے ہیں اس لئے یہ کہنا غالباً بیجا نہ ہوگا کہ اس وقت ان کے علاوہ اور کوئی کتاب اس نام کی مشہور نہ تھی۔

۱۔ محمد بن زید (یزید؟) الواسطی متوفی ۳۰۶ھ[1]۔

۲۔ علی بن عیسیٰ الرمانی (م ۳۸۶ھ)[2] ۳۔ حمد بن محمد الخطابی (م ۳۸۸ھ)[3]

۴۔ ابوبکر محمد الباقلانی (م ۴۰۳ھ)[4]

---

[1] فہرست ص ۳۸۔ نایاب ہے [2] فہرست ص ۶۳ و ۶۲۔ ایک نسخہ وہبی آفندی کے کتبخانہ (استامبول) میں موجود ہے۔ میں نے ایک نقل حاصل کی ہے اور امید ہے کہ جلد سے شائع کرسکوں گا۔ [3] لائڈن میں موجود ہے ملاحظہ ہو فہرست کتبخانہ ج ۴ ص ۱۰۷۔ اس کی نقل بھی میرے پاس ہے اور شائع کرنے کا قصد رکھتا ہوں۔

[4] کئی بار طبع ہوچکی ہے۔ آخری بار ۱۹۳۰ء میں۔

۵. محمد بن یحییٰ ابن سراقہ (م [illegible]) | ۶. السید الشریف المرتضیٰ (م [illegible])
۷. عبد الواحد بن اسمٰعیل الرویانی (م [illegible]) | ۸. ابن باجوک البقالی (م [illegible] یا [illegible])
۹. قاسم بن فیرّوہ الشاطبی (م ۵۹۰ھ) | ۱۰. نصیر بن عبد السید المطرزی (م [illegible])
۱۱. ابن کمال پاشا (م ۹۴۰ھ) | ۱۲. ابراہیم بن احمد الجزری (م [illegible])
۱۳. محسن بن حسین النیسابوری الخزاعی (م [illegible])

باقلانی کی کتاب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اس موضوع پر بہترین کتاب ہے۔ یہ ایک مشہور متکلم اور امام اشعری کے سخت مقلد تھے۔ ان کے استاد ابو العباس بن مجاہد الطائی امام اشعری کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ باقلانی کی بے شمار تصانیف میں سے بس یہی ایک دستیاب ہوتی ہے لیکن یہ ایک ہی ان کے علم وفضل کے اندازے کے لئے کافی ہے۔

اپنی تصنیف کے دیباچے میں باقلانی ان اسباب کا جو اس تصنیف کا باعث ہوئے اس طرح ذکر کرتے ہیں:۔

"جس پر سے پردہ ہٹانا خدا کے دین والوں کے لئے سب سے زیادہ اہم اور جس سے بحث کرنا لازم ہے وہ (یعنی قرآن) ان کے دین کی جڑ بنیاد، توحید کا ستون، ان کے نبی کی دلیل اور اس کے معجزے کا ثبوت ہے خصوصاً ایسی حالت

شہ ملاحظہ ہو کشف الظنون: اعجاز۔ تینوں نایاب ہیں۔ شہ ۱۱ و ۱۲ ملاحظہ ہو فہرست مخطوطات عربی برلن ج ۱ ص ۲۸۰ و ۲۸۹۔ صرف نمبر ۱۱ موجود ہے (برلن ۶۱۹، ۴۸۰) ش ۱۰۹ ملاحظہ ہو رسالہ معارف ج ۱۰ نمبر ۵ ص ۳۳۱۔ دونوں مدینہ کے ایک کتبخانہ میں موجود ہیں شلہ ملاحظہ ہو کشف الحجب عن اسماء الکتب کلکتہ ۱۹۱۲ء ص ۵۲۔ کتاب نایاب ہے۔

شلہ معارف میں نام فیرہ چھپا ہے۔ ارشاد الاریب (ج ۶ ص ۱۸۴) میں فیرۃ ہے۔ بروکلمان (ج ۱ ص ۴۰۹) فیروہ لکھتا ہے اور اپنا قیاس یہ بتاتا ہے کہ یہ ایک قدیم ہسپانوی نام ہے۔

تھا کتابوں کا خمیدہ سینہ اور اس کا ماندہ گم ہے اور وہ تمام دنیا میں چھپایا ہوا ہے اور علم مٹتا جاتا ہے، چھپتا جاتا ہے اور اہل علم زمانے کی جفاؤں کا شکار ہو رہے ہیں اور بے انتہا شدائد برداشت کر رہے ہیں یہاں تک کہ ان تکلیفوں کے مارے وہ نہ علم کا حق ادا ادا کر سکتے ہیں اور نہ اس کے راستے پر چل سکتے ہیں۔ آج کل لوگ دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے ہیں ایک وہ جو حق سے دور اور ہدایت سے کنارہ کش ہے اور دوسری وہ جو اپنے کام کاج میں پریشان اور حق کی حمایت سے مجبور ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب ملحد اصول دین کی چھان بین کرتے ہیں اور ضعیف ایمان والوں کو شک اور شبے میں ڈال رہے ہیں۔ دین اب بے یار و مددگار ہے۔ اس کے ساتھیوں نے اسے چھوڑ دیا ہے اور وہ ہر اس شخص کے لئے ہدف بنا ہوا ہے جو اس پر نشانہ لگانا چاہے۔ اب بالکل وہی کیفیت ہے جو ابتدا میں قرآن کے ظہور کے وقت تھی۔ کوئی اسے جادو کہتا تھا، کوئی شعر، کوئی داستان پارینہ بتلاتا تھا اور کوئی کہتا تھا کہ اگر چاہیں تو ہم بھی ایسا پیش کر سکتے ہیں۔ یہ اور اسی طرح کے اور اقوال جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نقل کئے ہیں۔ ایک جاہل کے متعلق کسی نے مجھ سے یہ کہا کہ وہ قرآن کا مقابلہ بعض اشعار سے کرتا ہے اور اس پر بس نہیں کرتا بلکہ اشعار کو بہتر کہتا ہے۔ سو یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔ آج کل کے ملحد جو کچھ کہتے ہیں اس کا بیشتر حصہ وہی ہے جو ان کے بھائی قریش یا دوسرے قبائل کے ملحد اسی زمانے میں کہا کرتے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس زمانے کے بیشتر معترض بعد کو جب ان کی سمجھ میں بات آگئی تائب ہوئے اور ایمان لائے اور آجکل جہل غالب ہے اور ملحد ہدایت سے دور تر ہیں۔ ایسی حالت میں اہل ادب اور اہل کلام میں سے ان لوگوں کو جنھوں نے قرآن کے معانی اور فوائد پر مفید کتابیں لکھی ہیں یہ چاہئے تھا کہ اس مسئلے سے بھی تفصیلی بحث کرتے کہ قرآن کے معجز ہونے کے کیا وجوہ ہیں۔ یہ ان مسائل سے زیادہ ضروری تھا جن پر انھوں نے

کتابیں لکھ ڈالی ہیں مثلاً خبر یا اعراب یا بدیع اعراب یا نحو کی باریکیاں کیونکہ اس کی حاجت سخت تر ہے اور اس کی طرف توجہ کرنا واجب تر۔ لوگوں نے تو اس باب میں اتنی کوتاہی کی کہ ایک فرقہ براہمہ کا ہم خیال ہوگیا اور یہ سمجھنے لگا کہ جب لوگ اس معجزے کی حمایت سے عاجز ہیں تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اس کی حمایت ممکن ہی نہیں اور اس معجزے کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب انھوں نے دیکھا کہ ان لوگوں نے جدید مسائل میں تو عمدہ درجہ لطافت اور باریک بینی کا ثبوت دیا ہے اور اس مسئلے پر جو کچھ لکھا ہے وہ بہت ناقص اور تہذیب و ترتیب سے عاری ہے۔ بعض لوگ جو اس کوتاہی کے مجرم ہیں یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ اس مسئلے کی تحقیق اس وقت کی جائے گی جب دوسرے زیادہ اہم اور دقیق مسائل حل ہو چکیں گے۔ یہ بات زیادہ تفصیل کی محتاج ہے اور ہم آگے چل کر اسے پھر چھیڑیں گے۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ اس مسئلے کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ جاحظ نے جو کتاب نظم القرآن لکھی ہے اس میں ان متکلمین سے جو پہلے گزر چکے ہیں کچھ بھی زیادہ نہیں لکھا ہے اور نہ ان اشتباہات کو واضح کیا ہے جو اس باب میں وارد ہوتے ہیں۔ مجھ سے ایک شخص نے یہ کہا کہ میں ایک ایسی جامع کتاب اس مسئلے پر لکھوں جس سے جاہلوں کے تمام شکوک اور شبہات رفع ہو جائیں اور اس معجزے کے خلاف جو کچھ کہا جاتا ہے اس کا بھی رد ہو جائے۔ میں نے اس بات کو اللہ پر بھروسہ کر کے مان لیا۔ اب اس کے تقرب کی آرزو رکھتا ہوں اور اس کی توفیق کا طالب ہوں۔"

اس دیباچے کو دیکھنے کے بعد تھوڑا سا اندازہ ہو سکتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں اس مسئلے کی کیا کیفیت تھی۔ تحریر کی اس مبالغہ آمیزی کو وضع کرنے کے بعد بھی جو ہر زمانے کے متکلموں کا خاص رنگ ہے کم از کم اتنا ضرور باقی رہتا ہے کہ اس عہد میں مسئلہ اعجاز قرآن پر لوگوں کی توجہ کم تھی۔ جو کتابیں اب تک لکھی گئی تھیں ان سے لوگ مطمئن نہیں تھے اور ایک جامع کتاب کی ضرورت شدت سے محسوس

[illegible] جا سکتی ہیں ہم خود دیکھ سکتے ہیں کہ اس کمی کو باقلانی نے باحسن وجوہ پورا کر دیا۔ اس کتاب نے بعد کے ان متکلمین کے لئے جنھوں نے اس مسئلے سے بحث کی ہے برابر ایک نمونے کا کام دیا ہے۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ اس کا ایک مختصر خاکہ یہاں پر پیش کیا جائے۔

دوسرے متکلمین کی طرح باقلانی نے بھی اس دعوے سے ابتدا کی ہے کہ "قرآن ہی محمدؐ کا معجزہ ہے"۔ پہلے باب میں یہی بحث ہے۔ دوسرے باب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن واقعی معجزہ ہے۔ تیسرے باب میں یہی بحث جاری ہے اور یہاں آکر تفصیل سے وہ تمام دلائل بیان کئے گئے ہیں جو اس دعوے کی موافقت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن کا طرز ادا ایسا ہے کہ کسی مخلوق کی فکر کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ اس موقعے پر باقلانی نے یہ دکھایا ہے کہ قرآن نہ تو شعر ہے اور نہ سجع۔ اگلے دو ابواب میں یہی بحث ہے۔ اب اس جگہ یہ سوال پیش آتا ہے کہ کیا قرآن کا اعجاز اس کے بدیع کے مطالعے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ باقلانی نے اس موقعے پر بدیع کے اقسام گنائے ہیں اور قرآن میں جو اقسام مستعمل ہیں ان کو بیان کرکے دوسرے کلام سے ان کا مقابلہ کیا ہے۔ ایک طویل بحث کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اس طرح قرآن کا اعجاز یقینی طور پر متعین نہیں ہو سکتا۔

تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر تعین کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب دینے سے پہلے وہ یہ کہتا ہے کہ ان لوگوں کے لئے جن کی زبان عربی نہیں ہے یا اگر زبان عربی ہے تو اس کی باریکیوں سے واقف نہیں ہیں یہ فیصلہ خود کرنا ممکن نہیں ہے۔ انھیں تو ان لوگوں کا دست نگر ہونا پڑے گا جنھیں کھرے کھوٹے کی تمیز اور جو ادبی خوبیوں کے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اب وہ خود رسولؐ کے بعض خطبوں اور خطوط کو نقل کرکے کہتا ہے کہ ان میں اور قرآن کے طرز میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب خود رسولؐ بھی اس طرز کے مالک نہیں ہیں تو بجز اس کے اور کوئی صورت ممکن نہیں کہ اسے خدا کا کلام سمجھا جائے۔ اس کے بعد وہ اسی طرح صحابہ اور دوسرے مشہور جاہلی اور اسلامی خطیبوں کے کلام کو پیش کرکے یہی نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ یہیں اس نے وہ چند جملے بھی نقل کئے ہیں جو مسیلمہ اور سجاح سے منقول ہیں اور ان کا اچھی طرح خاکہ اڑایا ہے۔ اب وہ شعراء کی طرف توجہ کرتا ہے۔ مقابلہ کرنے سے پہلے وہ یہ کلیہ پیش کرتا ہے کہ نظم میں طرز ادا کی وہ خوبیاں ہرگز نہیں پیدا

ہو سکتیں جو نثر میں ممکن ہیں اس لئے کہ نظم ردیف اور قافیے کی مصیبت میں گرفتار ہے۔ اس وجہ سے شعرا کے کلام کا کوئی مقابلہ قرآن سے ہو ہی نہیں ہو سکتا لیکن چونکہ بعض جاہل اس قسم کا مقابلہ کرتے ہیں اس لئے یہ ضروری ہے کہ ان کی کمزوریوں کو واضح کیا جائے۔ وہ شاعروں کے سردار یعنی امرء القیس کا انتخاب کرتا ہے اور تفصیل سے اس کے اشعار کی خوبیوں اور خرابیوں سے بحث کرتا ہے۔ اب وہ قرآن کے طرز ادا کی چند خوبیاں بیان کرتا ہے اور فیصلہ ان لوگوں پر چھوڑ دیتا ہے جو ذوق سلیم رکھتے ہیں۔ بحث ابھی ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ اسلامی شعرا کے کلام کو بھی پیش کرتا ہے اس لئے کہ کچھ لوگ اس کی ضرورت بھی محسوس کرتے ہیں حالانکہ کسی عربی شاعر کا امرء القیس سے بڑھ جانا اس کے خیال میں بہت مشکل ہے اور جب اسی کے شعر قرآن کے مقابلے میں نہ ٹھیر سکے تو دوسرے شعرا کا تو ذکر ہی کیا۔ یہ باب بہت طویل ہے اور تقریباً نصف کتاب پر حاوی ہے۔

بعد کے صفحات میں باقلانی نے متفرق کم اہم مسائل سے بحث کی ہے مثلاً (۱) کیا قرآن کا اعجاز بدیہی ہے (۲) قرآن کا کتنا حصہ معجز ہے (۳) اعجاز کس چیز میں ہے (۴) تحدی سے کیا مراد ہے (۵) لفظ معجز کا صحیح مفہوم کیا ہے اور (۶) یہ کہنا کیوں صحیح نہیں کہ قرآن رسول کا کلام ہے۔ اب ایک باب اور باقی رہ جاتا ہے جو اگر اس بڑے باب کا جس کا ذکر کیا جا چکا ہے ایک حصہ ہوتا تو اچھا تھا۔ اس میں بلاغت کی تشریح کی گئی ہے اور قرآن سے اس کی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ آخر میں باقلانی نے بہت زوردار الفاظ میں ان مشکلات کا بیان کیا ہے جو ایک ایسے دشوار مسئلے سے بحث کرنے والے کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ اس کی رائے ہے کہ قرآن کی تمام باریکیوں کو سمجھنا اور اس کی تمام خوبیوں کو بیان کرنا بشر کے امکان میں نہیں ہے۔ باقلانی کی کیفیت نفسی کا اندازہ اس لطیفے سے ہو سکتا ہے جو اس نے اس موقعے پر بیان کیا ہے: ایک بدوی رات کو راستے سے بھٹک گیا تھا۔ دفعتاً چاند نکل آیا اور اس کی مدد سے اس نے اپنا راستہ پا لیا۔ اب وہ چاند کو مخاطب کر کے کہتا ہے "میں تجھے کیا کہوں۔ کہوں کہ خدا تجھے بلند کرے تو وہ تو تجھے بلند کر ہی چکا ہے۔ کہوں کہ اللہ تجھے روشنی دے تو وہ تو تجھے روشنی دے ہی چکا ہے۔ کہوں کہ خدا تجھے جمال دے تو وہ تو تجھے جمیل بنا ہی چکا ہے۔"

بہت افسوس کی بات ہے کہ اس موضوع کی خصوصی کتابوں میں سے اکثر نایاب ہیں۔ شریف مرتضیٰ کی کتاب کا ضائع ہو جانا اس لئے اور زیادہ افسوسناک ہے کہ انھوں نے ایک غیر معمولی راہ اختیار کی تھی اور

میں تفصیل سے بحث کی گئی تھی۔ وہ تھا بھی غالباً صرف نظم کا تھا۔ اس لیے یہ کتاب بہت دلچسپی کا باعث ہوتی۔ ان کے بعض دلائل دوسروں نے نقل کیے ہیں۔ خوش قسمتی سے ایک مخطوطہ ان کا بھی اس مسئلے سے متعلق ملتا ہے۔ ان کے بہت سے خطوط جو انھوں نے دینی اور ادبی استفسارات کے جواب میں لکھے تھے محفوظ ہیں[1]۔ ان میں سے دو خطوط اس مسئلے سے متعلق بھی ہیں۔

۲۔ دوسرے نظام کے تحت — (۱) معانی و بیان

یہ امر تو مسلّم ہے کہ عربی معانی و بیان بہت کچھ قرآن پر مبنی ہے لیکن ابھی تک غالباً اس حقیقت کو واضح نہیں کیا گیا ہے کہ اس فن کی ترتیب اور تدوین کا باعث یہی اعجاز قرآن کا عقیدہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اور محرکات بھی تھے لیکن یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ محرک اول یہی عقیدہ تھا۔ قرآن کے اعجاز کی بحث میں سب سے اہم اور ابتدائی مسئلہ یہ تھا کہ محل اعجاز کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بالکل شروع ہی میں دو فریق ہو گئے تھے۔ ایک کہتا تھا کہ محل اعجاز قرآن کا نظم ہے اور دوسرے کو اس کے نظم میں کوئی خاص بات دکھائی نہ دیتی تھی۔ یہ فریق دوسرے دلائل پیش کرتا تھا لیکن بہت کم لوگ اس خیال کے تھے، زیادہ تر علما نظم ہی کو معجز قرار دیتے تھے۔ اب فطرتاً یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر مقابلے کا معیار کیا ہے؟ اس لئے لوگوں نے ادبی آثار کو جمع کرنا اور ان سے قرآن کا مقابلہ کرنا شروع کیا۔ یہی سبب تھا کہ جاحظ نے ایک کتاب نظم القرآن کے نام سے لکھنے کی ضرورت محسوس کی۔ یہ واقعی نہایت افسوس کی بات ہے کہ یہ کتاب ضائع ہو گئی لیکن خود اس کا نام ہی اس کے موضوع کی بولتی ہوئی تصویر ہے۔

یہ حقیقت بھی ابھی محتاج توضیح ہے کہ جاحظ ہی وہ شخص ہے جس کی ذات سے فن معانی و بیان کی ابتدا وابستہ ہے۔ جس نے 'البیان والتبیین' کا غور سے مطالعہ کیا ہے اسے اور کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ عام طور پر یہ لکھا جاتا ہے کہ اس فن کے بانی عبد القاہر جرجانی (م ۴۷۱ھ) تھے لیکن یہ بیان صحیح نہیں۔ اس میں کوئی

---

[1] مخطوطہ برلن ۴۵ Pet (ورق ۴ الف ـ ۵ ب و ۹۲ ب ـ ۹۴ الف)۔

شبہ نہیں کہ انھوں نے سب سے پہلے معانی و بیان کو مرتب اور مدون کیا لیکن وہ کسی طرح بھی اس کے بانی نہیں کہے جا سکتے۔ ان کی دونوں کتابیں اسرار البلاغۃ[۵۱] اور دلائل الاعجاز[۵۲] غالباً پہلی کتابیں ہیں جن میں معانی و بیان کے مسائل سے مرتب طور پر بحث کی گئی ہے مگر جو معلومات ان میں ہیں وہ کسی نہ کسی شکل میں پہلے سے موجود ضرور تھیں اور انھوں نے ان کو صرف جمع کیا ہے۔

جرجانی کی کتاب دلائل الاعجاز ہمارے اس دعوے کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ فن معانی و بیان کی ترتیب کا ذمہ دار اعجاز قرآن کا عقیدہ ہے۔ کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں اعجاز کی دلیلیں بیان کی گئی ہوں گی لیکن آپ شروع سے لیکر آخر تک دیکھ جائیے تمام بحث نحو اور معانی و بیان کے مسائل سے ہے۔ بادی النظر میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی لیکن اس کا حل بہت آسان ہے۔ بقول جرجانی کوئی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ قرآن معجز ہے جبتک وہ بیان کے مختلف طرزوں میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو[۵۳]۔ اس نکتے کو جرجانی نے ایک ضمیمے میں اور زیادہ واضح کیا ہے۔ اس کا نام المدخل فی دلائل الاعجاز ہے[۵۴]۔ جرجانی نے خطابی کی کتاب اعجاز القرآن کی دو شرحیں بھی لکھی تھیں ان میں سے بڑی کا نام المعتضد تھا[۵۵]۔ یہ بہت ممکن ہے کہ ان شرحوں کی تالیف کے دوران میں ان کو ادبی نقد کا معیار معین کرنے کی ضرورت زیادہ محسوس ہوئی ہو اور اسی احساس کا نتیجہ ان کی دونوں مشہور تصانیف ہوں۔ اس سے ہم ان کے خیالات کے ارتقا کا اندازہ بھی لگا سکتے ہیں۔ پہلے تو انھوں نے ایک متقدم کی کتاب کی مختصر شرح کو کافی سمجھا تھا لیکن کچھ دنوں کے بعد ایک بڑی شرح کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے بعد انھیں شرح کا دامن تنگ معلوم ہونے لگا چنانچہ ایک مستقل تصنیف کی طرح ڈالنی پڑی اور یہی ان کی کتاب دلائل الاعجاز ہے۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ بحث کا مدار وہی اعجاز قرآن کا مسئلہ ہے۔ اس میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ اسرار البلاغۃ غالباً ان کی آخری تصنیف ہے۔ اس میں انھوں نے عقیدۂ اعجاز قرآن کا دامن چھوڑ کر صرف معانی و بیان کے مسائل سے بحث کی ہے۔ افسوس کہ ان کی دونوں

---

[۵۱] مطبوعہ مصر ۱۹۰۱ء طبع ثانی ۱۹۲۶ء [۵۲] مصر ۱۳۲۱ھ [۵۳] ص ۳۲-۳۳ و ۲۷۶ الخ [۵۴] مطبوعہ کتاب کے آخر میں منسلک ہے [۵۵] کشف الظنون ماتحت اعجاز۔

[illegible] مصنفین کے ذہن کی ارتقا زیادہ واضح طور پر ہمارے سامنے ہوتی۔

جرجانی کی دونوں کتابوں کو فخر الدین رازی نے ملخص کیا ہے اور اس کا نام نہایۃ الایجاز فی درایۃ الاعجاز[1] رکھا ہے۔ انھوں نے جرجانی کے اس نکتے کو عام فہم الفاظ میں بیان کیا ہے کہ صرف معانی و بیان کی وساطت سے اعجاز قرآن کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ رازی نے اپنی تفسیر اور علم کلام کی دو کتابوں میں بھی جن کے نام "معالم اصول الدین" اور "محصل افکار المتقدمین"[2] ہیں اس مسئلے سے بحث کی ہے مگر اس تمام بحث میں خود ان کا کوئی انفرادی عطیہ نہیں ہے۔

دوسرے مصنفین جنھوں نے جرجانی کے بتائے ہوئے راستے کو اختیار کیا ہے یہ ہیں: (۱) ابن ابی الاصبع القیروانی (م ۶۵۴ھ) جن کی کتاب کا نام بیان البرہان فی اعجاز القرآن[3] ہے۔ (۲) عبد الواحد الزملکانی (م ۶۵۱ھ) جن کی کتاب نام کتاب التبیان فی علم البیان المطلع علی اعجاز القرآن[4] ہے۔ حازم بن محمد قرطاجنی (م ۶۸۴ھ) کا نام بھی اس سلسلے میں لیا جاتا ہے۔ انھوں نے اس مسئلے سے غالباً اپنی تصنیف منہاج البلغا[5] میں بحث کی تھی۔ یہ کتاب اب نایاب ہے۔

یہ حقیقت بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا لفظ اعجاز بھی اپنے خصوصی معنی سے آہستہ آہستہ دور ہوتا گیا اور آخر میں تو یہ بلاغت کا مرادف ہو کر رہ گیا اسی طرح علم الاعجاز سے علم المعانی والبیان والبلاغۃ مراد ہونے لگا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ غیاث الدین لطف اللہ (م ۱۰۳۵ھ) نے ایک رسالہ "الایجاز فی علم الاعجاز" کے نام سے لکھا ہے جس کا موضوع سر تا سر علم معانی و بیان ہے اور اس میں ایک خفیف سا اشارہ بھی عقیدۂ اعجاز قرآن کی طرف نہیں ہے نہ مصنف نے دیباچے ہی میں اس کتاب کے نام اور اس کے موضوع

---

[1] مصر ۱۳۱۷ھ [2] دونوں مطبوعہ مصر ۱۹۰۵ء [3] کتب خانہ مشرقی پٹنہ [4] اسکوریال نمبر ۲۲۲ و ۲۶۳۔ اسی مصنف کی ایک کتاب مدینے کے ایک کتب خانے میں موجود ہے جس کا نام "البرہان الکاشف عن اعجاز القرآن" ہے (ملاحظہ ہو معارف ج ۱۰ نمبر ۵ نومبر ۱۹۲۶ء ص ۳۳۰) غالباً یہ ایک ہی کتاب ہے جس کے دو نام ہو گئے ہیں [5] ملاحظہ ہو: مفتاح السعادۃ طاشکبری زادہ مطبوعہ حیدر آباد ۱۹۱۰ء ج ۲ ص ۳۵۹ اور اتقان ج ۲ ص ۱۱۹۔

کے تعلق کو واضح کیا ہے۔ اب اس سے زیادہ اور کیا دلیل اس تعلق کی ہو سکتی ہے جو فن معانی و بیان کو عقیدۂ اعجاز قرآن سے ہے کہ ایک لفظ جو اس عقیدے کے اظہار کے لئے تراشا گیا تھا اس فن کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا۔

(ب) تفسیر

ہم اس سے قبل دو قدیم تفاسیر (طبری اور قمی) کا ذکر کر چکے ہیں۔ بعد کے مفسرین میں سے خاص طور پر جن لوگوں نے اس مسئلے سے بحث کی ہے ان کے نام یہ ہیں:۔

(۱) راغب اصفہانی (م ۵۰۲ھ)۔ مقدمۃ تفسیر القرآن (یہ مقدمہ مصر میں "تنزیہ القرآن عن المطاعن" کے آخر میں طبع ہوا ہے۔ ۱۳۲۹ھ)

(۲) عمر بن محمد النسفی (م ۵۳۷ھ)؛۔ تفسیر القرآن (مخطوطہ برلن [illegible])

(۳) محمود بن عمر الزمخشری (م ۵۳۸ھ)؛ تفسیر الکشاف (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۶ء)

(۴) ابن عطیۃ الغرناطی (م ۵۴۲ھ)؛۔ تفسیر القرآن (مخطوطہ برلن [illegible])

(۵) محمد بن احمد القرطبی (م ۶۷۱ھ)؛۔ تفسیر القرآن (مخطوطہ برلن: [illegible])

(۶) محمد بن جزی الکلبی (م ۷۴۱ھ)؛۔ کتاب التسہیل لعلوم القرآن (مخطوطہ برلن: [illegible])

(۷) اسمٰعیل بن عمر ابن کثیر (م ۷۷۴ھ)؛ تفسیر القرآن (مطبوعہ مصر ۱۹۲۴ھ)

(۸) محمد بن عبداللہ الزرکشی (م ۷۹۴ھ)؛ البرہان فی علوم القرآن (مخطوطہ کتب خانہ محمودیہ مدینہ
ملاحظہ ہو رسالہ معارف ج ۳۱ نمبر ۲ دسمبر ۱۹۳۲ء ص ۱۰۱
نیز مقدمہ الاتقان للسیوطی۔)

(۹) مجدالدین فیروزآبادی (م ۸۱۷ھ)؛ بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز (کتاب نایاب ہے ملاحظہ ہو فہرست مخطوطات عربیہ برلن ج ۱ ص ۲۸۹)

(۱۰) جلال الدین السیوطی (م ۹۱۱ھ)؛ الاتقان فی علوم القرآن (مطبوعہ مصر ۱۳۴۴ھ)

(۱۱) شاہ ولی اللہ دہلوی (م ـــــــھ): الفوز الکبیر فی اصول التفسیر۔

(ج) علم کلام

ہم علی بن ربن طبری کی کتاب کا ذکر کر چکے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ امام اشعری (م ۳۲۴ھ) نے بھی اپنی تصانیف میں اس مسئلے سے بحث کی تھی مگر بیشتر تو نایاب ہیں اور جو دستیاب ہیں ان میں کہیں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ ان کے بعض خیالات دوسروں کی تصانیف میں مذکور ہیں۔ ایک اور مشہور متکلم جن کی تصانیف اب نہیں ملتیں، ابو اسحٰق اسفرائینی (م ۴۱۸ھ) المعروف بہ "استاذ" تھے۔ انھوں نے غالباً اپنی تصنیف "جامع الجلی والخفی فی اصول الدین والرد علی الملحدین"[1] میں اس مسئلے سے بحث کی تھی۔ دوسرے متکلمین جنھوں نے اس مسئلے کو اپنے نظام کا جزو بنایا اور جن کی تصانیف دستیاب بھی ہوتی ہیں یہ ہیں:

(۱) عبد القاہر بن طاہر البغدادی (م ۴۲۹ھ): کتاب اصول الدین (مطبوعہ استانبول ۱۹۲۸ء)

(۲) علی بن محمد الماوردی (م ۴۵۰ھ): اعلام النبوۃ (مطبوعہ مصر ۱۳۱۹ھ)

(۳) علی بن احمد ابن حزم (م ۴۵۶ھ): کتاب الفصل فی الملل والاہواء والنحل (مطبوعہ مصر ۱۳۲۱-۱۸۹۹ء)

(۴) عبد الملک بن عبد اللہ الجوینی (ابو المعالی امام الحرمین م ۴۷۸ھ): کتاب الارشاد فی اصول الاعتقاد
(مخطوطہ لائڈن ۱۹۸۳ - برٹش میوزیم ۱۶۴۸-۲)

(۵) ابو حامد الغزالی (م ۵۰۵ھ): کتاب الاقتصاد فی الاعتقاد (مطبوعہ مصر ۱۹۱۶ء)

(۶) قاضی عیاض (م ۵۴۴ھ): کتاب الشفا (مطبوعہ مصر ۱۹۱۱ء)

(۷) محمد بن عبد الکریم الشہرستانی (م ۵۴۸ھ): نہایات الاقدام فی علم الکلام (مخطوطہ برلن Pm 579
مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۳۱ء - ابھی صرف ایک حصہ شائع ہوا ہے)

(۸) علی بن ابی علی الآمدی (م ۶۳۱ھ): ابکار الافکار (مخطوطہ برلن Pet 233)

(۹) تقی الدین ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ): الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح (مطبوعہ مصر ۱۳۲۲ھ)

---

[1] کشف الظنون: جامع۔

(۱۰) ہبۃ اللہ البارزی (م ۷۳۸ھ) توثیق عُریٰ الایمان فی تفضیل حبیب الرحمٰن (مخطوطہ برلن 1187 [illegible])

(۱۱) بدرالدین بن عمر بن حبیب (م ۸۰۸ھ) النجم الثاقب فی اشرف المناقب (، ، [illegible])

(۱۲) سعدالدین تفتازانی (م ۷۹۱ھ) شرح مقاصد الطالبین فی اصول الدین (مطبوعہ استانبول ۱۳۰۵ھ)

(۱۳) الشریف الجرجانی (م ۸۱۶ھ) شرح المواقف للایجی (م ۷۵۶ھ) (مطبوعہ لیپزک ۱۸۴۸ء)

(۱۴) ابوالحسین سعید بن ہبۃ اللہ الراوندی[۱] (القطب م ۵۷۳ھ) کتاب الخرائج والجرائح (مخطوطہ برلن Pm 113)

اس کتاب کو تمام وکمال محمد باقر مجلسی (م ۱۱۱۰ھ) نے اپنی عظیم الشان تصنیف "بحار الانوار" مطبوعہ طہران ۱۳۰۲ھ میں داخل کر لیا ہے۔

(۱۵) یحییٰ بن حسن القرشی الزیدی (م ؟ ھ) منہاج التحقیق ومحاسن التلفیق (مخطوطہ برلن ۹۶ [illegible])

(۱۶) رحمۃ اللہ الہندی (م ؟ ھ) اظہار الحق (مطبوعہ مصر ۱۳۰۹ھ)

(باقی)

---

[۱] فہرست مخطوطات عربیہ برلن ج ۲ ص ۶۲۳ پر یہ نام سعداللہ درج ہے مگر یہ غلط ہے۔ ملاحظہ ہو "منتہی المقال" لابی علی العاملی مطبوعہ طہران ۱۳۰۰ھ ص ۱۴۸، اور "تذکرۃ المتبحرین" مطبوعہ طہران ۱۳۰۲ھ ص ۵۵ اور "بحار الانوار" ج ۲۵ ص ۷۔

ہندو اور آریہ کی وجہ تسمیہ

ملک ہندوستان کی رہنے والی تمام قومیں ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، بودھ، عیسائی وغیرہ لفظ "ہندی" یا "ہندوستانی" میں بخوبی شامل ہو جاتی ہیں لیکن لفظ "ہندو" کے مفہوم سے سکھ، پارسی، بودھ، مسلمان، عیسائی جدا سمجھے جاتے ہیں۔ چونکہ اچھوت اور ذلیل اقوام کو دوسری اقوام کے مساوی معاشرتی حقوق عطا کرنے کی تحریک کچھ دنوں سے ہندوؤں میں جاری ہے لہذا جن لوگوں پر لفظ ہندو بولا جاتا ہے ان میں آجکل برہمن، راجپوت، ویش، شودر، اچھوت، چنڈال سب ہی شامل سمجھے جاتے ہیں لیکن اس سے پہلے ماضی قریب میں چماروں، بھنگیوں، کنجروں وغیرہ کو ہندوؤں کی قوم میں شامل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ہندوؤں میں برہمن، راجپوت اور ویش تین ہی قومیں جو جنیو استعمال کرنے کی حقدار ہیں شامل سمجھی جاتی تھیں۔ شودر قوموں میں عموماً ہندوستان کے قدیم باشندے شامل ہیں جن میں سے ایک بڑے حصے کو ہندوؤں نے اپنی خدمت گزاری کے لئے ضروری سمجھ کر کچھ اعلیٰ درجہ کی رعایتیں دیدی ہیں مثلاً کماروں کو برتن اور کھانے کی چیزیں چھونے کی اجازت ہے۔ اسی طرح جاٹوں کو کچھ رعایات حاصل ہیں۔ بہرحال ہندوستان کی قدیم عظمت کو انھیں ہر سہ دوجنمہ قوموں نے اپنے بزرگوں سے وابستہ سمجھا ہے اور جب ہندو تہذیب، ہندو علوم، ہندو طاقت، ہندو مذہب، ہندو تمدن، ہندو معاشرت وغیرہ الفاظ بولے جاتے ہیں تو ان کے مفہوم کو انھیں ہر سہ دوجنمہ قوموں سے تعلق ہوتا ہے۔ لفظ ہندو ان اقوام کے لئے سینکڑوں نہیں ہزاروں سال سے مسلسل استعمال ہوتا رہا ہے اور آجکل بھی مستعمل ہے لیکن چالیس پچاس سال ہوئے کہ ہندوؤں کے ایک جدید مذہبی فرقے نے جس کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی صاحب آنجہانی ہیں اپنے آپ کو ہندو کہلانا نہ چاہا اور اپنا نام آریہ تجویز کیا چنانچہ آجکل لفظ آریہ سے عام بول چال میں ہندوؤں کا یہی مذکورہ فرقہ مراد لیا جاتا ہے (اب چند سال سے آریہ فرقے کے لوگ بھی اپنے آپ کو ہندو ہی کہنے لگے ہیں) لیکن مورخین کی اصطلاح میں آریہ اور ہندو دونوں لفظ مترادف اور ہم مفہوم ہیں یعنی وہ لوگ جو کسی قدیم زمانے میں شمال یا شمال و مغرب کی جانب سے ہندوستان میں آکر اور اس ملک کے قدیم ترین

باشندوں کو پہاڑوں اور جنگلوں میں پناہ گزیں یا قتل ہونے کے لیے مجبور کر کے خود ہندوستان پر قابض و متصرف ہو گئے تھے۔ انھیں قدیم فاتحین کی اولاد برہمن، راجپوت یا چھتری اور ویش تین قوموں میں تقسیم ہو گئی۔ ان لوگوں کی زبان سنسکرت تھی اور انھیں لوگوں نے ہندوستان کو ممالک عالم میں نامور بنایا اور یہی لوگ ہندو کہلاتے ہیں۔ بس آریہ یا ہندو ایک ہی قوم یا ایک ہی مجموعۂ اقوام کا نام ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ہندوستان میں عام طور پر لفظ ہندو بولا جاتا ہے آریہ نہیں بولا جاتا لیکن تاریخ کی کتابوں میں مؤرخین ہندو کی جگہ لفظ آریہ استعمال کرتے ہیں۔ وید اور منوسمرتی میں بھی لفظ آریہ استعمال ہوا ہے۔ مؤرخین اس لئے بھی لفظ آریہ استعمال کرنے پر مجبور ہیں کہ اسی ہندی آریہ قوم کی ہم نسل دنیا کے دوسرے ملکوں میں اور قومیں بھی ہیں ان کو بھی آریہ اقوام کہا جاتا ہے ان پر ہندو کا لفظ نہیں بولا جا سکتا۔ لہٰذا جب اقوام عالم پر بحث کی جاتی ہے تو ہندوستان کی آریہ اقوام کو "ہندوستانی آریہ" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بہرحال اس وقت آریہ اور ہندو دونوں لفظوں کی حقیقت و اصلیت پر غور کرنا مدنظر ہے۔

سنسکرت اور فارسی زبان میں ہ اور س کا بدل ہو جاتا ہے مثلاً ہفت اور سپت، یا سوریہ اور ہوریہ، یا سندھو اور ہندو، یا سوما اور ہوما، یا ماہ اور ماس یا دس اور دہ، یا سوم اور ہوم وغیرہ ہم معنی الفاظ میں س والے الفاظ سنسکرت زبان کے اور ہ والے فارسی زبان کے ہیں۔ فارسی زبان میں ہندو کے معنی سیاہ کے ہیں۔ سنسکرت زبان میں سندھو دریا اور سمندر کے لئے استعمال ہوا ہے۔ سام یا شام کے معنی دونوں زبانوں میں سیاہ کے ہیں۔ جن ملکوں میں سورج کی دھوپ تیز ہوتی ہے وہاں رہنے سے انسان کے رنگ میں سیاہی آجاتی ہے بنابریں ایرانیوں نے سورج کا رنگ سیاہ مانا ہے۔ آگ چیزوں کو جلا کر کوئلہ یعنی سیاہ کر دیتی ہے لہٰذا انھوں نے آگ کی اصل رنگت بھی سیاہ مان کر آگ کا ایک نام سم رکھ لیا۔ اسی لفظ سم سے "سم اندر" کا مخفف سمندر بنا۔ سمندر ایک جانور کا نام ہے جو آگ میں پیدا ہوتا اور آگ ہی میں زندہ رہتا ہے۔ آگ سے باہر نکلتے ہی مر جاتا ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ وہ چوہے کی برابر اور چوہے سے مشابہ ہوتا ہے۔ پانی کی عظیم الشان جھیل یا بڑے دریا کو بھی سمندر اسی لئے کہا گیا کہ زیادہ گہرا پانی سیاہ نظر آتا ہے۔ اب بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ سندھو کے معنی سنسکرت میں سمندر یا بڑے دریا کے اسی مذکورہ لفظ سام یا شام کے تصور

بتایا ہے۔ چنانچہ ہندوستان یا پنجاب کا سب سے بڑا دریا خاص طور پر سندھو کے نام سے موسوم ہوا اور اس دریا کا ایک نام نیلاب بھی ہے یعنی نیلا پانی۔ ظاہر ہے کہ سیاہ اور نیلی رنگتوں میں کس قدر مشابہت ہے لہٰذا سندھو کا ترجمہ کالا پانی یا کالا دریا بھی کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال سنسکرت کا سندھو اور ایرانی زبان کا ہندو جس کے معنی سیاہ کے ہیں ایک ہی لفظ ہے۔ رگوید میں ہندوستان کے شمال و مغربی علاقے یعنی سات دریاؤں والے ملک کو "سپتہ سندھو" کہا گیا ہے اور اسی ملک کو ژند اوستا میں "ہپتہ ہندو" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان سات دریاؤں میں سب سے بڑا اور سرحد ایران کے قریب جو دریا ہے اس کو خاص طور پر سندھو اور نیلاب بولا جاتا ہے۔ اس سپتہ سندھو یا ہپتہ ہندو علاقے میں جو غیر آریہ قومیں آریوں کی آمد سے پیشتر آباد تھیں وہ ایرانیوں یا تورانیوں کے مقابلہ میں سیاہ فام، غیر تربیت یافتہ اور نامہذب تھیں اور تمام ایرانی یا آریہ ان کو ہندو یا سندھو کہتے تھے اور اس طرح اس لفظ کا مفہوم کالا آدمی، چور، رہزن اور غلام ہو گیا جیسا کہ فارسی زبان کی لغات میں لفظ ہندو کے یہی معنی درج ہیں۔ زحل سیارے کی نسبت قدیم سے قوموں کا خیال ہے کہ اس کا رنگ سیاہ ہے لہٰذا اس کو "ہندوئے فلک" کا خطاب دیا گیا فارسی محاورے میں چڑیل اور پلید عورت کو "ہندو زن" کے نام سے پکارا گیا ہے۔ جب ایرانیوں یا آریوں کا ایک حصہ پنجاب کو فتح کر کے ہندوستان میں سکونت پذیر ہو گیا تو ایرانیوں نے ان کو بھی ہندو کے نام سے یاد کرنا شروع کیا لیکن ان آریوں نے اپنے آپ کو ہندو نہیں کہا اور ممکن ہے کہ اسی لیے انھوں نے ہندوستان کے قدیم باشندوں یعنی ہندوؤں سے اپنے آپ کو بالکل الگ اور ممتاز رکھنے کی کوشش میں قدیم باشندگان ہند کو ویدوں کی ہوا تک نہیں لگنے دی اور اپنی معاشرت و تہذیب و اخلاق کو بھی ان سے جدا اور محفوظ رکھنا ضروری سمجھا کہ کسی طرح ان پر لفظ ہندو کا اطلاق نہ ہو سکے۔ لیکن چونکہ آریوں کا یہ حصہ جس نے ہندوستان پر قبضہ کیا ایرانی یا تورانی آریوں سے ناراض اور خانہ جنگیوں میں مغلوب اور وطن سے بیدخل ہو کر آیا تھا (جیسا کہ اس کے زبردست قرائن موجود ہیں اور وہ اپنے موقع پر بیان ہوں گے)، لہٰذا ایرانی و خراسانی و بابلی ان کو ازراہ طنز بھی اور ہپتہ ہندو کا باشندہ بن جانے کے اعتبار سے بھی ہندو ہی کہتے رہے۔ ان آریوں نے ایک عرصہ دراز تک اپنے آپ کو ہندو کہلانے سے پرہیز کیا اور یہاں کے قدیم ہندوؤں کو بھی ہندو کہنا ترک کر کے ان کو دسیو، وحشت وغیرہ ذلیل

خلافت سے اور کبھی کبھی ایرانی و بابلی مفتوح قوموں کو جو ابا چڑانے اور ترکی بترکی جواب دینے کے لئے اکثر [illegible] کے معنوں سے ان ذلیل و مقہور قدیم باشندگان ہند کو مخاطب کیا۔ یہی وجہ ہے کہ رگوید سے لے کر منوسمرتی کے زمانے تک ان آریوں نے اپنے آپ کو لفظ ہندو سے بچایا چنانچہ وید یا منوسمرتی میں ہندو کا لفظ آریہ قوم کے لئے قطعاً نہیں بولا گیا۔ بخلاف اس کے انھوں نے اپنے سفید رنگ ہونے پر جا بجا فخر کیا ہے جیسا کہ وید کے گیتوں سے ثابت ہے۔ اس کے بعد جب اور متعدد گروہ اسی طرح شمالی و مغربی ملکوں سے فاتحانہ آ کر ہندوستان میں سکونت پذیر ہوئے اور ان پہلے آئے ہوئے آریوں میں گھل مل گئے تو پھر اس لفظ ہندو میں آریوں کے لئے وہ اذیت رساں اور رنجدہ مفہوم باقی نہ رہا اور جب پنجاب و سندھ کا علاقہ مفتوح ہو کر ایران کی اخمانی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا تو ہندوستان والوں کے لئے عام طور پر ہندو استعمال ہونے لگا۔ اس کے بعد سے ان لوگوں نے خود اپنے آپ کو ہندو کہنا شروع کر دیا اور آجکل تو جیسا کہ اخبارات کے دیکھنے سے معلوم ہوا ہے لالہ ہردیال نے انگلستان میں لفظ ہندو کے متعلق ہندوؤں کو سمجھایا اور نہایت جوش کے ساتھ وعظ فرمایا ہے کہ اپنے آپ کو ہندو کہہ کر تمہارا سینہ از راہ فخر آگے کو ابھر جانا چاہئے۔

اب رہا لفظ آریہ۔ یہ بہت قدیم لفظ ہے جو ایک اس قوم کا نام تھا جس کا ایک حصہ ہندوستان میں آیا، ایک حصہ ایران میں سکونت پذیر ہوا، ایک حصہ بحیرۂ کاسپین کے قریبی علاقوں میں مسکن گزیں ہوا۔ وہاں سے ایک حصہ جزیرہ نما بلقان اور اٹلی کی طرف گیا، ایک حصہ جرمنی ہوتا ہوا انگلستان کے جزیروں تک پہنچ گیا۔ چنانچہ ملک ایران کا نام ہی خود بتا رہا ہے کہ یہ آریا یا آریہ لوگوں کا ملک ہے۔ ہرات کی وجہ تسمیہ بھی یہی بتائی جاتی ہے کہ وہ آریہ قوم کا دار الصدر رہا ہے۔ ملک ایران میں غیر معروف قدیم مخروطی حروف میں لکھے ہوئے ایسے کتبے زمانۂ حال میں پڑھے گئے ہیں جن کی زبان سنسکرت زبان سے مشابہ اور ژند اوستا کی زبان ہے ان میں شاہ گشتاسپ کے نام کے ساتھ آریہ کا لقب موجود ہے۔ قدیم یونانی مورخ سلطنت ایران کے تمام مقبوضہ ممالک کو ایریانہ کے نام سے تعبیر کرتے تھے۔ ہیروڈوٹس مورخ نے ایران کے کئی بادشاہوں کے ناموں کے ساتھ لفظ آریہ استعمال کیا ہے بابلی لوگوں میں مادی قوم کو یونانی مورخ نے آری آئی اور ان کی ایک شاخ کو آریزنتی کہا ہے۔ آرمینیا کا ملک اور آرمینین قوم بھی آریا سے تعلق ظاہر کر رہی ہے۔ کوہ قاف میں

... شمالی یونان یعنی علاقہ تھریس کا پرانا نام آریا تھا۔ آئرلینڈ کی رہنے والی کیلٹ قوم کا قدیم نام ... کے نام سے یہ جزیرہ موسوم ہوا۔ اوستا میں ایک آیت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "آیانہ ویجو ... قدیم زمانے میں کاشت شدہ سرزمین تھی باقی تمام زمین بنجر تھی۔" اس سرزمین کی نسبت لکھا ہے کہ وہ ... تھا۔ غالباً یہی علاقہ کل آریہ اقوام کے آباؤ اجداد کا ابتدائی مسکن ہوگا اور اس قوم نے سب سے پہلے چوپانی کے ساتھ کاشتکاری بھی وہیں سیکھی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ چوپان کو زمین کی محبت نہیں ہوتی۔ وہ جہاں زمین میں اپنے جانوروں کے چرانے کے لئے سبزی دیکھتا ہے وہیں مقام کر دیتا ہے۔ جب وہاں جانوروں کا چارہ ختم ہو جاتا ہے تو اس علاقے کو چھوڑ کر فوراً دوسری چراگاہ کی تلاش میں چل دیتا ہے۔ لیکن کاشتکار کو زمین کی محبت ہوتی ہے وہ جس جگہ کھیتی شروع کر دیتا ہے پھر اس کو چھوڑنا نہیں چاہتا اور ہمیشہ اس پر قابض رہنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے صوبے میں دیکھتے رہے ہیں کہ کاشتکاروں کو دخیل کار اور موروثی بننے کی کس قدر خواہش و آرزو ہوا کرتی تھی۔ اب چند سال سے جدید قانون نے قریباً ہر ایک کاشتکار کو حق دخیل کاری عطا کر دیا ہے لیکن چونکہ یہ دخیل کاری نسلاً بعد نسل جاری نہیں رہ سکتی اس لئے کاشتکار کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئے جو دلیل اس بات کی ہے کہ کاشتکاروں کو زمین کی اس قدر زیادہ محبت ہو جاتی ہے کہ وہ نہ صرف اپنی پوری زندگی بلکہ اپنی آئندہ نسلوں میں بھی اپنی زیرکاشت زمین کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ پس اس قوم نے جب کاشتکاری سیکھی تو زمین کے قبضے کی بابت آپس میں ضرور جھگڑا ہوا ہوگا اس لئے کہ قوم میں تعداد نفوس نے ترقی کی اور زیرکاشت زمین محدود تھی بنابریں طاقتور افراد نے کمزوروں کو مار کر نکال دیا یا وہ خود ہی دوسری قابل زراعت زمین کی تلاش میں وہاں سے نکل گئے۔ اسی شوق زراعت ہی نے اس قوم کو دنیا کے دور دراز علاقوں تک پہنچا دیا۔ جس طرح زند اوستا میں کاشتکاری اور فن کاشتکاری کی تکریم موجود ہے اسی طرح رگ وید میں جا بجا کاشتکاری اور اس کے متعلقات کا ذکر موجود ہے۔ کہیں بیجوں کو خراب ہونے سے بچانے کے لئے برہسپتی سے التجا کی گئی ہے کہیں ہرنوں کے شکار کرنے والوں اور کرخت آواز بھیلوں سے کھیتوں کو محفوظ رکھنے کے لئے امداد چاہی گئی ہے۔ یجروید ادھیائے ۱۲ منتر ۶۷ میں ہے کہ "اے کسانو! تم اناج وغیرہ بونے کے لئے زمین کو پھاڑنے والا جو "پھال" ہے اور اس پھال کو مضبوط کرنے کے لئے

اس کے پیچھے جو لکڑی کی خوبصورت پٹی لگی ہوئی ہے، اس سے اناج پیدا کرنے والی زمین کو پھاڑو۔ اسی طرح تمہارے خوبصورت رتھوں کو چلاؤ اور اپنی حفاظت کرو۔" پھر ایک جگہ اسی وید اور اسی ادھیا میں ہے کہ "اے انسانو! تم ہلوں کو جوئے میں لگا کر کھیتی کی خاطر زمین کو اچھی طرح جوتو اور اس کو اچھی طرح جوت کر اس میں جو وغیرہ اناج بوؤ۔ جو محنت کرنے والا کاشتکار ہے اس کو چاہئے کہ بیلوں کے ذریعہ ہل میں پھال لگا کر زمین کو جوتے۔"

غرض اس بات کے لئے زیادہ وضاحت اور دلائل کی ضرورت نہیں کہ ویدوں کے مطالعہ سے بلا اشتباہ یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آریا قوم ایک کاشتکاری پیشہ قوم تھی اور دودھ کے جانور گائے بکری وغیرہ بھی پالتی تھی۔ بابل و نینوا کی آسوری زبان میں آری کے معنی جتے ہوئے کھیت یا کاشت شدہ زمین کے تھے۔ بنجر زمین کو لاآری کہتے تھے۔ اسی ملک کی کوشی زبان میں ارآرا کے معنی فصل کا کاٹنا ہیں۔ جنسٹر اور مشہور سنسکرت داں میکسمولر کا قول ہے کہ لفظ آریہ سنسکرت زبان کے مصدر آر سے مشتق ہے جس کے معنی کاشتکاری اور زمین پھاڑنے کے ہیں لہذا آریہ کے معنی کاشتکار ہوئے۔ آر چمڑا سینے کے اوزار اور بیل ہانکنے کے ڈنڈے کو بھی کہتے ہیں جس کے سرے پر ایک نوکدار کیل لگی ہوئی ہوتی ہے۔ اس طرح آریہ کے معنی چمڑا سینے اور بیل ہانکنے والا ہوئے۔ اس ملک کے قدیم باشندے چونکہ فن کاشتکاری سے ناواقف اور شکار پر گزران کرنے والے تھے لہذا وہ اناریا یا غیر آریہ کے نام سے موسوم ہوئے۔ چونکہ یہ غیر آریہ سیاہ فام، پست فطرت، چپٹی ناک والے، کم ہمت اور چھپ چھپ کر حملہ کرنے والے تھے لہذا قدرتی طور پر لفظ آریا میں روشن چہرہ، اونچی ناک والے، بلند حوصلہ اور شریف کا مفہوم پیدا ہو جانا چاہئے تھا چنانچہ یہ لفظ ان معنوں میں استعمال ہونے لگا۔

رباعیات

اے بے خبرِ خودی! ہے کیوں سر بسجود؟
تیرے ہی خیالات ہیں تیرے معبود!!
تیری ہی تگ و دو سے ہے ہنگامۂ دہر
ہے تو ہی حقیقت اور تو ہی مقصود!!

اے شعلۂ برق! شمعِ محفل ہو جا!!
غارت گرِ تاریکیِٔ باطل ہو جا!
دل، حاصلِ کشتِ زندگانی ہے آخر
خاشاکِ خرد کو پھونک کر دل ہو جا!

اک سعیِ مدام، جس کا حاصل ہی نہیں
اک جادہ، کہ روشناسِ منزل ہی نہیں
اک خام خیال ہے تمنائے سکوں
اس بحرِ حیات کا تو حاصل ہی نہیں

ہمراہ یہ کارواں لیے جاتا ہے
کیا مجھ کو کشاں کشاں لیے جاتا ہے
اک کشتیِ آوارہ ہوں، طوفانِ حیات
معلوم نہیں کہاں لیے جاتا ہے

کیا کیا نہ کیا! دہر میں کیا کیا نہ ہوا!!
یہ قلبِ طپاں مگر شکیبا نہ ہوا
آخر کو فنا ہوا یہ کہتے ،
افسوس کہ ایسا ہوا، ایسا نہ ہوا

غزل

ہر نفس اف اف ہے ہر دم آہ آہ
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں ہیں تباہ

تیر اور تیرِ نگاہِ بے پناہ
دل کے بچنے کی نہیں اب کوئی راہ

دل کی حالت کیوں نہ ہو اب رو براہ
اس پہ ہے ان کی محبت کی نگاہ

دل کی دنیا کر گئی زیر و زبر
ان کی شرمائی ہوئی نیچی نگاہ

"موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے"
عشق میں نا استواری ہے گناہ

یادگارِ عشرتِ ایامِ وصل
اشک ہے یا آہ، وہ بھی گاہ گاہ

ترکِ الفت پر بھی یاد آتی رہی
ابتدائے آرزو کی رسم و راہ

آج شاید ان کو کچھ آجائے رحم
اس طرف جاتا ہوں با حالِ تباہ

صبر کر لیتا تو آساں ہے جلیل
چھیڑ سے جب باز آئے وہ نگاہ

انشا

محمد یحییٰ صاحب تنہا بڑے ثقہ نقاد ہیں۔ انھیں جیسے بزرگوں کے متعلق انشا نے کہا ہے۔ ع
میں ہوں ہنسوڑا اور تو ہے متطع میرا تیرا میل نہیں۔ بہرحال ہمارے شعرا نے شیخ کی پگڑی دل کھول کر اچھالی ہے۔ آخر شیخ کی زبان کیوں نہ چلے۔

سید انشاء اللہ خاں انشا حکیم ماشاء اللہ خاں کے بیٹے تھے۔ سادات صحیح النسب سے کہے جاتے ہیں۔ پہلے ان کے بزرگوں نے دلی میں سکونت اختیار کی اور رفتہ رفتہ امرائے شاہی میں داخل ہو گئے۔ تاریخ پیدائش معلوم نہیں ہے لیکن آپ مرشد آباد میں پیدا ہوئے جبکہ آپ کے والد وہاں نوابان بنگالہ کے طبیب تھے۔ ابتدائے عمر میں علوم رسمیہ آپ نے اپنے والد ہی سے حاصل کیے۔ شعر کہنے کا بچپن سے شوق تھا۔ آپ اپنے والد سے جو مصدر تخلص کرتے تھے اصلاح لیا کرتے تھے۔ آپ مرشد آباد سے دہلی آئے اور یہاں مشاعروں میں بے حد دلچسپی لی۔ کچھ دنوں تک شاہ عالم کے دربار میں بطور درباری شاعر کے رہے۔ شاہ عالم آپ کی بہت قدر و منزلت کرتے تھے لیکن آپ نے اپنا گذارہ دربار شاہی میں نہ دیکھ کر لکھنؤ کا رخ کیا اور وہاں مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ تھوڑے عرصے کے بعد شاہزادے کے استاد مصحفی کی جگہ پر آپ فائز ہو گئے اور مصحفی اور انشا میں شاعرانہ جنگ و جدل کے بعد سخت بگاڑ ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ کے امراء نے انشا کا ساتھ دیا اور مصحفی سے جو ایک پیر کہن سال شاعر تھے بے اعتنائی اختیار کی لیکن درحقیقت انشا نے اپنے تمسخر اور مذاق سے امراء کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا ورنہ ان کا پایۂ شاعری مصحفی سے برتر نہیں ہے۔ مصحفی کو تمام لکھنؤ کا استاد ماننا چاہیے کیونکہ یہ انھیں کی بدولت ہوا کہ قدیم شاعری ان کے سلسلے سے آج تک لکھنؤ میں جاری ہے ورنہ حضرت انشا نے اس شاعری کی مٹی خراب کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

علامہ تفضل حسین خاں کی وساطت سے آپ نواب سعادت علی خاں والی اودھ کی مصاحبت میں

داخل ہو گئے، اور بہت دنوں تک نواب صاحب کی ناک کے بال بنے رہے لیکن ایک روز بنسی ہنسی میں مخالفت پیدا ہو گئی جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ اپنے گھر کی چہار دیواری میں مقید ہو کر گمنامی کے ساتھ پیوند زمین ہو گئے۔ بسنت سنگھ نشاط کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ۱۲۳۳ھ میں فوت ہوئے۔

خبر انتقال سید انشا	دل غمدیدہ تا نشاط شنفت
سال تاریخ او زجان اجل	عرفی وقت بود انشا گفت

۳ + ۱۲۳۰ = ۱۲۳۳ھ

آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں:-

۱۔ کلیات انشا جس میں کلام ذیل شامل ہے: (۱) اردو کا دیوان (۲) دیوان ریختی (۳) قصائد (۴) دیوان فارسی (۵) مثنوی شیر و برنج فارسی (۶) مثنوی بے نقط (۷) مثنوی شکار نامہ (۸) مثنویات در ہجو زنبور، کھٹمل، پشہ، مگس۔ (۹) مثنوی شکایت زمانہ (۱۰) مثنوی فیل (۱۱) مثنوی در ہجو گیان چند ساہوکار (۱۲) اشعار متفرقہ، رباعیات، قطعات و تاریخہائے متفرقہ (۱۳) چیستانیں اور پہیلیاں مخمس وغیرہ (۱۴) دیوان اردو بے نقط مع رباعیات و نثر بے نقط (۱۵) شرح مائۃ عامل نظم فارسی (۱۶) مثنوی مرغ نامہ۔

۲۔ ایک داستان جو نثر اردو میں لکھی ہے اور ایک لفظ بھی عربی فارسی کا نہیں آنے دیا۔

۳۔ دریائے لطافت۔ اس میں اردو صرف و نحو، منطق، عروض و قافیہ، معانی و بیان وغیرہ کا ذکر ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جو ایک ہندی اہل زبان نے اردو صرف و نحو پر لکھی ہے اور حق یہ ہے کہ عجیب جامع و بے مثل کتاب ہے۔

<u>کلام پر تبصرہ</u> | ہمارے اردو شعرا میں آپ کا نام بھی کافی مشہور ہے بلکہ آپ استادان فن میں شمار کئے جاتے ہیں۔ جب تک آپ کا کلیات میری نظر سے نہیں گزرا اس وقت تک مجھے بھی یہ ہرگز خیال نہ ہوا کہ آپ "بدنام کنندۂ نکونامے چند" ہیں۔ آپ کا کلام تمام کا تمام جو غزلیات کے نام سے درج ہے رکاکت اور سخافت کے آخری درجہ پر ہے اور اگر اس کو ہم دیوان ہزلیات کہیں تو اس میں ہرگز مبالغہ نہ سمجھنا چاہئے۔ کاش سرلوح

یہ دیوان [illegible] لکھا ہوتا تو ہم ہرگز اس سے تعرض نہ کرتے اور آپ کے قصائد اور فارسی غزلوں کے دیکھنے میں وقت صرف کرتے جیسا کہ ہم نے آپ کے دیوان ریختی کے ساتھ برتاؤ کیا ہے کہ اول تو اس کو پڑھا ہی نہیں صرف اوراق الٹے ہیں ایک آدھ شعر ادھر اُدھر سے نظر پڑا بھی تو ہم اس سے یہ کہہ کر گزر گئے کہ آخر کار یہ ریختی ہے۔ اس کی شکایت کیا؟ افسوس ہے کہ ہمارے تذکرہ نویسوں نے آپ کے کلام کے متعلق جو رائے ظاہر کرنی چاہئے تھی اس سے دریغ کیا اور آپ کی شخصیت سے مرعوب ہو کر صاف صاف جو کہنا تھا نہ کہا۔ بالاجمال کچھ کچھ ضرور کہا لیکن ان کے دبے لفظوں سے ہرگز یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ آپ کی غزلیات تہذیب و شائستگی کی آخری حد پر ہیں اور آپ کے خیالات عشق مجازی کے کیا معنی بلکہ بوالہوسی کے لئے بھی باعث شرم ہیں۔ بلند فکری اور علوئے خیالات کی تلاش آپ کے یہاں نہ صرف بے سود ہے بلکہ تجسس کی نافہمی پر دال ہے۔ تخیل جو شاعری کی جان ہے وہ آپ کے یہاں بالکل مفقود ہے۔ اوباش یا عیاش مزاجوں کی جو گفتگو ہو سکتی ہے وہ اس دیوان میں موجود ہے۔ وہی خیالات، وہی طرز ادا، وہی الفاظ، وہی بانکپن، وہی شہد پن پایا جاتا ہے۔ آپ نے اپنے دماغ کو ذرا فکر کرنے یا سوچنے کی زحمت نہیں دی۔ ظرافت اور شوخی نے جو مضمون سجھایا بے کم و کاست شعر کے نام سے اسے لکھ دیا۔ اپنے رتبہ اور خود شاعری کے درجے کو نظر انداز کر دیا۔ مانا کہ آپ کو نواب سعادت علی خاں کی صحبت ملی تھی مگر وہ ہرگز واجد علی شاہ نہ تھا۔ وہ مدبر اور متین بھی تھا اور آخری تاجدار اودھ کی طرح عیاش نہ تھا۔ مانا کہ اس نے یہ مصرع کہہ کر ”پگڑی تو نہیں ہے یہ فرانسیس کی ٹوپی“ سید انشا سے غزل پوری کرنے کی فرمائش کی لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ آپ کی طبع زاد غزلیں اس غزل سے بھی بدرجہا بدتر ہوں اور یہ سب کی سب دیوان میں داخل کی جائیں۔ واجد علی شاہ کے شاہی یا درباری شعراء نے ہرگز شعر کا مرتبہ اس قدر کم نہیں کیا۔ آپ نے تو اردو شاعروں میں سب سے بڑھ کر فحش کہا اور لطف یہ کہ اس کو متین کلام کہہ کر دیوان غزلیات میں شامل کیا۔ ہم نے جو چند اردو شاعروں کے کلام پر اب تک تبصرہ کیا ہے اس میں ان کے رکیک اشعار کا بھی ذکر کیا ہے اور ایک خاصی تعداد کے اندر کسی کے یہاں کم اور کسی کے یہاں بیشتر اشعار رکیک پائے گئے ہیں لیکن آپ کے دیوان کو تو دیکھ کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ آپ کے دیوان میں تقریباً چار ہزار اشعار ہیں اور ہم کو بمشکل تمام بہتر اشعار ایسے دستیاب ہوئے جو سخیف اور رکیک نہیں ہیں۔ اگرچہ وہ

اعلیٰ اشعار میں شمار نہیں کئے جا سکتے تاہم ان کی سید انشا کے عام رنگ سے علیحدگی نیز ان کی عمدگی ان کے انتخاب کی سفارش کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ کوئی شاعر آج تک ایسا نہیں گزرا جس کا سنجیدہ کلام اس قدر سبک اس قدر رکیک اور اس قدر لغو ہو جیسا کہ سید انشا کا ہے۔ شاعری ایسے شاعر سے پناہ مانگتی ہے اور اردو شاعری تو سید انشا کے نام سے کانپتی ہے۔ یہ مثل مشہور ہے کہ ایک مچھلی تمام تالاب کو گندہ کر دیتی ہے۔ عجب نہیں کہ اردو شاعری جو بدنام ہے وہ سید انشاء اللہ خاں خلف میر ماشاء اللہ خاں کے نام نامی اور کلام گرامی کی بدولت ہو۔

آب حیات میں آزاد نے میاں بیتاب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ انشا کے علم و فضل کو ان کی شاعری نے کھویا اور ان کی شاعری کو نواب سعادت علی خاں کی دربارداری نے ڈبویا لعد اس قول کو خود صحیح تسلیم کیا ہے۔ بے شک سید انشا کا علم و فضل مسلم لیکن ہم کو ان کی شاعری تسلیم نہیں ہے۔ وہ نواب سعادت علی خاں کی مصاحبت سے بہت پہلے شعر کہتے تھے۔ انھوں نے دلی میں رہ کر مرزا عظیم بیگ شاگرد سودا کا ناطقہ بند کر دیا تھا بلکہ تمام شعرائے دہلی کو ان کے ساتھ ساتھ لتاڑا تھا۔ پھر لکھنؤ پہنچ کر بھی کچھ عرصہ تک مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم رہے اور حضرت مصحفی سے دست و گریباں رہے۔ شاعری کا ان سے قافیہ تنگ تھا اور شاعری کو ان کے نام سے ننگ ہو چکا تھا جبکہ وہ نواب سعادت علی خاں کے مصاحبوں میں شامل ہوئے۔ لہذا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ انشاء اللہ خاں کی شاعری کو نواب سعادت علی خاں کی صحبت نے کھویا۔ آخر وہ کیا شاعری تھی جو برباد گئی اور جس کا نمونہ بھی باقی نہ رہا۔ گلشن بے خار میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ تحریر فرماتے ہیں "در فنون رسمیہ مہارتے داشت و در ہر فن کوس لمن الملکی بہ آواز تمام می نواخت۔ بر موزونان معاصر از اعتراضات و مطاعن قافیہ تنگ نمودے۔ دیوانے دارد مشتمل بر اصناف سخن و ہیچ صنف را بطریقۂ راسخہ شعرا نگفتہ اما در شوخی طبع و جودت ذہن او سخنے نیست۔"

افسوس ہے کہ نواب صاحب موصوف نے بھی آزاد اور بیتاب کی طرح سید انشا کے کلام کے متعلق صرف یہ کہہ کر کہ "ہیچ صنف را بطریقۂ راسخہ شعرا نگفتہ" اپنی رائے کو اجمال کے ساتھ بیان کیا ہے۔ آپ کے ان الفاظ سے ہرگز یہ مترشح نہیں ہوتا کہ سید انشا کا کلام واقعی پڑھنے کے لائق نہیں۔ یہ سچ ہے کہ آپ کے نزدیک کلام انشا استادان شعر کے طرز پر نہیں ہے لیکن یہ کسی کو خیال نہیں ہوتا کہ اس سے آپ کا

یہی ہو سکتا ہے کہ کلام انشا رکیک و خفیف ہے اور شعرائے نامور کے لحاظ سے بیحد گرا ہوا ہے۔ کلام انشا سے نواب صاحب نے جو اشعار انتخاب کئے ہیں ان میں سے دو چار ہم یہاں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جو ہمارے خیال میں رکاکت اور سخافت سے پُر ہیں۔

آبخورے برف کے انشا کو بھیجے آپ نے — اس کے یہ معنی کہ لو نقشہ تمہارا جم گیا

امرود بھیجے ہیں اس کے خریدار چار پانچ — دے اور ایسے حق مجھے اغیار چار پانچ

بوسے وہ لینے سرو خراماں کو تاڑ باندھ — گر قصد بوسہ ہووے تو گردا سکے پاڑ باندھ

گائیاں سیکڑوں دیں ہانوں جو پالے ہم نے — محنتیں خوب ہی کیں خوب سے انعام لئے

جناب مصحفی نے اگرچہ سید انشا کی ہجو میں کہا ہے لیکن ہرگز اس میں مبالغہ نہیں اور بالکل سچ کہا ہے ع۔ واللہ کہ شاعر نہیں تو بھانڈ ہے بھڑوے۔ ان کی رفتار و گفتار بالکل بھانڈوں کی سی ہے۔ ہماری رائے میں اگر حضرت انشا اس وقت ڈراما لکھتے اور اس فن کا علم ان کو ہوتا تو وہ نہایت کامیاب ڈراما نویس سمجھے جاتے اور انیڈ دنقال بھی ایسے ہوتے کہ باید و شاید۔ ان کا جواب آج بھی ہندوستان میں تو کیا یورپ اور امریکہ میں بھی تلاش کرنے پر نہ ملتا اور وہ نواب سعادت علی خاں کے معتوب ہو کر بھی روزی کما سکتے اور اپاہجوں کی طرح خانہ نشین ہو کر افلاس اور تنگ دستی کے ہاتھوں اپنی لاابالی زندگی کا خاتمہ نہ کرتے اور خسر الدنیا والآخرہ کے مصداق نہ بنتے۔

میر و سودا نے اردو شاعری کو جس بام ترقی پر پہنچایا تھا وہاں سے میر انشا اس کی ٹانگ پکڑ کر نہ صرف یہ کہ زمین پر کھینچ لائے بلکہ اسے قعر مذلت میں دھکیل دیا۔ جرأت نے تو صرف چوما چاٹی ہی کو اپنا کمال سمجھا لیکن سعادت یار خاں رنگین اور انشا نے یہ اور جدت کی کہ ریختہ کے ساتھ ریختی ایجاد کی۔ ایجاد بندہ اگرچہ گندہ۔ اس پرآشوب زمانے میں اگر کسی شاعر نے قدیم روایات کو قائم رکھا اور مسلک شاعری پر استقلال اور ہمت مردانہ کے ساتھ گام زن رہا تو وہ صرف مصحفی ہے۔ ورنہ یہ اردو شاعری جو کچھ ہمیں نظر آتی ہے وہ یہی لکد کوب حوادث کی متحمل نہ ہو سکتی۔ چنانچہ ہماری شاعری میں ہزلیات کا باب اسی زمانے سے فروغ پاتا ہے اور آج تک اپنی سخت جانی کی بدولت قائم ہے۔

حضرت انشا اور ان کے یاران جلسہ کو اگر تیر ذرا بھی موقع دیتے تو وہ ان کی پگڑی اچھالنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ غنیمت ہے کہ اس ابوالشعراء نے ان کو منہ لگایا اور بد دماغی کے پردے میں بیٹھ کر اپنی جان بچائی۔ لیکن انشا کی بے چین طبیعت کب ہار مان سکتی تھی۔ تیر نہ سہی مصحفی سہی۔ غریب مصحفی کا وہ ناطقہ بند کیا کہ جس پر شاعری آٹھ آٹھ آنسو روتی ہے اور پھکڑ پن، فحش اور شہدپن بغلیں بجاتے ہیں۔

آئیے اب آپ دیوان انشا کی سیر کیجئے اور سمجھ لیجئے کہ بنی نوع انسان کے لئے ہمارے شاعر کا پیام بوالہوسی تھا اور بس۔

اگرچہ آپ کے یہاں الفاظ کی کثرت ہے اور صفائی زبان بھی پائی جاتی ہے لیکن قدیم محاورات اور متروکات بھی بدستور قائم ہیں۔ ذیل میں بطور نمونہ چند متروکات لکھے جاتے ہیں:-

ٹک بجائے ذرا، ہے گا بجائے ہے، خماری بجائے مخمور، اون نے بجائے اُس نے، تجھ بن بجائے تیرے بغیر، اجی بالکل متروک ہے اس کا قائم مقام کوئی لفظ نہیں، لے تو بھی بالکل متروک ہے، جوں بجائے جب، جریانہ بجائے جرمانہ، زور بجائے بہت، کبھو بجائے کبھی، بھلا رے بجائے کلمۂ تعجب جو آجکل بالکل متروک ہے، بھل بے اور واچھڑی بھی آجکل بالکل متروک ہیں، ذرہ بجائے ذرا، دوکھا بجائے بُرا کہا ؎

مجھے دوکھا جو کسی نے تو وہ بولے واہ   ایک میرا ہے وہ لاکھوں کی برابر عاشق

بیسوں بجائے بیسیوں، اولینڈ بجائے الٹ، ہیں گے بجائے ہیں، غلطی بجائے اختلاط، ندی بجائے ندی، انھوں کی طرح بجائے اُن کی طرح، تجھ پاس بجائے تیرے پاس، ہو کر کے بجائے ہو کر، تڑپ چھپٹ بجائے سوائے تڑپ، کد بجائے کب وغیرہ وغیرہ۔

آپ کے یہاں بعض الفاظ بھی غلط بندھے ہیں۔ ایسے شخص کو جو دوسروں کی غلطیاں فاش کرنے میں طاق تھا کسی قدر احتیاط سے کام لینا چاہئے تھا۔ بطور نمونہ چند الفاظ لکھتا ہوں:-

طَرَفْ کو طَرْف لکھا ہے یہ درست سہی مگر اردو میں اب استعمال نہیں ہوتا ؎

تجھے انشا اور تو کیا کہوں وہ جہاں میں کوئی بھی عنقا ہے   جو خدا کے نور سے پُر نہ ہو کہ محال دہر میں ہے خلا

کو پھڑکنا باندھا ہے ؎

ہے کاخِ فضل کا ترے یہ عالمِ ارتفاع　　پر کھل نہ پہنچ سکے طائرِ خیال

کا قافیہ 'آہ' کی 'ہ' یا 'اے' کا 'الف' تقطیع سے گرتا ہے ؎

آہ اے بہار کس کو تمنائے باغ و گل　　یہاں دل میں لاکھ، ہاتھ میں ہیں لاکھ داغ و گل

'آہ اے' کی بجائے 'آہے' پڑھا جاتا ہے۔ شاید کہا جائے کہ یہ جائز ہے۔ اگر جائز بھی ہے تو مکروہ ضرور ہے۔ الف کو ہ کے ساتھ حذف کرنا نہایت ناگوار ہوتا ہے۔

تکیے کو تکیۂ باندھا ہے ؎

اس کو مت سمجھئے کچھ خوف و خطر کا تکیہ　　شوق سے سوئیے سر رکھ کے مرے زانو پر

آپ کے یہاں بھی ادق الفاظ کافی ہیں مثلاً تسطیح، تشلیح و تطلیح، تشیح، سطاع، مشعید، ذنب الفار، قنطرا، سماکِ مرمن فلفل، صخرۂ جنّی، احراق، شیر احم، تغرعن، قوارع، یبروج، قور، یرق، زیبق، طاغوت وغیرہ وغیرہ۔ ان الفاظ کی گرانی اظہر من الشمس ہے اور غزل میں ایسے الفاظ ناگوار طبع ہوتے ہیں۔

آپ نے بعض الفاظ ایسے لکھے ہیں جو آج کل گنوار لوگ استعمال کرتے ہیں یا کم از کم ثقات نہیں بولتے مثلاً جھگڑا، سوندھ سانذہ، کمہ پھاٹ، جھڑبدلی، ہنسوڑا وغیرہ۔

آپ نے ایک فارسی شعر کا ترجمہ اپنے شعر میں کیا جس سے فارسی شعر کی عمدگی جاتی رہی ہے جب ترجمہ برا ہو تو اسے سرقہ کہنا جائز ہے ؎

غلط ہے آہ کہ ہے دل کو دل سے راہ نہیں　　کہ تیری چاہ مجھے تجھ کو میری چاہ نہیں

فارسی شعر کیسا اچھا ہے ؎

غلط است آں کہ گویند کہ بدل ہست دل را　　دل من ز غصہ خوں شد دل تو خبر ندارد

بعض الفاظ آپ نے ایسے استعمال کئے ہیں جو بول چال میں تو ضرور استعمال ہوتے ہیں لیکن تحریر اور خصوصاً نظم میں آجکل لوگ نہیں لکھتے مثلاً پھیرو، تہ، تندیلا، کھڑ تیج، اینٹھے گا، کھوسٹ وغیرہ وغیرہ

آپ نے اپنے نزدیک سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرنا بھی جزو شاعری خیال کیا ہے۔ اگر

آپ عمدہ مضامین نکالتے اور قافیے خوب بٹھاتے تو کم از کم آپ کی جولانی طبع کی ضرور داد دی جاتی لیکن آپ نے ردیف اور قافیہ ایسا اختیار کیا ہے جو آپ کے رکیک خیالات کے لئے موزوں ہے مگر اچھے مضامین نہ ایسی ردیفوں اور قافیوں میں کوئی لکھے گا اور نہ لکھے جا سکتے ہیں۔ یہ جدت تو ضرور ہے کہ دیگر شعرا سے آپ کی زمینیں مختلف ہیں لیکن محض اختلاف تو کسی کام کا نہیں جب تک کہ ان میں کارآمد مضامین بھی نہ باندھے جائیں اور شعرائے ماسبق سے بڑھ چڑھ کر علوئے تخیل نہ ہو۔ ذیل میں آپ کی چند زمینوں کے نمونے دئے جاتے ہیں:۔

جبل میں بٹھایا۔ بغل میں بٹھایا۔ پہاڑ عش کیا۔ کیواڑ عش کیا۔ بناوٹ سے غش کیا۔ چیٹ سے غش کیا۔ نبیڑے جا۔ چھیڑے جا۔ باغ ٹھنڈا۔ چراغ ٹھنڈا۔ مال بوسہ کا۔ سوال بوسہ کا۔ بلبل کا منہ چڑایا۔ قلقل کا منہ چڑایا۔ سنگ میں کیڑا۔ انگ میں کیڑا۔ اسی طرح میں فرماتے ہیں ؎

زاہد جو چک جائے تو جوں کرمک شب تاب ۔۔۔ بے بیچ کوئی ۔۔۔ پر تنگ میں کیڑا

چاند نکلا۔ پہاڑ نکلا۔ گہرا پردا۔ اکہرا پردا۔ کوہ قاف کا جوڑا۔ اوصاف کا جوڑا۔ کواڑ خوب۔ پچھاڑ خوب۔ زنداں سے لپٹ۔ اسیراں سے لپٹ۔ رکاوٹ سے لپٹ۔ کروٹ سے لپٹ۔ داغ کو چوٹ۔ زاغ کو چوٹ۔ طرحدار کی گیند۔ دستار کی گیند۔ خاک اینڈ اینڈ۔ تاک اینڈ اینڈ۔ جادو پہ اتنا گھمنڈ۔ گیسو پہ اتنا گھمنڈ۔ پہاڑ کر۔ گاڑ کر۔ نازنیں نہ چھیڑ۔ نہیں نہ چھیڑ۔ زلف رسا کو چھیڑ۔ کافر بلا کو چھیڑ۔ ادب لحاظ۔ رہو بے لحاظ۔ گھونگٹ عاشق۔ چیٹ چیٹ عاشق۔ اوچڑ عاشق۔ دھڑا دھڑ عاشق۔ سمٹ رہے ہوں۔ لپٹ رہے ہوں۔ جھاڑ میں۔ پہاڑ میں۔ گھمنڈ کرتے ہیں۔ ڈنڈ کرتے ہیں۔ آڑ میں۔ پہاڑ میں۔ گڑیاں باغ میں۔ چھڑیاں باغ میں۔ پہاڑ باندھ۔ جھاڑ باندھ۔ موڑ دیکھ۔ مروڑ دیکھ۔ پرے بیٹھ۔ ارے بیٹھ۔ چمپٹ گئے۔ رپٹ گئے۔ گدگداہٹ ہے۔ سجاوٹ ہے۔ کڑی کڑی۔ اڑی اڑی۔ توڑ بیٹھے۔ جوڑ بیٹھے۔ پڑگئی۔ رڑگئی۔ ران میں چلکی۔ جان میں چلکی۔ جوڑے اڑ گئے۔ گھوڑے اڑ گئے۔ رنگ اڑے۔ ڈھنگ اڑے۔ تاڑ توڑے۔ جھاڑ توڑے۔ کڑی مجھ سے لڑی۔ گھڑی مجھ سے لڑی وغیرہ وغیرہ۔

بعض بعض فارسی ترکیبیں بھی کانوں کو ناگوار گزرتی ہیں اور آجکل مروج نہیں ہیں مثلاً ع

بروان ساقی کوثر اسر خم کو پیر مغاں ہلا ع کبھی تو از بہر سیر کیجے بسوئے بیت الصنم نوازش ع نادر ملک

محسن دیباچہ بہن جاہلہ۔

جہاں ہم نے آپ کے اتنے عیوب ظاہر کئے ہیں وہاں ہم پر لازم ہے کہ آپ کی خوبیاں بھی بیان کریں مگر کہاں ہاتھ تو لیکہ عیب او جملہ گفتی ہنرش نیز گو۔

آپ کے یہاں عربی بجے اس صفائی اور بے تکلفی سے اشعار میں کھپ گئے ہیں کہ اب ان کا باندھنا آسان نہیں ہے مثلاً

ع کہ اگر الست بکم تو ابھی کے تو کہیں بلیٰ ۔ ع نہ وہ لن ترانی ادھر کی ہے تاتنی ہی کہ نہ پہچانا

اے عشق مجھے شاہد اصلی کو دکھا لا — تم خذ بیدی وفقک اللہ تعالےٰ

انہیں بھوک پیاس سے کیا غرض وہ جو قید تن سے ہوئے جدا
ثمرجناں انہیں دیویں گے واتوبہ متشابہا

ع ۔ بہت ان کو لکھو ہیں تو والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ ۔ ع لگا القاص سے ہے لایحب القاص کا جوڑا

معنیٔ آیۂ لا اسئلکم سید نا — جو نہ سمجھے تو وہ اسلام کے لشکر میں نہیں
کہوں بتقید قسم لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ — کہ اب ہجر بس اب مجھ میں لے الٰہ نہیں
آیۂ اینما تولو کا — ماحصل خوب کرکے کد دیکھو
پڑھو آگے فثم وجہ اللہ — یعنی اس قول کی سند دیکھو
لیس یداللہ فوق ایدیہم — پیچھے سے پڑھ لو انکو جد دیکھو

اے عشق جلوہ گر ہے خود تجھ میں ذاتِ مولا — والسابحات سبحاً فالسابقات سبقا
سبزا اگر چہ چڑھانا منظور صبح دم ہو — تو بیچے برگ کوئی الناشطات نشطا

آپ کے یہاں مقامی رنگ تو بکثرت موجود ہے اس کا ذکر ہی کیا لیکن مثالاً چند اشعار درج کئے دیتا ہوں :-

دل میں سما رہا ہے یوں داغ عشق اپنے — جس طرح کوئی بھونرا ہووے کنول میں بیٹھا
یا گر عقل نے منہ میں دل بیتاب کا گٹکا — تو جوگی جی دھرا رہ جائے گا سیماب کا گٹکا

گر حکم ہو تو سائیں سلفے کا دم لگا کر   پھسکاروں اور بھی میں سبزی کا ایک کوڑا
عکس لب جاں بخش سے جوں بیر بہوٹی   پھرتا ہے پڑا ایک قدح بنگ میں کیڑا
کپڑے کے پرانگیا میں لگا رادھکا بولی   ہے کشن یہ کاٹے گا مرے انگ میں کیڑا
چل نہ اتریوں میں جھولیں لیں درختوں کی ہوا   چھاگئی کالی گھٹا ہے تیرہ بختوں کی ہوا
جہاں سے تھے راجہ بھرتری جی کنواں بنانے کو وہاں کی نے   زمین کھودی تو ایک جوگی دھرے بھئے سر پہ ناند نکلا
تھورا سے جو محلوں کی ہو کوئی آکھ کی بڑھیا   بنے وہ آکے بوڑھے اور بڑے نداف کا جوڑا
یہ کیوں کر بن کے بن ٹیسو کے پھولوں کے نظر آویں   جو جنگل جی سے جوگی آپ یوں بھاگ کا جوڑا
مہاراجہ جہاں چگتے تھے موتی ہنس کے جوڑے   وہاں کا اب خبری ٹھاکر بنا ہے کاگ کا جوڑا
تمہارے بیلنے اور بیلنے کے غل کرنے کو سن لیوے   نہ دیکھا جن نے جو پیل تلے کے بھوت کا جوڑا

آپ نے ہندی الفاظ بھی نہایت خوبی کے ساتھ باندھے ہیں لیکن شکایت وہی ہے کہ مضمون کچھ نہیں:-

جو لوگ تشریف لے سدھارے عدم کو انکی ملی خبر کیا   سنو اچنبھا کہ جیتے ہی ملا نہ ہم کو سراغ اپنا
جام مئے عشق آنکھ موند پی جب   ہے ایک ہی گھونٹ کڑوا کسیلا
غزل لکھ اب انشا تو ایک اور بھی   کہ یہ قافیے ہیں انوکھے اچھت
دم ذرا سادہ کے لیتے ہیں پھر تری تو ابھی   سوں کھینچے ہوئے لاہوت کو جا سکتے ہیں
مفت میں گل کھا کے تیہا آپ ناحق لڑ پڑے   نرگستاں سے جو میری آنکھیں تڑیا لگ ہیں
گو برگنیش تو ندہی ایسی ہے شیخ کی   نسبت نہ ہووے بھنیں کو جھکے شکم کے ساتھ
دوں دم میں ندا آبادہ اسے چاندنی کو سونپ   رکھے ارتینج جو کہ اسام امم کے ساتھ
دیکھے ترے جلوے کو باہمن کی جو بیٹی بھی   مونہہ سے وہیں کلمہ کو یکبار لگے جپنے

آپ کے یہاں بعض غزلیں مسلسل بھی پائی جاتی ہیں مثلاً
ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے سہ کریم جلد کرم کر کہ ہو مزاج صحیح   برنگ نرگس بیمار ناتواں ہوں صریح

دوسری غزل جس کا مطلع ہے ؎ بہار ہوکے مجسم بوضع بادلہ پوش / ہوئی جو آکے خیاباں میں مجھ سے ہم آغوش

تیسری غزل جس کا مطلع ہے ؎ لہرا دیا صبا نے جو گل سبزہ زار کو / دو ہیں گھٹا نے گھیر لیا چشمہ سار کو

یہ غزلیں جہاں مسلسل ہیں وہاں پایۂ تہذیب سے بھی گری ہوئی نہیں ہیں۔ نہیں معلوم ہمارے یہاں مسلسل غزلوں کے لکھنے کا کیوں رواج نہیں رہا۔ اگر بغیر مطلع کے قطعہ لکھا جا سکتا ہے تو مطلع کے ساتھ مسلسل غزل لکھنے میں کیا قباحت ہے؟

آپ کا دیوان ریختی تو اس قابل ہی نہیں کہ اس کا کوئی ذکر کیا جائے البتہ آپ کے قصائد برے نہیں ہیں۔ اگرچہ ان میں بھی آپ کی ظرافت اور رکاکت کہیں کہیں جلوہ گر ہو جاتی ہے تاہم غنیمت ہیں۔ لیکن کوئی خاص بات ایسی نہیں جس سے آپ کے قصائد وجہ امتیاز حاصل کر سکیں۔

آخر میں آپ کے کلام سے جو صاف اور شستہ اشعار ہم کو نظر آئے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:-

کیوں شہر چھوڑ عابد غار جبل میں بیٹھا ۱ تو ڈھونڈتا ہے جس کو وہ ہے بغل میں بیٹھا

ہر چند کہ عاصی ہوں پر امت میں ہوں اسکی ۲ جس کا ہے قدم عرش معلّے سے بھی بالا

ٹکڑے پہ اسکے صرف نہ بلبل نے غش کیا ۳ چٹ چٹ بلائیں غنچوں نے لیں گل نے غش کیا

کر جبر جہاں تلک تو چاہے ۴ میرا کیا اختیار تیرا

دست جنوں سے اسے دلے ویلا ۵ سونے نہ پائے ٹک پاؤں پھیلا

[1] لگا کے برف میں ساقی صراحی مے لا ۶ جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا

اس ہستی موہوم سے میں تنگ ہوں انشا ۷ واللہ کہ اس سے بمراتب عدم اچھا

دست جنوں سے اپنے گریبان صبر کو ۸ اے عشق تار تار کیا ہم نے کیا کیا

بیتابی دل کے سبب اس شوخ تک انشا ۹ پہنچے ہے بلا واسطہ پیغام ہمارا

نہ کہہ تو شیخ مجھے زہد سیکھ مستی چھوڑ ۱۰ تری پسند جدا ہے مری پسند جدا

---

[1] یہ غزل کلیات انشا میں درج نہیں ہے جو ہمارے پاس ہے۔ آبحیات میں درج ہے۔

مجھے کیوں نہ آئے ساقی نظر آفتاب الٹا ۱۱ کہ پڑا ہے آج خم میں قدح شراب الٹا

چلے تھے حرم کو رہ میں ہوئے اک صنم کے عاشق ۱۲ نہ ہوا ثواب حاصل یہ لیا عذاب الٹا

فقط اس لفافہ پر ہے کہ خط آشنا کو پہنچے ۱۳ تو لکھا ہے اس نے انشا یہ ترا ہی نام الٹا

جو شخص جبہ سا ہو خدمت میں یاں تمھاری ۱۴ کیونکر نہ پیر دہ دیکھے لاہوت کا تماشا

اس سرِ خلوت کی ٹھہر جاتی تو میں اللہ سے ۱۵ واسطے دو دن کے عرش کبریائی انگشتا

زاہد مرے مولا کے اسرار نہیں پاتا ۱۶ غافل اسے کیا یاد ہے ہشیار نہیں پاتا

دل ستم زدہ بیتابیوں نے لوٹ لیا ۱۷ ہمارے قبلہ کو وہابیوں نے لوٹ لیا

جس شخص نے کہ اپنے نخوت کے بل کو توڑا ۱۸ راہ خدا میں اس نے گویا جبل کو توڑا

اپنا دل شگفتہ تالاب کا کنول تھا ۱۹ افسوس تو نے ظالم ایسے کنول کو توڑا

گرچہ مے پینے سے کی توبہ ہے میں نے ساقی ۲۰ بھول جاتا ہوں و لے تیری مدارات کے وقت

بیان ذات کے اوصاف کس سے ہوں انشا ۲۱ صفات جس کی ہیں حاملِ عرش ہیں مبہوت

گر یہ چھٹنے کی خبر سچ ہے تو قیدی تیرے ۲۲ خوب ساروئیں گے دروازۂ زنداں سے لپٹ

اب خیر و عافیت تو لگا مجھ سے پوچھنے ۲۳ اتنا تو بارے نرم ہوا یار کا مزاج

ہے بیاں وہ نخل عشق میں دیوانہ پن کی شاخ ۲۴ جس سے اُگی نہال اویس قرن کی شاخ

ابتدائے دوستی میں دل کو ہے یہ بے کلی ۲۵ کچھ نظر آتا ہے اس آغاز کا انجام بد

گلبرگ تر سمجھ کے لگا بیٹھی ایک چونچ ۲۶ بلبل ہمارے زخم جگر کے کھرنڈ پر

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرتِ انسان پر ۲۷ فعل بد تو ان سے ہو لعنت کریں شیطان پر

مجھے رونا آتا ہے شمع سحر پر ۲۸ کہ بیچاری اب مستعد ہے سفر پر

پیر مغاں کسی کو نہ تو تشنہ کام چھوڑ ۲۹ تحقیق خاص و عام برائے عوام چھوڑ

ہو جائے اگر جہاں فراموش ۳۰ کب دل سے ہو دلستاں فراموش

مطلق نہ آشنائی دنیا یہ کر گھمنڈ ۳۱ ظاہر پرست ہوتے ہیں سب آشنا غرض

سلطنت بیچے ہیں دردکشاں خاک کے مول ۳۲ ہے یہاں سایۂ ہما کا خس و خاشاک کے مول

بھر رہے ہیں یوں پھپولے اس دلِ صد چاک میں ۳۳ آرہے ہوں خوشۂ انگور جیسے تاک میں

دھوم اتنی ترے دیوانے مچا سکتے ہیں ۳۴ کہ ابھی عرش کو چاہیں تو ہلا سکتے ہیں

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں ۳۵ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی ۳۶ تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں ۳۷ نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے سنا انشا ۳۸ غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

گر یار مے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجئے ۳۹ زاہد نہیں میں شیخ نہیں کچھ ولی نہیں

جبتک کہ خوب واقفِ رازِ نہاں نہ ہوں ۴۰ میں تو سخن میں عشق کے بولوں نہ ہاں نہ ہوں

کفالت رزق کی کس سے کسی کی ہو سکے انشا ۴۱ صفت مخصوص ہے یہ تو فقط اس ذاتِ باری میں

حسرت و ارماں یاس و تمنا درد و فراق و رنج و تعب ۴۲ اپنے سر پر اتنی بلائیں ناحق اے دل جھیل نہیں

حرم سے دیر میں یاں آب و دانہ لے آیا ۴۳ بربِ کعبہ مرا اس میں کچھ گناہ نہیں

چھیڑنے کا تو مزہ تب ہے کہو اور سنو ۴۴ بات میں تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو

کوئی اس دامِ محبت میں گرفتار نہ ہو ۴۵ اے خدا یہ تو کسی بندہ کو آزار نہ ہو

ہو جو انشا کو اجازت تو بھرے وہ نالہ ۴۶ کبھی بلبل کے فرشتوں کو بھی جو یاد نہ ہو

گرچہ ہم سخت گنہگار ہیں لیکن واللہ ۴۷ دل میں جو ڈر ہے ہمیں ہے اسی ڈر کا تکیہ

چند مدت کو فراقِ صنم و دیر تو ہے ۴۸ چلئے پر کعبہ بھی ہو آئیں ذرا سیر تو ہے

آئے اٹک کے لگی سانس رلت سے ۴۹ اب ہے امید صرف خدا ہی کی ذات سے

جنوں کے رہ نوردوں کا کوئی لگتا کہیں دل ہے ۵۰ بسانِ گردباد ان کو سدا قطع منازل ہے

ہمصفیرانِ چمن دیکھئے کیا ہوتا ہے ۵۱ آج صیاد پھر آیا قفس و دام لئے

کیا کیا آہِ ناتواں تونے ۵۲ آگ سی پھونک دی یہاں تونے

گالی سہی ادا سہی چین جبیں سہی ۵۳ سب کچھ سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

گر ناز نیں کہے سے بُرا مانتے ہو تم ۵۴ میری طرف کو دیکھیو میں ناز نیں سہی

لب پہ آئی ہوئی یہ جان پھرے ۵۵ یار گر اس طرف کو آن پھرے

پھر کچھ گئے ہوؤں کی مطلق خبر نہ پائی ۵۶ کیا جانیے کدھر کو جاتا یہ قافلہ ہے

بار گراں اُٹھانا کس واسطے عزیزو ۵۷ ہستی سے کچھ عدم تک تھوڑا ہی فاصلہ ہے

جو نسیم صبح لپٹ گئی کسی گل کے دامن پاک سے ۵۸ تو شعاع مہر نے اک چھڑی جڑی اسکو آ کے شتاک سے

اے اشک گرم کر مرے دل کا علاج کچھ ۵۹ مشہور ہے کہ چوٹ کو پانی سے دھارئے

مخدوم پیر مرد جہاں گشت کی نمط ۶۰ اپنا خیال بھی یہ جہاں گرد ہے سو ہے

بولے ہے یہی خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں ۶۱ بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے

یہ کون پھوٹ کے رویا کہ درد کی آواز ۶۲ رچی ہوئی جو پہاڑوں کے آبشار میں ہے

عجیب لطف کچھ آپس کی چھیڑ چھاڑ میں ہے ۶۳ کہاں ملاپ میں وہ بات جو بگاڑ میں ہے

ہزار طرح کی فکریں خراب کرتی ہیں ۶۴ غرض نہ پوچھو کہ انسان کس ترار میں ہے

گھبرائے شور سے دل ہا دل آج دیکھ انشا ۶۵ کہ بے طرح سے پھنسی برق بھیڑ بھاڑ میں ہے

کر بیٹھے وہیں فضل خدا ساز پہ تکیہ ۶۶ جب بن نہ پڑے بات کچھ اپنی تگ و دو سے

مل گئے پہ حجاب باقی ہے ۶۷ فکر ناز و عتاب باقی ہے

یہاں زخمی نگاہ کے جینے پہ حرف ہے ۶۸ ہے دل پر اپنے زخم کہ سینے پہ حرف ہے

غیر کے اک اشارے پر اٹھ گئے میرے پاس سے ۶۹ تس پہ یہ مجھ سے پوچھنا بیٹھے ہو کیوں اُداس سے

سچ یہ آفت تری یہ دھج یہ خوشش اندامی ہے ۷۰ کہ نظر بھر کے تجھے دیکھیں تو بدنامی ہے

غصے میں ترے ہم نے بڑا لطف اٹھایا ۷۱ اب تو عمداً اور بھی تقصیر کریں گے

رونے سے اپنے دل کی تپش گرد ہو گئی ۷۲ دو چار بوندیوں میں ہوا سرد ہو گئی

قاضی جی

رخصتی کی تیاری اور جہیز کا جائزہ

اس مضمون کی چند قسطیں رسالہ ادب لکھنؤ کے جولائی، اگست، دسمبر ۳۸ء اور جنوری، فروری، مارچ ۳۹ء کے نمبروں میں چھپ چکی ہیں۔ افسوس ہے کہ ملک کی ناقدردانی سے ادب جیسا پاکیزہ رسالہ بند ہوگیا اور یہ مضمون ناتمام رہ گیا۔ ہم اس کا بقیہ حصہ جس کا ارباب ذوق کو بہت اشتیاق ہے شائع کرتے ہیں۔

کھانے سے چھٹی ملی، قاضی صاحب کے بھائیوں نے رخصتی کے تقاضے شروع کئے۔ جہیز گھر سے نکلنے لگا۔ جوڑے باگے، خوان، خوان پوش، صندوق، پٹیاں، قفلی، پٹارے، دری، چاندنی، فرش فروش، دیگ دیگچیاں، لوٹے، لوٹیاں، کٹورے، کٹوریاں، گھڑے، مٹکے، مجھولے، لگرے، تتیرے، گھڑونچی، بجھرے، پتیلیاں، رکابیاں، لگنیں، سینیاں، چمچی، سلفچی، آفتابے، مقابے، گلدان، شبودان، اگالدان، حسن دان، گلوری دان، خاصدان، پاندان، منجن دانی، مسی دانی، سرمہ دانی غرضکہ نہ جانے کتنے دان اور کتنی دانیاں وغیرہ وغیرہ سب کچھ تھا۔ قاضی صاحب باہر مسند پر جلوہ افروز ہیں۔ دلھن والے جہیز نکال نکال کر قاضی صاحب کے سامنے ڈھیر لگاتے جاتے ہیں۔ حضرت ان باتیں اگرچہ رفقا سے کر رہے ہیں، مگر کن انکھیوں سے جہیز کا جائزہ بھی برابر ہوتا جاتا ہے اور مصرف صحیح کا تعین بھی ابھی سے دل میں کرتے جاتے ہیں۔ خوش سلیقہ ہونا بھی کیا بات ہے۔ قاضی صاحب کی محنت رائگاں نہیں گئی۔ اس تلاش، اس جائزے میں جو قاضی صاحب نے ڈھونڈھ نکالا اس میں بہت کچھ تنہا انھیں کے لئے باکار نکلا جیسے حقہ کا سامان "لب معشوق" صرف قاضی صاحب کی لب نوازی کرسکتا ہے۔ بی بی صاحب کو عادت نہیں، نہ قاضی صاحب عادت ہونے دیں گے کیونکہ دیہاتی شرفا میں عورتوں کا حقہ پینا ممنوع ہے۔ بہت کچھ بی بی ہی کے لئے ضروری ٹھہرانا پڑا جیسے چھوٹے کپڑے۔

فرض کرو قاضی صاحب اگر پہن بھی لیں تو اس کی خلا میں کیا کریں گے۔ اس لئے بیکار ٹھہرا۔ یا جیسے مجھے پانچوں کا پجامہ، شاہی میں اگرچہ مردانہ وضع شرفا میں داخل تھا، تذکیر و تانیث کے بکھیڑے نہ تھے مگر اب متروک ہے۔ انشاء اللہ قاضی صاحب اپنے کو مذکر سمجھتے ہیں پہننے سے رہے۔ مگر زیادہ حصہ دونوں کی "رفع حاجات" میں مشترک قرار پایا۔ مثلاً مثلاً پیخانے کا لوٹا، دونوں طہارت کر سکتے ہیں، پیخانے کی چوکی، دونوں کے لئے "بلا خطرہ اجابت گاہ" ہے۔ پلنگ پر دونوں برابر برابر سو سکتے ہیں۔ لحاف میں جوڑے کا جوڑا ملفوف ہو سکتا ہے۔ سرمہ دانی دونوں کو تکریم سنت کے قیام کا موقع دیسکتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ البتہ ان سب چیزوں میں سب سے پہلے جو شے قاضی صاحب اشتراک مصرف میں لائیں گے وہ پلنگ ہے۔ اس لئے اس کا جائزہ بھی قاضی صاحب نے بنظر غائر لیا۔ جتنا غور کرتے ہیں کیا دیکھتے ہیں، نرم نرم توشک، اس پر سفید چادر، نئی روئی کا چھپا ہوا لحاف، گدگدے تکیے، کھنچا پلنگ۔ قاضی صاحب کے خواب میں بھی کبھی ایسا بستر نہ آیا تھا، آج اس پر آرام مع دلارام کے خیال سے "شغال دل" قبل از وقت رال ٹپکانے لگا۔ باچھیں کھل گئیں۔

دلھن کی رخصتی

جہیز گھر سے برآمد ہو چکا۔ قفس ڈیوڑھی میں لگائی گئی۔ قاضی صاحب کی طلبی اندر ہوئی۔ ڈومنیوں نے "بابل" شروع کی تھی ع بابل مورا نیہر چھوٹا جائے۔ ابھی ابھی دو ہی ایک کڑیاں گانے پائی تھیں کہ حضرت اندر داخل ہوئے۔ دلھن کے پلنگ کے پاس پہنچ کر رکے۔ بابل خود بھی سننے لگے۔ سب عورتیں بابل سن کر اپنا اپنا وقت، اپنا اپنا زمانہ یاد کر کے "گریۂ شادی" میں ساون بھادوں برسا رہی ہیں۔ اللہ رکھے ایک تو قاضی صاحب کا "مزاج شاعرانہ" طبیعت گداز تھی ہی، اس پر زنانخانے کی ہوا جو لگی، پھر تاب ضبط کہاں، سب عورتوں کے ہمنوا ہو کر چھاجوں برسے۔ بارے ڈومنیوں کی بھول کی بدولت "بابل" ختم ہوئی۔ عورتوں نے بھی ضبط گریہ کیا۔ حضرت کے بھی آنسو پاک کئے مگر ہنوز اثر باقی ہے یعنی بسورر ہے ہیں۔

حمالی عروس

بابل ختم ہوئی تو بڑی بوڑھیوں نے کہا۔ میاں نوشاہ بنے، بسم اللہ کرو، خدا تم کو اسی طرح

پر وعظ نصیب کرے۔ قاضی صاحب ابتک اثر رقت سے حواس باختہ، یہ ہوش کہاں کہ اپنے قلعی گر
کا اندازہ اور دلھن کے پانچ ہاتھ لمبان کی جانچ پڑتال کرکے ہاتھ ڈالتے۔ بلا سوچے سمجھے جاسے
ن گردن جھکا کر بوڑھیوں کے کہنے کو خدائی فرمان سمجھ کر حالی عروس میں منہمک ہی تو ہوگئے۔ اب ننھے
ہاتھ میں جتنا پسیل سکے بقیہ عروسی مستحکم گرفت کرکے لگے ہُمک ہُمک کر زور لگانے۔ دو چار زور ہ،
میاں خویش، کوہ شکن مارے مگر لنگر بھاری تھا۔ قاضی صاحب کے "قد و قامت" "قوت و طاقت"
بالاتر نکلا۔ گو ہمت شادی ابھارتی رہی اور قاضی صاحب ٹھہر ٹھہر کر زور لگاتے رہے مگر وہ ٹسنا تھا نہ
سی اب سمجھے کہ کہیں یہ "بھاری پتھر" چوم کر چھوڑ نہ دینا پڑے۔ مایوسی کا پوڈر رخ قاضی پر پھرنے لگا۔
سرت بوڑھیوں کی جانب نگراں ہوئے۔

بوڑھیوں کی سفارش

بڑی بوڑھیوں نے جو قاضی صاحب کی یہ نبگرمی گاؤزوریاں دیکھیں اور اس پر یہ "ناکامی" قلق،
سے بیقرار ہوگئیں۔ دو ایک "جنگی، مضبوط" بی بیوں کو جو پاس ہی کھڑی ہوئی تھیں ملامت کی "ارے
ب دیکھ رہی ہو۔ لڑکا تھکا جاتا ہے اور تم سہارا نہیں دیتیں" غرض کہ سات پانچ کی لاٹھی اور کسی کی
نیں "عروسی بورہ" چار پانچ عورتوں نے اُکسایا، قاضی صاحب نے بھی "ہمک، ہمک کر زور لگایا۔
زیادہ حصہ اپنے ہی اوپر لادا، اِدھر اُدھر سے عورتوں نے سنبھالا۔ خدا خدا کرکے بلا کسی حادثہ کے ہر طرح
محفوظ یہ بارِ عظیم محبت" ہانپتے، کانپتے" گرگر کر سنبھلتے، اور محبت کی گراں گٹھری سنبھالتے، تھوڑی دیر کے
ضیق النفس میں مبتلا، جوں توں کرکے قاضی صاحب نے قفس میں لا ڈالا۔ قفس میں رکھ کر دم راست ہوئے
ن سانس ٹھہری۔

قاضی صاحب کی واپسی گھر کو دلھن بیاہ کر

ڈیوڑھی سے باہر آئے۔ "پونی" بے آب و گیاہ، "بہیئت اولیٰ" بلکہ اس سے کچھ حالت "بتر"

"منظر حالی" قاضی صاحب نے "بہ طرز قدیم" شہسواری فرمائی۔ اسی طرح "دست رفتار کی" "ہمکا نیاں" دبیاکھیاں، وہی کپڑے کے لونڈے کی "کشاکش لجام" وہی "پونی مذکور" کے نحافت و نقاہت بھرے نخرے، وہی بہ تخیل قدیم رفتار سے گریز، آگے آگے باجا گاجا، اس کے پیچھے جہیز، اس کے بعد "عروسی ڈولا" اس کے پیچھے "بچے کھچے" باراتی، سب کے پیچھے "پونی" قاضی صاحب مع قاضی صاحب" ضرب چوب سستی کے "بل" پر پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا۔ قاضی صاحب "حسب دستور نوشاہاں" شش جہتی بارش سلام فرماتے جس سے ذی روح، غیر ذی روح، زمین، آسمان، شجر، حجر، حتیٰ یہ کہ مکانات راہ کے در و دیوار بھی مستثنےٰ نہ رہے رواں ہیں۔ "الحمد للہ خیر صلا" سے دلھن بیاہ کر گھر پہنچے۔ باندازِ قدیم نزول فرمایا۔ غریب پونی حالی کی بیگار سے چھوٹ تو گیا مگر عمر بھر کے لئے "از کار رفتہ":

قاضی صاحب کا دلھن اتارنا اور رونمائی

فنس ڈیوڑھی میں لگائی گئی۔ دلھن اتارنے کے لئے "عورتوں کا ٹھٹھہ" دروازے پر لگا ہے۔ قاضی صاحب "لاگو جانور" کی طرح دوڑ کر پھر فنس کے پاس پہنچے اور پھر حمالی عروس پر مستعد ہوئے۔ "دلسوانی امداد و اعانت" اور سابق کی "یاد گرفتہ" ترکیبوں سے دلھن اٹھا کر "مقام مقصود" پر رکھ آئے۔ عورتوں نے دلھن کی "رونمائی" کی رسم میں حتی الامکان دل کھول کر قاضی صاحب کے "زمانہ اسلاف" کا بشتینی قرض حسنہ بے باق کیا۔

قاضی صاحب کی کھیر چٹائی

رونمائی سے فراغت ہوئی تو قاضی صاحب کی کھیر چٹائی کے لئے اندر طلبی ہوئی۔ کہنہ سال مشاطہ نے دلھن کا ہاتھ پھیلا کر اس کی ہتھیلی پر تھوڑی سی کھیر رکھی اور "کھیر کھا بتے کھیر کھا" والا مجرب منتر منمنا سمنا کر "یک جان دو قالب" کرنے کے لئے پڑھنا شروع کیا۔ انشاءاللہ سات مرتبہ اس عمل کی تکرار ہوگی۔ قاضی صاحب اس وقت زیادہ تر مشاطہ کے "بے محل بخل" اور کسی قدر اپنی "نوشاہی حیا" سے دل گرفتہ اور متامل

تھے مگر کچھ تو مشاطہ کا کھیر کھا بنے کھیر کھا "گا گا کر ترغیبیں دینا اور کچھ گاتے ہوئے آنکھوں سے "حیا شکن" "کمیونش" اشارے کرنا اور سب سے بڑھکر دلہن کی ہتیلی پر کھیر رکھے ہونے سے "بیک کرشمہ دوکار" یعنی کھیر کھانے کے ساتھ ہی متواتر "بوسوں" کے چاٹ کے خیال نے کچھ ایسا گڑبڑایا کہ "خودی" اور "خود داری" نے اپنے کو "بے خودی" پر قربان کر دیا۔ اب قاضی صاحب "سر بڑھا بڑھا کر" بلا منت دست" صرف "زبان" کی حرکتوں کے "سہارے" کھیر اڑانے میں "معروف" ہیں اور اس شدت سے "معروف" ہیں کہ مشاطہ کھیر رکھنے بھی نہیں پاتی کہ ان کے "سروزبان" کی "سرعت حرکت" کبھی کبھی خیالی ہی مزے لے کر پلٹ آتی ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے کھیر اگر سات مرتبہ رکھی گئی تو آپ نے کم سے کم چوبیس بار ہتیلی کو چاٹا اکیس مرتبہ پھر بھی بڑھے رہے۔

نماز عاشقاں اور باراتیوں کا شکریہ

کھیر چاٹ چکے۔ بڑی بوڑھیوں کو نماز عاشقاں یاد آئی۔ قاضی صاحب سے تقاضا ہوا کہ "میاں بنے" دو رکعت نماز شکرانہ تو دلہن کے دامن پر ادا کر لو۔ قاضی صاحب "کھیر آلودہ" "چپ چپا" منہ پاک کر رہے تھے "لگے ہاتھوں" بقول دیہاتیوں کے وضو بھی "بنا لیا" اور "ہم خرما اور ہم ثواب" کے مزے لوٹے چلے۔ ایک بی بی نے دلہن کے دوپٹے کا دامن فرش پر پھیلایا۔ نماز، اور پھر دلہن کے دامن پر، اللہ اللہ، نہ جانے کن کن منتوں، مرادوں سے یہ وقت نصیب ہوا تھا۔ ہمارے قاضی صاحب کا تہیہ تو ایک ہی سجدہ میں عمر تمام کر دینے کا تھا اور ایسا ہوتا بھی مگر باہر احبا، اعزہ، برادری والوں کا مجمع، جو اس گاڑھے وقت میں، آڑے آ رہے تھے، ان کا شکریہ ادا کرنے کے خیال نے اس ناحق، جاں بحق ہونے سے روکا اور قاضی صاحب نے اس قدر پھرتی سے نماز عاشقاں کا دوگانہ ختم کیا ہے کہ اس مدت میں مداری صاحب کا "ڈگڈگیل بندر" اپنی آموختہ ریاضت ہرگز پوری نہیں کر سکتا۔ مختصر یہ کہ اس طرح سے اللہ میاں کی نماز کو ٹال کر، شادوں شاد، نہالوں نہال، ہنستے مسکراتے باہر آ کر اعزہ، رفقا، باراتیوں سے جو مبارکباد مل رہی ہے اس کو دماغ میں ذخیرہ کرتے جاتے ہیں اور ایک ایک کا گڑگڑا گڑگڑا کر اس گاڑھے وقت

میں کلام آنے پر اظہار تشکر کرتے ہیں اور نہیں تھکتے ۔

قاضی صاحب چوتھی کھانے جاتے ہیں

قریب شام قاضی صاحب دلہن بیاہ کر گھر پہنچے تھے، تاریکیٔ شب بڑھنے لگی۔ یوم مسعود نیک تاریخ گزر جانے کے خیال سے دلہن والے متقاضی ہوئے۔ قاضی صاحب نے بھی تائید کی کہ آج ہی چوتھی کے جانے کی رسم ادا ہونا چاہیے۔ بارات پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ایک ہی قصبہ کا تو واسطہ تھا، چند منہ بولے سالے (اس لیے کہ قاضی صاحب کا کوئی اصلی خسر پورہ آج تک وجود میں نہیں آیا)، جو پہلا لیے آدھمکے ۔ حضرتنا کی ابھی باہر ایک پلنگ پر نشست تھی، احباب کے مجمع میں گل افشانیاں کر رہے ہیں، اتفاقاً وہی حکیم صاحب جو اخلاص میں تھے پہلو میں ہم نشین تھے۔ اندرونی جذبات کے بھونچال میں ان کی حاضری قاضی صاحب کو غنیمت معلوم ہوئی بلا تامل ہاتھ بڑھایا۔ انھوں نے نبض پر ہاتھ پر رکھا۔ اب حضرتنا کا استفسار پر استفسار ہے کہ بھئی میرا کیا حال ہے۔ وہ عرض کرتے ہیں کہ حضت (حضرت)، اور تو کچھ میری سمجھ میں آتا نہیں، اتنا جانتا ہوں کہ رگوں میں بجائے خون، بجلیاں کوندرہی ہیں، جواباً فرماتے ہیں لاریب، آمنا، صدقنا، مگر اس کی وجہ اس وقت طبیب صاحب کا ناطقہ بھی 'خود رگل' تھا۔ کیا کہیں، کیا نہ کہیں، اتنا ہی زبان سے عرض کیا کہ وجہ، سبب، علت، غائت تو حضرت ہی مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ عرض کچھ تم سمجھے کچھ ہم سمجھے ہو کر یہ قضیہ طاق نسیاں پر یوں رکھا گیا کہ کہاروں نے حسب عادت غل مچایا "ڈیوڑھی میں چوپہلا لگا ہے"۔ قاضی صاحب گوش برآواز تھے، ہوشیار ہو کر جلد جلد چوتھی میں چلنے کی تیاریاں شروع کردیں، بارہ ابرن، سولہ سنگار، آراستہ پیراستہ، لباس ہنی مون سے مُشتوٹھ، بالکل ریڈی ہو کر نکلے، ادھر دلہن سوار ہوئی۔ کہاروں نے چوپہلا اٹھایا، ادھر قاضی صاحب مع رفقار دنبال غش ہوئے اور اسی تاریکیٔ شب میں کہاران صبا رفتار کے نقش قدم پر قدم جماتے، سنگ ہائے راہ سے الجھتے، ڈگ گئے، ڈگمگاتے، خاک راہ یار کو آنکھوں میں جا دیتے، گرد قدم کہاران کو طوطیائے چشم بناتے، کبھی کبھی شدت افتادگی میں سجدۂ تعظیمی، بی بی صاحب بکا ادلغزاتے، رشتۂ زوجیت جس کا "کانکشن" چوپہلے سے ہے، گلے میں ڈالے اسی کے بل پر کھنچتے ،

گھسیٹتے رفتار کو ڈور میں فرانگوں شکست دیتے "ابھی پورے پونے دس تھے کہ "بہشت دالاما" میں داخل ہوگئے۔ گو "تکان گریز" رفتار بے امتیاز نکالو ہوئے غیر عادی سے قاضی صاحب کی ننھی سی تنکی تو ندھوکنی بن گئی پر پہنچتے ہی ہاتھوں ہاتھ لے لئے گئے۔ حضرتنا کی رسید پر سسرال والوں پر جو بوکھلاہٹ غیر مقدم کی سواری تھی اس نے قاضی صاحب کے اس فوری دمہ کے دورے میں مبتلا ہو جانے پر کسی کا خیال نہ جانے دیا۔ فی الحال ایک گوشۂ فرش پر شکن غیر دوی کر رہے ہیں۔ آمد رفت نفس کی سرعت میں بتدریج کمی شروع ہو چکی تھی مگر پھر بھی باقی تھی کہ کسی قدر تاخیر سے رفتار پہنچے۔ پردۂ شب نے جو آثار نکالو حضرتنا پر طاری وساری تھے ان کی ستاری بہت کچھ کی، مگر سانس کی "بیتکاروں" نے حضرتنا کے کسی بلائے مُبرم سے دوچار ہونے کی خبر دے ہی دی اور احباب کو استفسار پر مجبور کر ہی دیا۔ سب نے متفق اللہجہ ہو کر کہا "قاضی صاحب خیر تو ہے، کیا حال ہے!" فرمایا "الحمد للہ" ع بر سر فرزند آدم ہرچہ آید بگزرد" قاضی صاحب اتنا ہی جملہ کہنے پائے تھے۔ وقت زیادہ آگیا تھا۔ رات بھیگ چکی تھی۔ اب پورے دس بجے تھے۔

چوتھی کے کھانے

سسرال والوں نے دسترخوان بچھایا۔ "کندوری" کے "باقیات الصالحات" کھانوں کے علاوہ ساس، سالیوں، سلہجوں نے اپنے اپنے ہاتھوں کے مزے چکھانے۔ حضرتنا کے رجھانے کی خاطر جو جو پختیں کی تھیں ان کی بوقلمونی اور رنگارنگی سے دسترخوان صرف نمونۂ گلزار نہیں بلکہ قاضی صاحب کی آرزوؤں کے غنچے کی طرح بچی کھچی کندوری میں غیر معمولی اضافوں سے کھچا کھچ بھرا بھی ہے، تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ حضرتنا مع رفتار گرد دسترخوان جمے، دست شوئی ہوئی۔ قاضی صاحب نے اب گہری گہری نظروں سے کھانوں کے رنگ وروپ کو دیکھ کر ان کے مزوں کا اندازہ لگایا، غالباً جس کے خیالی مزے زبان پر بھی آنے جانے لگے، اس پر طرہ یہ کہ دل ہی دل میں ان کی تعداد کا شمار بھی شروع کر دیا۔ اب سنئے کہ غذاؤں کی کثرت تعداد کے ساتھ ان کی نفاستیں، ان کی خوشبوؤں کی لپٹیں آپ کی ذوقِ غذائی، طعام تلاشی شہوت صحیح معدی، مناسب موقع سسرال والوں کا اصرار، دمبدم بسم اللہ کی پکار بڑھانے

ویسے رہی ہے اور ہمارے حضرت کا تحمل بھی عنان گسیختہ، "ذوق ما لا یطاق" ہوتا جارہا ہے گوارش و رغبت تمام آمادہ مستعد بھی ہیں کہ "ہر چہ بادا باد" مرغی اور رجسٹ والی کارروائی جاری کریں مگر پھر بھی کچھ ایسا ہے جس سے حضرت کی طبع عالی کا "خورندہ ٹٹو" "سندا" پڑا ہے۔ سب کا خیال ہے کہ جبر یہی کیوں نہ ہو قاضی صاحب روٹھے ہیں۔ حضرت یہ روٹھنا کیا، اس وقت یقیناً قاضی صاحب کی حالت قابلِ رحم ہے۔ وہ غریب اس "تماشہ" معنوی رسم کی جان کو جو فی الحال عناں گیر دست، دہانی چھینکا بن کر صحیح جذبات خورندگی کا "ملیامیٹ" "خون ناحق" کر رہی ہے، رو رہے ہیں۔ گریۂ ناکردنی کرنی تھی اس لئے کہ جو تھی یہ روٹھنا اور وہ بھی تادیر ضروری ہے۔ یہ رسم یوں ہی ہوتی آئی ہے، "طلب نفع" اس کی تاخیر ہی میں مضمر ہے اور یہ بھی تھا کہ قاضی صاحب اب تک بے شادی کے ہر قانون پر ایک "امن پسند" "تابع آئین" کی طرح عامل رہے، نہ اچھو بھرا، "نہ اچھو بھرا" اُدھر ہٹے۔ اس رسم میں "یئرڈ ڈِس اُوبیڈینٹ" بنکر وائلنس کیوں کر کریں، ہاں ایک بات ہے، اتنے کھانے اور "ایسے کھانے" اور اس پر ستم یہ کہ "آنکھوں کے سامنے" (جن کی خاطر آپ کا بیشتر حصۂ عمر "تُور" ہی میں گزرا۔ جن کے لئے کوئی عزیز، کوئی دوست، کوئی آشنا، کوئی شناسا، حتیٰ کہ گاہے گاہے غیر شناسا بھی چار دانگ ہند میں ایسا نہ بچا کہ جس کو بادل خواستہ یا ناخواستہ، بطلب یا بلا طلب آپ کا "شرف میزبانی" نہ نصیب ہوا ہو) اب خواہش خورندگی کی لپک اور للک اور پکاوٹوں کے "اینک" میں جو گتھم گتھا اور گھمسان پڑے ہیں ان کی بے چینیاں اور بے قراریاں دیدنی ہیں۔ بے کل ہو رہے ہیں، جماہی پر جماہی نہیں آتی، نہیں معلوم "کس خیال" میں "منہ کھول کھول کر" رہ جاتے ہیں، جماہی کے ساتھ پانی منہ میں بھرا آتا ہے۔ "اس روٹھنے کی لعنت پر" "آخ تھو" رابہانہ ساخت سے اگالدان پر کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد سسرال والوں کے اصرار میں جس قدر ترقی ہے اسی قدر آپ کی بے چینیاں بھی آپے سے باہر ہیں، غرضکہ حال کیا، بے حال ہیں۔ "دل کی تو اللہ جانے" ظاہر میں قاضی صاحب کھانا دیکھتے ہیں اور ٹھرتے ہیں، بڑھتے ہیں اور گھٹتے ہیں، پھیلتے ہیں اور سکڑتے ہیں، کھنچتے ہیں اور سمٹتے ہیں، اُبھرتے ہیں اور جمتے ہیں، کسمساتے ہیں اور رہ جاتے ہیں، ابھی کسی پہلو تھے، کہ نیا پہلو ڈھونڈھا، اس پہل تھے، کہ اس پہل رکھے۔ یہ زانو تھا کہ وہ زانو بدلا، "اضطراراً" ہاتھ سوئے

مقصود از سوال کہ کسی خیال نہ کے آتے ہی کھنچا۔ رفقا بھی، یہ گھر کا خیال، آداب خورش کی جکڑ بندیاں، لحاظ ناموس میزبان، پاس ہمراہی حضرت، اہمیت موقع کے مُسکتے (چھینکے) منہ پر چڑھائے "جبری تعاطعہ جوعی" کئے اپنی اپنی جبینوں کے بے چین، نبو کا ڑے (مُر بھکے) پونیوں کی لگامیں کھینچے تانے حضرتنا سے ہمعناں ہیں اور آپ کے ان میمونی حرکات کے فقط تماشائی نہیں بلکہ صبر کی بھاری سلیں چھاتی پر رکھے، مقاطعۂ جوعی کے گراں تیمر پٹیوں سے باندھے آپ سے لیے جمے ہیں سسرال والوں کا اصرار بڑھنے لگا "قاضی صاحب بسم اللہ، حضرتنا نوش فرمایئے" مگر قاضی صاحب کی گردن بخوف قانون شکنی، مجبوراً نفی و انکار پر برابر جنباں ہے، ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ بی طہورن رشتۂ زوجیت میں منسلک ہو کر بوقت رخصت دولھا کے ساتھ جانے کے لئے "مداری" کے طلب اقرار پر جو آموختہ انکار بذریعہ "سر" ظاہر فرماتی ہیں اس میں یہ مزا کہاں جو قاضی صاحب کی چوتھی خوری کے انکار ڈگڈگاتے سر ملتی گردن میں ہے۔ گرچہ بی میمونہ ایک ناقص ہیولیٰ قاضی صاحب ہی کی جنس کی ہیں مگر ہمارے حضرت کو جو ارتقائے کامل حاصل ہو چکا ہے وہ کہاں سے لائیں گی اور اگر فرض محال، محال نباشد تحم تاثیر صحبت کا اثر جا ل ہمنشیں کے فیض، مداری صاحب کے "گنگہ" کی تربیت سے انسانی عادتیں سیکھ بھی جائیں اور اس نقص کو کسی طرح پورا بھی کرلیں تو پھر فرمایئے کہ یہ شاعرانہ مزاج کہاں سے پائیں گی، سسرال والوں نے خالی خولی اصرار بے کار جاتے دیکھ کر کھنکتے چھنکتے روپیوں کی تھیلی کو درمیان میں ڈالا، اب وہ بھی سسرال والوں کے اصرار میں ہم زباں ہے۔ قاضی صاحب نے بھی اب کان بچپائے (کان کھڑے کئے)، گو ابھی تک انکار کے تھرمامیٹر کا پارہ جس ڈگری پر پہنچ چکا تھا اسی پر قائم ہے، ادھر روپیوں نے "کوتا گھار" مچائی، لمحہ بہ لمحہ سسرال والوں کے اصرار کی طرح دو دو ایک ایک کر کے بڑھنے لگے۔ "زر بر سر فولاد نہی نرم شود" قاضی صاحب کا انکار بھی ریشۂ خطمی کے لعاب کی طرح بنے، موم ہو کر پگھلنے لگا۔ خنک جنباں کی "سریع دوری حرکت" بطی ہونے لگی، اب کبھی کدھار دوری جھٹکا، دیر، دیر کے بعد ہو جاتا ہے، غرضکہ کیش پرس نے کشاکش اقرار، قید انکار سے نکال کر قاضی صاحب کا دست و دہانی لگام وسکہ (چھینکا) ترڑایا، سوکھے دھانوں پانی پڑا، رکی ہوئی طبیعت میں روانی ہوئی، گنگاجی میں طغیانی آئی، گھما گھر اکا

ہنڈیا، سیلاب خورش میں ماحضر سے متزاد، سسرال والوں کے توقع و امید سے کہیں زیادہ بھاؤ آئے، مُحتی سی ٹیک ہول کا کوئی کونہ کترا ایسا نہ بچا جس میں جاؤ بے جا، تول بے تول، ناپ بے ناپ تلے اوپر، اونچے سیدھے، الٹے پلٹے، لقمہائے تر بند نہ کئے گئے ہوں۔ اس دنیا میں خالی ظروف بدقت بچے، مگر قاضی صاحب کے دل سے کہیں زیادہ صاف "بی پڑوسن" یعنی ذابح البقر کی رجسٹری شدہ "منظور نظر" بہ کرایہ یا بپاس مروت یا بادلے حق ہمسائگی، فی الحال سسرالی ماماجی زحمت ظروف شوئی سے آج کے دن بالکل محفوظ اور مطمئن ہیں۔ رفقا نے بھی حضرت کی معیت میں مقاطعہ جوعی تنکست کرکے مال مفت کے لئے دل بے رحم بن کر اپنی اپنی اونچی نیچی خندقیں، گڑھیاں، چقر، نالے، نالیاں، کھوے، ڈبرے، بھرے پاٹے۔

قاضی صاحب حجلۂ عروسی میں جاتے ہیں

ادھر تو قاضی صاحب مع رفقا، بحر طعام میں شناوریاں دکھا رہے ہیں، اُدھر سالیوں سلہجوں نے لپ جھپ برقی سرعت کے ساتھ "حجلۂ عروسی" ٹھیک ٹھاک کر دیا، فقط قاضی صاحب کے پہنچنے کی دیر ہے، سب تیار ہے۔ پورے گیارہ بجے تھے کہ قاضی صاحب نے جملہ رفقا کو "نان کہ خوردی خانہ برو" کی عام ہدایت دے کر "ہفت خوان" پر چڑھائی کی ٹھان لی۔ چل تو پڑے مگر "بادل ناخواستہ"۔ آئیں یہ کیا، ٹائیں ٹائیں پھش، یا یہ شوراشوری، یہ زور، یا یہ بے نمکی، یہ پھسپھساہٹ۔ نہیں کوئی بات ضرور ہے ورنہ قاضی صاحب رُکنے والے اسامی نہیں۔ دو چار دن سے برات کے ہنگاموں میں دوڑے دھوپے، تھکے ماندے "سسرالی" لڑکی کا بیاہ کرکے، گھوڑا نہیں گھوڑی بیچ کر، مردوں سے شرط لگا کر دیکھیے بجائے سوچے سمجھے، معاملہ سے مطمئن، ادویۂ سریع التاثیر کے جوہروں کے ظہور سے، سیرخوری کے برکات، چہل سالہ جوگ کے کرامات سے بڑی بڑی امیدیں لگائے "جو دنیا میں ہوتا آیا ہے" اس سے کہیں زیادہ کے قاضی صاحب سے متوقع ہوئے اور ایسے سوئے گویا سانپ سونگھ گیا ہے کہ "گجردم" ناشتہ نہاری کی تیاری کی خاطر اٹھنا ہے۔ سسرال والوں کی یہ توقعات بیجا نہ تھیں اور قاضی صاحب بھی ہر طرح

کے جوہر دکھلانے، جیسی چاہئے ویسی کرامتیں ظہور میں لانے پر بالقوی قادر تھے۔ مگر اس کا لحاظ رہے، جہاں ہر طرح قاضی صاحب عجیب الخلقت ہیں وہاں نفس پر قدرت بھی غیر معمولی رکھتے ہیں۔ اول تو اس کا ایک شمہ مختصر، اظہار منظور دوسرے کچھ حلیہ کششوں کا پالن و اہتمام نہ ہوا تھا، اس لئے دست و پابستہ سندے رہے۔ آئین شکنی کا خیال البتہ فیض زنیاں کر رہا ہے، اس واسطے ناچار کو یہ رسم بھی ادا کرنا ضروری تھی، گئے ہاں مگر قدرت نفس کے وہ کرشمے دکھلا گئے کہ انسان تو جنس حیواں ہے فرشتہ خاں بھی اس محل پر گوش و دم بریدہ نظر آتے۔ آپ دیکھتے نہیں، اندرون حجلہ عروسی موجود ہیں مگر جبر بر اختیار کیا کہنا ہمسر عروس ہوئے، نہ پشت پلنگ آشنا ہوئی۔ تحت چھپر کھٹ جلوس ہے اور جو پائے محمل گریز۔ آمادۂ فرار ہیں۔ "چھپر کھٹ" پر حجاب نوعروسی میں سرشار دلھن تنہا و راز، جائے قاضی خالی، زمانہ کا اونچ نیچ دکھا کر نیک صلاح، مفید مشورہ دے کر "بھگوڑے دولھا" کے خطاب سے بچانے میں کسی طرح قاضی صاحب کی "عناں گیر" نہ ہو سکی۔ اگر کوئی صلاح شوری ہوتا بھی تو قاضی صاحب ان پھندوں میں کب پھنسنے والے تھے، صنف نازک کا ضعف عقلی ظاہر۔ قاضی صاحب کو فرار ہی میں مفر تھا اور مفاد مضمر تھے، بدیں وجہ ابھی تحت چھپر کھٹ جلوس تھا کہ بیٹھے سے اٹھ کھڑے ہوئے، اب شگاف حجاب سے برابر تاک جھانک، سسرال والوں کے جاگا نیندی کی ٹوہ لی جا رہی ہے۔ دل خوف فرار میں پتے کی طرح ہل رہا ہے، ماہی بے آب کی طرح پھڑک رہا ہے، ادھر نفیر ہائے خواب سسرالیاں" گوش قاضی تک پہنچیں اور قاضی صاحب سمجھے کہ نیند نے چھاپہ مارا، ادھر جس طرح جنگلی خرگوش جھاڑی سے نکل کے بھاگتا ہے اسی طرح قاضی صاحب کھڑک سے پردہ کے باہر آئے۔ دبے پاؤں، بلی کی چال، پنجوں کے بل، دروازے پر پہنچ کر زنجیر کھول سر پر پاؤں رکھ پیچھے مڑ مڑ کے دیکھتے، ہندوستان کے دل سے دفتری اقتدار کے اعتماد کی طرح اڑنچھو، رفو چکر، بھاگوں بھاگ، سسرال والوں کو خواب خرگوش میں چھوڑ، پورے بارہ" تھے کہ انتہائے گریز کی بوکھلاہٹ میں اپنا محلہ اپنا گھر بھول کے بھائی صاحب کی سسرال کا "دق الباب" فرمایا۔ بھائی صاحب تین دن سے شادی کے دوڑے دھوپے، خستہ بھر بھرے، تھکے ماندے مع مسٹر فالو (قاضی صاحب کے بھائی کا سب سے آخری حماقت کا ملخص) ایک پلنگ پر سو نہ رہے تھے بلکہ غش میں تھے جس سے افاقہ مشکل

تھا مگر حضرت کی پیہم چھیڑ چھاڑ شگوفیوں نے غش سے چونکایا۔ گو بھائی صاحب حسبِ قرار داد اس فرار سے آگاہ تھے مگر شدتِ خستگی میں قاضی صاحب کی اس ناوقت آمد بے ہنگام رسید کے خیر مقدم کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ مگر کچھ تو طرز وقوعِ واقعہ فرار سے خبردار ہونے کا خیال، کچھ قاضی صاحب کی اس شب تار میں دروازہ پر ایستادگی کی تکلیف کے احساس نے بھائی کا دل بے چین کر دیا، دل ناخواستہ کو خواستہ بنا کر، گرتے پڑتے، جھومتے جھامتے کسی نہ کسی طرح اپنے کو دروازے پر پہنچایا، زنجیر کھولی۔ قاضی صاحب نے قدم اندر رکھا۔ بھائی صاحب نے پوچھا "خیر صلاً"۔ فرمایا "شب خیر ہے"۔ الدری شاعرانہ بلاغت اتنے سے فقرے میں سب حکایت فرار بیان کر گئے۔ بھائی صاحب ہر پہلو سے مطمئن، بعالم خستگی پھر پلنگ پر بھس ہو کر گرے۔ اور "آنجہانی"۔ خیال رہے کہ قاضی صاحب شب وصال کو شب فراق بنا کر آئے ہیں، اکیلے کھرے پلنگ پر دراز ہوئے، نہ بخیال استراحت، بلکہ بلحاظ وقت گزاری طوالت شب، مگر خائف بھی، جانتے ہیں کہ سسرال دو چار کھیت دور، سسرالی "یادگار بنافر" (آلھا اودن کا ہیرو)، ہاتھی چھوٹے، گھوڑا چھوٹے، کیسی پڑے، کیسی نہ پڑے، چند ساعت کا قیام بھی پُر از خطرات، مگر "کلموہی" رات کی زیادتیوں سے مجبور، کریں تو کیا۔ گو پلنگ نمونۂ قبر جھولا ہے، چاہتے تو صبح حشر تک سکون سے پڑے رہتے مگر دل کی بے چینیاں آڑی ترچھی، لمبی چوڑی، اوندھی سیدھی کروٹوں پر کروٹیں بدلا رہی ہیں، کبھی کروٹوں سے اکتا کر چیت ہو کر اختر شماری میں مصروف ہیں، ایک تارا گھنگرو تارا، دو تارے، گھنگرو تارے، اب شمار کا سلسلہ قاضی صاحب نے "الی غیر النہایہ" بڑھایا۔ کبھی سو پچاس تک پہنچے کہ ایک تارا، گھنگرو تارا پر آ رہے، غرضکہ اسی عالم میں تارے گن گن کے چار بجائے، بیل گاڑی بی طباخہ کو اسٹیشن پر لانے کے لئے موجود تھی۔ چاہتے تو قاضی صاحب، ہم خرما و ہم ثواب، کرتے بی طباخہ سے راستہ بھر بات چیت، گلغپ اڑاتے، پان خوری مفت میں ہوتی، راہ کٹ جاتی، سواری گھاتے میں پڑتی، مگر بہ مصالح پیادہ روی کو ترجیح ملی، بہ معیت رفیق دلی، میاں وزیر علی، و بیک دست چھڑی ہلاتے رواں دواں ہیں، راہ بھر قدم قدم پر قدرت نفس کے کرشمے، فلسفۂ فرار کے اذکار کرتے رفیق راہ سے ہر نکتہ گریزی کی خوبی کی تائید کراتے پوچھتے پاچھتے، اگرچہ اسٹیشن چار پانچ کوس تھا، موجود رکھے ہیں۔ گاڑی آنے میں دیر تھی اُسی

کے انتظار میں پلیٹ فارم پر چہل قدمی کر رہے ہیں۔ سسرال والوں کی سنئے، جوانی کی نیندیں اور
دن ہیں تو مشہور ہی ہیں، جوانیں تو خیر جوانی کی نیندیں لے رہی ہیں۔ بوڑھیاں، ٹھوریاں بھی خستگی و
تھکاوٹ سے بیس دماغی کا مبادلہ کرکے وہ بے خراٹے کس رہی تھیں کہ بتیوں کی لڑائی مات ہے۔
نو بجتے بجتے گھر کے گھر کی آنکھ کھلی۔ دیکھتی کیا ہیں نوشاہ بنے فقرتو، نوکرشاہی اعتماد کی طرح ناپید۔
سمدھیانے آدمی پر آدمی جا رہا ہے، محلہ محلہ ڈھونڈھیا پڑی ہے، قاضی صاحب ہوں تو ملیں، خسر صاحب
اس غم و غصے میں شمشیر برہنہ تھے۔ خیر ہوئی قاضی صاحب ملے نہیں ورنہ خدا جانے کیا نوبت آتی۔

خیر اب تو ہمارے قاضی صاحب بھاگ آئے ہیں۔ میں بھی رخصت ہوتا ہوں۔ بعد چلہ کشی
جب ہفت خوان پر چڑھائی ہوگی تو یہ کمترین بھی حاضر ہوگا۔

داغِ ناتمامی

دنیا پرانی ہوتی گئی، دنیا پرانی ہوتی گئی اس قدر کہ زمانے کی قید اُٹھ گئی، وقت کا شمار جاتا رہا، ماہ و سال، شب و روز کے تفرقے اُٹھ گئے، قیاس وقت کی ضرورت ہی نہ رہی، محاسبہ کار نے دن اور رات کی جگہ لی، مصروفیت اور آرام کا شمار تکمیل کار قرار دیدیا گیا، دقیقہ اور ساعت صبح اور شام بے معنی ہو گئے۔

دنیا پرانی ہوتی گئی اور اس قدر کہ احساس بعد مکانی جاتا رہا، بر اعظم اور بحر اعظم انسانی قدرت مسافت کے لئے بلا معنی ہو گئے۔ تمام کرۂ ارض ایک شہر ہو کر رہ گیا جس میں دور پارینہ کی طویل مسافتیں صرف اس قدر رہ گئیں کہ جیسے ایک محلے سے دوسرے محلے کا سفر۔ صرف خیال ہی انتقال مکانی کے لئے کافی اور وافی ہو گیا۔

دنیا پرانی ہوتی گئی اور اس قدر کہ انسانی قوت کا اندازہ اس طرح لگایا جانے لگا کہ ہر خواہش کے حصول کا مقدور ہی معیار قطعی قرار دے دیا گیا۔ انسانی اشکال اور ساخت کی تمیز اٹھ گئی۔ معاشرتی اور نوعی تعلقات کا خاتمہ ہو گیا۔ قوم اور فرقے کا وجود ہی مٹ گیا۔ خاندان کہ جو معاشرت کا سنگ بنیاد ہے فرسودہ ہوتے ہوتے خاک میں مل گیا۔

دنیا پرانی ہوتی گئی حتیٰ کہ "آواز" کا احساس ہی نہ رہا اور تمام کرۂ ارض پر ایک خاموشی کہ جو موت کی خاموشی سے زیادہ گہری تھی طاری ہو گئی۔ جذبات کے اظہار کا رواج ہی نہ رہا اور شاید ان کا وجود ہی باقی نہ تھا اور اگر تھا تو انسانی جسم کا وہ حصہ جو ان کا منبع اور مخزن ہے اس قدر ضابط اور مستبد ہو گیا کہ اظہار ممکن نہ رہا۔ انسانی جسم تمام امراض سے مبرّا ہو گیا اور انسانی خیال اس درجہ سریع الرفتار اور وسیع ہو گیا کہ اس کا شمار اور احتساب حدود وضاحت اور تشریح سے بالاتر ہے۔

اسی کرۂ ارض پر ایک بادل اُٹھا، نہایت تیرہ اور نہایت تاریک۔ علم انسانی کو یہ پتہ نہ لگ سکا کہ یہ

بادل کس رخ سے آیا ہے اور یہ نہ معلوم کرسکا کہ کس طرف کو جا رہا ہے۔ نہ تو اس بادل کے برسنے کا یقین تھا اور نہ اس کے نہ برسنے کا احتمال۔ مگر اس کی سیاہی بڑھتی گئی ٹھیک اسی طرح کہ جیسے دنیا پرانی ہوتی گئی تھی۔ اس کی سیاہی بڑھتی گئی اور نگاہ کی قوت زائل کرتی گئی ٹھیک اسی طرح کہ جیسے قیود زمانی اور مکانی زائل ہوتی گئی تھیں۔

آخر کار وہ سیاہ بادل کرۂ ارض پر محیط ہوگیا۔ عدم اور وجود کا سوال ہی درمیان نہ رہا۔

آہستہ آہستہ وہی سورج کہ جو ہبوطِ آدم کے وقت مشرق سے طلوع ہوا تھا پھر افق مشرق پر نمودار ہوا۔ اس کا نور پھیلتا گیا' روشنی ہوتی گئی۔ رفتہ رفتہ چیزیں نظر آنے لگیں۔

اس سپیدۂ صبح میں نمودار ہونے والی پہلی چیز ایک وسیع ریگستان تھا' اس قدر وسیع کہ انسانی ہمت اس کے عبور کرنے کے خیال سے پریشان ہو جائے مگر اس ریگستان میں ایک قافلہ مسافروں کا نظر آیا کہ جو متواتر مشرق کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ طویل مسافت طے کرنے کے بعد ریگستان کا خاتمہ ہوا اور ایک دل شکن دلدل کی ابتدا ہوئی مگر ان مسافروں کی ہمتیں بڑھی ہوئی تھیں اور وہ قدم اٹھائے چلے گئے۔ اس دلدل میں جان مارتے ہوئے اس قافلے کو کافی وقت گزر گیا۔ سورج نصف النہار تک پہنچا اور اب مغرب کی افق میں ہلکے ہلکے بیٹھنے لگا۔

دلدل ختم ہوئی اور شفاف پانی کی ایک جھیل شروع ہوئی۔ ان مسافروں کو دن بھر کی محنت اور مشقت نے چور کر دیا تھا لیکن جھیل کے دوسرے کنارے پر ایک پرانے قلعے کے نظر آجانے سے ان کے چہرے شاداب اور بشاش ہوگئے۔ ان سب کے دست و پا میں خاص قوت پیدا ہوگئی اور ان کی رفتار کافی تیز ہوگئی۔ غروب سے کچھ قبل یہ اس عالیشان قلعے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اس قلعے کا نام قلعۂ دورِ چرخ تھا۔

یہ قلعہ بہت پرانا تھا اسی قدر کہ جتنی دنیا پرانی تھی۔ اس میں فضا کی تلاطم سے پیدا ہونے والی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ وہی آوازیں کہ جو روحوں کو ایک موسم حیات کے لئے میدان عمل میں بھیج دیتی ہیں۔

ان مترنم آوازوں کو سنتے ہی مسافروں کا قافلہ یک زبان ہو کر چیخ اٹھا "دروازہ کھولدو کہ ہم اندر داخل ہو سکیں"۔

وہم و خیال سے زیادہ قوی اور زیادہ پیاری آواز نے پوچھا "تم کون ہو"۔

تیغ و تبر اور زرہ بکتر سے آراستہ شخصیت مجمع سے آگے بڑھی اور یوں گویا ہوئی: "میں نے کرۂ ارض پر انسان اعلیٰ کے اقتدار کے قیام کے لئے جماعتوں کی تنظیم کی، میں نے کمزور اور معمولی انسانوں کے کثیر انبوہ کو جن کی قوت صرف جماعت پر مبنی تھی زیر و زبر کیا۔ میرا جسم زخموں سے چور ہے۔ میری تلوار خون سے آلودہ ہے۔ میرا زرہ بکتر دشمن کی ضربوں سے پاش پاش ہے مگر میرا دل اتنا ہی قوی ہے کہ جتنا کسی فاتح کا ہو سکتا ہے۔ میں حقدار ہوں کہ حریم مصفا اور منزہ میں داخل کر لیا جاؤں"۔

حقارت آمیز ہنسی نے اسے خاموش کر دیا اور دوسرا شخص بولا: "میں نے کرۂ ارض پر منتشر دولت اور زر و سیم کو یکجا کرنے میں کسی بات سے دریغ نہیں کیا۔ زبردست سے لڑ کر اس کی دولت چھینی، کمزور کو دھوکا دے کر مفلس کر دیا۔ سمندروں پر اور ہوا میں غرضکہ ہر جگہ میں نے اپنا جال پھیلا دیا۔ سرمایہ کی حفاظت کے لئے لطائف الحیل سے کام لیا۔ کرۂ ارض کی ہر شے کو کارآمد بنایا اور ابھی میں اپنی کوششوں میں انہماک سے مشغول ہوں۔ ایک دن آئے گا کہ جب ...."

خاموش ہو جا، خاموش ہو جا کے ناطق حکم نے اس کی بات لبوں پر روک دی اور ایک تیسرا شخص مصروف گفتار ہوا۔

"ان دونوں کے دعوے باطل ہیں۔ یہ ہمیشہ میرے محتاج رہے۔ پہلے مدعی نے ضرور خون بہائے، ضرور قلعے فتح کئے لیکن اس کے پاس صرف ناکارہ اور دقیانوسی اسلحہ ہی موجود تھے۔ میں نے نئے سے نئے آلات بربادی ایجاد کئے۔ اسی طرح سرمایہ فراہم کرنے والے کو بھی میری ہی عقل و دانش نے سرمایہ دار بنا دیا۔ اوقیانوس کی گہرائیوں میں دیکھنے کے لئے میں نے اسے آنکھیں دیں، پہاڑوں کی دشوار گزار چوٹیوں پر اڑتے پھرنے کے لئے میں نے اسے بازو دئے۔ انسانی سماعت کی کمزوری میری ایجادوں نے رفع کر دی۔ غرضکہ ہر نا تمامی کو تمامیت پر میں نے پہنچایا۔ ان دونوں سے زیادہ حقدار میں ہوں"۔

"اور کوئی بھی مدعی ہے" قلعہ دور چرخ سے اٹھنے والی آواز نے کہا۔ چوتھے دعویدار نے کہا

شروع کیا :۔

" میں نادم ہوں کہ میرے امکان میں اتنی وسیع خدمات تھیں۔ اس میں اس بربادی کو دیکھ دیکھ کر رو تا مزور رہا ہوں کہ جو پہلے تین دعویداروں نے اپنے کرشمہ ہائے ستم سے کرۂ ارض پر برپا کر رکھی تھی۔ اس خون سے جو بہایا جا تا رہا میں اپنے صفحۂ دل پر گلکاری کرتا اور پھر ان گلکاریوں کو اپنے آنسوؤں کے پانی سے دھو دیتا۔ میں اپنے شکستہ ساز پر ایسے دلکش راگ پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ جو ظلم کوش کو ست رنگ کر دیں۔ کچھ میری سنتے رہے اور کچھ مجھ سے منحرف رہے۔ میں صرف زخمی دل اور ناتمام کوششوں کے وجود کا مظاہرہ ہوں۔ میں مکمل ہوں مگر میری تکمیل ...."

تم مقرب بارگاہ ہو۔ دروازہ کھلتا ہے اندر آ جاؤ۔

دروازہ کھلا۔ حقدار نے قدم بڑھائے لیکن شخص اول الذکر مجمع کو چیرتا پھاڑتا بہ سرعت تمام دروازے میں یہ کہتا ہوا داخل ہو گیا کہ " دنیا میں قوت قبضے کی ضمانت ہے۔ "

دارالسلطنت مانڈو اور اس کے حکمران

ہزارہا سیاح ہر سال اجین سے ہو کر گزرتے ہیں لیکن سوائے چند کے کوئی بھی مالوے کے قدیم دارالسلطنت مانڈو کا رخ نہیں کرتا جو اجین سے چند ہی میل کے فاصلے پر ہے اور کسی زمانے میں ایک عظیم الشان شہر تھا۔ اب بھی اس کی عمارتیں اور کھنڈر دیکھنے والوں کے دلوں پر عجیب اثر کرتے ہیں۔ مہاراجہ دھار نے جن کی ریاست میں یہ شہر ہے ان کی حفاظت کے لئے خاص انتظام کیا ہے پچاس برس کا عرصہ ہوا کہ یہ کھنڈر زمین میں دب گئے تھے اور وحشی جانوروں کی اتنی کثرت ہو گئی تھی کہ وہاں ایک رات بھی بسر کرنا ناممکن تھا۔

مانڈو ایک ٹیلے پر واقع ہے جو سطح سمندر سے کوئی دو ہزار فیٹ بلند ہے۔ اس کا کل رقبہ پچیس مربع میل ہے ٹیلے کی چوٹی پر دہلی دروازہ ہے اور اس کے چاروں طرف اونچی اونچی فصیلیں ہیں جن کے اندر متعدد مقبرے، شان دار مساجد اور خوبصورت محل ہیں۔ محلوں میں دو عمارتیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ہنڈولہ اور جہاز محل۔ جہاز محل کی چھت سے ویران شہر کا نظارہ قابل دید ہے۔ میلوں تر سر سبز درخت، مختلف قسم کی عمارتیں اور نیلی نیلی جھیلیں عجیب بہار دکھاتی ہیں۔ جب کوئی ان چیزوں کو دیکھتا ہے جن پر ہر وقت سکون اور خاموشی چھائی رہتی ہے تو مشکل یقین آتا ہے کہ کبھی اس شہر میں بھی چہل پہل تھی اور ہنسی قہقہوں کی آوازیں اس کے در و دیوار تک سے گونجتی تھیں۔

جہاز محل کے پاس ہی ایک عمارت ہے سادہ مگر پرشکوہ۔ اس کے نیچے سلطان ہوشنگ شاہ غوری آرام کی نیند سو رہا ہے۔ اس کے قریب سنگ سرخ کی وسیع اور خوبصورت جامع مسجد ہے۔ جامع مسجد سے سڑک جنگل میں سے ہوتی ہوئی ساگر تالاب پہنچتی ہے۔ یہ تالاب یوں ہی کافی خوبصورت ہے لیکن کنول کے پھول اس کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ ایک میل اور چلنے کے بعد باز بہادر کا محل آتا ہے۔ اس کے بلند دروازے میں داخل ہونے کے بعد انسان کو جو حظ حاصل ہوتا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ محل کے عقب میں چھوٹی سی ایک پہاڑی پر روپ متی کا شامیانہ ہے جس میں بیٹھ کر یہ حسین و جمیل رانی دریائے نربدا کو دیکھا

کرتی تھی جو بارہ ہزار فیٹ نیچے بہتا ہے۔

مانڈو کی بنیاد کے متعلق بہت سی روایات ہیں۔ ان میں سے ایک ابوالفضل نے نقل کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ اس ملک میں ایک قسم کا پتھر پایا جاتا ہے جسے پارس کہتے ہیں۔ جس دھات کے ساتھ یہ چھو جائے وہ سونا بن جاتی ہے۔ راجہ بکرماجیت سے بھی کہیں پہلے ہندوستان میں ایک راجہ جے سنگھ دیو نامی حکومت کرتا تھا۔ یہ راجہ اپنی سخاوت اور نیکی کی وجہ سے اپنی رعایا میں ہردلعزیز تھا۔ اس کے عہد میں ایک غریب آدمی کو اتفاقاً پارس مل گیا جس سے اس کی درانتی سونے کی ہوگئی۔ یہ دیکھ کر وہ بہت خوفزدہ ہوا اور ایک سنار کو جس کا نام منڈو تھا وہ پتھر دے دیا۔ سنار یہ پتھر لے کر راجہ کے دربار میں پہنچا اور تحفے کے طور پر یہ قیمتی چیز اس کو دے دی۔ راجہ نے اس کے ذریعہ سے بہت سے رفاہ عام کے کام کئے اور ایک قلعہ بھی تعمیر کیا جس کا نام سنار کے نام پر مانڈو رکھ دیا گیا۔

یہ روایت جہانگیر نے بھی اپنی تزک میں نقل کی ہے لیکن اس پر تنقید کرتے ہوئے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ "یہ روایت محض خیالی اور ناقابل اعتبار معلوم ہوتی ہے"۔ بہرحال دوسرے تاریخی ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے بہت پہلے مانڈو ایک معمولی سا گاؤں تھا۔

درا صل مانڈو کی اصلی تاریخ دلاور خاں سے شروع ہوتی ہے جس نے سنہ ۱۴۰۱ء میں اپنی خود مختاری اور بادشاہی کا اعلان کیا تھا جبکہ امیر تیمور کے حملے سے شاہان دہلی کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ دلاور خاں کا اصلی نام حسین تھا اور اس کے آبا و اجداد غور سے آکر شاہان دہلی کے دربار میں مختلف عہدوں پر مقرر ہوگئے تھے۔ فیروز شاہ تغلق کے وقت حسین نے چند ایسے کارنامے کئے کہ اسے دلاور خاں کا خطاب عطا ہوا اور فیروز تغلق کے بعد اس کے جانشین سلطان محمود نے اسے مالوے کی صوبیداری پر متعین کر دیا۔

سنہ ۱۴۰۶ء میں دلاور خاں مرگیا اور اس کا بیٹا الپ خاں السلطان الاعظم حسام الدنیا والدین ابوالمجاہد ہوشنگ شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ نوجوانی ہی سے اس کے دل میں کشور کشائی اور فتوحات کا شوق تھا۔ تخت پر بیٹھتے ہی اس نے سید مبارک شاہ بادشاہ دہلی، احمد شاہ بہمنی اور جون پور کے بادشاہ کے خلاف لڑائی چھیڑ دی۔ ان تینوں کے خلاف الگ الگ لڑائیاں ہوئیں جن میں بالآخر سلطان کامیاب رہا

جنگ و جدل کے شوق کے ساتھ ساتھ سلطان کے سینے میں ایک فیاض اور دردمند دل بھی تھا۔ رعایا اس کو دل سے چاہتی تھی جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کے مرنے کے بعد ہر سال اس کی قبر پر بڑی شان سے عرس ہوتا تھا۔ ۱۶۱۱ء میں مشہور مورخ برگس مانڈو گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ "چند عابد و زاہد مسلمان اب بھی یہیں رہتے ہیں جو ہر سیاح کو دلی عقیدت سے سلطان کے مقبرے کی زیارت کراتے ہیں جس کے دروازے پر یہ شعر کندہ ہیں۔"

شہ والا قدر سلطان ہوشنگ   سوئے دار البقا چوں کرد آہنگ
بپرسیدم ز ہاتف سال تاریخ   ندا آمد نماندہ شاہ ہوشنگ

فن تعمیر میں بھی سلطان اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اس کے اس شوق کی وجہ سے مانڈو نہ صرف ناقابل تسخیر قلعہ بلکہ ایک نہایت عمدہ اور حسین شہر بن گیا تھا۔ اس کی بنائی ہوئی عمارتوں میں سے جامع مسجد، دہلی دروازہ اور خود اس کا مقبرہ بہت مشہور ہیں۔

ہوشنگ شاہ اپنے ایک عزیز محمود خاں کو بہت چاہتا تھا۔ جب اس کے مرنے کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے بیٹے غزنی خاں کو اپنا جانشین مقرر کیا اور محمود خاں کو ہدایت کی کہ وہ غزنی خاں کا ہر طرح سے خیال رکھے۔ محمود نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک اس کی حفاظت میں بہا دے گا۔ شروع شروع میں محمود اپنے وعدے پر قائم رہا لیکن جب دربار کی اندرونی سازشوں اور رشک و حسد کی وجہ سے اس کی اپنی جان کی خیر نہ رہی تو اس نے بادشاہ کو زہر دے کر مروا ڈالا اور ۱۴۳۶ء میں خود السلطان الاعظم علاء الدین والدنیا ابو المظفر محمود شاہ خلجی کے لقب سے تخت پر بیٹھ گیا۔

محمود کو علم و ادب سے خاص شغف تھا۔ اس نے علم و ادب کی ترقی کے لئے اپنی سلطنت میں کئی کالج قائم کئے تھے۔

فرشتہ کہتا ہے کہ سلطان محمود نرم دل، بہادر اور منصف مزاج بادشاہ تھا۔ اس کے عہد میں ہندو مسلمان بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔ فرصت کے اوقات میں سلطان دنیا کے بادشاہوں اور درباروں کے حالات سنا کرتا تھا۔ وہ فخر سے کہا کرتا تھا اور یہ بات تھی بھی درست کہ وہ انسانی فطرت سے بخوبی

واقف ہے اور اس کا مطالعہ اچھی طرح سے کیا ہے۔ ۱۴۴۳ء میں سلطان محمود نے ایک ہسپتال کی بنیاد ڈالی اور اپنے خاص شبیر طبی فضل اللہ کو وہاں کا منتظم و مہتمم مقرر کیا۔ اس ہسپتال میں الگ الگ وارڈ تھے اور مریضوں کا علاج بڑی اچھی طرح سے کیا جاتا تھا۔

سلطان محمود بڑا بہادر سپاہی بھی تھا۔ اس کی فوجی قابلیت ہندوستان سے نکل کر اسلامی ممالک میں پھیل گئی تھی۔ چنانچہ اس کے دربار میں سلطان ابوسعید شاہ ماوراءالنہر اور امیرالمومنین مستعد باللہ کی طرف سے سفیر رہتے تھے۔ سلطان بھی ان ملکوں میں اپنے سفیر اور تحفے تحائف روانہ کرتا تھا۔ تحفوں میں اکثر عمدہ ململ، عربی گھوڑے، رقاصہ لڑکیاں، ہاتھی، مینا اور طوطے ہوتے تھے۔ مینا اور طوطوں کو بڑی محنت سے فارسی کے بہت سے جملے یاد کرائے جاتے تھے۔

سلطان کو فن تعمیر سے بھی بہت شوق تھا۔ سلطان ہوشنگ کی جامع مسجد مکمل کرانے کے بعد اس نے بہت سی اچھی اچھی عمارتیں بنوائی تھیں۔ ۱۴۶۹ء میں ایک مہم سے واپس آرہا تھا کہ انتقال ہوگیا تاریخ وفات یہ ہے:۔

شہ والاقدر سلطان محمود ۔۔۔ چو شد از امر حق رحلت گزینے

بپرسیدم زہاتف سال تاریخ ۔۔۔ ندا آمد کہ شد جنت نشینے

سلطان محمود کے انتقال پر اس کا بیٹا الواثق بالملک الملتجی، ابوالفتح غیاث خلجی کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں تو مانڈو نے انتہائی عروج حاصل کرلیا تھا۔ مانڈو کا نام بدل کر شادی آباد رکھا گیا۔ غیاث کے دربار میں صرف عورتیں ہی عورتیں تھیں جن کی تعداد کوئی ڈیڑھ ہزار تھی۔ ان سب کو کوئی نہ کوئی فن سکھایا گیا تھا۔ ان میں سے اکثر حکومت کے مختلف عہدوں پر مامور تھیں۔

شاہی باڈی گارڈ کے دو حصے تھے ایک میں حبش کی لڑکیاں تھیں اور دوسرے میں ترکنیں۔ ان کی کل تعداد ایک ہزار تھی۔ یہ خیال کر کے کہ رشک و حسد کی وجہ سے دربار کے امن میں کسی قسم کا خلل نہ پڑے اس کا حکم تھا کہ نوجوان لڑکیوں اور بوڑھی عورتوں کی تنخواہ میں ایک پائی کا بھی فرق نہ ہو۔ وہ اپنے تکیے کے نیچے سونے سے بھرا ہوا تھیلا رکھ کر سوتا تھا اور صبح اٹھتے ہی غرباء میں تقسیم کردیتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک

مرتبہ اس نے حکم دیا کہ اس کے لیے ایک معجون تیار کی جائے۔ جب معجون تیار ہو گئی تو اس کو اس کی اطلاع کی گئی اس نے کہا کہ جب تک وہ ان دواؤں کے نام نہیں سن لے گا جو اس میں پڑی ہیں وہ اس کا استعمال نہیں کرے گا۔ مجبوراً سب چیزوں کے نام گنوائے گئے۔ ان میں سے ایک چیز جو سیل بھی تھی۔ اس نے کہا کہ یہ دوا کسی کام کی نہیں ہے۔ اس معجون پر کئی ہزار روپیہ صرف ہوئے تھے لیکن اس نے حکم دیا کہ اس کو کوڑے کرکٹ میں پھینک دیا جائے۔ ایک درباری نے کہا کہ یہ کسی غریب کو دیدی جائے تاکہ اس کا ہی فائدہ ہو جائے۔ مگر اس نے جواب دیا "ہر چہ برخود نہ پسندی بہ دیگراں ہم مپسند"

غیاث جس قدر سخی تھا اتنا ہی منصف مزاج اور نیک بھی تھا۔ شب و روز اس کے محل میں خوبصورت لڑکیاں خوش الحانی سے قرآن شریف کی تلاوت کرتی رہتی تھیں۔ اس کا حکم تھا کہ جب نماز کا وقت آئے تو اسے پلنگ پر سے کھینچ کر ہوشیار کر دیا جائے اور اگر اس پر بھی نہ اٹھے تو سرد پانی اس پر ڈال دیا جائے۔

تیس برس تک غیاث اسی طرح حکومت کرتا رہا۔ باوجود اس عیش و عشرت کے اس کی سلطنت کا انتظام بہت اچھا تھا۔ رعایا خوش حال تھی اور ملک میں امن و امان تھا۔ لیکن اس کا خاتمہ بڑے اندوہناک طریقے سے ہوا۔ غیاث کی عمر اسی برس کی تھی جب ایک دن اس کا لڑکا نصیرالدین زہر کا پیالہ ہاتھ میں لئے اچانک اس کے خاص کمرے میں داخل ہوا اور اپنے باپ سے کہا کہ اس کو پی جاؤ۔ بادشاہ کے بازوبند میں اس وقت زہر مہرہ تھا اور اگر وہ چاہتا تو زہر کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا تھا لیکن دو مرتبہ پہلے بھی اسے زہر دینے کی کوشش کی گئی تھی اب تیسری مرتبہ اس نے زہر مہرہ اپنے بیٹے کی طرف پھینک دیا اور یہ کہتے ہوئے زہر کا بھرا ہوا پیالہ غٹا غٹ پی گیا کہ "اے خدا تو نے اپنے معمولی بندے کو ایسی زندگی عطا کی جس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔" مرتے وقت اس نے وصیت کی کہ نصیرالدین کو قتل کا ذمہ دار نہ ٹھہرایا جائے۔ غیاث الدین کی زندگی کے حالات پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الف لیلیٰ میں سے کوئی قصہ بیان کیا جا رہا ہے لیکن یہ تمام باتیں واقعات پر مبنی ہیں جن کی تصدیق فرشتہ اور دوسرے مورخین نے بھی کی ہے۔

نصیرالدین کے اس ذلیل فعل کی مذمت اگرچہ مارے خوف کے اس کی زندگی میں نہیں کی گئی لیکن

اس کے مرنے کے بعد اس کو خوب ہی برا بھلا کہا گیا یہاں تک کہ شہنشاہ جہانگیر جب مانڈو گیا تو اس نے خود بھی اس کی قبر کو اپنے پاؤں سے ٹھکرایا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ بھی ایسا کریں۔ اس پر بھی جب اس کا غصہ کم نہ ہوا تو اس نے حکم دیا کہ اس کی ناپاک ہڈیوں کو قبر سے نکال کر دریائے نربدا میں پھینک دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

اپنے باپ کے انتقال کے فوراً بعد یعنی ۱۵۰۰ء میں نصیرالدین نے اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا۔ اگرچہ اس کی سلطنت کا انتظام اچھا تھا لیکن ظلم و ستم نے اس کی اچھائی پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن نصیرالدین نشے میں کسی تالاب کے کنارے بے ہوش پڑا تھا۔ یکایک وہ پانی میں گر گیا۔ چار خادمات جو وہاں موجود تھیں انھوں نے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر اس کو بڑی مشکلوں سے باہر نکالا اور بھیگے ہوئے کپڑے اتار کر نیا لباس پہنا دیا۔ جب وہ ہوش میں آیا تو سخت دردِ سر کی شکایت کی۔ خادمات نے سارا واقعہ اس کے حضور میں عرض کر دیا۔ بادشاہ نے خیال کیا کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے چنانچہ انتہائی غصے کی حالت میں اس نے تلوار نکالی اور ان کی التجاؤں اور منتوں کے باوجود انہیں قتل کر دیا۔

نصیرالدین کے انتقال پر مانڈو تقریباً نصف صدی تک لڑائیوں اور جنگوں کا مرکز بنا رہا یہاں تک کہ ۱۵۵۵ء میں ملک بایزید سلطان باز بہادر کے لقب سے تخت نشین ہوا اور مانڈو پر حسن و عشق نے اپنا تسلط جما لیا۔

باز بہادر کو لڑائیوں اور جنگوں سے سخت نفرت تھی لہٰذا اس طرف سے اپنی توجہ ہٹالی۔ روپ متی سے ملنے کے بعد تو وہ بس اسی کا ہو گیا۔ باز بہادر اور روپ متی کے عشق کی داستان عجیب ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن سلطان باز بہادر نربدا کے کنارے شکار کھیلتا ہوا اپنے ہمراہیوں سے الگ ہو کر ایسی پرفضا جگہ پہنچ گیا جہاں روپ متی بیٹھی ہوئی مناظرِ فطرت پر موسیقی کی بجلیاں گرا رہی تھی۔ جنگل کے جانور اس کی آواز کی بے پناہ کشش سے اس کی طرف کھنچے آتے تھے۔ روپ متی گانے میں اس قدر محو تھی کہ گرد و پیش کی مطلق خبر نہ تھی۔ باز بہادر بھی گانا سننے میں محو تھا۔ یکایک دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک ہی نظر میں دونوں ایک دوسرے پر فریفتہ ہو گئے۔

روپ متی دھرم پور کے رئیس کی لڑکی تھی۔ جب اس کے باپ کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بہت برافروختہ ہوا اور اس سے کہا کہ ایک مسلمان سے محبت کر کے تو نے اپنے دھرم کا ناش کر لیا ہے۔ اس کی سزا یہ ہے کہ تو موت کے لئے تیار ہو جا اور یہ زہر کا پیالہ تجھے پینا پڑے گا۔

روپ متی نے جواب دیا "مرنا مجھے منظور ہے۔ میں آپ کی عزت برقرار رکھوں گی۔" اس نے زہر کا پیالہ لیا اور حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ ابھی زہر کا پیالہ اس کے ہونٹوں تک بھی نہ گیا تھا کہ خدا کی قدرت دیکھئے باز بہادر جسے اس واقعے کی خبر ہو گئی تھی وہاں پہنچ گیا۔ یہ عاشق مزاج سلطان رئیس دھرم پور اور اس کے ساتھیوں کے حملوں کو روکتا ہوا روپ متی کے پاس جا پہنچا اور اس کے ہاتھ سے زہر کا پیالہ چھین کر زمین پر گرا دیا اور اس کو اپنے ساتھ لے کر اس ہنگامے سے صاف نکل آیا۔

پانچ برس تک باز بہادر اور روپ متی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ روپ متی ایک بہت اچھی سوار، فن موسیقی کی ماہر اور شاعرہ تھی۔ دونوں ایک ساتھ جنگل میں شکار کھیلنے جاتے اور موسم گرما کی چاندنی راتوں میں جن کے متعلق ایک شاعر نے کہا ہے "صبح بنارس، شام اودھ اور شب مالوہ چاہیے" شعر و سخن کا چرچا رہتا۔

لیکن یہ ہنسی خوشی کے دن جلدی ہی گزر گئے۔ ۱۵۶۰ء میں اکبر اعظم کی فتح مند افواج نے مانڈو پر حملہ کر دیا اور باز بہادر نے راہ فرار اختیار کی۔ ایک عرصے تک دونوں فوجوں میں جنگ ہوتی رہی یہاں تک کہ جنرل ادہم خاں نے مالوہ کو پوری طرح سے مسخر کر لیا۔ روپ متی ایک پھول بیچنے والی کے بھیس میں بھاگ گئی اور اپنے تینوں بھائیوں سے مدد چاہی۔ ادہم خاں کو جب معلوم ہوا کہ شکار ہاتھ سے جا رہا ہے تو اس نے فوج کا ایک دستہ اس کے تعاقب میں روانہ کیا۔ ایک ایک کر کے اس کے تینوں بھائیوں نے اپنی جانیں دیدیں اور روپ متی گرفتار ہو کر مانڈو لائی گئی۔ اس دفعہ بچنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اس نے ادہم خاں کو لکھا کہ اگر اسے تین دن کی مہلت مل جائے جس میں وہ اپنے آپ کو تیار کرے تو وہ اس سے مل سکے گی۔ ادہم خاں بہت خوش ہوا اور اس کی درخواست منظور کر لی۔ تین دن تک خوب جشن ہوتا رہا۔ تیسرے دن ادہم خاں جب روپ متی کے کمرے میں پہنچا تو اس کو مردہ پایا۔ یوں مر کر روپ متی نے اپنے

لے حیات جاوید حاصل کرلی۔ مولانا عظمت اللہ مرحوم کی ایک نظم کے دو بند ہیں جن میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ

ایک طرف تھی وفا
ایک طرف جان تھی
سچ کا تقاضا یہ تھا
جان ہی قربان کی۔
پیت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی
موت تیسری سوت تھی
عشق کی دیوی تیری
موت وہ تھی جان بھی
جس پہ ہے قربان کی
پیت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

اجین میں ایک خوبصورت جھیل کے کنارے روپ متی کی خاک دفن ہے اور اس کے قریب باز بہادر بھی ابدی نیند سو رہا ہے۔

اس کے بعد سے مانڈو کا زوال شروع ہوتا ہے۔ جہانگیر اکثر موسم گرما میں یہاں آیا کرتا تھا اور وہ محض سیر و شکار کی خاطر۔ اور یہیں انگلستان کے پہلے سفیر سر ٹامس رو نے جہانگیر سے ملاقات کی تھی۔
جیسا کہ کہا جا چکا ہے مانڈو کی شکستہ اور برباد شدہ عمارات کے کھنڈر آج بھی موجود ہیں لیکن اس کی قدیم حالت کا اندازہ کرنے کے لئے ہمیں ازمنۂ متوسطہ کے مغربی سیاحوں کی تحریروں کی طرف توجہ کرنا پڑے گی۔ لیٹری لکھتا ہے۔

" مانڈو ایک نہایت ہی بلند پہاڑ پر جس کی چوٹی نے ایک وسیع اور ہموار میدان کی صورت اختیار کرلی ہے واقع ہے۔ اس پہاڑ پر جو درخت کھڑے ہیں ان کے درمیان

کچھ ایسا فاصلہ رکھا گیا ہے کہ نیچے سے نظر ڈالئے تو ایک نہایت ہی عمدہ منظر دیکھنے میں آتا ہے۔"

ولیم فنچ لکھتا ہے:-

"یہ شہر دس کوس لمبا اور چار کوس چوڑا ہے۔ شہر کے ارد گرد ایک نہایت ہی خوبصورت مرغزار ہے جس میں جا بجا سولہ خوبصورت تالاب واقع ہیں۔ شہر کا جو حصہ اس وقت موجود ہے اس کی خوبصورتی میں کلام نہیں لیکن اسے قدیم شہر سے کوئی نسبت نہیں۔ یہاں پتھر کی اس قدر مضبوط خوبصورت عمارتیں اور اونچے اونچے دروازے موجود ہیں کہ یورپ کا کوئی شہر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

یہ حالت تھی مانڈو کی اس زمانے میں جب اس کی عظمت و شہرت کا آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ بایں ہمہ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کی قدیم شان و شوکت کیا ہوگی۔

تنقید و تبصرہ

کتب

جدید اردو شاعری۔ تاج آفرینش۔ آلامِ حیات۔ مشاہیر اردو کے خطوط۔ رہبر حجاج۔ آرسی۔

جدید اردو شاعری | از عبدالقادر سروری ایم۔اے ایل ایل۔بی۔ مددگار پروفیسر اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد (دکن)۔

جدید اردو شاعری کے نام سے عبدالقادر صاحب کی تازہ تصنیف ہمیں موصول ہوئی ہے۔ کتاب تین حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ حصہ اول میں مصنف نے شعر کی ماہیت، تعریف اور اقسام سے بحث کی ہے اور حصہ دوم میں جدید اردو کے ارتقاء کو تاریخی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ حصہ سوم میں جدید شاعری کے ابتدائی دور کے شعراء کے حالات اور ان کا کلام پھر ان کے بعد آنے والے شعراء کے حالات اور ان کا کلام پیش کیا ہے۔ اور اس ترتیب کو چار حصوں پر تقسیم کر کے شعرائے مستقبل کا عنوان بھی قائم کر دیا ہے جس میں اس عہد کے بعض نوجوان خوشگو شعراء کے نام نظر آتے ہیں۔

حصہ اول میں اردو شاعری کے اقسام اور اس کی نوعیت کو نہایت خوبی سے واضح کیا گیا ہے اور جا بجا دوسری زبانوں اور مغربی شعراء کے خیالات نقل کئے ہیں۔ اردو شاعری کے خد و خال اس باب سے نمایاں ہو جاتے ہیں۔

حصہ دوم میں قدیم شاعری کے اسباب تنزل سے بحث کی ہے اور اس عہد کے سیاسی انقلابات اور حکومت اسلامی کے زوال کو شاعری کی پستی اور بدمذاقی کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ کتاب کا یہ حصہ دلچسپ ہے اور اس میں جدید اردو کی تاریخ بھی شامل ہے۔

آخری حصے میں شعراء کے کلام کے نمونے اور ان کے حالات زندگی درج ہیں۔

کتاب بحیثیت مجموعی مفید ہے اور ترتیب و زبان قابل داد۔ شعرائے مستقبل کے عنوان میں کسی قدر جسارت بھی کا اظہار کیا گیا ہے یا اس باب کا عنوان ایسا ہے کہ مصنف کے دلی مقصد کا اظہار نہیں ہوتا۔ غزل گو شعراء میں شاد عظیم آبادی، ثاقب لکھنوی کا نام نہیں اور شعرائے مستقبل میں بھی بعض نام ایسے ہیں جن کو بہ آسانی شامل کیا جا سکتا ہے لیکن غالباً اس فہرست سے "مشتے نمونہ" کا کام لینا مقصود ہے حصر مدنظر نہیں۔ افسوس ہے کہ کتابت و طباعت کی خوبی

کتاب کے معنوی محاسن کی ہم سر نہیں اور تصاویر تو ایسی ہیں کہ ان کا نہ ہونا ہی اچھا تھا۔

تاج آفرینش | از جناب عبدالحمید صاحب نعمانی۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ متوسط، قیمت ۱۰ر

ملنے کا پتہ: (۱) انجمن بک ڈپو، پرنسس بلڈنگ بمبئی ۹ (۲) مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی۔

ملک خانم عرف باحثۃ البادیہ مصر کی مشہور وطن دوست اور مصلح خاتون تھی۔ مصری خواتین میں اصلاح و ترقی کی تحریک کو اس نے اس وقت اپنے ہاتھ میں لیا جبکہ مصر میں عورتیں بہت ہی پست اور ذلیل حالت میں تھیں۔ اس نے اپنے مقصد کے لئے زبان و قلم دونوں سے کام لیا۔ جلسوں میں تقریریں کیں اور اخبارات میں مضامین لکھے۔ زیر نظر کتاب اس کے انہیں مضامین کا ترجمہ ہے۔ یہ مضامین تعداد میں سترہ ہیں۔ ان کے علاوہ دو تقریروں کا خلاصہ بھی درج کیا گیا ہے۔ مضامین سب اہم اور غور و توجہ سے پڑھنے کے لائق ہیں مثلاً پردہ، شادی، شادی کی عمر، تعدد ازدواج، یاسوت عورتوں کے چند عیوب۔ غلط غیرت۔ شوہر کے رشتہ داروں سے نفرت۔ زود رنجی اور جدائی کی دھمکی۔ فضول خرچی اور مقابلہ کی عادت۔ مردوں کے چند عیوب۔ حرص و طمع۔ عورتوں کی تحقیر۔ تعلیمیافتہ مردوں کے گھر میاں بیوی میں تکلف۔ دیہات اور شہر مشرق و مغرب کا نسوانی موازنہ۔ دور ولادت۔ دور طفلی۔ جوانی سے پہلے منگنی اور شادی کا دور وغیرہ۔ ان تمام مضامین میں مردوں اور عورتوں کے ان تمام عیوب و نقائص کو نمایاں کیا گیا ہے جن کی وجہ سے دونوں کی باہمی زندگی اجیرن ہو گئی ہے اور وہ روز بروز مصیبت و پریشانی، تباہی و بربادی میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ ساتھ ہی ان خراب عادات و اخلاق کے اصلاح کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں۔

یہ مضامین اب سے تقریباً پندرہ سولہ برس پہلے کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس مدت میں مصر میں نسوانی ترقی کی تحریک بہت آگے بڑھ چکی ہے بلکہ بعض موقعوں پر حدود سے تجاوز کر گئی ہے لیکن ہندوستان میں یہ مضامین اب بھی اسی طرح مفید ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسلام کی روشنی میں لکھے گئے ہیں اور خیالات بہت معتدل ہیں۔ اصل مضامین عربی میں تھے۔ جناب مولانا عبدالحمید صاحب نعمانی نے نہایت سلیس اور بامحاورہ اردو میں ترجمہ کیا ہے اور ایک مفید مقدمہ کا بھی اضافہ فرمایا ہے۔ شروع میں باحثۃ البادیہ کے مختصر سے حالات بھی لکھے ہیں اور اس کی تصویر بھی دی ہے۔

آلام حیات | مخمور اکبرآبادی ادبی دنیا میں مشہور و معروف شخصیت کے مالک ہیں۔ جن لوگوں نے نقاد کے پرچے دیکھے

ہیں وہ مخمور کو ایک بلند پایہ ادیب تسلیم کرنے میں تامل نہیں کر سکتے۔ نقاد کے بعد مخمور نے گوشۂ عافیت اختیار کر لیا کبھی کبھی [illegible]
میں مخمور نظر آجاتے تھے۔ ان سے ادب اردو کو بہت سی توقعات تھیں، وہ اب مایوسی میں تبدیل ہو رہی تھیں لیکن مقام شکر
ہے کہ یہ مایوسی دور ہونیوالی ہے۔ مخمور کے شائع شدہ ادبی مضامین میں سے بعض کو مرتب کرکے شائع کیا گیا ہے؛ اور یہ اس کا
پیش خیمہ ہے کہ مخمور اب پھر ادبی دنیا میں کیف پیدا کریں گے۔

کتاب میں کل ۵ افسانے ہیں اور ہر افسانہ بجائے خود ایک مستقل سامان کیف و تاثر ہے۔ فہرست یہ ہے:-

(۱) بادشاہ کی محبت میں (۲) بنت البحر (۳) ملکۂ بہار (۴) اسیر بحر (۵) دولہا کی روح۔

جن لوگوں کو ادب لطیف سے ذوق ہے امید ہے کہ وہ اس مجموعہ کی ضرور قدر افزائی کریں گے۔

آگرہ اخبار پریس کے حسن کتابت و طباعت کے تعارف کی ضرورت نہیں۔ قیمت ۱۲، ملنے کا پتہ "تسنیم بک ایجنسی آگرہ" یا "رام پرشاد اینڈ برادرس کتب فروش، چوک، آگرہ"

مشاہیر اردو کے خطوط | بابو مہیش پرشاد صاحب "مولوی فاضل، ہیڈ مولوی، عربی فارسی اردو ڈپارٹمنٹ ہندو یونیورسٹی بنارس" نے یہ کتاب تیار کی ہے۔ درج شدہ خطوط میں اکثر خطوط شائع شدہ ہیں۔

شروع میں "خطوط اور ان کی اہمیت" پر مولوی عبدالحق سکریٹری انجمن ترقی اردو کے خیالات کا اقتباس "مکتوبات حالی" سے مولانا سید سلیمان ندوی، مولوی محمد امین صاحب زبیری، مرزا محمد عسکری اور مولانا حالی کے خیالات کے اقتباسات علی الترتیب مکاتیب شبلی، مکاتیب، ادبی خطوط غالب، اور مکاتیب امیر مینائی سے ماخوذ ہیں۔ پھر "عرضداشت مؤلف" کے عنوان سے جناب مؤلف فرماتے ہیں "...... میں نے دیکھا کہ جس طرح مشاہیر اردو کے منتخب مضامین کا مجموعہ درس و تدریس کے حق میں بکار آمد ہے، اسی طرح چیدہ چیدہ خطوط بھی کچھ کم سودمند نہیں ہونگے"

امید ہے کتاب بچوں کے لئے "سودمند" ثابت ہوگی، جناب مؤلف کو خطوط کے انتخاب میں ذرا اور دقت نظر سے کام لینا چاہئے تھا۔

کتابت اچھی، کاغذ عمدہ، طباعت صاف، قیمت ۸، ملنے کا پتہ: "کے۔ بی۔ اگروالا، شانتی پریس، الہ آباد۔"

۱۔ رہبر حجاج۔ **ہدایات بابتہ حج ۱۹۳۳ء** | چھوٹی تقطیع ۸۰ صفحے غالباً مفت۔ ملنے کا پتہ "ہند پریس کلکتہ"
حکومت نجد و حجاز کی جانب سے ہر سال حاجیوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے ایک پمفلٹ

شائع ہوتا ہے جس میں حج کے متعلق تفصیلی معلومات درج ہوتی ہیں۔ حسب معمول اس سال بھی یہ پمفلٹ عربی میں شائع ہوا تھا۔ ہند پریس کلکتہ نے اس کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے اور جلالۃ الملک سلطان عبدالعزیز کی ان دو تقریروں کا اضافہ کر دیا ہے جو دو مختلف موقعوں پر سلطان نے کی ہیں۔ یہ رسالہ ضرورت مند اصحاب کو مندرجہ بالا پتہ پر مفت مل سکتا ہے۔

اسی قسم اور سائز کا ایک اور رسالہ دہلی سے شائع ہوا ہے۔ ترتیب میں کچھ فرق ہو گا ورنہ مضامین وہی ہیں البتہ لکھائی چھپائی اور کاغذ نسبتہ بہتر ہے۔ ملنے کا پتہ: "محمد بن حمد العمری، جامعہ ملیہ اسلامیہ، قرول باغ، دہلی"

آرسی | (مصنفہ نثار حسین خاں صاحب شیدا) حجم ۲۲۰ صفحہ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ لکھائی چھپائی اوسط درجے کی، کاغذ نفیس چکنا قیمت فی نسخہ مجلد عہ ملنے کا پتہ مقبول حسین خاں، دریاباد، الہ آباد)۔

یہ حضرت شیدا الہ آبادی کے ریختی کلام کا مجموعہ ہے۔ ریختی ہمارے ہندوستانی تمدن کے دور تنزل کی یادگار ہے۔ اس زمانے میں کم سے کم ادب اور شاعری کے میدان میں ایجاد اور اختراع کی کمی نہیں تھی لیکن معاشرت کا ذہن اخلاقی پستی کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا اس لئے جو چیز نکلی اس رنگ میں رنگی ہوئی نکلی۔ ریختی کا موضوع یہ تھا کہ عورتوں کے خیالات عورتوں ہی کی زبان میں ادا کئے جائیں۔ یہ بجائے خود بہت اچھا خیال تھا لیکن زمانے کی زہریلی آب و ہوا کے اثر سے جو درخت اس بیج سے اگا اس کا پھل پکنے سے پہلے سڑ گیا جس سے دونوں نے اخلاق ایک طرف ذوق شعر بھی پناہ مانگتا ہے۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ یہ اس عہد کی معاشرت کی سچی تصویر ہے اور اس لحاظ سے قابل قدر ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس شاعری میں ہماری پست معاشرت کا رنگ ہی نہیں جسے دیکھ کر عبرت ہو بلکہ اس کی بو بھی ہے جسے سونگھ کر دماغ پراگندہ ہو جاتا ہے۔ حضرت شیدا کی ریختی جان صاحب اور میاں رنگیں کی ریختی سے غنیمت ہے لیکن اسے پڑھنے میں بھی اکثر ناک پر رومال رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہرحال جن لوگوں کو "ارباب نشاط" کی زبان، خیالات اور طرز زندگی سے دلچسپی ہو وہ آرسی میں اپنا منہ دیکھیں اور شرمائیں یا اترائیں یا جو حضرات آجکل کے بازاری نظریہ جمالیات کے قائل ہوں وہ یہ سمجھ کر اس کا مطالعہ کریں

تو سر بہ بین و ورق در نورد و دم درکش   مبیں کہ سحر نگاہاں سیاہ کار انند

ہمیں تو حضرت شیدا کے ایک شعر سے بڑی تسکین ہوئی۔ خدا کرے ان کی پیش گوئی پوری ہو۔

ریختی گوئی اب آکر ختم شیدا پر ہوئی   جان صاحب نے کہی رنگین نے ایجاد کی

اخبارات و رسائل

سالنامہ نیرنگ خیال ۱۹۳۳ء - ہمایوں سالگرہ نمبر جنوری ۱۹۳۳ء - نیرنگ سالگرہ نمبر ۱۹۳۳ء - خاص نمبر عالمگیر ۱۹۳۳ء - پیشوا قرآن نمبر - آئینہ - امہات - نوید -

سالنامہ نیرنگ خیال ۱۹۳۳ء | (قیمت ۸/ حجم ۲۰۰ صفحہ لکھائی چھپائی کاغذ حسب معمول رنگین اور سادہ تصاویر متعدد۔ سرورق خوشنما۔ ملنے کا پتہ شاہی محلہ لاہور)

نیرنگ خیال اور اس کا سالنامہ تعارف کا محتاج نہیں۔ اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ اس پرچے میں قدیم معیار قائم رکھا گیا ہے بلکہ اور ترقی ہوئی ہے۔ نیرنگ کے پرانے قلمی معاونین کے علاوہ جن میں اردو کے اکثر مشہور مصنف اور مضمون نگار شامل ہیں اس بار نواب نصیر حسین صاحب خیال اور مولوی عنایت اللہ صاحب کے مضامین اور محمود خاں صاحب شیرانی کی ایک نظم بھی ہے۔ تصویروں کا انتخاب خاص طور پر قابل تعریف ہے اور بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ مضمون نگاروں کے فوٹو کم ہیں۔ بعض مضامین ایسے بھی ہیں کہ اگر نہ ہوتے تو اچھا تھا لیکن اس عیب سے تو اردو کا کوئی رسالہ خالی نہیں۔

ہمایوں سال گرہ نمبر جنوری ۱۹۳۳ء | ایڈیٹر بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) و حامد علی خاں۔ ضخامت ۱۵۲ صفحات قیمت ایک روپیہ۔ قیمت سالانہ للعہ مقام اشاعت لاہور۔

ہمایوں لاہور کا ایک وقیع، سنجیدہ اور متین رسالہ ہے اور نہایت خاموشی سے علمی و ادبی خدمات انجام دے رہا ہے۔ نئے سال کی خوشی میں اس نے بھی ایک خاص نمبر نکالا ہے اور اپنی علمی متانت کے اعتبار سے سال کے تمام خاص نمبروں پر بھاری ہے۔ اس نمبر کی ضخامت ۱۵۲ صفحات ہے اور کل مضامین نظم و نثر کی تعداد ۴۰ ہے۔ مضامین ویسے تو سبھی بہت اچھے ہیں لیکن 'خوشی کی تسخیر' (بشیر احمد)، 'میرا سخت ترین نقاد' (فلک پیما)، 'آزاد نگارستان' اور 'داداجان' (مرزا فرحت اللہ بیگ)، 'سکینہ' (فیاض محمود)، 'دوست یا دشمن' (پریم چند) خاص طور پر پڑھنے کی چیزیں ہیں۔ نثر کے ساتھ نظم کا حصہ بھی بہت بہتر ہے۔ خود بشیر احمد صاحب بہت اچھے شاعر ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت جوش ملیح آبادی، آزاد انصاری، فراق گورکھپوری، آثر صہبائی، امجد حیدرآبادی جیسے مشہور شعراء کا کلام بھی موجود ہے۔ تصاویر دس ہیں اور ہر ایک کسی نہ کسی خاص مقصد کی حامل ہے۔ ٹائٹل بھی بہت خوشنما اور شاندار ہے، غرض مجموعی حیثیت سے یہ نمبر قابل قدر ہے اور اس کے مرتب لائق مبارکباد۔

نیرنگ سالگرہ نمبر سنہ ۱۹۳۳ء | ایڈیٹر عشرت رحمانی قیمت عمہ، سالانہ چندہ عا، مقام اشاعت دہلی۔

نیرنگ نے رام پور سے دہلی میں منتقل ہونے کے بعد روحانی اور جسمانی ہر اعتبار سے غیر معمولی ترقی کی ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ منتظمین رسالہ کو ترقی دینے میں بہت عرق ریزی اور جانکاہی سے کام لے رہے ہیں اور موجودہ نمبر اس کا بہترین ثبوت ہے۔

اس خاص نمبر کی ضخامت اشتہارات کے علاوہ ۱۴۰ صفحات ہے۔ مضامین نظم و نثر کی تعداد تقریباً ۴۰ ہوگی۔ مضمون نگاروں میں جناب محمد حسین صاحب ادیب، ایم اسلم، عیش امروہوی، سلطان حیدر جوش، سرفراز حسین قاری، علی عباس حسینی اور شعراء میں مولانا حسرت موہانی، حضرت جلیل، آزاد انصاری، جوش ملیح آبادی، یگانہ لکھنوی، جگر مراد آبادی، محوی لکھنوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ تبرکات غالبؔ کے زیر عنوان غالب کی ایک غیر مطبوعہ غزل ہے جس نے رسالہ کی وقعت دوبالا کر دی ہے۔ تصویریں کل ۲۰ ہیں اور سب کی سب جاذب نظر۔ اکثر تصاویر پر خاص طور سے نظمیں لکھوائی گئی ہیں۔ ٹائٹل بہت خوبصورت، کاغذ، کتابت و طباعت اور صفائی ستھرائی کے اعتبار سے اس سال کا کوئی خاص نمبر شاید ہی اس کا مقابلہ کر سکے۔

خاص نمبر عالمگیر سنہ ۱۹۳۳ء | ضخامت ۱۹۴ صفحات، قیمت عہ، چندہ سالانہ للعہ، مقام اشاعت لاہور۔

عالمگیر نے اپنے خاص نمبروں کے اعتبار سے خاص شہرت حاصل کر لی ہے۔ سال میں اس کے تین چار خاص نمبر ضرور نکل جاتے ہیں۔ موجودہ نمبر بھی بہت سی خوبیوں کا حامل ہے۔ بڑا سائز ہے اور ۱۹۴ صفحات کا حجم ہے۔ تقریباً ۵۱ مضامین نظم و نثر ہیں۔ نثر میں علی عباس حسینی، مرزا فرحت اللہ بیگ، اعظمی اجمیری، مولینا احد ایم۔ اے، ایم اسلم، فہیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی کے مضامین خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ حصۂ نظم میں دوسرے شعرائے کے علاوہ حضرت جلیل، مولانا محوی، حضرت صفی، حضرت عزیز، ظریف لکھنوی اور یگانہ لکھنوی کے اسمائے گرامی بھی نظر آتے ہیں۔ تصاویر کل ۱۴ ہیں۔ ان میں آٹھ سہ رنگی ہیں۔ ان میں سے اکثر تصویروں پر مشہور شاعروں سے نظمیں لکھوائی گئی ہیں۔ کتابت و طباعت اور کاغذ متوسط، ٹائٹل خوبصورت اور شوخ۔

پیشوا قرآن نمبر | ضخامت ۱۲۰ صفحات۔ قیمت ۶، مقام اشاعت دہلی۔

ایڈیٹر صاحب رسالہ پیشوا کا یہ عمل خیر شکریہ کا مستحق ہے کہ انھوں نے اس مقدس مہینہ کی مناسبت سے

ایک ضخیم نمبر نکال کر قرآنی علوم و فنون سے متعلق بہت سے قیمتی مضامین یک جا فراہم کر دئے۔ اس نمبر میں کل ۲۰ مضامین نظم و نثر ہیں اور سب کے سب مقدس و محترم کلام پاک سے متعلق ہیں۔ یہ مضامین عام مسلمانوں کے لئے خاص طور پر بہت مفید ہیں اور انھیں قرآن کے فہم میں یقیناً بہت مدد دیں گے۔ مضمون نگاروں کی فہرست میں جناب مولانا ظفر علی خاں صاحب، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، مولانا عبدالسلام صاحب ندوی، کے اسمائے گرامی بھی نظر آتے ہیں۔

ان خوبیوں کے علاوہ رسالہ میں دس تصویریں بھی ہیں اور اکثر دنیا کی مشہور مساجد جامع قرطبہ، سوناطہ، اشبیلیہ وغیرہ کی ہیں۔ غرض یہ رسالہ ہر حیثیت سے کامیاب ہے اور قرآن سے شغف رکھنے والوں کے لئے دلچسپی نیز اضافۂ معلومات کا موجب ہے۔

ویسے بھی یہ رسالہ ہر ماہ مفید مذہبی معلومات پیش کرتا رہتا ہے۔ باوجود اس کے عام افادہ کے خیال سے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے یعنی قسم اول کی (جو اعلیٰ چکنے کاغذ پر چھپتا ہے اور چار صفحے فوٹو بلاک کے ہوتے ہیں) ۲/ ہے اور قسم دوم کی (جس کا کاغذ معمولی ہوتا ہے اور تصاویر بھی نہیں ہوتیں) ۱؎ ہے۔ ضخامت دونوں پرچوں کی اسی صفحے ہوتی ہے اور باوجودیکہ قیمت اس قدر کم ہے ایڈیٹر صاحب جنوری میں ڈیڑھ سو صفحے کا قرآن نمبر اور جولائی میں ڈھائی سو صفحے کا رسول نمبر بھی اپنے ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

آئینہ | ماہوار مصور رسالہ سائز ۲۰×۲۶/۸ ایڈیٹر سید ابن الحسن صاحب فکر ایم اے۔ قیمت سالانہ ۱؎ مقام اشاعت دہلی۔

سید ابن الحسن صاحب اردو کے مشہور اور مشاق اخبار نویس ہیں۔ عرصے تک الہلال مرحوم (کلکتہ) میں کام کر چکے ہیں۔ ان کی نگرانی اور ادارت میں جو چیز بھی نکلے گی وہ قابل قدر اور لائق اطمینان ہوگی۔

اس وقت ہمارے سامنے آئینہ کا پہلا پرچہ ہے۔ اس میں علمی ادبی سبھی طرح کے مضامین ہیں۔ مضمون نگاروں میں خود جناب فکر، خواجہ عبدالرؤف عشرت، مولوی عبدالمالک آروی، حضرت ملا رموزی، حضرت احسن مارہروی، اور جناب وحشت کلکتوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان تمام خوبیوں کے ساتھ قیمت بہت کم رکھی ہے اور اسی لئے امید ہے کہ رسالہ بہت جلد مقبولیت حاصل کرے گا۔

امہات | ہفتہ وار، مدیر خصوصی قمر النساء بیگم، چندہ سالانہ ۳؎، فی پرچہ ۱/ مقام اشاعت بھوپال۔

یہ مفید اخبار جناب محمود الحسن صاحب صدیقی سابق ایڈیٹر کے زیر انتظام ونگرانی اور قمر النساء بیگم صاحب کی ادارت میں بھوپال سے نکلا ہے۔ پہلا اور تیسرا نمبر اس وقت پیش نظر ہیں تمام مضامین طبقۂ نسواں کے لئے مفید اور لائق مطالعہ ہیں۔ ترتیب میں بھی خاص صفائی اور سلیقہ سے کام لیا گیا ہے۔ محمود الحسن صاحب سے امید ہے کہ وہ کتابت وطباعت کی جانب خاص طور پر توجہ کریں گے۔

نوید | ہفتہ وار، ایڈیٹر سید حسن ریاض، چندہ سالانہ للعہ، فی پرچہ ا، مقام اشاعت گھسیاری منڈی لکھنؤ۔

مرحوم روزنامۂ ہمت کے بند ہو جانے کے بعد لکھنؤ میں ایک سنجیدہ مسلمان روزنامہ کی کمی محسوس کی جاتی تھی۔ اور سید حسن ریاض صاحب سابق ایڈیٹر ہمت برابر اس کوشش میں مصروف تھے کہ ہمت کو دوبارہ زندہ کیا جائے لیکن ان کی یہ کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں اور اب اس طرف سے مایوس ہو کر انھوں نے ایک اردو پریس ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی ہے جس کے زیر انتظام روزانہ اور ہفتہ وار اخبار شائع کئے جائیں گے۔ سردست ہفتہ وار اخبار نوید کے نام سے شائع کر دیا گیا ہے۔ روزانہ اخبار کچھ دنوں بعد نکلے گا۔

ہفتہ وار نوید کے مدیر ومرتب جناب سید حسن ریاض ہیں۔ اخبار کی ضخامت ۱۶ صفحے ہے۔ اس کی ترتیب کا خلاصہ یہ ہے کہ دوسرے صفحہ پر اقتباسات ہیں، تیسرے پر واقعات حاضرہ پر سرسری نظر کے عنوان سے مختصر نوٹ ہیں، چوتھے پر افتتاحیہ، اس کے بعد مفید سیاسی پھر علمی، ادبی اور مذہبی مضامین، علاوہ بریں نظمیں بھی ہیں۔ ایک افسانہ بھی ہے۔ غرض وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک ہفتہ وار پرچہ میں ہونی چاہئیں۔ پالیسی ابھی تک "مرنجاں مرنج" ہے۔ ترتیب میں سلیقہ اور مضامین میں سنجیدگی ہے۔ توقع ہے کہ اخبار آیندہ مزید ترقی کرے گا اور ایسوسی ایشن مذکورہ روزانہ اخبار نکالنے میں بہت جلد کامیاب ہوگا۔

دنیا کی رفتار

اسلامی ممالک

ترکی | ترکی حکومت نے سمسون سے لے کر سیواس تک تقریباً ڈھائی سو میل لمبی ریل کی پٹری مکمل کر لی ہے اور اس طرح بحر اسود کو وسط اناطولیہ سے ملا دیا ہے۔ قیصری کے راستے سے انقرہ سے لے کر سیواس تک تو ریل سنہ ۱۹۳۰ء میں ہی مکمل ہو چکی تھی اس لئے اب استامبول سے سمسون تک انقرہ ہو کر ریل کا سفر ممکن ہو گیا ہے۔ وسطی اور مغربی ریلوے لائنوں کو ملانے کا کام جو قوطاہیہ سے بالقیسر تک ہو رہا تھا اب قریب ختم ہے اور صرف ایک سرنگ نکالنے کی اور ضرورت ہے۔ قیصری سے الوق الیشلاک کام جاری ہے جو تقریباً دو برس میں ختم ہو جائے گا۔ اس طرح بحر اسود سے بحر ابیض تک مسلسل ریل ہو جائے گی۔ انقرہ اور فلیوس کے درمیان کی لائن کا افتتاح بھی غالباً سنہ ۴۲ء میں ہو سکے گا۔ یوں بحر اسود کے کنارے جو کوئلے کی کانیں ہیں ان کا تعلق براہ راست انقرہ اور ملک کے اندرونی حصے سے ہو جائیگا۔ بغداد ریلوے کا اضافہ دیار بکر تک بھی اس وقت تک ہو جائیگا۔ یہ تمام کام حکومت کی موجودہ آمدنی سے ہو رہا ہے اور بہت جلد ترکی میں ریلوں کا ایک ایسا جال بچھ جائے گا جو نہ صرف معاشی ترقی کے لئے بلکہ ملک کی حفاظت کے لئے بھی بہت مفید ثابت ہوگا۔

... ...

ترکی زبان کو خارجی خصوصاً عربی اور فارسی الفاظ سے پاک کرنے کی تحریک میں خود مصطفےٰ کمال پاشا سب سے زیادہ حصہ لے رہے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے حال میں کاظم پاشا صدر مجلس کو ایک تار دیا ہے جس میں کوئی لفظ عربی یا فارسی کا نہیں لکھا ہے۔

... ...

۲۰ اگست کو درآمد پر جو پابندیاں حکومت کی طرف سے عائد کی گئی تھیں ان سے تاجروں میں ایسی بے چینی پھیلی کہ مصطفےٰ شریف بے وزیر اقتصاد کو استعفا دینا پڑا۔ ان کی جگہ پر جلال بے کا تقرر ہوا جنھوں نے فوراً درآمد اور برآمد کے ضوابط میں اہم تبدیلیاں کیں۔ اب ترکی صنعتوں کے لئے جن خام اجناس کی ضرورت ہے ان کا داخلہ بغیر کسی

پابندی کے ہو رہا ہے۔

مصر وزیر اعظم صدقی پاشا نے ابھی یورپ کا سفر کیا تھا اور اپنے قیام کو اس لئے ذرا طویل کر دیا کہ وہ اطالوی اور فرانسیسی حکومتوں سے مصری قرضے کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ مصری قرضۂ عامہ کی قسطیں سونے کے ذریعے ادا کی جائیں یا پاؤنڈ اسٹرلنگ کے ذریعے۔ سنا جاتا ہے کہ صدقی پاشا کی اس خواہش کو کہ ادائیگی اسٹرلنگ کے ذریعے ہو اطالوی حکومت نے نظر قبول سے دیکھا ہے۔

... ...

روئی کا نرخ گر جانے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب اس رقبے میں جس میں روئی کی کاشت ہوتی تھی بہت کمی ہو گئی ہے۔ حکومت کے احکام سے تو صرف ایک تہائی رقبے کی کمی لازمی تھی مگر فلاحین نے خود اس سے زیادہ تخفیف کی اور اب مشکل سے نصف رقبے میں روئی کی کاشت ہوتی ہے۔ زیادہ تر تو روئی کی جگہ گیہوں نے لے لی ہے۔ اب اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلے کا نرخ بھی بہت گر گیا۔ حکومت نے گیہوں اور آٹے کی درآمد پر محصول بڑھا دیا ہے اور اس کوشش میں ہے کہ مصر کو کم از کم ان اجناس کے لئے کافی بالذات بنا دے۔ اب تک پچاس لاکھ ڈالر کا گیہوں بالخصوص آسٹریلیا سے ملک میں آیا ہے۔ حکومت نے فلاحین کو فصل کی ضمانت پر جو قرضے دئے تھے ان کی ادائیگی بالکل نہیں ہو رہی ہے۔ اب صرف دو صورتیں رہ گئی ہیں یا تو یہ کثیر رقم معاف کر دی جائے اور یوں حکومت کا نقصان ہو یا غریب فلاحین کے چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی ضبط کر لئے جائیں۔

شام کچھ روز ہوئے دمشق میں مجلس وزراء کا ایک جلسہ ہوا جس میں اقتصاد کا مسئلہ پیش تھا۔ پنشن کی مد میں سرکاری ملازموں کی تنخواہ میں سے اب تک ۷ فی صدی وضع ہوتا تھا۔ اب یہ رقم بڑھا کر ۱۰ فی صدی کر دی گئی ہے۔ تاوان، انعامات اور زائدات کی ادائیگی بالکل بند کر دی گئی۔ موٹر الاؤنس منسوخ کر دیا گیا۔ اخراجات سفر میں ۲۵ فی صدی کی تخفیف کی گئی اور دفتری اخراجات میں ۲۰ فی صدی کی۔ یہ تجویز بھی منظور ہوئی کہ ساٹھ سال کی عمر کے عہدہ دار یا وہ لوگ جو چالیس سال ملازم رہ چکے ہیں وظیفہ دے کر علیحدہ کر دئے جائیں۔ بعض کمیشن منسوخ کر دئے گئے اور اگلے سال کے لئے رفاہ عامہ کی مد میں صرف ایک لاکھ پینتالیس ہزار شامی پاؤنڈ کی منظوری دی گئی۔

افغانستان افغانستان پر حکومت کرنا آسان نہیں۔ باشندوں کا اختلاف، دشوار گذار گھاٹیاں اور سرداران قبائل کی سرکشی ایسے عناصر ہیں کہ مشکل سے کوئی بادشاہ اس ملک میں امن چین سے اپنی حکومت کے دن گذار سکتا ہے۔ امیر امان اللہ خاں کی حکومت کا جو انجام ہوا اس سے شاید ہی کوئی بے خبر ہو۔ خیال تھا کہ اب نادر خاں کے عہد میں امن و امان رہے گا مبصرین کہتے تھے کہ انھوں نے اپنی سلطنت کی بنیادیں مضبوط کر لی ہیں اور اب کم از کم ان کی زندگی میں کوئی خطرہ نہیں لیکن یک بیک خبر آئی کہ ایک مشہور سردار کو اس جرم میں سزائے موت دی گئی کہ انھوں نے حکومت کے خلاف سازش کی تھی۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے کہ نادر شاہ کے بھائی سردار شاہ ولی خاں کے ساتھ سردار غلام نبی خاں بھی کابل جاتے ہوئے ہندوستان سے گذرے تھے۔ کون یہ خیال کر سکتا تھا کہ چند ہی روز کے بعد ان کو سزائے موت ملے گی۔ سردار غلام نبی خاں امیر عبدالرحمٰن خاں کے مشہور سپہ سالار غلام حیدر خاں کے لڑکے اور یوسف زئی قبیلے کے سردار تھے۔ ان کا اثر نہ صرف افغانستان میں ہی بہت تھا بلکہ روس کے ارباب حل وعقد کو ان سے ایک زمانے میں بہت توقعات تھیں۔ یہ ایک عرصے تک روس میں افغانستان کے سفیر بھی رہ چکے تھے اور ۱۹۲۹ء کے اوائل میں امان اللہ خاں کی مدد کے لئے روسی علاقے کے باشندوں کی ایک فوج لے کر افغانستان پہنچے تھے۔ جب امان اللہ خاں جنگ سے دست بردار ہو گئے تو غلام نبی خاں نے خود حکومت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اسی وجہ سے ان سے اور نادر شاہ سے مخالفت چلی آتی تھی لیکن نادر شاہ نے غلام نبی خاں کے بھائیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور جب یہ خبر آئی کہ غلام نبی خاں شاہ ولی خاں کے ساتھ کابل واپس جا رہے ہیں تو یہ امید بندھی تھی کہ اس ناگوار مخالفت کا دور اب ختم ہو جائے گا اور غلام نبی خاں نادر شاہ کی موافقت میں اپنے اثر کو کام میں لائیں گے

اسی دوران میں جنوبی افغانستان میں ایک بغاوت رونما ہوئی جس کے ابھارنے والے امیر امان اللہ خاں کے قریبی رشتے دار تھے اور جن میں سے ایک نے اپنے آپ کو عنایت اللہ ثانی مشہور کر دیا تھا۔ حکومت اس بغاوت کو دبا دینے میں کامیاب ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اسی سلسلے میں کچھ ایسے کاغذات ملے جن سے یہ بات یقین کے درجے تک پہنچ گئی کہ غلام نبی خاں بھی اس سازش میں شریک تھے۔ چنانچہ ان کو فوراً گرفتار کر کے بغاوت کے الزام میں قومی جرگے کے سامنے پیش کیا گیا۔ جرگے نے تمام واقعات پر غور کرنے کے بعد سزائے موت تجویز کی اور گرفتاری کے چار ہی دن کے اندر ان کو پھانسی دیدی گئی۔ اس با اثر سردار کے افسوس ناک انجام کا افغانستان پر کیا اثر ہوگا؟ ممکن ہے کہ یوسف زئی قبیلہ بغاوت پر آمادہ ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اتنے بڑے سردار کا قتل لوگوں کی ہمت پست کر دے۔ بہرحال اس وقت تو نادر شاہ کو بغاوت کے اس آسانی سے فرو ہو جانے

کی وجہ سے بہت تقویت پہنچی ہے اور کچھ دنوں تک غالباً کسی کو ہتھیار اٹھانے کی جرأت نہیں ہوگی۔

ایران | ایران میں اینگلو پرشین آئل کمپنی کو جو مراعات حاصل تھیں ان سے انگریزوں کو اب تک بہت فائدہ پہنچا ہے لیکن جب سے رضا شاہ کی حکومت قائم ہوئی ہے ایرانیوں کو یہ بات بہت گراں گذر رہی تھی اور حکومت آہستہ آہستہ اس کمپنی کے اقتدار کو کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ادھر دو تین سال سے کمپنی نے یہ اودھم کیا کہ طرح طرح کے بہانے بنا کر اس رقم کو کم کرنا شروع کیا جو ایرانی حکومت کو سالانہ ملنی چاہیے تھی۔ حکومت نے جب شکایت کی تو کہا یہ گیا کہ آمدنی کم ہوتی ہے۔ اس پر حکومت نے اس محصول کی تعداد دریافت کی جو گذشتہ زمانے میں کمپنی نے انگلستان میں ادا کیا ہے تاکہ اس سے آمدنی کا پتہ چل سکے کمپنی نے اپنے حسابات کے پیش کرنے سے انکار کیا۔ اب حکومت کو موقع ملا اور اس نے مراعات کے منسوخ کرنے کا اعلان کر دیا۔ کمپنی نے حکومت کو اطلاع دی کہ وہ یہ مسئلہ ہاگ کی بین الاقوامی عدالت کے سامنے پیش کرے گی۔ حکومت ایران نے جواب دیا اگر یہ قضیہ مجلس اقوام کے سامنے پیش ہو تو اسے کوئی عذر نہ ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ایک کمیٹی مجلس اقوام نے اس مسئلے کی تحقیقات کے لئے مقرر کر دی ہے۔ حکومت ایران کا دعویٰ ہے کہ جو مراعات دستوری حکومت کے قیام سے پہلے کسی کو بھی حاصل تھیں وہ اس حکومت کی طرف سے نہیں سمجھی جا سکتیں اور اس حکومت کو ان کے منسوخ کرنے کا پورا حق ہے۔ انگلستان میں منسوخی کی خبر سے بہت تشویش پھیل گئی ہے اور حکومت انگلستان کی طرف سے ایک بہت ہی سخت تحریر ایران کی حکومت کے پاس پہنچی ہے۔ لیکن ایران کی حکومت اپنی بات پر اڑی ہوئی ہے۔ ایران میں جب یہ خبر مشہور ہوئی تو تمام ملک میں خوشی منائی گئی اور چراغاں کیا گیا۔ اس مسئلے کا قانونی پہلو کچھ بھی ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ جب کسی قوم میں احساس خودداری پیدا ہو جاتا ہے تو وہ اپنے ملک میں کسی قسم کی خارجی مداخلت کو برداشت نہیں کر سکتی اور ذرا ذرا سی بات پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت ایران کی بھی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اگر یہ کمپنی وہاں سے علیحدہ ہو جائے تو ایرانی خود مٹی کے تیل کے کارخانوں کا اچھا انتظام نہ کر سکیں مگر یہ بات خارج از بحث ہے۔ یہ مسئلہ معاشی یا اقتصادی نہیں ہے بلکہ نفسیات قومی سے تعلق ہے اور اسے اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے۔

ممالک غیر

انگلستان | ۱۰ نومبر کو پارلیمنٹ کا ایک اجلاس ختم ہوا اور ۲۲ نومبر کو دوسرا اجلاس شروع ہو گیا۔ حسب معمول دونوں مواقع

پر ملک معظم کی تقریریں ہوئیں۔ شاید کم ایسا ہوا ہوگا کہ بادشاہ کی طرف سے پارلیمنٹ میں اتنے کم فصل سے دو تقریریں ہوئی ہوں۔ پہلی تقریر میں حکومت کے کاموں پر تبصرہ تھا اور دوسری میں ان کارروائیوں کی طرف اشارہ جو پیش نظر ہیں۔ دونوں تقریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت انگلستان کے سامنے سب سے اہم مسئلہ اپنی تجارت اور ملکی معیشت کو درست کرنے کا ہے۔ ملک معظم نے پہلی تقریر میں فرمایا کہ "میں بہت خوش ہوں کہ اوٹاوا کی معاشی کانفرنس نہایت کامیابی سے ختم ہوئی۔ اس کانفرنس میں میری سلطنت کے مختلف حصوں کے نمائندے موجود تھے اور مجھے یقین ہے کہ اس کی وجہ سے میری سلطنت کی مختلف اقوام میں روابط باہمی اور مضبوط ہو جائیں گے اور سلطنت کی تجارت کو فروغ ہوگا"۔

اس کے بعد آئرلینڈ کا سرسری سا ذکر تھا اور ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلہ پر اپنے وزیراعظم کے تصفیہ کی تعریف اور اس بات پر اظہار مسرت کہ قومی صرف اور آمدنی میں توازن قائم ہو گیا ہے اور قرضوں کو ادا کرنے اور دوسرے نئے قرضوں میں تبدیل کرنے کی کارروائیاں نہایت کامیابی سے انجام پا چکی ہیں۔ "توازن تجارت کو جو ہمارے مخالف تھا قانون محاصل درآمد کے ذریعے درست کر لیا گیا ہے۔ اس وسیلے سے خاصی آمدنی کا انتظام بھی ہو گیا ہے اور ایک غیر جانبدار مجلس شوریٰ کی ہدایت میں برطانوی صنعتوں کے لئے معقول تامین کی تدبیری عمل آئی ہے"۔

دوسری تقریر میں تخفیف اسلحہ اور ہندوستانی گول میز کانفرنس کا ذکر بھی تھا لیکن خاص زور اس میں بھی تجارت کو فروغ دینے کے وسائل پر ہی تھا۔ ملک معظم نے فرمایا کہ "میری حکومت تجارت کو روبراہ لانے کے لئے ہر طرح کی کوششیں جاری رکھے گی۔ قیمتوں کے گرنے سے زراعت کا حال ایک مدت سے بہت زبوں ہے۔ میرے وزراء کو پورا احساس ہے کہ ہر چند کہ جو کارروائیاں انہوں نے حال میں گوشت اور دوسری زرعی پیداوار کے سلسلے میں کی ہیں ان سے واقعی مدد پہونچی ہے پھر بھی اس مقصد کے لئے کہ زراعت کو ہماری قومی معیشت میں اس کی اچھی جگہ دی جا سکے مزید تدابیر ضروری ہیں"۔

تقریر میں بے کاری کے بیمہ کے متعلق ایک قانون کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔ نیز لگان پر کچھ پابندیاں عاید کرنے کے لئے ایک قانون کا۔ جن لوگوں کو توقع تھی کہ پارلیمنٹ کے ایوان اعلیٰ کی اصلاح کے متعلق بھی ان تقریروں میں کچھ ارشاد ہوگا وہ ضرور مایوس ہوئے ہوں گے۔

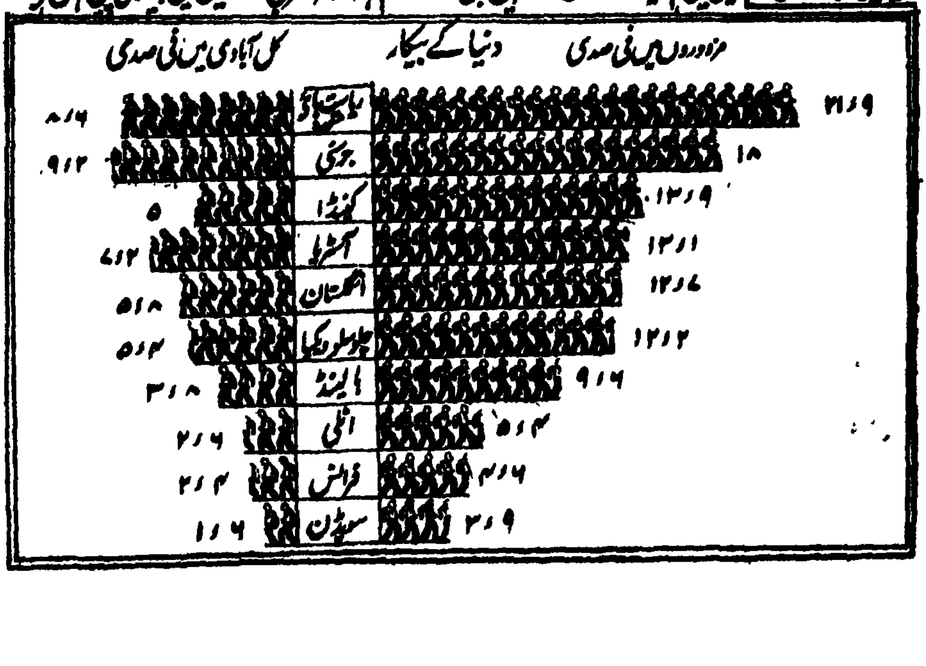
ایک اہم تقریر اور ممالک کی طرح برطانیہ کے لئے بھی بے کاری کا مسئلہ بہت تشویشناک ہے۔ ہر سو مزدوروں میں تقریباً ۲۳ بے کار ہیں۔ چنانچہ پارلیمنٹ میں ۱۰ نومبر کو اس مسئلہ پر جو مباحثہ شروع ہوا وہ برابر تین روز تک جاری رہا۔

حکومت کی طرف سے کوئی نئی دلیل یا نئی تجویز پیش نہیں کی گئی۔ وزرا کی تقریروں کا لب لباب یہ تھا کہ ہم نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ برطانوی صنعت کو تباہی سے بچالیں اور اگر ہماری کوششیں کامیاب نہ ہوتیں تو معاملات ابتک بہت نازک ہو چکے ہوتے۔ یہ صحیح بھی ہے لیکن بہرحال بے کاری کا مسئلہ موجود ہے اور اس کے حل کی اور تدبیریں سوچنا اور ان پر عمل کرنا حکومت وقت کا اولین فرض ہے۔ اس ضمن میں سر رابرٹ ہارن کی تقریر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ حکومت جہاز بنانے والی کمپنیوں کو کم شرح سود پر روپیہ قرض دے جس طرح ۲۰ سال پہلے کونارڈ کمپنی کو دیا گیا تھا۔ سر رابرٹ نے قیمت کے متعلق کہا "ہم نے جب پچھلی دفعہ اس مسئلہ پر بحث کی تھی اس وقت سے بجائے اس کے کہ قیمتیں بڑھتیں سونے کے اعتبار سے تو قیمتیں کچھ گھٹی ہی ہیں۔ پونڈ اسٹرلنگ میں قیمتیں تقریباً وہی ہیں جو اس وقت تھیں جب ہم نے معیار طلائی کو ترک کیا تھا اگرچہ پونڈ مقابلۃً گرا ہے اور واقعہ ہے کہ آج پونڈ سے ہم اس سے زیادہ اجناس خرید سکتے ہیں جتنی ۱۹۲۷ء میں خریدتے تھے۔"

پھر سر رابرٹ نے یہ سادہ معاشی اصول بیان فرمایا کہ "قیمتیں یا تو اس طرح بڑھ سکتی ہیں کہ اجناس کی مقدار کم کی جائے یا اس طرح کہ زر کی مقدار بڑھائی جائے۔ پہلی کوشش کی جا چکی ہے اور سب دیکھ سکتے ہیں کہ ناکام رہی۔ اب دوسری تدبیر کو کیوں نہ آزمایا جائے۔" انھوں نے بتلایا کہ سونا دنیا میں کم ہے لہٰذا زر رائج میں اضافہ سونے کی بنا پر تو ہو نہ سکے گا۔ لہٰذا ان کی رائے ہے کہ چاندی کو پھر بطور زر کام میں لانا چاہیئے۔ اس تجویز میں بہت سے بااثر امریکن اور فرانسیسی مدبر بھی سر رابرٹ کے ہمنوا ہیں اور معاشی معاملات پر خود ان کی رائے بہت توجہ کی مستحق سمجھی جاتی ہے؛ اس لئے ممکن ہے کہ یہ تجویز عمل کا جامہ پہنے اور چاندی کا بازار جلد تیز ہو جائے۔

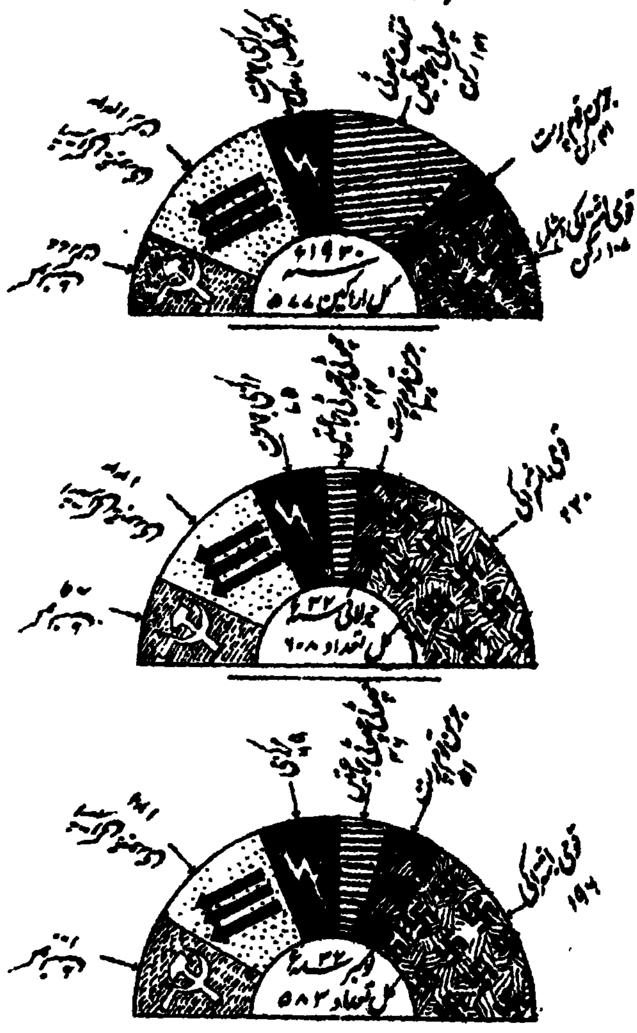
دنیا میں بے کاری

ذیل میں ہم ایک نقشہ درج کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ مغربی ممالک میں کیسی بیکاری پھیلی ہوئی ہے۔



جرمن پارلیمنٹ ہم پچھلے پرچے میں جرمنی کے جدید انتخابات کا ذکر کر چکے ہیں۔ ذیل کے نقشے سے قابل ذکر سیاسی جماعتوں کی قوت کا اندازہ ہو سکے گا اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ان میں دو ڈھائی برس کے اندر کیا تغیر ہوا ہے۔

جرمن پارلیمنٹ میں مختلف جماعتوں کے اراکین



فان شلائشر گذشتہ اشاعتوں میں ہم بارہا لکھ چکے ہیں کہ اس وقت جرمنی میں سب سے زیادہ با اثر آدمی جنرل فان شلائشر ہیں۔

اور جرمن سیاست میں ایک عرصے سے پس پردہ ان کی قوت کارفرما ہے۔ حالات نے رفتہ رفتہ انھیں سامنے آنے پر بھی مجبور کر دیا اور اب یہ جدید جرمن حکومت میں وزیر اعظم ہیں۔ جرمن پارلیمنٹ میں سیاسی جماعتوں کی تقسیم کچھ ایسی ہے کہ صحیح جمہوری طرز کی حکومت کا قیام ممکن نہیں۔ لہذا ایسے شخص کی تلاش تھی جس کا ساتھ کچھ عرصے تک تو اکثریت دے سکے۔ چنانچہ صدر جمہوریہ نے فان شلائشر کے سپرد وزارت بنانے کا کام کر دیا اور غالباً موجودہ حالات میں اس سے بہتر انتخاب مشکل تھا۔

فان شلائشر کے وزیر اعظم ہونے سے ظاہر ہے کہ فرانس میں تشویش پیدا ہوگی۔ اس لئے کہ یہ حال ہی میں وزیر جنگ کی حیثیت سے جرمن فوج کی تنظیم نو کی دھمکی دے چکے ہیں۔ لیکن فان شلائشر کو نرا فوجی سپہ سالار سمجھ لینا غلطی ہے۔ یہ سیاست کی گتھیوں سے خوب واقف ہیں اور ابھی وزیر اعظم ہونے سے پہلے مختلف جماعتوں سے جو گفتگو ہوتی رہی اس میں اپنی سیاسی صلاحیت کا اچھا ثبوت دے چکے ہیں اور توقع کی جا سکتی ہے کہ دوسری دول سے سیاسی معاملات میں ان کا رویہ ہر چند کہ ذرا سخت ہوگا لیکن ایسا نہیں کہ مفاہمت کی راہ مسدود ہو جائے۔

ہندوستان

اسمبلی کا خاص اجلاس | اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کا خاص اجلاس پچھلے ہفتہ ختم ہوگیا۔ موجودہ دستور اساسی کے نفاذ کے بعد مرکزی مجالس کا یہ تیسرا خاص اجلاس تھا جو منعقد کیا گیا ہے۔ پہلا خاص اجلاس ٹاٹا کمپنی کی مصنوعات کی تائید منظور کرنے کی غرض سے شملہ میں ہوا تھا، دوسرا اجلاس گذشتہ سال حکومت ہند کے ضمنی میزانیہ کی منظوری کے لئے منعقد ہوا اور یہ تیسرا خاص اجلاس معاہدۂ اوٹاوا کی تصدیق اور قانون فوجداری کی ترمیم یعنی آرڈیننس بل کی منظوری کے لئے منعقد ہوا تھا۔ معاہدۂ اٹاوا تجارتی نقطۂ نظر سے اور آرڈیننس بل سیاسی حیثیت سے ہندوستان کی رائے عامہ کے نزدیک خاص اہمیت رکھتے تھے جس کا اظہار ہر ممکن طریقہ سے کیا جا چکا ہے لیکن بڑی رد و قدح اور بحث و تمحیص کے بعد بالآخر جو فیصلہ ہوا وہ ہر چند کہ توقعات کے خلاف نہیں ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رائے عامہ کے خلاف ضرور ہے۔

... ...

معاہدۂ اوٹاوہ کے مختلف پہلوؤں پر رسالہ جامعہ کی گذشتہ دو اشاعتوں میں بحث کی جا چکی ہے آرڈیننس

بل بھی اب کوئی نئی چیز نہیں، تحریک سول نافرمانی کے مقابلہ کے لئے وائسرائے نے وقتاً فوقتاً کچھ آرڈیننس جاری کئے تھے جن کا نفاذ قانوناً صرف چھ ماہ کے لئے ہو سکتا تھا۔ ششماہی مدت ختم ہونے کے بعد تمام آرڈیننس ایک جامع آرڈیننس میں شامل کر کے آرڈیننس اختیارات خصوصی کے نام سے نافذ کئے گئے تھے۔ اس آرڈیننس کی مدت بھی ۲۹ دسمبر ۱۹۳۲ء کو ختم ہو گئی لیکن ہنوز تحریک سول نافرمانی کی طرف سے حکومت کو وہی خدشہ ہے جو ۱۹۲۹ء میں یا دسمبر ۱۹۳۱ء میں تھا۔ اس لئے قانون فوجداری میں اس قسم کی ترمیمات کر دی گئی ہیں کہ آرڈیننس مذکور کے تمام اختیارات حکومت کو حاصل ہو جائیں گے۔ یہ ترمیمات فی الحال تین سال کے لئے منظور کی گئی ہیں لیکن حکومت کو اندیشہ ہے کہ یہ ترمیمات مستقلاً قانون کا جزو رہیں گی اور اس میں کسی رد و بدل کی ضرورت نہ پڑے گی۔ حکومت کا یہ خیال اگر صحیح ہے تو اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تحریک سول نافرمانی نے ملک کے طول و عرض میں کس قدر مضبوط جڑیں پکڑ لی ہیں کہ گذشتہ تین سال کی پیہم کوششوں کے بعد بھی حکومت نہ اب تک اطمینان کا سانس لے سکتی ہے اور نہ آئندہ کے لئے کوئی خوش آئند توقع قائم کرنے کے لئے تیار ہے۔ ایسی صورت میں دانشمندی اور تدبر کا کیا یہی تقاضا ہے کہ ملک کی عام بے چینی کا علاج قانون فوجداری میں چند دفعات کے اضافہ سے کیا جائے؟ اور اگر یہی فیصلہ کر لیا گیا ہے تو پھر ہر سال قانون فوجداری کی ترمیم کے لئے مخصوص اجلاس کی ضرورت ہوگی۔

... ...

آرڈیننس بل کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) ملک معظم کی فوج یا پولیس میں ملازمت کرنے سے منع کرنا جرم ہے، اس کی سزا ایک سال تک کی قید یا جرمانہ یا دونوں ہیں۔

(۲) کسی سرکاری ملازم کو ادائیگی فرائض سے روکنا جرم ہے۔ اس کی سزا بھی ایک سال تک قید یا جرمانہ یا دونوں ہیں۔

(۳) سرکاری ملازمین کے ساتھ برا برتاؤ کرنا یا ان سے قطع تعلق کرنا اس نیت سے کہ وہ ملازم اپنے مفوضہ کام کی انجام دہی سے باز رہے جرم ہے اور اس کی سزا تین ماہ کی قید یا جرمانہ یا دونوں۔

(۴) ضبط شدہ لٹریچر کی اشاعت اور اس کا پڑھنا جرم ہے۔ اس کی سزا چھ ماہ تک کی سزائے قید یا جرمانہ یا دونوں۔

(۵) جھوٹی خبریں اڑانا جس سے عوام کے دلوں میں خوف پیدا ہو یا ایسی باتیں کرنا جس سے سرکاری ملازمین

کی تحقیر ہو جرم ہے۔ اس کی سزا ایک سال کی قید یا جرمانہ یا دونوں۔

(۶) دوکانوں پر پہرا لگانا اور خرید و فروخت سے لوگوں کو منع کرنا جرم ہے۔ اس کی سزا چھ ماہ کی قید صرف یا مع جرمانہ (پانچ سو روپیہ تک)۔

(۷) اگر کوئی جرم کسی لڑکے سے سرزد ہوگا اور عدالت کی طرف سے اس پر جرمانہ کیا جائے گا تو یہ جرمانہ والدین یا سرپرست کو ادا کرنا ہوگا۔

(۸) اگر کوئی مکان یا جگہ غیر قانونی مجالس کی کارروائیوں کے لئے استعمال کی جائے گی تو اس پر قبضہ کر لیا جائے گا، اور مکان کے اندر منقولہ اور غیر منقولہ تمام چیزوں پر قبضہ کیا جائے گا۔ جن چیزوں کے متعلق ثابت ہوگا کہ غیر قانونی کارروائیوں کے لئے استعمال کی جاتی تھیں وہ سب بحق سرکار ضبط کر لی جائیں گی۔

(۹) حکومت اس روپیہ کو بھی ضبط کرے گی جو غیر قانونی کارروائیوں کے لئے جمع ہوگا۔

... ...

مندرجہ بالا اضافہ قانون فوجداری کی دفعات میں کثرت آراء سے منظور کیا گیا، لیکن اس 'کثرت' میں منتخب اراکین کا بہت کم حصہ ہے۔ رائے شماری کے وقت ۷۰ رائیں موافق تھیں اور ۳۱ رائیں مخالف۔ موافقین میں ۴۰ رائیں سرکاری اور نامزد اراکین اسمبلی کی تھیں اور کل ۷۰ رائیں 'منتخب اراکین' کی۔ گویا جہاں تک رائے عامہ کی نمایندگی کا تعلق ہے اسمبلی نے اس گئی گذری حالت میں بھی حقیقتاً کثرت رائے سے آرڈیننس بل نامنظور کر دیا ہے۔

جنوبی افریقہ | جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے ساتھ روز بروز ناانصافیاں اور زیادتیاں بڑھتی جاتی ہیں لیکن جب خود اپنے ملک میں ہندوستانی اپنے حقوق کا تحفظ نہیں کر سکتے تو ظاہر ہے کہ غیر ملک میں جو کچھ مصیبت ان پر گذرے کم ہے۔ جنوبی افریقہ کے مسئلہ پر رسالہ جامعہ کی گذشتہ اشاعت میں بحث کی جا چکی ہے۔ حکومت ہند اور حکومت جنوبی افریقہ کے نمائندوں کی ایک گول میز کانفرنس اسی غرض سے منعقد ہوئی تھی کہ ہندوستانیوں کی شکایت پر غور کیا جائے اور جائز طریقہ پر ان کا ازالہ کیا جائے۔ بہت مشکلوں سے ایک سمجھوتہ بھی ہوا تھا اور یہ توقع تھی کہ جنوبی افریقہ کی حکومت دیانتداری کے ساتھ اس سمجھوتہ پر عمل کرے گی لیکن چند مہینے بھی نہ گذرنے

پاسے تھے کہ حکومت جنوبی افریقہ نے اس معاہدہ کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور ایسے جدید قوانین بنائے جانے لگے جو ہندوستانیوں کے لئے ہر طرح تباہ کن ہیں۔

گاندھی جی کے صاحبزادے مسٹر منی لال گاندھی جو گذشتہ بیس سال سے افریقہ میں صرف ہندوستانیوں کی خدمت کے لئے قیام گزیں ہیں حال ہی میں ہندوستان تشریف لائے تھے اور انھوں نے جو بیانات اخبارات کو دئے ان سے حقیقت حال پر اور زیادہ روشنی پڑتی ہے۔ تقریباً دو لاکھ ہندوستانی افریقہ میں ایک عرصے سے آباد ہیں۔ انھوں نے وہاں بڑی بڑی تجارتی کوٹھیاں قائم کی ہیں اور ایسے زمانے میں افریقہ کو آباد کیا اور وہاں تجارت کو ترقی دی جب وہ ملک بالکل جنگل اور ویران تھا۔ کئی کئی پشتیں ہندوستانیوں کی وہاں گذر چکی ہیں لیکن افریقہ کی فرنگی آبادی نسل و رنگ کے تعصبات کی وجہ سے ایک منٹ کے لئے بھی ہندوستانیوں کا وجود گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں اور ایسی تدابیر برابر اختیار کی جا رہی ہیں کہ کسی طرح ہندوستانی اپنے سالہا سال کے کاروبار کو چھوڑ کر ہندوستان واپس آ جائیں یا کہیں اور چلے جائیں۔ ہر آبادی میں ہندوستانیوں کے محلے مخصوص کر دئے گئے ہیں ان محلوں کے علاوہ کسی دوسری جگہ وہ سکونتی مکان نہ بنا سکتے ہیں اور نہ کوئی جائداد خرید سکتے ہیں کاروبار کے لئے بھی بازار مقرر ہیں۔ ان کے علاوہ کسی دوسری جگہ کاروبار کرنا ممنوع ہے۔

... ...

افریقی نژاد ہندوستانی اگر ایک مرتبہ افریقہ سے باہر آ کر پھر افریقہ واپس جانا چاہتا تو اس کی اجازت نہیں ملتی یا قانونی چارہ جوئی کے لئے پہلے تین ہزار روپیہ کی ضمانت داخل کرے اس کے بعد عدالت کے سامنے ثابت کرے کہ وہ افریقہ میں سکونت پذیر رہ چکا ہے، اس کے بعد دوبارہ سکونت کی اجازت ملتی ہے۔ یہ اور اس قسم کی اور سینکڑوں بندشیں ہیں جو ایک باعزت قوم کے فرد کے لئے بے انتہائی توہین کا باعث ہو سکتی ہیں مگر ہندوستانیوں کو یہ سب اس لئے برداشت کرنا پڑتا ہے کہ ان کا تعلق ایک محکوم قوم سے ہے۔

... ...

افریقہ کی فرنگی آبادی ہندوستانیوں کے خلاف یہ سب کارروائیاں اس اندیشے سے کرنا چاہتی ہے کہ اگر ہندوستانیوں کے داخلہ پر پابندیاں نہ عائد کی گئیں تو کچھ عرصہ کے بعد ہندوستانیوں کی آبادی بہت زیادہ بڑھ جائے گی اور وہ افریقہ پر چھا جائیں گے جن سے فرنگیوں کی معاشرتی اور تمدنی خصوصیات پر برا اثر پڑیگا۔ فرنگیوں کا یہ اندیشہ اس قدر بے بنیاد ہے کہ مندرجہ ذیل اعداد کے پیش کرنے کے بعد کسی مزید ثبوت کی شاید ضرورت نہ پڑے۔

افریقہ کی کل آبادی	تقریباً	۸۰ لاکھ
اس میں:-		
فرنگی آبادی	"	۱۷ "
دیسی باشندے	"	۵۴ " ۵۰ ہزار
دیگر مخلوط آبادی	"	۶ "
ایشیائی	"	۱ " ۸۱ ہزار

جنوبی افریقہ کا کل رقبہ تقریباً ۵ لاکھ مربع میل ہے اور ۱۹۲۶ء کی مردم شماری کے اعداد کے مطابق فی مربع میل آبادی کا اوسط ۱۵۵، ۲ نفر ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان میں ۲۲۰ نفر فی مربع میل اور انگلستان میں ۵۰۰ نفر فی مربع میل کا اوسط آبادی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ افریقہ ابھی اس قدر غیر آباد ہے کہ وہاں دو لاکھ ہندوستانی دریا کے ایک قطرے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھ سکتے۔ آبادی میں اضافے کے اعداد پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ گذشتہ بیس سال کے اندر فرنگی آبادی میں اضافے کا اوسط ۵، ۲۷ فی صدی اور ہندوستانیوں کا ۵، ۱۹ فی صدی رہا ہے۔ ہندوستانیوں اور فرنگیوں کی اضافہ آبادی میں یہ تفاوت اس قدر بین ہے کہ فرنگیوں کا اندیشہ کبھی صحیح ثابت نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ فرنگیوں کا یہ مطالبہ درست ہو سکتا تھا کہ آئندہ نئے ہندوستانیوں کو افریقہ میں سکونت پذیر ہونے کی اجازت نہ دی جائے لیکن وہ ہندوستانی جو افریقہ کو اپنا گھر اور وطن بنا چکے ہیں اور افریقہ کی صنعتی اور تجارتی ترقی میں ہمیشہ سب سے پیش پیش رہے ہیں ان کے حقوق برقرار رکھنا حکومت جنوبی افریقہ کا اخلاقی فرض ہے۔ اس وقت ممکن ہے کہ ہندوستان کی محکومیت سے فائدہ اٹھا کر حکومت جنوبی افریقہ ہندوستانیوں کے ساتھ ناانصافی کرے لیکن بین الاقوامی برادری میں اس قسم کی زیادتیوں کے نتائج کسی قوم کے لئے مفید نہیں ہو سکتے۔

شذرات

ملک کے مشہور مصنف اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی ہند قدیم کی ایک مبسوط تاریخ لکھ رہے ہیں۔ اس کا مقدمہ مکمل ہو چکا ہے اور ایک مستقل کتاب کی صورت میں شائع ہونے والا ہے جس کا حجم تین سو صفحے سے کم نہ ہوگا۔ اس میں چالیس عنوانات قائم کئے گئے ہیں جو حسب ذیل مطالب پر مشتمل ہیں:-

۱۔ علم تاریخ کی تعریف، اس کے موضوع کا تعین اور اس کی اہمیت کی بحث۔

۲۔ اقوام عالم کی ابتدائی زندگی، ان کی تقسیم نسل، مذہب اور تمدن کے اعتبار سے اختلاف مذاہب کی حقیقت، مذہب اور تمدن کی فضیلت کا معیار۔

۳۔ آریا قوم کے قدیم وطن اور قدیم تمدن کی تحقیق، آریوں اور ایرانیوں کی مذہبی مماثلت۔ اور فارسی اور سنسکرت کے تعلق پر تبصرہ۔

۴۔ تاریخ ہند قدیم کے ماخذ۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابیں، مہابھارت، رامائن اور دوسرے تاریخی پوران۔

۵۔ دوسری اقوام کے مورخوں کی تحقیق تاریخ ہند قدیم کے متعلق، یونانی واقعہ نگاروں اور چینی سیاحوں کی روایات۔ قدیم ایرانی نوشتوں اور شاہنامۂ فردوسی کی شہادت، مسلم مورخین اور یورپی مورخوں کی تحقیقات۔

۶۔ زمانے کا تعین اور سن و سال کا استعمال۔

اس کتاب کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا "ہندو اور آریہ کی وجہ تسمیہ" کے عنوان سے "جامعہ" کے جنوری نمبر میں شائع ہو رہا ہے اور کچھ حصے دوسرے رسالوں میں چھپیں گے۔ اس کے بعد جلد سے جلد مکمل کتاب طبع ہو جائے گی۔ اصل تاریخ ترتیب پانے کے بعد کئی حصوں میں شائع کی جائے گی۔

... ...

اس کتاب کی تالیف میں مصنف نے جتنا وقت صرف کیا ہوگا اور جس محنت اور جانفشانی سے کام لیا ہوگا اس کی پوری پوری قدر تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں خود علمی تحقیق کی کٹھن راہ پر چلنے کا تجربہ ہے

لیکن تھوڑا بہت اندازہ ہر پڑھے لکھے آدمی کو نمونہ دیکھنے سے ہو سکتا ہے جو اس پرچے میں موجود ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ملک کی اقتصادی حالت اور علم کی بے قدری کی بدولت کتاب لکھنے سے زیادہ مشکل کتاب کا چھپوانا ہے۔ یہ مشکل اب تاریخ ہند قدیم کے مؤلف کو بھی پیش آرہی ہے۔ وہ علم دوست حلقوں سے مدد چاہتے ہیں مگر صرف اتنی مدد کہ جو حضرات یہ کتاب خریدنا چاہتے ہوں وہ اپنا نام خریداروں کی فہرست میں لکھوا لیں تاکہ اس کے چھپنے کے ساتھ ہی ان کے نام وی۔ پی بھیج دیا جائے۔ صحیح قیمت ابھی متعین نہیں ہوئی لیکن غالباً مؤلف سے دریافت کرنے سے تخمینی قیمت معلوم ہو جائے گی۔ ہمارے خیال میں یہ ذرا سی زحمت گوارا کرنے میں ارباب ذوق کو تامل نہ ہوگا اور وہ فوراً مؤلف کے پاس نجیب آباد ضلع بجنور کے پتے سے فرمائش بھیج دیں گے۔ کم سے کم اتنی اعانت تو مؤلف کا حق اور ہر علم دوست کا فرض ہے۔

جامعہ ملیہ کے ہمدردوں اور بہی خواہوں کو اخباروں میں یہ خبر پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی ہوگی کہ جناب ڈاکٹر انصاری مدظلہ العالی کو یورپ کے قیام اور اطبائے یورپ کے علاج سے بہت فائدہ ہوا اور اب موصوف کی صحت پہلے سے بہت بہتر ہے لیکن اس بات سے ابھی کسی قدر تردد ہے کہ انھیں قلب کی کمزوری کی شکایت بدستور باقی ہے۔ معالجوں نے انھیں یہ مشورہ دیا ہے کہ حتی الامکان ان عملی سیاسی کاموں میں شرکت سے پرہیز کریں جن سے قلب پر مضر اثر پڑنے کا اندیشہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی ذات ملک کی سیاست خصوصاً اتحاد اور مصالحت کی تحریکوں سے اس حد تک وابستہ ہے اور خود موصوف کے ایثار اور جوش عمل کا یہ عالم ہے کہ اس مشورے پر پوری طرح عمل کرنا بہت مشکل ہے لیکن ان کے مخلص دوست جن میں ہر خیال اور ہر طبقے کے لوگ خصوصاً ہندوستان کے بڑے بڑے سیاسی رہنما شامل ہیں اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ ان کی واپسی پر ان سے درخواست کی جائے کہ کم سے کم چند سال تک اپنی صحت کے خیال سے عملی سیاسی مشاغل سے علیحدہ رہیں۔ اب دیکھنا ہے کہ خود ڈاکٹر صاحب کیا فیصلہ کرتے ہیں۔

... ...

بہرحال ڈاکٹر صاحب کے خطوط سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ قیام یورپ کے زمانے میں ان کا وقت زیادہ تر علمی تصنیف و تالیف میں گذرا اور قومی تعلیم سے جو دلچسپی انھیں ہمیشہ سے ہے وہ اب اور بڑھ گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ان معدودے چند ارباب فکر و ارباب عمل میں سے ہیں جنھیں اس کا پورا احساس ہے

ملک اور قوم کی ترقی بلکہ قومیت کی تعمیر کے لئے ایک صحیح تعلیمی پالیسی ناگزیر ہے اور یہ مسئلہ اور سب چیزوں سے پہلے توجہ کا مستحق ہے ۔ خدا کرے اب ان کو تعلیمی کاموں میں حصہ لینے اور خصوصاً اپنی عزیز تعلیم گاہ جامعہ ملیہ کی خدمت کرنے کی فرصت پہلے سے زیادہ ملے ۔

فرولائن فلیسبورن ایک جرمن خاتون ہیں جن کا ایک عرصے سے یہ فیصلہ تھا کہ ہندوستان آکر وہ اپنی زندگی جامعہ ملیہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیں ۔ ایک عرصے تک وہ جناب شیخ الجامعہ سے خط و کتابت کر کے جامعہ کے مفصل حالات معلوم کرتی رہیں اس کے بعد انھیں پروانۂ راہداری حاصل کرنے میں بڑی دقتیں پیش آئیں ۔ سب مشکلات کا مقابلہ کرنے کے بعد اب وہ یہاں پہنچ گئی ہیں اور جامعہ کی برادری میں شامل ہو کر انھوں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے ۔ ان کے سپرد چھوٹے بچوں کے رہنے سہنے ، اٹھنے بیٹھنے ، کھیلنے کودنے کی نگرانی ہے اور انھیں انگریزی بھی پڑھاتی ہیں ۔ بعض کالج کے طلبہ ان سے جرمن زبان میں درس حاصل کرتے ہیں ۔ موصوفہ نے برلن یونیورسٹی میں کچھ عرصے تعلیم پائی ہے اس کے بعد جرمنی کے مشہور مینا کونسی انسٹی ٹیوٹ میں بچوں کی تعلیم اور تربیت کا طریقہ اصولی اور عملی طور پر سیکھا ہے ۔ مدت تک انگلستان میں قیام کر چکی ہیں اور انگریزی زبان پر پوری قدرت رکھتی ہیں ۔ اب اردو بھی سیکھ رہی ہیں اور امید ہے کہ بہت جلد جامعہ کے بچوں سے ان کی مادری زبان میں گفتگو کرنے لگیں گی ۔ ہم ان خاتون کا سب جامعہ والوں کی طرف سے بہت گرمجوشی سے استقبال کرتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ انھیں ہندوستان کی آب و ہوا اور جامعہ کی زندگی راس آئے اور وہ اس تعلیم گاہ کی وہ مفید خدمات انجام دے سکیں جن کی خاطر وہ اپنا گھر بار چھوڑ کے اور انتہائی ایثار کر کے تشریف لائی ہیں ۔ انھیں دیکھ کر ان لوگوں کے دل کو جو پہلے سے جامعہ کی خدمت کر رہے ہیں بہت تقویت پہنچتی ہے اور ان کے عزم میں استقامت پیدا ہوتی ہے کہ جب ایک غیر ملک غیر قوم کی خاتون کو ہندوستانی مسلمانوں کے اس ادارے کے مقاصد اس قدر پسند آئے اور ان کے دل میں اس کی محبت پیدا ہو گئی کہ انھوں نے سمندر پار سے آکر برائے نام معاوضے کے بدلے اپنی زندگی اس کے لئے وقف کر دی تو ہم اسے جتنا عزیز رکھیں اور اس کی خاطر جو کچھ برداشت کریں وہ کم ہے ۔

رمضان مبارک میں اردو اکادمی کا کوئی جلسہ نہیں ہو سکے گا ۔ امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری صاحب ظلہ کی

تحریک پر ترکی کے مشہور مدبر رؤف پاشا صاحب نے وعدہ فرمایا ہے کہ فروری میں جب وہ ہندوستان تشریف لائیں گے تو پہلے دہلی آکر جامعہ ملیہ میں چند خطبے غالباً قدیم اور جدید ترکی کے متعلق دیں گے۔ ان خطبوں کے صحیح عنوان اور تاریخ اور وقت کی اطلاع ہم آئندہ پرچے میں دے سکیں گے اور مقامی ممبران اکادمی کی خدمت میں حسب معمول دعوت نامے روانہ کئے جائیں گے۔

فروری ۳۳ء

جلد ۲۰ نمبر ۲

عقیدہ اعجاز قرآن کی تاریخ

۲

۵. لفظ اعجاز اور اُس کا مفہوم۔

اب آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں یہ بحث چھیڑنی چاہیئے کہ لفظ اعجاز کا مفہوم کیا ہے۔ اِس کے لغوی معنی تو مجبور کرنا، عاجز کرنا ہیں اور اسی سے لفظ معجزہ مشتق ہوا ہے جس سے علم کلام کی اصطلاح میں وہ فعل مراد ہے جو کسی نبی سے اپنی صداقت کے ثبوت میں سرزد ہوتا ہے۔ اس لفظ میں جو تصور مضمر ہے اور جس کو سمجھنا کچھ مشکل بھی نہیں وہ یہ ہے کہ بجز نبی کے اور ہر شخص ایسے افعال سے مجبور یا عاجز ہے۔ قرآن میں نہ تو کہیں لفظ معجزہ آیا ہے اور نہ اس مادے کا کوئی دوسرا مشتق۔ بخلاف اس کے وہاں آیہ اور برھان عام طور پر مستعمل ہیں۔ ان الفاظ کے پیچھے اک ذرا مختلف تصوّر کارفرما معلوم ہوتا ہے۔ یہ الفاظ صرف یہ ظاہر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ایک مخصوص مشاہدہ کسی نبی کی نشانی یا اس کی صداقت کا ثبوت ہے اب اس کے بعد لفظ معجزہ کی حد شروع ہوتی ہے جو وصفی معنی اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے اور یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ یہ فعل صرف نبی کی ذات سے مخصوص ہے۔

یہ متعین کرنا آسان نہیں ہے کہ یہ لفظ اپنے اصطلاحی معنی میں سب سے پہلے کب استعمال کیا گیا مسائل نبوت سے بحث پہلی صدی ہجری میں شروع ہو چکی تھی مگر اس میں شک کی بہت گنجائش ہے کہ یہ لفظ بھی اتنا ہی قدیم ہے۔ بخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ علی بن ربّن طبری جس نے اپنی کتاب سنہ ۲۳۲ ہجری اور سنہ ۲۴۷ ہجری کے درمیان لکھی تھی برابر الفاظ آیہ اور برھان استعمال کرتا ہے اور ایک جگہ بھی نہ لفظ معجزہ استعمال کرتا ہے اور نہ کوئی دوسرا ہم اشتقاق لفظ۔ اس خفیف سی شہادت پر ہم یہ فیصلہ تو ہرگز نہیں کر سکتے کہ اس وقت تک لفظ معجزہ اپنے اصطلاحی معنی میں

کبھی استعمال ہی نہیں ہوا تھا مگر یہ کہنا حقیقت سے دور نہ ہوگا کہ اس وقت تک یہ لفظ اتنا غالب نہیں ہوا تھا کہ اپنے سے متقدم الفاظ آیہ اور برہان کو خارج کر دیتا جیسا کہ اس نے بعد کو کیا اس دعوی کی ایک دلیل یہ ہے کہ امام احمد بن حنبل اپنی تصانیف میں لفظ معجزہ نہ صرف انبیا کیلئے استعمال کرتے ہیں بلکہ اولیاء و اصفیا کے لئے بھی۔ بعد میں اس معنی میں لفظ کرامت استعمال ہونے لگا[1] ہم معلوم کر چکے ہیں کہ پہلی کتاب جس کا نام اعجاز القرآن تھا تیسری صدی ہجری کے نصف آخر میں لکھی گئی تھی۔ اس زمانے میں اور اس کے بعد نبوت کی بحثوں میں الفاظ آیہ اور برہان کا استعمال رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا اور ان کی جگہ الفاظ اعجاز اور معجزہ نے لے لی۔

بلاشبہ اس رفتار کا پتہ لگانا جس سے ایک لفظ کوئی مخصوص معنی حاصل کر لیتا ہے بہت ہی دلچسپ کام ہے مگر ساتھ ساتھ یہ کام بہت مشکل بھی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اصطلاحی معنی کسی نہ کسی طرح لغوی معنی سے متعلق ضرور ہوتے ہیں۔ دشواری صرف تعلق کے متعین کرنے میں ہوتی ہے۔ یہ معلوم ہے کہ محمد کی نبوت کا مسئلہ شام کے دینی حلقوں میں نبوت کے عام مسائل سے بہت پہلے زیر بحث آچکا تھا اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ سب سے بڑی دلیل ان کی صداقت کی یہی پیش کی جاتی تھی کہ وہ صاحب وحی ہیں اور وہ وحی قرآن ہے۔ خود قرآن کا یہ دعوی ہے کہ اس کا مثیل کلام پیش کرنا جن و انس کے بس سے باہر ہے۔ جو فقرہ اس موقعے پر آیا ہے وہ "لا یاتون بمثلہ" ہے ان الفاظ کو واضح کرنا چاہیں تو "یعجزون عنہ" کہہ سکتے ہیں۔ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں یہی الفاظ استعمال بھی کئے ہیں[2]۔ اب اگر قرآن کو فاعل ٹھیرایا جائے تو فعل متعدی اَعجَزَ استعمال کرنا پڑے گا جس سے یہ ظاہر ہوگا کہ قرآن نے لوگوں کو عاجز کر دیا ہے۔ گفتگو میں ایسا مجاز عام طور پر رائج ہے اب اس مجاز کو

Tor Andrae: Die Person Muhammad in Lehre und Glauben seiner Gemeinde (Upsala 1917 p 101) ملاحظہ ہو۔

(۲) ج ۱ ص ۱۲۶-۱۲۹

اگر مختصر الفاظ میں بیان کرنا ہو تو بجائے فعل کے مصدر یا حاصل مصدر جو عربی میں ایک ہی چیز ہو استعمال کریں گے۔ اس طرح ترکیب "اعجاز القرآن" وجود میں آئی ہوگی۔ کچھ دنوں بعد جب بحث علم مسائل نبوت سے شروع ہوئی ہوگی تو ایک عام لفظ کی ضرورت بھی محسوس ہوئی ہوگی۔ اب لفظ معجزہ نہ صرف قرآن کے لئے بلکہ دوسرے انبیا کے خوارق عادات کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہوگا اس عام معنی کے لئے "ۃ" کا اضافہ کر کے ایک اسم صفت بنا لینا بالکل فطری بات تھی۔ اس طرح لفظ معجزہ ظہور پذیر ہوا ہوگا۔

معجزے کی جو تعریف علم کلام کی کتابوں میں عام ہے وہ یہ ہے: "امر خارق للعادة مقرون بالتحدی سالم عن المعارضة"[1] ان کتابوں میں صفحے کے صفحے اس تعریف کی توضیح و تشریح میں سیاہ کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک جامع تشریح پیش کی جاتی ہے۔ محمد بن احمد القرطبی نے اپنی تفسیر "الجامع لاحکام القرآن" میں پانچ شرائط بیان کئے ہیں جن کے بغیر کوئی فعل معجزہ نہیں کہا جا سکتا۔ (۱) یہ فعل صرف خدا کے اختیار میں ہو (۲) خارق عادت ہو (۳) مدعی نبوت پہلے سے اعلان کر چکا ہو کہ ایسا ہونے والا ہے۔ (۴) واقعہ تمام و کمال اعلان کے مطابق ہو اور (۵) کوئی اور شخص ویسا ہی عمل نہ کر سکے یہ ہے مختصر الفاظ میں وہ مطلب جو متکلم کا اس وقت ہوتا ہے جب وہ لفظ معجزہ استعمال کرتا ہے۔ اس موقع پر زیادہ[2] تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہمیں تو اس وقت صرف ایک مخصوص معجزے سے بحث کرنی ہے۔ اب ہمیں چاہئے کہ ان دلیلوں کو بیان کریں جو قرآن کے معجز ہونے کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں۔

۶۔ دلائل اعجاز۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن میں اپنے معجز ہونے کا دعویٰ ان لوگوں کے جواب میں کیا گیا ہے جو محمد کی نبوت کے منکر تھے۔ متکلم بھی دلائل کو اسی جگہ سے شروع کرتا ہے چنانچہ پہلی بحث یہی ہوتی

---

[1] اتقان ج ۲ ص ۱۱۶۔ [2] زیادہ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو Torandrae ص ۱۰۰-۱۰۳۔

یہ تو تھی عام دلیل۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محل اعجاز کیا ہے۔ بالکل ابتدا ہی سے اس کے دو جواب دئے گئے ہیں۔ اس عقیدے کی نشو ونما کے ساتھ ساتھ یہ مسئلہ بھی اٹھا کہ قرآن کا نظم معجز ہے یا اس کے معانی اور مطالب۔ آخر میں اجماع تو اسی پر ہوا کہ دونوں معجز ہیں۔ مگر ایسے بھی لوگ گذرے ہیں جنھوں نے ایک سے انکار کیا ہے اور دوسرے کو مانا ہے۔ شروع ہی میں نظام نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ قرآن کے نظم میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ اور اگر عرب کو اختیار دیا جاتا تو وہ ایسا کلام پیش کر سکتے تھے۔ مگر اللہ نے اُن کو ایسا کرنے سے روک دیا اور یہی دراصل قرآن کا اعجاز ہے۔ اس دلیل کو علم کلام کی اصطلاح میں "دلیل الصرفہ" کہتے ہیں نظام کے نزدیک دوسرا عنصر جو قرآن میں معجز ہے وہ "اخبار بالغیب" ہے۔ برخلاف اس کے جاحظ نے نظم پر زیادہ زور دیا اور اپنی کتاب نظم القرآن میں اپنے دعوی کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ علی بن ربن کی تمہیدی الفاظ سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نظم کے معجز ہونے کا مسئلہ اختلافی تھا۔ وہ لکھتا ہے "جب میں نصرانی تھا تو میرا اور میرے ایک چچا کا جو صاحب فصاحت و بلاغت تھا یہ خیال تھا کہ بلاغت نبوت کی نشانی نہیں ہو سکتی اس لئے کہ وہ تمام قوموں میں مشترک ہے لیکن جب میں نے تقلید کو چھوڑ کر اور عادت اور تربیت کے اثرات کو خیرباد کہہ کر قرآن کے معانی پر غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ قرآن کا واقعی وہی درجہ ہے جو اس کے ماننے والے کہتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ میں نے کسی زمانے کی کوئی کتاب خواہ وہ عربی ہو یا عجمی ہندی ہو یا رومی ایسی نہیں دیکھی جس میں توحید و تہلیل، خدا کی ثنا اور انبیاء و رسل کی تصدیق، نہ مٹنے والے اعمال صالح کی ترغیب، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، جنت کا شوق اور دوزخ کا ڈر اس طرح جمع ہوں جس طرح قرآن میں ہیں۔ تو اگر کوئی ایسی کتاب پیش کرے جس میں یہ صفات ہوں اور جس کے لئے قلوب میں ایسی عظمت اور حلاوت ہو اور جس کے دم سے ایسی کامرانی اور نصرت ہو اور باینہمہ جس پر وہ نازل ہوئی ہے وہ اُمّی ہو جس نے نہ کتابت سیکھی ہو اور نہ بلاغت تو بلاشبہ وہ کتاب اس شخص کی نبوت کی نشانی ہے" یہاں ایک تیسری دلیل بھی ملی۔ قرآن کے نظم اور اس کے

معانی اور مطالب کے علاوہ یہ بھی ایک دلیل اعجاز کی ہے کہ محمد امّی تھے یعنی نوشت وخواند سے ناآشنا۔

اب رمانی کی باری آتی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ "اعجاز قرآن کے وجوہ یہ ہیں:۔ (۱) باوجود سخت ضرورت اور اسباب اور دعوت عام کے کسی نے اس کا مقابلہ نہیں کیا (۲) صرفہ (۳) بلاغت (۴) پیشین گوئیاں (۵) نقض عادت اور (۶) دوسرے معجزات سے اس کی مشابہت۔ نقض عادت سے یہ مراد ہے کہ کلام کی جو مروجہ اقسام ہیں مثلاً شعر، سجع، خطب، رسائل، اور نثر جو گفتگو میں مستعمل ہے، قرآن کا طرز ان سب سے نرالا اور سب سے بلند ہے حتیٰ کہ کلام موزوں سے بھی جو بہترین سمجھا جاتا ہے۔ اب رہی دوسرے معجزات سے مشابہت تو اس کی بھی وہی حیثیت ہے جو سمندر کے پھٹ جانے اور عصا کے سانپ بن جانے یا دوسرے ایسے ہی واقعات کی ہے۔ اس لئے کہ یہ بھی اسی طرح عادت مستمرہ سے خارج ہے اور لوگ اسی طرح اس کے مقابلے سے بھی عاجز ہیں" یہ بات قابل لحاظ ہے کہ رمانی دلیل نظم اور دلیل صرفہ کو جو ابتداءً ایک دوسرے کے خلاف پیش کی گئی تھیں ایک ساتھ پیش کر رہا ہے۔ زمانہ بعض اوقات وجہ مخالفت کو مٹا دیتا ہے اور دو مخالف دلیلیں ایک ساتھ پیش کی جانے لگتی ہیں۔

اب نظم کے سلسلے میں یہ مسئلہ پیش آیا کہ آخر معیار کیا ہے اور کیسے یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ نظم کم مرتبہ ہے اور یہ عالی مرتبہ۔ پہلا جواب تو یہ ملا کہ صرف ذوق سلیم رکھنے والے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں۔ غیر زبان والے یا بے ذوق اہل زبان یقینی طور پر اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے ہیں اور انھیں اہل ذوق کی رائے کا محتاج رہنا پڑے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قمّی نے بہت شد و مد سے یہ دعوی کیا ہے کہ قرآن کا اعجاز بیان نہیں کیا جا سکتا بلکہ صرف ذوق اس کا ادراک کر سکتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح اچھا شعر یا حسن ملیح کہ اس کی پسندیدگی کے وجوہ بیان نہیں کئے جا سکتے۔ اور اگر کوئی کہتا ہے کہ قرآن کے اعجاز کی وجہ صرفہ ہے یا اس کے اسلوب کا دوسرے اسالیب سے مختلف ہونا یا تناقض سے بری ہونا یا اخبار عن الغیب یا ازیں قبیل کچھ اور تو اس کی خالہ کا بھانجا جھوٹا ہے فقد کذب

ابن اخت خالتہ)

خطابی نے اس خیال کی مخالفت کی ہے وہ کہتا ہے "علماء نظر میں سے بیشتر کا یہ خیال تو ہے کہ قرآن کے اعجاز کی وجہ اس کی بلاغت ہے لیکن اس کی تفصیل انھیں دشوار معلوم ہوتی ہے اور وہ مجبوراً ذوق کو حکم بنانا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کلام کی مختلف قسمیں ہیں اور ان کے رتبے بھی مختلف ہیں........ قرآن کی بلاغت میں یہ تمام اقسام شامل ہیں اور ان سب کے مجموعے سے کچھ ایسا ڈھنگ قائم ہو گیا ہے کہ اس میں شان و شکوہ اور شیرینی دونوں ایک ہو گئی ہیں باوجودیکہ الگ الگ یہ دونوں صفتیں ایک دوسری کی مخالف ہیں.... یہ فضیلت صرف قرآن کو ملی ہے تاکہ وہ نبی کے لئے ایک کھلی نشانی کا کام دے سکے" خطابی نے ایک اور دلیل پیش کی ہے جس کے خیال میں اس سے پہلے کسی اور نے نہیں پیش کیا تھا اور وہ یہ ہے "کوئی دوسرے الفاظ منظوم ہوں یا منثور قلب انسانی پر کبھی حلاوت اور کبھی رعب کی وہ کیفیت پیدا نہیں کر سکتے جو قرآن کے الفاظ پیدا کرتے ہیں"۔

اب باقلانی کا زمانہ آتا ہے۔ باقلانی نے ان تمام دلائل کو جو اس سے پہلے پیش کئے گئے تھے جمع کر دیا ہے اور ان کے علاوہ کچھ نئے دلائل بھی پیش کئے ہیں۔ ہم اس کی کتاب کا ایک مختصر خاکہ پیش کر چکے ہیں۔ دوسرے باب میں اس نے تفصیل سے یہ بحث کی ہے کہ قرآن کو معجز کیوں کہتے ہیں۔ اس کا خلاصہ بھی ہم عام دلائل کے سلسلے میں پیش کر چکے ہیں۔ وہ دلیل صرفہ کا سخت مخالف ہے۔ تیسرے باب کے شروع میں وہ تین دلیلیں پیش کرتا ہے:۔ (۱) قرآن میں آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں ہیں جو انسان کے بس سے باہر ہیں (۲) یہ معلوم ہے کہ محمد امی تھے نہ لکھ سکتے تھے نہ اچھی طرح پڑھنا جانتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ وہ امم سابقہ کی کتابوں سے ناآشنا اور ان کے حالات و واقعات سے ناواقف تھے۔ بایں ہمہ انھوں نے خلق آدم سے لیکر اپنے زمانے تک کے اہم واقعات کو بیان کیا ہے۔ ایسی حالت میں بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ علم ان کو براہ راست خدا سے بذریعہ وحی حاصل ہوا تھا۔ (۳) قرآن کا طرز، اس کا نظم اور اس کی بلاغت اس حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ جہاں انسان

کی رسائی ممکن نہیں۔ یہ وہ دلائل ہیں جو پہلے بھی لوگ پیش کر چکے تھے۔ باقلانی کا کام اُن کی توضیح و تشریح ہے۔ چنانچہ وہ تیسری دلیل کی توضیح کے لئے دس نکتے بیان کرتا ہے:-

۱۔ قرآن کا نظم باوجود انداز بیان کی گوناگونی کے عرب کے تمام اصناف کلام سے مختلف اور صرف قرآن سے مخصوص ہے۔

۲۔ ادب عربی میں کوئی ایسا نمونہ نہیں مل سکتا جو قرآن کا سا طویل ہو اور پھر بھی فصاحت اور بلاغت کے اس درجے پر فائز ہو۔

۳۔ قرآن کے نظم کی خوبی اور تالیف کا حسن باوجود مضامین کے اختلاف کے کبھی کم نہیں ہوتا۔ تشریح اس کی یہ ہے کہ قرآن میں قصص بھی ہیں اور مواعظ بھی۔ دلائل بھی ہیں اور احکام بھی، وعدہ بھی ہے اور وعید بھی۔ اوصاف کا بیان بھی ہے اور تعلیم اخلاق بھی۔ لیکن ہر صنف میں فصاحت و بلاغت کا وہی عالم ہے۔ بخلاف اس کے بہترین شاعر اور خطیب کے کلام میں بھی مضمون کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بیان کی خوبی میں کمی ہو جاتی ہے اور ایک شخص صرف ایک ہی صنف میں کمال دکھاتا ہے

۴۔ فصحاء کے کلام میں فصل اور وصل، علو اور نزول، تقریب اور تبعید وغیرہ میں کھلا ہوا تفاوت نظر آتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب وہ دو مختلف مطالب کو یکجا کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن قرآن میں جہاں کہیں ایسی صورت پیش آئی ہے وہاں اس خوبی سے جوڑ ملایا گیا ہے کہ مختلف مؤتلف معلوم ہوتا ہے اور متباین متناسب۔ یہ ایسی خوبی ہے کہ انسان کے کلام میں اس کا پایا جانا محالات سے ہے۔

۵۔ قرآن کا نظم نہ صرف انسان کے بس سے باہر ہے۔ بلکہ جن کے بھی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دعویٰ محتاج ثبوت ہے اور اس کا یقینی ثبوت ملنا ممکن ہی نہیں مگر یہ تو معلوم ہے کہ عربوں کے پاس کچھ ایسا کلام محفوظ ہے جسے وہ اجنہ سے منسوب کرتے ہیں اس کا مقابلہ اگر قرآن سے کیا جائے تو اس دعوی کی صداقت صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔

۶۔ کلام عرب کے تمام اصناف مثلاً بسط اور اختصار، جمع اور تفریق، استعارہ اور تصریح۔ تجوّز

اور تحقیق وغیرہ وغیرہ قرآن میں موجود ہیں اور اس خوبی سے موجود ہیں کہ تمام کلام میں اس کی مثال مل ہی نہیں سکتی۔

۷۔ یہ واقعہ ہے کہ مروجہ خیالات کے لئے الفاظ کا انتخاب اتنا مشکل نہیں جتنا بالکل نئے خیالات کے لئے۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر اگر دیکھا جائے کہ ان مطالب کے ادا کرنے کے لئے جو عرب میں ناپید تھے اور شریعت یا اصول دین سے متعلق ہیں قرآن میں کس قدر مناسب اور سڈول الفاظ استعمال کئے گئے ہیں تو یہ نکتہ اور واضح ہو جائے گا کہ قرآن بشر کا کلام نہیں ہے۔

۸۔ کسی کلام کی فصاحت اور فضیلت کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اس میں سے کوئی خاص لفظ لیکر کسی دوسرے کلام میں استعمال کیا جائے اور وہ لفظ ذہن کو اپنی طرف کھینچ لے۔ یہ خوبی قرآن میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ قرآن کا کوئی مخصوص لفظ کسی جملے یا شعر میں اسی طرح چمکتا ہے جیسے کسی معمولی ہار میں یاقوت یا موتی۔

۹۔ عربی میں حروف تہجی کی تعداد ۲۹ ہے۔ قرآن کی ان سورتوں کی تعداد جن کی ابتدا حروف سے ہوئی ہے ۲۹ ہے۔ وہ حروف جو اس طرح استعمال کئے گئے ہیں اس تعداد کے نصف یعنی ۱۴ ہیں اس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ قرآن کی بنا بھی انھیں حروف پر ہے جن پر عرب کے کلام کی۔ پھر حروف کی مختلف تقسیمیں کی گئی ہیں مثلاً حروف مہموسہ و مجہورہ، حروف حلق وغیر حلق، حروف شدیدہ وغیر شدیدہ، حروف مطبقہ و منفتحہ۔ کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے حروف میں سے پورے نصف سورتوں کے شروع میں آئے ہیں۔ یہ تقسیمیں نزول قرآن کے بہت بعد کی گئی ہیں اور یہ حقیقت کہ ہر قسم سے پورے نصف حروف لئے گئے ہیں علم غیب پر دلالت کرتی ہے اور یہ سوا خدا کے اور کسی کے اختیار میں نہیں۔

۱۰۔ قرآن کے الفاظ سادے اور اس کے معانی عام فہم ہیں، وحشی الفاظ اور غریب ترکیبوں کا استعمال اس میں کہیں نہیں ہے لیکن باوجود اس سادگی کے اس کا مثیل کلام پیش کرنا ممکن نہیں۔ اب اسے معجزہ نہ کہیں تو اور کیا کہیں۔

یہ ہیں باقلانی کے دس نکتے۔ کتاب کا باقی حصہ انھیں نکات کی توضیح اور تشریح کے لئے

دقت ہے۔ ان نکات کو کماحقہ سمجھنے کے لئے پوری کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس سے زیادہ تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ باقلانی کی کتاب اس سلسلے میں گویا بیچ کی کڑی ہے۔ اعجاز قرآن کے وہ تمام دلائل جو اس سے پہلے پیش کئے گئے تھے یہاں آکر جمع ہوئے اور پھر یہاں سے نکل کر بعد کی تصانیف میں جاگزیں ہوتے ہیں اب ہم چوتھی صدی ہجری کے آخر تک پہنچ گئے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب بیشتر اسلامی عقائد ایک خاص قسم کی سختی اختیار کر چکے تھے۔ یہ کیفیت ان میں کم وبیش اس وقت تک قائم ہے۔ چوتھی صدی میں کلام کی عمارت مکمل ہوگئی اب صرف آرائش اور زیبائش کا کام باقی رہ گیا تھا۔ جو بعد کے متکلمین کو ملا۔

دلیل صرفہ کے سب سے بڑے حامی سید شریف مرتضیٰ تھے۔ یہ غالباً آخری شخص تھے جو اعجاز قرآن کی صرف یہی ایک قطعی دلیل قرار دیتے تھے۔ افسوس کہ ان کی کتاب جس میں انھوں نے تفصیلی بحث کی تھی نہیں ملتی لیکن جیسا کہ انھوں نے خود اپنے ایک خط میں بیان کیا ہے سب سے زیادہ اہم نکتہ یہ تھا کہ ہم قرآن کے بعض ٹکڑوں اور عرب کے فصیح ترین کلام میں بغیر بحث واستدلال صرف پہلی نظر میں فرق نہیں کر سکتے حالانکہ عرب کے فصیح تر اور کم فصیح کلام میں ایسا فرق ممکن ہے ایسی حالت میں صرف یہی ایک قطعی دلیل ہو سکتی ہے کہ عرب اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہ پیش کر سکے یا بہ الفاظ دیگر معجزہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرب کو قرآن کا مقابلہ کرنے سے روک[1] دیا۔

اب دلائل سے متعلق کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے۔ اس عہد کے بعد متکلمین کی کوشش نئے دلائل کی تلاش میں نہیں صرف ہوتی تھی بلکہ پرانے دلائل کو نئے انداز سے بیان کرنے میں۔ اس کا صحیح اندازہ صرف ان کی تصانیف کے مطالعے سے ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ماوردی[2] کو لے لیجئے۔ وہ اعجاز کے ثبوت میں بیس دلیلوں کے پیش کرنے کا فخر حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن صرف ایک دلیل

---

[1] دلیل صرفہ درحقیقت شیعہ متکلمین کے یہاں متکلمین اہل سنت سے زیادہ ملتی ہے۔ اس سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ شیعوں کے علم کلام کو تعلق معتزلہ سے بہت گہرا ہے اور خصوصاً متقدمین معتزلہ سے۔ [2] اعلام النبوۃ ص ۴۰ - ۵۳

نئی معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن کا حفظ کرنا بہت آسان ہے اور نہ صرف عرب اس کے حافظ ہیں بلکہ ایرانی اور قبطی بھی۔ دوسری خصوصیت بعد کے متکلمین کی یہ ہے کہ وہ دلائل کو بہت پھیلا کر بیان کرتے ہیں مثلاً۔ قاضی عیاض۔ علی الآمدی اور شہرستانی کو لے لیجئے کہ وہ ایک دلیل کو واضح کرنے کے لئے کئی صفحے لکھتے چلے جاتے ہیں۔ آمدی کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ان تمام شبہات کو بیان کرتا ہے جو کسی کو پیدا ہو سکتے ہیں اور پھر ان کا جواب دیتا ہے۔ لیکن قابل لحاظ امر یہ ہے کہ شبہات کے بیان کرنے میں جس قدر تفصیل سے کام لیتا ہے ان کے جوابات میں اسی قدر اختصار سے۔ اس سلسلے میں دو نام اور اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک تو راغب اصفہانی کا کہ ان کی تحریر میں ایک خاص شگفتگی اور بحث کی ابتدا کے انداز میں ایک خاص جدت نظر آتی ہے اور دوسرے ابن حزم کا۔ ان کے یہاں دلائل کی جو کمی ہے وہ لعنت ملامت اور دشنام سے پوری کی گئی ہے۔ یہ شرف ان کو بخشا جاتا ہے جو ابن حزم سے اختلاف رائے کی جرأت رکھتے ہیں۔

۷۔ منکرین اعجاز اور معارضین قرآن۔

پہلے باب میں ہم ان اقوال کا ذکر کر چکے ہیں جو قرآن سے متعلق کفار مکہ سے خود قرآن میں منقول ہیں۔ رسول کی حیات میں ہی کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے تھے جو یا تو نبوت کے مدعی تھے یا قرآن کے مقابلے میں اپنا کلام پیش کرتے تھے۔ انھیں میں سے نضر بن حارث بھی تھا جو نواح مکہ میں رہتا تھا۔ اس نے نبوت کا دعویٰ تو نہیں کیا لیکن وہ شاہان عجم کے قصے بیان کیا کرتا تھا اور اس طرح بزعم خود ان قصص کا مقابلہ کرتا تھا جو قرآن میں انبیاء و اقوام سلف کے مذکور ہیں نضر غالباً ان لوگوں کا نمائندہ تھا جو کہتے تھے کہ محمد محض ایک قصہ گو ہیں اور قرآن کی حیثیت داستان پارینہ سے زیادہ نہیں۔ اس کے قصوں کا کوئی حصہ بھی کسی نے نقل نہیں کیا ہے۔ کہ کچھ

اندازہ ہو سکتا ہے۔[۱]

مدعیانِ نبوت میں سب سے زیادہ مشہور مسیلمہ بن حبیب تھا جو بنی حنیفہ یمامہ کا سردار تھا اس نے رسول کی زندگی کے آخری ایام میں ہی اس دعویٰ کا اظہار کر دیا تھا اور کہا جاتا ہے کہ ایک خط بھی مدینہ روانہ کیا تھا جس کے چند الفاظ یہ ہیں۔ "میں اس دنیا میں تمہارا شریک بنایا گیا ہوں۔ آدھا ملک ہمارا اور آدھا قریش کا۔ مگر قریش ایک سرکش جماعت ہے[۲]......" رسول کی وفات کے بعد مسیلمہ نے بہت زور پکڑا اور اس کے متبعین کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ ابوبکر کو ایک بہت بڑی فوج اس کے مقابلے کے لئے روانہ کرنی پڑی۔ اس جنگ میں مسیلمہ مارا گیا۔ اس کے بعض اقوال ہم تک پہنچے ہیں مگر وہ سب کے سب قرآن کی نقل ہیں اور کسی قسم کی ادبی خوبی سے بالکل عاری ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ بعد والوں نے ان کو گھڑ کر اس کے نام محض اس کا خاکہ اڑانے کیلئے منسوب کر دیا ہو۔[۳] دوسرے مدعی (۱) عبہلہ بن کعب (الاسود العنسی ذوالخمار)[۴] (۲) سجاح بنت الحارث[۵] (از بنی تمیم) اور (۳) طلیحہ بن خویلد[۶] (از بنی اسد) تھے۔ ان کے اقوال میں سے صرف دو دو ایک ایک فقرے منقول ہیں اور ان کے بارے میں کسی قسم کی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

دوسری صدی ہجری کے وسط میں جب آزاد خیالی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی بعض لوگ

---

(۱) ابن ہشام۔ سیرت مطبوعہ گوٹنگن ۱۸۶۰ء ج ۱ ص ۱۹۱-۲؛ طبری۔ تاریخ مطبوعہ لائڈن ۱۸۷۹ء ج ۱ ص ۱۷۴۸-۱۷۵۰۔
(۲) مسیلمہ کے حالات کیلئے ملاحظہ ہو تاریخ طبری ج ۱ ص ۱۷۳۷-۳۸، ۱۷۹۵-۹۸، ۱۹۱۵-۲۰، ۱۹۲۹-۴۹، اور سیرت ابن ہشام ۹۴۵-۴۶، ۹۶۳۔ (۳) تاریخ طبری۔ ج ۱ ص ۱۷۹۵-۹۸، ۱۸۵۳-۶۰، ۱۸۷۰-۱۷، ۱۹۹۷-۲۰۰۱ اور ابن ہشام ص ۹۶۴ (۵) تاریخ طبری ج ۱ ص ۱۹۰۰، ۱۹۱۱-۲۱، ۱۹۲۰، (۶) تاریخ طبری ج ۱ ص ۱۸۸۵-۸۸، ۱۸۹۰-۹۳، ۲۲۵۸-۶۵، ۲۲۷۲-۲۹، اور ابن ہشام ص ۹۵۲۔ اس کا نام غالباً طلحہ بن خالد ہوگا اور اسی طرح مسیلمۃ کا مسلمہ۔ بعد والوں نے تحقیر کے لئے تصغیر کر دی ہوگی۔

اس سلسلے میں بہت مشہور ہوئے۔ ان میں سے زیادہ مشہور ابن المقفع[1]، بشار بن برد[2]، صالح بن عبد القدوس[3] اور عبد الحمید کاتب[4] تھے۔ ان میں سے ہر ایک باکمال اہل قلم یا شاعر تھا۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یہ لوگ اپنی مجلس میں قرآن پر اعتراضات اور اس کے معارضے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ابن المقفع سے متعلق یہ روایت بہت عام ہے۔ عربی ادب کی تاریخ میں یہ کیفیت بہت دلچسپ ہے کہ ابتدائی زمانے کے بہترین نثر نگار اور بعض شعراء پر معارضۂ قرآن کا الزام لگایا گیا ہے۔ لیکن یہ تمام روایتیں ختم ایک ہی نکتے پر ہوتی ہیں اور وہ یہ ہے کہ باوجود عرصۂ دراز کی کوشش کے ان میں سے ہر ایک کو ہار ماننی پڑی اور کوئی چیز جواب میں نہ پیش کر سکے۔ اسی سلسلے میں ابو الطیب المتنبی[5] (م ۳۵۴ھ) قابوس بن وشمگیر[6] (م ۴۰۳ھ) اور ابو العلاء المعری[7] (م ۴۴۹ھ) کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ متنبی کا تو لقب ہی اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اس پر ادعائے نبوت کا الزام عائد ہوتا ہے۔ یہ قصے بظاہر قرین قیاس معلوم ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ ان تمام افراد کے بارے میں یقینی طور پر یہ معلوم ہے کہ یہ راسخ العقیدہ نہ تھے۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ۔ اور غالباً یہی اصلی وجہ اس الزام کی ہے۔ ان میں

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ ابن المقفع، اور شرح حال عبد اللہ بن المقفع فارسی از عباس اقبال آشتیانی مطبوعہ برلن ۱۹۲۶ء (۲) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام بشار، اور بشار بن برد لمنصور حسین، مطبوعہ مصر (۳) Goldziher (۱) S. G. A. Q. Und das Zindiktum (Transactions of the 9th Orientalists Congress, London Vol II pp 104-129 (2) Nicholson's Lit. Hist p. 374 (۴) ابن خلکان ج ۲ ص ۱۷۳ (دی سلان) اور مروج الذہب للمسعودی ج ۶ ص ۸۱ (۵) نکلسن ص ۳۰۴ تا ۳۱۲، بروکلمان ج ۱ ص ۸۶-۹۰۔ (۶) قابوس وشمگیر (مطبوعات ایرانشہر، برلن نمبر ۱) (۲) یتیمۃ الدہر للثعلبی ج ۳، (۳) الآثار الباقیہ (مقدمہ) للبیرونی (۴) تاریخ طبرستان لابن اسفندیار۔ (۷) انسائیکلوپیڈیا۔ ابو العلاء، (۲) طہ حسین: ذکری ابی العلاء مطبوعہ مصر (۳) عبد العزیز میمن راجکوٹی۔ ابو العلاء ماله وما عليه۔ مطبوعہ مصر۔

سے ہر ایک صاحب طرز نثر نگار یا شاعر تھا تخیل عامہ ہر زمانے میں بلند پرواز رہی ہے اور یہ امر بھی مسلم ہے کہ مرور زمانہ افواہ کو تاریخی واقعات اور افسانے کو حقیقت بنا دیتا ہے خصوصاً اعتقادات عامہ کے مخالفین کے فرد قرار داد جرم میں تو دنیا کی ہر گردش ایک نئے جرم کا اضافہ کر دیتی ہے۔ اس مسئلے میں شہادت کا جہاں تک تعلق ہے وہ اس کے لئے کفایت نہیں کرتی کہ ہم ان ادبا پر اتنا بڑا الزام لگا دیں۔ پھر اس کا بھی لحاظ رہے کہ ابن المقفع اور اس کے دوسرے احباب کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب اسلامی عقائد کی تشکیل شروع ہی ہوئی تھی اور ہر مسئلے میں شدید اختلافات کا ہونا لازمی تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ تقریباً اسی زمانے میں اعجاز قرآن کے مسئلے سے پہلی دفعہ بحث کی گئی تھی۔ اس زمانے میں صاحبان عقل و ہوش کا ایک حلقہ عوام سے الگ قائم تھا اور یہی لوگ اس کے ارکان تھے۔ اس لئے لازمی طور پر ان لوگوں کے خیالات عوام کے عقائد سے مختلف رہے ہوں گے۔ رائے عامہ ہمیشہ متشدد ہوتی ہے اور اس کی عدالت میں جو شخص پورا مومن نہیں وہ پورا کافر قرار پاتا ہے۔ اگر کوئی شخص ایک چیز پر ایمان نہیں رکھتا تو زیادہ امکان اسی کا سمجھا جاتا ہے کہ وہ کسی چیز پر ایمان نہیں رکھتا۔ عوام کی منطق یہی ہے اور اسی سے وہ خواص کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ پھر ابن المقفع اور اس کے ساتھیوں کو مستثنیٰ کیوں کیا جاتا۔

ابن المقفع پر ایک الزام اور ہے جو اس سے زیادہ سنگین ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک کتاب اسلام کے خلاف لکھی تھی اور اس میں خاص طور پر قرآن پر اعتراضات کئے تھے اس الزام کے ثبوت میں صرف ایک شہادت ملتی ہے۔ القاسم بن ابراہیم الرسّی (م ۲۴۶ھ) بانی حکومت زیدیہ یمن کی تصانیف میں ایک رسالہ موجود ہے جس کا نام ہے کتاب الرّد علی الزندیق اللعین ابن المقفع[2]، اس میں انھوں نے ابن المقفع کی کتاب کے جملے نقل کر کے اس کا تفصیلی جواب دیا ہے۔ اس

---

(1) S. Lanepool. Moh. Dynasties, London 1894 p. 102

(۲) مرتبہ و شائع کردہ گوئیدی۔ روما ۱۹۲۷ء

مسئلے پر تو کافی بحث ہو چکی ہے اور اب اس میں شبہے کی گنجائش بھی نہیں کہ یہ رسالہ قاسم بن ابراہیم کی تصنیف ہے(۱،۲) لیکن یہ امر بہت مشتبہ ہے اور اس سے ابھی تک کسی نے بحث بھی نہیں کی ہے کہ آیا وہ کتاب جس کی تردید قاسم نے کی واقعی ابن المقفع کی تصنیف تھی۔ اس کے خلاف خارجی اور داخلی دونوں قسم کی شہادتیں موجود ہیں۔ اول تو یہ کہ اور کسی ذریعہ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ابن المقفع نے کوئی ایسی کتاب لکھی ہو۔ اس کی تصانیف کی فہرست عام طور پر منقول ہے اور اس میں اس قسم کی کوئی تصنیف نہیں۔ اس کے علاوہ اُس کے حالات اور اطوار کا جہاں تک علم کتابوں سے ہوتا ہے اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ اس قسم کے مباحث سے دور رہنے والا انسان تھا داخلی شہادت اس کے خلاف یہ ہے کہ کتاب کے جو فقرے قاسم نے نقل کئے ہیں وہ نہ تو مصنف کی اعلیٰ ذہنی قابلیت پر دلالت کرتے ہیں اور نہ ان میں طرز تحریر کی کوئی خوبی ہے۔ خود قاسم کی رائے میں بھی وہ کتاب "اعجمی(۳) البیان" تھی حالانکہ اس میں شک اور شبہے کی مطلق گنجائش نہیں کہ ابن المقفع نہ صرف عربی طرز تحریر کا مالک تھا بلکہ ذہنی صلاحیت میں بھی ممتاز حیثیت رکھتا تھا ہمیں اس میں شک کرنے کی تو کوئی وجہ نہیں کہ قاسم بن ابراہیم کو ایک کتاب ایسی ملی تھی جس میں اسلام اور قرآن پر اعتراضات تھے اور اس کا مصنف فرقۂ ثنویہ سے تعلق رکھتا تھا اور کچھ ایسے اسباب بھی تھے جن کی بنا پر قاسم نے یہ خیال کیا کہ وہ کتاب ابن المقفع کی تصنیف تھی۔ لیکن قاسم بن ابراہیم کا زمانہ ابن المقفع سے تقریباً ایک صدی بعد کا ہے اور وہ مرکز خلافت سے دور یمن میں رہتے تھے۔ اس زمانے میں ثنویہ کی تصانیف پھیل رہی تھیں اور بیشتر گمنام تھیں۔ مصنفین کے بارے میں عام طور پر قیاس آرائیاں بھی ضرور ہوتی ہوں گی اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان کتابوں میں سے ایک ابن المقفع سے

I (1) Nyberg in O.L.Z. 1929 p 425 ff. (2) Bergsträsser in Islamica, 1930 p 294 ff

(۳) کتاب الرد ص ۸۔

منسوب کردی گئی کیونکہ وہ ایک مشہور اہلِ قلم تھا، زندیق ہونے کا الزام اس پر لگایا جا چکا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے پہلوی سے بعض مذہبی رسائل کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ قاسم نے جو سرتاپا ایک پرجوش مبلغ تھے اس نسبت کو بے چون وچرا تسلیم کرلیا اور لگے اس کی تردید کرنے۔ ان کے لئے فطرتاً یہ مسئلہ بالکل ثانوی حیثیت رکھتا تھا کہ واقعی اس کتاب کا مصنف کون تھا۔ اصل حقیقت ان کیلئے یہ تھی کہ جو بھی اس کا مصنف تھا وہ زندیق اور لعین تھا۔ مصنف کی تحقیق کی نہ انھیں فرصت تھی اور نہ ضرورت۔

مامون کے عہد میں (۱۹۸ تا ۲۱۸ھ) جب روشن خیالی کی نہ صرف تلقین ہوتی تھی بلکہ لوگوں کو بجبر روشن خیال بنایا جاتا تھا سب سے بڑا مسئلہ خلق قرآن کا تھا۔ اعجاز قرآن کا مسئلہ یا تو بالکل ٹال دیا گیا ہوگا یا اسے ضمنی حیثیت دے دی گئی ہوگی لیکن اس زمانے کا ایک واقعہ بہت قابلِ لحاظ ہے۔ مامون کے ایک درباری نے جس کا خلیفہ سے کوئی رشتہ بھی تھا اور جس کا نام عبداللہ بن اسمٰعیل الہاشمی کہا جاتا ہے اپنے ایک دوست کو جو کسی زمانے میں مامون کا درباری رہ چکا تھا لیکن راسخ عیسائی تھا اور جس کا نام عبدالمسیح بن اسحاق الکندی بتایا جاتا ہے ایک طویل خط لکھا جس میں اُسے دینِ اسلام قبول کرنے کی دعوت دی اور عیسائیت پر اسلام کی فضیلت ثابت کرنے کی کوشش کی۔ عبداللہ الہاشمی نے محمد کی رسالت کے ثبوت میں ایک دلیل۔ قدرتی طور پر۔ اعجاز قرآن کی بھی پیش کی تھی۔ کندی نے اس خط کے جواب میں ایک طویل تر خط لکھا جس میں ہاشمی کے تمام دلائل کا ایک ایک کرکے جواب دیا اور خصوصاً قرآن سے متعلق جو دلائل تھے ان کی بہت تفصیلی تردید کی۔ اس سلسلے میں اس نے قرآن کی جمع و ترتیب پر اس کی زبان، طرز ادا اور مضامین پر بہت سے اعتراضات وارد کئے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ ہر ممکن ذریعے سے اس نے اعجاز قرآن کے اسلامی عقیدے کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں اس لئے کہ ان معدودے چند رسائل میں سے جو اسلام کے ابتدائی عہد میں اس کے خلاف لکھے گئے تھے غالباً یہی ایک اب تک دستیاب ہوتا ہے۔ (نوٹ اگلے صفحے پر دیکھئے)

اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد ایک شخص نمودار ہوا جس کا نام ابوالحسین احمد بن یحییٰ تھا لیکن جو ابن الراوندی کے نام سے مشہور ہے (م ۲۵۰ھ) آخری عمر میں اس شخص کا خاص مشغلہ عقائد اسلام اور خصوصاً قرآن پر اعتراضات تراشنا ہی رہ گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے کئی کتابیں اس موضوع پر لکھی تھیں۔ ایک کا نام جس میں اس نے صرف قرآن پر اعتراضات کئے تھے 'الدامغ' تھا۔ یہ کتاب غالباً اس نے بعض یہودیوں کی فرمائش پر لکھی تھی جن کے یہاں وہ حکومت وقت کے خوف سے روپوش تھا۔ اس کی مثال غالباً ہمارے زمانے کے بعض ان صحافیوں کی سی ہے جو بلا پس و پیش ایک ہی مسئلے کی موافقت اور مخالفت میں یکساں طمطراق کے ساتھ معاوضہ حاصل کرنے کے لئے مضامین لکھنے پر تیار نظر آتے ہیں۔ اس کی بیشمار تصانیف میں سے صرف جستہ جستہ ٹکڑے ملتے ہیں اور وہ عام طور پر ان کتابوں میں جو اس کی تردید میں لکھی گئی تھیں۔[۲]

وہ اعتراضات جو عہد بہ عہد قرآن پر وارد کئے گئے ہیں اور مسلمانوں نے ان کے جوابات

---

[۱] یہ دونوں خط مصر میں طبع ہو چکے ہیں۔ رسالۃ الھاشمی الی الکندی و رسالۃ الکندی الی الھاشمی مصر ۱۹۱۲ء اس سے پہلے ان خطوط کا خلاصہ سر ولیم میور نے ایک انگریزی مضمون میں کیا تھا جو لندن میں ۱۸۸۷ء میں طبع ہوا ہے۔ ان خطوط کے دونوں کاتبوں کے نام فرضی معلوم ہوتے ہیں۔ عبداللہ اور عبدالمسیح۔ ابن اسمٰعیل اور ابن اسحاق' ہاشمی اور کندی میں الیا کھلا ہوا تقابل ہے کہ اسے اتفاق پر مبنی سمجھنا مشکل ہے غالباً اصلی نام مصلحتاً پوشیدہ رکھے گئے تھے لیکن اس میں شک کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ یہ خطوط مامون کے عہد سے متعلق اور اس کے درباریوں ہی کے ہیں۔ ایک تو انکی زبان بہت قدیم معلوم ہوتی ہے اور طرز استدلال بھی قدیم ہے دوسرے اگر ہم اس نکتے پر غور کریں کہ خلیفہ متوکل نے علی بن ربن سے ایک کتاب نبوت محمدی کے ثبوت میں لکھوائی تھی تو یہ مسئلہ بالکل حل ہو جاتا ہے۔ متوکل نے مامون کے طرز عمل کی اپنے زمانے میں ہر حیثیت سے مخالفت کی اور اس کی روشن خیالی کے مقابلے میں ہر طرح راسخ الاعتقادی کا ثبوت دیا اس لئے بہت قرین قیاس ہے کہ کتاب الدین والدولۃ' کا محرک بھی مامون کے ان اثرات کو محو کرنے کا جذبہ رہا ہو جن کی جھلک ان خطوط میں نظر آتی ہے۔ وہاں ایک عیسائی الکندی اسلام پر اعتراضات (باقی اگلے صفحے پر)

دئے ہیں۔ ایک مستقل تصنیف کے محتاج ہیں۔ یہ موضوع بہت وسیع ہی اور اس کا مسالہ علم کلام کی کتابوں میں بھرا پڑا ہی۔ بلا استثنا ہر متکلم اعجاز قرآن کی بحث کے بعد ان اعتراضات کا جواب دینا شروع کرتا ہی جو قرآن پر وارد کئے جاتے ہیں۔ ابو الحسن عبدالجبار ہمدانی اسدآبادی (م ۴۱۵ھ) نے تو ایک مستقل تصنیف ہی اس موضوع کے لئے وقف کردی ہی۔ اس کتاب کا نام "تنزیہ القرآن عن المطاعن" ہی۔ اسلام کی دینی تاریخ اور عرب کی لسانی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بہت مفید ہوگا اگر ان تمام اعتراضات اور ان کے جوابات کو جمع کیا جائے اور اُن کو اچھی طرح مرتب کرکے شائع کیا جائے۔

وارد کرتا ہی اور یہاں ایک سابق عیسائی علی بن ربّن اسلام کی حقانیت پر کتاب لکھتا ہی۔ [2] ملاحظہ ہو مقدمہ کتاب الانتصار، عبدالرحیم الخیاط مرتبہ نیبرگ (Nyberg) مطبوعہ مصر ۱۳۴۴ھ اور رٹر (Ritter) کا مضمون رسالہ "Der Islam" ج ۱۹ ۱۹۳۰ء ص، [3] مطبوعہ مصر ۱۳۲۹ھ

روحِ تہذیب[۱]

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر — کازدام و دد ملولم و انسانم آرزوست

زیں ہمرہانِ سُست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما

گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

ایک رات عالمِ خواب میں جب تخیّل عقل اور مصلحت کی بندشوں سے آزاد ہوجاتا ہے میرا اوران شیخ کا ساتھ ہوگیا جو حیوانوں اور چوپاؤں سے بیزار تھے اور ایک انسان کی تلاش میں عمر گذار چکے تھے لیکن انھیں اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی تھی انھوں نے اپنی جستجوئے ناکام کا افسانہ مجھے سنایا کہ کس طرح انھوں نے ہر ملک اور ہر قوم کے لوگوں میں ایک ایسے انسان کی جستجو کی جس میں وہ تمام صفات موجود ہوں جنھیں وہ انسانیت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں لیکن ان کو پے دپے مایوسی کا شکار ہونا پڑا اور ہمیشہ شریف اور مشہور اور نیک نام انسانوں کی شکل میں ریاکاری، جھوٹ اور نفسانیت کے مجسمے ملے۔ میں ان ستم ظریف حضرت کی طبیعت سے واقف نہ تھا۔ بظاہر نہایت سیدھے سادے مردِ معقول معلوم ہوتے تھے۔ میں نے بغیر انجام کو سوچے ہوئے ان سے یہ کہا کہ شاید

---

[۱] یہ اس مقالے کا پہلا حصہ ہے جو خواجہ غلام السیّدین صاحب نے اکتوبر ۴۲ء میں اردو اکادمی کے ماہانہ جلسے میں پڑھا۔ اس میں تمہید کے طور پر خواجہ صاحب نے ہماری موجودہ تہذیب کی وہ کیفیت دکھائی ہے جسے خوابِ پریشاں کہا جا سکتا ہے۔ غالباً اسی رعایت سے شیخ سے ملاقات بھی خواب میں ہوئی اس حصے کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوگا کہ ہمیں تہذیب کے صحیح مفہوم پر غور کرنے کی کتنی ضرورت ہے دوسرے حصے میں اسی صحیح مفہوم کی تشریح کی گئی ہے

(مدیر)

آپ کو بدقسمتی سے صرف بُرے لوگوں سے سابقہ پڑا ہوگا۔ میں نے مانا کہ واقعی معنوں میں انسان بہت کم ہیں لیکن بالکل ناپید بھی نہیں۔ میں آپ کو ایسے ایک انسان سے نہیں کئی انسانوں سے ملا دوں گا جن میں وہ صفات موجود ہیں جن کا احترام کرنا سب پر لازم ہے۔ وہ مسکرائے اور راضی ہو گئے اور میں نے یہ حماقت کی کہ ان کی رہنمائی کا فرض اپنے ذمہ لے لیا۔

میں نے سوچا کہ سب سے پہلے ان کی ملاقات اپنے ایک نوجوان دوست سے کراؤں جو نہایت مہذب اور تربیت یافتہ ہیں اور میرے خیال میں ایک قابلِ رشک زندگی بسر کرتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کے علاوہ مغرب میں رہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ گھر سے خوش حال ہیں۔ خاندانی جائداد کی معقول آمدنی ہے اس لئے نوکری یا کوئی اور کام نہیں کرتے ایک شاندار اور خوبصورت کوٹھی میں رہتے ہیں اور مختلف ادبی اور تہذیبی مشاغل میں اپنا وقت گذارتے ہیں۔ قدرت کی طرف سے بہت صاف ستھرا اور شائستہ مذاق پایا ہے۔ انگریزی اردو اور فارسی ادب میں بہت اچھی نظر ہے۔ ادبِ لطیف کی طرز کے مضامین لکھتے ہیں جن میں ایک خاص چاشنی ہوتی ہے۔ شعر بھی کہہ لیتے ہیں۔ موسیقی سے بہت دلچسپی ہے اور مشرقی اور مغربی موسیقی کو خوب سمجھتے اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ انگلستان میں رہ کر اور یورپ کی سیاحت کے دوران میں انھیں مغربی مصوری کے شاہکاروں کو مطالعہ کرنے کا اچھا موقع ملا ہے۔ اس لئے تصویروں کے حسن و قبح پر بہت قابلیت کے ساتھ رائے دیتے ہیں۔ گفتگو بہت معقولیت اور شائستگی سے کرتے ہیں اور چونکہ اپنی فرصت میں اکثر موجودہ زمانے کے ادب اور جدید تصانیف کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں اس لئے زمانۂ حال کے رجحانات اور تحریکوں سے باخبر ہیں۔ مختصر یہ کہ خوش نصیبی اور ذاتی قابلیت کی بدولت اپنی زندگی بہت عمدگی اور خوش اسلوبی سے بسر کرتے ہیں اور ہر شخص کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں تہذیب اور شائستگی کے تمام لوازم اور تمام قدریں موجود ہیں۔ خیر، میں ان نئے ملاقاتی کو اپنے دوست سے ملانے لے گیا۔ جب ہم لوگ ان کے یہاں پہنچے تو وہ چند دوستوں کے ساتھ بیٹھے گراموفون بجا رہے تھے۔ ہمارے پہنچتے ہی بولے "اس ریکارڈ کو غور سے سنیئے

یہ ایک بہت مشہور روسی گیت ہے " والگا کے کشتیبان کا گیت" جس کو جرمنی کے مشہور استاد کرائسلر نے ستار پر بجایا ہے۔ انھوں نے اس کی تمام خوبیاں اور نکات ہم کو سمجھائے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی با مذاق تحسین کی مدد سے ہم نے اس نغمے سے بہت لطف اٹھایا۔ پھر انھوں نے چند ہندستانی ریکارڈ بجائے، ان کی راگنیوں کی تشریح کی، گانے والوں کی خصوصیات بتائیں، مشرقی اور مغربی موسیقی کا فرق مثالیں دے کر سمجھایا۔ اس کے بعد وہ کچھ دیر تک اردو اور انگریزی ادب کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ اس کے بعد موجودہ رجحانات پر اظہار رائے کیا۔ بہت سی جدید تصانیف ہمیں دکھائیں جو ان کے روز افزوں کتب خانے کی زینت ہیں۔ کہنے لگے " میں شاعری میں قدیم کلاسکی انداز کا قائل ہوں۔ خواہ آپ مجھے قدامت پسند ہی کیوں نہ سمجھیں۔ مجھے نہ موجودہ اردو شعراء کے نئے اور بھونڈے تجربے پسند ہیں نہ انگریزی شعراء کی وزن اور قافیہ سے آزاد شاعری جس میں نہ توازن ہے نہ ہم آہنگی۔ بات یہ ہے کہ شعر اور موسیقی میں بہت قریبی تعلق ہے جس شعر میں موسیقیت نہ ہو وہ میرے نزدیک شعر ہی نہیں ......" کچھ دیر تک اس موضوع پر گفتگو رہی۔ اس کے بعد کچھ ذکر سینما کا چھڑ گیا۔ انھیں سینما کے متعلق غضب کی واقفیت ہے۔ انھیں یہ معلوم ہے کہ ہر مشہور ایکٹر اور ایکٹرس نے کن فلموں میں کام کیا ہے ان کی تنخواہیں کس قدر ہیں۔ ان کی عمر کیا ہے۔ آنکھوں اور بالوں کا رنگ کیسا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی کتنی مرتبہ شادی ہوئی ہے اور کتنی مرتبہ طلاق؟ ان کے پاس ایک نہایت خوبصورت چمڑے کی جلد کی نوٹ بک ہے جس میں انھوں نے بترتیب حروف تہجی ان تمام فلموں کی فہرست لکھی ہے جو انھوں نے دیکھے ہیں اور دوسری نوٹ بک میں تمام مشہور ایکٹروں کے حالات درج ہیں۔ انھوں نے اپنے شوق سے ان کی تصویروں کے بہت سے البم جمع کیے ہیں جن میں سے متعدد تصویروں پر صاحبان تصویر کے دستخط موجود ہیں! وہ سینما کو محض تفریحاً نہیں دیکھتے بلکہ اس کو ذہنی اور اخلاقی تعلیم کا ایک زبردست آلہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستانیوں کی سیاسی تربیت میں بھی اس کو بڑا دخل ہے۔ کیونکہ مغربی تہذیب کا پردہ ان کی نظروں میں اسی

سے فاش کیا ہی.... وہ اس گفتگو میں منہمک تھے کہ شیخ صاحب نے ایک بالکل غیر متعلق بات چھیڑ دی۔ کہنے لگے کیوں صاحب۔ آپ تو بہت بڑے زمیندار ہیں۔ آپ کے بہت سے گاؤں ہوں گے۔ کبھی آپ کو وہاں جانے کا اتفاق بھی ہوتا ہی؟" انھوں نے کہا "جی ہاں ابھی کچھ عرصہ ہوا میں اپنے گاؤں گیا تھا اور کچھ روز وہاں ٹھیرا تھا" پوچھا "فرمائیے آپ کو گاؤں سے اور گاؤں والوں سے بھی کچھ دلچسپی اور تعلق ہی یا نہیں" انھوں نے کہا "جی ہاں، مجھے گاؤں سے اور اس کی سادہ زندگی سے بہت دلچسپی ہی برسات ختم ہونے کے بعد اکتوبر کے مہینہ میں جب زمین زمردیں سبزے اور شفاف پانی سے ڈھکی ہوتی ہی اور میلوں تک ہرے بھرے کھیت لہلہاتے نظر آتے ہیں، میں اکثر ایک آدھ ہفتہ دیہات میں بسر کرتا ہوں۔ شہروں کی زندگی میں بہت تصنع اور تکلف ہی۔ کبھی کبھی خود بخود جی چاہتا ہی کہ انسان اس سے بھاگ کر چند روز فطرت کے سادہ اور خوشگوار مناظر کا لطف اٹھائے۔ میں جب کبھی چند روز اپنے گاؤں کے مکان میں بسر کرتا ہوں تو ہمیشہ تازہ دم ہو کر لوٹتا ہوں۔ اور ایک خاص اطمینان اور سکون قلب محسوس کرتا ہوں اگر انسان وہاں گندگی اور غلاظت سے محفوظ رہ سکے اور اس کے ساتھ چند کتابیں اور گراموفون وغیرہ ہوں تو تبدیل آب و ہوا اور تبدیل مقام کے لئے گاؤں سے بہتر اور کون سی جگہ ہو سکتی ہی؟ مزدور اور کاشتکار سب اپنی رعایا ہیں۔ کام کے لئے ہر قسم کی سہولت شکار کا انتظام بہت عمدہ ہو سکتا ہی۔

شیخ صاحب نے کہا "جی ہاں۔ یہ تو میں سمجھا لیکن میں نے یہ دریافت کیا تھا کہ آپ کو گاؤں کے لوگوں سے بھی کچھ دلچسپی ہی یا نہیں جو اسی گندگی اور غلاظت میں رہتے ہیں جس سے آپ بھاگتے ہیں اور جن کے پاس نہ گراموفون ہی نہ کتابیں۔ وہ آپ کی رعایا ہیں نہ؟ ان سے آپ کے تعلقات اور مراسم کیسے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا "سنئے، شیخ صاحب، میرا عقیدہ یہ ہی کہ زمیندار کو ہمیشہ کاشتکاروں کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھنے چاہئیں۔ میرا اصول یہ ہی کہ میں سال میں ایک مرتبہ اپنے دیہات میں ضرور جاتا ہوں۔ اپنے کسانوں اور کاشتکاروں

سے ملتا ہوں۔ (مسکرا کر) نذرانہ وصول کرتا ہوں بفضل کے حالات دریافت کرتا ہوں۔ ان سے پوچھتا ہوں کہ انھیں کسی بات کی شکایت تو نہیں ہے۔ جو کچھ انتظام یا رعایت وہ کرانا چاہتے ہیں اس کا وعدہ کر لیتا ہوں لیکن (دوبارہ مسکرا کر) یہ تو آپ جانتے ہیں کہ وعدہ آسان ہے' وعدہ کی وفا مشکل ہے۔ میرا اصول ہے کہ زمیندار کو اپنی رعایا کے ساتھ خود نرمی اور مہربانی سے پیش آنا چاہیئے تاکہ جب وہ اس سے ملیں تو اسے اپنا محسن اور دوست سمجھیں۔ لگان کی وصولی وغیرہ میں جو کچھ سختی کرنی ضروری ہو اسے کارندوں پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ میں نے مانا کہ سختی کے بغیر کام نہیں چلتا لیکن آپ جانتے ہیں کہ آج کل زمانہ نازک ہے' سختی اور نرمی کو ملا کر کام نکالنا چاہیئے اور بہترین تقسیم عمل یہی ہے کہ زمیندار خود نرمی سے کام لے اور اس کے کارندے سختی سے! کہیئے کیا رائے ہے'؟

شیخ صاحب کو یہ سن کر یارائے ضبط نہ رہا۔ بولے "خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک ہندوستان میں آپ جیسے زمیندار موجود ہیں کیونکہ غریب کسانوں اور کاشتکاروں کی اصلاح اور بہبود کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ خدا زمینداروں کی عقل کو بالکل سلب اور معطل کر دے اور ان کے انسانی جذبات مفقود ہو جائیں۔ اس وقت انشاءاللہ یہ نظام' جو ظلم اور ناانصافی کی بنیاد پر قائم ہے' خود اپنی تباہی کا باعث ہو جائے گا۔ آپ ان جفاکش اور جفا نصیب کسانوں کی محنت میں سے اپنا حصہ "سختی اور نرمی کو ملا کر" وصول کر لیتے ہیں اور اس کے برتے پر عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ گراموفون بجاتے ہیں۔ شعر و شاعری کا لطف اٹھاتے ہیں' سینما دیکھتے ہیں' خوبصورت تصویروں سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اپنے دل میں سمجھتے ہیں کہ آپ ایک مہذب انسان ہیں! اور آپ کی طبیعت میں ماشاءاللہ نفاست اس قدر ہے کہ جب آپ گاؤں میں جا کر تفریح کرتے ہیں تو اس بات کا التزام رکھتے ہیں کہ وہاں کی غلاظت سے محفوظ رہیں۔ کبھی آپ نے یہ بھی غور کیا ہے کہ یہ لوگ جو بے زبان جانوروں کی طرح آپ کی خاطر اپنا پسینہ بہاتے ہیں سال میں ۳۶۵ دن اسی گندگی اور غلاظت میں رہتے ہیں۔ کبھی ان کے لئے بھی آپ نے صفائی یا حفظان صحت یا تعلیم کا کوئی بندوبست کیا؟ نہیں! آپ کو اپنے تہذیب اور

تفریح کے مشاغل سے اتنی فرصت کہاں کہ آپ یہ درد سری مول لیں! آپ نے کبھی اپنے ہاتھوں کو کسی کام یا مزدوری یا محنت سے آلودہ نہیں کیا، آپ کو ان کی زندگی اور قسمت کے لکھے کا کیوں اندازہ ہونے لگا؟

عاشق نہ شدی محنتِ ہجراں نہ کشیدی　　کس پیش تو غم نامہ ہجراں چہ سراید؟

مگر تہذیب اسے کہتے ہیں کہ شیخ صاحب کی غضب آلود تقریر سن کر بھی میرے دوست کی پیشانی پر بل نہیں آیا۔ اسی اطمینان قلب اور شائستگی سے فرمانے لگے "شیخ صاحب۔ اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے! یہ اپنی اپنی رائے ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہر شخص کو صرف ایک ہی زندگی ملتی ہے، اسے بار بار تو دنیا میں آنا نہیں ہے۔ اسی زندگی کو غنیمت جان کر اسے چاہیئے کہ اس قلیل مدت میں یہاں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔ علم حاصل کرے، دولت اور قوت حاصل کرے، اپنی ذہنی اور ذوقی قوتوں کی تربیت کرے، فطرت کے مناظر اور فنون لطیفہ کے شاہکاروں سے لطف اٹھائے۔ مختصر یہ کہ اپنی زندگی کو خوش باش طریقہ پر بسر کرے۔ اگر اسے تمام دنیا کی فکر پڑی رہے گی تو اس سے دنیا کو کچھ فائدہ نہ پہنچیگا اور وہ خود ہر طرح کی تہذیب اور تربیت سے محروم رہ جائے گا۔ دنیا میں واقعی ضرورت انفرادیت کو مستحکم کرنے کی ہے اگر ہر شخص اپنی اپنی فکر رکھے تو یہ نہ صرف اس کے لئے مفید ہے بلکہ سوسائٹی کو بھی اس سے فائدہ پہنچیگا۔ آج کل لوگ جذبات کی تنگی اور دل کی کمزوری سے بے بس ہو کر بجائے اپنی ترقی اور اصلاح کی کوشش کرنے کے تمام دنیا کی اصلاح کا بیڑا اٹھا لیتے ہیں۔ لیکن اس جذبات نوازی سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا۔ معاف کیجئے گا آپ کو میری باتیں شاید ناگوار گذریں۔ آپ غالباً خود غرضی کو برا سمجھتے ہیں۔ مگر میری رائے یہ ہے کہ خود غرضی ہی پر عالم کا نظام قائم ہے اور صحیح طور پر قائم ہے۔ اگر میں بھی جا کر گاؤں میں رہنے لگوں اور ان لوگوں کی طرح ہل چلاؤں اور بیلوں کی رکھوالی کروں تو دنیا میں ایک غلیظ جاہل، بدمذاق کسان کا اضافہ ہو جائے گا اور (معاف کیجئے گا) ایک اچھے خاصے تعلیم یافتہ، خوش مذاق، با تہذیب انسان کی کمی! ممکن ہے آپ اس تبدیلی کے لئے تیار ہوں۔ لیکن میں اس کو

کسی طرح اچھا نہیں سمجھتا"

جب ہم لوگ وہاں سے نکلے تو شیخ صاحب کا چہرہ بہت غضب آلود تھا۔ دروازہ سے باہر قدم ہی رکھا تھا کہ بہت زور سے کہا "لاحول ولا قوۃ الا باللہ! ارے بھئی، تم نے مجھے کس نقلی انسان سے ملا دیا۔ یہ شخص زیادہ سے زیادہ ایک بہروپیا ہے یا ایک نمائش پسند حیوان۔ کیا تم سنجیدگی سے یہ خیال کرتے ہو کہ اس شخص کو، جو فنون لطیفہ سے سطحی دلچسپی رکھتا ہے اور خود غرضی کے فلسفہ کی تلقین کرتا ہے تہذیب سے کوئی سروکار ہے؟ بے شک تہذیب نفس کی تکمیل کے لئے ذوق سلیم ایک نہایت ضروری چیز ہے لیکن اتنا ہی جتنا کسی عمارت کے لئے خوبصورت اور موزوں ہونا۔ اگر عمارت ہی نہ ہو تو کس چیز کو خوبصورت بناؤ گے! اس کا خیال ہے کہ وہ فنون لطیفہ میں بہت دستگاہ رکھتا ہے۔ یہ سراسر غلط فہمی ہے۔ جس شخص کو خدا کے بیشمار بندوں کے کام کاج اور محنت مزدوری سے کوئی سابقہ نہیں پڑا، جس کو کبھی دکھ اور مصیبت اور افلاس کی خلش محسوس نہیں ہوئی، جس نے کبھی انسانوں کے مشترک اغراض و مقاصد میں حصہ نہیں لیا اس کو فنون لطیفہ سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت بھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنے خیالات اور نظریوں کی بنیاد الفاظ پر قائم رکھتا ہے جن کی حیثیت محض اتنی ہے کہ وہ ہوا میں تموج پیدا کرتے ہیں اور بس۔ ان کی پشت پناہی کے لئے کوئی شدید اور پرخلوص ذاتی تجربہ نہیں ہوتا۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ایک شاعر جو اپنی لافانی نظم سے دنیا کو مالا مال کرتا ہے محض خوبصورت الفاظ کے ساتھ کھیلتا ہے؟ نہیں! اس میں اس کے تلخ اور شیریں تجربات کا عطر ہوتا ہے اس کا خون جگر شامل ہوتا ہے۔ اس کے دل کے تار تمام انسانوں کے دکھ درد کے لئے لرزتے ہیں اور ان کے ارتعاش کی وجہ سے اس کے الفاظ ہر شخص کے دل میں اتر جاتے ہیں۔ جو شاعر ان تجربات کی دولت سے محروم ہے، جس کو خود غرضی نے تنگ حدود میں قید کر دیا ہے وہ ممکن ہے ایسے شعر کہہ دے جو کانوں کو بھلے معلوم ہوں اور عارضی طور پر دل کو لبھائیں لیکن وہ ہرگز کسی قدر مستقل کے حامل نہیں ہو سکتے۔ اور یاد رکھو کہ شاعری سے حقیقی طور پر لطف اندوز ہونے کے بھی وہی شرائط ہیں جو اچھا شعر کہنے کے، اور یہی حال تمام فنون لطیفہ کا ہے۔ ان سب کی

بنیاد وہی محنت اور مزدوری اور دستکاری ہو جس کو آپ کا شاعر دوست حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور مجھے اس پر صرف یہی اعتراض نہیں کہ وہ فنون لطیفہ کی اہمیت کا غلط اندازہ کرتا ہو اور ان کا مفہوم نہیں سمجھتا۔ یہ تو ضمنی بات ہو۔ مجھے تو اس کے تمام فلسفۂ حیات پر اعتراض اور اس سے اختلاف ہو۔ عزیزمن۔ آج کل ہندوستان میں خاصی تعداد ایسے خوش بخت ذہین اور بظاہر خوش نصیب نوجوانوں کی ہو جن کو قدرت نے سور اتفاق سے ہر قسم کے مواقع دئے ہیں، آسودگی دی ہے، دماغ اچھا دیا ہے، ان کی تعلیم مروجہ نظام کے مطابق بہت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی ہے۔ مگر وہ ہر لحاظ سے بالکل بیکار بلکہ باعث ضرر ہیں۔ بے کار اس لئے کہ وہ کسی مفید تعمیری کام میں حصہ نہیں لیتے اپنے چھوٹے چھوٹے اغراض و مقاصد میں، اپنی ذاتی دلچسپیوں میں محصور رہنے کو مقصد حیات سمجھتے ہیں کسی عظیم الشان اور سنجیدہ مقصد کے ساتھ خود کو وابستہ نہیں کرتے جس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ ان کی انفرادی قوتوں کی نشوونما بھی نہیں ہو پاتی کیونکہ کوئی شخص اسوقت تک خود یابی کی منزل پر نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ خود کو کسی اہم مقصد کے اندر گم نہ کر دے۔ وہ مضر اس لئے ہیں کہ دوسروں کے لئے ایک غلط لیکن کشش رکھنے والی مثال قائم کرتے ہیں۔ وہ خود تہذیب کا مفہوم غلط سمجھتے ہیں لیکن چونکہ اُن کی سماجی حیثیت اچھی ہوتی ہو اس لئے ان کے خیالات کی اشاعت ہوتی جاتی ہو اور قوم میں غلط قدروں اور غلط معیاروں کا رواج ہوتا جاتا ہو۔ لوگ نمائشی اور سطحی چیزوں کو مستقل اہمیت رکھنے والی چیزوں پر ترجیح دیتے ہیں اور چھوٹے اور بڑے مفلس اور آسودہ حال تعلیم یافتہ اور جاہل ہر قسم کے لوگ جھوٹے بتوں کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ میں اس قسم کے آدمیوں کو انسان نہیں سمجھتا۔ مجھے کسی انسان کے پاس لے چلو اور اپنا وعدہ پورا کرو۔

ان کی یہ تمام باتیں سن کر میں بہت گھبرایا۔ مگر میں نے سوچا کہ شاید اس قسم کی تہذیب کی وہ قدر واقعی قدر نہیں کر سکتے ممکن ہو خود ان کی تربیت بہت سخت مذہبی اور اخلاقی ماحول میں ہوئی ہو اس لئے اس مرتبہ ان کے سفید بالوں اور متبرک صورت کا خیال کرکے میں انھیں ایک نہایت معزز اور خدارسیدہ عالم کے پاس لے گیا جن کے تقدس کی بہت دھوم تھی اور جن کے بارے میں لوگوں کا یہ خیال

تھا کہ محض اُن کے پاس بیٹھنے سے دل کی سیاہی کافور ہو جاتی ہے اور ایمان چمک اٹھتا ہے۔ یہ بزرگ عبا
وقبا میں ملفوف ایک عالمانہ دستار سر پر باندھے ایک تخت پر متمکن تھے۔ ان کے گرد کچھ فاصلے پہ چند طلبہ
اور ملاقاتی مودب دو زانو بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے نصیحت آمیز کلام پر سر تحسین ہلا ہلا کر
بجا و درست کہہ رہے تھے۔ ہم نے بھی با ادب سلام کیا اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ مولانا اس وقت دور
حاضرہ کی بے دینی اور دہریت پر گفتگو فرما رہے تھے جس کا ماحصل یہ تھا کہ مغربی تعلیم کی وجہ سے نوجوانوں
کے دماغ میں آزادی کی مسموم ہوا سرایت کر گئی ہے۔ وہ مذہب اور اس کے عقائد و عبادات کی طرف
سے بالکل غافل ہو گئے ہیں، علمار دین کا قرار واقعی احترام نہیں کرتے اور اگر یہی حالت قائم رہی تو
کیا عجب ہے کہ پروردگار عالم ان پر اپنا قہر و غضب نازل فرمائے جیسا کہ اس نے امم سالقہ پر کیا تھا
اس خوفناک تہدید پر حاضرین نے مختلف انداز میں عبرت اور تاسف کا اظہار کیا اور ایک طالب
حق نے یہ سوال کیا کہ "قبلہ و کعبہ اس عذاب الہی سے بچنے کا بھی کوئی طریقہ ہے یا نہیں۔ سرکار
اپنی زبان مبارک سے کوئی ایسا عمل یا اسم تلقین فرمائیں جو حرز ایمان ہو اور ہم لوگوں کے خیالات کو
راہ راست سے بھٹکنے نہ دے" قبلہ و کعبہ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ مذہب سے توسل رکھتے ہیں ان
کو چاہیئے کہ وہ ہر معاملہ میں عالمان دین سے استصواب کریں اور ان کے ارشاد کے مطابق عمل کریں اور
اپنی کوتاہ عقل کو ہر جگہ دخل نہ دیں میں تمہیں ایک دعا بھی لکھ کر دوں گا لیکن یہ نہایت ضروری
ہے کہ لوگ خلوص سے عبادت گذاری کریں اور خوف خدا ہر وقت اپنے دل میں رکھیں۔ لیکن یہاں
پہنچ کر ان کی آواز میں رعب اور جلال کی شان پیدا ہو گئی) وہ عاقبت نا شناس لوگ جنھوں
نے اپنے دلوں میں شکوک کو جگہ دیدی ہے جو خدا اور محافظین شریعت کے احکام پر بے چون چرا
عمل نہیں کرتے اور رہبات کی وجہ دریافت کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے نجات کی کوئی صورت
نہیں ان کے لئے حکم الہی بالکل صریح ہے "فجزا رھم جہنم خالدین فیہا" بخدائے عزوجل اگر دنیا
میں علمائے دین کا وجود نہ ہوتا جن کی مثال انبیائے بنی اسرائیل کی ہے تو یقیناً اس امت نا ہنجار
پر قہر الہی نازل ہو چکا ہوتا

اس ارشاد کو سن کر تمام حاضرین پر بالکل سناٹا طاری ہوگیا۔ ان کو اس وقت صریحاً یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر خدانخواستہ ان کے درمیان سے یہ چند بابرکت ذاتیں اٹھ جائیں تو دنیا کا بالکل خاتمہ ہو جائے۔ اس خموشی کو میرے ساتھی نے نہایت دھیمے اور مودب لہجے میں یہ کہہ کر توڑا "مولانا! جناب نے یہ تو بالکل درست ارشاد کیا کہ آج کل لوگوں میں بے دینی کا رواج بڑھتا جا رہا ہے لیکن اپنی زبان معجز بیاں سے اتنا اور ارشاد فرما دیجئے کہ بے دینی کی اس روز افزوں اشاعت کی وجہ کیا ہے اور علمائے دین کی مقتدر جماعت ہوتے ہوئے اس کا تدارک کیوں نہیں ہو سکتا" مولانا نے ذرا چونک کر ان کی طرف دیکھا کیونکہ ان کو ایسے لوگوں سے بالعموم سابقہ نہ پڑتا تھا جو اس قسم کے سوالات ان سے کریں۔ انھوں نے کہا "حضرت میں نے ابھی تو بیان کیا تھا کہ مروجہ بے دینی کی وجہ یہ ہے کہ مغربی تعلیم نے ان کے خیالات کو خراب کر دیا ہے۔ تشکک کی لعنت ان کے دلوں میں پیدا ہو گئی ہے۔ وہ علمائے دین کی عزت اور ان کے مرتبے کو نہیں پہچانتے اس لئے وہ ان کی طرف رجوع نہیں کرتے اور جہالت و ضلالت کے سمندر میں ڈوبتے چلے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں ہم ان کی اصلاح کیسے کر سکتے ہیں؟ جب خداوند تبارک و تعالیٰ اپنی حکمت کاملہ اور مصلحت عالیہ سے ان کے دلوں کو حق کی جانب پھیر دے گا اور وہ ہماری طرف رجوع کریں گے اس وقت انشاء اللہ المستعان ہم ان کی ہدایت کا انتظام کر سکیں گے۔" یہ بات سن کر بجائے خاموش ہو جانے کے شیخ صاحب کج بحثی پر اتر آئے اور بولے "مولانا! معاف کیجئے گا یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر خداوند عالم از خود اپنی حکمت کاملہ سے ان نوجوانوں کے دلوں کو حق کی طرف پھیر دے گا تو اس وقت آپ کی ہدایت کی کیا ضرورت رہے گی۔ کیا ہدایت الٰہی کے بعد بھی کسی انسانی ہدایت کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ میری رائے ناقص میں تو یہ بات آتی ہے کہ خدائے تعالیٰ اپنی مصلحتوں کو پورا کرنے کے لئے مختلف وسیلوں اور واسطوں سے کام لیتا ہے اور خود جناب نے ابھی ارشاد فرمایا تھا کہ امت کی ہدایت اور نجات کا وسیلہ علمائے دین کی جماعت ہے اس لحاظ سے تو جناب پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ لوگوں کی اصلاح کے لئے جد و جہد کریں اور اُن کو راہ راست پر لانے کی تدابیر سوچیں ورنہ

محض ہادی ہونے کا دعویٰ کرنا کافی نہیں"۔ مولانا کو شیخ کی یہ گستاخی اور آزادی رائے ناگوار گذری لیکن انھوں نے تحمل سے کام لے کر فرمایا۔ حضرت میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ لا تجسّسوا فی امور اللہ جن معاملات کو انسان نہیں سمجھ سکتا ان میں اسے اپنی عقل نہیں لڑانی چاہیئے۔ کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ خدائے عزوجل کے احکام اور مصلحت کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم احکام الٰہی اور ان کے مفہوم و معانی کو آپ تک پہنچائیں اور آپ کا فرض ہے کہ آپ ہماری تعمیل کریں اور ہدایت و ضلالت کے مسئلہ پر رائے زنی نہ کریں وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے ضلالت کی طرف لے جاتا ہے" یہ حکم قاطع سن کر ہمارے شیخ صاحب کا تحمل ختم ہو گیا اور انھوں نے اپنے مودب لہجہ اور دھیمی آواز کو خیرباد کہکر ایک پر زور تقریر کر ڈالی۔ فرمانے لگے:۔

"جناب! آپ لوگوں کی عادت ہے کہ بغیر سوچے سمجھے ہر مسئلہ پر ایک حکم قطعی لگا دیتے ہیں اور اس کی تائید میں کوئی غیر متعلق آیت اور اگر آیت دستیاب نہ ہو تو کوئی عربی جملہ سنا دیتے ہیں اور اس طرح آزادی رائے اور اظہار خیال کا سد باب کر دیتے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں مذہب پر ایمان رکھنے کے معنی ہیں آنکھیں بند کر لینا۔ میں سمجھتا ہوں اس کی سب سے بڑی تعلیم یہ ہے کہ عقل کی آنکھیں کھول ڈالو اور ضرور ہر معاملہ میں تلاش، جستجو، طلب حق کرو۔ ختم رسل کے بعد وحی والہام کا دروازہ بند ہو جانے کا مطلب یہ تھا کہ اب انسان اپنی عقل اور فکر کے دروازے کھول ڈالے لیکن آپ اس کی اجازت نہیں دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ نے جس قدر باتیں بیان فرمائیں سب غلط ہیں (اس پر ادھر ادھر کے لوگوں نے کچھ اظہار ملامت کرنا چاہا لیکن وہ شیخ صاحب کی تقریر کے دھارے کو روک نہ سکے) اسلام نے کبھی یہ تعلیم نہیں دی کہ انسان اپنی عقل اور رائے کو معطل کر دے اور اپنے تمام شکوک و شبہات کا گلا گھونٹ دے۔ آزادی رائے انسان کا سب سے زیادہ قابل قدر حق ہے اور عقل خدا کی سب سے بڑی نعمت! جب انسان ان سے دستبردار ہو گیا تو اس کے پاس رہ کیا جائے گا؟ رہا شکوک کا پیدا ہونا سو یہ مقتضائے فطرت ہے۔ اگر ان کی تشفی نہ کی جائے بلکہ عذاب الٰہی اور اس سے بھی کہیں زیادہ علمائے دین کے غیظ و غضب سے ڈرا کر انھیں دبا دیا جائے تو اس کا نتیجہ

ہمیشہ روحانی ہلاکت ہوتا ہے۔ ایک سچے اور فطرت شناس عالم کا تو یہ فرض ہے کہ وہ نوجوانوں کے شکوک کی پذیرائی کرے، ان کو کرید کرید کر معلوم کرے اور اپنے زیادہ گہرے اور ہمہ گیر علم کی مدد سے ان کی تشفی کرے۔ آپ کہتے ہیں کہ چونکہ ان کے دل میں شکوک پیدا ہو گئے ہیں اس لئے وہ مذہب اور علمائے دین کی طرف سے بے اعتنائی اور روگردانی کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ چونکہ آپ ان کے شکوک کی تشفی نہیں کرتے یا نہیں کر سکتے اس لئے وہ آپ کی طرف سے بدظن ہیں آپ نے مذہب کو بالکل ایک طلسم یا بھول بھلیاں بنا رکھا ہے اور اس میں چاروں طرف نہایت خوفناک اوامر و نواہی کھڑے کر دئے ہیں تاکہ کسی شخص کو جو شروع ہی سے ہر معاملہ میں پوری طرح ہار نہ مان لے اس کے قریب پھٹکنے کی ہمت نہ ہو۔ آپ صرف ان لوگوں کے ساتھ سروکار رکھنا چاہتے ہیں جو ہر بات میں ہاتھ باندھ کر بجا و درست کہیں اور کبھی اختلاف رائے کی جرأت نہ کریں۔ پھر آپ کو دوسرے لوگوں سے یہ شکایت کیوں ہے کہ وہ آپ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے آپ نے کبھی اُن کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ کبھی ان کی مشکلات کے ساتھ ہمدردی نہیں کی۔ کبھی دورِ حاضرہ کے تمدنی مسائل پر غور کر کے اصول و قوانین کو ان پر منطبق نہیں کیا۔ آپ نے تمام تمدنی انقلابات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے، تمام جدید مطالبات حیات کی طرف سے روگردانی کر کے چند الفاظ اور علامات، اور لوگوں کو ڈرانے دھمکانے پر قناعت کی۔ آپ مذہب کی خدمت کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے مکان پر عزت اور آرام اور کم و بیش آسودگی کی زندگی بسر کریں، کبھی کبھی نماز پڑھا دیا کریں، آپ سے جو مسئلہ پوچھا جائے اس کے متعلق اپنا فتویٰ دیدیں اور اگر کوئی شخص آپ سے اختلاف کرے تو اس کو کافر قرار دیں۔ اگر کوئی جدید تحریک شروع ہوتی ہو جس میں پہلے سے آپ کی رائے نہ لی جائے اور جس کا افتتاح آپ کے متبرک ہاتھوں سے نہ ہو تو آپ اس کو ناکامیاب بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ خود دنیاوی جاہ و عزت اور آسائشوں سے کنارہ کش نہیں ہوتے لیکن آپ کی زبانی تلقین و تعلیم یہی ہے کہ دین اور دنیا دو مختلف چیزیں ہیں اور دنیاوی مفاد کے لئے جد و جہد کرنا گناہ ہے۔ اگر کوئی شخص مذہب کے ظاہری ارکان کو پورا کرتا ہو

لیکن معاملات میں بد دیانتی اور ناانصافی ہو تو اس کی گرفت کرنا آپ اپنا فرض نہیں سمجھتے۔ انسانوں کی زندگی نوے فی صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ دنیوی معاملات اور کاروبار کی زندگی ہے۔ اُس کی اصلاح کرنا اس کو اصول عدالت کے ماتحت منظم کرنا آپ کا اصلی فرض تھا۔ لیکن آپ ان کی زندگی کے دس فیصدی حصے پر قانع ہو گئے ہیں اور اس میں بھی آپ نے مذہب کو، جو ابتدا میں ترقی اور ہمت اور حوصلہ کا ضامن تھا، جمود اور قدامت پرستی کا مرادف بنا دیا ہے۔ آپ سے یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اپنے مقام معزز کو چھوڑ کر اٹھیں، خدا کی دنیا اور خدا کے بندوں میں گھومیں، پھریں۔ ان سے ملیں جلیں، افلاس جہالت توہم پرستی، بیماری اور ظلم و ناانصافی کے دردناک مناظر کو دیکھیں اور انھیں دور کرنے کے لئے اپنا پسینہ بہائیں لباس، انداز، گفتگو اور "شان علم" میں عزت نہیں، عزت تو خدمت میں ہے۔ لیکن خدمت سے آپ کو کوئی واسطہ نہیں۔ کیا آپ کے اور ہمارے ہادی اور سردار سرکار محمدؐ مصطفےٰ نے اشاعت دین اور اعلائے کلمتہ الحق کا فرض اسی طرح انجام دیا تھا جس طرح آپ انجام دیتے ہیں یعنی کیا وہ اپنی جگہ آرام سے بیٹھے رہتے تھے اور جس کسی کو فقہ اور شریعت کے مسائل دریافت کرنے ہوتے وہ خود حاضر خدمت ہوتا اور مسئلہ پوچھ کر چلا جاتا تھا؟ اگر انھوں نے ایسا کیا ہوتا تو کیا انھیں وہ عظیم الشان کامیابی ہو سکتی تھی جو ہوئی؟ ہرگز نہیں انھوں نے چالیس برس کی عمر تک بے غرضی اور بے نفسی کے ساتھ لوگوں کی خدمت کی، غریبوں، مظلوموں، بیماروں، محتاجوں، بیکسوں، اور کمزوروں کی دادرسی کی ان کی خاطر مزدوروں کی طرح کام کیا اور اپنی شان امانت کا سکہ دوست دشمن سب کے دلوں پر نقش کر دیا اس کے بعد انھوں نے ہر طرح کے خطروں اور آزمائشوں کو جھیل کر خدا کا پیغام ہر جگہ سنایا اور اس فرض کی ادائیگی میں جس قدر تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھانی پڑیں انھیں خندہ پیشانی سے برداشت کیا جب کوئی شخص اخلاق محمدی کا خفیف سا پرتو اپنی ذات میں پیدا کرے، جب وہ اپنے نفس کو زیر کر کے دوسروں کے رنج و راحت کو اپنی ذاتی آسائش اور آرام پر ترجیح دینے لگے، جب وہ سچ کی خاطر ہر قسم کی تحریص و ترغیب کو ٹھکرا دے، جب وہ سردار بننے کی بجائے خادم بننے کی کوشش کرے اس وقت علماء امتی میں سے ہونے کا دعویٰ کرے ورنہ ایک وضع خاص بنا کر "شان علم" پیدا کر لینی

کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ جناب مولانائے محترم! آپ میری گستاخی کو معاف کر دیجئے مگر میرے الفاظ پر غور کیجئے۔ یہ نہ دیکھئے کہ کون شخص یہ باتیں کہہ رہا ہے بلکہ یہ سوچئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، اپنی شان تقدس، اپنے ادّعائے بزرگی کو خدا حافظ کہئے۔ خداوند عزوجل کی بارگاہ میں انسانوں کا ایک دوسرے پر تفوق جتانا اور خود کو ما فوق البشر سمجھنا نہایت مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ اگر آپ کو واقعتاً دین کی حمایت مقصود ہے اور آپ بے دینی کے سیلاب کو روکنا چاہتے ہیں تو دوسرے انسانوں کی طرح انسان بن جائیے اور ان میں مل جل کر، ان کے درمیان رہ کر ان کی خدمت کیجئے۔ آزاد خیالی اور مغربی تہذیب و تمدن پر الزام رکھنے سے کام نہیں چلے گا۔ اگر آپ کو دعوائے اجتہاد ہے تو اسلام کی تعلیم کو ایسے انداز میں پیش کیجئے کہ وہ موجودہ تہذیب و تمدن کو کلیتہً مسترد نہ کرے بلکہ اس کے بہترین عناصر کو اپنے اندر ضم کرلے اور لوگوں کے فلاح دارین کا باعث ہو یعنی ان کے دین اور دنیا دونوں کو سدھارے۔ اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو آپ سے عیسائی مشنری بہتر ہیں جو مدرسے کھولتے ہیں، دواخانے جاری کرتے ہیں، لوگوں کو صفائی اور حفظانِ صحت کے اصول سکھاتے ہیں، غریبوں سے ملتے جلتے ہیں۔ ان کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ان کی خدمت کرتے ہیں۔ ان کی مذہبی تلقین غلط سہی ممکن ہے ان کی نیت مشکوک ہو لیکن ان کی معاشرتی خدمات سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا...... یہ کہہ کر انھوں نے میرا بازو پکڑا اور مجھے ساتھ لے کر بہت تیزی کے ساتھ مکان سے باہر نکل گئے قبل اس کے کہ مولانا ان کو عذاب الیم کی بشارت دیں اور حاضرینِ مجلس جن پر حیرت اور غصّہ دونوں طاری تھے ان کی قرار واقعی خبر لیں۔

...... جب میرے ہوش و حواس ذرا ٹھکانے ہوئے تو میں نے ان سے کہا کہ حضرت آپ برائے خدا اس قسم کی حرکتیں نہ کیجئے ورنہ آپ کے ساتھ میری بھی شامت آجائے گی۔ انھوں نے کہا کہ تم ان ذرا ذرا سی باتوں کا خیال نہ کرو۔ ایسے مواقع تو مجھے آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ انسان کی تلاش جان جوکھوں کا کام ہے پھولوں کی سیج نہیں۔ میں نے دبی زبان سے کہا "جی ہاں خصوصاً ایسی حالت میں جب اس میں بت شکنی کا مرض بھی شامل ہو۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ آپ

کو ان صاحب سے کہاں کی دشمنی تھی کہ آپ نے ان کی اس بری طرح لے دے کر ڈالی اور ان کی بزرگی اور مرتبہ کا ذرا بھی خیال نہ کیا۔ ان مولوی صاحب کی علمی معلومات بہت وسیع ہیں وہ ہر شخص سے اخلاق اور مروت سے پیش آتے ہیں عبادت گذار ہیں بہت پاک زندگی بسر کرتے ہیں۔ سوائے اس قلیل نذرانے کے جو ان کے بعض معتقد از خود پیش کر دیتے ہیں۔ اور وہ بھی اس زمانے میں بہت کم ہو گیا ہے ان کا اور کوئی وسیلہ معاش نہیں لیکن وہ اسی پر قانع ہیں۔ اگر علمیت اور اخلاق، عبادت اور قناعت، نیک نفسی اور رمرنجان مرنجی تہذیب اور انسانیت کے اجزا نہیں ہیں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ انسانیت سے کیا مراد لیتے ہیں۔

انھوں نے کہا "عزیز من تمھاری نظر سطحی خوبیوں سے خیرہ ہو جاتی ہے۔ اول تو تم نے جس قدر صفات گنائی ہیں ان کا مفہوم میرے نزدیک وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو۔ دوسرے ان صفات کو تہذیب و انسانیت سے کوئی لازمی تعلق نہیں۔ مجھے جس انسان کی تلاش ہے اس کے لئے عالم ہونا لوگوں سے اخلاق اور مروت برتنا اور عبادت گذاری کرنا لازم نہیں۔ میں تو عالم دین بھی ایسا چاہتا ہوں جس کو یہ اندیشہ نہ ہو کہ اس کا دامن تقدس عوام کے ساتھ ملنے جلنے اور ان کے دکھ درد، ان کے مشاغل میں شرکت کرنے سے آلودہ ہو جائے گا۔ جو انسانوں میں انسان بن کر رہے خود کو حیوانوں میں فرشتہ نہ سمجھے، جو محض "گلیم خویش" کو بچا کر لے جانے کی فکر نہ کرے بلکہ دوسرے ڈوبتوں کو نکالنے کے لئے جد و جہد کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتا ہو۔ مجھے خاص کر کے ان مولوی صاحب کے متعلق نہ کوئی علم ہے نہ ان سے کوئی ذاتی پرخاش یا شکایت، ممکن ہے وہ اپنی ذات سے بہت اچھے اور نیک آدمی ہوں اس معنی میں جو اچھے، اور نیک، کے عرف عام میں سمجھے جاتے ہیں لیکن ان کی مختصر سی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ انھوں نے ابھی مذہب کی الف بے کو بھی نہیں سمجھا۔ میں اس طبقہ علماء کے بہت سے افراد کو جانتا ہوں جنھوں نے اپنی علمیت اور تقدس کو گویا ایک لبادہ بنا کر اپنے گرد لپیٹ لیا ہے اور دنیا کی جد و جہد اور تگ و دو، اس کی تکلیفوں اور تحریصوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ ان کی عبا و قبا کو اس علیحدگی کی علامت سمجھنا چاہیئے۔ یاد رکھو مذہب کو زیادہ نقصان

ان لوگوں سے پہنچتا ہے جو بظاہر اس کے محافظ اور حامل ہیں لیکن روحِ مذہب تک نہیں پہنچے ہیں اور نیک نیتی کے ساتھ لوگوں کو گمراہ یا بد دل کرتے ہیں، لوگ ان کو اپنا راہنما مانتے ہیں۔ ان کے افعال و اقوال کو اپنے لئے سند بنا لیتے ہیں اور اس طرح رہبر اور راہرو دونوں نہایت نیک نیتی کے ساتھ اس راستے پر پڑ لیتے ہیں جو ان کو منزلِ مقصود سے بالکل مخالف سمت میں لے جاتا ہے!

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

ان کی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ شاید ان کو مذہبی لوگوں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں بلکہ وہ طبعاً ان کے مخالف ہیں، اس لئے میں نے یہ سوچا کہ انھیں ایک ایسے صاحب سے ملاؤں جن میں نہ صرف وہ خوبیاں ہیں جو بقول شیخ صاحب نظر کو خیرہ کرتی ہیں بلکہ وہ صفات بھی ہیں جن کے وہ خود قائل معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں انھیں اس مرتبہ ایک نہایت مشہور اور ممتاز بیرسٹر صاحب کے پاس لے گیا۔ جنھوں نے تعلیم جدید کے اعلیٰ ترین منازل کی تکمیل کی ہے ان کی علمی اور انتظامی قابلیت، ان کی ایمانداری، ان کی اقبال مندی کا تمام ملک میں شہرہ ہے قوم اور حکومت دونوں کی نظر میں ان کی بہت قدر اور عزت ہے ان کی رائے ہر معاملہ میں نہایت وقیع اور ذمہ دارانہ سمجھی جاتی ہے وہ اکثر قومی تحریکوں کے رکن بلکہ سرگروہ ہیں، پبلک جلسوں، تعلیمی اور سوشل انجمنوں کے صدر منتخب ہوتے ہیں اور اپنے فرائض کو ایسی قابلیت اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں کہ محض ان کی موجودگی سے جلسہ کو چار چاند لگ جاتے ہیں اور ان کی صدارت سے اس کی اہمیت دوبالا ہو جاتی ہے۔ ان کو خدا نے دولت علم کے ساتھ دولت دنیا کی نعمت بھی دی ہے جس میں سے ایک کافی حصہ وہ نہایت فیاضی کے ساتھ قومی تحریکوں اور طلبہ کی امداد پر صرف کرتے ہیں، بہر حال بحیثیت مجموعی وہ قوم کے ایک نہایت مفید، معزز اور سرگرم رکن ہیں۔ بیرسٹر صاحب ہم لوگوں سے بہت تپاک سے ملے اور تھوڑی سی تمہیدی گفتگو کے بعد انھوں نے پوچھا کہ فرمائیے آپ کو ملک کے موجودہ سیاسی معاملات سے بھی کوئی دلچسپی ہے یا نہیں۔ میں نے کہا "جی ہاں اخبار تو دیکھتا رہتا ہوں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ گتھی کیسے سلجھے گی" کہنے لگے "اب تو معاملات بالکل سلجھ گئے ہیں۔ ہندوستان کا سیاسی مستقبل

روز روشن کی طرح واضح ہے ہمیں بہت جلد فیڈرل حکومت ملجائے گی۔اسمبلی اور کونسلیں بنی ہوں گی آپ لوگوں کو جو نوجوان اور تعلیم یافتہ ہیں (میں نے دل ہیں سوچا کہ میرے ساتھی کو تو دونوں باتوں سے انکار ہے وہ نہ نوجوان ہیں نہ تعلیم یافتہ!) چاہیئے کہ ان جدید مواقع سے فائدہ اٹھائیں اور کونسلوں میں جاکر قومی خدمت کریں اور اپنے مفاد کا تحفظ کریں۔ آج کل سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ کہیں کونسلوں پر نیچ ذاتوں کا، اچھوتوں کا، کانگریس وغیرہ کا قبضہ نہ ہو جائے۔ یہ لوگ یا تو اعتدال کی حدود سے تجاوز کر گئے ہیں یا ان میں قدرتاً یہ صلاحیت نہیں کہ وہ سیاسی ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام زمیندار سرمایہ دار اور معقول خیالات کے تعلیم یافتہ لوگ مل جل کر ایک ایسا مکمل نظام قائم کریں کہ ملک کی حکومت ان کے ہاتھوں میں آجائے اور انھیں کے ہاتھوں میں رہے ورنہ بہت بدامنی اور نقصان کا اندیشہ ہے"

بیرسٹر صاحب کے لہجہ اور انداز گفتگو میں یقین اور اطمینان کی ایسی شان پائی جاتی تھی کہ اگر کوئی شک یا شبہ کسی کج فہم کے ذہن میں پیدا بھی ہوتا تو وہ شرم کے مارے فوراً دور ہو جاتا۔ لیکن شیخ صاحب عجیب آدمی نکلے کہنے لگے " جناب آپ کو یہ فکر کیوں لگی ہوئی ہے کہ حکومت دولت مندوں اور زمینداروں کے ہاتھ میں رہے۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ جمہوری حکومت یا ذمہ دارانہ حکومت کا مفہوم یہ ہے کہ حکومت میں سب لوگوں کا حصہ ہو۔ سب اس میں شریک ہوں اور اس کا نظام ایسا قائم کریں کہ سب کے مفاد کی حفاظت ہو......" وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ بیرسٹر صاحب بیچ میں بول اٹھے ان کی ذہنی تیزی اور جودت کی ایک علامت بلکہ ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ دوسروں کی بہت کم سنتے ہیں اور اپنے خیال کو بہت سرعت کے ساتھ الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ کہنے لگے "۔ اور ان کے لہجہ میں بے انتہا تفوق تھا کچھ تمسخر کی چاشنی تھی اور کچھ وہ رحم اور ہمدردی جو بہر جاننے والے کو بیوقوفوں یا جاہلوں کی باتوں پر ہوتی ہے) جی ہاں میں نے بھی کتابوں میں اس قسم کی باتیں پڑھی ہیں اور پلیٹ فارم پر تقریر کرنے والے بھی اس قسم کے دلفریب خیالات ظاہر کر کے لوگوں کو دھوکا دیا کرتے ہیں لیکن ہم آپ جو تعلیم یافتہ اور سمجھ دار ہیں اور جن پر سوشلزم وغیرہ کے خراب اور خطرناک خیالات کا اثر نہیں ہوا اچھی طرح جانتے ہیں

کہ دنیا میں نہ کبھی ایسا ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ ملک میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کی بے انتہا دولت لگی ہوئی ہے زراعت، تجارت، صنعت و حرفت، کا نظام انھیں کی وجہ سے قائم ہے اگر وہ اپنے حقوق اور مفاد کی حفاظت نہیں کریں گے تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ غیر ذمہ دار لوگ اور جماعتیں ملک کے بنے بنائے نظام کو درہم برہم کر دیں گے اور ایسے قوانین بنائیں گے کہ ہم لوگوں کی پوزیشن اور حقوق خطرے میں پڑ جائیں گے کیا آپ اس خوفناک انجام کی پذیرائی کرنے کے لئے تیار ہیں؟ جناب عقل کا تقاضا یہ ہے کہ انسان عملی دنیا میں عملی قوانین کی پابندی کرے خیالی اور ہوائی باتوں پر اپنے قلعہ کی بنیاد نہ رکھے!" شیخ صاحب کو پھر تردید کے مرض نے مجبور کیا اور بولے "جی ہاں! میں تو بہت خوشی سے اس خوفناک انجام کا استقبال کرنے کے لئے تیار ہوں جس سے آپ خود ڈرتے ہیں اور دوسروں کو ڈرانا چاہتے ہیں ڈر انھیں پر طاری ہوتا ہے جن کے دل میں چور ہوتا ہے اور ان تمام جماعتوں کے دل میں چور ہے جن کی آپ نیابت کرتے ہیں۔ آخر سرمایہ داروں کے پاس سرمایہ کہاں سے آیا؟ انھیں غریبوں اور مزدوروں کے گاڑھے پسینے کی کمائی ہے نہ جن کو آپ ہر قسم کے سیاسی حقوق سے محروم کرنا چاہتے ہیں؟ آپ لوگوں نے کونسلوں اور حکومت کے نظام پر قبضہ کرکے ایسے قوانین بنا دئے ہیں جن کا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ وہ آپ کے غصب کردہ حقوق اور آسائشوں کی حفاظت کریں اور خدا کے بے شمار بندوں کو اقل ترین انسانی حقوق سے محروم رکھیں۔ یہ کہاں کی تہذیب اور کہاں کا انصاف ہے کہ کچھ لوگ تو دنیا کی تمام نعمتوں پر قابض ہو کر بیٹھ جائیں اور عیش و فرصت کی زندگی بسر کریں اور باقی تمام نوع انسان کے حصہ میں محنت اور مصیبت آئے نہ انھیں پیٹ بھر کھانا نصیب ہو نہ تن ڈھانک کپڑا! آپ کو یہ اندیشہ ہے کہ ہندوستان کی جدید حکومت کہیں ایسے قوانین نہ بنائے جن سے آپکے مفاد کو نقصان پہنچنے کا امکان ہو میں کہتا ہوں کہ دیر یا سویر ایسا ہونا اٹل ہے، آپ سیلاب کی یورش کو کچی مٹی کے گھروندوں سے نہیں روک سکتے۔ آج کل تمام دنیا کا یہی رجحان ہے کہ قانون سازی سوشلزم کے اصولوں پر کی جائے۔ میں خود سوشلزم کا زیادہ قائل نہیں۔ مجھے اس کی بعض باتوں سے اختلاف ہے لیکن آپ کو اس سے کسی طرح مفر نہیں ملے گا۔

خود انگلستان میں جو سب سے زیادہ قدامت پسند ملک ہے اور جس کو آپ ہر معاملے میں اپنا نمونہ اور منتہائے نظر سمجھتے ہیں۔ پارلیمنٹ برابر ایسے ہی قوانین بنا رہی ہے جو دولت اور سیاسی قوت کی تقسیم انصاف اور مساوات کے اصولوں پر کریں۔ عام اس سے کہ حکومت قدامت پسندوں کی ہو یا مزدوروں کی وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ آپ کب تک اپنے ملک میں شیشے کے گھر بنا کر رہنا چاہتے ہیں؟ اور شیشہ بھی ایسا نازک کہ اگر کوئی ذراسی کنکری بھی اٹھا کر پھینکے تو سارا مکان چکنا چور ہو جائے اور رہے آپکے زمیندار اور ان کی تنظیم، سو اس کا خدا کے فضل سے کوئی اندیشہ ہی نہیں! کبھی آپ نے آج تک یہ دیکھا ہے کہ مردہ گھوڑے چابک کی مار سے دوڑے ہوں؟ آخر ان کے سامنے کونسا ایسا ولولہ پیدا کرنے والا نصب العین ہے، کونسا مطمح نظر ہے جو ان میں نئی روح پھونکے گا؟ روپے کی تھیلیوں کی حفاظت! ایک طرف تو غلط یا صحیح، عوام الناس کے سامنے ایک نئی زمین اور نیا آسمان بنانے کا منتہائے نظر پیش کیا جا رہا ہے جو انھیں ایثار اور قربانی کا جوش دلاتا ہے اور دوسری طرف آپ ان مردہ ڈھانچوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ اپنی چوری کے مال کی حفاظت کریں! بیرسٹر صاحب آپ تو ایک ایسی لڑائی لڑ رہے ہیں جس میں آپ کی شکست یقینی ہے ......"

بیرسٹر صاحب اس تقریر کے دوران میں بہت پیچ و تاب کھا رہے تھے اور انھوں نے کئی مرتبہ شیخ صاحب کی بات کاٹنا چاہی لیکن یہ چوکنے ہو چکے تھے اور اُن کو اس کا موقع نہیں ملا اب جو وہ بتقاضائے عمر سانس لینے کے لیے رکے تو بیرسٹر صاحب نے اس مہلت کو غنیمت جانا اور فوراً میدان جنگ میں کود پڑے۔ "جناب مجھے نہیں معلوم تھا کہ بایں سن و سال آپکے خیالات اسقدر مہمل اور خراب ہیں اور آپکے دماغ پر روس مسلط ہے آپ کو کچھ معلوم بھی ہے کہ آپکے اُس پسندیدہ ملک میں لوگوں کی حالت کیا ہے (میں یہ سن کر تعجب سے ان کا منہ دیکھنے لگا کیونکہ شیخ صاحب نے تو روس کا نام تک نہیں لیا تھا) وہاں نہ مذہب باقی رہا ہے، نہ اخلاق نہ آزادی، نہ حیا نہ غیرت، انسان مشین کے غلام بن گئے ہیں۔ کسی کو اپنی انفرادیت، اپنی مخصوص قابلیت کو تربیت کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ ان کا مقصد زندگی صرف اتنا ہی ہے کہ وہ کم سے کم قیمت پر زیادہ سے زیادہ چیزیں پیدا

کریں اور دنیا کے بازاروں میں ان کا ڈھیر لگا دیں اور اپنے فاسد خیالات کی اشاعت دنیا کے گوشے گوشے میں کریں ان کی حماقت کا یہ حال ہے کہ وہ انسانوں میں مساوات قائم کرنا چاہتے ہیں جو فطرت انسانی اور مصلحت الٰہی دونوں کے خلاف ہے۔ جب دنیا میں تمام لوگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، جب دو آدمی بھی ایسے دستیاب نہیں ہو سکتے جن کی دماغی قابلیتیں ایک سی ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ان میں زبردستی مساوات قائم کر دی جائے یا سب کی مالی حیثیت ایک سی ہو جائے کیا کسی سلیم العقل انسان کی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ ایک جج یا وزیر کو وہی مشاہرہ دیا جائے جو ایک خاکروب یا مالی کو ملتا ہے؟ اگر ایسا ہو تو لوگوں کو کام کرنے کی، محنت کرنے کی کیا تحریص رہے گی، انھیں کام سے دلچسپی کیوں ہوگی؟ یہ تو انسانی فطرت کے سراسر خلاف ہے۔ ممکن ہے آپ جیسے چند لوگ ایسے نکل آئیں جن میں روحانیت اس درجہ بھری ہوئی ہو کہ وہ اس مضحکہ خیز صورت حال پر قانع ہو جائیں لیکن عام لوگ جن سے آئے دن ہمیں سابقہ پڑتا رہتا ہے کبھی اس پر راضی نہیں ہو سکتے۔ ان باتوں سے آپ یہ مطلب نہ نکال لیجئے گا کہ میں غریبوں کے ساتھ ہمدردی نہیں رکھتا یا ان کی مدد نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے ان کے ساتھ بہت ہمدردی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مزدوروں کو اپنی محنت کا مناسب معاوضہ ملے اور فقیروں، محتاجوں بے وسیلہ لوگوں کے ساتھ مناسب سلوک کیا جائے۔ ہمارے مذہب نے خیرات کرنے کا حکم دیا ہے اس کو پورا کرنا چاہیئے، زمینداروں کو کاشتکاروں اور مزدوروں کے ساتھ مہربانی اور رعایت کا برتاؤ کرنا چاہیئے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم خدا کے بنائے ہوئے امتیازات کو پس پشت ڈال دیں۔ اور عقل و مصلحت کو فراموش کر کے ایک ناممکن العمل آئیڈیل کے پیچھے سرگرداں رہیں ..... اچھا معاف کیجئے گا۔ مجھے اس وقت ایک جلسہ میں جانا ہے۔ خدا حافظ۔ پھر ملاقات ہوگی بیرسٹر صاحب مقدمہ جیت کر رخصت ہوئے اور مجھے شیخ صاحب کے طوفان تکلم میں گرفتار چھوڑ گئے۔ کچھ تو خیالات کا ہجوم کچھ اس زک کی خفگی کہ انھیں بیرسٹر صاحب کو قائل کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا باہر نکلتے ہی مجھ پر برس پڑے۔

"کیوں صاحب آپ کو انھیں حضرت کی ذات اور صفات پر ناز تھا؟ انھیں کو آپ انسان کامل سمجھتے ہیں؟ آخر آپ کس چیز سے اس قدر مرعوب اور متاثر ہیں؟ شہرت سے؟ وہ تو ہر قسم کے لوگوں کے حصے میں آتی ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے اکثر ایسی تدبیریں اور وسیلے اختیار کرنے پڑتے ہیں جن کی طرف واقعی ایک شریف آدمی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا روادار نہ ہوگا۔ دولت سے؟ میں دولت کو فی نفسہ برا نہیں سمجھتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ دولت کی طمع میں لوگ جس قدر ذلیل حرکات اور ظلم کرتے ہیں اتنا اور کسی وجہ سے نہیں کرتے اور میں نے ایک بہت بڑے بزرگ کا یہ قول بھی سنا ہے کہ کوئی امیر آدمی اس وقت تک آسمانی حکومت میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ گذر جائے۔ دماغی قابلیت سے؟ بے شک عقل اور ذہانت خدا کا بہت بڑا عطیہ ہے لیکن جو شخص اس کو محض اپنے مفاد کے لئے استعمال کرے اور اس کے ذریعے بندگان خدا کی خدمت نہ کرے وہ مجرم ہے اور کفرانِ نعمت کا مرتکب۔ عزیز من تم نہیں جانتے کہ بعض اوقات لوگ باوجود ہر قسم کی قابلیت اور مواقع میسر ہونے کے دنیا میں کوئی مفید اور دیرپا کام نہیں کر سکتے اور باوجود بہت بڑے آدمی ہونے کے درحقیقت بہت چھوٹے آدمی ہوتے ہیں۔ جانتے ہو اس کا سبب کیا ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ ان لوگوں کے جن میں تمھارے ممدوح کا شمار بھی ہے، دل اور دماغ دونوں بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور آدمی میں یہ سب سے بڑی المناک کمی ہے۔ انسانیت وسعت چاہتی ہے۔ دل کی وسعت، دماغ کی وسعت، نظر کی وسعت، ایسا دل جس میں علاوہ اپنے دکھ درد کے دوسروں کا دکھ درد بھی سما سکے، ایسا دماغ جس میں اپنی مخصوص دلچسپیوں اور مشاغل کے علاوہ دوسروں کے نقطۂ نظر اور اختلافات کو سمجھنے کی صلاحیت ہو، جو دوسروں کی رائے اور خیالات کا خندہ پیشانی سے استقبال کرے۔ ایسی نظر جس پر گھوڑے کی طرح اندھیریاں نہ لگی ہوں، جو دائیں بائیں آگے پیچھے ہر طرف دیکھ سکے۔ جس کو نہ صرف اپنے گرد و پیش کی چیزیں اور اپنی فوری ضروریات اصلی معلوم ہوں بلکہ مستقبل کے امکانات بھی اس کے لئے ایسی ہی اہمیت رکھتے ہوں جو ہر نصب العین کو محض اس وجہ سے مسترد نہ کر دے کہ وہ اس کو نظر نہیں آتا۔ ہر قسم کی تنگی اور تنگ نظری تہذیب اور انسانیت

کے منافی ہے لیکن ان لوگوں کے نہ دل میں وسعت ہے نہ دماغ میں نہ نظر میں۔ ان میں نہ رواداری ہے نہ دوسروں کا نقطۂ نظر سمجھنے کی صلاحیت۔ جو خیال ایک دفعہ ان کے ذہن میں آجاتا ہے اسی کو صحیح سمجھتے ہیں خواہ دوسرے لوگ کچھ بھی کہیں۔ ان کے دماغ میں کبھی یہ تکلیف دہ مگر حیوان کو انسان بنانے والا خیال نہیں گذرتا کہ ممکن ہے وہ کسی معاملہ میں غلطی پر ہوں۔ تم نے فطرت انسانی کے متعلق اس بڑے آدمی کے خیالات کو سنا اور لطف یہ ہے کہ اگر میں کئی روز تک مسلسل اس شخص سے اس مسئلہ پر گفتگو کرتا جب بھی اس کے خیالات میں کوئی فرق نہ آتا بلکہ وہ مجھے مجنوں سمجھ کر چھوڑ دیتا اور اپنے خیالات میں اور پختہ ہو جاتا۔ ہر معاملہ میں اس کے خیالات بالکل سطحی ہیں۔ افلاس کے مسئلہ پر ارشاد ہوا تھا کہ میں اس بات کے لئے آمادہ ہوں کہ ہم خیرات کے طور پر اپنے دسترخوان کے ٹکڑے غریبوں کے سامنے جھاڑ دیں لیکن وہ اس خیال کو جنون کی علامت سمجھتا ہے کہ افلاس کو دور کرنے اور دولت کی بہتر تقسیم کرنے کے لئے مناسب ذرائع اختیار کئے جائیں۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ غلاظت کو جہاں تک ہو سکے چھپانے کی کوشش کرو، دور کرنے کی فکر نہ کرو کپڑا پھٹے تو اس کو بدلو نہیں پیوند پر پیوند لگاتے جاؤ۔ کیونکہ اس "مفکر اعظم" کے خیال میں ہر قسم کی بنیادی اور دور رس تبدیلی انقلاب ہے اور انقلاب مصلحت الٰہی کی مخالفت! اس کے نزدیک قانون اور انصاف بالکل ایک ہی چیز ہیں اور اگر کوئی شخص انصاف کی حمایت میں قانون کو بدلنا چاہے یا اس کی مخالفت کرے تو اخلاقی اور قانونی مجرم ہے۔ وہ ان محتاط لوگوں کے طبقہ سے تعلق رکھتا ہے جس نے دو ہزار برس ہوئے حضرت عیسیٰ کو اس لئے پھانسی دیدی تھی کہ ان کی تعلیم مروجہ خیالات اور عقائد کے خلاف تھی، جو چودہ سو برس ہوئے پیغمبر اسلام کی مخالفت پر اس لئے کمربستہ تھے کہ وہ عدل اور مساوات اور اخوت کا انقلاب آفریں اور خطرناک پیغام دنیا کو پہنچا رہے تھے۔ بھائی، ان حیوانوں سے جو انسان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں بالکل عاجز آچکا ہوں۔ مجھے کسی انسان کے پاس لے چلو"

اب تو میں بہت چکرایا کیونکہ میرے ترکش میں جو سب سے زیادہ کارگر تیر تھے ان کو میں یکے بعد دیگرے چھوڑ چکا تھا لیکن اس مرد شریف نے نہایت آسانی سے ہر ایک کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا تھا۔ میں اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ اس مصیبت سے کس طرح جلد نجات حاصل کروں کہ امداد

غیبی آ پڑے آئی یعنی دفعتاً میری آنکھ کھل گئی اور میں نے خود کو بستر پر پڑا پایا۔ اس وقت مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ ہمیں دراصل اس مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ تہذیب کے اصلی اور حقیقی عناصر کیا ہیں اور ہم کن صفات رکھنے والے آدمی کو مہذب کہہ سکتے ہیں!

(باقی)

غزل

اس طرح جس کی سزا دی جائے — وہ خطا بھی تو بتا دی جائے

ہاں، وفا میری اسی قابل تھی — سر بسر دل سے بھلا دی جائے

میرے ہر صبر و سکوں پر ہنس کر — ایک بجلی سی گرا دی جائے

چارہ سازی کے عوض سینے میں — اور بھی آگ لگا دی جائے

ہو عنایت کی نظر غیروں پر — خانہ زادوں کو سزا دی جائے

اگلے وقتوں کی وہ اگلی باتیں — بات بگڑے تو بنا دی جائے

اب تو یہ ہے کہ خوشی کے بدلے — خبر مرگ سنا دی جائے

کام آئے گا کسی کے کوئی — یہ توقع ہی اٹھا دی جائے۔

غم الفت ہی وہ شے ہے حسرتؔ
زندگی جس میں گھلا دی جائے

کلام بیدل عظیم آبادی[1]

میں نے بیدل کا نام سب سے پہلے زمانۂ طالب علمی میں حضرت[2] استاد حکیم طغرائی مرحوم کی زبانِ فیض ترجمان سے سنا اور اس کی اہمیت کا اندازہ انہیں کی صحبت میں لگایا آپ نے شوکت میرٹھی مرحوم کے پیش کردہ اشعار بیدل کا حل اپنے رسالہ مسیحا میں شائع کر کے اپنی بےنظیر ذہانت کا ثبوت دیا تھا اور اس امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی، یہ زمانہ میرے ان کے تعلقات سے پہلے کا ہے جب آپ کی عنایت اور توجہ سے مجھ میں کچھ ذوق شعر پیدا ہوا تو میں نے مسیحا کے پرانے پرچے مہیا کر کے اس حل کا مطالعہ کیا، اور میرا بی شوق کا سامان پایا۔ آپ کی خدمت میں بیدل کو سبقاً پڑھنے کی درخواست کی، آپ نے فرمایا پہلے درسی کی تکمیل کر لو پھر بیدل کو ہاتھ لگانا، میں اس چنگاری کو سینے میں لئے رہا، یہاں تک کہ نصاب فارسی کی آخری کتابیں دیکھ لیں، پھر آپ سے ایفائے عہد کے متعلق عرض کیا، مجھے آپ کی صداقت اور نیک دلی کبھی نہ بھولے گی جب آپ نے فرمایا، اس وقت تک تم شاگرد اور ہم استاد تھے لیکن آج سے ہم دونوں برابر ہیں۔ دونوں شاگرد ہیں اور مرزا بیدل استاد آؤ مل کر ان کے کلام پر غور کریں، چنانچہ حسب ارشاد پہلے غزلیات کا مطالعہ شروع کیا، آپ بڑی کاوش فرماتے اور اکثر اشعار کے متعدد مطالب بیان کر کے ایک کو ترجیح دیتے، یہ سفر بہ قدر شوق طے نہ ہو سکا تھا

۱؎ یہ مضمون ۳۱ء کے وسط میں بعض احباب کے ارشاد و اصرار سے لکھنا شروع کیا تھا، صرف غزل بیدل سے متعلق لکھ سکا، دیگر اصناف کلام پر لکھنے کی نوبت نہیں آئی، ممکن ہے کہ کسی آئندہ فرصت میں یہ کمی پوری کر سکوں۔ انشاءاللہ

۲؎۔ آپ کا کلیات (نظم فارسی و اردو) مع سوانح و مقدمہ (از پروفیسر تاثیر ایم اے) پروفیسر تبسم ایم اے کی نگرانی میں کتب خانہ طغرائی امرتسر کی طرف سے مارچ ۱۹۳۲ء میں شائع ہو جائے گا انشاءاللہ۔

کہ تقدیر نے اس صحبت کو منتشر کر دیا۔ حضرت مرحوم کو ترکِ وطن پر مجبور ہونا پڑا۔ لیکن میں بیدل کو فراموش نہ کر سکا۔ بعض اساتذہ امرتسر کی خدمت میں بغرضِ استفادہ حاضر ہوا۔ انھوں نے اس کو ذخیرہ مہملات کہہ کر ٹال دیا۔ آخر کچھ عرصہ میں نے بطورِ خود اس کا بے قاعدہ مطالعہ کیا۔ یہ عجیب دن تھے شب و روز اس میں گم رہتا تھا۔ کبھی کوئی شعر کہتا تھا تو اسی رنگ میں۔ اگر اس زمانے کی کوئی غزل ہاتھ آ گئی تو ممکن ہے کہ کبھی ناظرین کی نظر کر سکوں۔ آخر اپنے آپ کو اس وادی کا تنہا مسافر دیکھ کر اس سفرِ لذیذ کو ختم کیا اور اس آتشکدۂ عشق کو قلب کی گہرائیوں میں ہمیشہ کے لئے محوِ خواب کر دیا۔ میرے نزدیک بیدل کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ طالبِ علم اپنے فکر و اعمال کو بیدل میں گم کر دے۔ اور یہ نہیں ہو سکتا جب تک کوئی ممتاز علمی ادارہ یا کوئی محبِ علم حکومت اس کام کو اپنے ذمے نہ لے۔ میں نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ سطحی کوشش اور نہایت قلیل فرصت کا نتیجہ ہے اس کا مقصد محض کلامِ بیدل سے تعارف ہے۔ میں نے نہایت واضح اشعار چننے کی کوشش کی ہے۔ (عرشی)

مرزا غالب نے کہا تھا۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ — شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شاعر کے کلام کا منظرِ عام پر آجانا اس کے افشائے ما فی الضمیر کا مرادف ہے۔ اسی طرح شیخ کا ارشاد ہے۔

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد — عیب و ہنرش نہفتہ باشد

یہ دونوں شعر ایک ہی مقصد کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، اور ایک قاعدہ کلیہ کی طرح تسلیم کئے جاتے ہیں۔ لیکن مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی اس میں استثنا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا کلام نظم و نثر کافی مقدار میں تقریباً دو سو سال سے ہمارے پاس موجود ہے لیکن اب تک نہ تو وہ رسوا ہوئے اور نہ ان کے عیب و ہنر عالمِ "نہفتن" سے چہرہ کشا ہوئے۔ اُن کا دیوان، نکات، مثنوی و عناصر وغیرہ بالکل ایک رازِ سربستہ ہیں۔ ایک سخنِ ناشنیدہ و حرفِ ناگفتہ، کوئی تمہید نہ مقدمہ، کوئی قابلِ ذکر حل نہ ترجمہ

اگر کسی نے کبھی سمجھنے کی کوشش بھی کی تو جلد ہی تھک کر وہاں پہنچ گیا، جہاں خواجہ حافظ نے کہا تھا، کہ کس نہ کشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

حق تو یہ ہے کہ غالب کا مصرع ذیل بھی صحیح طور پر بیدل ہی پر چسپاں ہو سکتا ہے کہ

مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا۔

خصوصیات کلام بیدل | بیدل کے کلام میں بعض ایسی خصوصیات ہیں جو اس کو تمام کائنات شعر سے الگ کر دیتی ہیں، وہ اپنی طرز کا موجد تھا اور خاتم بھی، اس میں نہ صرف معانی کی ندرت علو و عمق ہے، بلکہ اس کو مخصوص مطالب بیان کرنے کے لئے زبان بھی نئی ایجاد کرنی پڑی،

ہر شاعر کے کلام میں ابتدار وسط، اور انتہائے عمر کا اثر اور فرق ضرور نمایاں معلوم ہوتا ہے، غالب کے ابتدائی مغلق کلام کو دیکھئے، پھر ان کی پختہ مشقی اور سلاست بیان پر نظر کیجئے، زمین و آسمان کا بعد نظر آئے گا، ایسا ہی دوسرے شعراء کا حال ہے، لیکن بیدل کا کلیات سامنے ہے جس میں رباعی، غزل، قطعہ، نکتہ، رقعہ، نثر وغیرہ سب موجود ہے، سب میں ایک ہی انداز بیان ایک ہی روح حقیقت واضح ہے، بیدل کی روح و قلب پر تمام عمر ایک ناقابل تغیر کیفیت کا استیلا رہا ہے جسے ہم "فلسفۂ تصوف" کہتے ہیں" نکات" و "عناصر" کا تو موضوع ہی تصوف ہے عجب یہ ہے کہ غزل لکھنے بیٹھتے ہیں، تو وہ بھی ایک خاص تعلیم تصوف ہو کر رہ جاتی ہے، اس سے زیادہ حیرت یہ ہے، کہ کسی دوست کو رقعہ لکھتے ہیں تو وہ بھی انھیں سرمستیوں سے لبریز ہوتا ہے۔

مرزا نے تصوف کو قدیم روش سے الگ ہو کر نئے اسلوب میں پیش کیا ہے۔ اور اپنی طبعی مشکل پسندی و دور رسی کے سبب عمان فطرت کی ان گہرائیوں سے لآلی آبدار نکالے جہاں عام اساتذہ کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے آپ کو اس مظروف نادر کے لئے ظرف جدید کی ضرورت پڑی، مروجہ زبان ان معانی نازک کو چھو نہیں سکتی تھی اس لئے نئی نئی ترکیبیں ایجاد کی گئیں۔

مرزا کے غواص طبع نے مروجہ بحور کی وسعت کو اپنی شناوری کے لئے ناکافی پا کر ایجاد

وابداع سے کام لیا، اور وہ ترنم اور حالی کیفیات بحربیں استعمال کیں جو اس سے پیشتر فارسی میں نظر نہیں آتی تھیں۔ آپ کے بعد بعض لوگوں نے فارسی میں کم اور اردو میں زیادہ آپ کی تقلید کی۔

ردیف وقافیہ میں بھی آپ کی فطری جدت نوازی و مشکل پسندی بروئے کار آجاتی ہے، اور قدماء سے الگ اپنے لئے جادہ و منزل تلاش کر لیتے ہیں، کٹھن سے کٹھن زمینوں میں اپنے خیالات کی تخم ریزی نہایت آسانی سے کر جاتے ہیں۔ یہ کہیں معلوم نہیں ہوتا کہ "بیت برائے قافیہ" ہے، بلکہ قافیہ وردیف مضمونِ بیت کے خادم ومعاون نظر آتے ہیں۔

مرزا کا اثر عالم ادب کی پہنائیوں پر مسلط ہو گیا، بڑے بڑے اساتذہ نے آپ کی پیروی کرنی چاہی، اور بعض نے تو اپنی نارسائی کا اقرار بھی کر لیا۔

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا　　　　اسد اللہ خاں قیامت ہے

اس شعر سے بالخصوص اور غالب کے عام کلام سے بالعموم ثابت ہوتا ہے کہ وہ کلام بیدل سے کافی طور پر مسحور و متاثر ہو چکے تھے، اور میرے نزدیک اُن کو بیدل کا ایک حد تک مبلغ اعظم کہا جا سکتا ہے، کیونکہ انھیں کی وساطت سے بیدل کا طرز اردو شعراء نے قبول کیا۔ آج جو شخص غالب کی پیروی پر نازاں نظر آتا ہے۔ وہ بالواسطہ بیدل کا پیرو ہے، کیونکہ غالب کا منبع بیدل ہے۔ سراج الدین علی خاں آرزو، امام بخش صہبائی وغیرہ جانے بھی اس دشوار راہ میں چلنے کی سعی کی لیکن منزل پر پہنچنا سب کی قسمت میں نہیں ہوتا

میرے سامنے اس وقت بیدل کے دو مطبوعہ نسخوں کے سوا کوئی معاون و مدد چیز نہیں ایک نسخہ نولکشوری مطبوعہ ۱۲۸۴ھ ہے۔ دوسرا مطبع صفدری بمبئی کا مطبوعہ ۱۳۰۲ھ دونوں کافی اغلاط کے حامل ہیں، انھیں پر قناعت کرنے پر مجبور ہوں۔

اپنے انوکھے انداز میں حمد کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

اے کردہ نگاہ پوئے سراغ تو نشانہا　　　　وا ماندۂ اندیشہ رہ تو مکانہا
در کنہ تو آگاہی و غفلت ہمہ معذور　　　　دریا زمیاں غافل و ساحل زکرانہا

بس دیدہ کہ شد خاک و نشد محرم اسرار — آئینۂ ما نیز غباریست ازانہا

سالک کا دنیائے گذاشتنی سے استغنا اور عالم آخرت سے وابستگی قلب۔

دریں وادی کہ می باید گذشت از ہر چہ پیش آید — خوش آں رہرو کہ در داماں مے پیچید فردا را

ہستی کم فرصت محل اقامت نہیں محض تہمت زدہ اقامت ہے، اس سے اتنا ہی تعلق رکھنا چاہیے، جتنا عکس کو آئینہ سے،

اقامت تہمتی در محفل کم فرصت ہستی — چو عکس از خانۂ آئینہ بیروں گرم کن جا را

عالم تجرد میں غیر سے ادنیٰ تعلق کی تہمت بھی ایک دھبہ ہے، سالک کا پیراہن بھی نگاہ کی طرح تار غیر کا شرمندۂ احساں نہیں

در تجرد تہمت دیگر بہ بردے میزنم — غیر من تارے ندارد چوں نگہ پیراہنم

وحدت طالب و مطلوب کا بدیع اسلوب،

با کہ گویم گر بگویم کیست تا باور کند — آں پری روئے کہ من دیوانۂ اویم منم

اس نشیمن کی فکر نے جو نہ کبھی تھا اور نہ اس وقت ہے ہم کو یکسر اضطراب و التہاب بنا رکھا ہے۔ ردیف کی جدت بھی قابل غور ہے۔

فغاں کہ بست بہ بالم ہزار شعلہ طپیدن — نشیمنے کہ نبود آشیانہ کہ ندارم

مایوسی سے کوئی شعلۂ آہ نہیں اٹھ سکتا، دانۂ معدوم سے ریشہ کیا نکلے گا،

ز یاس بیدل ما گل نکرد شعلۂ آہے — نفس چہ ریشہ دواند ز دانہ کہ ندارم

آنکھ بند کرنے سے نگاہ فانوس خیال کی شمع بن کر اندرونی دنیا کا معائنہ شروع کر دیتی ہے، عاشق کا شوق دیدار مرنے کے بعد بھی زائل نہیں ہو سکتا، تشبیہ یکسر اجتہاد ہے،

نگہ شد شمع فانوس خیال از چشم پوشیدن — فنا مشکل کہ از عاشق برد شوق تماشا را

وجود اعتباری کے نشان اسمائے محض کے سوا کچھ حقیقت نہیں رکھتے اس جہان مرئی کو نقش بال عنقا سمجھو،

نشانہا نیست غیر از نام آنہم ناتواں بلبل   جہانِ دیدۂ بشمار نقش بال عنقارا

عالم کائنات ایک پیکر واحد کا حکم رکھتا ہے۔ کاروانِ امواج کی روانی پر نظر کرو، ہر موج خود ہی راہ ہے، ندرت تشبیہ ملاحظہ ہو،

دریں دریا بسے فرش است اجزائے وجود من   ہر جا می روم چوں موج بر خودمی نہم پارا

اسرار ہستی کا منتہائے ادراک یہ ہے کہ اس عظیم و وسیع کل کا کوئی پرزہ غلط کار نہیں، کل شئی خلقہ احسن، ہر حرکت، ہر قوت اور ہر جزو اپنے اپنے مقام پر لاریب مناسب اور احسن ہے

بفہم نسخۂ ہستی چرا نہ ناز کنم   کہ لفظ بشک در یب انتخاب میگردد

اگر کہیں کوئی نقص نظر آتا ہے، وہ یقیناً انسان کی نارسائی فہم کا ثبوت ہے،

نبود نقطۂ از علم ایں کتاب غلط   کہ فہم ناقص ما کردہ انتخاب غلط

آرام کا مطلب یہ نہیں کہ ہم کوئی کام ختم کر چکے ہیں، بلکہ یہ ناتمامی و نارسائی کا دوسرا نام ہے، قوت باصرہ کا تھک جانا ہی نیند بن جاتا ہے۔

کند گردن آرام نارسائیہاست   شکستہ پائی نظارہ خواب میگردد

عشرت غرور کی حد تک پہنچ جائے تو سمجھ لو کہ شکست و فنا کا وقت آگیا۔ قطرے کا بڑھ کر حباب بن جانا اس کی زندگی کا آخری سانس ہے

غرور عشرت ما با شکست نزدیک است   دمیکہ قطرہ ببالد حباب می گردد

گردن فرازی کا لازمی نتیجہ پائمالی ہے، نیستاں کی سربلندیوں کو دیکھو اور بوریئے کی صورت میں اس سے درس عبرت حاصل کرو،

مکن گردن فرازی تا نسازد زیر پا پستت   کہ نے آخر بجرم سرکشی ہا بوریا گردد

تبدیل بخت کے لئے فانی آستانوں پر جبیں سائی لغو محض ہے، سایہ ہر دروازے پر سجدہ ریزی کرتا ہے، لیکن اس کی تاریکی کے نصیب میں روشنی نہیں۔

چو سایہ چند بہر خاک جبہہ سودنہا   کہ زنگ بخت نگردد کم از زدودنہا

عجزِ انسانی کا تعلق بارگاہ غنائے مطلق سے کتنے پیارے انداز میں بیان کیا ہے۔

عجز را گر در جناب سرفراز بیاری است | اینقدر ہا بس کہ در کوشش رسد فریاد ما

اسی غزل کا مطلع ہے۔

داغم از سودائے خام غفلت و وہم رسا | او بہر دو من کف خاک او کجا و من کجا

کہیں بھولے سے عشق و محبت کا بیان آجاتا ہے تو اس میں قیامت برپا کر دیتے ہیں۔

ہر کرا الفت شہید چشم مخمورت کند | نشہ انگیزد ز خاکش گرد تا روز جزا

اسی غزل کا اور شعر سنئے۔ تمام دنیا میں ایک دل کے تزکیہ کے سامان کا حصول بھی محال ہے۔

نیست در بنیاد آتش خانۂ نیرنگ دہر | آں قدر خاکسترے کائینہ گیرد جلا

زندگی بقدرِ" دو جہاں آرزو" کے وہم کا بار اٹھائے پھرتی ہے، ہر سانس میں سو قافلوں کی بانگ درا کا شور ہے۔

زندگی محمل کش وہم دو عالم آرزوست | بے تپید ہر نفس صد کارواں بانگ درا

ہر چیز سو طرح کی جستجو کے لئے پریشان ہے، نقش پا بھی زبان حال سے کہہ رہا ہے، کہ اس کا رہرو سرگردانی تلاش میں گھوم رہا ہے'

ہر چہ می بینیم طپش آمادۂ صد جستجو است | زیں بیاباں نقش پا ہم نیست بے آواز پا

اسی بحر و قافیہ میں ایک غزل اور لکھی ہے، جس کے مضمون میں تسلسل اور رنگ میں تغزل کا لحاظ کیا گیا ہے، جذبات نہایت پاکیزہ، خیالات نہایت بلند، الفاظ یکسر انتخاب اور معنی سراپا نزاکت ہیں، چند شعر سنئے،

اے خیالِ قامت آہ ضعیفاں را عصا | بر رخت نظارہ ہا را لغزش از جوش صفا

نشۂ صد خم شراب از چشم مستت غمزۂ | خونبہائے صد چمن از جلوہ ہایت یک ادا

قامت، آہ اور عصا کی صورت، جوشِ صفائے رخسار سے لغزش نظر کا مفہوم، چشم مست کے غمزے میں صد خم شراب کا نشہ سو چمن کے خون کی قیمت ایک ادائے جلوہ، یہ الہامات بیدل کے سوا کس کے

داغ وقلب پر نازل ہو سکتے ہیں۔

ہمچو آئینہ ہزاراں چشم حیراں روبرو ‏ ‏ ‏ ہمچو کاکل یک جہاں جمع پریشاں درقفا
تیغ مژگانت آب نازدامن میکشد ‏ ‏ ‏ چشم مخمورت بخون تاک می بندد حنا
بستہ بربال اسیرت نامۂ پرواز ناز ‏ ‏ ‏ خفتہ درخون شہیدت جوش گلزار بقا

مصرع آخر پر بالخصوص شہید ہوجانیکو جی چاہتا ہے۔

ازصفائے عارضت جاں میچکد گاہ عرق ‏ ‏ ‏ وزشکست طرہ ات دل میدمد جائے صدا

دونوں مصرعے عالم بالا سے نئی اتری ہوئی دو روحیں معلوم ہوتی ہیں۔

ازنگاہت نشہ ہا بالیدہ ہر مژگاں زدن ‏ ‏ ‏ وزخرامت فتنہ ہا جوشیدہ از ہر نقش پا
ہر کجا ذوق تماشایت برانداز د نقاب ‏ ‏ ‏ کیست گردیک قطرہ برہم زدن صبر آزما
گر جالت عام سازد رخصت نظارہ را ‏ ‏ ‏ مردمک از دیدہ ہا پیش از نگہ گیرد ہوا

دوسرے مصرع میں غوطہ لگائیے اور ایک دوسری دنیا کی سیر کیجئے۔ یہ ہیں وہ اشعار جن کے معانی بیان کرنا ان کی روحانیت کو مجروح کرنا ہے۔

ساز محشر گشت آفاق از نگاہ حسرتم ‏ ‏ ‏ دیپے مژگاں چہ فریاد است محزون ترا

ساز۔ نے۔ فریاد۔ نگاہ۔ مژگاں حسرت ومحزوں کی بے تکلفانہ مناسبت اور مضمون کی درد انگیزی اور حسرت خیزی نے شعر کو تیر و نشتر بنا دیا ہے۔

ہر چہ می بینیم خیالے از سراغت میدہد ‏ ‏ ‏ ہر دو عالم یک سر زانوست مجنون ترا

بات تو وہی ہے جو کسی بزرگ نے فرمائی تھی۔

وفی کل شئی لہٗ شاہدٌ ‏ ‏ ‏ یدل علی انہ واحدٌ

لیکن اسلوب کتنا بدیع ہے۔

کیست از ماہ تو چوں خاشاک آوارہ مرا ‏ ‏ ‏ شعلہ جاروبی کند نا پاک بردارد مرا
ہستیم عہدے بہ نقش سجدۂ او بستہ است ‏ ‏ ‏ خاک خواہم شد اگر از خاک بردارد مرا

طالب مطلوب میں طالب کے پندار وجود کے سوا کوئی چیز حائل نہیں، ؎ تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز پس کون ہے، جو مجھ کو تیری راہ سے خاشاک کی طرح اٹھا دے، خاشاک سے ہمیشہ کے لئے نجات جاروب شعلہ کے سوا نہیں ہو سکتی، یہاں "جاروب شعلہ" اور شعر ثانی میں "خاک خواہم شد" کس بلا کا تخیل ہے. کوئی نطق و بیان ہے جو اس کی تعریف کر سکے؟

اختراع ترکیب سے یوں تو تمام شعر معمور ہیں، چند مثالیں خصوصیت سے سن لیجئے:

دریں مزرع چہ لازم خرمن آرائے ہوس باشی ۔۔۔ دلے با یدبدست آری ہمیں تخم است و حاصلہا

مزرع عالم میں ہوس کی خرمن آرائی فضول ہے. صاحبدل بننے کی سعی کرو، یہی بیج ہے اور یہی حاصل،

عاشقان بسمل آہنگت مہیا کردہ اند ۔۔۔ جبہۂ شوقے کہ داند آستان شمشیر را

"عاشقان بسمل آہنگ" کی جبیں شوق کا شمشیر کو آستاں سمجھ لینا کتنی موثر بانگ رجز اور تحریص جہاد ہے

ہر کجا شمع تماشائے تو روشن می شود ۔۔۔ از زمیں تا آسماں آئینہ خرمن می شود

شمع جمال کی روشنی سے زمین سے آسمان تک آئینے ہی آئینے بن جاتے ہیں. جن کو خرمن آئینہ سے تعبیر کیا ہے

عاجزم چندانکہ از عرض ضعیفی ہائے من ۔۔۔ نالہ گر بالد نگاہ ناتوانی می شود

عجز اظہار ضعیفی دیکھئے کہ فریاد اگر بہت ترقی کرے تو ایک نگاہ ناتواں بن جاتی ہے.

اوج عرفاں را کہ برتر از کمند گفتگو است ۔۔۔ ہر کہ بر می آید از خود نردبانے می شود

جو شخص قید ہستی سے نجات پائے اوج عرفاں تک پہنچنے کے لئے خود ہی اپنی سیڑھی بن جاتا ہے، کیونکہ اس مقام تک کمند گفتگو (محض باتیں بنانا) کی رسائی نہیں، ان اشعار میں خرمن آرائی ہوس، بسمل آہنگ، خرمن آئینہ، بالیدن نالہ، اور کمند گفتگو، مرزا کی خلاقی طبع کا ثبوت ہیں اور ایسی ہزاروں مثالیں ان کے کلام میں موجود ہیں.

غرابت ردیف دیکھئے.

سایہ انداز داگر بخت سیاہ من در آب ۔۔۔ فلس ماہی دیدۂ آہو کند خرمن در آب

پانی میں بخت سیاہ کے سایہ سے فلس ماہی خرمن چشم آہو بن جاتے ہیں، در آب کتنا بے تکلف سما گیا

من کہ نتوانم فرو بردن سر سوزن در آب — کے توانم در دل سنگین خوباں جا کنم

مصرع ثانی میں "عجز فرو بردن" اور "در آب" کی روانی دیکھئے،
غالباً استاد ذوق مرحوم کی مشہور غزل "شیر سیدھا تیرتا ہے وقت رفتن آب میں" اسی کی تتبع میں لکھی گئی ہے۔

اے جذبہ ہمتے کہ قدم بیشتر زنیم — یعنی رساندہ ایم پے خویش تا نفت آب
از دو لباشی ادب محرمی مپرس — با غیر جلوہ ساز دو با آشنا نفت آب

تازند فال گہر بے تاب آہنگ است آب — نعل در آتش بجست و جوئے ایں رنگ است آب
محمل ما عاجزاں بر دوش لغزش بستہ اند — صد قدم از موج اگر پیدا کند لنگ است آب
آبرو نتواں بہ پیش ناکساں چوں شمع بخت — اے طمع شرمے کہ اینجا شعلہ در چنگ است آب

اتنی مشکل ردیف، ایسے عالی خیالات، تمام غزل حکمت و دانش سے معمور ہے، ردیف و قافیہ مضمون کے خادم و محکوم نظر آتے ہیں۔

جوہر تجرید قطع الفت خویش است و بس — بر سر خود میتواں کرد امتحاں شمشیر را
زائل از زینت نگردد جوہر مردانگی — قبضۂ زر راز برش مانع نداں شمشیر را
بر شجاعت پیشہ ننگ است از شجاعت دم زدن — حرف جوہر بر نیاید بر زباں شمشیر را
اے فغاں بگذر ز چرخ و لامکاں تاثیر باش — چند در زیر سپر کردن نہاں شمشیر را

کون کہہ سکتا ہے کہ یہاں شمشیر کو باندھنے کے لئے ذرا بھی تکلف کرنا پڑا ہے، ایک میدان جنگ ہے، جہاں فطری جذبہ مردانگی کے زیر اثر شمشیر چل رہی ہے۔

بے مغزی و داری بمن سوختہ جاں بحث — اے پنبہ مکن ہرزہ بآتش نفساں بحث
جمعیت گوہر نکشد زحمت امواج — بیدل بخموشاں نکند اہل زباں بحث

سکون و قرار گوہر کو خموشی سے اور موج کو زبان سے کتنی بلیغ مناسبت ہے شاعر نے بیحد بلند نتیجہ پیدا کیا ہے

نداشت دیدهٔ من بے تو تاب خندهٔ صبح — زاشک دادہ چو شبنم جواب خندهٔ صبح

زندگی محروم تکرار است و بس — چوں شرر ایں جلوہ یک بار است و بس

ہر کجا کردم بیاد سجده ات ساز رکوع — چوں سر نو بر فلک رفتم بہ پرواز رکوع
پیچ و تاب موجہا یکسر گہر گردیدن است — سجدہ انجام است ہر جا دیدم آغاز رکوع
گر منافق از تواضع صاحب دیں می شود — تیغ ہم خواہد نمازی شد بہ پرواز رکوع

ما شہیداں را وضوئے دادہ انداز آب تیغ — سجدہ آموز سر ما نیست جز محراب تیغ
خون ما در پردہ بلبلے ریزد اما چہ سود — شوخی ایں نغمہ موقوف است بر مضراب تیغ

غالب کا شعر اسی بیت بیدل سے مستفاد ہے۔

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل — جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

گرم نوید کیست سروش شکست رنگ — کز خویش رفتہ ایم بدوش شکست رنگ
مانند دود شمع دریں عبرت انجمن — بالیدہ ایم لیک ز جوش شکست رنگ

کہاں تک لکھتا جاؤں، عجیب و غریب مدلیوں کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ اب ذرا جدت وزن و بحر کا نمونہ بھی ملاحظہ فرمائیے،

گہر محیط تقدسی مکن آبروئے حیا تنک — چو حباب حیف اگر شوی ز غرور سر ہوا تنک

اگر بہ گلشن ز ناز گردد قد بلند تو جلوہ فرما — ز پیکر سرو موج خجلت شود نمایاں چو چین دیبا

عمریست چوں گل می روم زیں باغ حرماں در بغل ۔۔۔ از رنگ و امن برکروز بو گریباں در بغل

جیسا کہ پیشتر عرض کر چکا ہوں، یہ چند صفحات بالکل سطحی نظر اور کم التفاتی سے اوقات پریشاں میں سپرد قلم کئے گئے ہیں، ان سے محض غزل بیدل سے ابتدائی رسم تعارف ادا ہو سکی ہوگی میں محسوس کرتا ہوں کہ ابھی اس جمال کی ننانوے فیصدی تجلیات زیر نقاب ہیں جس کے لئے میں نے تمہید میں اہل بزم کو دعوت نظارہ دی تھی۔ سچ پوچھئے تو میں ایک شعر کے متعلق بھی دل کھول کر اظہار تاثرات نہیں کر سکا حالانکہ یہ وہ اشعار ہیں، جن کی روح کو سمجھنے کے لئے ایک طویل و بسیط تشریح بھی کافی نہیں ہو سکتی، یہ وہ پھول ہیں جن سے رنگ و بو کا انتزاع ناممکن ہے۔ یہ وہ بوسے ہیں جو پیام سے نہیں پہنچائے جا سکتے، یہ ایک مائدہ وجد و سرور ہے، خاصان دقیقہ فہم کے لئے ایک جلوہ عمیق ہے۔ صاحب نظران نکتہ بیں کے لئے،

برسماع راست ہر کس چیر نیست ۔۔۔ طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست

ان تمام کمالات و معانی کے باوجود مرزا بشر تھے، ان کے کلام میں عیوب بھی ہیں، اکثر مقامات نثر و نظم میں اغلاق و اشکال اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے، معنی شعر در بطن شاعر ہو کر رہ گئے ہیں، ایجاد مضامین و اجتہاد فن میں "المجتہد قد یخطی" کے فطری قانون سے آزاد نہیں ہو سکے، یہ مبحث ایک الگ فرصت کا متقاضی ہے،

اندھی

اجنبی۔ تجھے ڈر نہیں لگتا اس کے ذکر سے؟
اندھی۔ نہیں۔
اسے اب زمانہ ہوا۔ وہ کوئی اور ہی تھا۔
جس کے اس زمانہ میں آنکھیں تھیں، جو دیکھتی بولتی خوش و خرم جیتی تھی،
وہ مر گئی۔
اجنبی۔ اور بڑی سخت تھی بیچاری کی موت!
اندھی۔ نہ جاننے والوں کے لئے موت انتہائی خوفناک ہے۔
بڑا مضبوط دل چاہئے اس کی برداشت کے لئے، وہ کسی غیر ہی کی موت کیوں نہ ہو
اجنبی۔ وہ تیرے لئے غیر تھی؟
اندھی۔ یا غیر ہو گئی۔
موت تو ماں سے بچے تک کو غیر کر دیتی ہے۔۔

لیکن پہلے کچھ دن بڑے ہی سخت تھے،
میری جان بھر جیسے زخموں سے چور تھی، اور دنیا،
جو باہر پھولتی پھلتی ہے،
(ایسا معلوم ہوتا تھا)

جیسے کسی نے جڑوں سمیت میرے دل سے کھینچ لی ہو؛
اور میں کھدی کھدائی زمین کی طرح خالی پڑی رہ گئی تھی۔
اور اپنے ٹھنڈے آنسوؤں کا مینہ پیتی تھی
جن کی مردہ آنکھوں سے ایسی جھڑ لگی تھی
جیسے بادلوں کا بادشاہ مر گیا ہو اور بادل
اُجڑے ہوئے آسمانوں سے گر رہے ہوں۔
اور میرے کان بہت تیز ہو گئے تھے اور ہر آواز کے لئے تیار؛
میں وہ چیزیں سن لیتی تھی جو سنی نہیں جا سکیں؛
زمانے کے اپنے سر پر سے گذرنے کی آواز
اور وہ خاموشی تک جو کاغذی شیشوں میں لرزاں تھی؛
اور محسوس کر لیتی تھی کہ ابھی میرے ہاتھوں کے پاس سے
کسی بڑے سے سفید گلاب کے پھول کی مہک گذر گئی۔
بار بار یہ ہی خیال آتا تھا، رات اور پھر رات،
اور کبھی جیسے ایک سفیدی کی جھلک سی نظر آتی تھی
جو میں یہ سمجھتی تھی کہ اب بڑھتے بڑھتے دن ہو جائے گا۔
اور خیال کرتی تھی کہ اب صبح ہونے والی ہو گی۔
اور صبح تھی کہ مدت سے میرے ہاتھوں پر پڑی جگ رہی تھی۔
ایک رات یکایک میری نیند میرے شب آلود چہرے سے ایک پتھر کی طرح لڑھک کر گر پڑی۔
اور میں نے اپنی غریب ماں کو سوتے سے جگا دیا؛
اماں! میں چلائی:
دیکھو تو اماں! روشنی تو کرو اماں!

اور گونش پر آواز ہو گئی؛
دیر تک، بڑی دیر تک ایک سناٹا رہا
ور میرے سر کے نیچے میرا تکیہ
جیسے پتھر کی چٹان ہوا جا رہا تھا،
اور پھر ایسا معلوم ہوا جیسے میں نے ایک چمک سی دیکھی
اور یہ چمک میری ماں کے دل جلے آنسوؤں کی چمک تھی
جن کا اب پھر نئے سرے سے خیال کرنے کو جی نہیں چاہتا۔
اکثر میں خواب میں چیخ اٹھتی تھی: روشنی! روشنی!
اسے روشنی کرو! روشنی!
آسمان گر پڑا،
اس کو اٹھا لو کوئی،

اوپر اور اوپر،
اور پھر ستاروں تک پہنچا دو!
یہ پہاڑ سا آسمان لئے
کوئی کیسے جئے ......
ارے ماں! یہ میں تجھ سے باتیں کر رہی ہوں؟
اور تجھ سے نہیں
تو پھر دنیا میں کس سے؟
یہ پیچھے کون کھڑا ہے؟
پردے کے پیچھے؟ خزاں؟
ماں: آندھی آ رہی ہے!

ماں : رات آ رہی ہے ؟
بتلاؤ ؟

یا : دن ہے ؟ .... دن !
بھلا میرے بغیر دن کیسے ہو سکتا ہے ؟
کیا میری کہیں بھی ضرورت نہیں ؟
کیا مجھے کوئی نہیں پوچھتا ؟
کیا ہمیں سب کے سب بھول گئے ؟

ہیں ؟ ......
لیکن تم تو ابھی ہو وہاں،
تمھارے لئے تو ابھی سب کچھ ہے،
ہے نہ ماں ؟
تیرے چہرے کے ارد گرد
ابھی ہر چیز کوشاں ہے
کہ اسے لذت یاب کرے۔
جب تیری آنکھیں آرام کرتی ہیں،
وہ کتنی ہی تھکی کیوں نہ ہوں،
پھر سے اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔
...... میری جیب میں۔
میرے پھولوں کے رنگ کھو گئے
میرا آئینہ پتھر ہو گیا
میری کتابوں کی سطریں کبڑی ہو گئیں

اور میری ساتھ کھیلی چڑیاں
کہیں غیر جگہوں میں غیر گھروں کی کھڑکیوں سے
سر ٹکرا ٹکرا کر
لہو لہان ہو رہی ہوں گی۔
اب مجھ سے کسی سے رشتہ باقی نہیں،
میں سب سے چھٹ گئی،
میں ایک اجڑا جزیرہ ہوں۔
اجنبی۔ اور میں سمندر پار کر کے آیا ہوں۔
اندھی میرے جزیرے تک؟ ..... کیسے؟
اجنبی میں ابھی کشتی ہی میں ہوں
اور یہ کشتی ابھی آہستہ سے ٹکا دی ہے۔
تجھ سے۔ اور وہ ابھی ہل ہی رہی ہے،
اس کے جھنڈے سے خشکی کا عزم ظاہر ہے۔
اندھی میں ایک جزیرہ ہوں اور تنہا .....
میں ساغنی ہوں۔
پہلے پہلے جب پرانی راہیں میری رگ و پے میں
موجود تھیں اور انکی یاد ابھی بالکل تازہ، ہاں
وہ مصیبت کے دن تھے۔
ہر چیز میرے دل سے نکلی بھاگتی تھی
مجھے نہ معلوم ہوتا تھا کہاں،
میرے سارے جذبات، میری ساری ہستی

بند آنکھوں کے حلقوں کے پاس غول کے غول جمع ہو کر
چیختے تھے اور شور مچاتے تھے؛
اور آنکھوں کو حرکت نہ ہوتی۔

میرے فریب خوردہ جذبات ....
مجھے معلوم نہیں کہ وہ برسوں یوں ہی رہے،
لیکن وہ ہفتے مجھے ابھی یاد ہیں،
جن کے بعد وہ ہزیمت خوردہ واپس ہوئے۔
اور ان کو پھر کسی چیز کی خبر نہ رہی۔

اس کے بعد آنکھوں تک ایک راہ بن گئی۔
اب وہ مجھ کو یاد نہیں۔
اب تو ہر چیز میرے لئے اندر ہی اندر
چکر لگاتی ہے بے فکر اور مطمئن۔
اب میرے جذبات
میرے سینے کے تاریک مکان میں
مزے سے چلتے پھرتے ہیں اور خوش ہیں۔
ان میں سے اب بھی بعض میں
یاد ماضی کم و بیش مستور ہے،

لیکن ان میں سے نوؤں کی نظر
صرف مستقبل کی طرف ہے،
وہ صرف باہر کی طرف دیکھتے ہیں،
کیونکہ میرے جسم کے ہر کونے میں
ان کے نئے شیشے کے روزن ہیں
جن سے وہ سب کچھ دیکھ سکتے ہیں۔
میری پیشانی دیکھتی ہے،
میرا ہاتھ دوسرے ہاتھوں کے حسن سے چشم سیر ہوتا ہے،
میرا پیر جس پتھر پر پڑتا ہے اس سے ہمکلام ہوتا ہے،
اور پرندوں میں سے ہر ہر پرند
میرا ہمنوا ہے۔
اب مجھے کسی چیز کی کمی نہیں،
آواز و بو رنگوں کے ترجمان ہو گئے ہیں
اور رنگ سروں میں بے انتہا بھلے معلوم ہوتے ہیں۔
مجھے کتابوں سے کیا کام:
ہوا درختوں کی صفحہ گردانی کر رہی ہے
اور اس سے جو لفظ بج بج کر نکلتے ہیں
وہ سب مجھے معلوم ہیں؛
اور کبھی میں ان کو آہستہ سے دہراتی بھی ہوں!.
اور موت، جو آنکھوں کو پھولوں کی طرح توڑ لیتی ہے،
اسے میری آنکھیں نہیں ملتیں ......

اجنبی ۔ (بہت آہستہ سے) ہاں مجھے معلوم ہے۔

نالۂ وحشت

"رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے"

دوش پر سیلاب کے یا گود میں گرداب کے ہو
ہے غرض محروم ساحل موجِ دریا آشنا

جس کو وحشت سے بھی وحشت ہو قرار اسکو کہاں
آہوئے صحرا تو اِک حد تک ہے صحرا آشنا

ہو گماں بیگانگی کا جس پہ ایسا التفات
کس قدر نا آشنا صورت ہے اپنا آشنا

جوشِ وحشت جب تصور تک نہ بندھنے دے کبھی
ہے ستم کہیئے اگر مجنوں کو لیلیٰ آشنا

عمر کٹتی ہے مگر اس طرح اے آرام جاں
زندگی ناساز، تو نایاب، اجل نا آشنا

خون گردش میں نفس بے چین نبضیں مضطرب
ہر بُنِ مو سوز ہے ہم سے سکوں نا آشنا

روتے روتے تھک گئیں اور بوجھ سے جھک جھک پڑیں
نیند سے لیکن نہ ان آنکھوں کو دیکھا آشنا

قلب مضطر، دم خفا، خاطر پریشاں، جی اداس
غیر کیا اپنوں میں بھی کوئی نہ نکلا آشنا

اہل دنیا ہیں فقط صورت شناس و درعیش
شام غم کی تیرگی میں کون کس کا آشنا

"میں ہوں اور آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا"

ع - ح

دارُالمُصنّفین

اس کی گذشتہ تاریخ اور اس کا تخیّل

دَارالمصنّفین، اعظم گڈھ کی طرف سے ایک رسالہ بغرضِ اشاعت ہمیں موصول ہوا ہے جس کا نام ہے
صنّفین اس کا تخیل اور اس کی گذشتہ تاریخ" ہم اس رسالہ کے جستہ جستہ اقتباسات اس عنوان سے شائع کرتے
"دارالمصنّفین" اس کی گذشتہ تاریخ اور اس کا تخیل"۔ تقدیم و تاخیر کی اس ترمیم سے ہمارا منشا جہاں اہلِ ملک
دارالمصنّفین کے علمی و ادبی کارناموں کی اشاعت ہے وہاں اربابِ دارالمصنفین کے سامنے اس حقیقت
بھی ہے کہ ادارہ مذکورہ کے گذشتہ کارنامے خواہ کتنے ہی مغتنم اور قابلِ قدر کیوں نہ ہوں، لیکن ابھی اس
تخیل تک پہنچنے کے لئے بہت سی منزلیں طے کرنی ہیں۔ امید ہے کہ اربابِ دارالمصنفین ہمارے اس مخلصانہ
کی طرف توجہ فرمائیں گے اور اس حق گوئی پر ہمیں معاف کریں گے

سب سے پہلے ہم تاسیس دارالمصنفین اور اس کے علمی اور کاروباری صیغوں کا ذکر کرتے ہیں جس سے
گذشتہ تاریخ اور موجودہ حالت کا اندازہ ہو سکے گا۔ پھر بعد میں ان تخیلات کا ذکر کریں گے جو اس
کے تاسیس کے محرک ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ

تاسیسِ دارالمصنفین

"یہی وہ تخیلات[1] تھے جو سب سے پہلے علامہ شبلی مرحوم کے پیش نگاہ آئے اور انھوں نے ایک علمی
دارالمصنّفین کے نام سے قائم کرنے کا قصد کیا لیکن ندوہ اور سیرت نبوی کی مصروفیت سے اس

ان تخیلات کا ذکر بعد میں آئے گا۔

تخیل کو عملی قالب میں لانیکا موقع نہ مل سکا۔ یہاں تک کہ جب ۱۹۱۳ء میں مولانا نے ندوہ کی خدمات سے سبکدوشی حاصل کی تو ان تخیلات کے عملی قالب میں آنے کا وقت آپہنچا، اور ۱۹۱۴ء میں الہلال کے ذریعہ سے اس تجویز کو مستقل طور پر سب سے پہلی مرتبہ ملک کے سامنے پیش کیا،

اس کے بعد مولانا شبلی نے اپنے وطن اعظم گڑھ میں سب سے پہلے اپنا ایک وسیع باغ اور کچے بنگلے وقف کئے اپنی اور اپنے بعض اعزہ کی ذاتی کتابیں اور سیرت کی کتابیں دار المصنفین کے نام منتقل کر دیا، ان مراتب کے طے ہو جانے کے بعد چند قواعد ترتیب دئے، اور اپنے تلامذۂ خاص کو خطوط بھیجے کہ وہ رخت سفر باندھنے کے لئے تیار ہو جائیں، لیکن یہ سروسامان ابھی ہو ہی رہے تھے کہ خود مولانا نے ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو ہمیشہ کے لئے اپنا رخت سفر باندھ لیا، اور دار المصنفین کی تحریک صرف اسی حد تک انجام کو پہنچ سکی کہ ان کی یہ پیشین گوئی پوری ہو جائے کہ "شاید وہی سیر مدفن بھی ہو" مولانا کی وفات کے بعد دار المصنفین کے تخیل کا عملی قالب جن اجزاء کی شکل میں موجود تھا، ان کا مجموعہ ایک باغ، دو کچے بنگلے اور چند الماری کتابوں سے جن کی تعداد چند سو تھی، زیادہ نہ تھا۔

اس کے بعد مولانا کے تلامذہ اور منتسبین کی کوششوں کا دور شروع ہوا اور ۲۱ نومبر ۱۹۱۴ء کو یعنی مولانا کی وفات کے تیسرے دن، مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کی دعوت پر مولانائے مرحوم کے علمی کاموں کی تکمیل کے لئے ایک عارضی مجلس اخوان الصفا کے نام سے قائم کی گئی، جس کے علاوہ صدر مولانا حمید الدین صاحب ناظم مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، اور مولانا مسعود علی صاحب ندوی مہتمم امور تھے،

اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس مجلس کا سب سے پہلا کام سیرت نبوی کی تکمیل ہے، چنانچہ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر مولانا حمید الدین مرحوم اور مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک وفد سرکار عالیہ جنت منزل مرحومہ بھوپال کی خدمت میں حاضر ہوا، اور سرکار عالیہ نے بدستور سیرت نبوی کا ماہوار وظیفہ جاری رکھا، مولانا کے باغ و بنگلہ کا وقف ناتمام رہگیا تھا۔ ۲۴ نومبر ۱۹۱۴ء کو اعیان شہر کی ایک مجلس مدعو کی گئی اور وقف کے بقیہ مراحل طے کئے گئے، اور مولانا کے احباب خاص میں مرزا محمد سلیم مرحوم و مرزا محمد نعیم مرحوم کا باغ بھی جو اسی باغ سے ملحق تھا، دار المصنفین پر وقف کیا گیا، لیکن خاص دار المصنفین کے لئے نہ اب تک کوئی سرمایہ

تھا، نہ اس کی کوئی باضابطہ جماعت تھی، نہ اس کے لئے کوئی کارروائی شروع ہوئی تھی، اور نہ اس کے مقاصد اور دستور العمل کا خاکہ تیار ہوا تھا،

مولانا مسعود علی صاحب نے اعظم گڈھ میں قیام منظور کیا، مولانا سید سلیمان صاحب نے اخبارات میں مضامین لکھ کر دار المصنفین کے قیام کی اطلاع شائع کی، اور ملک کے مشاہیر اور اکابر سے خط و کتابت کر کے ان کو اس کی تاسیس کی طرف متوجہ کیا،

مولانا حمید الدین صاحب نے حیدرآباد پہنچکر دار المصنفین کے لئے مولانا شبلی مرحوم کی ماہوار رقم منتقل ہو جانے کی کوشش فرمائی، نواب عماد الملک بہادر اور سر اکبر حیدری معتمد عدالت و امور عامہ سرکار عالی یعنی نواب سر حیدر نواز جنگ کی سفارش سے حضور نظام خلد اللہ ملکہ نے اپنی مشہور شاہانہ فیاضی و علم دوستی کے ساتھ مولانائے مرحوم کے منصب سہ صد ماہوار کو دار المصنفین کیلئے منتقل کرنا منظور فرمالیا۔

بعد ازیں دار المصنفین کے مقاصد اور قواعد کا خاکہ تیار کیا گیا اور ارکان کی جماعت نے منتخب ہو کر ان کی تصدیق و توثیق کی،

مقاصد دار المصنفین | دار المصنفین کے حسب ذیل مقاصد قرار پائے.

١. ملک میں اعلیٰ مصنفین اور اہل قلم کی جماعت پیدا کرنا۔

٢. بلند پایہ کتابوں کی تصنیف و تالیف و ترجمہ،

٣. ان کی اور دیگر علمی کتابوں کی طبع و اشاعت کا سامان کرنا،

ترتیب | سرکار نظام، نے اجرائے وظیفہ کے لئے دار المصنفین کی باقاعدہ سرکاری رجسٹری ضروری قرار دی تھی، اور ملک کے اعتماد کے لئے بھی اس کے رجسٹرڈ ہو جانے کی ضرورت تھی، اس لئے ۱۳ جون ۱۹۱۵ء کو لکھنؤ میں شبلی اکاڈمی اور دار المصنفین کے نام سے باقاعدہ اس کی رجسٹری کرائی گئی، اور اسی کے ساتھ دار المصنفین کا کام بھی باقاعدہ طریقہ پر شروع ہو گیا، سب سے پہلے ایک مجلس انتظامیہ کی تشکیل ہوئی جو ملک کے سر برآوردہ اہل قلم پر مشتمل تھی، مجلس انتظامیہ کی صدارت نواب عماد الملک بہادر نے قبول

فرمائی اور اپنے قیمتی مشوروں اور وقیع عطیات سے دارالمصنفین کی امداد فرمائی اور جسٹس سید کرامت حسین مرحوم نے نائب صدر ہونا قبول فرمایا۔ موصوف نے بھی اپنے قیمتی مشورے خصوصاً علوم جدیدہ کی ترتیب و تالیف کے اصول پیش کرکے دارالمصنفین کی رہنمائی فرمائی اور اسی مجلس انتظامیہ میں سے ایک مجلس عاملہ بنائی گئی، اور مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کو صدارت تفویض ہوئی اور ان کا وجود تمام عمر دارالمصنفین کے لئے سرمایہ اعتماد اور سہارا بنا رہا، اور مولانا سید سلیمان ندوی اس مجلس کے ناظم مقرر ہوئے اور مولانا مسعود علی ندوی کو اہتمام کے فرائض سپرد ہوئے اور پندرہ ارکان کی مجلس انتظامی بنائی گئی اور ۵ ارکان کی مجلس عاملہ منتخب ہوئی، جس کے ہاتھ میں دارالمصنفین کا تمام کاروبار اور انتظام ہے۔

صیغہائے دارالمصنفین

قیام دارالمصنفین کے بعد دو سال کی مسلسل جد و جہد سے اس کے متعدد صیغے الگ الگ قائم ہوگئے، اور وہ اس وقت بھی اسی شکل میں ہیں یعنی صیغۂ سیرت نبوی (۲) صیغۂ دار التالیف (۳) صیغۂ دار الطباعہ (۴) صیغۂ دار الاشاعت (۵) صیغۂ رسالہ معارف (۶) صیغۂ دار الکتب (کتب خانہ) (۷) صیغۂ تعمیرات اور آج تک ہر صیغہ اپنی تدریجی ترقی کے بعد جس منزل تک پہنچ چکا ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) صیغۂ سیرت نبوی: اس کی تمام تر ذمہ داری ناظم دارالمصنفین مولانا سید سلیمان ندوی کے سر عائد ہوئی، مولانائے مرحوم نے سیرت کا صرف ایک حصہ لکھا تھا، جو نامکمل تھا، ان کے جانشین نے اس کو پوری تکمیل کے ساتھ شائع کیا، پھر تیسری جلد معجزات کی تفصیلی بحث پر شائع ہوئی۔

اس کے بعد سیرت کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے بحیثیت پیغمبر کے بحث کی گئی ہے، مولانائے مرحوم نے اس حصے کے چند ناتمام اجزا لکھے تھے۔ اب بفضل خدا یہ جلد بھی شائع ہوکر مقبول ہو چکی ہے، اس کے بعد سیرت کی پانچویں جلد "سیرت اور مستشرقین یورپ" کے عنوان پر ہوگی۔

(۲) صیغۂ دار التالیف: یہ صیغہ سیرت کے علاوہ دیگر اہم تالیفات کیلئے جداگانہ قائم کیا گیا ہے

اس میں اولاً ایسے متعدد رفقاء اور مصنفین ہیں جو مستقلاً دار المصنفین سے وابستہ ہیں۔ ان کے علاوہ باہر سے جو مصنفین و مترجمین اپنی کتابیں شائع کرنے کے لئے بھیجتے ہیں وہ بشرط پسندیدگی یہاں منتخب کیجاتی ہیں۔

اوّل اوّل جب دار المصنفین قائم ہوا تو مصنفین میں مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبد السلام ندوی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی دکن کالج پونا کی پروفیسری کو خیرباد کہہ کر تشریف لائے تھے، اور مولانا عبد السلام ندوی الہلال کلکتہ کے صیغۂ ادارت سے۔ اس کے بعد مختلف اہل علم وقتاً فوقتاً دار المصنفین کی رفاقت سے وابستہ ہوتے گئے چنانچہ اب تک حسب ذیل اہل قلم کی خدمات اس کو حاصل ہوئیں۔

۱۔ مولانا عبد الباری ندوی حال پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

۲۔ مولوی سعید صاحب انصاری مصنف سیر انصار و صحابیات

۳۔ مولوی حاجی معین الدین صاحب مصنف مہاجرین، حال کیٹلاگر پٹنہ اورینٹل لائبریری۔

۴۔ مولوی ابو الحسنات صاحب ندوی مرحوم

۵۔ جناب سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم اے، حال پروفیسر اسماعیل کالج بمبئی،

۶۔ مولوی ابو الجلال صاحب ندوی سابق پرنسپل عربک جمالیہ کالج مدراس،

ان میں سے مولوی ابو الحسنات ندوی کو دست اجل نے ہم سے چھین لیا، بقیہ حضرات نے اپنی اپنی مدت رفاقت ختم کرنے کے بعد دیگر مشاغل علمی اختیار کرلئے جو ان کے انتساب بالا سے ظاہر ہیں اور اس وقت حسب ذیل حضرات دار المصنفین سے وابستہ ہیں، جو دار المصنفین میں قیام رکھتے ہوئے اپنی اپنی علمی خدمات انجام دے رہے ہیں، اور دار التصنیف کا شعبہ انھی لوگوں پر مشتمل ہے،

۱۔ مولانا سید سلیمان ندوی،

۲۔ مولانا عبد السلام ندوی،

۳۔ مولانا سعید انصاری،

۴۔ مولانا سید ریاست علی ندوی،

۵۔ مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی،

۴- جناب محمد عزیز صاحب ایم اے ایل ایل بی،

ان وابستگانِ دار المصنفین کے علاوہ بعض بیرونی اہل قلم نے بھی اس کو اپنی خدمات کا مرکز بنایا اور ان کی مستقل تصنیفات و تراجم دار المصنفین سے شائع ہوئے،

اس تفصیل سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ملک کی برگزیدہ علمی جماعت دار المصنفین سے دلچسپی رکھتی ہے اور عربی داں اور انگریزی خواں دونوں قسم کے لوگ دار التصنیف کی ہیئت ترکیبی کے جزو ہیں،

اب تک دار المصنفین میں مخصوص رفقائے دار المصنفین اور اس کے رفقائے اعزازی نے جو کتابیں تالیف و ترجمہ کیں ان کی تعداد چالیس سے زیادہ ہے جن میں سے ہر ایک کی اوسط ضخامت ساڑھے تین سو سمجھنا چاہیے، ہم دار المصنفین کی تالیف و تراجم کو موضوع کے اعتبار سے حسب ذیل عنوانوں پر تقسیم کر سکتے ہیں۔

سیرت: سیرۃ نبوی کی چار جلدوں کے علاوہ جن کا تذکرہ شعبہ سیرت میں گزر چکا ہے، سیر الصحابہ کی ترتیب و تدوین کا کام ابتدا ہی سے شروع ہوا تاکہ ہندی مسلمانوں کو اسلامی تمدن اور اس عہد اول کی اصلی تصویر نظر آجائے، مختلف رفقاء و مصنفین نے اس کتاب کے مختلف حصے لکھے، یہ ایک نہایت وسیع اور عظیم الشان کام تھا اور اب پندرہ سولہ سال کی مسلسل محنت کے بعد تکمیل کو پہنچا ہے، یہ سلسلہ مجموعًا دس جلدوں اسوۂ صحابہ، اسوۂ صحابیات، سیر الصحابیات، سیر انصار، دو جلد، خلفائے راشدین، مہاجرین، دو جلد، اور سیر الصحابہ یعنی صحابہ بعد فتح مکہ وغیرہ پر مشتمل ہے، یہ سب کی سب نہایت اہم ہیں، اب تک اردو زبان میں صحابہ کے حالات میں اس قدر جامع و مکمل تالیف موجود نہ تھی، اس میں صحابہ کے اخلاق اور عملی زندگی کے واقعات زیادہ نمایاں طور سے دکھائے گئے ہیں،

سوانح: سیر الصحابہ کے اس وسیع سلسلہ کے علاوہ متعدد کتابیں بزرگانِ اسلام کے سوانح میں شائع ہوئیں، جن میں سے اولاً حیات مالک، سیرت عائشہ، اور سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ہیں، ان میں ان بزرگوں کے عام حالات کے علاوہ ان کے جدید طریق سوانح نگاری کے اصول پر ان کے سوانح حیات کے مختلف ابواب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی سلسلہ میں عالمگیر کے تاریخی واقعات کی ترتیب نہایت اہم ہے جس کی ابھی تک

صرف ایک جلد مع ایک وسیع مقدمہ کے شائع ہو چکی ہے، چند جلدیں ابھی باقی ہیں، یہ سلسلہ حقیقت میں اس عظیم الشان بادشاہ کی اصلی تاریخ کا کام دے گا،

تاریخ علوم وفنون:۔ اسلامی علوم وفنون کی تاریخ بھی نہایت اہم کام ہے، اس سلسلہ میں ارض القرآن دو جلد، تاریخ فقہ اسلامی، اور طبقات الامم شائع ہو چکی ہیں، اسی طرح مسلمانوں کے علم تاریخ کی سرگذشت تاریخ التاریخ کے نام سے ترتیب پا رہی ہے۔

تاریخ ممالک:۔ مسلمانوں نے سسلی پر ڈھائی سو برس تک حکومت کی اور اسپین کی طرح اس کو بھی اسلامی خیر و برکت کا سرچشمہ بنا دیا تھا، مگر کس قدر افسوس کی بات تھی کہ اس کی تاریخ اردو فارسی تو کیا عربی میں بھی موجود نہ تھی، چار پانچ برس کی محنت اور تلاش و تحقیق کے بعد دو ضخیم جلدوں میں اس کی تاریخ مرتب کیگئی ہے، پہلی جلد سسلی کی اسلامی سیاسی تاریخ پر مشتمل ہے، اور دوسری جلد یہاں کے اسلامی تہذیب و تمدن اور علوم و آداب کا مرقع ہے، اسی طرح اگرچہ اردو میں اسلام کی بہت سی تاریخیں لکھی گئی ہیں لیکن ابھی تک اس موضوع پر مستند اور وسیع سلسلہ کی جگہ خالی تھی، دارالمصنفین نے تاریخ اسلام کے اس وسیع سلسلہ کو بھی چھیڑ دیا ہے، نیز اس سے الگ آئندہ ہندوستان کی ایک مکمل تاریخ کی تدوین بھی پیش نظر ہے،

فلسفہ تاریخ کے عنوان میں ابھی تک صرف ایک کتاب کا ترجمہ انقلاب الامم کے نام سے شائع ہوا ہے، اور آجکل تاریخ اخلاق اسلام کے نام سے ایک وسیع سلسلہ زیر تالیف ہے،

حدیث:۔ اردو میں اب تک حدیث کا کوئی ایسا مستند مجموعہ مرتب نہیں ہوا، جس کی ہر حدیث اپنی صحت کے لحاظ سے بلا جرح و تعدیل قبول کر لینے کے قابل ہو، دارالمصنفین نے اس ضرورت کا احساس کیا، چنانچہ اس وقت اسی قسم کا ایک مجموعۂ حدیث زیر ترتیب ہے، جس میں صحت کے لئے یہ التزام رکھا گیا ہے کہ صرف وہی حدیثیں انتخاب کی جائیں جو صحیح بخاری و مسلم دونوں میں موجود ہوں، اور دونوں کے نزدیک وہ متفق ہوں، یہ مجموعۂ حدیث ایک بسیط مقدمہ کے ساتھ عنقریب شائع ہو جائے گا، اور یہ اردو زبان میں نہایت قیمتی اور مقدس کارنامہ انجام پائے گا،

فقہ، میں اب تک دو کتابیں نکلی ہیں، القضاء فی الاسلام، اور اسلامی قانون فوجداری،
جدید علم کلام کے عنوان میں الجہاد فی الاسلام پر اسی نام سے ایک ضخیم کتاب شائع ہوگئی ہو،
فلسفۂ جدید کے موضوع پر اب تک چند کتابیں برکلے، مکالمات برکلے، نطشے، مقالۂ روسو، ابن
رشد، مبادی علم انسانی، روح الاجتماع اور نفسیات ترغیب شائع ہوئی ہیں، ان کی اشاعت میں خاص
طور پر لحاظ رکھا گیا کہ فلسفہ کی صرف وہی کتابیں شائع کیجائیں جن کی حیثیت کلاسیکل ہو،
ادبیات، اس سلسلہ میں اردو شاعری کی تاریخ اور شعرائے اردو کے حالات میں تین مبسوط کتابیں
شعرالہند دو جلد اور گل رعنا شائع ہوئی ہیں،
لغت، اسیطرح ایک مستند عربی اردو لغت کی شدید ضرورت محسوس کیجارہی تھی، دارالمصنفین
نے اس ضرورت کو بھی پورا کیا، ایک اوسط قسم کی جامع لغت ترتیب پاچکی ہو، جو ہنوز مسودہ ہو،
ان ضخیم مختلف النوع تصنیفات کے علاوہ رفقائے دارالمصنفین نے مختلف علمی عنوانوں پر جو رسالے
لکھے ہیں، وہ ان کے علاوہ ہیں، اوران کی بھی ایک خاص تعداد ہو،
نیز شعبۂ دارالتصنیف ایک اہم علمی خدمت یہ بھی انجام دیتا ہے، کہ اسلامی علوم و تاریخ و عقائد و مسائل
وغیرہ کے متعلق اطراف ملک سے استفسار کے طور پر سیکڑوں سوالات آیا کرتے ہیں اوران کے جوابات یہاں
سے تحقیق اور استقصار کے ساتھ لکھ کر بھیجے جاتے ہیں اس مشغلہ میں رفقائے دارالمصنفین کا کافی وقت صرف
ہوتا ہے، اور شاید اس لحاظ سے یہ ادارہ اسلامی ہند میں منفرد ہو، ولافخر،
علاوہ ازیں دارالمصنفین کے شعبۂ دارالتصنیف نے اردو زبان کی ان کتابوں کے علاوہ عربی زبان
میں بھی تصنیفات شائع کئے، اس سلسلہ میں ابومسلم اصفہانی کے تفسیری اجزاء، نظام القرآن کے مختلف
اجزاء، مولانا سید عبدالحی مرحوم کی ایک مبسوط تاریخ ہند، مولانا فیض الحسن مرحوم سہارنپوری کا عربی دیوان
ابوالعلاء معری کے سوانح حیات اور اس کے کلام اور مختلف فیہ اجزاء سوانح پر ایک دقیق تنقید اور اسیطرح
ابتدائی عربی رسائل وغیرہ کی اشاعت اس کا قابل ذکر کارنامہ ہو،
۳۔ صیغۂ دارالطباعہ، دارالمصنفین کی تمام اردو تصنیفات اسی مطبع معارف میں طبع ہوئیں

و مسرت ہے کہ اس کے اہتمام حسن طبع اور حسن مذاق کی کافی حوصلہ افزائی ہوئی ہے، ابتداءً اس صیغہ میں لیتھو کا ایک پریس تھا، بعد میں ایک اور پریس کا اضافہ ہوا اور پھر دو مشینیں اور آگئیں اور پھر ایک ٹل انجن کا اضافہ ہوا، اس صیغہ کے عملہ کی مجموعی تعداد اس وقت ۲۲ ہے۔

۴۔ صیغۂ دار الاشاعت | اس صیغہ میں زیادہ تر مولانائے مرحوم اور رفقاء و مصنفین دار المصنفین کی تصنیفات ہیں، اور نیز انجمن ترقی اردو، اور مکتبہ جامعہ ملیہ کی کتابیں بھی داخل ہیں، علاوہ ازیں ملک کے دیگر مشاہیر کی کتابیں بھی جمع کی گئی ہیں، گویا اردو کا مستند علمی ذخیرہ اس میں جمع کر لیا گیا ہے، اس دار الاشاعت سے صرف وہی کتابیں شائع کی جاتی ہیں جو متین، سنجیدہ، اور مستند ہوں، ابتداءً میں کتابوں کی شکل میں دار المصنفین کا سرمایہ چار یا پانچ ہزار سے زیادہ نہ تھا، لیکن اب تقریباً ڈیڑھ دو لاکھ روپیہ کی کتابیں موجود ہیں،

۵۔ صیغۂ رسالۂ معارف | قیام دار المصنفین کے تقریباً دو سال بعد ماہ جولائی ۱۹۱۶ء میں معارف کا پہلا پرچہ شائع ہوا، اور بفضلہ تعالیٰ وہ اپنی خصوصیات کے ساتھ ابھی تک جاری ہے، ابتداءً اس کی ضخامت ۶۰ صفحے تھی، اور زیادہ تر مضامین دار المصنفین کے رفقاء و ارکان کے ہوتے تھے لیکن دو ہی سال کے بعد یہ ۸۰ صفحوں پر یعنی سالانہ ۹۶۰ صفحے کا شائع ہونے لگا، اور اس کے قلمی معاونین کا دائرہ بھی وسیع ہو گیا اور ملک کے سنجیدہ، مشہور اور مستند اہل قلم کا ایک مخصوص مرکز بن گیا، یہ ہندوستان کے علمی رسالوں میں جس وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس کے متعلق ہم خود اپنی زبان سے کچھ کہنا نہیں چاہتے،

صیغۂ دار الکتب | مولانائے مرحوم اپنا ذاتی کتب خانہ تو ندوہ پر وقف کر چکے تھے، لیکن ندوہ سے علحدگی کے بعد کچھ کتابیں سیرت نبوی کی تدوین کے سلسلہ میں جمع ہو گئیں، پھر جب اعظم گڑھ میں مستقل سکونت اختیار کی تو چند احباب نے بھی اپنی اپنی کتابیں مولانا کو دے دیں لیکن کتابوں کا یہ کل سرمایہ پانچ الماریوں سے زیادہ نہ تھا جو دار المصنفین کی وسیع ضروریات کے لئے ناکافی تھیں۔ اس لئے دار المصنفین کے ابتدائے قیام ہی سے کتبخانہ کی توسیع و تکمیل کی طرف توجہ کی گئی، اور ہر سال کتابوں کے خریدنے کیلئے ایک معقول رقم معین کر دی گئی اسی کے ساتھ ناظم دار المصنفین، مولانا سید سلیمان ندوی کے سفر یورپ سے دار المصنفین کے کتب خانہ کو بہت

بڑی مدد ملی، وہ یورپ کی عام مطبوعہ مشرقی کتب کا ذخیرہ اپنے ساتھ لیتے آئے، علاوہ ازیں وہاں کے ممتاز کتب فروشوں سے مستقل تعلقات قائم کر لئے گئے، چنانچہ اس کے بعد جو بہترین کتابیں یورپ میں مشرقی علوم کی طبع ہوتی ہیں، ان کا ایک نسخہ دار المصنفین کے کتب خانہ میں ہدیۃً یا بالقیمت ضرور آتا ہے،

اسی کے ساتھ ملک کے اہل علم رؤسا نے بھی توجہ فرمائی، جنمیں خصوصیت کیساتھ اس قیمتی عطیہ کا تذکرہ کرنا ہے جو ہمیں خود ہمارے ضلع کے بعض رؤسا کی طرف سے کتب خانہ کو حاصل ہوا، یعنی مولوی محمد اکرم خانصاحب رئیس مہہ آباد (ضلع اعظمگڈھ) نے اپنا پورا کتبخانہ عنایت فرمایا، جنمیں قیمتی قلمی کتابوں کا بھی معتد بہ حصہ ہے۔

اس طور پر دار المصنفین کے کتب خانہ نے ایک مستقل کتب خانہ کی صورت اختیار کر لی ہے، اور اب ۱۱ الماریاں مختلف علوم وفنون کی کتابوں سے لبریز ہیں، اور سالانہ ایک ہزار روپیہ کتابوں کی خریداری پر صرف کیا جاتا ہے، خریداری کے متعلق یہ خاص اہتمام ہے کہ وہی کتابیں خریدی جائیں جو تصنیفی ضروریات کے مطابق ہوں اور خاص طور سے ہر فن کی اہم ترین کتابیں جمع کیجائیں، قدماء کی تصانیف کا خاص خیال رکھا جائے، اسلئے مصر و شام اور یورپ کے مختلف دار الاشاعتوں سے مستقل تعلقات قائم کر لئے گئے ہیں، اور جو کتابیں وہاں اسلامی تاریخ، مذہب، عقائد اور فلسفہ کے متعلق شائع ہوتی ہیں، وہ یہاں آجاتی ہیں،

اس لئے دار المصنفین کے اس کتب خانہ میں جہاں برابر تازہ مطبوعات اور جدید کتابوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے، یورپ کی اکثر مطبوعات موجود ہیں بعض علمی نوادر بھی ہیں، قدامت کے لحاظ سے چھٹی صدی ہجری کی کتاب بھی اس کتب خانہ میں ہے، بعض شاہی کتب خانوں کی کتابیں بھی اس میں ہیں لیکن افسوس ہے کہ انگریزی کتب خانہ مختصر ہے، گو اس کے فلسفہ کا حصہ خاصہ ہے، اور مستند انگریزی رسائل کا ذخیرہ کافی ہے، سیرت کے متعلق کتابیں بھی اکثر موجود ہیں، تاہم یہ حصہ ہماری ضروریات کے لحاظ سے بہت کم ہے،

صیغہ تعمیرات ابتداء میں مولانائے مرحوم نے دار المصنفین کے لئے دو خام بنگلے وقف کئے تھے، ان کے سوا دار المصنفین کے پاس تعمیرات کے سلسلہ میں کچھ نہ تھا، لیکن یہ دونوں خام اور بوسیدہ بنگلے دار المصنفین کی ضروریات کیلئے بالکل ناکافی تھے، اس لئے ابتداء ہی میں رفقاء و مصنفین کے لئے پانچ چھ پختہ کمرے بنوائے گئے، اس کے بعد دفتر کیلئے تین پختہ وسیع کمرے تعمیر ہوئے، پھر پریس کے لئے الگ مکان تعمیر کیا گیا

لیکن اب تک کتبخانہ اور تصنیف و تالیف کے لئے کوئی مستقل عمارت موجود نہ تھی، کتب خانہ مولانائے مرحوم کے وقف کردہ ذاتی بنگلہ میں تھا اور رفقاء و مصنفین اپنے اپنے کمروں میں کام کرتے تھے، اسلئے اس بنگلہ کو منہدم کرکے کتب خانہ اور تصنیف و تالیف کیلئے ایک وسیع و شاندار عمارت بارہ پندرہ ہزار کے صرف سے تعمیر کیگئی اور اب اسی کا نام دارالمصنفین ہے، وسط میں دو بڑے ہال پھر ان کے بعد دو بغلی کمرے، اور چاروں گوشوں پر ایک ایک چھوٹا کمرہ اور سامنے کے برآمدے پر ایک شاندار پورٹیکو ہے، اور اسکی وجہ سے دارالمصنفین کی شان و عظمت مادی حیثیت سے بھی نمایاں ہوگئی ہے، ہمارے لئے تعمیر کتب خانہ کے ضمن میں ان محسنوں کا ذکر بھی ضروری ہے جنھوں نے بیس روپیہ سالانہ کے ارکان بنا کر کتبخانہ کی تعمیر کی مالی دقتوں کا حل کیا، ان میں سے جناب مولوی سید حسن امام صاحب وارثی رئیس گیا، جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اور جناب پروفیسر عبدالباری صاحب ندوی، اور مولوی سید ہاشم صاحب ندوی کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں،

اسی کے ساتھ نواب سر مزمل اللہ خان رئیس بھیکن پور کے عطیۂ خاص سے ایک خوبصورت مسجد تعمیر ہوگئی ہے، دارالمصنفین میں مستقل قیام پذیر لوگوں کے لئے ایک ایک مکان کی تعمیر زیر تجویز ہے جنمیں سے دو مکانات امسال بنکر تیار ہوئے ہیں،

دارالمصنفین کے بھی چند شعبے تقسیم کار کے اصول پر برابر خوش اسلوبی سے کام کر رہے ہیں، اس وقت ملازمین و وابستگان دارالمصنفین کی مجموعی تعداد ۴۵ ہے جن پر تقریبًا بارہ تیرہ سو روپے ماہوار بطور تنخواہ و وظائف کے خرچ ہوتے ہیں، اور دارالمصنفین کا سالانہ بجٹ تقریبًا چالیس پینتالیس ہزار روپیہ کا کم و بیش ہوتا ہے اور بارہ پندرہ ہزار سرمایہ محفوظ ہے"۔

یہ ہے اس ادارہ کا مختصر خاکہ جس کی بنیاد آج سے تقریبًا بیس سال قبل مولانا شبلی نے ڈالی تھی لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کیا تخیلات تھے جو اس ادارے کی تاسیس و بنا کے محرک ہوئے، اس کا جواب خود صاحب رسالہ کے الفاظ میں سنئے "انھوں نے دیکھا کہ دور حاضرہ کی مثال تقریبًا عہد عباسیہ سے ملتی جلتی ہے یعنی اس عہد میں جب نئی ضرورتیں پیدا ہوئیں تو اسلامی علوم و آداب میں بھی انقلاب پیدا کیا گیا

"ایک گروہ نے علوم و فنون کے ترجمہ سے عربی زبان کو مالا مال کیا، ایک دوسرے گروہ نے اسلامی علوم و آداب کی سادہ دیواروں پر مینا کاریاں اور نقش آرائیاں کیں، عقائد نے علم کلام کی صورت اختیار کی، اصول فقہ میں منطقی استدلال پیدا ہوئے، تفسیر میں فلسفہ کی آمیزش ہوئی، فرائض میں علم حساب کے دقیق مسائل شامل ہوئے، علوم یونان و ہند میں جہاں غلطیاں دیکھیں ان کی اصلاح کی اور جہاں جہاں خامیاں نظر آئیں انھیں پورا کیا"

بعینہٖ اس دور جدید میں بھی فلسفہ نے ایک نئی صورت اختیار کر لی ہے، منطق میں نئے برگ و بار پیدا ہو گئے ہیں، معانی و بلاغت کا اسلوب بدل گیا ہے، تاریخ ایک قسم کا فلسفہ بن گئی ہے اور اس طرح ان مستشرقین یورپ کے زہر کا تریاق پیدا کرنے کے لئے اسلامی علوم و آداب خصوصاً علوم دینیہ میں صدہا قسم کے جدید ابواب مختلف ضرورتوں سے پیدا ہو گئے ہیں، چنانچہ ان حالات کے مد نظر انھوں نے چند تلامذہ اور احباب خاص سے ایک جماعت مرتب کی" اور ان کے سامنے تصنیف و تالیف کا ایک مخصوص لائحہ عمل پیش کیا، جس میں تصنیف و تالیف کے لئے مختلف عنوان قائم کئے گئے، مثلاً فلسفۂ جدید کو ملکی زبان میں منتقل کرنا، فلسفۂ جدید کے مسائل پر جدید علم کلام کے رنگ میں روشنی ڈالنا، مختلف علوم اسلامی تاریخ، اسماء الرجال، معانی و بلاغت، اور تحقیقات مذاہب اور علوم جدیدہ کے اسی رنگ کی تالیفات کو سامنے رکھتے ہوئے، دونوں کا موازنہ کرنا، اور پھر اسلامی خصوصیات کو قائم رکھتے ہوئے انہی عنوانوں پر جدید تالیفات تیار کرنا، مخصوص علوم دینیہ تفسیر، حدیث، اصول، فقہ، تصوف، اور کلام کو نئے رنگ میں پیش کرنا، پھر ان علوم اسلامیہ کی تدریجی ترقیوں پر تبصرہ، ان کے غلط و صحیح حصوں پر تنقید و اصلاح، فارسی، عربی، اور اردو ادبیات کی تاریخ، اسلامی تہذیب و تمدن پر مورخانہ صحیح تنقید، اور پھر تہذیب اسلامی، اور تمدن جدید کے تعلقات کی تشریح و تفصیل کرنا"

تاریخ و تخیل کا فرق آپ نے ملاحظہ فرما لیا ہوگا، لیکن ہر ادارہ کو اپنے تخیل کی تکمیل میں کچھ نہ کچھ خارجی مشکلات اور دشواریاں بھی پیش آتی ہیں، اور یہ چیزیں ایک حد تک دار المصنفین کی راہ میں بھی پیش آئیں، جس کی وجہ سے وہ مجبور ہو کر آج بیس سال کے عرصہ میں پہلی بار اپنی ضروریات کو ملک و قوم

کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ ان ضروریات ہنگانہ کی تفصیل رسالہ مذکور میں یوں درج ہے۔

ہماری ضروریات

"۱۔ موجودہ رفقاء مصنفین کیلئے سکونتی مکانوں کی ضرورت ہے کیونکہ اس وقت مکانوں کی قلت کی وجہ سے بعض رفقاء مصنفین دارالمصنفین کی فضا سے باہر شہر کی پر آشوب آب و ہوا میں بمجبوری سکونت پذیر ہیں جس کی وجہ سے دارالمصنفین کے اس بنیادی تخیل کو شدید صدمہ پہنچ رہا ہے، جو اس کے بانی کے پیش نظر تھا۔ اسلئے ہمیں سردست دو مکانوں کی تعمیر بسا ضروری ہے جس کے لئے دس ہزار روپے کی فوری ضرورت ہے،

۲۔ ہمارے رفقاء کے موجودہ ماہانہ وظائف ان کی ضروریات کی کفالت نہیں کرتے، اسلئے ضرورت ہے کہ ہماری ماہانہ آمدنی میں کسی مستقل سرمایہ کا اضافہ ہو کہ ہمارے رفقاء سکون و طمانیت سے اپنے خدمات انجام دے سکیں،

۳۔ موجودہ رفقاء مصنفین کی تعداد ہماری تصنیفی ضروریات کے لئے ناکافی ہے، دارالمصنفین کے اصل تخیل کی تکمیل کے لئے کم از کم دس رفقاء کے مزید اضافہ کی ضرورت ہے، جن کے لئے دو امور ضروری ہیں، الف۔ ایک ہزار ماہوار کی مستقل آمدنی کا سامان۔

ب۔ ان رفقاء کے سکونتی مکانات کی تعمیر کے لئے سرمایہ،

۴۔ موجودہ رفقاء مصنفین کے ہاتھ بٹانے کے علاوہ ایسے رفقا کی بھی ضرورت ہے جو یورپ کی ان اعلیٰ کتابوں کو جو غیر زبانوں میں اسلامی علوم و فنون پر تالیف ہو رہی ہیں اردو میں منتقل کریں، اسلئے ان رفقاء میں ایسے اشخاص کی ضرورت ہوگی جو یورپ کی ان زبانوں سے آگاہ ہوں اور اس کیلئے ہمیں مزید سرمایہ کی ضرورت ہوگی،

۵۔ ہمارے یہاں کتابوں کا ذخیرہ روز بروز بڑھتا جاتا ہے جسکی وجہ سے ہمارے موجودہ کتب خانہ کی عمارت ناکافی ہوتی جاتی ہے اس لئے ضرورت ہے کہ ایک عمارت خاص کتبخانہ کی جدید ترتیب پر اسی نوع

کی تعمیر کی جائے۔ اس کے لئے ہمیں پچیس ہزار روپیہ سرمایہ کی ضرورت ہے، تاکہ دارالمصنفین کے شایان شان اور اس کی ضروریات کے مطابق کتب خانہ کی ایک خاص عمارت تعمیر کریں،

۶۔ ہمارے موجودہ کتب خانہ میں جو کتابیں فراہم ہوگئی ہیں وہ ہماری موجودہ ضروریات کیلئے بھی کافی نہیں ہیں، کیونکہ ہم اپنے موجودہ بجٹ کے لحاظ سے کتابوں کی خریداری پر صرف ایک ہزار روپیہ سالانہ کی قلیل رقم صرف کرتے ہیں، اور اسی لئے ابھی تک صرف عربی کتابوں کا ذخیرہ کسی قدر فراہم ہو سکا ہے حالانکہ ہمیں انگریزی و دیگر یورپی زبانوں کی اعلیٰ پایہ کتابوں کے جمع کرنے کی شدید ضرورت ہے کیونکہ تحقیقی معیار کی بلند پایہ تصنیف و تالیف کے لئے ایک بلند پایہ کتب خانہ قطعی ناگزیر ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ

الف۔ کتابوں کی فراہمی کے لئے مستقل سرمایے اور عطیے حاصل ہوں،

ب، اور قدیم خاندانوں میں کتابوں کا جو قدیم قلمی ذخیرہ ہو یا جو شائقین علم یورپ کی اعلیٰ تالیفات کو خرید کر اور اس کو بار بار پڑھ کر سیر ہو چکے ہوں، وہ سب دارالمصنفین میں منتقل کردیا جائیں تاکہ ان کا فیض ہمیشہ جاری رہے،

۷۔ ہمیں دارالمصنفین کے دارالاشاعت کو ترقی دینے کی شدید ضرورت ہے، تاکہ دارالمصنفین کے تخیل کے مطابق ایک اعلیٰ پیمانہ کا دارالاشاعت ملک و ملت اور زبان اردو کی حقیقی خدمات انجام دے سکے، اس سلسلہ میں ہمیں حسب ذیل ضرورتیں ہیں،

الف۔ ہمارا موجودہ پریس محض معمولی ضروریات کا کفیل ہو سکتا ہے، اسلئے اسمیں اضافہ کیا جائے،

ب۔ ملک میں ٹائپ کی طرف عام رجحان ہوتا جاتا ہے، اور وہ زمانہ قریب ہے کہ ہماری تالیفات لیتھو پریس کی مصیبتوں سے نجات پا جائیں، اس لئے مطبع دارالمصنفین میں ٹائپ کا بھی اضافہ ہو جائے، تاکہ ہم بھی اس طرف تدریجی قدم بڑھا سکیں،

ج۔ عربی کتابوں کی اشاعت ہمارا خاص مطمح نظر ہے، اس لئے ہمارے مطبع کو عربی ٹائپ کی بھی شدید ضرورت ہے،

د۔ آجکل ہمارے دارالاشاعت میں جلد سازی کا انتظام نہایت ناقص ہے، ضرورت ہے کہ

اعلیٰ پیمانہ پر اس کو ترقی دی جائے تاکہ ہم التزام کے ساتھ مجلد کتابیں شائع کرسکیں،

دار الاشاعت کی ترقی میں دس ہزار روپیہ سرمایہ کی ضرورت ہے، اس کی ترقی میں یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ اس کی ترقی سے ہمیں اقتصادی ترقیاں بھی حاصل ہونگی، جیسے کہ ابھی تک وہ ہماری مالی حالت کو سنبھالے رہا ہے،

اس لئے درحقیقت ہمارے دار الاشاعت کی ترقی میں ہماری مالی مشکلات کا حل بھی کسیقدر مضمر ہے،

یہ ہیں وہ ہماری کل سات ضروریات جنکی تکمیل کے بعد دار المصنّفین کا اصل مطمح نظر پورا ہوتا ہے"

اس کے بعد واقعی اگر ہم دل سے متمنی ہیں کہ دار المصنّفین اپنے اس تخیل کو واصل مطمح نظر کو پورا کرے تو ہمیں چاہئیے کہ اس کی ان ضروریات کی تکمیل میں مدد دیں،

تنقید و تبصرہ

انگارے۔ دس مختصر کہانیوں کا مجموعہ از سید سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں، محمود الظفر،
ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

سالنامہ کاروان۔ مرتبہ پروفیسر تاثیر ایم اے۔ مقام اشاعت، لاہور سال میں صرف ایک دفعہ شائع ہوگا،
قیمت ۱۲ ملنے کا پتہ۔ چابک سواران لاہور،

<u>انگارے</u> یورپ میں اکثر دیکھا جاتا ہے کہ اچھی صورت والی عورتیں جب سیر کو نکلتی ہیں تو ایک یا دو معمولی یا بھدی صورت والیوں کو اپنے ہمراہ رکھتی ہیں۔ اس میں دونوں کا فائدہ رہتا ہے۔ اچھی صورت والی کا حسن نکھر آتا ہے، بھدی صورت والی کو ایک سہارا مل جاتا ہے۔ اور لوگوں کو خواہ مخواہ یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ اس میں کوئی نہ کوئی صفت ضرور ہے ورنہ ایسی حسین عورت اسے کیوں اپنے ساتھ رکھتی۔ عورتوں کا ایسی چالیں چلنا تو سمجھ میں آسکتا ہے۔ لیکن ہم کو یہ نہیں معلوم تھا کہ افسانہ نویس بھی باہمی امداد کے ایسے طریقے اختیار کر سکتے ہیں "انگارے" اس کوشش کی پہلی مثال ہے جو ہماری نظر سے گذری، اور اسی کو دیکھ کر ہمارا خیال ہو گیا ہے کہ اچھے افسانہ نویسوں کے لئے یہ طریقہ مناسب نہیں۔ ان کا حسن تو نکھر آتا ہے لیکن پڑھنے والے کی طبیعت بدمزہ ہو جاتی ہے۔

سجاد ظہیر صاحب کے اوصاف ان کے پہلے دو افسانوں میں ظاہر ہو گئے تھے جو انھوں نے رسالہ جامعہ میں شائع کئے: اُن کے "ہمراہیوں" سے ابھی تک ہمارا تعارف نہیں ہوا تھا۔ شاید ان کا تعارف ہی کرانے کے لئے ان کے افسانے بھی اس مجموعے میں شامل کر دئے گئے۔ انسانی ہمدردی ہر شکل میں تعریف کی مستحق ہوتی ہے، لیکن ہمارا دل یہی کہتا ہے کہ سجاد ظہیر صاحب نے اس مجموعے میں صرف اپنے تخیل کے کارنامے پیش کئے ہوتے تو بہت بہتر ہوتا "انگارے" واقعی "انگارے" ہیں "محض افسانے نہیں۔ ان میں صرف زندگی نہیں دکھائی گئی ہے بلکہ ایک خاص قسم کی زندگی، اور ان کا مقصد یہ ہے کہ دل پر ایک خاص قسم کا اثر ہو۔ ہمارے معاشرے میں آگ لگ جائے۔ مسلمانوں کی موجودہ معاشرت، خیالات، عقائد، سب پر وار کیا گیا ہے۔ کہیں ان کی ہنسی اڑائی گئی ہے، کہیں عیب ظاہر کئے گئے ہیں، ساتھ ساتھ غریبی، بیکسی، مظلومیت، اور جہالت کی دردانگیز تصویریں بھی ہیں، اور معاشرے کے خوشحال آزاد طبقے جو ظلم کرتے ہیں ان کی شکایت بھی کی گئی ہے۔ ہم کو اپنی زندگی اور معاشرت کے مصوروں پر یہ اعتراض نہ کرنا چاہیئے کہ اس کو ہمارے عقیدے اور تعصب سے اتفاق یا ہمدردی نہیں، اور جن چیزوں کا ہم احترام کرتے ہیں

چیز سے بھلا کب سیر ہوتا ہے۔ مولانا کے قدم اٹھے اور وہ دوسرے در کی طرف بڑھے۔ اسی طرح وہ ہر در پر جا کر تھوڑی تھوڑی دیر رکتے ...... اور مسکرا کر درود پڑھتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ......" لیکن ایک نازک وقت پر پیچھے سے قہقہے کی آواز آئی اس بے موقع ہنسی پر مولانا کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ان کی آنکھ کھل گئی۔ سورج نکل آیا تھا۔ مولانا جانماز پر پیٹ کے بل پڑے ہوئے قرآن کریم کو سینے سے لگائے تھے۔ ان کی بیوی پہلو میں کھڑی ہنس رہی تھیں۔"

"نیند نہیں آتی" اور "پھر یہ ہنگامہ" میں ذہن کی ایک سرسامی کیفیت دکھاتے ہیں۔ یورپ کی افسانہ نویسی کا سب سے جدید طریقہ یہی ہے لیکن ہمارا مذاق ایسی بے سر و پا باتوں کو شاید ہی گوارا کر سکے۔ امجد علی صاحب کے دونوں افسانے اسی رنگ کے ہیں۔ ایک بہت فحش ہے دوسرا بہت پر درد ہو سکتا تھا، مگر انداز بیان نے اس کے اثر کو بہت کچھ زائل کر دیا ہے۔

رشید جہاں صاحبہ کا ایک افسانہ ہے اور ایک ڈراما۔ افسانہ کیا ہے ایک پردہ نشین عورت اور اس کے بے پروا شوہر کا ایک بے لطف قصہ ہے۔ شوہر اپنی بیوی کو دہلی کی سیر کرانے لایا ہے۔ مگر اسے اسٹیشن پر چھوڑ کر غائب ہو جاتا ہے، اور اسٹیشن کے ہنگامے سے وہ ایسی پریشان ہوتی ہے کہ شوہر کے واپس ہوتے ہی وہ التجا کرتی ہے کہ مجھے گاڑی میں بٹھا کر گھر پہنچا دو۔ ڈراما میں ایک پردہ نشین عورت کے دل اور اس کے گھر کا حال سنایا گیا ہے۔ بیویوں کو اپنے شوہروں سے طرح طرح کی شکایتیں ہوتی ہیں، لیکن یہاں اس ڈرامہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ماں کو اس کے بچے بھی دوبھر ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کی تعداد بہت بڑھ جائے اور بچوں کی کثرت سے ماں کی صحت کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔ آخری افسانہ "جوانمردی" مسلمانوں کی ذہنیت کے ایک خاص عیب کی طرف اشارہ ہے۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ عیب موجود ہے اور اسے دور کرنے کی جتنی بھی کوشش کی جائے وہ کم ہے مگر یہ افسانہ بے رس ہے۔

"د م"

سالنامہ کارواں لاہور کی سرزمین بہت رسالہ خیز واقع ہوئی ہے اور کوئی سال نہیں جاتا کہ وہاں سے چند نئے رسالے نہ نکلتے ہوں لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ شاذ و نادر ہی کوئی رسالہ ایسا نظر سے گزرتا ہے جس کے معایب اس کے محاسن سے زیادہ نہ ہوں۔ ایسی حالت میں نہایت خوشی کا مقام ہے کہ آخرکار ایک رسالہ تو اس سرزمین سے ایسا بھی نکلا جسے سخت سے سخت تنقید نگار بھی اچھا کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پروفیسر تاثیر قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس پرچے کو نکال کر ادب اردو کے رہوار کی باگ اب صحیح راستے کی طرف موڑ دی ہے۔ اکثر لاہوری رسائل کے مدیروں میں نہ تو ہمت کی کمی ہے اور نہ اپج کی لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ خوش مذاقی بہت کمیاب ہے۔ اب اس رسالے کو دیکھ کر یہ معلوم ہوا کہ یہ جنس بھی اس بازار میں موجود ہے

دوسرے ان مقامات پر جہاں سے اردو رسائل نکلتے ہیں سمت عنقا کا حکم رکھتی ہے اور ان کا نام بھی کوئی نہیں جانتا اگر خوش مذاقی تھوڑی بہت ہے بھی تو اس کے اظہار کی نوبت ہی نہیں آتی اردو کی پیدائش خواہ کہیں بھی ہوئی ہو اور اسے پروان چاہے کسی نے چڑھایا ہو لیکن اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ اس یتیم بچے کی تربیت اور تہذیب کا فخر اہل لاہور کو حاصل ہونے والا ہے۔ جوش عمل کے نتائج ابتدا میں خامیوں سے پر ہوتے ہیں اور اسی لئے لاہور کے رسائل میں بھی خامیاں نظر آتی ہیں لیکن اگر ہمت بلند ہو اور عمل پیہم تو کوئی ایسی خامی نہیں جو پختہ کاری سے تبدیل نہ ہو سکے۔ ہمیں یقین ہے اور خوشی بھی کہ رسالہ کارواں اس پختہ کاری اور خوش مذاقی کا پہلا ثبوت ہے۔

سب سے زیادہ قابل لحاظ خصوصیت اس رسالے کی یہ ہے کہ بخلاف اپنے تمام معاصرین کے اس میں جتنی تصاویر شائع ہوئی ہیں وہ بلا استثنا خوش مذاقی پر دلالت کرتی ہیں، دوسرے رسائل بھی کبھی کبھار اچھی تصویریں شائع کرتے ہیں لیکن اسی کے پہلو بہ پہلو ایسی پست اور عامیانہ تصاویر بھی لگا دیتے ہیں جنھیں دیکھ کر اچھی تصاویر کی قسمت پر رونا آتا ہے۔ اگر کارواں نے اپنے اس معیار کو قائم رکھا تو یہ اردو داں طبقے کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ فنون لطیفہ سے بیگانگی کا اثر قومی سیرت پر اتنا خراب نہیں پڑتا جتنا بد مذاقی کا اور افسوس ہے کہ مصوّر رسائل بجائے بد مذاقی کا علاج کرنے کے آئے دن اس کو اور ترقی دیتے جا رہے ہیں۔

مضامین کے تنوع کا مدیر کارواں نے لحاظ تو رکھا ہے لیکن مضامین بیشتر ادبی ہیں اور افسانوں کی تعداد غیر متناسب طور پر زیادہ ہے۔ غالباً یہ کیفیت ارادی ہے اور اتفاق کو اس میں دخل نہیں ہے۔ ابھی تک اردو کے بیشتر اہل قلم اپنی توجہ صرف ادبی مضامین کی طرف مبذول رکھتے ہیں اور علمی مضامین لکھنے سے گھبراتے ہیں۔ اس کی ذمہ داری غالباً ہماری شاعری پر ہے۔ جس شخص کو افیون کی چاٹ لگ جاتی ہے اسے پھر نافع صحت غذا بالکل پسند نہیں آتی۔ یہی حال ہمارے مذاق کا ہے ہمیں علمی مضامین پھیکے اور بے رنگ معلوم ہوتے ہیں۔ اس مذاق عامہ کا اثر اہل قلم پر بھی پڑتا ہے اور رسائل کے مدیروں پر بھی نتیجہ یہ ہے کہ جنھیں قبول عام کی تلاش ہے وہ تو ارادی طور پر اور اصلاح پسند غیر شعوری طور پر ادبی مضامین پر ہی قلم اٹھاتے ہیں۔ یہ لوگ گویا ننگے کو بنارسی پٹکے کا تھان اور بھوکے کو مربے کے اچار کا ایک مرتبان پیش کرنا چاہتے ہیں حالانکہ نہ اس سے ستر پوشی ممکن ہے اور نہ اس سے شکم پُری غالباً مدیر کارواں اس اعتراض کو خارج از بحث تصور کریں گے اور یہ جواب دیں گے کہ انھوں نے اپنا دائرہ صرف ادبی خدمت تک محدود کر لیا ہے۔ یہ بذاتہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں لیکن عرض یہ ہے کہ اولوالعزمی اور خوش مذاقی کمیاب اجناس ہیں اور جسے یہ دولت ودیعت ہوئی ہے اس کا فرض ہے کہ اس دولت کو پہلے ضروریات پر صرف کرے اور پھر تعیشات پر۔ ہمیں امید ہے کہ

۱۹۴۸ء کے کارواں میں علوم اور فنون مفیدہ پر بھی اتنی ہی توجہ کی جائے گی جتنی اس دفعہ فنون لطیفہ پر کی گئی ہے۔
اب ایک بات اور رہ گئی ہے۔ اور وہ ہے بھی ذرا ٹیڑھی بات۔ پنجاب کے رسائل میں جہاں اور بہت سی خامیاں ہوتی ہیں وہاں سب سے بڑی خامی زبان کی ہوتی ہے۔ یوں تو یہ مرض اردو کے اہل قلم میں (الا ماشاء اللہ) عام ہے کہ الفاظ کا استعمال غلط یا غیر متعین معانی کے لئے کرتے ہیں اور مطالب کی ترتیب اور تہذیب کا خیال نہیں رکھتے لیکن روزمرہ اور محاورے کی غلطیاں جتنی پنجاب کے رسائل پر نظر سے گذرتی ہیں اتنی اور کہیں نہیں ملتیں (کارواں کے مضامین اس حیثیت سے بھی دوسرے رسائل کے مضامین سے بہت بہتر ہیں لیکن پھر بھی اصلاح کی ابھی کافی گنجائش ہے۔ صرف سرسری ورق گردانی سے جو غلطیاں نظر آئیں یہاں درج کی جاتی ہیں۔ استیعاب بالکل نہیں کیا گیا ہے۔

ص - ۴ شاعر کا سا لا الفاظ ہیں اور وہ ہر کوئی استعمال کرتا ہے (انھیں یا ان کو یا اسے یا اس کو)

"	کئی لکھنے والے	بہت سے
" ۵	قریباً	تقریباً
" ۶	اردو میں آپ نے دیر سے نہیں لکھا	عرصے سے یا بہت دنوں سے
" ۷	کئی جرس ہی کی آواز پرست ہوتے ہیں	کتنے
" ۱۴	منزلگاہ	یہ ترکیب صحیح نہیں غالباً قافیہ سے مجبوری تھی۔
" ۶۴	باپ نے اپنا شیرانہ سر اٹھایا۔	غالباً مراد ہے شیر کے شکل یا مانند
" ۱۵۵	اگر رکھتا ہیں اس پانی کی تھوڑی سی خبرداری	اول تو خبرداری رکھنا غلط ہے، دوسرے حفاظت کرنا یا بچا رکھنا اس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔
" ۲۱۷	تفصیل میں گھسنا منظور نہیں	پڑنا
" ۲۱۷	اس بات کی سمجھ نہیں آئی	یہ بات سمجھ میں نہیں آئی
" "	مجھے سمجھ نہ آتا تھا	میری سمجھ میں نہ آتا تھا
" ۲۰۱	کچھ لکھنے کی دلچسپی دلائی	شوق پیدا کیا۔

اس رسالے کی نظموں کا معیار بھی نسبتاً بلند ہے لیکن اتنا نہیں جتنا نقاد دیر کا ہے۔ اس میں مدیر کا قصور نہیں، جو ہماری شاعری کا معیار ہے اسی کی جھلک رسالے کے صفحات میں نظر آسکتی ہے۔

آخر میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جو کچھ اعتراضات اس رسالے پر عموماً پنجابی رسائل پر کئے گئے ہیں ان سے تنقیص مقصود نہیں بلکہ اصلاح مدنظر ہے

ع۔ ع

دنیا کی رفتار

ممالک اسلامی

مسلمانان چین ۱۹۳۶ء میں

چینی مسلمانوں کے حالات سے باہر کے لوگ کم واقف ہیں۔ بعض لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ چینی مسلمان بالکل مردہ بے جان ہیں۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ اس سے قبل ہم نے جون ۱۹۳۱ء کے رسالہ جامعہ میں چینی مسلمانوں کے متعلق لکھا تھا۔ آج پھر ان کے متعلق لکھ رہے ہیں۔ ہم اس موقع پر ان واقعات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو ۱۹۳۶ء میں پیش آئے ہیں۔ تین اہم واقعات پیش آئے، ایک مسلمانان چین اور حکومت چین سے، دوسرا مسلمانوں اور غیر مسلمانوں سے، اور تیسرا مسلمانان چین اور برادران ممالک اسلام سے متعلق ہے۔ ہم ان کو یکے بعد دیگرے پیش کرتے ہیں۔

چینی مسلمانوں کے مشہور رہنما مافوہیانگ جن کو حکومت چین بھی بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتی تھی، ۱۹ اگست ۱۹۳۶ء کو انتقال کر گئے۔ یہ حکومت نانکنگ کے ایک لائف ممبر اور منگولی اور تبتی کمیشن کے صدر تھے۔ نانکنگ سے پکن کو جا رہے تھے کہ دفعتاً گاڑی میں بیمار ہو گئے اور پکن کے اسپتال میں پہنچ کر چند ہی دن میں اس دار فانی سے تشریف لے گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

جنرل مافوہیانگ صوبہ کانسو کے باشندے تھے۔ پاؤٹنگ کی فوجی اکادمی میں تعلیم پائی تھی ایک عرصہ تک وہ کوکونور کے حاکم رہے۔ پھر صوبہ صدی یوان کے منصب گورنری پر مقرر ہوئے۔ تین سال کے بعد بندر گاہ ٹسن تاؤ (Poot Tsing - Tao) کے ہائی کمشنر بنائے گئے۔ اس کے بعد وہ منگولی و تبتی کمیشن کے صدر مقرر ہوئے اور مرتے دم تک اس منصب پر رہے۔

جب کہ چین کا دار السلطنت پکن سے نانکنگ کو منتقل ہوا (۱۹۲۸ء) تو جمہوریت چین نے ملک کی تشکیل نو کے لئے مختلف کمیشن مقرر کئے۔ تعمیری کاموں میں شمالی اور مغربی چین کی اصلاح بھی شامل تھی شمالی اور مغربی چین میں منگولیا، چینی ترکستان، تبت، کانسو، ننگ ہیا اور چنگ ہائی شامل ہیں۔ ان مقامات میں مسلمانوں کی تعداد بہت کافی ہے لیکن تعلیم کی کمی کی وجہ سے وہ جمہوریت چین کا بیکار جزو سمجھے جاتے ہیں۔ وہاں کے باشندے اتنے ترقی یافتہ نہیں جتنے وسطی یا جنوبی چین کے لوگ ہیں۔ ان کے حالات درست کرنے کے لئے حکومت چین نے منگولی اور تبتی کمیشن مقرر کیا۔ اور اصلاحی کام جنرل مافوہیانگ کے سپرد کر دیا۔ ان صوبوں کی تعلیمی معاشی

اور اجتماعی حالات درست کرنے کے علاوہ ان باشندوں کا دفاعی استحکام بھی ان کے ذمے تھا حکومت چین کے نزدیک شمالی اور مغربی چین کے مسئلے کو اتنی ہی اہمیت حاصل ہے جتنی منچوریا کے مسئلے کو۔ منچوریا کے حالات تو آج کل سب کو معلوم ہیں۔ شمالی اور مغربی چین کے متعلق ہم بیان کچھ لکھتے ہیں" تاکہ قارئین جنرل ما فو سیانگ کی محنت کی اہمیت سمجھ سکیں اور اس بات سے آگاہ ہوں کہ شمالی اور مغربی چین کے مسلمان اور حکومت چین کے باہمی تعلقات کیسے ہیں۔

باہر کے لوگوں کو صرف یہ معلوم ہے کہ جاپان منچوریا پر اپنا اقتدار جمانا چاہتا ہے، اور اس بات سے بالکل بے خبر ہیں کہ جاپان کے علاوہ اور بہت سے حکومتیں چین کی گردن دبانے کے مشتاق ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ امریکہ کو چین میں ارضی خواہش نہیں ہے اس کو صرف منڈی کی ضرورت ہے اور اس بنا پر وہ کھلے دروازے کا بڑا حامی ہے۔ لیکن جاپان، روس، فرانس اور انگلستان کا رویہ یہ نہیں ہے۔ جاپان نے تو فوجی قوت سے منچوریا کو اپنے قبضہ میں کر ہی لیا۔ روس عنقریب بیرونی منگولیا اور چینی ترکستان پر قبضہ کرے گا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اب روس اور جاپان کے درمیان زبردست جنگ ہوگی لیکن یہ خیال زیادہ صحیح نہیں۔ روس اور جاپان میں خفیہ سمجھوتا ہے۔ روس نے منچوریا میں جاپان کا اقتدار تسلیم کرلیا ہے اس احسان کے بدلے جاپان نے روس کو ماہی گیری حقوق عطا کئے ہیں اور یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ وہ بیرونی منگولیا میں روس کا اقتدار تسلیم کرے گا۔ اس سمجھوتے کی وجہ سے روس نے اپنی فوج کو سرحد سیبریا سے ہٹالیا ہے۔

جس طرح جاپان شمالی چین کے ایک حصہ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا اور اب قبضہ کر بھی لیا۔ اس طرح فرانس کا عرصے سے ارادہ ہے کہ جنوبی چین کے ایک حصہ پر قبضہ کر بیٹھے اس نے اس ارادے کو پورا کرنے کے لئے جاپان سے دوستی کرلی ہے۔ اور یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ اگر جاپان کو مالی امداد کی ضرورت ہوگی تو وہ ضرور مدد کرے گا فرانس دل سے چاہتا ہے کہ کوئی قوت چین کو ستانا شروع کرے تاکہ اس کو بھی انام کی طرف سے چین پر حملہ کرنے کا موقع ملے چنانچہ برابر یہ خبر سننے میں آتی ہیں کہ سرحد انام پر شورش موجود ہے اور دیسی باشندوں نے حکومت انام کے خلاف علم بغاوت اٹھایا ہے زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ وہاں سے عام بے چینی اور بلوے کی خبر آئی تھی۔ حکومت فرانس نے اس کا منبع چین کو قرار دیا اور چینی باشندوں پر یہ الزام لگایا کہ انھوں نے انامیوں کو حکومت کے خلاف آمادہ کردیا ہے۔ یہ الزام بالکل اس قسم کا ہے جو منچوریا کی طرف قدم اٹھانے سے پہلے جاپان نے ان چینی باشندوں پر لگایا تھا جو کوریا میں مقیم ہیں۔

یہ مضمون نگار کا قیاس ہے۔ روس اور جاپان میں اس قسم کا معاہدہ ذرا مشکل سے ہوسکتا ہے۔ قرین قیاس تو یہ معلوم ہوتا ہے روس اپنے اندرونی تعمیری کاموں کی وجہ سے کسی سے بھی لڑائی مول نہیں لینا چاہتا۔ (مدیر)

اب رہا تبت کا سوال۔ یہ بھی عرصہ سے نہایت تشویشناک حالت میں ہے، تبت کے لاماؤں نے اگرچہ یہ عہد کیا تھا کہ وہ حکومت چین کے ساتھ اتحاد کرے گا۔ مگر ادھر دو تین سال سے کسی بیرونی قوت نے لاما کو چین کے خلاف آمادہ کردیا ہے حال میں چین اور تبت کے درمیان جو جنگ چھڑ گئی تھی اخباروں کے ذریعے سے پتا چلتا ہے کہ اس میں ایک قوت ثالثہ کا دخل ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اگرچہ تبت میں مادی دولت بہت ہے لیکن معاشی لحاظ سے یہ ملک بہت مفلس ہے۔ بغیر بیرونی امداد کے، لاما چین کے خلاف بغاوت کا قدم نہیں اٹھا سکتا تھا

چین کے عام حالات کی تشریح کرنے کے بعد اب ہم چینی مسلم زعیم اور قائد ملت ما فوھیانگ کی طرف چلتے ہیں اور یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ انھوں نے حکومت چین اور مسلمانان چین کی کیا خدمت کی۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ان کا کام ایک طرف اندرونی اصلاح تھا اور دوسری طرف بیرونی مدافعت۔ اندرونی اصلاحات میں سب سے اہم کام تعلیم ہے۔ منگولیوں اور تبتیوں کو تعلیم دلانے کے لئے انھوں نے ہر بڑے شہر کی یونیورسٹی میں ایک شعبہ خاص کا اضافہ کرایا اس شعبہ میں صرف منگولی اور تبتی طلبا تعلیم پاتے ہیں جن کا نصاب عام چینیوں سے ذرا مختلف ہے۔ جو ان کی ضروریات کے مطابق رکھا گیا ہے، کانسو اور شمالی مغربی چین کے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے انھوں نے پیکن میں ایک ثانوی مدرسہ کھلوایا جو سرکاری اخراجات سے چلتا ہے۔ چینی ثانوی مدرسہ کی تعلیم صرف پڑھانے اور لکھانے تک محدود نہیں بلکہ اس میں فوجی اور فنی تعلیم بھی شامل ہے۔

جب سے ما فوھیانگ کو منگولی اور تبتی کمیشن کا صدر بنا دیا گیا۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ تعلیمی کاموں میں صرف کیا۔ اخبارات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ غیر مسلمانوں میں عموماً اور مسلمانوں میں خصوصاً ہر دل عزیز تھے، شمالی مغربی چین میں یہ ہی ایک شخص تھا جس نے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے دل اپنے اثر اور شخصیت سے جوڑ دیئے۔

شمالی مغربی چین میں عرصہ سے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے باہمی تعلقات اچھے نہ تھے۔ کچھ تو سیاسی اسباب سے اور کچھ جہالت کی وجہ سے شمالی مغربی چین میں تعداد کی زیادتی کی وجہ سے مسلمانوں کو سیاست میں کافی دخل ہے۔ تین چار سال سے اس علاقے میں حکام بھی مسلمان ہی مقرر کئے جا رہے ہیں اس وجہ سے اب وہاں بہت زیادہ امن ہے اور اندرونی شورش بہت ہی کم سنائی دیتی ہے۔ اندرونی امن کی وجہ سے دفاعی استحکام کے کاموں میں زیادہ آسانی ہو گئی ہے۔ اسی سلسلہ میں آمد و رفت کی سہولت کے لئے موٹر کی سڑکیں تیار کی جا رہی ہیں اور لانچاؤ سے ارومچی اور کاشغر تک ہوائی جہاز سے آمد و رفت بھی ممکن ہے۔ ریلوے کی تعمیر کے لئے اگرچہ خاکہ تیار ہے، لیکن حکومت چین کی مالی مشکلات اس پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دیتیں حال میں تبت کی سرحد پر جو شورش ہوئی تھی وہ مسلمانوں ہی کی کوشش سے دور ہوئی تاہم آذستان

جو دارالعلوم اسلامی پکن کے صدر اور ما فو ھیانگ کے دست باز و تھے، حکومت نانکنگ کے حکم سے تبت کی سرحد پر گئے اور اس نزاع کو جو حاکم سی کانگ اور تبت کے لاما کے درمیان رونما ہوئی تھی طے کرکے اب پکن واپس آ گئے۔ مقامی حکومت اور تعلیمی ادارات نے ان کا نہایت شاندار استقبال کیا۔ مندرجہ بالا امور سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ شمالی مغربی چین میں امن و امان قائم کرنے کی ذمہ داری کا اکثر حصہ مسلمانوں کے کاندھوں پر ہے۔ اور وہاں کی اصلاح بغیر مسلمانوں کی کوشش کے ناممکن ہے لیکن ما فو ھیانگ کی قسمت میں یہ بات نہیں لکھی تھی کہ وہ حکومت چین اور مسلمانان چین کو زیادہ عرصہ تک فائدہ پہنچا سکیں۔ ان کے انتقال سے نہ صرف شمالی مغرب چین کی ایک زبردست شخصیت اٹھ گئی بلکہ حکومت چین کا ایک مفید بازو ٹوٹ گیا۔ حکومت نانکنگ نے ان کے انتقال پر بے حد افسوس ظاہر کیا اور بہت تزک و احتشام سے ان کی تجہیز و تکفین کی لیکن مسلمانان چین ان کی موت پر اب تک روتے ہیں اور ان کی درد انگیز آوازیں، اخبارات کے ذریعے سے ہمارے کانوں میں بھی پہنچتی ہیں۔

۲۔ مذہبی فتنہ

ہندوستانیوں کے لئے یہ تو ایک معمولی سی بات ہے لیکن چین کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے جس کو "مذہبی فتنہ" کہا جا سکے ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ ماقبل عہد میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے درمیان کئی مرتبہ کشمکش ہوئی لیکن وہ سیاسی کشمکش تھی اور مذہب سے اس کو کوئی واسطہ نہ تھا ہاں ۱۹۳۲ء کے ستمبر میں مسلمان چین اور غیر مسلمان چین کے درمیان جو واقعہ پیش آیا، وہ مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ مسلمانان چین احکام شرعی کی پابندی کرتے ہیں اور خصوصاً کھانے پینے کے معاملات میں بہت محتاط ہیں عام چینی مسلمانوں کے سور سے پرہیز کرنے پر بہت تعجب کرتے ہیں چنانچہ بعض اخبارات و رسائل میں ایک دفعہ یہ بحث چھڑی کہ مسلمان سور کا گوشت کیوں نہیں کھاتے؟ بعض لوگوں نے بائبل اور قرآن کی رو سے اس پر بحث کی اور بعض لوگوں نے اسے رسم و رواج قرار دیا لکھنے والوں میں ایک شخص لی ٹز چیانگ نامی تھا اس نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ایک عجیب مضمون لکھا جس میں سوائے انسانیت سوز جملے اور فحش گالی کے اور کچھ نہ تھا اس نے ایک قصہ میون چونگ کے سفرنامہ سے اخذ کیا ہے اور اس قصہ کی رو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسلمان نہ تو اس لئے سور کے گوشت سے پرہیز کرتے ہیں کہ وہ ناپاک ہے اور نہ اس لئے کہ ان کے مذہب میں اس کی ممانعت کی گئی ہے، اور نہ اس لئے کہ ان کے رسم و رواج میں یہ بات چلی آتی ہے بلکہ اس لئے نہیں کھاتے کہ وہ "سور کی اولاد" ہیں۔ اصلی مضمون شنگھائی کے ایک ادبی رسالہ میں جو "نان ہوا" کے نام سے موسوم تھا بعنوان "مسلمان سور کا گوشت کیوں نہیں کھاتے" شائع کیا گیا اس رسالہ کا مدیر محکمہ ریلوے کا ایک اعلیٰ

افسر تھا جس کا کام یہ نہیں کہ لوگوں میں فتنہ اور مذہبی احساس ابھارے، بلکہ یہ کہ تعصب اور فرقہ وارانہ جذبے کو لوگوں کے دل سے دور کرے۔ اس مضمون کی وجہ سے سارے مسلمانوں میں جوش اور ہیجان پھیل گیا۔

لیکن قبل اس کے کہ وہ کوئی سخت کارروائی کریں انھوں نے یہ ضروری سمجھا کہ اس معاملہ کو حکومت کے سامنے پیش کریں اور دیکھیں کہ حکومت اس کی بابت کیا فیصلہ کرتی ہے چنانچہ مسلمانان چین نے ۵ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو جامع پکین میں ایک عام جلسہ کیا جس میں شمالی چین کے آٹھ صوبوں کے نمائندے شریک تھے۔ اس جلسہ کا صدر مالین ای کو بنایا گیا، مالین ای وہ جلیل القدر شخص ہیں جو کسی زمانہ میں حکومت پکین کے وزیر تعلیم رہ چکے ہیں اور بالفعل حکومت نانکنگ کے ایک سرگرم رکن ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریر کے دوران میں ان شرائط کا ذکر کیا جو مسلمانان شنگھائی اور رسالہ "نان ہوا" کے ذمہ دار اشخاص کے درمیان اس معاملہ کا فیصلہ کرنے کے لئے طے پا چکے تھے۔ اس کی نوعیت یہ تھی کہ شنگھائی کے مسلمانوں نے جب اس مضمون کو دیکھا تو وہ فوراً رسالہ نان ہوا کے دفتر میں پہنچے۔ مدیر مسئول موجود نہ تھا، اس کے رفقا نے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے چار شرائط پر مسلمانان شنگھائی سے صلح کرنے کی کوشش کی۔ شرائط یہ تھے۔

۱۔ مضمون کی تردید کی جائے۔
۲۔ مسلمانوں سے معافی مانگ لی جائے۔
۳۔ اس بات کی ضمانت کی جائے کہ آئندہ اس قسم کی انسانیت سوز اور مسلم آزار مضمون نہ شائع کریں گے۔
۴۔ بقیہ کاپیاں جو دفتر میں موجود ہیں نذر آتش کر دی جائیں۔

مسلمانان شنگھائی ان شرائط پر صلح کرنے کو تیار تھے لیکن جب یہ خبر پکین پہنچی تو وہاں کے مسلمان اس سے مطمئن نہ ہوئے انھوں نے ایک جلسہ کر کے "انجمن تحفظ دین" کے نام سے ایک انجمن قائم کی ہزاروں ڈالر چندہ ہو گیا اور صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ چونکہ یہ ایک غیر معمولی توہین ہے اس لئے ہمارے مطالبات بھی غیر معمولی ہونے چاہئیں۔ شنگھائی کے مسلمان جن شرائط پر صلح کرنے کو تیار رہیں وہ ناکافی ہیں ان سے مسلمانوں کا دل ٹھنڈا نہیں ہو سکتا اور نہ ان سے فرزندان توحید کی تاہین ہو سکتی ہے۔ چنانچہ شرائط مذکور مسترد کر دئے گئے اور انجمن تحفظ دین نے مندرجہ ذیل تین ضروری مطالبات حکومت نانکنگ کے سامنے پیش کئے

۱۔ چین ٹسون سنگ کو جو وزیر محکمہ ریلوے ہے، اپنے منصب سے برطرف کر دیا جائے، کیونکہ وہ رسالے کا مدیر ہے۔
۲۔ مضمون نگار ہوی ٹسز چیانگ کو گرفتار کر کے سخت سزا دی جائے۔
۳۔ رسالہ نان ہوا کی اشاعت ہمیشہ کے لئے بند کر دی جائے۔

پیکن کے مسلمانوں نے اخبارات کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ اگر حکومت نے ان مطالبات کو منظور نہ کیا تو اپنے مذہب کی حفاظت کیلئے وہ ہر قسم کی قربانی کریں گے۔ جلسے کے عام فیصلے کے مطابق "انجمن تحفظ دین" نے چار نمائندے دار الحکومت نانکنگ کے پاس بھیجے۔ یہ لوگ ۲۲ اکتوبر کو پیکن سے نانکنگ روانہ ہوئے اور تیسرے دن وہاں پہنچے۔ روانہ ہوتے وقت ایک نمائندے نے اپنی انگلی کے خون سے چینی زبان میں یہ الفاظ لکھے۔ "شمع اسلام کو روشن رکھو" سب نمائندوں نے حلف اٹھایا کہ جب تک حکومت سے ان معقول مطالبات کو نہ منوالیں گے واپس نہ آئیں گے۔

ادھر یہ کاروائی ہو رہی تھی کہ شنگھائی کی انجمن اسلامیہ سے پھر خبر آئی کہ اسی مضمون کو دار الاشاعت "پے شین" (Pch. Shin) نے کتاب کی صورت میں دوبارہ شائع کرایا ہے جب یہ خبر مشہور ہوئی تو مسلمانان شنگھائی۔ پے شین کمپنی کے پاس گئے اور مالکان کمپنی سے انھوں نے مطالبہ کیا کہ کتاب مذکور کی تمام جلدیں جلادی جائیں۔ عین گفتگو کے وقت باہر سے تیس چالیس بدمعاش دوکان میں گھس آئے اور اس کے سامان خراب کرنے لگے۔

پہلے تو ایک معاملہ تھا۔ اب دو معاملے بن گئے۔ کمپنی کا بیان تھا کہ وہ لوگ مسلمان تھے جو دوکان لوٹنے کے لئے آئے تھے۔ امام مسجد شنگھائی کا بیان تھا کہ کمپنی نے اپنے پہلے سے ان بدمعاشوں کو جمع کر کے رکھا تھا اور ان کو ہدایت کی تھی کہ موقع پاکر دوکان میں گھس آئیں اور گڑبڑی کریں آخر یہ معاملہ ہائی کورٹ میں میں پہنچا۔

سب سے آخری اطلاع جو ۲۷ دسمبر ۳۲ء کو ملی ہے یہ ہے کہ چینی مسلمانوں نے مقدمہ جیت لیا اور حکومت نانکنگ نے بھی مسلمانوں کے مطالبات منظور کر لئے۔ ۱۰ نومبر کو حکومت نانکنگ نے اس معاملہ کو مجلس عاملہ کے سامنے پیش کیا۔ بہت غور و خوض کے بعد تمام اراکین اسی فیصلہ پر متفق ہوئے کہ اس فتنہ کو روکنے کے لئے مسلمانوں کے مطالبات منظور کرنے چاہئیں۔ چنانچہ دوسرے دن مجلس عاملہ کی طرف سے یہ اعلان صادر ہوا۔

"مساوات اور مذہبی آزادی حکومت کی آئینی بنیاد ہیں۔ اس اصول کے مطابق حکومت کا فرض ہے کہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کی حفاظت کرے۔ مسلمان، چینی قوم کے اہم جز ہیں انھوں نے حکومت کے کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔ عرصہ سے اہل ملک ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے چلے آئے ہیں ان دنوں میں معلوم ہوا کہ پے شین بک کمپنی اور رسالہ نان ہوا وغیرہ نے ایسے مضامین شائع کئے ہیں جن سے مسلمانوں کی توہین ہوتی ہے اور بدامنی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اس لئے ذمہ دار اشخاص کو سخت سزا دینے کے علاوہ شنگھائی کے صدر بلدیہ (Mayor) کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ رسالہ نان ہوا اور پے شین بک کمپنی کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیں۔ اور تمام اخبارات و رسائل کو متنبہ

کیا جاتا ہے کہ اس کے بعد ہرگز مسلم آزاری اور توہین دین کے مضامین شائع نہ کریں ورنہ قانون کی رو سے سخت گرفت ہو گی۔ عوام جمہوریت کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ ہر ملت و مذہب کے لوگوں کے ساتھ محبت سے پیش آئیں اور ایک دوسر کو بھائی سمجھیں۔ کیونکہ بیرونی دباؤ کے زمانہ میں اندرونی اتحاد سخت ضروری ہے۔ بغیر اس کے جدید چین کی تعمیر نہیں ہو سکتی یہ بھی تاکید کی جاتی ہے کہ کوئی شخص ایسی روش اختیار نہ کرے جس سے فتنہ فساد کا امکان ہو۔

اس اعلان کے مطابق حکومت نانکنگ نے کئی تار دئے۔ ایک صدر بلدیہ شنگھائی کو کہ رسالہ نان ہوا اور پبلشنگ کمپنی کو بند کر دیں دوسرا حاکم ہانگ چاؤ کو کہ لوی شنر چیانگ کو گرفتار کر کے سخت سزا دے۔ تیسرا مسلمانان شنگھائی اور پیکن کو کہ فیصلہ اس طرح ہوا، چین لشون سینگ کو اگرچہ اپنے عہدے سے برطرف نہیں کیا گیا لیکن اخبارات کے ذریعہ سے اس نے مسلمانوں سے معافی مانگ لی۔ اس طریقے سے اس مذہبی فتنہ کا انسداد ہوا۔

۳۔ مدیر نضارۃ الھلال اور امام جامع پیکن کی سیاحت ممالک اسلامیہ میں۔

ایسی حالت میں کہ تمام چین میں سیاسی اضطراب، معاشی بے چینی، اور اجتماعی تخریب و تعمیر کا دور دورہ ہے مسلمانان چین ان ہنگاموں سے غیر متاثر نہیں رہ سکتے تھے۔ زمانہ حاضر کی تیز رو بجلی کی طرح ان لوگوں میں دوڑ رہی ہے اور عہد جدید کے خیالات دریائے متلاطم کی طرح ان کے دلوں میں موجزن ہیں وہ اپنے فضائے محدود میں اس طرح بے چین ہیں جس طرح بلبل قفس میں۔ باد بہار کے قاصد نے نئی زندگی کا پیام لا کر ان کو اس قدر حوصلہ مند کر دیا ہے کہ اب وہ اپنی پستی پر قانع نہیں رہ سکتے وہ ایک نئے ماحول کی تلاش اور جدید فضا کی فکر میں ہیں۔ وہ جامد تھے لیکن اب حرکت کر رہے ہیں وہ بے جان تھے لیکن اب ان میں زندگی پیدا ہو گئی ہے۔ مسلمانان چین کو اپنی پستی کا احساس اور بلندی کی آرزو ہے۔ زمانہ ان کو مجبور کر رہا ہے کہ گوشہ نشینی چھوڑ دیں، اور محدود فضا سے نکل کر کھلی ہوا کی سیر کریں۔ پہلے وہ " سیروا فی الارض فانظروا " کا مطلب نہیں سمجھتے تھے، آج وہ اس آیہ کریمہ پر عمل کر رہے ہیں چینی مسلمانوں کی موجودہ بیداری کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ۱۹۳۱ء کے آخر میں طلبہ کی ایک جماعت اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جامع ازہر میں بھیجی گئی تھی اور ۱۹۳۲ء کے دسمبر میں پھر پانچ طلبہ جو چینگ دا دارالعلوم کے فارغ التحصیل تھے ازہر میں داخل ہو گئے۔

اس سے زیادہ اہم خبر یہ ہے کہ دو چینی علماء آج کل ممالک اسلامیہ کی سیر کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام عبدالرحیم ما سون تینگ۔ اور دوسرے کا نام عبداللہ الصدیق جو ہن ہے۔ اول الذکر جامع پیکن کے امام، چینگ دا دارالعلوم کے ڈائرکٹر، اور انجمن ترقی اسلام کے صدر ہیں، موخر الذکر شعبہ اشاعت متعلق دارالعلوم کے صدر اور نضارۃ الھلال پیکن کے ایڈیٹر ہیں۔

۲۸ نومبر ۱۹۳۳ء کو یہ لوگ پیکن سے روانہ ہوئے۔ آج کل یہ لوگ مصر میں ہوں گے، وہاں دو مہینے تک مقیم

رہیں گے اور بڑے بڑے علما سے مل کر تبادلۂ خیالات کریں گے وہ اپنے پروگرام کے مطابق حج سے پہلے ترکی جائیں گے استنبول اور انگورہ سے شام اور فلسطین ہوتے ہوئے مکہ شریف جائیں گے حج کے بعد مدینہ منورہ اور وہاں سے بغداد آئیں گے پھر ایران و افغانستان ہوتے ہوئے ہندوستان کی سیاحت کریں گے۔ یہ لوگ غالباً اپریل کے آخر یا مئی کے شروع میں دہلی پہنچیں گے۔ اس کے بعد لنکا، جزائر شرق الہند اور جاوا کا ارادہ کریں گے اس بڑے چکر کے بعد پھر وطن واپس جائیں گے۔

ان کی اس سیاحت کی غرض و غایت، مسلمانوں کے تعلیمی، معاشی، اور اجتماعی حالات کا مطالعہ کرنا، اور برادران اسلام سے ربط اور تعلق پیدا کرنا ہے۔ انھوں نے اپنی طرف سے ایک اعلان بھی شائع کیا ہے جو چینی اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہے۔ اس اعلان میں موجودہ چینی مسلمانوں کے حالات پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس لئے اس کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

"آنحضرت کی وفات کے بعد ہی، اسلام کا جھنڈا چین میں داخل ہو چکا تھا۔ اس وقت سے لے کر آج تک چین میں کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جہاں مسلمانوں کا نشان نہ ہو۔ اس زمانہ میں چینی مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ بھی جاتی ہے اور اسلام ہر صوبہ میں پھیل گیا ہے، چین کے دیہات اور قصبے بھی خانۂ خدا سے خالی نہیں مساجد ہزاروں ہیں تقریباً ہر جگہ پائی جاتی ہیں چینی مسلمانوں کا جذبۂ دینی، دوسرے ممالک کے فرزندانِ توحید سے کم نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ جہالت اور بے نظمی کی وجہ سے، وہ ایسے نمایاں رتبے پر نہیں پہنچے جس پر ان کو پہنچنا چاہیئے تھا۔ اس گری ہوئی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے، ہم مندرجہ ذیل دو کام زیادہ اہم اور ضروری سمجھتے ہیں (۱) اسلامی تعلیم کی اشاعت کرنا (۲) مسلمانوں کی تنظیم کرنا۔ ان دو کاموں پر عمل کرنے کے لئے ہم نے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے۔ ہم نے مسلمانوں کی حالت درست کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہماری تحریک ناکام ثابت ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ ہمارا تبلیغی طریقہ بہت خراب تھا۔ اور خود ہم باہر کی اسلامی برادری سے بے تعلق تھے۔

ہماری تعلیمی حالت یہ ہے کہ دینی طلبہ تقریباً اپنی ساری عمر قرآن شریف کی قرأت کرنے میں صرف کر دیتے ہیں، وہ دوسرے علوم و فنون کی طرف مطلقاً متوجہ نہیں ہوتے۔ ان کو یہ خبر نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ ان کی جہالت اور تنگ دلی سے ہمیں کیا کار آمد عمل کی توقع ہو سکتی ہے۔ ان کی تعلیم بالکل زمانہ کے خلاف اور ان کا وجود سوسائٹی کے لئے بیکار ہے، جاہل مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ قدامت پسند جو کچھ کہتے اور کرتے ہیں بالکل شرعی اور اسلامی ہے اور اندھوں کی طرح ان کی پیروی کرتے ہیں۔

اب دیکھئے ان کا نصاب۔ چینی مسلمان اب تک وہی پرانی کتابیں استعمال کرتے ہیں جو کسی زمانہ میں چین میں آئی تھیں۔ ان کے مضامین کے پڑھنے میں بے حد محنت اور بے حساب وقت صرف کرتے ہیں۔ لیکن پڑھنے والے

ایک لفظ بھی نہیں سمجھتے۔ مزید براں ہمارا یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ کتابوں کی کمی اور نایابی کی وجہ سے مسلمان بچوں کو کتاب پڑھنے کے لئے بھی نہیں ملتی۔ ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کیا تعجب کی بات ہے کہ مسلمان چین اب تک تنزل میں گرے ہوئے ہیں۔ خرابی یہ ہے کہ اکثر مسلمان قدیم روش کے لوگ ہیں، وہ جدید اصلاحات کے قبول کرنے کے لئے بہت کم تیار ہوتے ہیں۔ زمانہ گذشتہ میں ہم نے جو اصلاحی تحریکیں جاری کیں ان میں سے کوئی بھی اچھا پھل نہیں لائی ذیل میں ان کاموں کی مختصر کیفیت ہے جس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ کیا مشکلات ہمارے سامنے ہیں، اور کہاں تک ہم اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں۔

۱۔ تنظیم: اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی ترقی کی غرض سے عبدالرحمن وانگ ہافذن کے ارشادات پر ۲۰ سال سے چین میں ایک انجمن "انجمن ترقی اسلام" کے نام سے قائم ہے۔ بیچ بیچ میں اگرچہ یہ انجمن نہایت خراب حالت میں رہی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس کی شاخیں تمام چین میں پھیلی ہوئی ہیں اور صوبہ یون نان اور سی چوان کی شاخیں نہایت سرگرمی کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ نتیجے کے اعتبار سے بھی زیادہ خراب نہیں ہے، لیکن مالی کمزوری نے ترقی نہ ہونے دی۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ یہ انجمن بیس سال سے ہے لیکن کوئی نمایاں کام نہیں کرسکی۔ جو کام ذکر کے قابل ہے، وہ قرآن شریف کا ترجمہ ہے۔ اس کام کے انجام دینے میں، ترجمہ تصحیح اور نظرثانی کرنے میں تین سال صرف ہوچکے ہیں لیکن اب تک اس کی اشاعت نہ ہوسکی۔

۲۔ تعلیم: ہر مسجد میں ایک مکتب ہوتا ہے بڑے شہر اور قصبوں میں مکتب کے علاوہ بڑے پیمانے کے ابتدائی اور ثانوی اسکول ہیں، ان میں سے مشہور پیکن کا چینگ دا نارمل اسکول، شمالی مغربی پبلک اسکول، یون نان کا منگ ڈہ اسلامیہ اسکول، ہونان کا شیہ چین اسلامیہ اسکول، شنگھائی کا اسلامیہ اسکول اور سی چوان کے اسلامیہ اسکول ہیں ان ثانوی مدارس میں دینی تعلیم اور انتظامات کے لحاظ سے اول الذکر تحسین کا مستحق ہے۔ اس کی بنیاد ۱۹۲۵ء میں اس غرض سے پڑی تھی کہ تعلیمی اصلاح کے سلسلہ میں اس سے تجربہ حاصل کیا جائے۔ آٹھ سال کی ان تھک کوشش کے بعد آج ہمیں یہ فخر حاصل ہوا کہ اس وقت ہم اپنے فارغ التحصیل طلبہ میں سے ایسے پانچ طلبہ منتخب کرسکے جو اعلیٰ تعلیم کے واسطے جامع ازہر میں بھیجے جائیں، ہمارا خیال ہے کہ جب تک چین کی اسلامی تعلیم میں اصلاح نہ کی جائے۔ اس کی ترقی کی بہت کم امید ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح اصلاح کی جائے؟ معلمین طرزِ تعلیم، تعلیمی انتظامات اور نظام ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ایسی حالت میں ہم کیا ترقی کرسکتے ہیں۔

۳۔ تبلیغ: چین کے شمال وجنوب میں اس وقت اسلامی رسالے اور اخبارات دس سے زیادہ پائے جاتے ہیں یہ سب چینی مسلمانوں کے لئے ہیں۔ صرف ایک رسالہ نضارۃ الاسلام چین کے باہر جاتا ہے یہ چینی مسلمانوں کا سب سے بہتر رسالہ سمجھا جاتا ہے لیکن اس میں بہت سے نقائص ہیں۔ عربی ٹائپ نہ ہونے سے، ہم عربی میں کچھ نہیں

چھاپ سکتے۔ مضامین، سائز، کاغذ، اور ضخامت کے لحاظ سے یہ ہرگز ممالک اسلامیہ کے اخبارات کا مقابلہ نہیں کرسکتا اپنا مطبع نہ ہونے سے ہم دوسرے کے محتاج ہیں چار سال سے اس کی اشاعت ہورہی ہے، اندرونی مسلمان اس کو پسند کرنے لگے ہیں بیرونی چندہ دینے والے سو سے زیادہ ہیں لیکن اس کی اشاعت اب تک دس ہزار تک نہیں پہنچی، یہ ہمارے نقائص ہیں جن کو ہم بیحد محسوس کرتے ہیں۔

چین میں اسلامی تعلیم پھیلانے اور مسلمانوں کو ایک نظام کے ماتحت منسلک کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کام کرنے والے ہوں، قوت اور ہمت ہو، سرمایہ ہو اور برادران اسلام کی اعانت و ہمدردی ہو، ان کے بغیر ہم منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم ممالک اسلامیہ کی سیاحت اور برادران اسلام کی زیارت کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کی دوستی اور ہمدردی حاصل کریں۔ دنیائے اسلام کا شیرازہ خواہ مادی ہو، خواہ روحانی صرف تعاون اور ہمدردی سے مربوط ہوسکتا ہے۔ اسی سے گوشہ تاریک اور جسم بے جان کو روشنی اور زندگی مل سکتی ہے چینی مسلمانوں کی اصلاحی تحریک کے عہد طفلی میں، اگر عالم اسلام ہمارے ساتھ ہمدردی کرے اور حتی الامکان مدد دے تو اسلام سرزمین چین میں ضرور اچھی طرح پھیلیگا اور توحید کی آواز ضرور فضائے مشرق میں گونجی گی یہ ٹمٹماتا ہوا چراغ سحر ضرور پھر روشن ہوگا اور مسلمانان چین ضرور اس قابل ہوں گے کہ برادران اسلام کے ساتھ دوش بدوش ترقی اور اتحاد کے شاہ راہ پر چل سکیں۔ پھر ہم پیچھے نہ رہیں گے اور نہ آپ ہمیں پیچھے چھوڑ سکیں گے۔ آپ جدھر جائیں گے ہم آپ کے پیچھے پیچھے ہولیں گے۔ اسلام کی رو جس طرف بہے گی اس کی کشتی میں ہم بھی بیٹھیں گے، اسلام کی گود میں زندگی بسر کریں گے اور آخر اسی کی آغوش میں مریں گے۔ والسلام"

یہ تین واقعات ایک ہی سال کے اندر بلکہ چند ہی مہینے کے اندر چینی مسلمانوں میں ظہور پذیر ہوئے ما فوھیانگ کی موت کی وجہ سے خطرہ ہے کہ وہ اصلاحی کام جو شمالی مغربی چین میں شروع کیا گیا تھا اور وہ دفاعی استحکام جو بیرونی اثرات کو روکنے کے لئے ان کے ذمے تھا قائم نہ رہ سکے۔

مذہبی فتنہ کا انسداد کرنے کے لئے، جمہوریت چین نے جو تدبیر اختیار کی ہے وہ اس بات کی شاہد ہے کہ جدید چین کی تعمیر مسلمانوں کے ساتھ اتحاد و اتفاق کے بغیر نہیں ہوسکتی اب حکومت نے مذہب اور مسلمانوں کی حفاظت اپنے سر پر لی ہے اور اس طرح مسلمانوں کو مطمئن کردیا ہے

مسلمانان چین کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ آج دو چینی علماء ممالک اسلامیہ کی زیارت کو نکلے ہیں بلاد اسلام کو یہ شکایت تھی کہ وہ مشرق اقصیٰ کے ایک گوشہ میں چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں، اور باہر نکلنے کی ہمت نہیں کرتے۔ لیکن امام جامع پیکن اور اڈیٹر نضارۃ الھلال اس رسم کو توڑ رہے ہیں، تاکہ اسلام کی وسیع برادری سے روشناس ہوں۔

ممالک غیر

بین الاقوامی قرضے دنیا کے اکثر ممالک میں پچھلے چند سال کے اندر جو سیاسی تغیرات پیدا ہوتے رہے ان کے وجوہ متعدد ہیں لیکن سب سے اہم وجہ ان ممالک کی مالی اور معاشی پریشانیاں ہیں۔ انگلستان میں قومی حکومت کا برسر اقتدار آنا، امریکہ میں صدر ہوور کا منتخب نہ ہو سکنا، جرمنی میں ایک سال کے اندر اندر پانچ مرتبہ عام انتخابات کا ہونا اور کسی مضبوط وزارت کا نہ بن سکنا فرانس میں بار بار حکومت کا بدلنا یہ سب کچھ اسی مالی اور معاشی انتشار کے سبب سے ہوا، اور اس مالی انتشار کے سب سے موثر اسباب میں سے بین الاقوامی قرضوں کا مسئلہ ہے، اس وقت امریکہ اور انگلستان کے درمیان ان قرضوں کے متعلق جو گفتگو ہو رہی ہے۔ ساری دنیا کی معاشی کانفرنس میں اس مسئلہ پر جو فیصلہ کن بحث ہونے والی ہے ان کی وجہ سے ان قرضوں کی مختصر سی تشریح غالباً مفید ثابت ہوگی۔

جنگ عظیم سے جو تغیرات دنیا میں رونما ہوئے ان میں شاید روسی انقلاب سے بھی زیادہ اہم یہ تغیر ہے کہ امریکہ ایک قرضدار ملک سے دنیا کا سب سے بڑا قرض خواہ ملک ہو گیا۔ امریکہ کے جنگ میں شریک ہونے سے پہلے بھی جرمنی کے حریفوں نے آپس میں کچھ قرضے لیے تھے جن کی مجموعی مقدار کوئی اٹھارہ ارب ڈالر تھی۔ اس میں سے چھ ارب ڈالر انگلستان نے اوروں کو قرض دئے تھے۔ امریکہ نے شریک ہوتے ہی نہایت فراخدلی سے اپنے حلیفوں کو قرض دینا شروع کیا یہاں تک کہ جنگ کے بعد تک کوئی سوا دس ارب ڈالر قرض دے ڈالے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ امریکہ نے یہ قرض کچھ نقد کی شکل میں نہیں دیا بلکہ قرض چاہنے والوں کا کھاتہ اپنے بنکوں میں کھول دیا اور ان ملکوں نے امریکہ سے مال خریدنا شروع کر دیا۔ اس طرح امریکہ نے جتنی رقم قرض دی اتنے کا مال قرضداروں نے امریکہ سے خریدا اور ساری رقم امریکہ ہی میں کام آئی۔

جنگ کے بعد ۱۹۲۲ء میں امریکہ نے ان قرضوں کی واپسی کے لئے ایک کمیشن مقرر کر دیا۔ اور اسے ہدایت کی کہ ۲۵ برس میں سب قرض واپس وصول کرلے اور ۴½ فیصدی سالانہ سود لگائے۔ انگلستان نے سب سے پہلے احتجاج کیا کہ واپسی کے لئے یہ مدت بہت کم ہے اور شرح سود بہت زیادہ ہے کمیشن نے انگلستان کے اعتراض کو تسلیم کیا اور طے کیا کہ انگلستان پر جو ۴ ارب ڈالر قرض ہیں وہ ۶۲ برس میں ادا کئے جا سکتے ہیں اور سود کا اوسط کوئی سوا تین فیصدی قرار پایا جس پر اصل اور سود کی مجموعی مقدار کوئی ۱۱ ارب ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد کوئی بیس قرضدار ممالک سے کم و بیش اسی طرح معاملہ ہوا سب میں یہ قرار پایا کہ اصل پورا ادا ہو، اور سود قرضدار کی استعداد دیکھ کر مقرر کیا جائے برطانیہ، پولینڈ، رومانیا، چکوسلواکیا سے تقریباً سوا تین فیصدی سود مقرر ہوا، فرانس کے لئے تقریباً پونے دو فیصدی اور اٹلی کے لئے نصف فی صدی سے بھی کم۔ یوں دس ارب ڈالر کا قرضہ اصل اور سود مل کر ۲۲ ارب ہوتا ہے۔

اس ۲۲ ارب میں سے یکم جنوری ۱۹۳۲ء تک امریکہ کو کل دو ارب ۶۰ کروڑ ڈالر واپس ملے تھے اس میں سے

۳۰ فیصدی کے قریب انگلستان نے ادا کیا تھا (یعنی ایک ارب ۹۰ کروڑ ڈالر) باقی فرانس نے کوئی ۴۰ کروڑ اور اٹلی نے دس کروڑ سے کچھ کم۔

قرضدار حکومتوں کے میزانیوں میں اگر ایک طرف امریکہ کو رقم دادنی تھی تو دوسری طرف جرمنی سے تاوان جنگ کی رقمیں یافتنی تھیں۔ اس تاوان پر بھی بڑے بڑے جھگڑے جرمنی سے رہے رور کے علاقہ پر قبضہ کیا گیا مگر جرمن بنک پر جنرل ڈاز کی تجویز کے بموجب پردیسیوں کی نگرانی شروع ہوئی۔ پھر اس سرکاری بنک کی جگہ ایک نیا بین الاقوامی بنک اس کام کے لئے قائم ہوا۔ ۱۹۲۱ء میں تاوان کی رقم ۳۲ ارب ڈالر مقرر ہوئی تھی اور اندازاً سوا پانچ ارب ڈالر جرمنی ادا بھی کر چکا تھا۔

۱۹۳۰ء میں عام کساد بازاری کا اثر جرمنی پر ایسا ہوا کہ تاوان کی ادائیگی ناممکن ہوگئی۔ ڈر تھا کہ تاوان کی رقم نہ ملی اور امریکہ کا قرضہ ادا کرنا پڑا تو نہ جانے کتنی حکومتوں کا دیوالہ نکل جائے گا۔ چنانچہ جون ۱۹۳۱ء میں امریکہ کے صدر ہوور نے یہ تجویز کی کہ امریکہ اپنے قرض کی قسط ملتوی کردے اور یورپی حکومتیں جرمنی سے تاوان کی قسط ملتوی کردیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اسی التوا کے زمانہ میں اس بین الاقوامی بنک نے جو تاوان کی رقموں کی ادائیگی کے لئے قائم ہوا تھا جرمنی کی درخواست پر ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جس نے تمام حکومتوں کو معاملات کی نزاکت کی طرف متوجہ کیا اور جتلایا کہ جرمنی کا مسئلہ تنہا ایک ملک کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ تمام دنیا کی مالی تباہی کا بڑا سبب ہے۔ چنانچہ جون ۱۹۳۲ء میں لوزان کانفرنس شروع ہوئی۔ کانفرنس نے فوراً واجب الادا قسطوں کے التوا کا فیصلہ کیا اور ۳۲ ارب ڈالر کا تاوان جو ۱۹۲۱ء میں مقرر ہوا تھا گھٹا کر کل ۷۱ کروڑ ڈالر رکھا گیا! لیکن اس سارے تصفیہ کے ساتھ یہ شرط لگی ہوئی تھی کہ تاوان معاف کرنے والے ممالک پر امریکہ کا جو قرض ہے اس کا بھی مناسب تصفیہ ہو جائے۔

چنانچہ اب اسی تصفیہ کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ انگلستان اور فرانس دونوں نے گذشتہ نومبر میں امریکہ سے درخواست کی کہ قرضہ کے مسئلہ پر نظر ثانی کی جائے اور فیصلہ تک قسطیں ملتوی رکھی جائیں۔ امریکہ نے التوا کی تجویز منظور نہ کی سو انگلستان نے قسط ادا کردی۔ لیکن فرانس اور کئی دوسرے ملک واجب الادا قسط ادا نہ کرسکے۔ عنقریب انگلستان اور امریکہ میں اس اہم مسئلہ پر گفت و شنید شروع ہونے والی ہے۔

امریکہ کے لئے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو اصرار کرے کہ قرض پائی پائی چکایا جائے یا قرض معاف کرے یا کم۔ پہلی صورت تقریباً ناممکن ہے۔ سابقہ ایسے قرضداروں سے ہے کہ اگر وہ ادا نہ کریں تو جنگ کرکے ان سے وصول نہیں کیا جاسکتا۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ قرضدار یہ قرض کہاں تک اور کس طرح ادا کرسکتے ہیں اور اس پر اصرار کرنا خود امریکہ کے لئے بھی مفید ہے یا نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ قرضداروں میں سے سوا دو ایک کے باقی قرض ادا نہیں کرسکتے۔ قرض کی ادائیگی پر اصرار کرنا ان ملکوں کو صاف انکار پر مجبور کرنا ہے جس سے ان ممالک کا اعتبار دنیا

ہیں اٹھ جائے گا اور خود امریکہ سے تجارتی تعلقات ختم ہو جائیں گے جو امریکی تجارت کیلئے سخت مضر ہوگا۔

دوسری بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ قرضدار ملک اگر اپنا قرضہ ادا کر سکتے ہیں تو اجناس اور اسباب تجارت کی شکل ہی میں ادا کر سکتے ہیں اس لئے کہ دنیا میں جتنا سونا ہے اس سے تو قرضہ جنگ کا بس نصف ادا ہو سکتا ہے قرضہ جو ہو وہ کوئی ۲۲ ارب ڈالر کا ہے اور دنیا کے ۵۴ اہم ممالک کے بنکوں میں سونا کل گیارہ ارب ڈالر کا ہے اور اس میں سے چار ارب کا سونا خود امریکہ میں ہے! اگر قرضہ اسباب تجارت کی شکل میں ادا کیا جائے تو امریکہ کو اپنی سیاست تجارتی کا رخ بالکل بدلنا ہوگا۔ قرض جب ہی ادا ہو سکے گا کہ امریکہ میں دوسرے ممالک سے درآمد زیادہ ہو اور خود امریکہ سے کم مال باہر جائے اس پر امریکی صنعت جس نے پچھلے دنوں محاصل درآمد کو بڑھوا کر اپنے ملک کی منڈی کو اپنے لئے محفوظ کرلیا ہے کب رضامند ہو گی اور اگر سیاست کو یکایک بدلا تو غالباً صنعت، تجارت، زراعت سب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جائے گا۔ غرض قرض وصول کرنے کی خواہش اور وصولیابی کی نہا امکانی شکل میں خود اپنی معاشی تباہی کا اندیشہ امریکی مدبرین و معاشیئین کے لئے ایک "دوگونہ عذاب" ہے جس سے نکلنے کی شاید یہی صورت ممکن ہے کہ قرض سے ہاتھ دھویا جائے اور اس کے عوض کچھ تجارتی رعایتیں حاصل کرلی جائیں۔

جرمنی اور انقلاب | جرمنی میں بالآخر ہٹلر کو صدر اعظم بنایا ہی گیا! اس واقعہ کی اہمیت کا پورا پورا اندازہ لگانا مشکل ہے اس میں صرف ایک جوشیلے 'ارادے کے پکے' چالاک اور لوگوں کی کمزوریوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے والے سیاسی قائد کی کامیابی کا قصہ ہی پوشیدہ نہیں بلکہ جرمنی کی سیاسی اور مالی پریشانیوں، فکر و عمل کے انتشار اور انتہائے مایوسی میں ہر تدبیر کو آزمانے کی خواہش کی حسرتناک داستان بھی مضمر ہے اور شاید جرمن زندگی میں عنقریب کسی بنیادی تغیر کی پیشین گوئی بھی۔

جرمنی کی مصیبت ہٹلر کی قوت ہے شکست کی تلخی، کساد بازاری کی فلاکت، مزدوروں کی بدحالی، متوسط الحال لوگوں کی تباہی ان سب نے ہٹلر کو جو اصلاً جرمن بھی نہیں ایک عظیم الشان سیاسی تحریک کا علمبردار بنا دیا ہے اس کی جماعت کا نام ہی اس کی کامیابی کی تشریح کر دیتا ہے۔ یہ جس جماعت کا سردار ہے اس کا نام اس نے رکھا ہے "قومی اشتراکی جرمن مزدوروں کی جماعت" 'قومی' اور 'جرمن' سے یہ ان سب کو اپنی طرف بلاتا ہے جو صلحنامہ ورسائی کو جرمن قوم کی غلامی کا پٹہ جانتے ہیں، 'اشتراکی' اور 'مزدور' سے ان تمام طبقوں کو جو موجودہ نظام معاشی سے غیر مطمئن ہیں۔ اور سیاسی جوڑ توڑ کی عجیب داستان ہے کہ بیزار اور غیر مطمئن لوگوں کی اس بددل افراد کی جماعت کو کس کس نے مدد دی۔ بڑے بڑے کارخانے والوں نے انھیں ابھارا تاکہ اشتراکی جماعت کو کمزور کریں، قوم پرست زمینداروں نے انھیں سہارا دیا، سب نے اس نیت سے کہ اپنا کام نکالیں اور آخر میں ہوا یہ کہ سب دھرے گئے

اور کم سے کم اس وقت تو یہ جماعت برسرِ اقتدار آ ہی گئی۔ اور فوجی سپہ سالاروں، زمینداروں اور کارخانہ والوں کی یہ چال کہ ہٹلر کی قوت سے کام لے کر اپنی حکومت قائم کریں پوری طرح نہ چل سکی وجہ صاف ہے کہ باوجود مختلف باہمی میں انتہائی اختلافات کے یہ بات مشترک ہے کہ ساری جرمن قوم کا کم و بیش بڑا حصہ کسی نہ کسی طرح اشتراکی مسلک کا حامی ہے۔ ہٹلر کی قومی اشتراکی جماعت، اشتراکی جمہوری جماعت، اور کمونسٹ جماعت سب اشتراکی ہیں یہ آپس میں لڑیں جھگڑیں، پارلیمنٹی حکومت ان کے اختلافات کی وجہ سے ناممکن ہی کیوں نہ ہو جائے۔ مگر یہ آسانی سے جنرلوں، زمینداروں اور کارخانے والوں کی حکومت کو گوارا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ فان پاپن اور فان شلائشر کی حکومتیں زیادہ دن قایم نہ رہ سکیں اور بالآخر ہٹلر کو صدر اعظم بنا دیا گیا۔

لیکن ابھی جرمنی کی سیاسی گتھی سلجھی نہیں ہے۔ ہٹلر کی جماعت اگر کچھ عرصہ تک برسرِ اقتدار رہ گئی تو معتبر مبصروں کے نزدیک اس کا پورا پورا اندیشہ ہے کہ وہ اپنے دعووں کو پورا نہ کر سکے گی اور اس ناکامی کے بعد جرمنی میں کمونسٹ جماعت کے برسرِ اقتدار آنے کے امکانات بہت قوی ہو جائیں گے۔ اس وقت گویا اصل مقابلہ ہٹلر اور کمونسٹ جماعت کا ہے۔ چنانچہ قلمدانِ وزارت پاتے ہی ہٹلر نے کمونسٹ جماعت کو ختم کر دینے کی کارروائیاں شروع کر دی ہیں۔ اگر ہٹلر اس میں کامیاب ہوا، جس کے امکانات بہت قوی تو نہیں تو جرمنی میں گویا اٹلی کا فاشستی انقلاب ہوگا اور ہٹلر جرمنی کا مسولینی بن جائے گا۔ اگر اس میں ناکامی ہوئی تو کمونسٹ انقلاب کے لئے راستہ صاف ہو جائے گا۔

ہندوستان

تیسری اور آخری گول میز کانفرنس بھی ختم ہو گئی، توقع تھی کہ ہندوستان کے آئندہ دستورِ اساسی کا مجوزہ کہ آخری صورت میں ہمارے سامنے آجائے گا مگر ابھی انتظار کی گھڑیاں باقی ہیں۔ پہلے وھائٹ پیپر کا انتظار پھر جوائنٹ سلکٹ کمیٹی کی رپورٹ کا انتظار اور سب سے آخر میں پارلمنٹ کی منظوری کا انتظار! ان مراحل کو طے کرنے میں کتنی مدت صرف ہوگی؟ اس کا جواب کوئی نہیں دے سکتا۔ اگر ہندوستان کی سیاسی فضا میں سکون ہو گیا کہ جدید دستور پر سنجیدگی سے غور کر کے فکر یہ کے ساتھ اس کو قبول کر لیا جائے تو چند مہینوں میں تمام آئینی مراحل طے ہو جائیں گے، ورنہ جیسے اب تک مناسب موقعہ کی تلاش میں حکومت نے کئی لاکھ روپیہ اور کئی سال صرف کئے ہیں آئندہ بھی اس مسئلے کو تعویق میں ڈالنے کے لئے انگلستان کے مدبرین کوئی نہ کوئی دوسری تدبیر نکال لیں گے، اور ممکن ہے کہ گول میز کانفرنس کی بجائے صلح کانفرنس کے نام سے تضیع وقت کی کوئی صورت

نکل آئے۔

گذشتہ تین کانفرنسوں میں تمام مسائل مہمہ کی چھان بین کرکے حکومت جن نتائج پر پہنچی ہے اس کا کچھ اندازہ کانفرنس کی سب کمیٹیوں کی مختلف رپورٹوں سے کیا جاسکتا ہے اور خیال یہ ہے کہ جدید دستور انھیں کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا جائے گا۔

پہلی گول میز کانفرنس کے اختتام پر تین بنیادی باتیں طے ہوگئی تھیں کہ (۱) صوبجاتی خودمختاری دی جائے۔ (۲) ذمہ دار وفاقی نظام حکومت قائم کیا جائے۔ (۳) اور دستور اساسی میں ایسے تحفظات رکھے جائیں جو ہندوستان کے لئے مفید ہوں۔

جہاں تک صوبجاتی خودمختاری کا تعلق ہے، اتفاق رائے سے یہ مسئلہ پہلے ہی طے ہوگیا تھا لیکن دوسرے اور تیسرے مسئلے کو طے کرنے میں بیشمار دقتیں تھیں، اور ان مسائل پر دوسری اور تیسری کانفرنس میں بحث ومباحثہ اور تبادلۂ خیالات بہت کچھ ہوا، لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مسائل طے ہوگئے۔ وفاقی حکومت میں ریاستوں کی شرکت کا مسئلہ ابھی تک آخری طور پر طے شدہ نہیں کہا جاسکتا۔ اور وفاقی حکومت کے اختیارات اور تحفظات کے متعلق وزیر ہند نے تیسری کانفرنس میں جو اظہار رائے کیا اور سب کمیٹیوں میں وقتاً فوقتاً جو مباحثے ہوئے ان سب کو پیش نظر رکھ کر کسی طرح یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجوزہ تحفظات ذمہ دار حکومت ہندوستان کے مفاد کے لئے تجویز کئے گئے ہیں یا ایک غیر ذمہ دار شخصی حکومت کو قائم کرنے کے لئے۔

تحفظات کے متعلق تجویز یہ ہے کہ حکومت کے تمام اختیارات عاملہ (Executive powers) اصولاً تاج انگلستان کو حاصل ہوں گے اور عملاً بادشاہ کے نمائندے گورنر جنرل کو مرکز میں اور گورنران کو صوبوں میں۔ مرکزی حکومت دو حصوں میں تقسیم ہوگی، ایک کا تعلق براہ راست گورنر جنرل سے ہوگا۔ مثلاً معاملات خارجہ فوج اور کلیسا کا انتظام۔ دوسرا حصہ ذمہ دار وزرا کے متعلق ہوگا لیکن یہاں بھی گورنر جنرل کو خاص اختیارات ہوں گے کہ اگر۔

۱۔ امن عامہ میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو۔ یا

۲۔ اقلیت کا مفاد خطرے میں ہو یا

۳۔ سرکاری ملازموں کے حقوق پامال کئے جائیں یا

۴۔ دیسی ریاستوں کی خود مختاری اور حقوق کے حفاظت کی ضرورت ہو یا
۵۔ تجارتی معاملات میں غیر ملکیوں کے ساتھ کوئی ناانصافی کی جائے۔
تو وائسرائے کو حق ہوگا کہ وزراء کے مشورہ کے بغیر اپنے اختیارات تیزی سے کام لیکر جو کارروائی چاہے کرے

جہاں تک وفاقی مجلس قانون ساز کا تعلق ہے گورنر جنرل کو یہاں بھی خاص اختیارات حاصل ہونگے
۱۔ مجلس کے سامنے پیش ہونیوالے مسودات قانون کو جب چاہے روک سکتا ہے یا اگر منظور ہو چکے ہوں تو ان کو بھی مسترد کر سکتا ہے۔
۲۔ وفاقی مجلس اگر کسی مسئلہ کے خلاف فیصلہ کردے اور گورنر جنرل چاہے تو اسکے علی الرغم ضروری کارروائی کر سکتا ہے،
۳۔ اگر گورنر جنرل چاہے تو کسی مسئلہ پر بحث و مباحثہ کو روک سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ
یہ تمام اختیارات ایک شخص کو تفویض کرنے کے بعد کہا جاتا ہے کہ کوئی سمجھدار گورنر جنرل بلا ضرورت ان اختیارات کا استعمال نہیں کرے گا اور گورنر جنرل کو ملک معظم کی طرف سے یہ ہدایت بھی کردی جائے گی کہ ہر معاملہ میں وزراء سے ضرور مشورہ کیا جائے۔ اس قسم کی ہدایات موجودہ دستور کے متعلق بھی کی گئی تھیں اور موجودہ اصلاحات کا منشا بھی یہی بیان کیا گیا تھا کہ گو قانوناً تمام اختیارات گورنر اور گورنر جنرل یا مجلس عاملہ کے پاس رہیں گے مگر عملاً وزرا اور مجالس قانون ساز کے مشورہ اور رائے کی پیروی کیجائے گی لیکن گذشتہ دس سال کے تجربہ کے بعد آئندہ کے متعلق اس قسم کے وعدے بے معنی معلوم ہوتے ہیں۔
فوج کے متعلق جو تحفظات تجویز کئے گئے ہیں ان پر نظر ڈالنے سے آئندہ دستور کے متعلق کوئی غلط فہمی باقی نہیں رہتی۔ وزیر فوج کا تقرر گورنر جنرل اپنی رائے سے کیا کرے گا، فوجی مصارف کے متعلق وائسرائے کے مشیر اور وفاقی وزراء کے درمیان میزانیہ پیش ہونے سے قبل مشورہ ہوگا لیکن فوجی مصارف پر وفاقی مجلس کو رائے دینے کا کوئی حق نہ ہوگا۔ ہندوستان کی فوج کو 'ہندوستانی' بنانے کے لئے بھی کوئی مدت نہیں معین کی گئی ہے اور نہ یہ مطالبہ تسلیم کیا گیا ہے۔ بغیر وفاقی مجلس کی رائے کے ہندوستانی افواج سے بیرون ہند کام نہ لیا جائے گا۔ گویا فوج پر آئندہ بھی ذمہ دار وفاقی حکومت کو کسی قسم کا اختیار حاصل نہ ہوگا۔
دنیا میں کوئی ذمہ دار نظام حکومت کامیابی سے اس وقت تک نہیں چل سکتا جب تک کہ حکومت کی مالیات مستحکم بنیادوں پر قائم نہ کی جائیں۔ چنانچہ اس حقیقت سے دوچار ہو کر حکومت نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ جدید دستور کے نفاذ سے قبل 'ریزرو بنک' ہندوستان میں قائم ہونا ضروری ہے لیکن 'ریزرو بنک' کے قیام کیلئے مندرجہ ذیل چار شرائط کا پورا ہونا بھی ضروری قرار دیا گیا ہے،

۱۔ مرکزی حکومت کے میزانیہ میں قابل اطمینان توازن قائم ہو جائے۔
۲۔ حکومت ہند کے کم مدت والے تمام قرضہ جات میں معتد بہ کمی ہو جائے۔
۳۔ معقول سرمایہ محفوظ جمع ہو جائے۔
۴۔ ہندوستان کی درآمد اور برآمد کا فرق حسب سابق قائم ہو جائے۔

بحالات موجودہ ان میں سے کوئی ایک شرط بھی قابل اطمینان طریقہ پر پوری نہیں ہو سکتی۔ میزانیہ میں صحیح اور حقیقی توازن قائم کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ فوجی مصارف میں معقول تخفیف نہ کیجائے۔ اور حکومت نہ اب اس کے لئے تیار ہے نہ آئندہ فوجی انتظام میں ہندوستان کو دخل دینے کی اجازت دینا چاہتی ہے۔

سونے کی برآمد برابر ملک سے جاری ہے، اور ذخیرہ جمع کرنے کی اسوقت تک کوئی تدبیر نہیں اختیار کی گئی ہے اوٹاوہ کے معاہدہ کے بعد ولایتی مال کی درآمد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، اور یہ یقینی نہیں کہ برآمد اور درآمد کا فرق حسب سابق قائم ہو جائے گا۔ صرف ایک شرط البتہ پوری کرنے کی کوشش حکومت نے شروع کی ہے اور وہ دوسری شرط ہے۔ غرض مجموعی حیثیت سے یہ توقع نہیں قائم کی جاسکتی کہ رزرو بنک مستقبل قریب میں قائم ہو جائے گا۔ اور چونکہ رزرو بنک کے قیام پر وفاقی حکومت کا قیام موقوف قرار دیا گیا ہے اس لئے اندیشہ ہے کہ اس کو غالباً خدا حافظ کہنا پڑے گا۔ لیکن یہ جھگڑا یہیں ختم نہیں ہوتا۔ ہندوستان کی معتدل سے معتدل جماعتوں نے بھی حکومت پر یہ واضح کر دیا ہے کہ صوبجاتی خود مختاری اور ذمہ دار وفاقی حکومت ساتھ ساتھ قائم ہونا چاہیئے ورنہ وہ جدید دستور سے کوئی تعلق نہ رکھیں گے

کانگریس کے مطالبات ناقابل عمل قرار دے کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دئے گئے تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ معتدل جماعتوں کے مطالبات کا کیا حشر ہوتا ہے۔

شذرات

رمضان کا مبارک مہینہ گذر گیا اور اس کے خاتمے پر عید کی گہما گہمی بھی زیادہ عرصے قائم نہ رہی۔ خدا نے جسے توفیق دی اس نے اس مہینے میں اپنی آخرت کا سامان مہیا کیا اور جسے وسعت دی اس نے اس کے خاتمے پر دل کھول کر خوشی منائی۔ جامعہ کے اساتذہ اور طلبا نے بھی اپنی توفیق اور وسعت کے مطابق دونوں قسم کی مصروفیات میں حصہ لیا اور اپنی سنت دیرینہ کو قائم رکھا۔ رمضان میں افطار، تراویح اور سحرگہی کی دلچسپیاں رہیں اور عید کے دن باہمی ملاقات اور مبارکباد کی۔ پھر دوسرے دن ٹر بھی منائی گئی۔ اسی سلسلے میں روایات قدیمہ کے مطابق ایک دعوت بھی ہوئی جس میں نہ صرف تمام اساتذہ اور طلبہ شریک تھے بلکہ شہر دہلی سے بھی بعض "ہمدردان جامعہ" مدعو کئے گئے تھے۔ اس سال یہ جلسہ پچھلے سالوں سے نسبتاً زیادہ کامیاب رہا اور جو لوگ باہر سے آئے تھے، امید ہے کہ وہ اچھے تاثرات لیکر واپس گئے ہوں گے۔

عید کارڈ بھیجنے کی رسم اب ہندوستان میں کوئی جدت کی بات نہیں رہی ہے اور بیشتر کارڈ تو پستی مذاق کا ایسا تکلف دہ نمونہ ہوتے ہیں کہ خوش مذاق لوگ اس رسم سے ہی بیزار نظر آتے ہیں پھر اس میں نمایش کا جو پہلو ہے اس سے سنجیدہ لوگوں کو اس سے نفرت سی ہوگئی ہے۔ یہ سب کچھ سہی لیکن اگر اس رسم کو خوش مذاقی اور خلوص کے ساتھ ادا کیا جائے تو اس میں نہ صرف طرفین کی فرحت کا سامان ہے بلکہ باہمی تعلقات کی استواری کا بھی اسی نکتے کو مد نظر رکھ کر جامعہ نے اس سال عید کے موقعے پر اپنے 'ہمدردوں' کی خدمت میں ایک عیدی "پیغام عمل" کے نام سے بھیجی تھی۔ ایک کارڈ تو ضرور تھا لیکن نہ تو وہ رنگین تھا اور نہ اس میں بہت سے گل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ چند اشعار تھے جن میں عمل کی دعوت دی گئی تھی اور اس خوشی کے موقعے پر یہ یاد دلانے کی جرأت کی گئی تھی کہ انسان کی زندگی کا مقصد عمل ہے اور وہ بھی نیک عمل۔ امید ہے کہ یہ 'بدعت' ارباب ذوق کو پسند آئی ہوگی اور انھوں نے اس کارڈ کو 'یک نگاہ غلط انداز' سے زیادہ کا سزاوار پایا ہوگا۔

اس سلسلے میں ہمیں ایک غلطی کا اعتراف اور معذرت کا اظہار بھی کرنا ہے۔ اس کارڈ پر جو اشعار لکھے گئے تھے وہ حضرت تمر میرٹھی کے ہیں۔ ارادتاً نہیں بلکہ سہواً ان کا نام اس پر درج نہ ہو سکا۔ ہمیں اپنی اس غلطی پر سخت ندامت ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ حضرت تمر ہمارے اس جرم کو 'جرم عمد' نہ قرار دیں گے بلکہ سہو سمجھ کر معاف فرمائیں گے۔

ہمدردانِ جامعہ کا حلقہ وسیع کرنے کی جو تحریک جامعہ نے چند ماہ سے شروع کی ہے اس میں بحمد اللہ حسب توقع کامیابی ہو رہی ہے اور ملک کے ہر حصے سے تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس تحریک کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔ اگر یہ رفتار قائم رہی تو ہمیں امید ہے کہ بہت جلد ہماری مالی مشکلات ختم ہو جائیں گی اور ہم سکون و اطمینان سے اپنی تعمیری تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں مشغول ہو جائیں گے مگر اس خوش آیند صورت حال کے لئے جو شرط ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے ہمدرد صرف فوری جوش کی نمائش نہ کریں بلکہ جس رقم کا انھوں نے وعدہ کیا ہے اس کی ادائگی وقت پر اور پابندی سے کرتے رہیں۔ مسلمانوں پر یہ اعتراض عام طور سے کیا جاتا ہے کہ ان میں جم کر کام کرنے کی صلاحیت نہیں۔ غیرت اور حمیت ان میں کافی ہے اور اپنی زبوں حالی کا احساس بھی مگر چاہتے یہ ہیں کہ ان کی تمام خرابیاں ایک آن میں رفع ہو جائیں۔ عمل پیہم سے وہ گھبراتے ہیں اور دیر طلب کاموں کے قریب نہیں جاتے۔ جامعہ نے جس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے اس کے نتائج کا اندازہ چند دنوں یا چند مہینوں میں نہیں ہو سکتا اس لئے ہم اپنے ہمدردوں سے درخواست کرتے ہیں کہ اگر انھوں نے اس صبر آزما کام میں ہمارا ہاتھ بٹانے کی زحمت گوارا کی ہے تو ذرا صبر اور استقامت سے بھی کام لیں اور ہمیں منجدھار میں چھوڑ کر الگ نہ ہو جائیں ہم مشکلات سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا ناپائدار کامیابی سے کہ یہ ہمتوں کو پست اور ارادوں کو متزلزل کر دیتی ہے۔

اس مہینے کے رسالے میں ایک مضمون 'دارالمصنفین' سے متعلق شائع ہو رہا ہے۔ یہ ادارہ تعارف کا محتاج نہیں گذشتہ بیس سال میں دارالمصنفین نے جو خدمت علوم اسلامی کی خصوصًا اور اردو زبان کی عمومًا کی ہے وہ بھی محتاج تشریح نہیں۔ لیکن ہماری قوم کی علم دوستی کا یہ حال ہے کہ باوجود اتنی خدمات کے بھی یہ ادارہ مالی مشکلات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ کاؤنسل کی دو ایک نشستوں اور حکومت کی چند ملازمتوں کے لئے طوفان برپا کرنے والے مسلمان تو آپ کو ہندوستان کے ہر گوشے میں ملجائیں گے مگر علوم اسلامیہ کے زندہ رکھنے کی اس گرانقدر کوشش میں مدد کرنے والے ڈھونڈھنے سے بھی چند ہی نظر آئیں گے

دیکھئے یہ صورت حالات کب بدلتی ہے اور ہماری ملت کی نگاہیں چمکتے ہوئے سنگریزوں سے ہٹ کر مدہم رنگ والے قیمتی جواہرات پر کب جمتی ہے۔ آخر میں ہم دارالمصنفین کے ارباب حل و عقد کی خدمت میں ایک مخلصانہ مشورہ بھی پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتے اور وہ یہ ہے کہ زمانے کی ضروریات آجکل بہت سرعت سے بدلتی جا رہی ہیں اور اگر اس دور میں اصلاح اور تاثیر کی خواہش ہے تو علاج کا طریقہ بھی بدلنا چاہئے۔

ز خاک تا بہ فلک ہر چہ ہست رہ پیماست
قدم کشائے کہ رفتار کارواں تیز است

جامعہ

زیرادارت

مولانا اسلم جیراجپوری　　ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۲	بابتہ ماہ مارچ سنہ ۲۳ء	نمبر ۳

فہرست مضامین　　صفحہ

(محمد مجیب بی اے آکسن پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ قرولباغ سے شائع کیا)

روح تہذیب

تہذیب کا ایک نظریہ وہ ہے جو مذہب اور اخلاق کی تعلیم سے متاثر ہو کر ان لوگوں نے پیش کیا ہے جو انسانی زندگی میں اخلاقی قدروں کو مقدم اہمیت دیتے ہیں اور انسان کی اخلاقی اور مذہبی سیرت کو پختہ اور مستحکم بنانا چاہتے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق سیرت انسانی کی تہذیب کے لیے اس قسم کی صفات لازم ہیں جیسے صداقت، ایمانداری، عقیدے کی پختگی، ایثار اور خلوص۔ اگر ان کے مطمح نظر کو ایک لفظ میں ادا کیا جا سکے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ انسان کو مجاہد بنانا چاہتے ہیں۔ جو ایمان اور عقیدے کا پکا ہو، شکوک و شبہات سے محفوظ ہو۔ اپنے عقائد پر سختی سے عامل ہو اور ان کی اشاعت و تبلیغ کے لیے ہر قسم کے ایثار اور قربانی کے لیے تیار ہو۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ تمام لوگ جو مذہبی ہونے کا یا مذہبی سرگردگی کا دعویٰ کرتے ہیں ان اوصاف سے متصف ہوتے ہیں یا ان سب کی تائید کرتے ہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ دنیا کی [illegible] مذہب کی تعلیم کے اثر سے بہت سے ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے ان صفات کا اظہار [illegible] جریدۂ عالم پر اپنا سکۂ دوام ثبت کر دیا ہے۔

تہذیب کا دوسرا نظریہ ان لوگوں کا ہے جو انسانی زندگی کے اجتماعی اور تمدنی پہلو کو [illegible] سمجھتے ہیں اور اس کے معاشرتی تعلقات کی اہمیت پر زور دینا چاہتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے باہمی میل جول، داد و ستد، مراسم اور تعلقات میں لطف اور خوشگواری پیدا کریں۔ اس معنی میں مہذب شخص وہ کہلاتا ہے جس کو آداب محفل سے بخوبی واقفیت ہو، لوگوں کے ساتھ شائستگی اور مروت سے پیش آئے، ان کے جذبات اور احساسات کو ٹھیس نہ لگائے اور کم از کم ظاہراً ان کا احترام کرے۔ اس سے ان کی مراد صرف اتنی ہی نہیں کہ روزمرہ کے میل ملاقات میں ناگواری پیدا نہ ہو بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ بحیثیت ایک معاشرتی فرد کے انسان اپنے حقوق و فرائض کو پہچانے اور اپنے اقوال و اعمال کی حدود سے واقف ہو کر زندگی بسر کرے۔ جو لوگ اس کا خیال نہیں کرتے وہ نصرف

دوسروں کو تکلیف پہنچاتے ہیں بلکہ انجام کار خود بھی زک اٹھاتے ہیں۔

تہذیب کا تیسرا مفہوم جو صدیوں تک تعلیم کی بحثوں اور تعلیم کے عمل پر مسلط رہا ہے یہ ہے کہ [illegible]
میں بہت سی قوتیں اور صلاحیتیں ایسی ہیں جو تربیت کی محتاج اور اظہار کے لئے بے چین ہیں۔ ان [illegible]
قدر مستقل ہے خصوصاً ان قوتوں کی جن کا تعلق ادب اور فنون لطیفہ کی تحصیل اور تخلیق و تحسین [illegible]
سے۔ تہذیب یافتہ ہونے کے معنی ہیں ان قوتوں کی تربیت اور اظہار۔ انسان کی [illegible]
حیوانی خواہشات تک محدود نہیں بلکہ اس کو تلاش حق اور مشاہدۂ جمال کی کاوش بھی [illegible]
اور یہی وہ چیز ہے جو اس کو حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے کیٹس کے لئے ہر حسین مرقع مسرت دائمی کا سرمایہ
دار تھا۔ اسی کی طرح ہر تہذیب یافتہ انسان میں یہ صلاحیت ہونی چاہیئے کہ وہ حسین مناظر اور [illegible]
لطف اندوز ہو سکے۔ اس میں حسن شناسی کی قابلیت ہو۔ وہ ادب، موسیقی، مصوری اور شاعری کی
تخلیق و تحسین کا ذوق رکھتا ہو۔ اس مفہوم کے مطابق آرٹسٹ کے انہماک میں ہی تہذیب کی [illegible]
نقطۂ آغاز ہے اور آرٹ کی نیرنگیوں میں ایک مہذب انسان کے لئے زندگی کا مشغلہ موجود [illegible]
کام، محنت، مزدوری، دستکاری وغیرہ جن کے ذریعہ عام لوگ اپنی روزی کماتے ہو [illegible]
حقیر اور کم درجے کے مشاغل ہیں جن کو نہ صرف یہ کہ تہذیب سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ وہ [illegible]
تہذیب حاصل کرنے میں مانع ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مدت تک بلکہ اب بھی آزاد یا لبرل تعلیم
سے دماغی تعلیم یا فنون لطیفہ کی تعلیم مراد لی جاتی ہے اور جسمانی محنت اور مشاغل کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔

ان تینوں نظریوں میں سے ہر ایک میں بعض قابل قدر عناصر ایسے ہیں جن [illegible]
سے تہذیب نفس کی تعمیر و تکمیل ہوتی ہے لیکن ان میں سے کوئی بجائے خود اس کے پورے [illegible]
صحیح مفہوم پر حاوی نہیں بلکہ اگر ان میں سے کسی ایک پر بھی شدت اور مبالغہ کے [illegible]
عمل کیا جائے تو انسان کی تہذیب و تربیت ناقص رہ جائے گی۔

اگر مجھ سے کہا جائے کہ تم مکمل تہذیب یافتہ انسان کی تصویر پیش کرو تو اس [illegible]
خال بنانے میں شاید سب سے پہلے میں، وا داری کی صفت کو پیش کروں۔ ممکن ہے آج کل [illegible]

جب ہر جماعت بلکہ ہر فرد اپنے اپنے مخصوص اور بظاہر جداگانہ مفاد کے لئے جد و جہد کر رہا ہے اجتماعی
داری اور تعصب کو تقریباً ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے یہ کہنا بے وقت کی راگنی معلوم ہو لیکن میرا پرخلوص عقیدہ
ہے کہ افراد اور جماعتوں کے لئے رواداری کی صفت پیدا کئے بغیر تہذیب کی منزل تک پہنچنا ممکن نہیں
ت سے نیک نیت اور نیک نفس لوگوں کی خوبیوں پر محض اس وجہ سے پانی پھر جاتا ہے کہ ان
یہ صلاحیت نہیں ہوتی تو وہ اپنی زندگی کو خود اپنے اور دوسروں کے لئے ایک عذاب مستقل بنا لیتے
انھیں یہ خیال نہیں گذرتا کہ حکمت الٰہی اس امر کی متقضی ہے کہ انسانوں میں اختلافات ہوں
ر وہ ان کا احترام کریں۔ سائنس اور جمہوریت کے اس دور میں جب انفرادیت کی تکمیل کے بغیر قومی ترقی
ممکن ہے، تنگ نظری اور تعصب خودکشی کا حکم رکھتا ہے۔ دماغی بیداری اور نشو و نما اسی جماعت میں
ن ہے جس کے افراد میں ذہنی کشادگی ہو۔ جن کی دلچسپیاں متنوع ہوں جو علاوہ اپنے تنگ اور محدود
ذاتی اغراض و مقاصد کے دوسرے اجتماعی مسائل میں بھی دلچسپی کے ساتھ شرکت کریں۔ ہندوستانی
مذہب کی تباہی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے میں بھی شدت کے ساتھ تعصب اور
تنگ نظری سرایت کر گئی ہے جس کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا ہے یہاں تک کہ اس بیسویں صدی میں
جب کہ ہندو مذہب پانچ ہزار سال پرانا ہو چکا ہے۔ مہاتما گاندھی کو اچھوتوں کی آزادی کے لئے اپنا
مقدمہ حیات پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میرے عقیدے کے مطابق، باوجود ہر قسم کی علمی اور فنی ترقی
کے۔ باوجود ان تمام کارناموں کے جو ہندو تمدن کے امتیاز کا باعث ہیں ایسی سوسائٹی جو اس طرح انسانی
حقوق اور رواداری کا خون کرے سراسر نفی تہذیب کرتی ہے یہی حکم ان تمام قدیم تمدنوں اور معاشروں
ہوتا ہے جنھوں نے مختلف صورتوں میں اپنے بعض افراد کی حق تلفی کی اور خندہ پیشانی کے ساتھ
ن پر ظلم کو روا رکھا خواہ وہ غلامی کی رسم ہو یا عورتوں کی حق تلفی ہو یا کمزور اقوام کے حقوق
دست درازی ہو۔ بے شک اس اصول کو قائم کرنے سے ہمیں افلاطون کے زمانے کی سوسائٹی سے
کر امریکہ جیسے متمدن اور مہذب ملک تک کی شان میں گستاخی کرنی پڑے گی اور خود ہندوستانیوں کے احساس
خودی کو ٹھیس لگے گی لیکن ہم کسی طرح اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ صحیح انسانی تہذیب کا تقاضا یہ ہے

کہ ہم تمام انسانوں سے رواداری اور عدل کا برتاؤ کریں۔ جو فرد یا جماعت اس قاعدہ کی خلاف ورزی کرتی ہے وہ تہذیب سے عاری ہے خواہ اسکی علمی تہذیب کیسی ہی خیرہ کن کیوں نہ ہو۔

رواداری کے مفہوم میں ایک طرف تو یہ داخل ہے کہ انسان دوسروں کے جذبات اور خیالات کو سمجھے اور انکا احترام کرے، اور اپنی ذات میں اس درجہ وسعت پیدا کرے کہ اس میں دوسروں کا دکھ درد بھی سما سکے دوسری طرف اسمیں یہ صفت شامل ہے کہ انسان دوسروں کی غلطیوں اور قصوروں کو فیاضی کیساتھ جانچے اور ایک سخت گیر قاضی کیطرح ان پر حکم لگانے کے بجائے ایک اہل دل انسان کیطرح ان کی وجہ اور علت کو معلوم کرنے کی کوشش کرے یعنی اسے جرم کو پکڑنے اور سزا دینے سے زیادہ اس بات کی فکر اور کاوش ہو کہ وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے اس شخص کو سیدھے راستے سے ہٹا کر اس راستے پر ڈال دیا۔ جو شخص ہمیشہ دوسروں کے لئے محتسب بنا رہتا ہے، ان کی عیب جوئی کرتا رہتا ہے، انکی لغزشوں کو معاف کرنے کے لئے تیار نہیں بلکہ ان پر سختی کرنا اور انھیں عذاب الیم کا مزہ چکھانا اپنا فرض سمجھتا ہے وہ ممکن ہے کہ ایک اعلیٰ اخلاق، سیرت کا مالک ہو لیکن وہ تہذیب کے ایک نہایت لازمی اور شیریں عنصر سے محروم ہے، اسمیں وہ فراخدلی اور رواداری نہیں ہے جو مجرم اور جرم میں امتیاز کرتی ہے جسکی وجہ سے ہمارے دل میں ایک بدبخت مجرم کو دیکھ کر بھی یہ خیال گذرتا ہے کہ اگر توفیق الٰہی شامل حال نہ ہوتی تو کیا عجب ہے کہ آج ہم بھی اسی حالت میں ہوتے یعنی وہ صفت جسکی بدولت عارضی اور اتفاقی فرق کی بنا پر ہم اپنی مشترک انسانیت کا احساس نہیں کھونے پاتے۔ یہ وہ حقیقی انسانی ہمدردی، رحم اور انکسار ہے جو بعض لوگوں میں فطرتاً ودیعت ہوتا ہے، اور بعض میں بہت سے تجربے اور آزمائشیں اٹھانے کے بعد پیدا ہوتا ہے اور بعض پر اس کا سایہ تو بھی نہیں پڑتا۔ ایسی ہمدردی اور فراخدلی کی مثالیں ہمیں ادب میں بھی ملتی ہیں، اور اگر ہم خوش قسمت ہوں تو عملی زندگی میں بھی کبھی کبھی ایسے انسانوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ جو اس تہذیب حقیقی کے حامل اور شمع بردار ہیں۔ جو باوجود اپنے مواقع کے تنگ اور محدود ہونے کے باوجود جاہل اور ناواقف اور ناتجربہ کار رہنے کے، اپنی فطرت کی گہرائیوں میں ایثار، محبت، ہمدردی اور رواداری، سمجھنے اور معاف کرنے کے ایسے خزانے رکھتے ہیں جنکے مقابلے میں حقیقت میں نظروں کے سامنے علم اور تجربے کی بھی کوئی وقعت نہیں۔ بیشک علمی مشاغل اور مذاق کی مناسبت اور اتحاد بہت قابل قدر چیزیں ہیں اور خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنکو اپنے دوستوں اور عزیزوں میں یہ نعمت میسر ہو لیکن ان سے زیادہ وقیع ہیں محبت اور ہمدردی کے وہ رشتے جن کو موت بھی نہیں توڑ سکتی، کس کا ہم آہنگی آخری سانس

میں باہمی مناسبت اور اتحاد اور وہ ذہنی رشتے جن کو قائم کرنے کا لوگوں کو شوق ہوتا ہے یا ہر وقت انسان کو یہ چیزیں اپنے عملی رنگ میں نظر آتی ہیں یعنی یہ کہ وہ زندگی کی محض بیرونی نمائش ہیں۔ بچہ جب تاریکی کے بھوتوں سے ڈرتا ہے تو وہ یہ نہیں چاہتا کہ دوسرے بھی اس کے خوف میں شریک ہوں یا اس خوف کی نفسی وجہ اس کو سمجھائیں بلکہ اس گرم اور محبت بھری آغوش کی تلاش کرتا ہے جس میں پناہ لے کر اپنے ڈر کو بھلا سکے۔ اسے اس شفیق اور تسکین بخش ہاتھ کی تلاش ہوتی ہے جس کو تھام کر وہ اس خوف کا مقابلہ کر سکے۔ بے شک امید، ایمان، محبت ضروری ہیں لیکن ضرورت ہے انسانیت کے لئے سب سے زیادہ بعض ہندوستانی ماؤں کی سی محبت کی جس میں انتہائی بے نفسی ہو، صبر ہو، ان تھک تحمل ہو، ایسی محبت جس کو خطائیں اور لغزشیں کم نہ کر سکیں، جو کسی معاوضہ کی طالب نہ ہو، جس میں محبت الٰہی کی جھلک ہو۔ اس کے مقابلے میں اور تمام انسانی تجربے اور جذبات ہیچ اور پوچ ہیں۔

رواداری کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے دو باتوں کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ آدمی اخلاقی عیوب اور برائیوں کے ساتھ بھی سمجھوتہ کرنے کو تیار ہو جائے اور جرم اور گناہ کے خلاف جدوجہد ترک کر دے۔ نہیں! اسے جرم اور مجرم میں، گناہ اور گناہ کرنے والے میں تمیز کرنی چاہیئے۔ ایک با اخلاق آدمی کے اس کا فرض ہے کہ وہ جرم کے تدارک کی کوشش کرے اور اس کے خلاف اپنی قوت صرف کرے لیکن بحیثیت ایک انسان کے اسے مجرموں کے ساتھ ہمدردی رکھنی چاہیئے اور انھیں راہ راست پر لانے کی پوری کوشش کرنی چاہیئے۔ جب حضرت عیسیٰ کے ساتھیوں نے جن کو دعوائے تقدس تھا اور اپنے متعلق بہت خوش فہمی تھی، میری مگدالین پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ کی اور اس کو سنگسار کرنا چاہا تو اس عارف ربانی نے جس کی نظر اوروں سے زیادہ گہری اور دل اوروں سے زیادہ فراخ اور روادار تھا، اپنی آواز بلند کی، "پہلا پتھر وہی شخص پھینکے جس نے خود کبھی کوئی گناہ نہ کیا ہو" نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہاتھ جو پتھر پھینکنے کے لئے اٹھے تھے اپنی اپنی جگہ پر ٹھٹک کر رہ گئے اور کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ دل کے چور کو فراموش کر کے نظر کے سامنے والے چور پر ہاتھ اٹھائے۔ اسی طرح جب رسالتمآب بحیثیت ایک فاتح کے دوبارہ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے جہاں انھوں نے اہل مکہ کے

ہاتھوں ہر طرح کی ایذائیں اور بے حرمتی اٹھائی تھی جہاں لوگوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کا خاتمہ کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا تھا۔ تو آپ کی زبان پر یہی اعلان تھا کہ لاتثریب علیکم الیوم اور دل میں یہ دعا تھی کہ بارالہا تو میری قوم کی خطاؤں سے درگذر کر کیونکہ وہ لاعلمی اور جہالت میں گرفتار ہیں اسی طرح اس جلیل القدر پیغمبر کے برگزیدہ نواسے نے جو تاریخ عالم کا سب سے بڑا مجاہد تھا خلق اور رواداری کی جو شان کربلا کے میدان میں دکھائی جب کہ وہ ایسی مصیبتوں اور آزمائشوں میں گھرا ہوا تھا جن کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اس کی تمام عمر عبادت الہی اور خدمت خلق میں بسر ہوئی ہے۔ اس کے مخالف وہ لوگ ہیں جنھوں نے نہ صرف اسلام اور انسانیت کو بالائے طاق رکھ دیا ہے بلکہ شقاوت اور ظلم میں درندوں سے بھی کہیں بدتر ہیں لیکن یہ خدا کا محبوب بندہ باوجود اپنے زبردست تقدس اور عظمت کے اپنی انسانی ہمدردی کو زندہ رکھتا ہے اور قاتل کے خنجر کے نیچے بھی سجدے میں پڑا ہوا ان ظالموں کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے! یہ ہے تہذیب اور انسانیت کا انتہائی کمال جسکی پیروی کرنے کی کوشش اور آرزو ہر انسان کو چاہیئے خصوصاً ان لوگوں کو جنھیں اسلام سے توسل کا دعویٰ اور اس پر فخر ہے۔ کیونکہ خود پیغمبر اسلام نے یہی بتائی تھی کہ بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں) یہ تعلیم دی تھی کہ تخلقوا باخلاق اللہ (خود کو اخلاق الہی سے متصف کرو) اخلاق کا یہ تقاضا نہیں کہ نیکی کرکے اوچھے برتن کی طرح چھلک پڑے۔ نہ خطاکاروں کے حالات پر غور کرے۔ نہ ان کی نیت معلوم کرے بلکہ ایک بلند مقام سے ان پر حکم لگانا شروع کردے۔ خدائے تعالیٰ کی نظر میں عزت اس شخص کی ہے جس کو تقویٰ یعنی خوف خدا ہو۔ "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" اور سب سے بڑا گناہ غرور اور تکبر ہے جس نے ابلیس کو جو فرشتوں کا سردار تھا ہمیشہ کے لئے ذلیل و خوار کردیا۔ جو زاہد اپنے زہد اور اتقا پر نازاں ہے اس کی عبادت گذاری کا پیشکش بھی درگاہ الہی میں قبول نہیں لیکن ممکن ہے کہ وہ نکتہ نواز اس رند کو سرفراز کردے جو نیازمندی کی شان سے اس کے سامنے جھکتا ہے۔

زاہد غرور کرد و ملامت نہ برد راہ　　رند از رہ نیاز بدار السلام رفت!

دراصل تہذیب کا مسئلہ عدل اور توازن کا مسئلہ ہے یعنی ہمیں مختلف قوتوں اور مطالبات کے درمیان

[illegible] اور مستحسن صفات کے درمیان ایک خاص تناسب قائم کرتا ہے۔ ہم نے ابھی غرور اور نیازمندی کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی تہذیب ہے کہ بیک وقت دو ایسی صفات کی طالب ہو جو بظاہر ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتی ہیں۔ ایک طرف اس بات کی ضرورت ہو کہ انسان کو بحیثیت انسان ہونے کے اپنی حقیقی وقعت اور عظمت کا احساس ہو اور وہ یہ جانے کہ وہ بے شمار امکانات کا مالک اور حامل ہو جن کو عمل میں لانا اور ان کے ذریعے عالم فطرت کو تسخیر کرنا اس کا فرض ہو۔ سائنس کی ترقی نے انسان کی عقل کو بڑی حد تک توہمات کی زنجیروں سے آزاد کر دیا ہے اور اسے اس کے فطرتی ماحول پر بہت بڑی قدرت حاصل ہو گئی ہے جو شخص عاجزانہ تقدیر پرستی کا شکار ہو جائے اور اس دنیا میں جو عالم اسباب ہو ہاتھ باندھ کر منتظر رہے وہ کوئی مفید کام انجام نہیں دے سکتا۔ ہمارے نزدیک وہ نہ تہذیب یافتہ ہو نہ بن سکتا ہے کیونکہ ہم تہذیب کے عالی مفہوم کے قائل ہیں اس کو ایک جامد اور مجہول چیز بنانے کیلئے تیار نہیں جب اس میں اس احساس کی بدولت صحیح عزت نفس پیدا ہوتی ہے تو وہ نظام عالم میں اپنی اہمیت کو پہچانتا ہے اور یہ خود شناسی معرفت الٰہی کا زینہ ہے۔ یہ پاس نفس اسی شخص میں پیدا ہو سکتا ہے جس کے اعمال و افعال کی محرک خود اس کی ذات ہو، دوسروں کی تقلید یا خواہش تحسین یا خوف ملامت اس کا راہبر نہ ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تنگ نظر یا خود غرض یا نفس پرست ہو بلکہ اس سے ہماری مراد یہ ہو کہ اس کے خیالات اور عقائد اس کے اپنے غور و فکر کا نتیجہ ہوں اور وہ یہ جانے کہ بحیثیت انسان کے اسے ایسی آزادی فکر و عمل حاصل ہے جس سے کوئی قوت اسے محروم نہیں کر سکتی۔ جن لوگوں کے جذبات و خیالات اور اعمال و افعال دوسروں کا عکس ہوتے ہیں وہ محض رسم و رواج یا فیشن کے غلام ہو کر رہ جاتے ہیں اور ان میں نہ حقیقی جرأت پیدا ہوتی ہو نہ عزت نفس۔ ایسے شخص کو ہم اپنے نظریے کے مطابق مہذب کہنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔

اس عزت نفس کے ساتھ ساتھ جو انسان سے اس کے امکانات کا احترام کراتی ہے، اسے یہ بھی احساس ہونا چاہیئے کہ عالم کائنات کی بے اندازہ وسعت کے مقابلے میں اس کی ہستی بہت چھوٹی اور کمزور ہے اور باوجود اس کی علمی اور عملی ترقی اور انکشافات کے اس کا علم و قدرت دونوں محدود ہیں۔ یہ خیال اس کے دل میں سچا عجز اور انکسار پیدا کرتا ہے جو غلط اور جھوٹی خاکساری سے بہت مختلف ہو۔ اس کی شناخت یہ ہے کہ اس عجز کی وجہ سے انسان کے قوائے عمل معطل نہیں ہو جاتے بلکہ ان کو جد و جہد کی دعوت ملتی ہے لیکن وہ اپنی کامیابی پر غرور نہیں

کرتا۔ نیوٹن جیسے عالم متبحر کا یہ قول کہ "علم کے بحر زخار کے سامنے میری واقفیت کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی بچہ سمندر کے کنارے بیٹھا ہوا کنکریوں سے کھیل رہا ہو" تہذیب نفس اور مذہبی جذبے پر دلالت کرتا ہے اور ایسے عجز کی نہایت عمدہ مثال ہے۔ دنیا میں جس قدر صحیح معنوں میں بڑے آدمی گذرے ہیں ان سب میں یہ بات مشترک تھی کہ انھوں نے اپنی ذات کے متعلق کبھی غرور یا تکبر نہیں کیا، انھوں نے کبھی دوسرے انسانوں کو ذلیل نہیں سمجھا اور ان کے مقابلے میں اپنی فوقیت نہیں جتائی۔ یہ تہذیب اور خرافت کی بہت بڑی پہچان ہے۔ ہر انسان بحیثیت ایک انسان ہونے کے ایک قدر مستقل کا مالک ہے اس لئے کسی کو اپنے علم یا وجاہت یا پرہیزگاری کی وجہ سے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے کو حقیر سمجھے۔ ایسے لوگ، خواہ وہ جلیل القدر پیغمبر ہوں جیسے حضرت عیسیٰ، آنحضرتؐ، یا معاشرتی اور سیاسی رہنما جیسے مہاتما گاندھی، ہمیشہ انسانوں سے ان جیسے انسان بن کر ملتے ان کے پاس آتے، ان سے ملتے جلتے، اپنا دکھ درد اور اپنی کمی اور کمزوری ان کو بتانے میں معمولی سے معمولی آدمی کو بھی باک نہیں ہوتا۔ وہ یہ نہیں کرتے کہ مثلاً بعض انتخاب کے امیدواروں کی طرح مصنوعی اور جھوٹے انکسار سے کام لے کر اپنی بلندی سے اتر کر دوسروں کی سطح پر آئیں بلکہ وہ قدرتاً اور خود بخود دوسروں کو اپنی سطح تک بلند کر لیتے ہیں کیونکہ ان کی انسانیت مصلحت وقت پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ ان کے دلی جذبات اور فطری احساسات کا اظہار ہوتی ہے۔ میں کسی ایسے شخص کو مہذب انسان ماننے کے لئے تیار نہیں جو انسانیت کی حرمت کو نہ پہچانے اور تنگ نظری کی وجہ سے خود کو ہمیشہ دوسروں سے بلندتر اور بزرگ تر سمجھے۔ جو شخص تقدس کا دعویٰ کرتا ہے یا اپنی دولت، علمیت، یا وجاہت نسبی کی بنا پر غریبوں، جاہلوں، کم حیثیت لوگوں پر اپنی فوقیت جتاتا ہے وہ نہ صرف تہذیب سے عاری ہے بلکہ اس میں احساس تناسب اور ذوق ظرافت بھی مفقود ہے کیونکہ وہ یہ نہیں محسوس کرتا کہ خدا کی کائنات کس قدر وسیع ہے اور اس کے مقابلے میں اس کے بلند آہنگ دعاوی کیسے مضحک اور مہمل معلوم ہوتے ہیں۔ مذہب ہمیں سکھاتا ہے کہ اس قادر مطلق کی نظر میں ہر قسم کی خدمت کی وقعت اور اہمیت یکساں ہے بشرطیکہ وہ خلوص سے کی جائے، خواہ وہ کسی ملک کی سیاست کا چلانا ہو یا زمین کا کھودنا، مذہب کی تبلیغ کرنا ہو یا سڑکوں اور مکانوں کی غلاظت کو دور کر کے ان کی صفائی کرنا۔ ہم اس بات کی وجہ اور مصلحت نہیں سمجھ سکتے کہ کیوں ایک شخص کے حصہ میں شہرت اور عزت و افتخار کی زندگی

آتی ہے یا کسی اہم یا شان مقصد کے لئے شہرت اور ناموری کے ساتھ جان دینا اور دوسرے کے حصّہ میں ایک ایسی زندگی جو شروع سے آخر تک اندھیرے میں ٹٹولنے کے مانند ہو اور جس کا انجام گمنامی اور ذلت ہو ہم یہ نہیں جانتے لیکن ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ جو مفید کام بھی خلوص کے ساتھ کیا جائے وہ مقبول ہے اور اس کی وقعت مسلّم

لہٰذا ہم تہذیب کے لئے ایک شرط لازم یہ قرار دیتے ہیں کہ ہر انسان اس مشترک انسانیت کے رشتے کا احترام کرے جو اسے دوسروں سے ملاتا ہے اور کسی خارجی یا نمائشی فرق کی وجہ سے خود کو دوسروں سے برتر اور اعلیٰ تر نہ سمجھے۔ نہ ہی اسے کسی شخص کو اس بنا پر حقیر سمجھنے کا حق حاصل ہے کہ اس کے کام کی نوعیت بہت معمولی ہے یعنی یہ کہ مثلاً وہ چمار یا خاکروب یا کمہار ہے۔ ان کاموں کی ضرورت مستقل ہے اور ان کو تہذیب کا مخالف یا اس سے بے تعلق سمجھنا ہمارے نظریہ تہذیب کی رو سے کسی طرح جائز نہیں بے شک یہ نقطۂ نظر تہذیب کے قدیم اور مستند مفہوم کے بالکل خلاف ہے لیکن موجودہ اخلاقی اور فلسفیانہ تحریکات اور بہترین قدیم تعلیمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ محنت، مزدوری اور تہذیب میں کوئی لازمی تناقض نہیں۔ گذشتہ زمانوں میں گرچہ لوگوں نے تہذیب کے مفہوم کو ان چند مشاغل تک محدود کر دیا تھا جن میں وہ اپنے ذاتی شوقوں، مثلاً علم کی تحصیل، عبادت گذاری، فنون لطیفہ کی تخلیق و تحسین کی تشفی کرتے تھے اور اس کو دنیاوی مکروہات اور عملی زندگی کی کشمکش سے گریز کرنے کیلئے ایک جائے پناہ سمجھتے تھے لیکن تہذیب کا یہ مفہوم نہایت سطحی، نہایت ناقص اور ادھورا ہے اس میں زندگی کا جوشیلا خون بالکل ندارد ہے۔ یہ ایک قسم کی دماغی اور روحانی خود غرضی کا مرادف ہے اور اصلیت کے بجائے بیرونی جلا اور صنائع پر زور دیتا ہے۔ اس مفہوم کی رو سے تہذیب کا سرچشمہ کتابیں اور درسی علوم ہیں اور اس کا مقصد ہے تنہائی میں انفرادی قوتوں کی تربیت کرنا۔ لیکن ہم تہذیب کو بیکار یا بکار معلومات کا مجموعہ ماننے کیلئے تیار نہیں اور یہ ہرگز ضروری نہیں کہ جو شخص مخزن علوم ہو وہ مہذب انسان بھی ہو بلکہ گمان غالب یہ ہے کہ وہ تہذیب سے بے بہرہ رہیگا کیونکہ اس کی دلچسپیوں کا مرکز اس کی اپنی ذات ہوگی یا کتابیں نہ کہ انسانی زندگی اور اس کے وہ تلخ و شیریں تجربات جن کی چاشنی چکھنے کے بعد آدمی انسان بنتا ہے ہمیں بار ہا ایسے

لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جو باوجود عالم اجل ہونے کے تہذیب سے محروم ہوتے ہیں پروفیسر اشپرنگر نے اپنے نظریہ نفسیات میں انسانوں کی جو قسمیں قرار دی ہیں ان میں ایک قسم Der akademische Mensch یعنی نظری انسان کی بھی ہے جو تلاش حق اور طلب علم کو اپنا مقصد حیات سمجھتا ہے اور اس میں بالکل محو ہو فنا ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کا آدمی قابل قدر ہے اور اپنے نتیجہ کار کی رو سے خدمت خلق کر رہا ہے۔ لیکن بحیثیت ایک معاشرتی فرد کے اگر اس کو اپنے گرد و پیش کے انسانوں سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اگر وہ ان کے دکھ درد اور مشاغل میں شریک نہ ہو، علاوہ علمی معاملات کے اور تمام معاملات کی طرف سے بے اعتنائی کرے، اس کی قوت عمل معطل ہو جائے، وہ انسانی جذبات کا احترام نہ کرے تو ہم اسکو بحیثیت انسان کے بہت ناقص اور تہذیب سے عاری سمجھیں گے۔ تہذیب کا جدید نظریہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد کام اور خدمت اور عملی تجربے پر رکھنی چاہیئے نہ کہ کتاب اور نظری علوم پر۔ وہ تہذیب جو افراد میں حقیقی شرافت اور انسانیت کی روح پیدا کرتی ہے محض مطالعہ یا عبادت گذاری یا آرٹ میں انہماک کا نتیجہ نہیں بلکہ خدمت خلق سے، محنت سے، دوسرے انسانوں کے ساتھ دوش بدوش کام کرنے، ان کے جذبات و خیالات کو سمجھنے ان سے ہمدردی اور محبت کرنے اور ان کے رنج و راحت میں شریک ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ تجربات دل کو نرم اور دماغ کو روشن کرتے ہیں۔ کارلائل کا یہ قول مشہور ہے کہ "کام عبادت ہے۔ ہر کام جو خلوص سے کیا جائے برکت کا باعث ہے جس شخص کو یہ برکت نصیب ہے اسے اور کوئی برکت طلب کرنیکی ضرورت نہیں" خدمت بشرطیکہ وہ خلوص اور دانشمندی کے ساتھ کی جائے رحم کی صفت کی طرح "دوچند متبرک ہے" وہ اس کیلئے بھی برکت ہے جو خدمت کرے اور اس کے لئے بھی جس کی خدمت کیجائے اس خدمت کے طفیل علمی کام کرنے والوں میں وہ برتری کا احساس پیدا نہیں ہونے پاتا جو انھیں محنت مزدوری کرنے والوں سے جدا رکھتا ہے اور بیشمار معاشرتی اور اخلاقی خرابیوں کا باعث ہے۔ اسی وجہ سے ہر وہ تحریک جو "تحریک خاکساراں" کی طرح لوگوں میں محنت اور خدمت کے شوق اور صلاحیت کو بڑھائے تہذیب کی اشاعت میں براہ راست مدد دیتی ہے۔

لیکن یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ رواداری کا ایک غلط مفہوم وہ بھی ہے جو آج کل رائج ہو گیا ہے اور جو اسکو تقریباً بے اعتنائی کا مرادف قرار دیتا ہے۔ تعلیم یافتہ گروہ میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو رہا ہے جن کے نزدیک کسی

اصول یا عقیدہ کی کوئی اہمیت نہیں نہ تو خود ان کے کوئی پختہ اصول اور عقائد ہیں نہ وہ دوسروں سے ان کے اصول اور عقائد پر اختلاف یا جھگڑا کرتے ہیں ان کے نزدیک سب برابر ہیں اس لئے وہ سب کی طرف سے یکساں بے پروائی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے ابنائے جنس پر محتسب بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ ہم اپنے بھائیوں کے رکھوالے نہیں ہیں چنانچہ جن امور کے متعلق ارباب فکر شدت کیساتھ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے رہے ہیں مثلاً یہ کہ خدا ہے یا نہیں۔ سیاست میں فلاں مسلک صحیح ہے یا کوئی اور اچھوتوں کو حقوق دئے جائیں یا نہیں۔ عورتوں کا نظام معاشرت میں کیا مرتبہ ہے، انسان کی زندگی کا منشا جلب منفعت ہے یا خدمت خلق۔ ان سب مسائل کی ان کے نزدیک کوئی خاص وقعت نہیں۔ ان کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی زندگی اپنے خیال کے مطابق بسر کرنی چاہیئے دوسروں سے بحث ومباحثہ کرنا مناسب نہیں لیکن یہ حقیقی رواداری نہیں۔ یہ ذہنی رویہ فلسفہ تشکیک پر مبنی ہے جس کو بعض مفکرین نے بہت وقعت دی ہے۔ مگر اس کو عقلی آزادی اور آزاد خیالی سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے اس رویے کے اصلی معنی یہ ہیں کہ اس نام نہاد متشکک نے کوئی خاص نظام اقدار، کوئی معیار زندگی قائم نہیں کیا اس کی زندگی کسی زبردست مقصد کے ساتھ وابستہ نہیں۔ ہم جس رواداری کے خواہاں ہیں وہ عقائد کی پختگی کے منافی نہیں۔ اس کیلئے صرف یہی شرط ہے کہ وہ عقائد ہماری ذہنی آزادی اور غور وفکر معطل نہ کریں۔ اس شرط کے ساتھ عقائد کی پختگی تشکیل وتنظیم حیات کے لئے لازم ہے۔ سچی رواداری کی تعریف یہ ہے کہ ہم زندگی کے اہم مسائل کے متعلق اپنے مخصوص خیالات اور عقائد رکھتے ہیں اور خلوص کے ساتھ ان پر کاربند ہیں لیکن عقلاً اور عملاً دوسروں کے اس حق کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ہم سے بالکل مختلف خیالات اور عقائد رکھتے ہوں ہم اپنی رائے کو جوش اور قوت کے ساتھ دوسروں کے سامنے پیش کرتے اور انھیں اپنا ہم رائے بنانا چاہتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم خندہ پیشانی اور بردباری کے ساتھ ان کی بالکل مخالف رائے کو سننے اور اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہیں اور اس اختلاف رائے کی وجہ سے ہمارے باہمی تعلقات میں تلخی یا ناگواری پیدا نہیں ہوتی۔ اس ذہنیت کی تربیت کے لئے یہ لازم ہے کہ ہم افراد میں تجسس کا مادہ اور شوق کی وہ تازگی اور بیداری قائم رکھیں جو بچپن کا خاصہ ہے لیکن ناسازگار ماحول کی وجہ سے ابتدائی عمر میں

دب جاتی ہے اور لوگوں پر قبل از وقت کہولت طاری کر دیتی ہے جس طرح یہ بات تہذیب کے مطالبات کے خلاف ہے کہ ہم بجبر اپنے خیالات دوسروں پر عائد کریں اسی طرح یہ بھی تہذیب کے منافی ہے کہ ہم اپنے یا دوسروں کے خیالات اور عقائد کے بوجھ میں دب کر نئے خیالات اور نئے حقائق کا استقبال نہ کر سکیں۔ ہندوستانیوں پر تو خاص کر کے قبل از وقت کہولت طاری ہو جاتی ہے اور دماغی جدت اور جولانی کا مادہ باقی نہیں رہتا جس طرح نو عمری کی شادی یا ملازمت جسمانی شباب کی موت ہے اسی طرح عقائد اور خیالات کا اس طرح جامد ہو جانا کہ انسان میں سوچنے اور غور کرنے کا مادہ نہ رہے اور وہ ہر نئی بات سے گھبرائے ذہنی شباب کا خاتمہ ہے۔ ایمان اور عقیدے کی اہمیت تسلیم۔ لیکن انسان کو کسی طرح یہ مناسب نہیں کہ وہ آنکھوں پر اندھیریاں لگا کر زندگی بسر کرے، اسے تو شہید جستجو ہونا چاہئیے۔

ہمہ ساز ناتمام ہمہ سوز آرزویم　　　　بگماں دہم یقیں را کہ شہید جستجویم

ہم نے تہذیب کا جو مفہوم مندرجہ بالا صفحات میں پیش کیا ہے اس کے ضمن میں ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ایک پر جوش اور سرگرم مجاہد تہذیب یافتہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ مجاہد سے یہاں ہماری مراد وہ شخص ہے جو کسی خاص مقصد کی حمایت یا تحصیل میں اس درجہ منہمک ہو جائے کہ اس کے لئے اور تمام چیزوں کو قربان کرنے کو تیار ہو اور اسے اس انہماک میں اتنا غلو ہو کہ وہ اور تمام مفاد اور اغراض کو نظر انداز کر دے۔ اس ذیل میں صرف جنگجو سپاہی ہی شامل نہیں بلکہ وہ تمام لوگ بھی جو کسی نیک اور مفید کام میں مثلاً علم کی تحصیل یا مذہب کی اشاعت اور حمایت یا سیاسی مقاصد کیلئے اپنا تن من دھن نثار کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ یقیناً قابل احترام ہیں اور دنیا میں اکثر بڑے بڑے کاموں کو ایسے ہی لوگوں نے انجام دیا ہے جن کو کسی ایک خیال کی دھن ہو جاتی ہے کسی ایک چیز سے اس درجہ شغف ہو جاتا کہ وہ جنون کی حد تک پہنچ جائے۔ کامیابی کے لئے اکثر مفید ثابت ہوتا ہے۔ مجاہد کی بعض خوبیاں ایسی ہیں جنکا ہم اعتراف کرتے ہیں اور ان کو تہذیب کا لازمی جزو سمجھتے ہیں! اس میں عقیدہ کی پختگی ہوتی ہے۔ جب اسے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہ ایک معاملہ میں حق پر ہے تو وہ اس پر ثابت قدم رہتا ہے اور اس کے لئے ہر قسم کا ایثار کرنے کو تیار رہتا ہے ہم اس کے ایثار اور یکجہتی کی قدر کرتے ہیں۔ اس کے لئے اعلیٰ جرأت درکار ہے جس میں

جسمانی، دماغی اور اخلاقی جرأت تینوں شامل ہیں۔ اس کو تکلیفوں اور مخالفتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور اکثر سوسائٹی کی ناپسندیدگی اپنے سر لینی پڑتی ہے لیکن وہ اس کی پروا نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے جو آدمی بزدل اور ڈرپوک ہوتا ہے وہ جسمانی تکلیف یا معاشرتی مخالفت یا ذہنی تنہائی کے خوف سے اپنے مستحکم عقیدوں کو ترک کر دیتا ہے۔ اس شخص میں تہذیب کی صفات پیدا ہونی بہت مشکل ہیں۔ لہذا جرأت کو ہم تہذیب کیلئے ایک شرط لازم قرار دیتے ہیں بشرطیکہ اس میں اخلاقی جرأت کی یہ شان بھی ہو کہ جب انسان اپنی کوئی غلطی محسوس کرے یا دوسرا اس کی غلطی محسوس کرائے تو وہ بے کم وکاست، اپنی غلطی کا اقرار کرے اور جھوٹی شرم سے مغلوب نہ ہو جائے۔ یہ جرأت کی سب سے اعلیٰ شکل ہے گویا انسان کو خود اپنی ذات کے خلاف دکھانی پڑتی ہے۔ اس کے لئے بڑے دل اور جگر کی ضرورت ہے کیونکہ اکثر لوگ عزت نفس کا ایک غلط مفہوم اپنے ذہن میں قائم کرکے اس کے غلام ہو جاتے ہیں اور اپنی جگہ سے ہٹنے یا اپنی غلطی تسلیم کرنے کو کسر شان سمجھتے ہیں۔ خصوصاً ان لوگوں کے لئے یہ بات بہت مشکل ہے جن کو عام طور پر بڑا آدمی سمجھا جاتا ہے اور جنکی تمام حرکات اور افعال عوام کی نظر میں رہتے ہیں۔ بہرحال اس جرأت کا اپنے میں پیدا کرنا، ہر کام کو جوش، خلوص اور انہماک کے ساتھ انجام دینا، مشکلات کے سامنے ہتیار نہ ڈالنا، مجاہد کی صفات ہیں اور ان کی ہمیں دل سے عزت کرنی چاہیئے۔

لیکن یہ مجاہدانہ صفات بجائے خود ایک شخص کو ہمارے خیال میں مہذب نہیں بنا سکتیں تہذیب کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان زندگی کے تمام پہلوؤں پر ایک ہمہ گیر نظر ڈال سکے، اس کی طبیعت میں توازن ہو۔ جب اس کے سامنے کوئی معاملہ درپیش ہو تو وہ اس کے تمام رخوں پر غور کرنے اور تمام متعلقہ اشخاص اور واقعات کو جانچنے کے بعد کوئی طریقۂ عمل اختیار کرے۔ حقوق اور مطالبات کے اسی توازن کو مذہب اور فلسفہ نے عدل کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ "اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ"۔ مجاہد اکثر معاملہ کا ایک ہی رخ دیکھتا ہے اور یہ وہ رخ ہوتا ہے جس سے اس کو بہت گہری ذاتی دلچسپی ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نظر کی یک جہتی سے اس کی قوت عمل دو چند بلکہ چہار چند ہو جاتی ہے لیکن وہ عقل سلیم سے کام نہیں لیتا اور اکثر انجام کار نقصان اٹھاتا ہے۔ اس کی مثالیں ہمیں اپنے تجربے میں اکثر ملتی رہتی ہیں۔ علم کے مجاہد کا ذکر

اور آچکاہے جو طلب علم میں اس درجہ محو ہو جاتا ہے کہ انسانی حقوق کی اس کو شناخت نہیں رہتی اور وہ اپنے معاشرتی فرائض کو ادا نہیں کرتا۔ اسی طرح بعض مذہبی مجاہد ہوتے ہیں جو اپنے خیالات کی تبلیغ اور انکی حمایت میں اس قدر منہمک ہو جاتے ہیں کہ ان میں احساس تناسب باقی نہیں رہتا وہ ہر ہر نقطے اور شوشے کی غلطی کو کفر کا مرادف سمجھتے ہیں کسی قسم کے اختلاف کے روادار نہیں ہوتے جو شخص ان سے اختلاف کرتا ہو اسے عذاب ابدی کا سزاوار قرار دیتے ہیں۔ دوسرے مذاہب اور ان کے پیروؤں کی بے حرمتی اور دل آزاری کرتے ہیں اور اس کو باعث ثواب سمجھتے ہیں ان میں محبت ہمدردی اور رواداری کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگ نیک نیتی کے ساتھ یہ سب کچھ کرتے ہوں لیکن اس قدر غلو اور تعصب اور آنکھوں کو تقریباً بند کرلینا نہ صرف تہذیب اور انسانیت کے منافی ہے بلکہ روح مذہب کے بھی خلاف ہے جو نیک حق پر ہو نا بہت اچھا ہے، اس کی اشاعت نہایت ضروری ہے۔ اس کے لئے ایثار اور قربانی کرنا بہت بڑی قابل تعریف بات ہے لیکن انسان کے دل میں جو خطا اور نسیان کا پتلا ہے، کبھی یہ خیال بھی تو آئے کہ ممکن ہے وہ غلطی پر ہو یا اگر غلطی پر نہیں تو ممکن ہے وہ بھی راستی پر ہوں اور دوسرے لوگ بھی کیونکہ خدا کی وسیع خدائی میں اکثر ایک ہی منزل مقصود تک پہنچنے کے ایک سے زیادہ راستے ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے مکمل تہذیب یافتہ انسان میں مجاہد کا سا عزم اور حوصلہ اور جرأت اور ایثار اور قوت عمل ہو، وہ اپنے مشاغل اور فرائض کو جوش اور انہماک کے ساتھ انجام دے لیکن اپنے احساس تناسب اور اپنے توازن کو قائم رکھے اور عقل اور جذبات کے تقاضوں کو عمل کی یورش میں نظر انداز نہ کرے۔ کسی ایک خیال کے اوٹ میں تمام دنیا اس کی نظر سے اوجھل نہ ہو جائے۔ مجاہدوں کے لئے بہترین مثال تاریخ اسلام کے مجاہد اعظم امام حسین علیہ السلام کی ہے جنھوں نے باوجود اپنے شوقِ شہادت کے، باوجود راہ خدا میں سرفروشی کرنے کے، باوجود انتہائی مظالم اور تکالیف برداشت کرنے کے حقوق العباد کو بھی کماحقہٗ ادا کیا اور عدل و تہذیب اور انسانیت کی ایک ایسی مثال قائم کردی جو ہمیشہ دنیا کے لئے شمع ہدایت بنی رہے گی۔

یونان قدیم کے مفکرین نے ان صفات کو جو تہذیب کے کمال کے لئے لازمی ہیں ایک لفظ Sophrosyne سے ادا کیا ہے۔ اس لفظ کی بالکل ٹھیک تشریح کرنی مشکل ہے "اعتدال" اُس کا

ایک جزو ضرور ہو لیکن اس صفت کو پوری طرح ظاہر نہیں کرتا۔ حیا اور خاکساری، جس حد تک بیجا تہور اور اوعائے خودی اور خودنمائی کو روکتی ہیں اس میں شامل ہیں لیکن اس کے کل مفہوم پر محیط نہیں۔ یہ سکون سے بھی بڑھ کر ہے اگرچہ سکون اس کا ایک جزو ضرور ہے۔ اس میں بے نفسی بھی شامل ہو اور ایک ایسا معیار اعلیٰ جو گھٹیا درجے کی خوشیوں اور فائدوں کو حقیر سمجھے۔ اس میں اعتدال اور ضبط نفس کی جو شان مضمر ہو وہ کسی بیرونی جبر یا دباؤ سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ آزادی اور اس کے صحیح استعمال کا ثمر ہوتی ہو۔ سر آرتھر کوئلر کوچ نے اپنے ایک لکچر میں اس کا ترجمہ "Assured mental grace" کیا ہے۔ ان کی رائے ہو کہ جس شخص میں یہ صفت ہوتی ہو وہ اپنی قابلیت کی حدود سے واقف ہوتا ہو۔ اسے یہ معلوم ہوتا ہو کہ دنیا ہر قسم کے لوگوں سے مل کر بنتی ہو۔ اس کو اپنی جگہ پر خاموشی اور اطمینان کے ساتھ اس بات کا یقین ہوتا ہو کہ وہ اپنی علمی تربیت کی بدولت ہر علم دوست حلقے میں شریک ہو کر مستفید ہو سکتا ہو۔ لیکن جب وہ وہاں سے گھر جاتا ہو تو وہ عقل مند ترین لوگوں کے قول کو بھی فیصلے کے لئے اپنے ضمیر کے سامنے پیش کرتا ہو کیونکہ اس کا ضمیر اور اس کے دل و دماغ اپنے ہیں جن میں صلاحیت اور سمجھ ہو اور وہ جانتا ہو کہ خواہ وہ اپنی صلاحیتوں کو کتنی ہی کسر نفسی کے ساتھ جانچے اس کا فرض ہو کہ وہ معاملات کو خود سمجھے اور ان پر غور کرے۔ اس بیان سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ تہذیب کے مفہوم میں ہمہ گیری، سکون اور عزت نفس شامل ہیں اور ہر قسم کا اوچھاپن، جھوٹی شیخی اور جھوٹی کسر نفسی تہذیب حقیقی کے منافی ہیں۔ اس مفہوم کی ایک عملی اور شخصی مثال حالی کے لاثانی اور غیر فانی مرثیہ غالب میں مل سکتی ہے۔

بلبل ہند مر گیا ہیہات — جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں نکتہ سنج نکتہ شناس — پاک دل پاک ذات پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج — رند اور مرجع کرام و ثقات
لاکھ مضمون اور اسکا ایک ٹھول — سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

خاکساروں سے خاکساری تھی — سربلندوں سے انکسار نہ تھا

لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلہ | دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا
بے ریائی تھی زہد کے بدلے | زہد اس کا اگر شعار نہ تھا

مظہر شان حسن فطرت تھا
معنی لفظ آدمیت تھا

تہذیب یافتہ انسان کی ایک اور امتیازی صفت یہ ہے کہ اس کے لئے ہر نیا تجربہ علم و حکمت کا ایک خزانہ ہوتا ہے جس سے اس کی دانشمندی، اس کی بردباری، اس کی انسانیت میں اضافہ ہوتا ہے اس کے لئے تجربات کی مثال ایسی نہیں جیسے کسی فائل میں بہت سے کاغذات شامل کر دیے جائیں بلکہ وہ اس کی وسعت پذیر شخصیت میں زیادہ گہرائی اور معنویت پیدا کرتے ہیں وہ ناگوار تجربات پر بھی چیں بجبیں نہیں ہوتا، نظام عالم اور خالق عالم کو الزام نہیں دیتا بلکہ ان سے بھی سبق اور استحکام حاصل کرتا ہے اس کے لئے دکھ سکھ سے زیادہ سبق آموز بن جاتا ہے کیونکہ مصیبت اور رنج کی آزمائش میں سے نکل کر اس کی طبیعت میں زیادہ نرمی، زیادہ ہمدردی اور زیادہ سمجھ پیدا ہو جاتی ہے۔

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطف خواب سے | ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

اس لئے انسان کی تہذیب اور تربیت میں ہر تجربہ خواہ وہ ناگوار ہو یا خوشگوار معین ہوتا ہے مرغ اور ہد ہد کے قصے میں جس کو اقبال نے نظم کیا ہے اسی طرف اشارہ ہے:

مرغے ز آشیانہ بسیر چمن پرید | خارے ز شاخ گل بہ تن نازکش خلید
بد گفت فطرت چمن روزگار را | ہم سوز خود و ہم ز غم دیگراں تپید
گفت اندریں سرا کہ بنایش فتادہ کج | صبحے کجا کہ چرخ در و شامہا نچید

یہ مرغ تہذیب سے عاری تھا اور یہ نہیں جانتا تھا کہ دکھ درد مصیبت کو کس طرح معین کار بنایا جا سکتا ہے۔ ایک تجربہ کار اور رمز شناس ہد ہد نے اس کی نالہ و زاری کو سن کر اس پر رحم کھایا اور کانٹے کو نکال دیا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ زریں نصیحت بھی کی جو غور کے قابل ہے:

گفتا کہ سود خویش ز جیب زیاں بیار | گل از شگاف سینہ زر ناب آفرید

درماں زدرد ساز اگر خستہ تن شوی   خوگر بخار شو کہ سراپا چمن شوی

عام لوگوں کی زندگی تو ذرا ذراسی آزمائشوں اور تکلیفوں سے تلخ اور بے کیف ہوجاتی ہے لیکن وہ اہل دل اور اہل نظر جن کو قدرت کی طرف سے نفس مطمئنہ ملا ہے اور جنھوں نے اصلی تہذیب کو حاصل کیا ہے انھیں تجربات کی بنا پر بلند سے بلند تر ہوتے جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تہذیب کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ایک مکان یا زمین کی طرح کسی شخص کی ملکیت ہوسکے وہ تو ایک خاص انداز سے زندگی بسر کرنے کا نام ہے جس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انسان اپنے تمام تجربوں کی مسلسل تنظیم و تشکیل کرتا رہے اور ان کی مدد سے پرانی چیزوں سے بھی نیا لطف اور کیف حاصل کرے بقول امریکہ کے معلم اعظم ڈیوی (Dewey) کے تہذیب کے معنی یہ ہیں کہ انسان میں یہ صلاحیت ہمیشہ بڑھتی رہے کہ وہ ہر چیز سے زیادہ وسیع اور زیادہ گہرے معانی حاصل کرسکے یہی وجہ ہے کہ اگر ایک تہذیب یافتہ شخص جس کے ذوق جمال کی تربیت ہوئی ہے تاج محل کو دیکھتا ہے تو اسے اس عمارت میں ایک ایسا جہان حسن و جمال دکھائی دیتا ہے جو ایک ناواقف بچے یا ایک جاہل بالغ کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ یہی حالت ہر قسم کی تحسین اور لطف اندوزی کی ہے۔ تہذیب خود انسان کی ذات اور اس کے مذاق میں ایسی معنویت پیدا کردیتی ہے کہ بہت سی چیزیں جو دوسروں کو معمولی نظر آتی ہیں اس کے لئے سرمایہ مسرت و تحسین ہوتی ہیں۔ ورڈسورتھ کا قول ہے کہ ہرے بھرے جنگل کی ہوا کا ایک جھونکا ہمیں انسان اور خیر و شر کے متعلق وہ باتیں سکھا سکتا ہے جو دنیا کے تمام دانشمند مل کر بھی نہیں بتا سکتے تا لیکن اس جھونکے کے پیغام کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں اس کے لئے صاحب دل اور صاحب نظر ہونا شرط ہے۔ اس لئے سعدی نے اپنے شعر میں "نظر ہوشیار" کی شرط لگادی ہے

برگِ درختاں سبز در نظر ہوشیار   ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

لیکن جس طرح یہ تہذیب یافتہ انسان ایک طرف معمولی چیزوں میں معنویت اور دل آویزی ڈھونڈھ نکالتا ہے اسی طرح وہ معیار اقدار کی رو سے بہت سی ان چیزوں کو حقیر سمجھتا ہے جو عوام الناس کے لئے بہت قیمتی ہیں اور جن کے لئے وہ تمام عمر جد و جہد کرتے ہیں اور حق تلفی اور ظلم کے

مرتکب ہوتے رہتے ہیں مثلاً دولت شہرت، اعزاز و خطابات۔ وہ ان کے لئے اپنا سکون قلب اور قناعت کھونے کو تیار نہیں ہوتا بلکہ لوگوں کی مجنونانہ جد و جہد پر ہنستا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ دنیاوی قوت اور عزت کے لئے ایک حد تک جد و جہد کرے کیونکہ ہم تہذیب کو ترک دنیا کا مرادف نہیں سمجھتے لیکن وہ اس کشمکش میں ہرگز اس درجہ منہمک نہیں ہوتا کہ اپنے احساس تناسب اور ذوق ظرافت کو کھو بیٹھے اور جن چیزوں کی حیثیت محض ذرائع کی ہے ان کو مقصد زندگی بنالے۔

آخر میں ہمیں اس مسئلہ سے بحث کرنی چاہیئے کہ ہمارے نقطۂ خیال کے مطابق منشائے حیات کیا ہے اور ہمارے نزدیک تہذیب یافتہ انسان کا رویہ اس بارے میں کیا ہونا چاہیئے جن لوگوں کی تمام تر امیدیں اسی دنیا کے ساتھ وابستہ ہیں، جن کا خیال ہے کہ چراغ حیات گل ہو جانے سے انسان کی روح اور شعور و احساس بھی فنا ہو جاتے ہیں ان کا تو اعتقاد لازماً یہی ہونا چاہیئے کہ مدت حیات کو غنیمت جان کر انسان کو جو کچھ لینا، حاصل کرنا اپنے قبضہ اور تصرف میں لانا ہے اس کو لے لے۔ اس لحاظ سے انسان کا فرض اور مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دنیا کی جس قدر نعمتوں پر قبضہ کرسکے کرے اور کنجوسوں کی طرح جب تک ممکن ہو ان پر قبضہ کئے بیٹھا رہے اور ان کو صرف نہ کرے۔ زندگی کے اس نظریہ کی مختلف مثالیں ہمارے چاروں طرف موجود ہیں۔ معاشی زندگی میں سرمایہ داری کا نظام، سیاست میں ملک گیری اور اقلیم رانی کی ہوس، معاشرتی تعلقات میں تنگ نظری اور خود غرضی یہ سب اس مفروضے پر قائم ہیں کہ انسان بالطبع خود غرض ہے وہ لینا چاہتا ہے، ذخیرہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کو دینا، خرچ کرنا ناگوار ہوتا ہے۔ ملکیت اس کی جبلت ہے، سخاوت اس کی فطرت کا جزو نہیں اس کے برخلاف دوسرا نظریہ زندگی وہ ہے جو بہترین انسانوں کا ہمیشہ رہا ہے۔ اس کی رو سے زندگی امانت الٰہی ہے جس کو خدا کی راہ میں فیاضی کے ساتھ بسر کرنا چاہیئے انسان کو مختلف قوتیں اس لئے دی گئی ہیں کہ وہ انھیں اعلیٰ انسانی مقاصد کی خدمت میں صرف کرے یہ نظریہ نفس پرستی اور عیش پسندی کے بجائے خدمت اور ایثار کی تعلیم دیتا ہے اور لوگوں کو یہ سکھاتا ہے کہ وہ اپنی ذات کو اور اپنی تمام قوتوں کو ایک کنجوس دولتمند کی طرح مقفل کر کے نہ رکھیں بلکہ ان کو بیدریغ رفاہ عام کے لئے صرف کریں کیونکہ جس طرح علم خرچ کرنے سے کم نہیں ہوتا بلکہ بڑھتا ہے اسی طرح انسان

کی اخلاقی اور روحانی قوتوں کو خدمت کے ذریعے اور زیادہ فروغ حاصل ہوتا ہے جو لوگ اپنے نفس کو رضائے الٰہی کی خاطر بیچ ڈالتے ہیں وہی اس کی اصلی قیمت حاصل کرتے ہیں کیونکہ بقول حضرت عیسیٰ کے "وہی شخص اپنی روح کو پائے گا جو اسے کھو دینے کے لئے تیار ہو۔" اس لحاظ سے اسلامی تعلیم قدیم اور جدید مغربی تعلیم اور فلسفہ پر بہت نمایاں فوقیت رکھتی ہے خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے عصر جدید میں ایک مضمون "تعلیم کی ظاہری غرض اور انتہائی مقصد" کے عنوان سے لکھا تھا جس میں انھوں نے اس امر سے بحث کی ہے کہ منشائے حیات اور منتہائے تعلیم کے بارے میں مغربی اور اسلامی نقطۂ نظر میں کیا فرق ہے؟" جدید تعلیم یا مغربی فلسفہ قرار دیتا ہے کہ اعلیٰ خود غرضی اخلاق کی بنیاد ہے۔ اعلیٰ خود غرضی سے مراد یہ ہے کہ عقل و اندیش اپنی غرض اور مصلحت کو سمجھے۔ یہ نہیں کہ جس بات سے آج آرام و آسائش معلوم ہوتی ہے اور کل کو اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے اس سے ضرر ہو اس کو انسان اچھا سمجھ کر کرنے لگے۔ یہ تو ادنیٰ غرض ہے اسلامی تعلیم یہ کہتی ہے کہ شخصی اور نوعی غرض بالکل جائز اور بجا ہے مگر وہ ادنیٰ درجہ کی ہے۔ اصلی انسانیت کا معیار یہ ہے کہ ذاتی خواہشوں کو مشیت ایزدی اور قوانین کل کے تابع کر دے۔ یا ایھا الذین آمنوا انفقوا مما رزقنٰکم من قبل ان یاتی یوم لا بیع فیہ ولا خلۃ ولا شفاعۃ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان اپنی کل قوتوں اور دولت کو یہاں خرچ کرے کہ یہ زندگی اسے اس لئے دی گئی ہے کہ وہ اپنے عمل سعی اور ایثار سے حیات ابدی حاصل کرے۔ جو لوگ اس اصول کو نہیں سمجھتے اور خدا کی دی ہوئی قوتوں اور نعمتوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے وہ کافر یعنی ناشکرے اور ظالم ہیں اور تاریکی میں ہیں۔.... جدید تعلیم سکھاتی ہے کہ کھاؤ پیو اور خوش رہو کیونکہ کل تم مر جاؤ گے۔

نوروز و نوبہار و مے و دلبر خوش است	بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اسلامی تعلیم کہتی ہے کہ کھاؤ پیو مگر حالت اعتدال سے نہ نکلو کیونکہ بے اعتدالی اور بیجا کام انسانیت کی موت ہے" (عصر جدید جلد ۹) ہم نے جس تہذیب کی تعریف اور تشریح اس مضمون میں کی ہے وہ قطعی طور پر تنگ نظری، خود غرضی اور خود پسندی کے منافی ہے اور انسان سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو بہترین اور بلند ترین مقاصد انسانی کے لئے صرف کرے اور اُن کی تحصیل کے لئے مزدوروں کی

طرح کام کرے۔ ہم تہذیب کو عیش نصیب اور فرصت پسند لوگوں کا مشغلہ تفریح بنانے کے لئے تیار نہیں ہمیں ایسے انسانوں کی ضرورت ہے جو عقل سلیم اور سلامت روی کے ساتھ اپنے تمام حقوق و فرائض پر ہمہ گیر نظر ڈال سکیں اور ان کو خلوص اور انہماک کے ساتھ پورا کریں۔

میں اس مضمون کو ختم کر کے اس پر نظر ڈالتا ہوں تو میرے دل میں دو مختلف خیالات پیدا ہوتے ہیں کبھی تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ میں نے تہذیب نفس کیلئے جن صفات کو لازم قرار دیا ہے وہ سب متفق علیہ ہیں میں نے کوئی بات ایسی نہیں کہی جس پر کسی قدامت پسند شخص کو بھی اعتراض ہو۔ رواداری، عدل، ذہنی آزادی، دلچسپی کی بیداری، زندگی کو امانت الٰہی سمجھنا، کام کو خدا کی نعمت خیال کرنا، اس کو عار نہ سمجھنا، یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جنکو کم از کم نظری طور پر ہر زمانہ میں لوگوں نے تسلیم کیا ہے لیکن اسکے ساتھ ہی یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ میں نے تہذیب کے مروجہ مفہوم کا کماحقہ، احترام نہیں کیا میں نے تہذیب یافتہ لوگوں کی شان میں بہت سی گستاخیاں کی ہیں ان سے کام اور محنت کا مطالبہ کیا ہے ان کے احساس خودی کو ٹھیس لگائی ہے اور انھیں انکے مقام علیین سے اتار کر معمولی جاہل اور ناشائستہ مزدوروں اور کسانوں کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا ہے ان کے دل میں یہ تحریک پیدا کرنیکی کوشش کی ہے کہ وہ بالکل معصوم اور بے خطا نہیں ہیں بلکہ ممکن ہے وہ کسی معاملے میں غلطی پر ہوں۔ میں نے فنون لطیفہ، علمیت، مذہبیت اور شائستگی پر زیادہ زور دینے کے بجائے انسانیت پر زیادہ زور دیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس تمام بیان سے تہذیب یافتہ انسان کی جو تصویر مرتب ہوتی ہیں وہ اتنی دلکش اور نظر فریب ہے یا نہیں جیسی اس کی روایتی تصویر۔ لیکن مجھے یہ یقین ہے کہ تہذیب کا یہ مفہوم زیادہ مفید زیادہ پائیدار اور زیادہ عملی ہے۔ اس کے لئے یہ شرط نہیں کہ انسان خاص طور پر خوش نصیب ہو اور اس کے حالات غیر معمولی ہوں بلکہ اس تہذیب کی شان ہر شخص اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے۔ جو خلوص اور ہمت کے ساتھ اس پر آمادہ ہو۔

معاہدۂ عمرانی[1]

"انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جدھر دیکھو وہ پابزنجیر ہے" ان الفاظ کے ساتھ روسو اپنی کتاب "معاہدۂ عمرانی" شروع کرتا ہے۔ آزادی، مساوات، حکومت عوام، ایسے تخیلات نہیں جن سے دنیا روسو سے پہلے آشنا نہ ہو۔ روسو کا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے انھیں انسان کا "حق" ثابت کیا اور کسی چیز کو خیرات کے طور پر مانگنے اور حق کے طور پر طلب کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

روسو کو فرانسیسی انقلاب کا "روحانی باپ" کہا جاتا ہے۔ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ یہ انقلاب نتیجہ تھا محض روسو (یا دوسرے فلسفیوں) کے سیاسی نظریوں کا تو اس میں بلا خبہ مبالغے کو دخل ہے اس طرح کے انقلاب کتابوں کے ذریعہ رونما نہیں ہوا کرتے۔ وہ نتیجہ ہوتے ہیں حقیقی آلام و مصائب کا اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ فرانس میں انقلاب سے پہلے معاشی اعتبار سے جمہور انتہائی افلاس اور سیاسی نقطۂ نظر سے حد درجہ کی غلامی کا شکار تھے۔ البتہ روسو نے اپنے عہد کی نبض کو خوب پہچانا جو کچھ لوگوں کے دلوں میں تھا وہ روسو کی زبان قلم پر آیا۔ قوم اپنے آپ کو بے بس اور لاچار خیال کرتی تھی۔ روسو نے اُسے یقین دلایا کہ وہ تو خود تمام تر دنیاوی اقتدار کا منبع ہے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ روسو کی تصنیف "معاہدۂ عمرانی" فرانسیسی انقلاب کے علمبرداروں کے لئے آسمانی کتاب بنی اور انھوں نے "حقوق انسانی" کے تخیل سے فرانسیسی بادشاہت مطلقہ اور نظام جاگیرداری کا قلع قمع کرنے میں انمول مدد لی۔

روسو زندگی اور سوسائٹی کو مظلوم، کمزور اور فاقہ کش انسان کی نظر سے دیکھتا ہے سیاسی

---

[1] ڈاکٹر محمود حسین صاحب نے روسو کے Contrat Social کا ترجمہ اردو میں کیا ہے، یہ مضمون اس کا مقدمہ ہے۔ ترجمہ اردو اکادمی سے شائع ہونے والا ہے۔ (مدیر)

عدم مساوات ہی نہیں معاشرتی عدم مساوات بھی اس کی آنکھ میں کانٹے کی طرح چبھتی ہے۔ اس کے نزدیک ایک بڑا جاگیردار جو لوگوں کا پیٹ کاٹ کر انھیں مفلس بنائے اسی قدر قابل نفرین ہے جتنا ایک مطلق العنان بادشاہ جوان کے گلے میں غلامی کا طوق ڈالے۔

روسو جن حالات اور جس گرد و پیش میں پیدا ہوا اور جن جن مصیبتوں، دشواریوں اور ناکامیوں سے اُسے اپنی زندگی میں بچپن ہی سے دوچار ہونا پڑا ان کا پورا پورا عکس اس کے خیالات میں نظر آتا ہے۔ اور اس وجہ سے خاص طور پر ضروری ہے کہ روسو کے فلسفے پر غور کرنے سے پہلے اس کے سوانح حیات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

زندگی | ژاں ژاک روسو کا تعلق ایک ایسے فرانسیسی خاندان سے تھا جس کے ارکان کو سولھویں صدی کے وسط میں پیرس سے جینوا ہجرت کرنی پڑی۔ وہ اپنے پروٹسٹنٹ مذہب کو خیرباد کہنے کے لئے تیار نہ تھے اور اس صورت میں ان کے لئے یہی مناسب تھا کہ وہ جینوا چلے جائیں جو اس وقت پروٹسٹنٹ تحریک کا بڑا بھاری مرکز تھا۔ سوئیٹان کے اس چھوٹے سے آزاد، جمہوری شہر میں پیدا ہونے اور وہاں بچپن کا زمانہ گذارنے کا روسو پر نمایاں اثر ہوا۔ روسو کے خاندان کے اکثر لوگ گھڑیاں بنا کر روزی کماتے تھے۔ روسو کا باپ بھی گھڑی ساز تھا۔ اس کا تعلق شہر کے پانچ طبقوں میں سے اس بیچ کے طبقے سے تھا جو گو سب سے بلند مرتبہ تو نہ تھا مگر جسے شہری حقوق حاصل تھے۔ اور یہی تھا وہ طبقہ جو اٹھارہویں صدی کے شروع سے بلند ترین سر کو نیچا کر کے اپنے لئے حقوق حاصل کرنا چاہتا تھا۔

روسو کے باپ کے مزاج میں حد سے زیادہ آزادپسندی تھی، اور طبیعت میں جھگڑالوپن۔ سیر و سیاحت پر وہ حد درجہ فریفتہ تھا (یہ تمام اوصاف ہیں جو بیٹے میں بھی بدرجہ اتم موجود تھے) شادی کے چند ہی سال بعد بچوں کو خدا پر چھوڑ اس نے قسطنطنیہ کا رخ کیا۔ غالباً یہ سفر اسے مالی مشکلات کی وجہ سے اختیار کرنا پڑا تھا۔ وہ جب وہاں سے واپس آیا تو اس کا منجھلا بیٹا ژان ژاک پیدا ہوا۔ (۲۸ جون ۱۷۱۲ء) ابھی یہ بچہ آٹھ ہی دن کا ہوا تھا کہ ماں اس دنیا سے رخصت ہوگئی اور اس کی پوری تربیت کا بوجھ باپ کے سر پڑا۔

ژاں ژاک کی تربیت جس ڈھب کی ہوئی اس کا یہی تقاضا تھا کہ وہ جذبات و احساسات کا بندہ ہو، اس کے دل میں امنگیں، طبیعت میں بے چینی اور مزاج میں تلون ہو۔ اس کی عمر ابھی کوئی سات آٹھ سال کی ہوگی کہ باپ نے اس کے ساتھ ایسے قصے کہانیاں اور تاریخی کتابیں پڑھنا شروع کیں جو تو سن خیال کے لئے چابک کا کام دیں۔ باپ اور بیٹا اس قدر اس انہماک کے ساتھ کتابیں پڑھتے اور ان پر گفتگو کرتے رہتے تھے کہ بعض اوقات ساری ساری رات بیٹھے ہی گذر جاتی تھی حتیٰ کہ چڑیوں کے چہچوں سے انہیں یہ پتہ چلتا تھا کہ صبح ہوگئی۔ اور باپ کو بیٹے سے یہ کہنے کا موقع ملتا تھا کہ "لڑکے! مجھ میں تو تجھ سے بھی زیادہ بچپن ہے!"

روسو دس برس کا ہونے پایا تھا کہ اس کے باپ کو ایک جھگڑے کی وجہ سے جنیوا چھوڑنا پڑا اب روسو بے ماں باپ کا رہ گیا اور جنیوا کے پاس ایک گاؤں میں اپنے ایک عزیز کے ہاں جو پادری تھا رہنے لگا خود روسو کا خیال ہے کہ دنیائے فطرت سے اس کا دل لگاؤ اسی زمانہ سے شروع ہوا بچپن ہی میں بے انصافی سے نفرت کے جذبے نے اس کے دل میں گہری جگہ کرلی تھی اور یہ جذبہ پیدا کرنے کی فوری وجہ وہ سزائیں تھیں جو بعض اوقات بلا قصور اُس کے حصے میں آتی تھیں۔ دوسری چیز جس کا اس دو برس کے عرصہ میں روسو کو تجربہ ہوا وہ اس میں وقت سے پہلے جذبۂ شہوانی کے آثار تھے زندگی کا یہ وہ پہلو ہے جس کے متعلق عموماً لوگ خاموشی اختیار کرتے ہیں مگر روسو نے اپنے "اعترافات" میں ہر چیز کا اعتراف کرلیا ہے!

روسو دو برس اسی طرح گذار کر پھر جنیوا آگیا۔ اب اس کا قیام اپنے چچا کے ہاں رہتا تھا۔ دو تین برس اس نے یوں کہنا چاہیئے کہ ضائع کئے۔ البتہ اس عرصے میں تھوڑی بہت نقاشی اور اقلیدس سیکھی۔ اب پیشے سے متعلق روسو کے سامنے تین تجویزیں تھیں۔ گھڑی سازی، وکالت اور مذہبی امامت (تنوع قابل داد ہے!) روسو کو جیسا کہ وہ خود کہتا ہے ان میں سے آخری کام سے دلچسپی تھی۔

روسو اُن بدقسمت لوگوں میں سے ہے جنھیں بچپن ہی سے اپنی روزی آپ کمانے کی فکر کرنی پڑتی ہے چنانچہ باپ کے جنیوا سے رخصت ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد جب کہ اس کی عمر مشکل سے

گیارہ برس کی ہوگی اس نے ایک سرکاری وکیل کے ہاں دفتر میں کام شروع کیا مگر وکیل اس کے کام سے ذرا بھی مطمئن نہ تھا۔ وہ روسو کو نہایت کند ذہن اور ناکارہ سمجھتا تھا اور آخر کار اس کو برطرف کر دیا۔ اب روسو ایک کندہ کار کے پاس کام سیکھنے لگا۔ اس مشغلے سے اسے خاصی دلچسپی تھی مگر سلوک بے چارے کے ساتھ یہاں بھی بہت برا ہوتا تھا۔ یہ آزاد منش انسان اپنے اوپر پابندی مشکل سے عاید کر سکتا تھا اور تھوڑے ہی دنوں میں اس کا جی کام سے اکتا گیا۔ اس دوران میں روسو کی خوشی کا دن اتوار ہوتا تھا جب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ شہر سے دور جنگل میں سیر کے لئے جایا کرتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ یہ لڑکے سیر سے اتنی دیر میں واپس آتے تھے کہ رات کے وقت شہر کے دروازے بند ہو جاتے تھے۔ دو مرتبہ روسو کو اسی بات پر سخت سزا دی جا چکی تھی۔ ایک مرتبہ (۱۷۲۸ء میں) جب پھر ایسا اتفاق ہوا کہ روسو کو شہر کے دروازے بند ملے تو اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ سزا نہیں بھگتے گا۔ وہ گھر بار چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا اور اس نے ایک دوسری سمت کا رخ کیا جو کچھ بھی ہو کیسی بھی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے لیکن اس نے جی میں ٹھان لی کہ اب وہ ذرا اس دنیا کی ہوا کھائے گا جس کے اب تک وہ محض خواب دیکھا کرتا تھا۔ کیا عجب ہو کہ وہ ہر طرح کی پابندی سے آزاد رہ کر بھی خوش اور خرم زندگی بسر کر سکے۔ اس آوارہ گردی میں روسو کی آنکھوں کے سامنے ایک نئی دنیا آئی، گو اس میں شبہ ہو کہ یہ دنیا وہی تھی جس کی اس کو تلاش تھی۔ بہرحال اس واقعہ سے یہ پتا ضرور چلتا ہے کہ روسو پر فوری جذبات کس قدر حاوی ہو جاتے تھے۔ کسی ایک ذرا سے واقعہ سے اس کی زندگی کا رخ سرے سے بدل جانا معمولی بات تھی۔

جینوا سے فرار ہو کر روسو سوائے (Savoy) کے حدود میں پہنچا۔ سوائے کے کیتھولک ڈیوک اور جینوا کے پروٹسٹنٹ پیشواؤں کی آپس میں خوب چلی ہوئی تھی۔ روسو ایک کیتھولک پادری کے ہاتھ پڑا۔ اس نے نوجوان لڑکے کی خوب خاطر مدارات کی اور اسے اپنے مذہب میں داخل کر لیا۔ گو اُس نے روسو کو اپنے مذہب کی خوبیاں سمجھانے کی پوری کوشش کی مگر روسو کے لئے اس وقت کیتھولک مذہب کی تائید میں سب سے بڑی دلیل شراب سرخ کا جام تھا جو پادری نے لذیذ کھانوں

کے ساتھ اس کے سامنے پیش کیا!

اب روسو ایک خاتون مدام دے وارین کے پاس بھیجا گیا، جس نے ایسے نوجوانوں کی خدمت اپنا پیشہ بنایا تھا جو کیتھولک مذہب میں نئے نئے داخل ہوتے تھے۔ مدام دے وارین کی بھی عجیب شخصیت تھی، روسو کی طرح اس نے بھی اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کیا تھا۔ مگر کیتھولک مذہب قبول کرنے کے بعد بھی مذہبی معاملات میں بہت آزاد خیال اور نوجوانوں کے ساتھ تعلقات میں شاید اور بھی آزاد تھی۔ تصوف سے اسے دلچسپی تھی۔ کیمیا بنانے کا اسے شوق تھا اور تجارتی سٹے بازی کا اسے مرض۔ نیک اور بد دونوں قسم کے خیالات اور جذبات اس میں یکجا پائے جاتے تھے۔ روسو کی فطرت بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھی۔ اس عورت کی صحبت میں روسو کے برے اور بھلے دونوں قسم کے رجحانات کو بڑی تقویت پہنچی۔ مدام دے وارین نے پہلی ہی ملاقات میں اپنے حسن اخلاق سے روسو کا من موہ لیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اسے ایک ایسی ذات ہاتھ آئی ہو جو ماں کی طرح اس کی خبر گیری کرے، معشوقہ کی طرح اس پر جان دے، استاد کی طرح اس کے دماغی نشوونما میں مدد دے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی مالی پریشانیوں کو دور کرنے کے قابل ہو، مگر روسو کا قیام چند ہی روز وہاں رہ سکا اور وہ تورین بھیجا گیا۔

روسو نے تورین تک کا سفر پیدل کیا۔ یہی سفر تھا جس کے بعد سے روسو مناظر فطرت اور پاپیادہ سفر پر جان دینے لگا۔ پہاڑ اور وادیاں، سبزہ زار اور چشمے اس کے لئے جاندار، بولتی چالتی چیزیں بن گئیں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ روسو نے بعد میں دنیا کو تمدن سے ہٹ کر فطرت کی طرف پلٹنے کا سبق دیا۔

تورین میں روسو نے پہلے ایک مسیحی خانقاہ میں تعلیم حاصل کرنا شروع کیا، پھر وہ وہاں کے قدیم گرجا میں رہنے لگا۔ کچھ دنوں بعد وہاں سے اسے تھوڑا سا روپیہ دے کر رخصت کر دیا گیا۔ اب اس نے طرح طرح سے روزی کمانے کی کوشش کی، کچھ دن محرر رہا، کچھ دن معمولی خدمتگار۔ اس زمانہ میں اس کے اخلاق پر بہت برا اثر ہوا اور اسی زمانہ میں وہ واقعہ پیش آیا جس کی یاد ہمیشہ اس کے

لئے سخت تکلیف کا باعث ہوتی تھی، یعنی اس نے اپنے مالک کے ہاں ایک چھوٹی سی چوری کی اور جب اس پر شبہ کیا گیا تو اس نے اپنے اوپر سے الزام ہٹانے کے لئے ایک غریب لڑکی کا نام لے دیا جو اُسی کی طرح گھر میں ملازم تھی۔ بے قصور لڑکی مصیبت میں پڑ گئی۔ اپنی یہ ذلیل حرکت روسو مرتے دم تک نہ بھولا۔

کچھ عرصہ بعد روسو خدمتگاری سے ترقی کر کے سکریٹری بن گیا۔ گھر والوں کو اب اس کی صلاحیتوں کا اندازہ ہو چلا تھا۔ اور وہ اس فکر میں تھے کہ جلد اسے ترقی دیں۔ مگر آوارہ گردی کا جذبہ روسو میں پھر عود کر آیا وہ پھر پہاڑوں، دریاؤں، سبزہ زاروں اور مادام دے وارین کے خواب دیکھنے لگا، چنانچہ اس نے پھر اس خاتون کے گھر کا رخ کیا۔ وہاں اس کا بہت اچھی طرح خیر مقدم ہوا۔ روسو نے کچھ دن اطمینان کی زندگی گذاری۔ اسے پیسے کمانے کی فکر سے نجات مل گئی اور اس نے مذہبی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ تھوڑے دنوں میں اس تعلیم سے بھی اس کا جی سیر ہو گیا۔ اب اسے موسیقی کا شوق ہوا اور اس نے اسی سلسلہ میں سوئٹیان کے مختلف حصوں کا پیدل سفر کیا۔ سفر کے دوران میں ایک فرانسیسی سفارت خانہ تک اس کی رسائی ہوئی۔ سفارت خانہ کے بعض اراکین کے مشورہ سے فوج میں داخل ہونے کی غرض سے پیرس گیا مگر وہاں پہنچ کر جب اُس نے دیکھا کہ اسے افسر کی حیثیت سے نہیں بلکہ معمولی سپاہی کے طور پر بھرتی کیا جائے گا تو وہ مدام دے وارین کے پاس واپس آ گیا۔ کچھ دنوں ایک دفتر میں کام کیا، مگر ایسا شخص جو تخلیقی دماغ لے کر پیدا ہوا ہو بھلا دفتر کا کام کب تک کر سکتا تھا۔ اُس نے پھر موسیقی کی طرف توجہ کی اور اپنے قصبے کی بعض لڑکیوں کو سبق دینے لگا۔ روسو کا خیال ہے کہ وہ سب کی سب نہایت حسین تھیں فطرتاً روسو کو اس مشغلے سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی، مگر جب مدام دے وارین نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھا تو اس خیال سے کہ کہیں روسو پر کسی اور کا جادو نہ چل جائے خود روسو کے ساتھ سلسلۂ عشق شروع کر دیا! عشق کی یہ کہانی بھی بڑی عجیب ہے۔ جسے وہ اب تک "ماں" کہہ کر پکارا کرتا تھا وہ اس کی محبوب نظر بن گئی اور پھر ستم یہ کہ "محبوبہ" کی نظر التفات ایک روسو ہی پر نہیں تھی۔ اس اجمال کی تفصیل چنداں ضروری نہیں۔

ہمارے لئے اس قصے سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس زمانے میں روسو کی راہ و رسم اپنے طبیب ڈاکٹر سالومون سے بڑھی۔ یہ ایک جیّد عالم تھا اور دیکارتی[1] مذہب فلسفہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے روسو کو فلسفہ اور علوم فطریہ کی طرف توجہ دلائی۔ اسی کے کہنے پر اس نے والتیر[2] کی ایک کتاب کا مطالعہ کیا، اور اسی کے بعد سے فلسفہ سے اسے بڑی رغبت ہوگئی۔ لاک اور نیوٹن کے فلسفہ سے بھی وہ آشنا ہوا۔ روسو پر دیکارت اور لاک دونوں کا گہرا اثر ہے۔ اسے لاک کا بھی شاگرد کہا جا سکتا ہے اور دیکارت کا بھی۔ جب اُسے فلسفہ کے مختلف مذاہب میں اختلاف نظر آتا تھا تو اسے خود سوچنے اور غور کرنے کا موقع ملتا تھا۔ فلسفہ کے علاوہ ریاضی، لاطینی، اور تاریخ کے مطالعے سے بھی اسی زمانہ میں روسو کو دلچسپی پیدا ہوئی۔ مگر ان تمام علوم کی تحصیل کا مقصد صرف اپنی دماغی نشو و نما تھا۔ لیکن روسو کے پیش نظر یہ بھی تھا کہ اس طرح ممکن ہے اسے کوئی اعلیٰ خاندان اپنے ہاں استاد یا سکرٹیری کے طور پر رکھ لے۔

۱۷۴۱ء تک روسو اسی طرح مدام دے وارین کے پاس رہا۔ کبھی جب کوئی نیا رقیب پیدا ہو جاتا تھا، یا اسے سیر و سیاحت کا شوق چرّاتا تھا تو وہ کچھ دنوں کے لئے کہیں چلا جاتا تھا۔ مگر تھوڑے کے بعد مدام موصوفہ کی کشش اسے پھر وہیں کھینچ لاتی تھی۔ البتہ جب مدام دے وارین کی مالی حالت بہت خراب ہوگئی تو روسو نے فیصلہ کیا کہ وہ پیرس جا کر موسیقی کی تحریریں بیچ بیچ کر اپنی روزی کمائے گا اور اگر ممکن ہوگا تو مصیبت کے وقت اپنی محسنہ کی بھی مدد کرے گا۔ مگر پیرس میں روزی کمانا کچھ بہت آسان نہ تھا۔ البتہ اس سلسلہ میں اس کی ملاقات پیرس کے علمی اور ادبی حلقوں کے مشہور مشہور لوگوں سے ہوگئی۔ انھیں میں سے بعض کی عنایت سے روسو کو چند سال بعد وینس کے فرانسیسی سفیر کے ہاں سکرٹیری کا عہدہ مل گیا۔ اس مشہور اور قدیم جمہوریہ میں قیام روسو کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ یہاں اس کی تاریخی معلومات میں بھی بہت اضافہ ہوا۔ نیز وینس کے قانون دستوری سے اُسے بڑی دلچسپی پیدا

---

[1] دیکارت، (Descarte) فرانسیسی فلسفی اور ریاضی کا علامہ (۱۵۹۶ء تا ۱۶۵۰ء)

[2] والتیر، مشہور فرانسیسی فلسفی، ادیب اور مورخ، روسو کا ہمعصر (۱۶۹۴ء تا ۱۷۷۸ء)

ہوگئی۔ اور یہیں دستور پر کتاب لکھنے کا خیال اسے پہلی مرتبہ آیا۔ اطالوی موسیقی اسے بہت پسند آئی اور بعد میں پیرس جاکر فرانسیسی موسیقی کے مقابلہ میں اطالوی موسیقی کو رواج دینے کی اُس نے سرگرم کوشش کی مگر وینس میں اس کا قدم بہت دنوں نہ ٹک سکا۔ وہاں سے جی اکھڑنے کی بڑی وجہ فرانسیسی سفیر کا غرور و تکبر تھا۔

وہ پیرس واپس آگیا اور ایک اوپرا opera میں کام کرنے لگا۔ اب وہ جس ہوٹل میں رہتا تھا اس میں ایک نوجوان لڑکی بھی ملازم تھی۔ روسو کو رفتہ رفتہ اس سے بڑی محبت ہوگئی، اگر اطالیہ اور سوئٹیاق کے اکّے دکّے واقعات سے قطع نظر کرلی جائے جب عارضی طور پر روسو کے قدم ڈگمگا گئے تو روسو کا مادام دے وارین کے بعد یہ دوسرا عشق تھا روسو نے بعد میں کہا ہے کہ اصل میں اُسے اُس لڑکی دھتریسے والیسور) سے عشق نہ تھا۔ اسے تلاش تھی ایک ہستی کی جو اس سے ہمدردی کرے اور جس کے سامنے وہ اپنے دل کی کہانی سنا سکے۔ اس "بت دہقان" میں اسے ایسی ہستی دستیاب ہوگئی۔ اس لڑکی کے دماغی نشو ونما کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ باوجود روسو کی جانکاہ کوشش کے پڑھنا عمر بھر نہ سیکھ سکی اسے چار اور چار کو صحیح جوڑنا تک نہیں آیا۔ گھڑی دیکھ کر وقت وہ نہیں بتا سکتی تھی۔ مہینوں کے نام سلسلہ وار اسے یاد نہیں تھے ظاہر ہے کہ یہ تعلق جو پچیس برس تک قائم رہا روسو کے لئے بہت خوشگوار نہیں ہوسکتا تھا۔ اسے روسو کے علمی کام سے نہ کوئی دلچسپی تھی نہ ہوسکتی تھی۔ روسو کا روزانہ میلوں ٹہلنا اسے پسند نہ تھا۔ پھر روسو کی پریشانی کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ اس کا پورا گھرانا روسو کے سر کھاتا تھا۔ مگر جب روسو کی اس سے اولادیں ہوئیں اور اس نے اپنے پانچوں بچوں کو یتیم خانہ میں بھجدیا تو پھر دونوں کے تعلقات بہت کشیدہ رہنے لگے۔ بچوں کا یتیم خانہ میں بھیجنا روسو کے سیاہ ترین اعمال میں سے ہے اور گو اُس نے بعد میں طرح طرح کے عذر اور حیلے تلاش کرلئے مگر اسے اپنے اس فعل کی برائی کا اچھی طرح احساس تھا چنانچہ "ایمیل" میں لکھتا ہے "جو باپ کے فرائض انجام دینے کے قابل نہ ہو اسے اس کا کوئی حق نہیں کہ باپ بنے۔ نہ غربت، نہ کام کی زیادتی اور نہ لوگوں کا خوف اسے اس فرض سے بری کرسکتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش آپ کرے اور خود انھیں تعلیم دے۔ میری کتاب کے پڑھنے والو! میری بات پر یقین کرو۔ میں ہر اس شخص کو بتائے دیتا ہوں

جس کے سینے میں دل ہے۔ اور جو پھر بھی ان مقدس فرائض کو انجام دینے سے قاصر رہتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے اس گناہ پر خون کے آنسو روئے گا اور اس کے دل کو کبھی تسلی نہ ہو پائے گی۔"

روسو اور اس کے حامیوں نے اس فعل کی بہت سی توجیہیں کی ہیں مگر ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں جو ہماری تشفی کر سکے۔ روسو کی زیادتی ہے جب وہ اپنے اس طرز عمل کو غریب افلاطون کے سر تھوپتا ہے۔ کہ اس نے اپنی "ریاست" میں اسی کا مشورہ دیا ہے! روسو کا یہ خیال بھی محض بہانہ ہے کہ یتیم خانہ میں بچے گھر سے بہتر تعلیم پا کر نہایت محنتی کاشتکار بنیں گے اور ایمانداری کے ساتھ روزی کمایا کرینگے واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں ایسے اداروں سے جو بچے پڑھ کر باہر نکلتے تھے وہ جرائم پیشہ اور کسبیوں کے طبقے میں شامل ہوتے تھے۔ روسو کے وکلا کا یہ خیال بھی بے معنی ہے کہ روسو ایسا کرنے میں اس وجہ سے حق بجانب تھا کہ وہ بچے دراصل اس کے تھے ہی نہیں اولاً اگر ایسا ہوتا تو روسو کے "اعترافات" میں جہاں اس نے کچھ بھی نہیں چھپایا ہے، اس کی طرف بھی اشارہ ضرور ہوتا۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ایسا ہی تھا تو اس عورت سے قطع تعلق کے لئے یہ معقول اور کافی وجہ ہو سکتی تھی۔ مگر غریب بچوں کا بھلا اس میں کیا قصور تھا؟ مگر روسو بچوں کی ماں کو تو ان تمام واقعات کے بعد بھی اپنے لئے دنیا کی سب سے بڑی نعمت سمجھتا رہا۔

روسو کو پیرس میں پھر ایک ایسا موقع ہاتھ آیا کہ اگر وہ چاہتا تو چین سے زندگی گذار سکتا تھا۔ وہ ایک بڑے عہدہ دار کا سکریٹری ہو گیا۔ مگر اسی زمانہ میں (سنہ ۱۷۵۰ء) اس کی پہلی تصنیف شائع ہوئی جس کا ہم اس کی تصانیف کے تحت میں مفصل ذکر کریں گے کتاب جس قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی اس نے روسو کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے آرام اور اطمینان کو قربان کرے اور اپنا علمی مشغلہ جاری رکھے۔ اس نے اپنی ضروریات زندگی کو بہت محدود کر لیا اور پھر اپنی روزی موسیقی کی تحریریں بیچ بیچ کر کمانے لگا۔

سنہ ۱۷۵۴ء میں روسو نے تھریسے کے ساتھ اپنے آبائی وطن، جنیوا کا سفر کیا۔ اب روسو کوئی آوارہ گرد نہ تھا وہ ادبی دنیا میں کافی نام پیدا کر چکا تھا۔ جنیوا میں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ مگر کیتھولک مذہب اختیار کرنے کی وجہ سے روسو اپنا حق شہریت کھو چکا تھا۔ اس حق کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے روسو پھر پروٹسٹنٹ مذہب میں داخل ہو گیا! اگرچہ وہ عرصہ تک پکا کیتھولک رہا تھا مگر اس مذہب کی ظاہری رسوم

در بابندیوں پر اس کا اعتقاد ذرا مشکل سے جم سکتا تھا۔ اس نے آسانی سے اپنا آبائی مذہب دوبارہ قبول کرلیا۔ اس کے بعد سے مرتے دم تک اسے جینوا کی شہریت پر بڑا ناز رہا جینوا میں اس دفعہ اس کی ملاقات ایسے لوگوں سے بھی ہوئی جو ریاست کے دستوری مسائل سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ اور اسی قیام کے دوران میں اس نے پھر ایک ایسی کتاب تصنیف کرنے کا ارادہ کیا جس کا خیال پہلے پہل اسے وینس میں آیا تھا۔

پیرس واپس آکر جب اس کی ایک اور کتاب "عدم مساوات" پر شائع ہوئی تو اس کی شہرت کو اور بھی چار چاند لگ گئے۔ ایک خاتون کی نوازش سے اسے پیرس کے پاس نہایت خوشنما علاقہ میں ایک آرام دہ مکان رہنے کو مل گیا۔ جہاں وہ کوئی چھ سال رہا۔ علمی اور ادبی کام کے اعتبار سے روسو کی زندگی کا یہ بہترین زمانہ تھا۔

پیرس کے پندرہ سال کے قیام میں وہاں کے بڑے بڑے ادیبوں اور عالموں سے روسو کے گہرے تعلقات ہو گئے تھے مشہور فرانسیسی۔ انسائیکلوپیڈیا[1] کے تیار کرنے والوں۔ دیدرو، گرِم[2] اور اولباک (ہولباخ) سے اس کی اچھی طرح شناسائی ہوگئی۔ انسائیکلوپیڈیا کے لئے روسو نے موسیقی پر مختلف مضامین لکھنے کے علاوہ "معاشیات" پر بھی ایک مقالہ تحریر کیا۔

انسائیکلوپیڈیا والوں سے روسو کی دوستی تو ہوگئی مگر ان میں اختلاف کا پیدا ہونا بھی بالکل قدرتی امر تھا۔ اس گروہ کے خیالات اور روسو کے فلسفے میں بڑا فرق تھا۔ روسو نے اپنے ان تمام احباب اور خصوصاً والٹیر[3] سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ اپنے خیالات میں شائستگی، اپنی نظر میں وسعت اور اپنے کلام میں ادبی چاشنی کے لئے بڑی حد تک انھیں کا رہین منت ہے یہ سب اس وقت اپنے اپنے فن کے

---

[1] یعنی وہ انسائیکلوپیڈیا جو اٹھارہویں صدی میں تیار ہوئی۔ لاک کے فلسفہ اور جدید علوم نظریہ کی مدد سے پرانے علمی اور مذہبی خیالات پر اس میں سخت نکتہ چینی کی گئی تھی شائع ہونے پر خصوصاً مذہبی حلقوں میں اسکے خلاف بہت شورش برپا ہوئی۔

[2] گرم اور اولباک (دراصل ہولباخ) دونوں المانی النسل تھے، مگر پیرس میں عمر گذاری۔

[3] والٹیر سے روسو کی ذاتی ملاقات نہ تھی۔ صرف تصانیف کے ذریعہ شناسائی ہوئی۔

سلہ استادو تھے۔ روسو نے ان سے پورا پورا استفادہ کیا۔ انھوں نے بھی کسی طرح مدد سے دریغ نہیں کیا مگر یہ دوستی بھی ہمیشہ قائم نہ رہ سکی۔ قصور وار تھی کچھ تو روسو کی اپنی غیر معاشرتی طبیعت۔ کچھ روسو کا نیا اور ناکام عشق جس کی یہ لوگ ہنسی اڑاتے تھے اور سب سے بڑھ کر روسو اور اس گروہ کے خیالات میں بنیادی اختلاف۔ روسو کے یہ احباب اس کی غربت پر ترس کھاکر جس قدر اس کی مدد کرتے تھے اُسے ان سے اسی قدر چڑھ ہوتی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ لوگ اس کی آزادی میں بیجا مخل ہیں۔ روسو کی باتوں پر بعض اوقات وہ ہنستے تھے اسے ناگوار ہوتا تھا۔ مگر اصل سبب جس کی طرف ابھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔ وہ ان کے اور روسو کے فلسفہ زندگی کا فرق تھا۔ روسو اپنے خیالات پر ایک کٹر مذہبی آدمی کی طرح قائم تھا، والیتر سے گو اس کے ذاتی تعلقات نہ تھے مگر ان دونوں کے خیالات کے درمیان ایک زبردست خلیج حائل تھی اور روسو کی جھگڑالو طبیعت کے لئے یہ بہت کافی تھا۔ غرض روسو کی والیتر، دیدرو، گرم اور اولباک سب سے ایسی چلی کہ خدا کی پناہ۔ ایک دوسرے کے خلاف تو تو میں میں پر اُتر آئے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب روسو نے اپنی دونوں مشہور کتابیں "معاہدۂ عمرانی" اور "ایمیل" تیار کیں۔ "ایمیل" کا شائع ہونا تھا (جون ۱۷۶۲ء) کہ کتاب کو نذر آتش کرنے اور اس کے مصنف کو گرفتار کرنے کا حکم حکومت کی طرف سے صادر ہوا۔ روسو کو اپنے دوستوں کے ذریعہ اس کی اطلاع پہلے سے مل گئی تھی اور سپاہیوں کے پہنچنے سے بس ذرا پہلے، رات کی تاریکی میں روسو نے سوئیٹان کا رخ کیا۔ مگر اس آزادی کے گھر میں بھی روسو کو آزادی نصیب نہ ہوئی۔ جینوا میں "معاہدۂ عمرانی" اور "ایمیل" دونوں ممنوع قرار دی گئیں اور روسو کے خلاف وارنٹ جاری ہوگیا۔ وہ وہاں سے بھی فرار ہوا۔ چند سال اس نے نیوشاتل میں گذارے جو اس وقت فریڈریش اعظم کے زیر حکومت تھا۔ مگر روسو کے مذہبی خیالات کی وجہ سے جن کا اس نے مباحثوں وغیرہ میں اظہار کیا، وہاں کے دینی پیشواؤں کے غصہ کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور اُسے یہ جگہ بھی چھوڑنی پڑی۔ کچھ دنوں اس کا قیام ایک پُرفضا جزیرہ "سین پیئر" میں رہا، یہ جگہ اسے بہت پسند تھی، اس جزیرہ پر بھی سوئیٹانی ریاست برن کی حکومت تھی۔ وہاں سے بھی اسے نکال باہر کیا گیا۔ اب اس نے اپنے جی میں کارسیکا جانے کی ٹھان لی، مگر پیشتر اس کے وہ اپنے اس ارادے پر عمل پیرا ہو مشہور

انگریز فلسفی ڈیوڈ ہیوم نے اسے انگلستان آنے کی دعوت دی، اور روسو نے بہت تکلف کے بعد اسے قبول کر لیا ہیوم اور روسو بھی بالکل مختلف طبیعتیں لیکر پیدا ہوئے تھے۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ ہیوم کو روسو کے ساتھ بڑی ہمدردی تھی، وہ اسے انگلستان لے گیا اور جو کچھ اس سے ہوسکتا تھا اس نے روسو کیلئے کیا اس کا وظیفہ بھی مقرر کرا دیا۔ کچھ دنوں تعلقات اچھے رہے۔ مگر روسو بھلا ایک مقام پر کب ٹک سکتا تھا ادھر اسکی صحت بھی بہت خراب رہنے لگی۔ بیماری کبھی کبھی جنون کی حد تک پہنچ جاتی تھی وہ یکایک انگلستان سے فرانس واپس چلا آیا۔ اب بھی اس کا کوئی مستقل مسکن نہ تھا۔ ہر شخص سے ہیوم کی بُرائی کرتا۔ اس خیال نے اب اس کے دماغ میں اچھی طرح جگہ کر لی تھی کہ وہ جہاں بھی جاتا ہے اسے نقصان پہنچانیوالے سایہ کی طرح اس کے ساتھ ساتھ لگے رہتے ہیں۔ اسی نیم جنون کی حالت میں اس نے اپنے "اعترافات" اختتام کو پہنچائے۔

زندگی کے اخیر دن روسو نے پیرس کے پاس ایک گاؤں میں گذارے اور ۲ جولائی ۱۷۷۸ء کو یکایک اس کی روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔ یہ خیال بعد کی تحقیق سے بے بنیاد ثابت ہوا کہ اس نے خود کشی کر لی تھی جس طرح عمر بھر اسے چین نصیب نہ ہوا تھا۔ اسی طرح موت کے بعد اس کی ہڈیوں کو چین نہ ملا سولہ برس کے بعد ۱۷۹۴ء میں وہ پانتھیوں میں لا کر دفن کی گئیں ۱۸۲۱ء میں انھیں اوپر سے ہٹا کر نیچے تہ خانہ میں گاڑ دیا گیا اور نو سال بعد پھر اوپر لے جائی گئیں مگر یہ تھا سب کچھ اعزاز کے سلسلہ میں!

یہ تھی مختصر سی داستان اس غیر معمولی شخص کی زندگی کی جس کا دل نیک اور جس کے تخیلات اخلاق اور مذہب کی انتہائی بلندیوں تک پہنچنے والے مگر جس کی زندگی کھوٹی اور جس کی سیرت ناقابل اعتبار تھی لیکن اگر جان بوجھ کر ان حالات کو نظر انداز نہ کیا جائے جنہوں نے روسو کو بگاڑنے میں تو بہت مدد دی اور سنوارنے میں ذرا بھی نہیں۔ تو روسو اس کا مستحق نہ معلوم ہوگا کہ اُسے برا کہا جائے، اس پر ترس کھانے کو جی چاہے گا۔

تصانیف[1] | ۱۷۴۹ء میں ایک دن روسو دیدرو سے ملنے کی غرض سے پیرس سے ویں سین جا رہا تھا کہ اس

---

[1] روسو کی تصانیف بہت سی ہیں اور اُن کا تعلق کسی ایک علم یا فن سے نہیں۔ موسیقی اور ادب کے علاوہ بہت سے علوم سے ہے یہاں پر روسو کی صرف مشہور اور اہم تصانیف کا ذکر ہے۔

نے اخبار میں دیژون کی اکادمی کی طرف سے ایک تحریری مقابلہ کا اعلان دیکھا جس میں اس سوال کا جواب طلب کیا گیا تھا کہ علوم وفنون کے احیاء نے اخلاق کو سدھارنے میں مدد دی ہے کہ بگاڑنے میں؟ اس سوال نے روسو کے تخیل کی دنیا میں ہلچل برپا کردی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ سوتے سے چونک پڑا ہو ابھی منزل مقصود تک پہنچا بھی نہ تھا کہ ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ کر اس نے اس سوال کا جواب لکھنا شروع کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سائنس کی نئی نئی روشنی سے دنیا کی آنکھیں چکا چوند ہو رہی تھیں نشأۃ ثانیہ کے ادبی کارنامے اور فنون لطیفہ، علوم فطری کی معرکہ آرا ایجادیں اور لاک کا فلسفہ ان سب لوگوں کو مسحور کر رکھا تھا۔ خیال تھا کہ اب وہ وقت دور نہیں جب کائنات کے تمام رموز انسان کی آنکھوں کے سامنے آجائیں گے۔ فرانس میں وہ مشہور انسائیکلو پیڈیا تیار ہو رہی تھی جس کا مقصد نہ صرف عالموں بلکہ معمولی پڑھے لکھے لوگوں کو بھی نئی علمی اور ادبی تحریکات سے آشنا کرانا تھا۔ ایسے وقت میں سائنس کی شان میں گستاخی ہمت کا کام تھا۔ جہاں کسی کی زبان پر ایک حرف بھی سائنس کے خلاف آیا اور علماء نے اس کے خلاف "جہالت" کا فتویٰ دیا۔ مگر روسو ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو بہاؤ کے ساتھ بہتے ہیں اس نے اپنے لئے دھارے کے خلاف تیرنا پسند کیا۔

اکادمی کے اس سوال کی وجہ سے روسو کے دماغ میں جو خیال پیدا ہوا اور جس کا شاید اکادمی کو اعلان کرتے وقت گمان بھی نہ ہوگا۔ وہ انسانی فطرت اور تہذیب و تمدن کا تضاد تھا۔ روسو کے نزدیک فطرت کے معنی تھے سادگی، بھلائی، مساوات اور سب سے بڑھ کر آزادی۔ برخلاف اس کے تہذیب و تمدن کے لوازمات تھے۔ تعیش، بد اخلاقی، غلامی اور ایمان و یقین کی کمزوری۔

روسو نے اپنی اس پہلی تصنیف میں جس پر اُسے دیژون کی اکادمی کی طرف سے انعام ملا اس خیال کو نہایت اصرار کے ساتھ پیش کیا ہے کہ جس قدر ہمارے علوم وفنون ترقی کرتے جاتے ہیں اسی قدر ہماری روحیں برباد ہوتی جاتی ہیں۔ انسان اس وقت تک بڑی اچھی زندگی گذارتا ہے جب تک اُسے اشیاء کا علم نہیں ہوتا۔ مگر اس لاعلمی کو چھوڑ کر وہ علم حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے

کہ وہ اخلاق کھو بیٹھتا ہے اور غلامی میں گرفتار ہو جاتا ہے اس میں نہ تو ایمان ویقین کی حرارت باقی رہتی ہے اور نہ سچے عشق کا جذبہ اور دہریت کا الگ شکار ہو جاتا ہے۔

اس تصنیف میں روسو اپنے تمام دعوؤں کے لئے کافی دلائل فراہم نہیں کر سکا ہے۔ عبارت آرائی اور لفاظی نے بھی مقالہ کی علیت کو صدمہ پہنچایا ہے مگر باوجود ان باتوں کے اس کے شائع ہوتے ہی فرانس کی علمی دنیا میں ایک ہلچل مچ گئی، اور کیوں نہ مچتی۔ عبارت کا ہر لفظ دہکتا ہوا انگارہ ہے مصنف دیکھتے دیکھتے غیر معمولی شہرت کا مالک ہو گیا۔ کتاب کا مقصد لامذہبوں کے علاوہ ارباب انسائیکلوپیڈیا کی مخالفت بھی تھا اور اگرچہ روسو خود انسائیکلوپیڈیا کے مضمون نگاروں میں سے تھا مگر وہ جس نہج پر تیار کی جا رہی تھی اس سے روسو متفق نہ تھا۔ اس مقالہ کے شائع ہوتے ہی انسائیکلوپیڈیا والوں اور خاص طور پر والٹیر اور دالمبر کے کان کھڑے ہو گئے اور آخر میں اس کا جو کچھ نتیجہ ہوا وہ ہم روسو کی زندگی کے حالات میں دیکھ چکے ہیں۔

ڈیژون کی اکادمی کی طرف سے ۱۷۵۳ء میں پھر ایک تحریری مقابلہ کا اعلان ہوا۔ اب کے موضوع مقرر کیا گیا تھا۔ "انسانی عدم مساوات کی ابتداء اور بنیادی اسباب" روسو نے اس موضوع پر بھی ایک مقالہ تیار کیا۔ مگر اس دفعہ وہ انعام حاصل کرنے میں ناکام رہا۔

بغیر کسی شک وشبہ کے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ روسو کی تصانیف میں یہ مقالہ سب سے زیادہ انتہا پسندانہ ہے مرکزی خیال وہی ہے جو پہلی تصنیف کا تھا۔ روسو فطری زندگی کی وکالت کرتا ہے مگر یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ واقعی کبھی ایسی صورت حال موجود تھی۔ تمام مصائب اور تکالیف جو آج انسان کو اٹھانی پڑتی ہیں وہ دراصل ان کا اپنا قصور ہیں۔ انسان نے اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماری جب اس نے فطری زندگی کو خیرباد کہا۔ اس زندگی میں انسان کی ضروریات کم تھیں۔ کام کی تقسیم ایسی نہ تھی۔ کہ غلامی اور عدم مساوات ناگزیر ہو۔ عقل کی جگہ انسانی طبیعت اعمال میں رہنمائی کرتی تھی۔ مگر باوجود ان سب خوبیوں کے روسو لوگوں کو جنگلوں میں بسنے اور درندوں کی طرح زندگی گذارنے کا مشورہ نہیں دیتا جیسا کہ بعض لوگ غلط فہمی کی وجہ سے اور بعض طنز کے طور پر کہتے آئے

ہیں۔

روسو کی تیسری اہم تصنیف ایک ناول ہے۔ (Nouvelle Heloise)
اس کتاب میں روسو کا مقصد سچے عشق کی تصویر کھینچنا ہے۔ اور عشق سے روسو کی مراد اس انسان کی بے غرضانہ محبت ہے جو ابھی تہذیب و تمدن سے ناآشنا ہو۔

روسو کی ہیروئن ژولی نہایت ہی نیک نفس لڑکی ہے وہ اپنے دل کی آواز کے سامنے عقل کی بات نہیں سنتی۔ تن من دھن سب کچھ وہ اپنے منظور نظر پر نثار کرنے کو آمادہ ہے۔ مگر ژولی کے عالی خاندان والدین کو یہ گوارا نہیں ہے کہ ان کی بیٹی ایک معمولی گھرانے کے نوجوان کے ساتھ بیاہی جائے۔ اب ژولی کو دو صورتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ یا وہ اپنے والدین کی دل دکھانے والی نافرمانی کرے اور یا اپنے محبوب سے عمر بھر کے لئے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ژولی نے دوسری صورت اپنے لئے منتخب کی۔ اس کی شادی والد کی مرضی کے مطابق ایک دوسرے شخص سے ہو جاتی ہے۔ شادی ہو جانے کے بعد فرض کا احساس عشق کے جذبہ کو دبا لیتا ہے۔ روسو کا مقصود عشق کے خلوص اور حق کو جتانا ہی نہ تھا۔ وہ نکاح کے احترام اور میاں بیوی کی باہمی وفاداری پر زور دینا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں فرانس کے اچھے تعلیم یافتہ خاندانوں میں نوجوان لڑکیوں کے ساتھ تو سختی برتی جاتی تھی مگر شادی شدہ عورتوں کو بہت آزادی حاصل تھی۔ روسو اس ذہنیت کے خلاف سخت احتجاج کرتا ہے۔ مگر ان دونوں تخیلات یعنی حق محبت اور احترام نکاح کو یکجا پیش کرنا ذرا مشکل ہے۔ اور ژولی کی شخصیت میں گو روسو نے دونوں رجحانات جمع کئے ہیں مگر یہ یکجائی بالکل ظاہری اور بہت سطحی معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ ایک موقع پر جسے کتاب کا "بیت الغزل" کہنا چاہیئے ژولی کے سینے کی دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اور جب وہ اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہی ہے تو کہتی ہے کہ دراصل عشق اُسے اپنے شوہر سے نہیں بلکہ پہلے محبوب ہی سے تھا۔ وہ نوجوانی ہی کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔ اور اس سوال کا جواب ہمیں اس کتاب سے نہیں ملتا کہ اگر اس کی زندگی وفا کرتی تو کیا پیش آتا!

روسو نے اس ناول میں نہ صرف سچے عشق کی تصویر کھینچی ہے بلکہ اپنے بہت سے معاشرتی تعلیمی اور مذہبی خیالات بھی پیش کئے ہیں اور اس وجہ سے کہیں کہیں "آورد" کا شبہ ہوتا ہے اس زبردست مذہبی کشمکش پر جو روسو کی زندگی میں انسائیکلوپیڈیا والوں اور ان کے مخالفین میں جاری تھی اس نے اپنے خیالات کا اظہار اس ناول میں تفصیل کیساتھ کیا ہے، اور دونوں کے تضاد کو کم حقیقت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ژولی اور اس کا شوہر دونوں شریف خصلت انسان ہیں مگر ان میں سے ایک "مومن" ہے اور ایک "کافر"۔ البتہ ژولی کی مذہبیت پادریوں والی مذہبیت نہیں خود روسو کی مذہبیت ہے جس میں تصوف کا رنگ اور نکھر آیا ہے۔

۱۷۶۲ء میں دنیا کے سامنے روسو کی وہ معرکۃ الآرا کتاب آئی جس کا ترجمہ اس وقت اردو میں پیش کیا جا رہا ہے۔ "معاہدۂ عمرانی"[۱] اگرچہ روسو کے خیال میں ایک ناتمام تصنیف ہے اور نظر ثانی کی محتاج۔ لیکن روسو کے تمام سیاسی تخیلات اس میں کامل پختگی کے ساتھ موجود ہیں۔ اس تصنیف میں روسو کے نظریوں کی اساس قانونِ فطرت ہے۔ اور روسو شروع سے آخر تک اس حقیقت پر نہایت سختی کے ساتھ مُصر ہے کہ طاقت کو حق (قانون) نہیں کہا جا سکتا۔ قوت کا ہر استعمال صرف اس صورت میں جائز ٹھہر سکتا ہے جب وہ ارادۂ اجتماعی اور قوم کی مرضی کے مطابق ہو۔ ارادۂ اجتماعی (Volonte generale) سے مراد کسی خاص وقت میں تمام افراد کے ارادوں کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ ارادہ مراد ہے جس پر نسلاً بعد نسلٍ قوم کی زندگی کا مدار ہوتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کسی خاص زمانے

---

[۱] فرانسیسی زبان میں Contrat Social کا بہترین ایڈیشن M. Dreyfus - Brisac کا ہے۔ تمام مہذب قوموں کی زبانوں میں اس کے ترجمے موجود ہیں انگریزی میں اس کے متعدد ترجمے ہیں سب سے پہلے ۱۷۶۴ء میں اس کا ایک ترجمہ شائع ہوا تھا۔ بعد میں R. M. Harrington، ٹوذر H. J. Tozer، جی۔ ڈی۔ ایچ کول G. D. H. Cole اور ایکلر P. Eckler نے ترجمے کئے ہیں۔ ٹوذر کی زبان بہت شگفتہ ہے۔ مگر بحیثیت مجموعی غالباً کول کا ترجمہ بہترین ہے۔

کے لوگ ایک بات طے کر کے دوسرے زمانے کے لوگوں کو اپنے ارادہ کا پابند بنا سکیں، پھر زمانوں کی تقسیم بھی تو ناممکن ہے۔ قوموں کی زندگی میں اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ کب ایک پیڑھی ختم ہوئی اور دوسری شروع۔

یہ خیال کہ قوم خود اپنے بُرے بھلے کی مختار (Sovereignty of the People) ہونی چاہیئے روسو نے پہلی مرتبہ پیش نہیں کیا۔ عہد اوسط کے آواخر میں اس خیال کے بہت سے حامی تھے مگر عہد جدید میں بلاشبہ روسو اس کا پیغمبر ہے اور اس پر عہد اوسط کے تخیلات کا اتنا اثر نہیں معلوم ہوتا جتنا خود اس کے وطن جینوا[1] کے دستور کا۔ روسو کا کمال خیالات کی ندرت میں نہیں خیالات کو اس طرح پیش کرنے میں مضمر ہے کہ اس کی بات کو لوگ کان لگا کر سنیں۔ ناممکن ہے کہ آپ معاہدۂ عمرانی کو شروع سے آخر تک پڑھیں اور کوئی اثر قبول نہ کریں۔ اس کتاب پر کبھی کبھی یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں ایک بات کو بار بار بیان کیا گیا ہے۔ مگر یہ تکرار کتاب کا عیب نہیں ہنر ہے۔ اسلئے کہ روسو کو تو اپنی بات دلنشین کرانا مقصود ہے۔ اور تکرار اس کا بہترین ذریعہ ہے۔

فرانسیسی انقلاب کے زمانے میں روسو کی یہ تصنیف انقلابیوں کی انجیل تھی۔ ان کے لئے دنیا کے تمام سیاسی حقائق اس کے اندر موجود تھے۔ ایسے حقائق جو ہر زمانہ اور ہر ملک میں یکساں طور پر صحیح ہوں۔ اُن کی نظر میں انسانیت کا بھلا اسی میں تھا کہ معاہدۂ عمرانی کے اصول کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب کے علمبردار اس تصنیف کو مصنف سے بھی زیادہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ورنہ روسو کے خیال میں تو ایسا دستور ترتیب دینا ناممکنات سے ہے جو ہر ملک کے لئے یکساں طور پر موزوں ہو۔ طرح طرح کی مثالیں دے کر روسو یہ ثابت کرتا ہے کہ ایک دستور جو کسی خاص ریاست کے لئے بہترین ہو بہت ممکن ہے کہ کسی دوسری ریاست میں بدترین ثابت ہو۔ چنانچہ جب روسو کو کارسیکا کا دستور بنانے کی دعوت دی گئی تو اس نے پہلے معافی ہی چاہی۔ اور بعد میں پولینڈ کا جو دستور اس نے تیار کیا اس میں یہ اچھی طرح

---

[1] معاہدۂ عمرانی کے سرورق پر روسو اپنے نام کے ساتھ خاص طور پر "جینوا کا شہری" لکھتا ہے

واضح کر دیا ہے کہ غیر ملکی کبھی بھی کسی ملک کے لیے مناسب قوانین وضع نہیں کرسکتا نیز یہ کہ قوانین سے زیادہ قومی روایات اور رسوم اہمیت رکھتی ہیں۔ اور غیر ملکی انھیں کامل طور پر کبھی نہیں سمجھ سکتا۔

صرف اس صورت میں کہ روسو کی تمام سیاسی تصانیف پیش نظر رکھی جائیں ہمیں اس کے فلسفۂ سیاست کی تدریجی ترقی اور ان تبدیلیوں کا اندازہ ہو سکتا ہے جو روسو کے خیالات میں پیدا ہوتی رہیں۔ مثال کے طور پر اگر "انسانی عدم مساوات" سے "معاہدۂ عمرانی" کا مقابلہ کیا جائے تو یہ پتہ چلیگا کہ روسو کے فطری اور مدنی زندگی کے نظریہ میں کافی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ مگر "معاہدۂ عمرانی" "فلسفۂ سیاسیات" پر روسو کی آخری کتاب ہے۔ اور اس لئے اس میں روسو نے اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے انھیں کو روسو کے تخیل کا پختہ ثمر سمجھنا چاہیئے۔

روسو کے "معاہدۂ عمرانی" کا جو درجہ فلسفۂ سیاسیات میں ہے۔ وہی رتبہ "ایمیل"[1] کا فلسفۂ تعلیمات میں ہے۔ افلاطون کی "ریاست" کے بعد روسو کے زمانے تک فلسفۂ تعلیم پر کوئی دوسری تصنیف ایسی نہیں جو "ایمیل" سے ٹکر کھا سکے۔

ایمیل تعلیمی تصنیف سے زیادہ ایک فلسفیانہ کتاب ہے۔ انسان فطرتاً نیک واقع ہوا ہے مگر اس کی برائیاں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں۔ روسو نے اس کتاب میں اسی کی تشریح کی ہے اور اس کے اسباب بتائے ہیں۔ روسو کا یہ دعویٰ ہے کہ تمام انسانی کمزوریاں اور خرابیاں روشن ہو جاتی ہیں اگر انسانی دل کا غور سے مطالعہ کیا جائے۔

روسو اپنے نظرئے تجربہ کی بنیاد پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے تعلیمی نظریوں کو اتنی اہمیت نہیں دیتا جتنی کہ اُن دعووں کو جو اس نے انسان اور خصوصاً بچے کی فطرت اور نفسیاتی کیفیت کے متعلق کئے ہیں۔ زیادہ اہم سبق روسو کی نگاہ میں وہ ہیں جو خود بچے کی فطرت اس کی مختلف صلاحیتوں اور قوتوں کو ابھار کر اسے دیتی ہے۔ بچے کو انسان کا شاگرد نہیں۔ فطرت کا شاگرد بننا چاہیے۔ زیادہ

لہ معاہدۂ عمرانی کی طرح اس کے بھی انگریزی میں کئی ترجمے ہیں Barbara Foxley کا ترجمہ بہت معتبر ہے۔

سے زیادہ انسان یہ کر سکتا ہے کہ بچے کو بُرے اثرات سے دور رکھے۔ روسو اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ ہر انسان کی فطرت جداگانہ ہوتی ہے۔ یہی نہیں۔ اس کی عمر کا ہر دور ایک مخصوص فطرت رکھتا ہے۔ اور اسی کو پیش نظر رکھ کر ہر فرد کے متعلق الگ الگ فیصلہ کرنا چاہیئے۔

تعلیم کا مقصد ہے سمجھدار انسان پیدا کرنا۔ روسو کے خیال میں سمجھ ابتدا سے انسان میں موجود نہیں ہوتی۔ جب انسان کی دوسری صلاحیتیں نشوونما پا جاتی ہیں تب جا کر کہیں سمجھ پیدا ہونا شروع ہوتی ہے۔ پس اگر معلم متعلم کو سمجھ دار سمجھ کر تعلیم دینا شروع کرتا ہے تو گویا وہ اس جگہ سے ابتدا کرتا ہے جو تعلیم کی آخری منزل ہے!

روسو کی آخری تصنیف اس کے "اعترافات" confessions ہیں جو ادبی حیثیت سے فرانسیسی زبان میں ایک انقلاب کا موجب ہوئے۔ خود نوشت سوانح عمریاں بہت سی لکھی گئیں، مگر مشکل سے کبھی کسی نے اپنی زندگی کا ہر پہلو ایسے بے دھڑک طریقے سے بیان کیا ہوگا۔ روسو نے "اعترافات" میں گویا اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ یہ کتاب اس نے شروع سے آخر تک دل کی مدد سے لکھی ہے؛ دوسری تصانیف میں اس کے ذہن کو بھی کہیں کہیں دخل ہے! اُس نے اپنی زندگی کی تصویر کا پہلا رخ ہی نہیں دوسرا رخ بھی دکھایا ہے جب یہ "اعترافات" روسو کی موت کے چند سال بعد ۱۷۸۲ء میں شائع ہوئے تو روسو کے بہت سے مداح جو اس کی تصانیف کو پڑھ کر اس کے بہت معتقد ہو گئے تھے سخت مایوس ہوئے۔ سچ ہے غریب روسو کی زندگی اس قابل نہ تھی کہ اسے نمونے کے طور پر آنکھوں کے سامنے رکھا جاتا۔

روسو نے "اعترافات" دراصل اس غرض سے لکھنا شروع کئے تھے۔ کہ انسانی خیالات اور اعمال کی صحیح صحیح تصویر کھینچے انسان کا ظاہر اور باطن سب کچھ دکھائے تاکہ فلسفی ایسی نفسیاتی تصنیف سے فائدہ اٹھا سکیں۔ چنانچہ "اعترافات" کے ابتدائی ابواب اسی نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہیں مگر اعترافات کو صرف اسی نقطۂ نظر سے نہ دیکھنا چاہیئے۔ روسو کی زندگی اخلاقی مدوجزر کی ایک عجیب مثال ہے اوران واقعات کا جن پر روسو بجا طور پر شرمندہ تھا اس کے قلب پر اتنا گہرا اثر تھا کہ وہ

اور نہیں تو اپنی شرمندگی ہی کا اظہار کرکے اس بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ "اعترافات" کا ایک حصہ توبہ کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ مگر اس انداز میں بھی کتاب ختم ہونے نہ پائی تھی کہ اس کی زندگی کے آخری زمانہ میں والتیر اور دوسرے انسائیکلو پیڈیا والوں سے اس کی لڑائی ہوئی۔ انھوں نے طرح طرح سے روسو کو بدنام کیا۔ روسو کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ کسی زبردست "سازش" کا شکار ہے جس کا مقصد اسے بدنام کرنا اور لوگوں کی نظروں میں ذلیل ورسوا کرنا ہو۔ یہ خیال یوں کہنا چاہیئے کہ جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ "اعترافات" کے آخری حصے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روسو اپنے اوپر سے الزام ہٹانے اور اپنے سیاہ اعمال کے معقول عذر پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ روسو کی اس آخری تصنیف کو ان تینوں باتوں کو پیش نظر رکھ کر پڑھنا چاہیئے۔

روسو کی تمام تصانیف کو پڑھتے وقت ایک بات کا ہمیشہ لحاظ رکھنا چاہیئے وہ یہ کہ اس نے اپنے خیالات شاعرانہ زبان میں ادا کیئے ہیں روسو ہی نہیں اس زمانے کے اور مشہور فلسفی مثلاً والتیر بھی ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ ان کے لئے اپنے خیالات کو زبان پر لانے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ طنز، استعاروں، اور اشاروں سے مدد لی جائے اور اس طرح سرکاری وغیر سرکاری غیظ وغضب سے نجات حاصل کی جائے۔

(باقی)

آپ کو اپنا نمبر خریداری یاد ہے؟

اگر یاد نہ ہو تو مہربانی فرما کر پتے کی چٹ پر ملاحظہ کر لیجیئے۔ خط وکتابت میں نمبر کے حوالہ سے بڑی سہولت ہو جاتی ہے ورنہ بسا اوقات جواب دینا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ براہ کرم اسے نہ بھولیئے۔ (مہتمم)

تصورِ باری کا ارتقا

خدا کیا ہے؟ ا۔ خدا کیا ہے؟ سوال جس قدر آسان ہے، جواب اتنا ہی مشکل ہے۔ فکرِ انسانی کی تاریخ گواہ ہے کہ خدا کے تعین میں بے حد اختلاف رہا ہے۔ رومی۔ زہرہ۔ اور مشتری کو خدا مانتے تھے یونانی زیوس Zeus اور اپولو کو۔ لات و عزیٰ عربوں کے خدا تھے۔ اہرمن، اور ارمزد ایرانیوں کے اگنی، اندر، وشنو ہندوں کے۔ موجودہ زمانہ میں فطرت کے قوانین کو مرتبہ الوہیت دیا گیا ہے، اور دعویٰ کیا جاتا ہے کہ صرف یہی ہماری تعظیم و احترام کے قابل ہیں۔ چنانچہ بہت زمانہ نہیں گذرا کہ ہیکل نے مذہب اور علم (science) میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی اور کونیاتی ایثر (cosmic ether) کو خدا کا قائم مقام بنا دیا[1]۔ ان تمام الفاظ سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ایک ہی خدا کے یہ سارے مختلف نام اور تعینات ہیں بلکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذاتِ باری کے تخیل میں نہ صرف بعید اختلاف رہا ہے بلکہ اس میں ترقی بھی ہوتی رہی ہے خدا کے تصور اور اس کے تعین میں جو تدریجی ارتقاء عمل میں آیا ہے اس کا سراغ تاریخ مذہب سے لگتا ہے۔ کیونکہ مذہب اور تصورِ باری میں نہایت گہرا اور ناقابلِ افتراق ربط و تعلق ہے۔

پہچان کے طریقے خدا سے مراد باری تعالیٰ یا کائنِ مطلق کا وہ تصور ہے جو شعورِ انسانی میں متمکن ہے جس میں کنہہ ذات، صفاتِ ذاتیہ اور اضافاتِ ذاتِ باری داخل ہیں خدا کے اس تصور کے متعلق بیک وقت نفسیاتی (psychological) اور وجودیاتی (ontological) سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا ماخذ، اس کی ماہیت، اور اس کی صحت کے دلائل کیا ہیں۔ نظریاتِ ماخذ دو شقوں پر مشتمل ہیں (الف) شعور کے اعتبار سے، جیسے مشتق (ماخوذ) اور اصلی۔ (ب) طریقِ فہم کے اعتبار سے جیسے تجربی یا وجدانی، (ان میں مشتق اور تجربی، اصلی اور وجدانی باہم مربوط ہیں) نظریاتِ ماہیت الہیاتی

---

[1] Der Monismus, p. 37 (1893)

معتقدات کے تنوع کے لحاظ سے کثیر التعداد ہیں مثلاً الہیت مطلقہ (Monotheism)
الہیت لامداخلتہ (Deism[1]) کثرتیت یا بت پرستی (Polytheism)وحدانیت یا
توحید (Monotheism) وحدتِ وجود یا ہمہ اوست Pantheism۔ نظریات
صحت کی تقسیم موضوعی (داخلی) اور معروضی (خارجی) میں ہو سکتی ہے۔ پہلی صورت میں تصور باری کی
موضوعی صحت مختلف مراتب پر مشتمل ہے۔ اور اس میں معروضی سند کا لحاظ نہیں ہوتا۔ معروضی نظریات
اس تصور کی معروضی صحت کے قائل ہیں۔

مذہب کے تاریخی مراحل کو ارتقائے انسانی کے دوسرے تمام عناصر اور اس کے تمام شمولات و
مظاہرات کے تعلق سے معروضی طور پر جانچنا کچھ آسان کام نہیں، اور نہ اس پر کوئی قطعی رائے قائم
ہو سکتی ہے۔

آغاز مذہب کے مختلف نظریات | خدا کے تصور کی طرح مذہب کی نسبت جتنے اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں
ان میں یہ بھی ہیں کہ مذہب کی ابتدا کیسے ہوئی۔ اس کی ترقی اور تقسیم مراتب کس طرح عمل میں آئی۔ مذہب
کی تحقیق تقابلہ سے کیا مباحث پیدا ہوتے ہیں وغیرہ۔ آغاز مذہب کے موضوع میں یہ نفسیاتی پہلو بھی شامل ہے
کہ آیا مذہب فطری ہے یا تزئیدی یعنی اختیار مذہب تقاضائے فطرت ہے یا اکتسابی ہے اور خارج سے ہم
پر عائد ہوا ہے اس آخری یعنی معروضی حیثیت سے فطریت[2] اور فوق الفطریت[3] کی بحث پیدا ہو جاتی ہے

[1] خدا کا وہ اعتقاد جس میں خدا کو کائنات سے الگ اور ماوراء مانا جاتا ہے۔ گویا خدا کو اس سے اب کوئی تعلق نہیں ہے
بلکہ وہ دور سے اس کا تماشا دیکھ رہا ہے بجز شاذ و نادر صورتوں کے کبھی اس میں دخل نہیں ہوتا۔ اس اعتقاد کی رو سے وحی کا
انکار لازم آتا ہے

[2] وہ نظریہ جو عالم مذہب سے عالم غیب یا ما فوق الفطرت کو خارج کر دیتا ہے اور حقایق مذہب کی توجیہ یا تو فطری عوامل و قوانین
سے کرتا ہے یا مقدس ہستی کو کائنات کی فطری ترتیب کا مرادف سمجھتا ہے

[3] وہ نظریہ جو کائنات بشمول انسان کو ایک ایسے وجود سے منسوب کرتا ہے جو اپنی ماہیت و قدرت کے اعتبار سے اس کائنات
سے ماوراء ہے اور اس کو کائنات کے قویٰ اور اعمال کا مرادف نہیں قرار دیتا۔

فوق الفطریت کی مثال ہربرٹ اسپنسر کا نظریۂ خواب ٹائیلر کا نظریہ طیف (ghost) اور ماکس ملر کا یہ خیال ہے کہ مذہب کی ابتداء ہمارے احساس لامحدودیت سے ہوئی ہے۔

کونت (Comte) شعور مذہب کی ابتدائی صورت یہ بیان کرتا ہے کہ اس تنزل میں انسان تمام خارجی اجسام کو اپنی ہی طرح ذی حیات سمجھتا ہے۔ ہیگل کا خیال ہے کہ انسانیت anthropological[۵]۔ دوسرے پہلے عہد سحری[۶] سے اس کی ابتداء ہوئی۔ ماکس ملر نے فلسفہ اور خرافیات mythology[۷] کی مدد سے یہ بھی دعویٰ کیا کہ مذہب ان تمام مظاہرات کے ادراک پر مبنی ہے جو انسان کے اخلاقی کردار کو متاثر کرتے ہیں۔ ہربرٹ اسپنسر نے انگلستان میں اور گرانٹ آلن اور لیپارٹ نے جرمنی میں بعض علمائے اسلام کی طرح مذہب کو مردوں کی پرستش سے متخرج کیا ہے۔ جیونز کا خیال ہے کہ مذہب کی ابتداء وہمیت Totemism[۸] سے ہوئی۔ فریزر کی رائے میں مذہب عہد سحری کی ایک ترقی یافتہ صورت کا نام ہے اور ونٹ اور بعض علمائے اسلام کی رائے میں روح کے ابتدائی تخیل نے بعد میں ترقی پاکر مذہب کی صورت اختیار کرلی۔ ابن خلدون کے اقوال سے مستنبط ہوتا ہے کہ مذہب کی ابتداء خواب اور اظہار غیبیات سے ہوئی ہے۔ غزالی کے خیال میں مذہب کا آغاز دوام راحت کی خواہش سے ہوا ہے۔ شاہ ولی اللہ کے خیالات[۹] سے یہ پایا جاتا ہے کہ مذہب محتاج الیہ کی طرف رجوع

۵۔ انسانیت anthropologism اس دینیاتی اصول یا عقیدہ کا نام ہے جو خدا کے ساتھ انسان کے حقیقی اور فانی علایق سے بحث کرتا ہے یا انسان پر مملکت الٰہی کے موضوع ہونے کی حیثیت سے۔ ۶۔ یعنی وہ زمانہ جس میں ساحری کا بہت رواج تھا اور عقیدہ تھا کہ ارواح (خواہ وہ شخصی نہ ہوں) اور اسی قسم کے اور عوامل کی مدد سے پُراسرار طور پر فطرت کے طریقے بدل دیئے جا سکتے ہیں۔ ۷۔ وہ علم جو دیوتاؤں اور دیویوں کی نسبت مصنوعی کہانیوں کی تفتیش کرتا ہے (دیومالا)۔

۸۔ یہ وہ عقیدہ ہے جس کی رو سے ایک فطری شے یا ایک حیوان کو کسی مناسبت کی بنیاد پر قبیلہ یا فرد کی علامت خاص قرار دیا جاتا ہے۔

۹۔ حجۃ اللہ البالغہ۔

کرنے سے پیدا ہوا۔ غرض ان میں سے اکثر نظریات کا ماحصل یہ ہے کہ انسان نے فیتشیت[1] Fetishism اور حیاتیت[2] Animism سے ابتدا کر کے تدریج خدا کا تصور حاصل کیا اور اعلیٰ مذاہب پیدا کئے بخلاف اس کے انڈریو لینگ کا قیاس ہے کہ "سلسلۂ ارتقا میں باری تعالیٰ کا اعتقاد ایک نوبت پر خود بخود پیدا ہو گیا تھا لیکن رفتہ رفتہ عفریت (demons) طیف اور ادنیٰ درجے کے اصنام کی پرستش کی بدولت اس اعتقاد کو نظر انداز کر دیا گیا" یہ ساری تحدیدات زیادہ تر آثاری اور تاریخی تحقیقات کا نتیجہ ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذہب کی ابتدا ان سے مشخص نہیں ہو سکتی۔ اس کو نفسیاتی نقطۂ نظر سے جانچنا ضروری ہے جس کی طرف مسلمانوں نے زیادہ توجہ کی ہے۔

<u>ارتقائے مذہب</u> | ارتقائے مذہب سے متعلق یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ آیا تقدیم کثرتیت (بت پرستی) کو حاصل ہے یا وحدانیت بلکہ بہتر الفاظ میں الہیت مطلقہ (Henotheism)[5] کو؟ فیتشیت کا کیا مقام ہے؟

---

[1] ۔ ایک غیر ذی روح کی پرستش جس کو اس وجہ سے ایک خاص قدرت اور قوت کا حامل سمجھا جاتا ہے کہ اس میں ایک روح یا دیوتا متمکن ہے وہ اس روح کی علامت یا نشانی ہے اور اس کی ساخت یا اصلیت ایک خاص نوعیت کی ہے[2] علم تقسیم و خصوصیات نسل Ethnology اور علم مذاہب کی رو سے حیاتیت کے تین مفہوم ہیں۔ (۱) یہ اعتقاد کہ ساری فطرت ذی حیات ہے اور اس کے عوامل مرئی اجسام سے الگ اپنا جداگانہ وجود نہیں رکھتے۔ (۲) یہ عقیدہ کہ اجسام میں کوئی چیز متمکن ہے لیکن وہ ان اجسام سے ممتاز ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ 'کوئی چیز' بہر حال مادی ہو (۳) یہ کہ اجسام میں مردوں کی ارواح آباد ہیں اور اسی وجہ سے وہ ذی حیات ہو گئے ہیں دوسری تعریف ٹیلر کی ہے اور تیسری اسپنسر کی[3] اس اصطلاح کو سب سے پہلے ماکس ملر نے ۱۸۶۰ء میں وضع کیا تھا۔ اس نے سامی وحدانیت کے عنوان سے اسی سنہ کے ٹائمز (لندن) میں ایک مضمون شائع کیا تھا جس میں وہ اپنا خیال ظاہر کرتا ہے کہ تاریخ مذاہب میں 'الہیت مطلقہ' کا درجہ وحدانیت اور کثرتیت سے پہلے ہے خدا کا ابتدائی وجدان بالذات نہ وحدتی تھا نہ کثرتی لیکن دونوں اس سے متخرج ہو سکتے تھے۔ کثرتیت سے پہلے یقیناً ایک درجہ ایسا آیا ہو گا جس میں کم و بیش غیر شعوری وحدانیت کا تسلط رہا ہو گا کسی زبان میں واحد سے پہلے جمع کا تصور نہیں پیدا ہوا۔ خدا کے ابتدائی وجدان کو صحیح معنی میں وحدتی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ایک خدا کے اعتقاد سے زیادہ کا انکار لازم آتا ہے اور یہ انکار اسی وقت ممکن ہے جبکہ اس کا تخیل

آیا ٹیلر کے خیال کے مطابق یہ سمجھا جائے کہ یہ حیاتیت کی ایک ابتدائی صورت ہے یا ماکس ملر اور اسپنسر کے اس خیال کو ترجیح دی جائے کہ یہ سب مذہب کی متاخر اور تنزلی صورتیں ہیں انسیتین Anthropomorphic مشکلان دعووں کے بالمقابل ایک اور مذہب ہے جو اس بات کا قائل ہے کہ انسان میں جبلی اور فطری طور پر خدا کا تصور جاگزیں ہے شعور انسانی جیسے جیسے نشو ونما پاتا جاتا ہے خدا کے تخیل اور اس کے تعین میں بھی توسیع ہونے لگتی ہے۔ اور ارتقائے مذہب کا مفہوم یہ ہے کہ مذہب میں خدا کے تصور کی قابلیت بڑھتی جاتی ہے۔ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ خدا حقیقی محتاج الیہ کا نام ہے جس کی تعیین میں وقتاً بوقت ارتقا ہوتا رہا۔ اور یہ وجدان انسان کی فطرت میں داخل ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں۔ اصل مذہب کی بنا اپنی احتیاج اور دوسرے کے محتاج الیہ ہونے پر ہے۔ جیسے جیسے اس کے معلومات و تحقیقات ترقی کرتے جاتے ہیں، وہ پہلے جس کو محتاج الیہ سمجھتا تھا خود اس کو محتاج پاتا ہے تو محتاج کو خیالی خدائی سے معزول کر دیتا ہے۔ اور اس سے بڑے محتاج الیہ کی طرف رجوع کرتا ہے جب اس کا خیال سارے عالم اور اس کے اجزا کے روابط تک جاتا ہے تو آخر کار ایک خدا کو ماننے لگتا ہے۔ انڈریو لینگ کہتا ہے آیا وحشی، ادنیٰ اور غیر شائستہ مذاہب کی اعلیٰ ترین یا کم سے کم برتر ہستیوں کو خدا کے لفظ سے تعبیر کیا جائے یا نہ کیا جائے یہ اس امر پر منحصر ہے کہ ہم مذہب اور ان ہستیوں کی تعریف کن الفاظ میں کرتے ہیں[۲]۔ ہووٹ نے قبائل آسٹریلیا کے اعلیٰ وجود کو "ابونا All Father" کا نام دیا ہے کیونکہ قبائل کے خدا کو عموماً "ہمارے باپ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے[۳]۔ اس امر میں لینگ جو ہووٹ سے متفق ہے کہتا ہے کہ ان ہستیوں پر روح spirit یا اعلیٰ روح کا لفظ منطبق نہیں ہو سکتا۔ اور یہی حال تمام وحشیانہ اور ادنیٰ درجے کے

(بقیہ صفحہ (۲۴۲) پیدا ہو چکا ہو۔ لھذا ملر کہتا ہے کہ اس اعتقاد کو ان الفاظ میں ادا کیا جائے کہ "خدا نہ کہ صرف ایک خدا ہے" (Selected Essays)

۱ علمائے انیات۔

۲ Making of Religion (London)

۳ Native Tribes of South Australia (London) 204

غیر شائستہ مذاہب کا شیٔ عبرانی صحائف میں ازلی وجود کا بار بار ذکر آیا ہے لیکن ہر موقع پر اس کو روحانی ثابت کرنا آسان نہیں نیز ہندوؤں کے دیوتا اور ہومر کے اولمپیائی دیوتاؤں کا تخیل روحانیت سے معرا ہے. روحانی وجود یا اعلیٰ روحانی وجود کے الفاظ کو 'ابونا' یا اعلیٰ وجودوں پر منطبق کرنیکی کوشش غلطی پر مبنی ہے اس امر کو پیش نظر رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ موجودہ انیاتی نظریات کی رو سے وحشی اور دوسرے مذاہب کا وجود برتر متصور طیوف یا ارواح کو اعلیٰ ترین قدرت سے منسوب کرنیکی بدولت ظہور میں آیا ہے. استھرن کا خیال ہے کہ اعلیٰ روحانی وجود اور بالآخر اعلیٰ ترین روحانی وجود تدریجی ارتقا کا نتیجہ ہے. انسئین کا موجودہ نظریہ یہی ہے جس پر ہربرٹ اسپنسر، ٹائیلر اور دیگر محققین قائم ہیں.

تصور باری انسان میں قائم ہے | تہذیب میں باری تعالیٰ کا تصور کچھ حالیہ نہیں ہے اور نہ وہ بادشاہو کا عکس ہے کیونکہ اس کا وجود ان اقطاع عالم میں بھی پایا جاتا ہے جہاں ملوکیت کا نام و نشان تک نہیں ملتا. اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ آسٹریلیا کا 'بونا' ایک برگزیدہ طیف ہے. کیونکہ وہ خرافیات کی رو سے موت سے پہلے بھی تھا اور کسی وقت دنیا میں آیا تھا. لیکن اب آسمان پر زندہ موجود ہے وہاں سے انسان اور اس کے کردار کو دیکھ رہا ہے مگر اس کے معاملات میں شاید ہی کبھی دخیل ہوتا ہو البتہ لامداخلیہ (Deism). وسطی آسٹریلیا کا کیتش فرقہ اسی قسم کے خدا کا قائل ہے جس کو ملکی زبان میں 'اتناتو' کہتے ہیں. البتہ یہ قائم بالذات ہے. اس کے علاوہ 'اتناتو' کسی مردہ انسان کی برگزیدہ روح نہیں. خیال ہے کہ یہاں اسپنسر اور ٹائیلر کا نظریۂ طیوف یا نظریہ حیاتیت ٹوٹ جاتا ہے.

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس سے ظاہر ہوگا کہ اگر ان وحشی اقوام میں کسی ایسے 'ابونا' کا تخیل پایا جاتا ہے جو خالق بھی ہے اور صانع بھی تو یہ اقوام خدا کے اس تخیل تک روح یا طیف کے توسط کے بغیر ہی پہنچ گئی ہیں جس کو ہمارے خدا کے خام عقیدے سے بہ آسانی متمیز نہیں

Making of Religion pp 202-204

کیا جاسکتا۔ 'بونا' کا تصور اعلیٰ ترین مذہبی تخیل کا ایک جزو ہے جو اخلاق کی خالقیت سے بھی متصف ہے۔

یہاں شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید 'بونا' کا تصور آسٹریلیا کی وحشی اقوام کے جدید ترین افکار کا نتیجہ ہو۔ لیکن یہ قبائل اپنی قدیم طرز معاشرت اور انداز تخیل کے اعتبار سے نوع انسان کے سب سے قدیم نمایندے معلوم ہوتے ہیں لیکن حیاتیت یا طیوف کے قائل نہیں ہیں تاہم بعض قبائل میں مردوں کی پرستش جاری ہے شمالی اور وسطی آسٹریلیا کے قبائل دوسری وحشی اقوام کی طرح ایک ماقبل البشر قادر دلونانا اور سحر کار نسل کے معتقد ہیں جو آسمان پر رہتی ہے۔ البتہ غور طلب بات یہ ہے کہ جہاں اس قبیل کے دیوتاؤں کو بھینٹ چڑھائی جاتی ہے 'بونا' کو بالکل نہیں چڑھائی جاتی۔ اور نہ اس سے کوئی دعا کی جاتی ہے۔ برٹش نیوگنی میں باوجود اس کے کہ وہاں کسی اعلیٰ ہستی یا آسمانی اجسام کا تخیل تک نہیں پایا جاتا۔ خالق باری کا تصور ہر شخص کے دل میں جاگزیں ہے جزائر فجی میں بھی کثیر التعداد بتوں کے باوجود ایک خدا کا تصور قائم ہے۔

لینگ اپنی ایک کتاب میں ادنیٰ اقوام کی اعلیٰ ہستیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ان سب میں 'ہمارا باپ' اور خالق ہونے کا تصور موجود ہے لیکن زیادہ ترقی یافتہ اقوام میں غفلت کی وجہ سے اس تصور نے کثرتی اور حیاتیتی مذاہب کی صورت اختیار کرلی۔ اے۔ آر۔ براؤن نے جزائر انڈمان کی تحقیقات میں اس امر کا پتہ چلایا کہ وہاں 'پلوگا' کے نام سے ایک غیر مخلوق خالق کو مانا جاتا ہے جو دل کا راز جانتا ہے۔ جنوبی افریقہ کی زولو قوم میں بھی جو طیف کی پرستار ہے ایک

---

(۱) Howith: Natural Tribes. 344, 394

(۲) Seligmann: Melanisians of British New Guinea 646, 651.

(۳) Making of Religion (London) 1898

خالق کا تصور موجود تھے[لے] ان شہادتوں سے پتا چلتا ہے کہ ازلی اور غیر فانی خالق کا یہ تصور بلند تر سطح تہذیب کے خیالات کی تعمیم نہیں بلکہ ابتدائی فکر کا ایک منفرد اور مخلوط تصور ہے۔

<u>تصور باری کا ارتقا</u> بہرحال تاریخ مذہب کی مدد سے دیکھنا یہ ہے کہ آیا اس تغیر و تبدل میں کوئی قیام پذیر اور غیر متغیر ذات نظر آسکتی ہے یا نہیں لیکن اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ مذہب کی تاریخی ابتداء میں اس ذات کا سراغ لگایا جائے۔ اگر تمام مذاہب کے تاریخی آغاز کا سراغ ممکن بھی ہو تو ابتدائی تخیلات کی مدد سے کسی وجود کی حقیقی ماہیت کی نسبت بہت زیادہ علم نہیں حاصل ہوسکتا۔ کیونکہ ترقی مذہب کے ساتھ ساتھ تصور باری میں جو قلب ماہیت اور ترتیب جدید عمل میں آتی ہے ان سے ایسی صفات کا پیدا ہونا ممکن ہے جو اس کی ابتدائی حالت میں نہیں پائی جاتیں کسی وجود کی حقیقی ماہیت اس قانون ارتقا پر منحصر ہے جس کے مطابق وہ ابتدائی کیفیت سے ابعد کی کیفیات میں منتقل ہوتا ہے کوئی توقع نہیں ہے کہ تاریخ اس مسئلہ کے حل میں کبھی کامیاب بھی ہوگی کہ عالم انسان پر آفتاب مذہب کی ضیا پاشی کب سے شروع ہوئی البتہ قرآن سے ثابت ہے کہ نوع انسان میں شروع ہی سے تصور باری موجود ہے۔

فاقم وجہک للدین حنیفاً فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا۔ لا تبدیل لخلق اللہ ذلک الدین القیم و لکن اکثر الناس لا یعلمون۔ ۲۱۔۳۰۔۴ ترجمہ۔ تو (اے پیغمبر) تم تو ایک خدا کے ہو کر (اس کے) دین کی طرف اپنا رخ کئے رہو۔ (یہ) خدا کی بنائی ہوئی سرشت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا ہے خدا کی بناوٹ میں رد و بدل نہیں ہوسکتا۔ یہی دین کا سیدھا راستہ ہے۔ مگر اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

موجودہ زمانہ کی سب سے وحشی اقوام بھی ارتقا کا ایک طویل سلسلہ ختم کر چکی ہیں۔ کم سے کم اتنا یقینی ہے کہ ہم جس مذہب کو ابتدائی کہتے ہیں وہ بھی لازمی طور پر اصلی مذہب (یعنی وہ جو آغاز سے یکساں طور پر چلا آیا ہو) نہیں ہے۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ تمام مذاہب حقیقت میں قینیت ہی سے

لے Lang: Magic of Religion (1901)

نکلے ہیں، خواہ یہ ثابت بھی ہو جائے کہ نوع انسانی کی مذہبی ترقی فتیشیت ہی سے ہوئی ہے لیکن مخالفین مذہب نے بہرحال اسی قسم کے نتائج اخذ کئے ہیں۔ دوسری طرف اکثر حامیان مذہب نے یہ اصول قائم کیا ہے کہ ابتدائے آفرینش میں بنی آدم پر ایک مکمل مذہب وحی کے ذریعہ نازل ہوا تھا لیکن نوع انسان نے اس سے انحراف کیا اور اس کے بعد جتنے مذاہب آتے گئے وہ اسی کے قائم مقام تھے یا یہ کہ وحی کے ذریعہ اسی ایک ابتدائی مذہب کا اعادہ ہوتا رہا۔ اس کے مقابلے میں فتیشیت کا نظریہ پیش کیا جاتا ہے اور اسکو زیادہ فطری خیال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ امر زیادہ آسانی کے ساتھ سمجھ میں آتا ہے کہ ایک غیر مکمل مذہب نے تدریجی ترقی کے بعد زیادہ مکمل مذہب کی صورت اختیار کی نہ یہ کہ ایک غیر مکمل مذہب مکمل مذہب کا زائیدہ ہے، یا اس کی ابتدا، ایک مکمل مذہب سے ہوئی ہے۔ اگر کسی مکمل مذہب میں غیر مکمل مذہب کا تخم یا امکان ہو تو اول الذکر کو بھی مکمل نہیں تسلیم کر سکتے لیکن یہ ممکن ہے کہ کوئی مذہب تکمیل پذیری یا قلب ماہیت کی وجہ سے تکمیل کامل کی جانب ترقی کرے۔ ہم جو کچھ پاتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ ادنیٰ اور اعلیٰ مذاہب کا ایک سلسلہ قائم ہے۔ یہ سلسلہ یکساں رفتار سے منازل ارتقا طے نہیں کر سکتا بلکہ ترقی و تنزل، ردو بدل، مد و جزر ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہاں اس تمام عروج و زوال اور اتار چڑھاؤ میں ترقی کا ایک عام رجحان ضرور پایا جاتا ہے۔ مذہب کی تقسیم مراتب میں ایک اور اساسی امتیاز فطری اور اخلاقی مذہب کا ہے۔ دوسری شق میں تمام اعلیٰ اور زیادہ روحانی مذاہب داخل ہیں۔

مذہب کا میلان ایک خاص دور ترقی میں ظاہر ہوتا ہے | انسان میں مذہب کا احساس اس وقت تک ہونا ناممکن ہے جب تک کہ وہ بھی اپنے ذاتی مشاہدات عالم کو ایک حد تک ترتیب نہ دے لے لیکن اس کے بعد ایک حالت سے دوسری حالت اور ایک منزل سے دوسری منزل میں جو انتقال و ترقی ہوتی ہے اس میں خالص نفسیاتی قوانین عمل کرتے ہیں۔

حیاتیت | اس وقت جو اقوام ادنیٰ ترین منازل ارتقا میں ہیں ان کے تخیل عالم کو ٹائیلر کی رائے میں حیاتیت کہا جا سکتا ہے۔ حیاتیت صرف ایک تصور کائنات ہے نہ کہ مذہب۔ مگر فلسفۂ مذہب کے لئے اس میں بہت دلچسپی کا سامان ہے۔ اس لئے کہ یہ دنیا کا سب سے ابتدائی تخیل ہے جس نے مذہب کی

خدمت کی ہے۔ اس کی خصوصیات میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ تحریف سے کام لے کر واقعات وحوادث عالم کی توجیہ ارواح یا شخصی ہستیوں سے کرتا ہے۔ اس کا ماخذ غالباً وہ تصورات ہیں جو خواب سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک وحشی انسان خواب میں جن تجربات ومشاہدات سے دوچار ہوتا ہے ان کو عالم بیداری کے تجربات کے برابر صحیح سمجھتا ہے۔ کیونکہ وہ خواب میں آپ کو اور دوسروں کو زمان ومکان اور مادی اضافات میں جتنا آزاد پاتا ہے بیداری میں نہیں پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خوابوں سے (جن کی صداقت وحقانیت میں اسے شبہ نہیں ہوتا) بیداری کی توجیہ کرنے لگتا ہے ہمیشہ اس کے شعور میں یادِ رفتگاں جاگزیں رہتی ہے، یہ لوگ جب تک زندہ تھے ہر چیز میں نمایاں حصہ لیتے رہے۔ لہٰذا قدرتی طور پر یہ اعتقاد پیدا ہوتا ہے کہ اب بھی ان کی کرم مکش تکمیل کے لئے جاری ہوگی۔ لیکن اس کے مقابلہ میں ابن خلدون اور بعض اور حکمائے اسلام کی ۔ ائے ہے کہ انسان اکثر جو خواب دیکھتا ہے اس کے مطابق واقعات رونما ہوتے ہیں تو اس سے اس کو خیال گذرتا ہے کہ ایک عالم ایسا بھی ہے جو اس عالم پر اثر ڈالتا ہے یا یہ کہ وہ اس کے مقابلے میں زیادہ حقیقی ہے۔ اس سے واضح ہوگا کہ انسان کی جبلت ہی میں یہ بات داخل ہے کہ ہر چیز کو ایک شخص قرار دے۔ واقعات وحوادثِ فطری کو اعمال شخصی سے تعبیر کرے ورنہ محض خواب حیاتیت کی بنیاد قائم کرنے کے لیے کافی نہ تھے حیاتیت ترقی کے ادنیٰ درجے میں تمام اقوام عالم میں پائی جاتی ہے یہ انسان کی اولین حکمت ہے۔ حتیٰ کہ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ مذاہب میں بھی، جن میں خدا کا انتہائی تصور قائم ہو چکا ہے، یہ تصورات برابر پائے جاتے ہیں۔ اور اب تک یہ بحث جاری ہے کہ ہم خدا کو شخصیت سے تعبیر کرسکتے ہیں یا نہیں۔ اکثریت غالباً اس کی تائید میں ہے[1]۔

فتیثیت اور روحیت کا تقابل | حیاتیت کی حدود کے اندر ہم فتیثیت اور روحیت (Spiritism)

---

[1] پروفیسر وب (Webb) نے خدا اور شخصیت پر ایک مستند کتاب لکھی ہے۔
God and Personality.

میں امتیاز قائم کر سکتے ہیں۔ ایک فیتیشی (قائل فیتیثیت) ان جزئی اشیاء پر قانع ہوتا ہے جن میں ارواح نے مختصر یا طویل مدت کے لئے عارضی اور موقتی سکونت اختیار کر لی ہے۔ روحیت کے بموجب ارواح کسی شئے میں محدود یا مقید نہیں بلکہ کچھ تو اپنی خواہش و اختیار سے اور کچھ سحر کاری کے اثر سے اپنی صورت اور طریق انکشاف کو بدل سکتی ہیں۔ ہرمان یوسنر نے فیتیشی کے خدا کو 'ایک آنی خدا' (God of a moment) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی یہ جزئی شئے جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے یہی اور صرف یہی خدا ہے[1]

ان موقتی بتوں کو پیدا کرنے کا میلان اب تک جاری ہے۔ انسان جب خارجی اشیاء سے کوئی دلچسپ تعلق پاتا ہے تو بچوں کی طرح ان کو اشخاص اور خاص علامات کا حامل تصور کرنے لگتا ہے۔ مثلاً سانپ کو غصہ یا ضرر رسانی کا دیوتا سمجھ کر اس کی پوجا کرنا یا آفتاب کے انعکاس سے چمکنے والے سنگریزوں کو دیوتا سمجھنا۔ اگر ہم اس قسم کے موقتی دیوتاؤں اور صنم سازیوں کا بنظر امعان مطالعہ کریں تو اس بات کی طرف رہنمائی ہوگی کہ ابتدا میں حیاتیت سے مذہبی تصورات کس طرح قائم ہوئے ہوں گے۔

اصنام کی صفات کا تعین و استقلال | تاریخ کی مدد سے ایسے موقتی اصنام کو صرف تخمینی طور پر جانچا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جب کبھی کسی نئی شئے کو دیوتا تسلیم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہوگی تو ایک بت پرست کا ذہن فوراً اس دیوتا کی طرف منتقل ہوتا ہوگا جس نے پہلے کبھی اس کی مدد کی تھی۔ اس لئے ہر موقع پر ایک نیا دیوتا نہیں پیدا ہوتا بلکہ اسی سابق دیوتا کو نئے حالات و واقعات کی مناسبت سے ایک نئی صفت سے متصف کر دیا جاتا ہوگا۔ بس اس طرح ہر دیوتا میں بتدریج مستقل صفات داخل ہوتی جاتی ہیں۔ اور بعض محدود خطوں کا مالک بھی بن جاتا ہے۔ ان مستقل اور بقا پذیر صفات نیز محدود حکومت و فرمانروائی کی وجہ سے ایک انفرادی دیوتا شعور میں زیادہ وضاحت

---

[1] Höffding: The Philosophy of Religion (1914) iii-136

اختیار کرتا جاتا ہے۔ غرض ایک خاص درجہ رکھنے والے دیوتا انھیں موقتی اور عارضی دیوتاؤں کی ترقی یافتہ صورت ہیں لیکن فکر ابھی تک گوناگونی اور تنوعات سے بے نیاز نہیں ہوتی۔ ہر محدود خطے اور دائرہ عمل کے لئے ایک دیوتا معین ہوتا ہے۔ چنانچہ نیوزی لینڈ کے ایک رئیس نے ایک اروپائی سے دریافت کیا، "کیا یہ سچ ہے کہ یورپ میں صرف ایک خدا تمام اشیاء کو پیدا کر سکتا ہے؟ لیکن نوع انسان میں تو ایسا کہیں نہیں ہوتا۔ کوئی بڑھئی ہوتا ہے تو کوئی لوہار اور کوئی جہاز ساز[۱]۔ مذاہب کی ابتدا میں یہی ہوتا ہے، ہندوؤں کا، اور یونانیوں کے زیر اثر آنے سے پہلے رومیوں کا یہی حال تھا۔ ہندوستان میں بعض دیوتاؤں کی مورتیں ایسی بھی نظر آتی ہیں جن کے متعدد سر اور ہاتھ ہیں۔ غالباً یہ اسی ابتدائی تخیل کی ذرا ترقی یافتہ صورت ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اتنے بہت ہاتھ اور اتنے بہت سر والا دیوتا بیک وقت متعدد اور متنوع کام کر سکتا ہے، اور بڑا صاحب قدرت ہے (مثلاً گنیش، شنکر، وتاری، سرسوتی، کالی، لکشمی) یہ خاص دیوتا موقتی خداؤں کی طرح شعور مذہب کے احتیاج کے مطابق یہ احساس پیدا کرتے ہیں کہ ایک عظیم الشان قوت ان سے بہت قریب ہے جو ہر ضرورت پر اُن کی اعانت و دستگیری کر سکتی ہے کیونکہ جس طرح خوف مذہب کا اساس ہے اُسی طرح تفاؤل و رجا بھی ہے بلکہ شاید آخر الذکر کی اہمیت زیادہ ہے

<u>ادنیٰ مذہب اعلیٰ مذہب کا اساس ہے</u> | اعلیٰ مذاہب نے بھی ادنیٰ مذاہب کی بنیاد پر مذہبی جذبات کے بہتر اظہار کی عمارت تعمیر کی ہے جو اُن کی داخلی تحریک کے بالکل مطابق ہے۔ جو خصوصیات ادنیٰ مذاہب میں پائی جاتی ہیں وہی اعلیٰ میں بھی ہوتی ہیں اور ان سب کا سلسلہ نسب انھیں (ادنیٰ مذاہب) سے جا ملتا ہے۔ اعلیٰ مذہب عمل انتخاب اور ارتقا کی بدولت ادنیٰ مذہب سے پیدا ہوتا ہے۔ کچھ عناصر اس کی ترقی میں مزاحم ہوتے ہیں اور کچھ معاون۔ مزاحم عناصر ادنیٰ مذاہب کی سخت مقامی خصوصیات اور تخصیصی میلان کا نتیجہ ہیں۔ کسی محدود خطے یا مخصوص شے سے جو ارواح یا قوتیں منسوب ہو جاتی

---

[۱] Höffding: The phil of Religion p137

ہیں نہ تو آسانی سے رفع ہو سکتی ہیں اور نہ خود ان میں وسعت پیدا ہو سکتی ہے۔ وجدان قدامت پرست ہے۔ اور جس دیوتا یا ہستی کا احترام ہونے لگتا ہے اس میں انفرادی صفات کا اس درجہ فقدان ہوتا ہے کہ اس قسم کا دیوتا مخصوص خدا میں منتقل نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے بیشمار دیوتا ترقی سے محروم ہیں۔ نیز کسی قبیلے کا یہ احساس کہ اس کے دیوتا اسی کے ہیں اس قابل نہیں ہے کہ اعلیٰ مذہب پیدا کر سکے۔ بلکہ اس کی راہ میں مزاحم ہوتا ہے۔ جب تک کسی مذہب سے یہ احساس دور نہ ہو اس پر اعلیٰ مذہب یا وحدانیت کا رنگ چڑھ نہیں سکتا۔ (اسی لئے اسلام میں تبلیغ کی سخت تاکید کی گئی ہے) ہندوستان کے مختلف فرقے مختلف اصنام کے پرستار ہیں۔ اور بعض اپنے دیوتاؤں کو اپنے ہی لئے مخصوص سمجھتے ہیں لیکن آثار و شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بت پرست اقوام گرد و پیش کے مذاہب اور حالات و واقعات سے متاثر ہونے لگی ہیں۔ اور ان میں ترقی تہذیب کے ساتھ ساتھ ترقی مذہب کا بھی ایک عام رجحان پیدا ہو گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پست اقوام اعلیٰ اصنام کی پرستش اور اعلیٰ مذاہب کی طرف مائل ہوتی جا رہی ہیں اور اعلیٰ اقوام وحدانیت کی طرف رجوع ہو رہی ہیں چنانچہ پست اقوام کو اعلیٰ اصنام کی پرستش کے لئے سہولت حاصل کرنے کی فکر دامنگیر ہے' اور اعلیٰ اقوام سکھ مذہب' آریہ سماج' اور برہمو سماج جیسے نئے مذاہب تراش رہی ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ یہ مذاہب قدیم ہندو مذہب کی مجددہ صورتیں ہیں بلکہ اس کی تنزیہی اور ترقی یافتہ شکل ہیں۔ یہ مذاہب اسلام اور عیسائیت سے بیحد متاثر اور بہرہ یاب ہوئے ہیں۔ سکھ مذہب' اور برہمو سماج کی ایک شاخ نے تو اسلام ہی سے خوشہ چینی کی ہے۔ اور آریہ سماج تلاش وحدانیت کی ایک بین مثال ہے۔ غرض جب تک ہندوستان کے دیوتاؤں کے تخصیصی میلانات دور نہ ہوں مختلف فرقوں کی قبائلی تہذیب قومی تہذیب کی صورت نہیں اختیار کر سکتی

مردوں کی پرستش کا مذہب توسیع معاشرت کے ساتھ ساتھ پرستش اجداد میں منتقل ہو کر بہ آسانی وسعت حاصل کئے جاتا ہے۔ آخرالذکر مذہب نے تہذیب کو اہم عناصر سے آراستہ کیا ہے جس کی مثال چین' جاپان اور قدیم اطالوی مذاہب میں ملتی ہے۔ لہٰذا ادنیٰ مذہب میں اعلیٰ امکانات بھی پنہاں ہیں۔ مگر وہ اسی وقت برگ و بار لاتے ہیں جب کہ جدید ضرورتیں اور وسیع تر

زاویۂ نگاہ پیدا ہوجائے

اعلیٰ مذہب | اعلیٰ مذاہب اسی وقت عالم وجود میں آتے ہیں جب کہ قومی تہذیب قبائلی تہذیب کی جگہ لے لیتی ہے۔ انسان کی حیات باطنی کے نشوونما کے دوش بدوش معاشرتی تغیرات بھی رونما ہوتے ہیں، اور مذہب بھی انہی تغیرات کے اثر سے اعلیٰ مدارج ترقی حاصل کرتا جاتا ہے حیات شخصی کی تہذیب و آراستگی اس امر کی مقتضی ہے کہ اپنے معبودوں کے تصور اور مذہبی اضافات کی نظرثانی کرے قدیم روحیت، بے شمار اور غیر معین قوتیں، اور متلون مزاج دیوتا انسان کی زیادہ منتظم اور باقاعدہ زندگی، اور اس کی متنوع اور مخصوص اغراض کے مطابق نہیں رہتے۔ سکھ مذہب آریہ سماج اور برہمو سماج اسی عدم تشفی کی ایک مثال ہیں۔ ان کے ظہور کے بظاہر دو اسباب معلوم ہوتے ہیں (۱) یہ کہ ہندو مذہب کی کثیر الاصنامی انکے ترقی یافتہ شعور مذہب کیلئے ناکافی ثابت ہوئی (۲) عیسائیت اور خاص کر اسلام کے اعلیٰ نمونے مدت سے ان کے پیش نظر تھے (یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ جن افراد کا شعور مذہب ترقی کرجاتا ہے وہ ادنیٰ مذہب ترک کرکے اعلیٰ مذہب اختیار کرلیتے ہیں) الحاصل نظام کثیر الاصنام اصل میں انسان کے تصور کائنات کا ایک مظہر ہے اگرچہ عالم کثیر الاصنام نہایت متخالف و متبائن شعبوں میں منقسم ہونیکی وجہ سے ایک وحدت حقیقی سے معرا ہوتا ہے تاہم ترقی یافتہ ضرور ہے کیونکہ وہ دو حیثیتوں سے بے حد مفید ثابت ہوا ہے۔ اس نے مذہب کو خالص مقامی لوازم کے قید و بند سے آزاد کیا اور قدیم عقائد کی سادہ اور غیر موثر قوتوں کی جگہ زیادہ مُعرّف اوصاف یا کم و بیش محدود قدرت والی متعدد مقدس ہستیوں کو لا بٹھایا۔ ایک حامل صفات وجود جو روحیت کی ہستیوں سے متمائز اور اعلیٰ ہو ان اقدار کا جامع ہوتا ہے جو شعور انسانی میں جاگزیں ہیں۔

ارواح spirits اصل میں ایک بنیاد کا کام دیتی ہیں جس پر ترقی یافتہ خدا کا تخیل قائم ہوسکتا ہے قیاس کیا جاتا ہے کہ یونان کے دیوتا ہرمس اور آرطمیس نے اسی طرح ترقی کی تھی لیکن یہ عمل زیادہ عام نہیں ہے اور ایسی مثالیں بھی جن میں ایک توتم (totem)[1] خدا کا مرتبہ حاصل کرلے بہت

[1] دیکھئے وہبیت (Totemism) کی تعریف صفحہ (۲۴۱)

کم ملتی ہیں صرف اتنی بات صاف اور واضح ہے کہ مظاہر فطرت کے ساتھ اعلیٰ اور ترقی یافتہ دیوتاؤں کا ایک خاص ربط و تعلق ہے اور ان سے اس تعلق کی علامتیں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ اس طرح مصر کا 'را' اور بابل کا شمس آفتاب کے دیوتا ہیں۔ یونانیوں کا زفس اور ویدکا دیاس آسمان کے دیوتا۔ وید کے گیتوں میں اوشا کا ذکر آیا ہے جو فجر کا دیوتا ہے لیکن بہت سی مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں جن میں اس ربط کا ٹھیک طور پر پتہ نہیں چلتا مگر حقیقت نفس الامر غیر مشتبہ ہے۔ اسی طرح مصری دیوتا ' اوسیرز (Osiris) کی فطری بنیاد مشتبہ ہے یہی حال وید کے وشنو اور ورونا کا ہے۔ صرف اتنا معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کا تعلق بہرحال روشنی اور آسمان سے ہے۔ دیوتاؤں کے ترقی یافتہ اور زیادہ حالی مفہوم کی مدد سے ان کا ماخذ دریافت کرنا سخت دشوار ہے البتہ اس سے ایک دھندلا سا نشان مل جاتا ہے۔ ہندوؤں کی ساری مذہبی کتابیں نظم میں ہیں۔ اس لئے اس امر کا پتہ چلانا مشکل ہے کہ یہ کس حد تک استعارات کی حیثیت سے استعمال ہوئے ہیں اور کس حد تک ہندوؤں کے اصلی معتقدات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ ان کو دونوں حیثیتیں حاصل ہیں۔

صفات باری کی توسیع جوں جوں حیات انسانی میں وسعت پیدا ہوتی ہے اس کے اقدار بھی متنوع ہو جاتے ہیں اور مقدس وجودوں کے اظہار و تضمن میں اسی مناسبت سے توسیع بھی ہوتی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے یونان کے اپولو نے جتنی مختلف صفات و خدمات اختیار کی ہیں شاید اس کی نظیر دوسری نہیں ہے۔ آفتاب کے ساتھ اس کی مماثلت زیادہ حالیہ ہے لیکن اس کی ابتدائی صورت نہایت مبہم تھی۔ شروع میں وہ گلوں اور ریوڑوں کا مالک تھا۔ بعد میں کہانت اور پیشین گوئی کا دیوتا بنا۔ پھر شفا بخشی کا، پھر طہارت و تزکیہ کا اور پھر شاعری کا۔ اس کے علاوہ بعض اوقات اصنام متضاد و متباین صفات سے بھی منسوب ہوتے ہیں۔

لیکن جہاں مختلف تہذیبوں کے اختلاط و ارتباط کے باعث ایک نیا مذہب صورت پذیر ہوتا ہے تو اس کی تنظیم کی فوری ضرورت بھی لاحق ہوتی ہے اس کی بیّن مثالیں بابلی ہندی اور یونانی مذاہب میں ملتی ہیں۔ بابل کے سامی غنیموں نے قدیم ترسیری مذہب کو جذب کر لیا اور اپنے معبودوں کے حلقے میں سیری دیوتاؤں کے لئے بھی جگہ نکال لی۔ آریہ ہند جب ہندوستان میں داخل ہوئے

تو ان بے شمار دیوتاؤں سے نا آشنا تھے۔ لیکن ہندوستان کی دراوڑی اور دیگر قدیم اقوام کے ساتھ اُن کا اختلاط اُن کے مذہب پر بھی اثر انداز ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آریوں کا جدید ترکیب یافتہ مذہب اپنی بہت سی خوبیاں کھو چکا۔ اور ہندوستانی دیوتاؤں کو اپنے دیوتاؤں کے زمرے میں شامل کر لیا۔ اور کچھ اقتضائے حال سے نئے نئے دیوتا بھی تراش لئے مثلاً گنگا ماتا کی تقدیس وغیرہ۔ یونانی تہذیب آریہ عُنیوں کی نسل اور ہلادی نسل کے باہمی اختلاط کا نتیجہ تھی[1] اور بعض یونانی دیوتا مثلاً اتھینی، آرطمیس اور افروڈیٹے زیادہ قدیمی تہذیب سے مستعار لے لئے گئے تھے۔ کثرتیت کی مذہبی پیچیدگیوں میں شعوری تنظیم گو ہمیشہ دشوار ہوتی ہے لیکن ناگزیر بھی ہوتی ہے۔ مفتوحہ نسل کے مقامی لوازم نیز ان معبودوں کے ساتھ مذہبی دلچسپی انجذاب میں مزاحمت کا باعث ہوتے ہیں۔ اس مشکل کو اس طرح رفع کیا جاتا ہے کہ ان معبودوں کو بھی فاتحین کے دیوتاؤں کے زمرے میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ اور اُن کو اُن کے خاندان میں بیٹیوں اور خادموں کی حیثیت دی جاتی ہے۔ ہومری مذہب بلاشبہ اسی تنظیم کی ایک مثال ہے لیکن یہ تنظیم مصنوعی اور ادبی نوعیت کی تھی۔ اس سے یونانی تہذیب کے اصلی معتقدات اور مذہبی رسوم پر روشنی نہیں پڑتی[2]

یہ عمل خواہ کتنا ہی ادھورا ہو۔ بُت پرستی کے پس پردہ ترتیب و تنظیم کا ایک سلسلہ جاری رہتا ہے۔ حیاتِ معاشرتی کی ترقی کے ساتھ ساتھ، جب کہ اس میں مختلف شعبے اور وظیفے معین و مشخص ہو جائیں، ذہن انسانی عالم اصنام کو عالم انسان کے نمونے پر قیاس کرنے لگتا ہے۔

(باقی)

Höffding: The Phil of Religion. at

زندگی

صبح کو چند مہمان آگئے تھے تمام دن ان کی خاطر مدارات میں صرف ہوگیا۔ عصر کے قریب میں بمشکل مطالعہ کے لئے وقت نکال سکا اور شام تک پڑھتا رہا۔ اسی ضمن میں سہ پہر کی ہوا خوری بھی نہ ہوسکی۔ جب چراغ روشن ہوئے تو کتابوں سے دل برداشتہ ہو کر صحیفہ فطرت کے مطالعہ کے لئے میں مکان کی چار دیواری سے باہر نکلا۔ ابھی دس قدم بھی نہ گیا تھا کہ کسی نے آہستہ سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مڑ کر دیکھا تو ایک دبلا پتلا چھوٹے قد کا آدمی میلی سی اچکن پہنے کھڑا تھا شام کے دھندلکے میں اسے پہچاننے میں مجھے کچھ دقت ہوئی لیکن جب اس نے مانوس اور قریبی آواز میں، اور یقیناً وہ آواز دنیا میں صرف ایک ہی شخص کی ہوسکتی تھی۔ میرا نام لے کر پکارا تو میں حیرت سے "اصغر" کہہ کر بے تحاشا اس سے لپٹ گیا۔ معانقہ ختم ہوا تو سب سے پہلے میں نے اس کی ہیئت ظاہری پر لب کشائی کی جس کی وجہ سے وہ بالکل اجنبی معلوم ہو رہا تھا۔ پہ اپنے بے تکلفانہ انداز میں اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے میں نے کہا "خیریت تو ہے، تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ اگر تم نہ بولتے تو شاید میں تمھیں پہچان بھی سکتا"

اس نے کچھ رکتے رکتے کہا "میں ملتان سے آرہا ہوں۔ راستے میں میرا کپڑوں کا بکس چوری ہوگیا۔"

ہمدردی کی بجائے میرے منہ سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔ پھر ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا "واللہ قدرت بھی عجب ستم ظریف واقع ہوئی ہے۔ تمھارے کپڑوں کے بکس کا گم ہوجانا اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایسا ہی افسوسناک سانحہ ہے بلکہ اس سے بھی شدید جیسا کسی مصور یا نقاش یا سنگتراش کی اختراعات فائقہ اور عمر بھر کی عرق ریزی سے جمع کئے ہوئے نوادر روزگار کا کھویا جانا۔ یقیناً اس حادثہ سے صنعت اور فنون لطیفہ کی دنیا کو بہت نقصان پہنچے گا۔ کہو یہ واقعہ کیونکر پیش آیا؟

اس نے کہا "بندہ خدا! مذاق پھر کر لینا پہلے یہ تو پوچھو کہ میں آیا کیوں ہوں۔ میرے قیام وطعام کا بندوبست کرو۔ میں تمہارے یہاں ٹھیروں گا"

"بسم اللہ، آئیے" میں سیدھا اسے اپنے بیٹھنے کے کمرے میں لے گیا۔ جب ہم اطمینان سے آرام کرسیوں پر دراز ہو گئے اور لیمپ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی تو میں نے دیکھا کہ اصغر بہت زرد اور نحیف ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس نے مخصوص انداز میں اپنی ترکی ٹوپی کو اتار کر میز پر پھینک دیا اور زیر لب گنگنانے لگا لیکن اس کی ہئیت مجموعی سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ بننے کی کوشش کر رہا ہے دراصل آج کا اصغر اس اصغر سے جسے میں جانتا تھا کوئی نسبت نہ رکھتا تھا۔ اداس، منحنی سا چہرہ، معمولی اونٰے درجہ کے لباس میں ملبوس، آنکھوں میں پریشانی کے آثار، اور کہاں وہ چاق چوبند خوش طبع، انگریزی فیشن کا دلدادہ اصغر جو اپنی سحر کار شخصیت اور ندرتِ کلام سے حاضرین کو مبہوت کر دینے کے علاوہ لطیف بذلہ سنجیوں اور فلک شگاف قہقہوں سے بزم کو کشت زعفران بنا دیتا تھا۔ اس کا حسن مذاق مسلم اور اس کی رائے خصوصاً پوشاک اور آرائش کے معاملات میں ہمیشہ ہمارے حلقۂ احباب میں سند کے طور پر پیش کی جاتی تھی۔ چند لمحے خاموشی میں گذر گئے تو میں نے کہا "ہاں تو تم نے بتایا نہیں وہ بکس کیسے گم ہو گیا؟"

ارے بھئی کوئی بات ہو تو کہوں سراسر میری ہی غلطی تھی میں ملتان سے چلا تو بہت سراسیمگی اور ذہنی انتشار کے عالم میں تھا۔ یہ اچکن کھونٹی پر لٹک رہی تھی۔ اسی پریشانی میں جلدی سے اتار کر پہن لی اور باقی تمام کپڑے اور چند کتابیں ٹرنک میں بند کر لیں ریل میں بیٹھا تو بھی وہ ادھیڑ بن جاری رہی اور میں اس ڈبے کے باقی مسافروں کا بخوبی جائزہ بھی نہ لے سکا۔ راستہ میں اتفاق سے میری آنکھ لگ گئی اور خانیوال اسٹیشن پر جاگا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ٹرنک غائب کمرے میں میرے سوا اور کوئی مسافر نہ تھا۔ میں نے گارڈ، اسٹیشن ماسٹر اور پولیس کے افسر کو فوراً اطلاع کی۔ وہ کہنے لگے کہ اپنا سفر منقطع کر کے یہیں ٹھیر جاؤ تاکہ تلاش و تفتیش میں سہولت ہو مگر میں نے سوچا مضیٰ ما مضیٰ، قسمت اچھی ہوئی تو بکس بھی مل جائے گا ورنہ جان تو باقی ہے

اُن کو ضروری ہدایت دے کر میں چلا آیا۔ اگر یہ نقصان بعض اور حالات کے ماتحت ہوتا تو شاید میں بالکل ہی محسوس نہ کرتا۔ مگر جیسا مبہم پروگرام اب میرے پیش نظر ہے اور جس قسم کی غیر مستقل زندگی سے میں دوچار ہونے والا ہوں وہاں لباس ایسی اہم اور ضروری چیز کی عدم موجودگی سے ضرور رنج ہوگا۔

میں نے ایک لمبا سانس لیا اور کہا "اصغر ہم ہندوستان میں کتنی جلدی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ میری مراد جذباتی بڑھاپے سے ہے تم اور ذہنی انتشار کے عالم میں گھر سے چلو اور پھر تمام سفر ایک ادھیڑ پن میں گزار دو۔ خدا کی قسم میں باور نہیں کر سکتا۔ مگر جب دیکھتا ہوں کہ یہ بڑھاپا ہر لحظہ ہم پر شدت سے وار کر رہا ہے اور بہت کم لوگ ہیں جو اپنے اندر قوت مدافعت رکھتے ہیں تو میرے لئے حیرت کی کوئی وجہ نہیں رہتی اور تمہاری گذشتہ زندگی سراسر ایک تعلّی معلوم ہوتی ہے"

"تعلّی!" اصغر چمک اٹھا "تم دیکھو گے کہ میں نے اپنے اصول سے سرمو انحراف نہیں کیا۔ باقی رہا یہ کہ میں خاص احوال میں کیوں سراسیمہ ہوا تو عرض یہ ہے کہ میں نے اس بات کا تو کبھی دعویٰ نہ کیا تھا کہ میرے اعصاب فولاد اور قلب و دماغ پتھر کے ہیں۔ ہر ذی حیات شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی کی ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ اسرار حیات کو سمجھ لینے کا دعویٰ تو مجھے نہیں ہاں میں نے ایک ایسا نکتہ ضرور معلوم کر لیا ہے جس سے زندگی کی غایت پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی روشنی میں میں نے اپنے لئے چند اصول وضع کر لئے ہیں جو میری رہبری کر رہے ہیں۔ تم ان باتوں پر ہنستے ہو لیکن ایسی ہنسی میں پہلے سینکڑوں مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔ تم مجھے نور کو تاریکی اور تاریکی کو نور کہنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ بیشک مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں جن کے دفعیہ کے لئے میں ہمہ اوقات مصروف جدوجہد ہوں۔ آخر انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں کہ گردش مدام سے گھبرا نہ جاؤں۔ ہر چند جانتا ہوں کہ یہ گھبراہٹ سراسر بے سود اور تکمیل حیات میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے لیکن میرے عمل کی کوتاہی سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ زریں اصول جس کی حقانیت و صداقت پر میرا اعتقاد ہے اپنے اندر کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ تم اسے وہم کہتے ہو لیکن خدارا مجھے بتاؤ ہماری زندگی میں کوئی چیز مادی یا غیر مادی

ایسی ہے جس کی بنیاد وہم پر ہو؟ عزیز دوست! انسان کے تمام اعمال و معیار اعتباری ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو کامیابی پر آپے سے باہر ہو جانے اور ناکامی پر گریہ و زاری کرنے کے کیا معنی؟ تم میرے ہی کہنے سے اس اصول کو جسے میں صداقت اور تم وہم سے تعبیر کرتے ہو ایک مرتبہ تو اپنی زندگی میں جاری و ساری ہو جانے کا موقع دو اور پھر دیکھو کہ حجابات یک قلم اٹھ جاتے ہیں یا نہیں؟ زندگی پر ایک غیر فانی گرفت تمہیں حاصل ہوتی ہے یا نہیں؟ علت و معلول کی اس دنیا میں جہاں جاندار اور بے جان سبھی ایک غیر مختتم سلسلہ میں منسلک ہیں، میں اسباب و نتائج کی طبعی کڑی سے کیونکر آزاد ہو سکتا ہوں۔ باقی انسانوں کی طرح میں بھی حسب منشا نتائج اخذ کرنے کے لئے، اسباب پر قدرت کاملہ حاصل کرنے کا متمنی ہوں۔ مگر بسا اوقات ناکامی سے واسطہ پڑتا ہے۔ ناکامی ہماری طبایع پر کیونکر اثر انداز ہوتی ہے۔ بس یہیں سے میرے تمہارے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔"

ابھی خدا معلوم وہ اس کے بعد کیا کچھ کہہ جاتا کہ میں نے دفعتاً ایک قہقہہ لگا کر اسے خاموش کر دیا۔ میں نے کہا "سبحان اللہ، کیا کہنے ہیں آپ کی لسانی کے۔ آئینہ لاؤں حضور کے سامنے کہ آپ کو اپنے اصول کی حقانیت پر ایمان آجائے۔ ذرا اس چہرہ کو دیکھو جس میں خون زندگی کا قطرہ تک نظر نہیں آتا اپنی شکن در شکن پیشانی دیکھو۔ رخساروں کی زردی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دیکھو اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم کی ہڈیاں گن لو ایک اچٹتی ہوئی نگاہ اپنے لباس پر بھی ڈال لو کہ یہ اس شخص کا لباس ہے جو زیادہ عرصہ نہیں گزرا ذوق جمال و آرائش لباس کے معاملہ میں مجتہد کا درجہ رکھتا تھا اور پھر مجھے بتاؤ کہ اگر غیر فانی شباب اسی کا نام ہے تو ننگ شباب کی اصلاح کس پر عائد ہوتی ہے؟"

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اصغر کے پچھلے حالات قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کروں کہ یہ گفتگو زیادہ دلچسپ اور واضح ہو سکے۔ یہ کہنا کہ اصغر میرا دوست تھا چنداں قابل التفات بات نہیں کیونکہ طالب علمی کا زمانہ تو ہر شخص پر دوستی کا ملمع چڑھا دیتا ہے۔ اصغر اور میں چار سال ایک ہی کالج اور ایک ہی دارالاقامہ میں رہے جن میں سے ایک سال کے لئے میں اور وہ "ہم کمرہ" بھی تھے۔ اصغر

کی والدہ انتقال کر چکی تھیں اور اس کے والد نے نکاح ثانی کر لیا تھا۔ اصغر کے حقیقی بھائی بہن کوئی نہ تھا اور والد کے ساتھ بھی اس کے تعلقات اگر کشیدہ نہ تھے تو بہت زیادہ خوشگوار بھی نہ تھے طوعاً و کرہاً وہ اس کے تعلیمی اخراجات کے کفیل ہو رہے تھے۔ ان ہی وجوہ کے باعث اصغر کی تمام تر توجہات اور دلچسپیوں کا مرکز اس کی اپنی ہی زندگی تھی چھٹیوں میں بھی وہ بہت کم مکان پر جاتا تھا۔ کبھی میرے ہاں، کبھی آپ کے، یونہی فرصت کا وقت گذار لیتا یا اگر جیب گرم ہوئی تو ہندوستان کے مختلف شہروں کا چکر لگانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ حالات کی اس ناسا عد۔ وش نے اصغر کی طبیعت میں ایک خاص قسم کی بے نیازی اور ارادہ میں پختگی پیدا کر دی تھی۔

ہیئتِ اجتماعی کا فرد ہونے کی حیثیت سے انسان پر بہت سے فرائض ایسے بھی عائد ہوتے ہیں جن کو اس کے طبعی رجحان اور حقیقی ذوق کے ساتھ چنداں تعلق نہیں ہوتا۔ والدین کی خدمت، دوستوں کی مروت، بیوی بچوں کی محبت، بھائی بہنوں کے تعلقات غرض ایسی سیکڑوں زنجیروں نے ہمیں سوسائٹی کے مختلف شعبوں سے اس طرح باندھ رکھا ہے کہ انفرادی زندگی کا کوئی مفہوم رہا ہی نہیں۔ دراصل انسانی زندگی ان ہی رشتوں اور جذباتی تعلقات کے مجموعہ کا نام ہے۔ ان بندھنوں سے جیتے جی آزاد ہونا محالات سے ہے لیکن ہم ایسی زندگی کا تصور ضرور کر سکتے ہیں۔ جہاں انسان محض اپنے لئے زندہ رہتا ہے۔ کہتے تو ہیں کہ اکیلا خدا دشمن کو بھی نہ کرے مگر ایسا قائم بالذات شخص جو طعن و تشنیع کے دغدغے سے بے نیاز اپنی ہر ممکن الحصول خواہش کی تکمیل کے لئے آمادہ کار ہو جائے جس کے لئے کل کائنات سمٹ سمٹا کر اس کی اپنی زندگی میں محدود ہو گئی ہو، جس کی آرزوئیں رسمیات عہد کے دباؤ اور جس کے ارادے خندہ استہزا کے خوف سے یکسر آزاد ہوں بلاشبہ اپنی زندگی میں ایک خاص لذت رکھتا ہے۔ بعض دنیا دار شاید اس حالت کو آوارگی سے تعبیر کریں لیکن سچ پوچھئے تو ہر جذبہ اپنی آخری منزل میں بے عنان ہو کر آوارگی ہی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ آج سے کئی سال قبل جب میں اول اول اصغر سے ملا تو اس کی ایسی ہی آزادی و بے عنانی نے مجھے بھونچکا سا کر دیا تھا کہاں کالج کا ایک مبتدی اور کہاں یہ باغیانہ طبیعت۔ ذہانت کے لحاظ سے وہ اپنے ہم جماعتوں

میں بہت کم حریف رکھتا تھا۔ لیکن چونکہ اس نے اوقات بہت بے ڈھنگے طریقے سے تقسیم کر رکھے تھے اس لئے بعض دفعہ وہ کئی کئی ہفتے کسی کتاب کو نہ چھوتا پڑھنے پر آتا تو رات کو آنکھ جھپکانا بھی حرام سمجھتا میں کبھی اس کے لاابالی پن پر لب کشا ہوتا تو وہ یہی جواب دیتا کہ "میں طالب علمانہ شہرت حاصل کرنیکا خواہاں نہیں ہوں کہ کتابوں میں سر کھپانا مقصود زندگی قرار دے لوں۔ کتب بینی جو مشاہدہ کی صلاحیت سلب کرے ایک ذہنی بیماری ہے۔ میرے لئے تو اسی قدر مطالعہ کافی ہے جس سے امتحان میں کامیابی حاصل ہو سکے" اور پھر خوشی میں یہ شعر پڑھ دیتا

مومن بہشت و عشق حقیقی تمہیں نصیب　　ہم کو تو رنج ہو۔ جو غم جاوداں نہ ہو

دو سال بعد جب اتفاق سے میرا اور اس کا قیام ایک ہی کمرے میں ہو گیا تو اس کے حالات و اطوار زیادہ وضاحت کے ساتھ مجھ پر عیاں ہونے لگے۔ اس کا معمول تھا کہ سر شام کھانا کھا کے نکل جاتا اور رات گئے گیارہ بارہ بجے واپس آتا۔ حالانکہ قواعد کی رو سے کوئی طالب علم ۹ بجے کے بعد اپنے کمرے سے باہر نہیں رہ سکتا تھا۔ خوبی قسمت سے دار الاقامہ کے مہتمم بہت با مذاق اور زندہ دل تھے۔ انھوں نے جب شکایت کی اصغر صاحب نے ہنس کر جواب دیا "حضرت، انسان پر ایک ہی قسم کے قوانین عائد کرنا دانشمندی نہیں بعض کو قدرت مستثنیٰ بنا کر پیدا کرتی ہے۔ بندہ بھی انہیں میں سے ہے"

اس کی صحبت یقیناً افزائش مسرت کا موجب تھی۔ مگر جب وہ آدھی رات کو آکر سوتوں کو جگاتا اور دروازہ کھٹکھٹا کر میرے آرام میں بے طرح مخل ہوتا تو طبیعت جھنجھلا اٹھتی تھی، اور پھر ایک روز کی بات ہو تو مضائقہ نہیں، اس کا تو مہینہ میں تیس دن وطیرہ ہی یہی تھا۔ ایک رات وہ خلاف معمول بہت دیر سے آیا۔ شاید دو بجے ہوں گے۔ صبح ہوئی تو میں نے سامان باندھنا شروع کر دیا بڑی بے تابی سے پوچھنے لگا "خیر ہے، کہاں کا ارادہ ہے؟"

میں جلانے لگا "تمھارے ساتھ رہ کر میں اپنی صحت خراب کرنا نہیں چاہتا۔ غضب خدا کا، دن بھر کالج کی بک بک میں صرف ہو جاتا ہے، رات کو آرام کا وقت تم یوں برباد کر دیتے ہو۔ اگر

ایسی ہی آوارگی دماغ میں سما گئی ہے، تو کالج کو خیرباد کہدو۔ تم ایسے جہاں گردوں کے لئے خدا کی زمیں تنگ نہیں ہے"

وہ بستر سے اچھل کر مجھ سے آلپٹا "دوست خفا ہو گئے۔ سچ پوچھو تو تمھارے ہی بھروسے پر یوں بے فکری سے گذر رہی ہے۔ ورنہ مجھ ایسے سیلانی کو ہوسٹل کی قید و بند میں رہنے کا کب سلیقہ تھا۔ یار تم بھی کسی کٹھ ملا سے کم نہیں۔ کئی بار میں نے کہا کہ کتابی کیڑا بننا ہی طالب علمی کی غایت نہیں، انسان تو عمر بھر طالب علم رہتا ہے اور حصول علم کی سینکڑوں راہیں دنیا میں کھلی ہیں۔ لیکن تم ہو کہ کالج کے کمرے اور درسی کتابوں کے گنبد سے نکلنا ہی نہیں چاہتے۔ خدا کے لئے کوئیں کے مینڈک نہ بنو۔ ذرا چلو پھرو دنیا جہاں کی سیر کرو۔ زندگی کا مختلف پہلوؤں سے نظارہ کرو۔ حواس کو آزاد چھوڑ دو۔ پھر دیکھو کہ نفسیات کا علم جینیز کی کتاب سے حاصل ہوتا ہے یا تجربات ذاتی سے"

اصغر سخت کثیر الاحباب تھا۔ لیکن دوستی کے متعلق بھی اس کا نظریہ عجیب تھا۔ وہ کہا کرتا تھا "مجھے ان لوگوں پر ہنسی آتی ہے جو دوستی کو بھی لازمہ حیات تصور کرتے ہیں۔ جو دھوپ صدی کی شعلۂ آشام دوستیاں پانی کے بلبلے سے جلد فنا ہو جاتی ہیں۔ پھر ایسی ناپائیدار چیز کو ہم کیونکر روح کی غذا بنا سکتے ہیں۔ وہ لوگ جو دوستوں کی صحبت کے بغیر زندگی گذارنے کی اہلیت نہیں رکھتے خطرناک فریب نفس میں مبتلا ہیں۔ تم نے بہت سے فریب خوردہ اشخاص کو دیکھا ہوگا جو گذشتہ صحبتوں کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو رونے اور ایام رفتہ کو یاد کرکے آہیں بھرنے کے عادی ہیں۔ بیچارے اسی قماش کے بزرگ ہیں جو بسر اوقات کے لئے دوستی کو دو وقت کی روٹی کی طرح ضروری سمجھتے ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ اپنی وفاکیشیوں اور جاں سپاریوں کے عوض میں دوسروں سے بھی تسلیم و وفا کی توقع رکھتے ہیں۔ نادان نہیں جانتے کہ اس تغیر پذیر عالم ارضی میں اکثریت ان کی ہے۔ "جو نہیں جانتے وفا کیا ہے"۔ بھائی سچ پوچھو تو میں تو شطرنج اور ٹینس کی طرح دوستی کو بھی وقت فرصت گزارنے کا ایک کھیل سمجھتا ہوں۔ جب کام سے طبیعت اکتائی دو گھڑی کے لئے کسی دوست کو جا پکڑا۔ جس طرح شطرنج نہ کھیلنے کے باوجود تمام عمر خوش رہ سکتا ہوں، اسی طرح

دوستوں سے قطع تعلق کر لینے پر بھی میری زندگی میں ملال پیدا نہیں ہو سکتا۔ کسی چیز کا پابند ہو جانا زندگی کی نشو و ارتقار کو غارت کر دیتا ہے۔ رنج و مسرت کی تخلیق تو ہمارے نفس کے سپرد ہے واقعات خارجی کو ہم اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں ورنہ غم و شادی تو ایک اضافی امر ہے۔

اصغر صرف لباس کے معاملہ میں محتاط تھا۔ کچھ تو مزاج طبعاً خوش پوشی کی طرف راغب تھا اور کچھ اس کا خیال تھا کہ دنیا کو صرف لباس کے ذریعہ سے دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ میں بڑے بڑے جہاں دیدہ لوگوں سے ملا ہوں جو بزعم خود علم و فضل کے مجسمے بنے بیٹھے ہیں اور جن کا خیال ہے کہ انھیں زندگی کے نشیب و فراز اور حیات انسانی کی باریکیوں سے کامل آگاہی حاصل ہے لیکن کوئی ملاقات ایسی نہ تھی جس کے اختتام پر میں نے ان کی سادہ لوحی پر قہقہے نہ لگائے ہوں فیشن کے مطابق شاندار لباس زیب تن ہو اور واقعات عالم پر فصاحت کے ساتھ گفتگو کرنے کا ڈھنگ تمھیں آتا ہو تو دنیا کو الو بنا لینا بڑی بات نہیں"۔ ایک دن تو اس نے غضب ہی کر دیا۔ بڑے دن کی تعطیلات سے قبل کالج کا سالانہ ڈنر تھا جس میں پہن کر جانے کے لئے اس نے بڑے ٹھاٹھ کا سوٹ سلوایا تھا۔ ڈنر کے روز جب اس نے اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ نئے سوٹ کے ساتھ پہننے کو کوئی اچھی نکٹائی نہ تھی۔ اُدھر مہینے کا اخیر تھا اور اس کی جیب خالی ہو چکی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ فلسفہ کی درسی کتاب (جسے اس نے ابھی چند روز ہوئے خریدا تھا) ایک کتب فروش کے یہاں نصف قیمت پر فروخت کر دی اور بازار سے نئی نکٹائی خرید لایا۔

اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اصغر ایک معمہ تھا۔ جن لوگوں کو اس سے زیادہ واقفیت نہ تھی وہ اسے ایک سطحی نگاہ رکھنے والا شخص تصور کرتے تھے وہ چونکہ کسی شے کو اہمیت دینے کا عادی نہ تھا اس لئے بعض سنجیدہ مزاج لوگوں کو بھی اس سے شکایت تھی لیکن دراصل اصغر کو دنیا والوں کی کمزوریاں اور غلطیاں دیکھ دیکھ کر زہر خند ہو جانے کی عادت ہو گئی تھی عیب و ثواب کی کوئی راہ نہ تھی جس پر وہ گامزن نہ رہ چکا ہو، نیکی و بدی کا کوئی کوچہ نہ تھا جس کو اس نے

پامال نہ کیا ہو اور پھر دامن جھاڑ کر یوں نہ نکل آیا ہو کہ

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

میں اس کی دقتِ نظر کا ہمیشہ معترف رہا ہوں۔ لاعلمی اور جہالت کو مسرت کا ضامن قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ ان چند در چند نفوس میں سے تھا جو بقول اسپنسر "سوچتے ہیں اور پھر مسرور رہتے ہیں" اصغر یقیناً ایک رجائی تھا لیکن اس کی امید جہالت پر مبنی نہ تھی۔ اس نے زمانہ کا سرد و گرم چکھا۔ خار دار جھاڑیوں میں الجھ کر دامن کو تار تار کیا۔ پھولوں کے تختوں میں سے نسیم سحری بنکر گذرا اور پھر اسی نتیجہ پر پہنچا کہ "کام کرتی ہے نظر نام ہے پیمانے کا۔"

اپنی نگاہ میں رنگینی پیدا کرلو اور کل کائنات قوسِ قزح کی طرح نظر فریب ہو جائیگی طبیعت میں استغنا پیدا کرلو تو جھونپڑی میں بھی محلوں کے خواب دیکھو گے۔

ایک روز ہم سب بیٹھے تھے۔ ہمارا دوست وحید بھی تھا۔ وحید تھا تو بہت ذہین لیکن اُس کی ذہانت اس کے لئے وبال بن گئی تھی۔ کچھ شاعر، کچھ وہمی، قدرے مریض اور اس پر طرہ یہ کہ محبت کا زخم خوردہ۔ وہ اکثر عزلت نشینی کو پسند کرتا اور عہدِ ماضی کی نوحہ خوانی میں مصروف رہتا تھا یا پھر مستقبل کے خواب دیکھ دیکھ کر اپنے حال کو اور زیادہ افسردہ بنا دیتا تھا وہ اصغر کو "ہری چگ" کے نام سے پکارتا تھا اور اصغر صاحب تھے کہ اس لقب کی موزونیت پر لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ اصغر نے اس روز وحید کو مخاطب کر کے دیر تک سلسلہ کلام جاری رکھا اور سچ پوچھئے تو ہماری معلومات میں دل خوش کن اضافہ کیا وہ کہنے لگا "دیکھو بھئی وحید، اگر چندے تمھاری یہی حالت رہی تو قیس کی دیوانگی اور فرہاد کی کوہکنی کو دنیا یقیناً فراموش کر دے گی اور تم ان کے جانشین کی حیثیت سے مسندِ جنون پر رونق افروز ہوگے اگر بقائے دوام کے خواہشمند ہو یا شہیدانِ عشق کی فہرست میں نام لکھانا چاہتے ہو تو خدا کے لئے اُس "نیک بخت" کو بھلا دو۔ زندہ قوموں کا عشق بھی حیات افروز ہوتا ہے لیکن ہمارے ہاں عشق اور تپ دق ہم معنی الفاظ ہیں اور پھر اس ملک میں رہ کر عاشق بننا تو فطرت کے خلاف جنگ کرنا ہے، میں سنتا ہوں کہ تمھاری محبوبہ

ہندوستان کے جذبات کش طرز انتخاب کے ماتحت کسی اور کے حوالے کر دی گئی ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو تم کیوں پہاڑ سے ٹکرا کر سر کو لہولہان کر رہے ہو۔ محبت تو جذبات کی انتہائی کمزوری کا نام ہے اور ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہر دعوے دار اپنی محبت کو بے لوث ظاہر کرتا ہے خون کا جوش زیادہ ہوا محبت کے جراثیم پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ محبت کا جذبہ بے لوث صرف ماں کے سینے میں فروزاں ہوتا ہے اور باقی سب باطل۔ اس غلام آباد میں مصائب کیا کم ہیں کہ عشق کا روگ بھی پڑھا لیا جائے۔ سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ ہم میں زندگی بسر کرنے کی صلاحیت نہیں۔ بات بات پر آنکھوں سے آنسو بہانا ہر وقت ٹھنڈی آہیں بھرنا۔ دنیا کو دھوکے کی ٹٹی کہنا پر ہنسنے والے کو خدا سے باغی اور قہقہہ لگانے والے کو گنہگار خیال کرنا یہاں دین داری میں داخل ہے۔ تم گردن جھکا کر آنکھیں بند کر کے گذر رہے ہو درآنحالیکہ چھوٹی چھوٹی چیزیں معمولی معمولی واقعات جن کے اندر مسرت و شادمانی کے لازوال خزانے پوشیدہ ہیں تمھیں زبان حال سے پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ کوئی بستر علالت پر کراہ رہا ہے اور کوئی عسرت و تنگدستی کے ہاتھوں نالاں ہے۔ کوئی کسی عزیز کی موت پر نالہ کناں ہے اور کوئی فکر فردا اور غم ماضی میں جان گھلا رہا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ ہم ابھی تک بحر حیات کی موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔ کوئی نہیں جو سطح کے نیچے جا کر دیکھے کہ کیسے کیسے گہرہائے نایاب موجود ہیں۔ کامیاب زندگی کا راز یہی ہے کہ زندگی کو اہمیت نہ دو۔ زندگی تو سرد اور معطر ہوا کا جھونکا ہے جو سن سے گذر جاتا ہے اور تم اس شمیم جاں فزا کو مقید کرنے کی فکر میں ہو یہ جھونکے اسی طرح آتے اور گذرتے جائیں گے۔ تمہارا فرض بس اتنا ہے کہ ان کی عطر بیزی سے اپنے دل و دماغ کو معطر کرو اور چلتے جاؤ۔ کائنات کی وسعت بے پایاں کو دیکھو جس میں اس دنیا جیسی ہزاروں دنیائیں آباد ہیں اور پھر ان دنیاؤں میں جاندار مخلوق بھری پڑی ہے اس بے شمار جاندار آبادی کا نقشہ چشم تخیل کے سامنے لاؤ اور سوچو کہ ارض و سما کے درمیان اور اس پہنائے عظیم کے اندر ایک تمھاری ہستی بھی ہے، جو فنا کے غار عمیق کے کنارے کھڑی یاد

مخالف کی تندیوں سے ہر گھڑی کپکپا رہی ہے۔ تمہاری تو حقیقت ہی کچھ نہیں۔ اجل کا ادنیٰ سا اشارہ تمہیں ملیامیٹ کر سکتا ہے۔ سہ روزہ زندگی کی ناپائیداری پر غور کرو کہ کل صبح تمہیں اپنے بستر سے صحیح و سالم اٹھنے کا یقین بھی نہیں اور پھر آلام و تفکرات کے اس لامتناہی سلسلہ پر غور کرو جنہیں تم پر خواب و خور حرام کر کے رات کی نیند اور دن کا چین چھین رکھا ہے کیا تمہارے اوہام و توہمات تمہاری کم فہمی کی دلیل نہیں؟ دماغ کو استعمال کرو اور سوچو کہ تمہاری کل پریشانیاں کیا صرف اس نقطہ پر نہیں آ ٹھیرتیں کہ تمہیں پیٹ بھر کھانا اور تن ڈھانکنے کو کپڑا درکار ہے؟ پھر تم کیوں خیالی ہموم و غموم سے مرے جا رہے ہو؟ اگر ریشم کی قمیص نہیں تو نہ سہی گاڑھے کا کرتہ پہن لیں گے۔ ولایتی ساخت کا پمپ میسر نہیں آتا تو بلا سے دیسی جوتا اس سے زیادہ مضبوط اور آرام دہ ہے۔ عزیز دوست ذرا غالب معجز بیاں کے اس شعر پر غور کرو۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

تم بھی دنیا کو ایک اسٹیج تصور کرو اور ہر مرد و زن کو ایکٹر۔ تفریح و تفنن اور رنج و حرماں کے کل مظاہر درحقیقت کامیڈی اور ٹریجیڈی کے کھیل ہیں جن سے متاثر ہونا قرین دانش نہیں۔ ہر واقعہ کو ایک بے غرض و غیر جانب دار تماشائی کی حیثیت سے ملاحظہ کرو۔ اس عالم متغیر میں جس کی کسی شے کو ثبات نہیں اور جہاں ہر گذرنے والا لمحہ ایک نئی زندگی کی آفرینش کا پیغام دے جاتا ہے۔ زمانہ کی نیرنگیاں اور انقلابات دہر سے اثر پذیر ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ تمہیں اپنے دل و دماغ پر قابو نہیں۔ واقعات عالم کا تماشا کرتے وقت ایک سائنس داں کی طرح اپنے حسیات کو بالکل علیحدہ رکھو ورنہ یہاں گریہ و زاری کی تو یہ کیفیت ہے کہ

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہندوستان میں ہم اس قدر جلد کیوں بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم زندگی کو غیر معمولی اہمیت دینے کے علاوہ اس میں کوئی جدت پیدا نہیں کرتے۔ پیدائش سے موت تک ہم ایک ہی ماحول میں رہتے ہیں۔ وہیں پرورش پائی، وہیں بڑھے

اور وہیں مر گئے کسی چیز سے پوری طرح لذت اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے مختلف پہلوؤں سے تمام امکانی حظ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ طالب علم اگر صبح سے شام تک کتابوں میں سر کھپائے اور کھیل کو دحرام کرے یا ایک طبیب اگر دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر کے تشخیص امراض و معائنہ مرضی تک ہی اپنے تئیں وقف کردے تو اس نے زندگی کا صرف ایک پہلو دیکھا اور باقی پہلوؤں کے لئے وہ اندھا ہے۔ ایک ہی قسم کے ذائقہ سے طبیعت جلد سیر ہو جاتی ہے۔ مصروفیتوں میں ردوبدل کرتے رہو گے تو دنیا کی اشیاء زیادہ خوبصورت اور جاذب توجہ ثابت ہوں گی۔ کبھی فقیروں کا بھیس بنا کر "تماشائے اہل کرم" دیکھو تو کبھی اہل کرم بن کر فقیروں کا تماشا دیکھو۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے:

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب   چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہوجانا

بی اے تک ہم ساتھ رہے۔ اس کے بعد میں ایم اے میں آگیا اور اصغر گھر بے کار بیٹھا رہا۔ میرا خیال تھا اب وہ زندگی کا بے کاری کے نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کرے گا۔ لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ اسکے والد اسے مزید تعلیم دینے کے حامی نہ تھے۔ اس لئے اصغر کو مجبوراً لاہور کی جاں بخش درسگاہوں سے محروم رہنا پڑا ایک سال گذر گیا اور اگلے برس اصغر نے یکایک لا کالج میں داخل ہو کر سب دوستوں کو حیران کر دیا۔ کہاں اصغر اور کہاں قانون کی کٹھن منزل۔ سال بھر اصغر قانون کی ضخیم اور خشک کتابوں کا پلندا اٹھائے دو میل کا فاصلہ طے کر کے ہر روز آٹھ بجے کالج پہنچتا رہا۔ اس کی باقی زندگی انھیں دیرینہ خصوصیات کی حامل تھی۔ جدت کا وہ اب بھی شائق تھا۔ اور شاید لا کالج میں داخل ہونا بھی جدت پرستی ہی کا کرشمہ تھا۔ مگر اس کی ذہانت قانون کی حریف نہ ہو سکی۔ یہاں تو وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جنھیں صبح شام بجز کتابوں کے اور کسی چیز سے سروکار نہ ہو۔ امتحان میں ناکامی کی خبر اس کو ایک انگریزی روزنامہ کے ذریعہ سے ملتان میں ملی۔ اس کے والد جو پہلے ہی سے تعلیم کو ایک ناگوار فرض اور غیر ضروری بار سمجھے بیٹھے تھے یہ خبر سنتے ہی برس پڑے صاف صاف انھوں نے کہدیا کہ "میرے مکان سے نکل جاؤ۔ میں عمر بھر کا اندوختہ تمہاری فضول خرچیوں اور تماشبینیوں پر لٹانا نہیں چاہتا"

اسی گفتگو سے متاثر ہو کر اصغر صاحب گھر سے چل کھڑے ہوئے تھے اور کپڑوں کا بکس کھو کر اداس و مضمحل میرے پاس پہنچے تھے۔ جب ہم کھانا کھا چکے تو میں نے پوچھا "اب کہاں کا ارادہ ہے؟"

"میں بمبئی جا رہا ہوں"

بمبئی؟ وہاں کیا کرو گے؟ میں نے حیرت سے پوچھا

"تم حیران کس بات پر ہوتے ہو! میں تمہاری طرح آئی سی ایس کے خواب تو دیکھ نہیں رہا ہوں کہ اس سے کم کسی چیز سے میری تشفی نہ ہوگی۔ تمہیں معلوم ہے کہ ذاتی وجاہت و حشمت کے قائم کردہ معیار میں میں تمہارا ہم خیال نہیں ہوں۔ میں تو صرف جان و جسم کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا ایک انسان کے لئے ضروری سمجھتا ہوں اور یہ وہ چیزیں ہیں جو میں بہرحال اور ہر جگہ اپنے لئے بآسانی پیدا کر سکتا ہوں۔ اس لئے میرے لئے لاہور، کراچی، لکھنؤ، بمبئی یا لندن سب برابر ہیں"

چند روپے ان کے پاس تھے، کچھ مجھ سے لئے اور حضرت دوسرے روز بمبئی روانہ ہو گئے۔ اس واقعہ کو تین سال گذر گئے۔ ہم بظاہر ایک دوسرے کے لئے مر چکے تھے کیونکہ نہ اس نے مجھے کبھی خط لکھا اور نہ مجھے اس کا پتہ معلوم تھا۔ اس دوران میں میرے ہم سبق دوست آدم اسمٰعیل کی شادی کی تقریب آئی۔ آدم اسمٰعیل بمبئی کے رہنے والے تھے اور وہیں ان کا کاروبار تھا۔ ان کے سخت اصرار پر مجھے بھی اس تقریب سعید میں شریک ہونے کے لئے بمبئی جانا پڑا۔ جب برات اور ولیمہ کی گہما گہمی سے فراغت ہو چکی تو آدم صاحب نے اپنے خاص دوستوں کو ایک شام کو تاج محل ہوٹل میں دعوت دینے کا اہتمام کیا۔ تاج محل کی وسیع و شاندار عمارت کے ایک پر تکلف کمرے میں بیٹھے ہم سامان اکل و شرب کا انتظار کر رہے تھے کہ ہوٹل کا ملازم شوربے کی رکابیاں اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دہلیز کے اس طرف قدم رکھا ہی تھا کہ میری اس کی نظریں چار ہوئیں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر شک ہونے لگا۔ میں سمجھا کہ عالم خواب ہے اور جو دیکھ رہا ہوں اس کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ آنے والے شخص نے بھی میری طرف دیکھا اور

سوائے ایک خفیف تبسم کے اس کے چہرہ پر حیرت واستعجاب کی کوئی علامت نہ تھی۔ یہ اصغر تھا جو ہوٹل کے ملازم کی مخصوص وردی پہنے ہمارے لئے میز پر کھانا چن رہا تھا جب وہ دوسری مرتبہ کمرے میں داخل ہوا تو میں نے بے اختیار اس کا بازو پکڑ لیا اور کہا "اصغر تم کہاں ؟" اس نے نہایت تحمل سے جواب دیا "یہ مصروفیت کا وقت ہے۔ پہلے کھانے سے فارغ ہو لیجئے پھر باتیں کریں گے" میرے ساتھی حیران تھے کہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے انھیں یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کھانے کے بعد مفصل گفتگو ہوگی جب ہم بل ادا کر کے رخصت ہونے لگے تو اصغر چند منٹ کے لئے میرے پاس آیا اور کہنے لگا "ابھی کام ختم نہیں ہوا ورنہ میں تمہارے ہمراہ چلتا۔ یہ بتاؤ ٹھیرے کہاں ہو؟ میں کل صبح آؤں گا"

میں نے اسے اپنی قیام گاہ کا پتہ دیا اور بمنت درخواست کی کہ خدا کے لئے اپنی اولین فرصت میں ضرور پہنچنا۔ دوسرے روز میں ابھی ناشتے سے فارغ نہ ہوا تھا کہ اصغر کے آنے کی اطلاع ہوئی۔ ہلکے فاختئی رنگ کا سوٹ بیش قیمت انگریزی ٹوپی اور نہایت اعلیٰ بوٹ پہنے اصغر صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ میرے میزبان جو اب تک اصغر کے حالات واطوار سے بے خبر تھے اس قلب ماہیت کو دیکھ کر حیران ہو گئے۔ اصغر نے اندر قدم رکھتے ہی ایک بلند بانگ قہقہہ لگایا اور آداب مجلس کو بالائے طاق رکھ کر وحشیوں کی طرح مجھ سے لپٹ گیا۔

میں بار بار اس کے کپڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور سخت متعجب تھا کہ اس طرفہ معجون آدم زاد کا خمیر کس مٹی سے ہوا ہے رات ایک ہوٹل کا خدمتگار تھا اور اب ہائیکورٹ کے وکیل سے کم شان کا مالک نہیں۔ میں نے پوچھا "تم نے بہروپ بھرنے کا پیشہ کب سے اختیار کیا ہے۔ کیا بمبئی میں تم شروع سے یہی کام کر رہے ہو؟ کیسی شرمناک بات ہے کہ یونیورسٹی کا گریجوایٹ اور تم سا زیرک اور خوش فہم شخص یوں ذلیل وخوار ہو"

اس نے کہا "اگر تم نے زجر و توبیخ کی پرانی عادت ترک نہیں کی تو الحمدللہ میں بھی اپنی دیرینہ خصوصیات پر بدستور قائم ہوں۔ میں تم سے ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب ایکٹر۔ تم میرے قول کو متانت کے خلاف سمجھ کر ناقابل عمل خیال کرتے تھے۔ اب تو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو کہ میں کس

اندازسے اس اصول کو اپنی عملی زندگی میں جاری وساری کرچکا ہوں. بھائی سچ جانو میں تم سے زیادہ مسرور و مطمئن ہوں. غم دنیا و فکر عاقبت سے آزاد ہوں. اچھا کھانا اچھا پہننا، بمبئی ایسے شہر میں فطرت انسانی کا مطالعہ اور مجھے کیا چاہیے؟ آزادی کا یہ عالم ہے کہ ڈھائی سال کی مدت میں بیسیوں پاپڑ بیل چکا ہوں. مدرسی اور اخبار نویسی میں نے کی. سنگر مشین کا ایجنٹ میں رہا. سینما اور تھیٹر کی ملازمت کا مزا میں نے چکھا. ٹرام میں نوکری میں نے کی. غرض کہ جہاں طبیعت ذرا اکتائی اور حواس پر بڑھاپے کے آثار نمودار ہوئے میں فوراً اپنی مصروفیت کی نوعیت میں تبدیلی پیدا کرلیتا ہوں اور زندگی پھر تر و تازہ ہوجاتی ہے ع

جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

میری صحت دیکھو، قابل رشک ہے یا نہیں؟" اصغر کی صحت واقعی بے نظیر تھی. گوشت اور خون کی کثرت. اس پر اس کا ورزشی جسم، پہلوان معلوم ہو رہا تھا." آج کل یہ کام ہے کہ دن کو یہاں کے ایک رئیس کے خورد سال بچے کو پڑھاتا ہوں. معقول مشاہرہ لینے کے علاوہ رہتا بھی انھیں کے مکان پر ہوں اور شام کو تاج محل ہوٹل. پچھلے دنوں جرمنی کی ایک مشہور تجارتی کمپنی کے گماشتے سے میری ملاقات ہوگئی تھی وہ اپنے کاروبار کے سلسلہ میں مجھے جرمنی لے جانے پر رضامند ہے شرائط ابھی طے نہیں ہوئے ہیں. ممکن ہے چند ماہ میں جرمنی چلا جاؤں اور یوں یورپ جانے کی پرانی آرزو بر آئے."

مجھے بمبئی سے واپس آئے سال بھر سے زیادہ عرصہ ہوگیا ہے. آدم اسمٰعیل اور اصغر کی خاصی دوستی ہوگئی تھی. چنانچہ آدم صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ اصغر جرمنی روانہ ہوگیا ہے.

غزل

حریمِ ناز میں میری نماز ہو جائے
جبینِ شوق سراپا نیاز ہو جائے!

ہر ایک شے میں درخشاں ہو جلوۂ عصمت
مری نگاہ اگر پاکباز ہو جائے

پھر آرزو سے یہ معمور ہو گیا اے حسن!
دیارِ دل پہ پھر اک ترکتاز ہو جائے

یہ میری زیست کا حاصل ہے آپ کا کیا ہے!
اگر نگاہ محبت نواز ہو جائے۔

کچھ ایسا نغمۂ بے تاب چھیڑ اے مطرب
کہ بیقرار مرے دل کا ساز ہو جائے

مری نگاہ میں پھر کیا ہے گردشِ گردوں!
تری نگاہ اگر کارساز ہو جائے

وہی ہے رندِ حقیقت شناس نظروں میں
کہ پیرِ میکدہ سے بے نیاز ہو جائے

تلاشِ خویش میں گم ہوں یہ کیا قیامت ہے
کہ راز آپ ہی جویائے راز ہو جائے

نہ کٹ سکے گی شبِ تارِ زندگانی کی
یہ داستانِ محبت دراز ہو جائے

بہشتِ زیست ہے سوز و گدازِ عشق اثر
خوشا وہ دل! کہ سراپا گداز ہو جائے

تنقید و تبصرہ

کتب۔

باطل شکن۔ الکلام الفصیح فی تحقیق حیات المسیح۔ ترکی جمہوریہ۔ مفتاح العربیہ۔ اصح السیر فی صدی البشر

رسائل۔

یادگار رسالانہ نمبر۔ سالنامہ حقیقت الاسلام۔ ساقی۔ سالانہ نمبر

باطل شکن | مصنفہ مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی۔ تقطیع خورد لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط۔ حجم ۹۰ صفحات قیمت فی نسخہ ۳۔ ملنے کا پتہ۔ منیجر صاحب مکتبہ عبرت۔ نجیب آباد۔ ضلع بجنور۔

ایک عیسائی پادری نے ایک کتاب تاویل القرآن لکھ کر اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عیسائی قرآن کی رو سے مذہب حق پر ہیں اور اہل اسلام کو ان سے مذہبی امور دریافت کرنے چاہئیں۔ اور ان کو برسرحق تسلیم کرنا چاہیئے۔ مولانا اکبر شاہ خاں نے قرآنی دلائل سے اس کتاب کے دجل و فریب کو نہایت خوبی اور صفائی کے ساتھ واضح کردیا ہے۔ اور یہ دکھلا دیا ہے کہ قرآن کریم کے ہوتے ہوئے کسی قوم کا مکر و فریب مسلمانوں پر نہیں چل سکتا اور کسی کے جھوٹ اور کذب کے پھندوں میں وہ آسکتے ہیں۔ اس کے ساتھ انھوں نے توریت اور انجیل کی تاریخی اور موجودہ حیثیت بھی دکھلا دی ہے کہ یہ دونوں کتابیں دراصل مرفوع ہوچکی ہیں صرف ان کے محرف ترجمے باقی رہ گئے ہیں۔ اور اہل کتاب کے لئے دین حق حاصل کرنے کا اب کوئی راستہ بجز قرآن کریم کے نہیں رہ گیا ہے۔

مولانائے موصوف کی دیگر مختصرات کی طرح یہ کتاب بھی ہم کو بہت پسند آئی۔ معقول۔ مدلل اور سادہ و سلیس ہے

(ا۔ ج)

الکلام الفصیح فی تحقیق حیات المسیح | فرقہ مرزائیہ کا سب سے اہم مسئلہ جس پر جا بجا وہ بحثیں کرتے ہیں حیات مسیح کا مسئلہ ہے اس کے اوپر متعدد کتابیں اور رسائل بھی فریقین کی طرف سے لکھے جا چکے ہیں۔ حال میں مولانا مفتی قاری سید محمود کی قادری سنوسی نے مندرجہ بالا نام سے چھوٹی تقطیع پر چار جز کا ایک رسالہ لکھ کر شائع کیا ہے۔ اس میں انھوں نے حیات مسیح کے دلائل لکھے ہیں۔ اور مرزا صاحب کے دعاوی کے خلاف بھی بہت سے براہین پیش کئے ہیں۔ انداز بیان متین۔ سادہ اور صاف ہے۔ رسالہ کی قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ۔ جناب حاجی حافظ وزیر محمد

صاحب جنرل مرچنٹ۔ چک بازار دارجلنگ (۱۰-ج)

ترکی جمہوریہ | از جناب ضمیر احمد ہاشمی صاحب ڈپٹی کلکٹر میرٹھ ضخامت ۳۰۸ صفحات سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کتابت و طباعت اچھی۔ کاغذ متوسط۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی یا جامعہ پریس عقب جامع مسجد دہلی یا خود جناب مصنف سے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو آل عثمان کی سلطنت سے شروع سے شغف رہا ہے خصوصًا اس آخری زمانہ میں جب کہ خود ان کی سلطنت پارہ پارہ ہو گئی اور محکومیت کا ادبار ان پر مسلط ہو گیا ان کی عقیدت و توجہ کا مرکز اسی طرف منتقل ہو گیا اسی کا اثر تھا کہ ترکوں کی ذرا سی پریشانی سے ہندوستانی مسلمانوں کے دل پر چوٹ لگتی تھی۔ کریمیا اور بلقان کی جنگوں سے اس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن جنگ عظیم کے بعد جب ترکی حکومت نے نیا چولا بدلا نئی طرز حکومت کی بنیاد ڈالی گئی تو کچھ مغربی حکومتوں کے پروپیگنڈے کے اثر سے اور کچھ حکومت اور اس کے بعض سرکردہ افراد کے رویہ کی وجہ سے مسلمانوں کی عقیدت روز بروز کم ہوتی گئی اور ترکی حکومت کے خلاف ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو گئے خصوصًا جب کہ ترکی حکومت نے خلافت کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا ادھر کئی سال سے ترکوں کی تاریخ سے متعلق اردو میں اچھا خاصا ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے لیکن یہ تمام تر عربی کی جدید تصانیف سے ماخوذ ہے اور محض سطحی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک ایسی تصنیف کی ضرورت اب بھی باقی تھی جو ترکی تاریخ کے گہرے مطالعہ پر مبنی ہوتی اور جس میں ترکی قوم کی ترقی و تنزل اور دوبارہ احیا کے اسباب و وجوہ کا تجزیہ کیا جاتا۔ اس سلسلہ میں پروفیسر گرمانوس صدر شعبہ مشرقی بوڈا پسٹ و سابق پروفیسر السنہ مشرقیہ شانتی نکیتن کے وہ مقالات نظر انداز نہیں کئے جا سکتے جو انھوں نے انگریزی زبان میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں پڑھے تھے اور جن کا ترجمہ رسالہ اردو میں باقساط شائع ہو رہا ہے۔ پروفیسر گرمانوس کو ترکی میں قیام کرنے وہاں کے مشہور ماہرین سیاست سے ملنے جلنے اور ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع ملا ہے پھر ترکی زبان و ادب اور اس کی تاریخ ان کا خاص موضوع ہے۔ زبان و ادب کی تاریخ کے ضمن میں انھوں نے ترکوں کی تاریخ ان کے تدریجی نشو و نما اور پھر ان کے انحطاط و تنزل پر بھی بحث کی ہے

زیر نظر کتاب کا مقصد ترکی جمہوریہ کی "نشأۃ ثانیہ کا تجزیہ" ہے لیکن مصنف نے اس سلسلہ میں ترکوں کے ابتدائی نشو و نما تدریجی ترقی اور پھر تنزل و انحطاط کے علل و اسباب کا بھی تجزیہ کیا ہے اور نہایت غور و تحقیق سے کام لیا ہے۔

کتاب سولہ ابواب پر منقسم ہے اور ہر باب ایک مستقل بحث پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ترکی میں یورپ کے اثر

پربحث کی گئی ہے پہلے یورپ کی شاطرانہ چالوں کو عریاں کیا گیا ہے پھر بتایا ہے کہ ترکی کے مردِ بیمار نے کس طرح اس حکیم مغرب سے چھٹکارا حاصل کیا اور اس کی ساری امیدوں کو پامال و مجروح کر دیا پھر یہ کہ ترکی مصلحین اپنے طرز حکومت اور اپنے تہذیب و تمدن کو کس طرح مغربی طرز پر ڈھالنا چاہتے ہیں اور انھیں کہاں تک اس میں کامیابی ہوئی ہے۔ پھر یہ بتایا ہے کہ ترکی کے متعلق اہل مغرب کی معلومات کس قدر محدود تھیں اور وہ ترکوں کو کیا سمجھتے تھے اور قدیم ترک اور ترکی تمدن ان کی نظر میں کیا تھا دوسرے باب میں ترکوں کی ابتدائی تاریخ ان کے اناطولیہ میں آباد ہونے۔ ان کے اسلام لانے ان کی فاتحانہ پیش قدمیوں ان کی اور اہل مغرب کی حریفانہ زندگی ان کے نظام حکومت اور اس کی خصوصیات عثمانی بادشاہوں کے عیسائی و دیگر غیر مسلم غلاموں کی تربیت اور نظام سلطنت میں ان کے مراتب و مدارج کا تذکرہ ہے. تیسرے باب میں یہ بتایا ہے کہ مغربی و مشرقی عیسائیوں کے باہمی تعلقات کیا تھے اور مشرقی عیسائی یورپ کے عیسائیوں سے کس درجہ متنفر تھے لیکن آہستہ آہستہ یہ نفرت دور ہونے لگی اور ٹوٹے ہوئے رشتے مدتوں کے بعد پھر جڑنے لگے۔ پھر اس صورت حال کے اسباب بتائے گئے ہیں اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ ترکی ارکان سلطنت نے اس خطرہ کو بروقت محسوس کر کے کس طور پر اس کے انسداد کی کوشش کی غرض اس ملک پر مغربیت نے کس طرح آہستہ آہستہ اپنا اثر ڈالا اور کس طرح انقلاب کے جراثیم پیدا ہوئے چوتھے باب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح غیر مسلم رعایا پر سے روز بروز حکومت کا اثر و اقتدار زائل ہو رہا تھا اور اس مصیبت کو دور کرنے کے لئے کیا کیا مراعات دی گئیں پھر سلاطین عثمان کی بدعنوانیوں خصوصاً سلطان عبدالحمید کے استبداد اور ترک قوم پرستوں کی ایک جماعت کے قیام کی تفصیل دی گئی ہے اور ان کی بے شمار قربانیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے پھر بتایا گیا ہے کہ ان نوجوانوں کو اپنے مقصد میں کس حد تک کامیابی نصیب ہوئی نیز ان کے بعض غلط اقدامات کی وجہ سے ملک کو کس قدر نقصان پہنچا۔ پانچویں باب جنگ عظیم کے بعد کی مفصل تاریخ ہے اور ترکوں کے زوال کی انتہا سلاطین کی بے عنوانیوں پھر ترک قوم پروروں کی جانبازیوں ان کی مسلسل جدوجہد مغربی دول کی شاطرانہ چالوں یونان کی چیرہ دستیوں اور پھر آخر میں ترک قوم پرستوں کی شاندار کامیابیوں اور ان کی کوشش سے ایک نئی جمہوریت کی تاسیس اور ترکی قوم کی حیرت انگیز ترقی کا نہایت تفصیلی تذکرہ ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب عام مسلمانوں کے لئے بھی مفید ثابت ہوگی اور ترکوں کے متعلق جو غلط خیالات عام طور پر ان کے دلوں میں قائم ہو گئے ہیں وہ بڑی حد تک دور ہو جائیں گے۔ آخر میں ہم ان غلطیوں کی طرف بھی توجہ دلانا چاہتے ہیں جو یا تو کاتب صاحب کی نوازش یا خود جناب مصنف کی بے توجہی کا نتیجہ ہیں مثلاً صفحہ ۱۰ سطر ایک پر "جان پڑی ہے" یہ فقرہ مہمل ہے جان کے بعد ضرور کچھ رہ گیا ہے پھر اسی صفحہ پر دوسری سطر میں" چارہ ساز کو کہہ سمجھا ہے" لکھا گیا ہے یہاں بجائے "کو" کے "نے" چاہیئے۔ اسی قسم کی اور بہت سی غلطیاں ہیں جن کا احاطہ اس وقت دشوار ہے امید ہے کہ آئندہ اشاعت میں ان

فروگذاشتوں کو دور کر دیا جائے گا۔ (ا ع ۔ ع)

<u>مفتاح العربیہ</u> مصنفہ مولانا احسان سامی حقی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ضخامت ۱۲۰ صفحات سائز ۱۶×۲۰ قیمت ۸/ ملنے کا پتہ۔ سید محمد نسیم بذریعہ مولوی سید محمد نعیم صاحب ایڈوکیٹ بالائے قلعہ علی گڑھ یوپی

مولانا احسان سامی حقی نے یہ کتاب بچوں کو عربی بول چال سکھانے کے لئے لکھی ہے۔ ہندوستان میں اس مقصد کے لئے بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن جناب مصنف کے خیال میں نہ صرف یہ کہ یہ کتابیں مفید نہیں ہیں بلکہ مضرت رساں معلوم ہوتی ہیں اور انھوں نے اپنے اس دعوے کے اثبات میں معقول دلائل بھی پیش کئے ہیں تاہم ہمیں ان کے اس دعوی میں تھوڑا سا مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے ان کی اس کتاب کو بغور دیکھا ہے۔ مگر ہمیں اس میں کوئی ایسی خاص بات نظر نہ آئی جو دوسری کتابوں سے امتیاز رکھتی ہو اور یہ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ جب کہ یہ پوری کتاب محض ایک ہفتہ کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ بچوں کے لئے جو کتاب لکھی جائے اس کو دلچسپ اور آسان تر بنانے کے لئے خاص کوشش و اہتمام کی ضرورت ہے۔ اور غالبا ایک ہفتہ اس قسم کی کوشش کے لئے کافی نہیں پھر بھی ہمیں امید ہے کہ دوسری کتابوں کے مقابلہ میں یہ کتاب بچوں کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

اس کی کتابت و طباعت یونیورسٹی پریس کی اور کتابوں کی طرح بہت اچھی ہے۔ اچھا ہوتا اگر کاغذ بھی ذرا اور دبیز لگایا جاتا۔ (ح ۔ ح)

<u>اصح السیر فی ھدی خیر البشر</u> مصنفہ مولانا حکیم ابو البرکات عبد الرؤف صاحب قادری داناپوری تقطیع اوسط لکھائی چھپائی اور کاغذ اعلی۔ ضخامت ۶۱۲ صفحات قیمت فی نسخہ غیر مجلد للعہ

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں یہ کتاب بلحاظ روایت نہایت تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ اور باوجود اس کے کہ بنگال میں لکھی گئی ہے اس کی اردو صاف اور صحیح ہے۔ جملہ واقعات اس قدر بسط و تفصیل کے ساتھ لکھے گئے ہیں کہ اس سے زیادہ کی ضرورت نہ تھی۔ علاوہ حالات کے بہت سے مسائل پر ضمناً تحقیقی بحثیں بھی ہیں جو محققانہ انداز میں کی گئی ہیں۔ خود مؤلف نے جہاں اپنی رائیں لکھی ہیں ان میں بہت کچھ بحث کی گنجائش ہے لیکن انھوں نے ائمہ حدیث اور فقہا کے اقوال بھی سامنے رکھ دئے ہیں جن سے فیصلہ میں بہت کچھ آسانی ہو جاتی ہے۔

ہر چند کہ یہ کتاب چھوٹی تقطیع پر ہے لیکن اس میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات شروع سے آخر تک مع ازواج حالات کے آگئے ہیں۔ اس مستقل تصنیف کے طالب کو اس حصہ کے بعد کسی مزید انتظار کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ سیرت میں جو کتابیں علمی انداز سے لکھی گئی ہیں ان میں یہ کتاب بہت قدر کے قابل ہے۔ (ا ۔ ع)

<u>یادگار سالانہ نمبر</u> | ایڈیٹر نیّر بی اے حجم ۲۰۰ صفحات قیمت عمر چندہ سالانہ سے مقام اشاعت لاہور

یہ رسالہ پہلے عالمگیر کے دفتر سے نکلتا تھا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ جناب ایڈیٹر صاحب عالمگیر نے اسے چند لائق حضرات کے سپرد کر دیا ہے جو اس پر پوری توجہ صرف کر رہے ہیں اور رسالہ قابل اطمینان طریقے پر ترقی کر رہا ہے۔ زیر نظر نمبر سنہ ۱۹۳۳ء کا سالگرہ نمبر ہے اور دوسرے رسائل کے سالانہ نمبروں سے کسی طرح گھٹیا نہیں ہے بڑے سائز پر ۱۹۴ صفحات کی ضخامت ہے۔ ڈیڑھ درجن کے قریب اعلیٰ درجہ کی تصاویر ہیں تقریباً ۲۰ مضامین نظم و نثر ہیں۔ مضمون لکھنے والوں میں جناب علی عباس حسینی، جناب تبسم ایم اے، جناب ایم اسلم، جناب محمد حسین ادیب، جناب منصور احمد، جناب عظیم بیگ چغتائی، جناب کاشی پریاگی، اور شعراء میں حضرت جلیل، حضرت جگر، حضرت احسن، جناب حشر کاشمیری، حضرت وحشت، جناب مجود سوہانی، مولانا امجد، مولانا سہا، مولانا محوی اور جناب حفیظ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ رسالہ کی کتابت و طباعت بھی اچھی خاصی ہے۔ کاغذ متوسط درجہ کا ہے۔ ٹائٹل دیدہ زیب ہے اور اس پر مشہور مغربی شاعر بائرن کا فوٹو بلاک ہے (ح۔ ح)

<u>سالنامہ حقیقت اسلام</u> | ایڈیٹر سید محمد شاہ صاحب ضخامت ۲۳۶ صفحات کتابت و طباعت نہایت صاف اور پاکیزہ، کاغذ عمدہ۔ چندہ سالانہ ۲ر اس پرچہ کی قیمت ۱۲

چکوآرٹ پریس ایک عرصہ سے قرآن اور علوم قرآن سے متعلق بہترین خدمات انجام دے رہا ہے ہندوستان میں یہ پہلا پریس ہے جو اس قدر اہتمام اور نفاست کے ساتھ اعلیٰ قسم کے مضبوط کاغذ پر عکسی بلاکوں کے ذریعے غیر معمولی احتیاط کے ساتھ کلام پاک چھپوا رہا ہے۔ تقریباً ایک سال سے اس مطبع سے ایک مذہبی رسالہ بھی نکل رہا ہے جس میں نہایت صاف و سلیس زبان اور دلچسپ انداز بیان میں مذہبی معلومات پیش کی جاتی ہیں۔ زیر نظر نمبر اسی رسالہ کا سالانہ نمبر ہے اس میں نظم و نثر کے ۲۵ مضامین ہیں جو سب کے سب مفید مذہبی معلومات پر مشتمل ہیں۔ ان مضامین میں مطالب الفرقان (تفسیر مسلسل) اسلامی اخلاقیات کا امتیازی پہلو، اسلام کی خصوصیات، خیر الوریٰ، امیر المومنین عمرؓ، ابو جعفر منصور (مسلسل) عربی زندگی، تجرید الترمذی (مسلسل) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مضمون نگاروں میں جناب مرزا عزیز شمس الحسن رضوی رفیق دلاوری، یوسف سلیم، محمد عبد اللہ قریشی، اور روشن صدیقی صاحبان نے اس نمبر کو کامیاب بنانے میں خاص حصہ لیا ہے۔ شروع میں عید کارڈ کے نمونہ پر چار رنگ کا ایک خوب صورت بلاک بھی ہے۔ علاوہ اس کے کلام پاک اور یازدہ سورہ کا ایک ایک صفحہ نمونہ کے لئے دیا گیا ہے۔ یہ دونوں صفحات اپنی خوش نمائی اور دیدہ زیبی میں اپنی آپ نظیر ہیں۔ ٹائٹل کا بلاک بھی بہت متین و سنجیدہ اور خوب صورت ہے۔ غرض یہ رسالہ خصوصاً یہ خاص نمبر ہر حیثیت سے اس قابل ہے کہ اس کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ (ح۔

ساقی۔ سالانہ نمبر ۳۳ء | ایڈیٹر شاہد احمد صاحب بی اے سائز ۲۹×۲۲ حجم ۳۲۵ صفحات کتابت وطباعت اچھی۔ کاغذ متوسط۔ اس پرچہ کی قیمت عہ سالانہ ہے مقام اشاعت دہلی

اس رسالہ کو دلی سے جاری ہوئے تین سال گزر چکے ہیں تیسرے سال کے اختتام اور چوتھے کی آمد کی مسرت میں یہ خاص نمبر نکالا گیا ہے جو اپنی صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے نہایت کامیاب ہے۔ اس خاص نمبر کے علاوہ سال میں غالباً تین اور خاص نمبر ادارہ کی جانب سے نکالے جاتے ہیں اور ان میں دلی نمبر اور ظریف نمبر اپنے انوکھے پن کی وجہ سے اہم اور امتیازی حیثیت رکھتے ہیں زیر نظر سالانہ نمبر کی ضخامت جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں ۳۲۵ صفحات ہے اس سال کے سالانہ نمبروں میں کسی پرچہ کی ضخامت اس قدر نہیں ہے۔ پھر کتابت بہت باریک ہے۔ مضامین نظم و نثر کل چالیس ہیں۔ مضمون نگاروں میں خان بہادر میر ناصر علی محمد حسین ادیب ایم اے عبدالمالک آروی۔ سید حسن برنی سید وزیر حسن دہلوی نصیر الدین ہاشمی، سید مقبول حسین احمد پوری۔ حجاب اسمعیل۔ ایم اسلم ڈاکٹر اعظم کریوی، سید بادشاہ حسن، مرزا عظیم بیگ چغتائی خاص طور سے قابل ذکر ہیں مضامین میں شرح ہنگامہ ہستی، اردو شاعری پر کلاسیت اور رومانیت کی جنگ کے اثر۔ بہار کا ایک گمنام شاعر، دولت خانہ، تاج محل۔ جال دوست۔ محبت کی ٹھوکر، اللہ میاں کی قواعد۔ اکبر الہ آبادی اور مغربی تعلیم مقبوضہ تارہ مجبہ نوری۔ سلاطین آصفیہ کی اردو شاعری، دولت کا پجاری، اندھی کھلونے والی خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ شعرا میں مہاراجہ کشن پرشاد، حضرت جوش۔ اثر صہبائی۔ علی اختر اختر۔ حضرت فانی۔ حضرت رسا ہمدانی۔ حضرت نوح ناروی، رونق محفل ہیں تصویریں ۶ ہیں ان سے پہلی تصویر ہندوستانی مصوری کا اچھا نمونہ ہے دوسری تصویر میں مصریوں کے ممی بنانے کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسری اور چوتھی تصویریں چینی آرٹ کا بہترین نمونہ ہیں اور کارکنوں نے خاص ذرائع سے حاصل کی ہوں گی۔ غرض یہ نمبر ہر اعتبار سے علم و ادب کا بہت اچھا مرقع ہے اور شاہد صاحب نے بہت محنت سے مرتب کیا ہے۔ یہ رسالہ جب سے جاری ہوا ہے برابر ترقی کی راہ میں گامزن ہے ہم شاہد صاحب کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں ان تمام خوبیوں کے مقابلہ میں اس نمبر کی قیمت بہت کم ہے یعنی صرف عمر

(ح۔ ح)

شذرات

غازی رؤف بے کا ورود جامعہ کی تاریخ میں ایک یادگار واقعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری صاحب مدظلہ کے بیحد شکر گذار ہیں کہ انھی کی بدولت غازی موصوف کی زیارت ہمیں نصیب ہوئی۔ اسی سلسلے میں یہ خبر بھی مسرت انگیز ہے کہ ترکی اور یورپ کے بعض اور جلیل القدر علمائے ڈاکٹر صاحب قبلہ سے جامعہ میں تشریف لانے اور اہل جامعہ کو اپنے خیالات سے فائدہ پہنچانے کا وعدہ فرمایا ہے۔

جن لوگوں کو ترکی کی گذشتہ پچیس سال کی تاریخ سے واقفیت ہے۔ ان کے لئے رؤف بے کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس عرصے میں ترکی قوم پر جتنے دور گذرے ہیں ان میں سے ہر ایک میں موصوف نے نمایاں حیثیت سے حصہ لیا ہے آپ ۱۸۸۱ء میں استانبول میں پیدا ہوئے اور گیارہ سال کی عمر میں بحری فوجی اکادمی میں داخل ہوئے۔ اٹھارہ برس کے سن میں آپ کی عملی زندگی شروع ہوئی اس وقت سے لے کر ۱۹۲۵ء تک آپ نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں ان کی تفصیل کے لئے تو ایک مستقل کتاب درکار ہوگی۔ اجمالاً یہاں کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

موجودہ صدی کے ابتدائی سالوں میں آبدوز کشتیوں کا استعمال خفیہ طور پر شروع ہوا۔ ترکی حکومت کی طرف سے رؤف بے انگلستان بھیجے گئے کہ وہاں کچھ معلومات حاصل کریں لیکن وہاں انھیں ناکامی ہوئی۔ امریکہ اس زمانے میں ترکی پر مہربان تھا اس لئے وہاں موصوف کا خیر مقدم کیا گیا۔ اور ہر طرح کی معلومات بھی انھیں حاصل ہوئیں۔ اس طرح ترکی بیڑے میں آبدوز کشتیوں کا رواج رؤف بے کے ذریعے سے ہوا۔ ۱۹۰۸ء کے دستوری انقلاب کے سلسلے میں جب بحری فوج کی از سر نو تشکیل ہوئی تو اس میں بھی رؤف بے کا نمایاں حصہ تھا اور اس کے بعد ہی آپ جنگی جہاز 'حمیدیہ' کے کپتان

مغرور کئے گئے۔ اس جہاز نے جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں جس طرح غنیم کے بیڑے کو پریشان کیا وہ ایک ایسی عجیب و غریب داستان ہے کہ اگر ہمیں اس کے واقعہ ہونے کا علم نہ ہوتا تو کبھی باور نہ کرتے۔

سنہ ۱۹۱۴ء سے سنہ ۱۹۱۸ء تک جنگ عظیم کے سلسلے میں نہ صرف بحری فوج میں بلکہ بری فوج میں بھی اپنے کمالات دکھاتے رہے۔ پھر جب عزت پاشا وزیر اعظم ہوئے تو رؤف بے 'وزیر البحر' بنائے گئے اور اسی حیثیت سے آپ ہی کی سرکردگی میں وہ وفد گیا تھا جس نے ۳۰ نومبر سنہ ۱۹۱۸ء کو اتحادیوں سے انقطاع جنگ کا معاہدہ کیا۔ صلح کے بعد سلطان کے غیر دستوری طرز حکومت کی وجہ سے عزت پاشا کو استعفا دینا پڑا اور جب توفیق پاشا نے ترکی پارلیمنٹ کو منسوخ کر دیا تو رؤف بے عثمانی حکومت سے اس قدر بیزار ہوئے کہ انھوں نے ملازمت سے بھی استعفا دے دیا۔

جب یونانی فوجیں سمرنا میں داخل ہوئیں اور انھوں نے اپنی شرمناک سفاکیاں شروع کیں تو رؤف بے بھی اناطولیہ پہنچے اور مصطفیٰ کمال پاشا کے ساتھ آپنے بھی یونانیوں کا مقابلہ کیا آپکے پیش نظر فوج کے لئے اسلحہ اور سامان خورونوش کی فراہمی کا مشکل کام تھا۔ ترکوں نے اس جنگ میں جس بہادری وطن پروری اور ایثار کا ثبوت دیا اس کی مثال تاریخ میں شاذو نادر ہی ملتی ہے۔ سلطان وحیدالدین نے جب قوم فروش وزرا کے مشورے سے اتحادیوں کو قسطنطنیہ میں داخل ہونے دیا اور قوم پرستوں کے مقابلے میں فوج بھیجی اس وقت رؤف بے ہی اپنی جان خطرے میں ڈال کر سلطان کے پاس گئے تھے اور انھیں اس شرمناک طرز عمل سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی پھر جب ترکی قوم کی جاں نثاری پھل لائی اور اتحادیوں کو اس قوم کے زندہ ہونے کا یقین ہوا تو لوزان کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس میں جو ترکی وفد گیا تھا اس کے سردار بھی رؤف بے ہی منتخب ہوئے اور یہ انھیں کی سیاسی قابلیت کا نتیجہ تھا کہ معاہدہ سیورے منسوخ ہوا اور ترکوں کو وہ حقوق پھر حاصل ہوئے جن کے بغیر کوئی قوم آزاد نہیں کہی جا سکتی۔

حکومت آل عثمان کی تنسیخ اور ملی حکومت کے قیام میں بھی رؤف بے کا حصہ بہت نمایاں تھا آپ کی جو وقعت قوم پرست جماعت کے دلوں میں تھی اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ پہلی مجلس ملی کی صدارت کے لئے آپ ہی کا انتخاب ہوا۔ اب جب صحیح معنوں میں تعمیری کام کا وقت آیا اور جب اس کا موقع تھا کہ رؤف بے کی عملی صلاحیتوں سے ترکی قوم کو فائدہ پہنچتا تو کچھ اسباب ایسے پیدا ہوگئے کہ مصطفیٰ کمال پاشا اور رؤف بے ایک ساتھ مل کر کام نہ کر سکے۔ یہ اختلاف ذاتیات سے متعلق نہ تھا بلکہ سراسر طرز حکومت اور سیاسی و تعلیمی نظام سے متعلق تھا۔ رؤف بے کی عظمت اور عالی حوصلگی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے اس اختلاف کو ذاتی اختلاف نہیں بنایا اور بجائے اس کے کہ ملک میں رہ کر ایک مخالف جماعت قائم کرتے اور اس طرح فساد کا دروازہ کھولتے انھوں نے پسند کیا کہ خود گوشۂ گمنامی میں چلے جائیں اور مصطفیٰ کمال پاشا کی جماعت کو جسے اکثریت حاصل تھی، ملک کا انتظام و انصرام کرنے دیں۔ اب بھی جب کبھی مصطفیٰ کمال پاشا کا ذکر آتا ہے تو رؤف بے اس فراخدلی اور جوش و خروش کے ساتھ ان کی خوبیاں بیان فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کو ان دونوں کے اختلافات کا علم ہے انھیں حیرت ہوتی ہے۔ کاش اس بے نفسی اور احساس توازن کی مثالیں سیاسی رہنماؤں میں کثرت سے ملتیں کہ انھی دو صفتوں کے فقدان نے ہر ملک کی سیاسی فضا کو مکدر کر دیا ہے۔

غازی رؤف بے کو ہندوستان آنے اور ہندوستانی مسلمانوں سے ملنے کا عرصے سے شوق تھا خصوصاً جنگ بلقان کے زمانے میں جب وفد ہلال احمر نے جو ڈاکٹر انصاری صاحب کی سرکردگی میں گیا تھا۔ ترکی افواج کی خدمت کی تو آپ کا یہ شوق اور بڑھا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب اور رؤف بے کے درمیان جو دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے تھے انھی کا یہ نتیجہ ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب نے اپنے سفر یورپ کے دوران میں آپ سے جامعہ میں تشریف لائے اور ترکی کے موجودہ حالات پر چند مسلسل تقریریں کرنے کی درخواست کی تو آپ نے بلا تکلف اسے منظور کر لیا اور اس طویل سفر کی زحمت برداشت کی

دہلی میں رؤف بے کا خیر مقدم جس شان سے ہوا اور آپ کی تقریروں کے سننے کے لئے شائقین کا جیسا ہجوم برابر رہا اس سے وہ دن یاد آتے تھے جب ہندوستان کے مسلمان ترکوں کو ملت اسلامی کا امین اور حامی سمجھتے تھے اور ان کی ہر کامیابی پر خوش اور ناکامی پر رنجیدہ ہوتے تھے۔

جامعہ میں غازی رؤف بے کی چار تقریریں ہوئیں ان کے موضوع بالترتیب یہ تھے :۔
(۱) آل عثمان کی تاریخ کا خاکہ اور جدید دور کی ابتدا۔ (۲) اتحاد اسلامی، اتحاد تورانی، اور قوم پرستی کی کشمکش (۳) ترکی اور جنگ عظیم (۴) ترکی کے موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانات۔ یہ تقریریں بہت جلد انگریزی اور اردو میں مکتبہ جامعہ سے شائع ہونے والی ہیں۔ اس لئے ہم ان کا خلاصہ اس وقت پیش نہیں کر رہے ہیں۔ جن لوگوں نے خود مقرر کی زبان سے ان تقریروں کو سنا ہے وہ اسکی شہادت دیں گے کہ مقرر کی شخصیت اور طرز ادا کی دلفریبی کی وجہ سے لوگوں کی دلچسپی برابر قائم رہی اور باوجود اس کے کہ ہر تقریر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی تھی کسی کو بھی طول کلامی کی شکایت نہ ہوئی۔ بیشتر واقعات تو غازی موصوف نے وہی بیان کئے جن سے اخبار بیں حضرات کم وبیش واقف تھے لیکن بیان کرنیکا طریقہ ایسا تھا کہ گویا وہ واقعات ہمارے سامنے پیش آرہے تھے اور ایسا کیوں نہ ہوتا جب ان میں سے بیشتر واقعات خود مقرر کے چشم دید تھے اور بعض میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ اسی وجہ سے آپنے بعض واقعات ایسے بھی بیان کئے جو اب تک ظاہر نہیں ہوئے تھے اور سیاسی راز کی حیثیت رکھتے تھے۔ خصوصاً جنگ عظیم میں ترکی کی شرکت کے وجوہ کے سلسلے میں آپنے بہت سی پوشیدہ باتیں بتائیں جن سے یہ امر اچھی طرح ذہن نشین ہوگیا کہ ترکی کو بجز اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ جرمنی کا ساتھ دے۔ اس حیثیت سے یہ تقریریں 'جدید ترکی' کے مورخ کے لئے بہت مفید ثابت ہوں گی۔

اس علمی حیثیت کے علاوہ خود غازی رؤف بے کی شخصیت، ان کی خندہ پیشانی، ان کے اخلاق کریمانہ اور ان کی رواداری سے جو سبق اہل جامعہ کو خصوصاً اور اہل دہلی کو عموماً حاصل ہوا ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ اسکا

لقش دلوں سے جلد محو ہو سکے ایسی ہستیاں دنیا میں بہت کم نظر آتی ہیں جن کی ملاقات سے انسان کے دل میں مسرت اور جوش کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے ایسی لہر جس میں مایوسی اور ناکامی کے تمام خطرات خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں۔

نہایت افسوس ہے کہ جامع برلن کے تاریخ اسلام کے استاد پروفیسر ڈاکٹر کارل بیکر کا انتقال ہو گیا۔ موصوف تاریخ اسلام اور خصوصًا مصر کی اسلامی تاریخ کے ماہر تھے۔ تمدن اسلامی کے مسائل سے آپ کو خاص دلچسپی تھی اور اسلامی ممالک کی جدید ذہنی کشمکش کا مطالعہ بھی بہت شوق سے کرتے رہتے تھے اسی سلسلے میں آپ پچھلے سال جاوا گئے تھے اور ہندوستان آنے کا بھی ارادہ رکھتے تھے اپنے ایک ہندوستانی شاگرد سے آپنے اس خیال کا اظہار بھی کیا تھا۔ چنانچہ بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ان سے ہندوستان تشریف لانے اور مختلف علمی اداروں میں اسلامی تمدن پر تقریر کرنے کی درخواست کی جائے۔ مگر کسے معلوم تھا کہ موت ان کی تاک میں ہے اور ان کا یہ شوق اور ان کے احباب کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکے گی مرحوم کی شہرت صرف اسلامی تاریخ کے استاد کی حیثیت سے نہیں تھی بلکہ آپ تقریبًا دس سال تک جرمنی کے سب سے بڑے صوبے یعنی پروسیہ (Preussen) کے وزیر تعلیمات بھی رہ چکے تھے۔ آپ کی علم دوستی اور اپنے مضمون سے شغف کی یہ ایک بین دلیل ہے کہ وزارت سے علیحدہ ہونے کے بعد آپنے جامع برلن کی استادی قبول کر لی اور خاموشی کے ساتھ درس دینے لگے آپ کی ذات سے جرمنی میں اسلامیات کے طالب علموں اور نوجوان اساتذہ کو بڑی تقویت تھی آپ کی ادارت میں ایک سہ ماہی رسالہ 'اسلام' بھی شائع ہوتا تھا۔ جو امید ہے کہ جاری رہیگا۔ آپکے علمی مضامین کے مجموعے کی ایک جلد تو بہت عرصہ ہوا Islamstudien کے نام سے شائع ہو چکی ہے اور دوسری جلد بھی پچھلے سال تیار ہو گئی تھی۔ امید ہے کہ وہ عنقریب شائع ہوگی اور مرحوم کے انتقال سے اس میں تعویق نہ ہوگی۔

ترکی جمہوریہ

از

مسٹر ضمیر احمد ہاشمی، ایم۔ اے، پی سی ایس

ترکی جمہوریہ سولہ بابوں پر مشتمل ہے۔ جس میں سلیس اور عام فہم زبان میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ترکوں پر مغربیت کا اثر کیونکر ہوا۔ اور مغربی طرز اختیار کرنے کے لئے ترکی کو کس قدر مراحل طے کرنے پڑے۔ ترکی کا اولین زمانہ۔ اس کا عروج بعد ازاں تدریج زوال اور اس کے اسباب، بالآخر جنگ عظیم میں شرکت اور بعد کی حالت اتحاد اسلامی، خلافت اور سلطنت کا نسخ اور جمہوریت کا قائم ہونا ترکی کی موجودہ سیاسی اور اقتصادی و معاشرتی حالت اور ان شعبوں میں نمایاں ترقی کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

کتاب کی لکھائی چھپائی نہایت دیدہ زیب ہے اور قیمتی سفید کاغذ پر شائع کی گئی ہے۔ کل صفحات ۳۰۲، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

دیوانِ غالب (جرمنی)

اردو میں نہایت ہی خوبصورت کتاب

اور

قیمت میں انتہائی تخفیف

یعنی

قسم اول للعہ کے بجائے عہ ۸ر قسم دوم سے کے بجائے ۱۲ر

انتخاب

میر تقی میر علیہ الرحمۃ ۱۲ر

انتخاب

مرزا رفیع سودا مرحوم ۱۲ر

انتخاب

حسرت موہانی ۱۲ر

نفسیاتِ شباب

مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی لن

ایڈورڈ اشپرانگر پروفیسر برلن یونیورسٹی

کی بےمثل تصنیف کا براہ راست جرمن زبان سے اردو

ترجمہ۔ نوجوانوں کی نفسی سیرت، ان کی تخیلی

زندگی عشق تصور کائنات اور اخلاقی نشو و نما پر اپنی

نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے۔

قیمت سے ر

کیمیاگر

اور دوسرے افسانے قیمت عہ ر

پردۂ غفلت

تعلیم نسواں، آزادی نسواں اور

پردے پر ایک اچھا ڈراما۔

قیمت عہر

مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیر ادارت
مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

نمبر ۴	ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۳ء	جلد ۲۰

فہرست مضامین

صفحہ

(محمد مجیب مختار اے آکسن) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ دہلی سے شائع کیا

مُعاہدۂ عمرانی

فلسفہ | اگر روسو کی تمام تصانیف پر غور کی نگاہ ڈالی جائے تو ایک خیال کسی نہ کسی شکل میں روسو کی ہر تصنیف میں ملے گا یعنی فطرت اور تمدن (فطری اور متمدن انسان) کا تضاد۔ یہ وہ تضاد ہے جس کا روسو کی زندگی کی تشکیل میں بڑا حصہ ہے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ کن حالات میں اسے اپنے خاندان پیشہ، وطن اور مذہب سب سے ایک ایک کر کے قطع تعلق کرنا پڑا، کوئی تعجب نہیں کہ اسی وجہ سے اس کے اس خیال کو تقویت ہوئی ہو کہ وہ اس زندگی کی مدح سرائی کرے جس میں انسان کا تعلق اپنے سوا کسی سے نہ ہو۔ فطری انسان اچھا ہے، آزاد ہے؛ متمدن برا ہے، غلام ہے، "خدا اپنے ہاتھ سے تمام چیزیں اچھی بناتا ہے مگر وہ انسان کے ہاتھ میں آتی ہیں اور خراب ہو جاتی ہیں" روسو اپنی تصنیف "ایمیل" ان الفاظ سے شروع کرتا ہے۔ "معاہدۂ عمرانی" کے ابتدائی الفاظ بھی اسی کا اظہار کرتے ہیں: "انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جدھر دیکھو وہ پا بزنجیر ہے۔"

روسو کا فلسفہ شروع میں متمدن انسان سے نہیں فطری انسان سے بحث کرتا ہے۔ اور قانون فطرت اسی صورت میں ترتیب دیا جا سکتا ہے جب پہلے انسان فطرت سے تعارف ہو۔ انسان کے دل کے اندر ارادہ اور جذبات میں کشمکش جاری ہے وہ ارادہ کرتا بھی ہے اور نہیں بھی کرتا وہ اپنے آپ کو آزاد بھی محسوس کرتا ہے اور پابند بھی۔ نیکی کو پہچانتا بھی ہے اور بھلائی کرنے کی خواہش بھی رکھتا ہے، مگر اس سے اکثر بدی سرزد ہوتی ہے! غرض کبھی ارادے اور کبھی جذبے کی موج اسے اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔ ارادے کو روسو کے فلسفے میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ ارادہ ہی تمام اعمال کی بنیاد ہے۔ اور خود انسان ارادے کے سوا کچھ نہیں۔ مگر ارادے کے علاوہ انسان ضمیر کا بھی مالک ہے جو اسے اپنے ہی اعمال کی نہیں دوسروں کے اعمال

کی بھی برائی بھلائی سمجھتا ہے۔ جذبات کا بڑی حد تک جسم پر قابو ہوتا ہے اور ان کا اثر انسانی ناتو پر بھی پڑتا ہے۔ مگر عمل کے اچھے یا بُرے ہونے کے متعلق صرف ضمیر ہی گواہی دے سکتا ہے۔ ضمیر انسان کے دل کی آواز ہے اور وہی انسانوں کا سچا رہنما۔ اب اگر انسان کا ارادہ اور عمل ضمیر کی آواز کے مطابق ہے تو وہ آزاد ہے یعنی وہ فطری انسان ہے۔ بیرونی آزادی کی کوئی حقیقت نہیں اگر انسان اپنے دل سے اپنے آپ کو آزاد محسوس نہ کرے وہ شخص جو حقیقی طور پر آزاد ہے صرف اسی چیز کا ارادہ رکھتا ہے جس کے حاصل کرنے پر اسے قدرت ہے۔ روسو کے خیال میں آزادی غیر ذمہ دارانہ بے لگامی کا نام نہیں۔ آزادی کی لازمی شرط ہے پابندی۔ مگر وہ پابندی جو خود اپنی خوشی سے ہو۔ آزاد صرف وہ انسان ہے جو اپنے ضمیر کی وجہ سے نیک ارادہ ہے۔ فطری انسان طبعًا اچھا ہے، البتہ ہم لوگ بُرے ہیں۔ فطری انسان کی خواہشات کم بھی ہوتی ہیں اور اچھی بھی۔ مگر متمدن زندگی میں ان کی بھرمار ہونا شروع ہوتی ہے اور یہ زیادہ تر دوسروں کی دیکھا دیکھی: جو کچھ زید کے پاس ہے وہ بکر کے پاس کیوں نہ ہو؟ فطری زندگی میں تو انسان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح اپنی بقا کا سامان کرلے۔ مگر یہی جان کی حفاظت کا جذبہ تمدن کی حالت میں انانیت کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان برائی میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے اور غلام بھی بن جاتا ہے۔ اس کا ارادہ اور عمل دونوں دوسروں کے پابند ہو جاتے ہیں۔ اپنی ذات سے محبت اور اپنی فکر (amour de soi) بری چیز نہیں، مگر جب دوسروں کو نقصان پہنچا کر اپنا فائدہ کرنے کا جذبہ (amour propre) انسانوں کے دلوں میں جگہ کرلے تو سماج کی تباہی ناگزیر ہے۔

روسو کا دعویٰ ہے کہ اگر انسانوں کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کرنا ہے تو فرد کی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہیئے سماج کو سمجھنے کے لئے انسانوں کا پرکھنا ضروری ہے۔

چنانچہ روسو اپنے تمام دعووں کی بنیاد فطری انسان پر رکھتا ہے۔ اور تمام سیاسی اور معاشرتی مسائل اسی کے ذریعہ حل کرتا ہے۔ مگر جب وہ فطری زندگی کے راگ گاتا ہے تو اس

کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ لوگوں کو اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ وہ جنگلوں میں جاکر بسیں اور ڈھنڈوں کی سی زندگی گذاریں، وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ انسان اپنی حقیقت کو پہچانے اور اپنی اصلیت کو دوبارہ معلوم کرے۔ روسو کو اس سے بحث نہیں کہ انسان یا سوسائٹی کی موجودہ حالت کیا ہے۔ وہ تو فطری انسان کو پیش نظر رکھ کر سوسائٹی کے متعلق رائے قائم کرتا ہے۔ اور اگر سچ پوچھا جائے تو اس کا فطری انسان دراصل خود اُس کی ذات ہے۔ وہ اپنی "اندرونی آواز" اپنے ضمیر کو اپنا رہنما بناتا ہے اور نیک و بد کی تمیز اسی کے ذریعہ کرتا ہے۔ وہ تمام دنیا کو اپنے پیمانے سے ناپتا ہے اور غالباً اسی میں اس کی انتہا پسندی کا راز مضمر ہے۔ وہ اپنے پیشرو مونٹیکو کی طرح دنیا و مافیہا کا مشاہدہ کرنے کے بعد اپنے نظریے قائم نہیں کرتا۔ وہ نظریے قائم کرکے یہ بتاتا ہے کہ دنیا کو کیا ہونا چاہیئے! اس کے ذہن میں ریاست کا ایک خاص تخیل ہے اور وہ تمام سیاسی مظاہر کو اسی کسوٹی پر کس کر دیکھتا ہے۔ موجودہ طریقہائے حکومت کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے کیلئے ضروری ہے کہ بہترین طریقے کا علم ہو۔ چنانچہ "معاہدۂ عمرانی" میں تمام سیاسی اداروں اور ملکی قوانین سے قطع نظر کرکے روسو نفس قانون سے بحث کرتا ہے وہ یہ سوال کرتا ہے کہ وہ کون سے قوانین ہیں جو خود انسانوں کے بنائے ہوئے ہوں اور ان پر فرائض عاید کرسکیں اور اس کے جواب میں وہ پہلے ایک ایسی سوسائٹی اور ریاست کا تخیل پیش کرتا ہے جس کی بنیاد قانونِ فطرت پر ہو۔ ایسی ریاست میں آزادی اور مساوات کا دور دورہ ہے اور نظام سیاسی کسی قانون کا پابند نہیں۔

مگر عجیب بات ہے کہ انسان جو آزاد پیدا ہوا ہے۔ ہر طرف پا بزنجیر نظر آتا ہے۔ آخر اس صورت حال کو قانونی شکل کیونکر دی جاسکتی ہے؟ روسو کے خیال میں یہ صورت قانوناً اور اخلاقاً اسی وقت جائز ٹھیر سکتی ہے جب انسان کی آزادی برقرار رہے۔ کہ یہ انسانی حکومت کے لئے سب سے پہلی اخلاقی شرط ہے۔ خود روسو کے الفاظ میں۔ "مسئلہ یہ ہے کہ اجتماع کی کوئی ایسی شکل تلاش کی جائے جس میں قوت اجتماعی کے ذریعہ ہر شریک کی جان و مال کی حفاظت ہوسکے اور جس کی بناء پر گو ہر شخص "کل" میں شریک ہو تاہم وہ صرف اپنی تابعداری کرے اور اس کی وہی آزادی قایم رہے جو اسے پہلے حاصل تھی"

اس مسئلہ کا حل روسو کے خیال میں "معاہدۂ عمرانی" پیش کرتا ہے۔

یہ خیال کہ ریاست کی بنیاد معاہدہ پر ہے نہ صرف اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اسے لاک کے علاوہ اور بہت سے مشہور حکمانے پیش کیا ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ جدید ریاست کی تخلیق اور تشکیل میں اس نظریہ کا بڑا حصہ ہے۔

اس نظریہ کی پوری تاریخ کا یہاں پر نہ موقع ہے اور نہ گنجائش۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ خیال عہد قدیم میں بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود تھا۔ بروتاغورس اور اس کے بعد افلاطون دونوں کے ہاں اس کی طرف اشارات ملتے ہیں۔ اسی طرح زمانۂ وسطیٰ میں قیصر اور پاپائے روما کی کشمکش میں "معاہدہ" اور قانونِ فطرت کے نظریوں سے دونوں فریقوں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی مگر اس زمانہ میں معاہدہ بجائے ریاست کے حکومت کی بنیاد قرار دیا جاتا تھا اور یہ نہ صرف اس وجہ سے کہ زمانۂ وسطیٰ کے فلسفے پر ارسطو کی تعلیمات کا گہرا اثر تھا بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ریاست کی ابتدا کلیسا کے نزدیک انسانی ارادے یا کم از کم محض انسانی ارادے کی بنا پر ممکن نہ ہوسکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زمانہ وسطیٰ میں ریاست کی ابتدا یا غرض و غایت کی بجائے حکومت اور حاکم غور و فکر کے موضوع بنے اور ان کی تشریح کے لئے "معاہدہ عمرانی" کی بجائے "معاہدۂ محکومیت" تجویز کیا گیا اس لئے کہ معاہدۂ عمرانی کے قبول کرنے کے تو معنی یہ تھے کہ فرد کو تمامتر نظام حکومت کا مبداو منبع قرار دیا جاتا اور اس زمانہ میں اس خیال کے بدعت بلکہ الحاد ہونے میں کسے شبہ ہوسکتا تھا؛

مگر جب سولھویں صدی میں عیسائیت کی تاریخ میں وہ انقلاب رونما ہوا جسے ریفرمیشن کے نام سے پکارا جاتا ہے تو معاہدۂ عمرانی کے نظریے کو بھی فلسفہ سیاست میں اہمیت حاصل ہوناشروع

لہ ریم (Rehm) کی Geschichte der Staatsrechts-wissenschaft) میں نہایت خوبی کے ساتھ اس نظریہ کی تدریجی نشو و نما اور مکمل تاریخ درج ہے۔

ہوئی۔ انگلستان میں رچرڈ ہوکر[1] نے معاہدۂ عمرانی کو ریاست کی بنیاد قرار دیا۔ اسی طرح جرمنی میں التھوسیئس[2] اور ہالینڈ میں گروسیئس[3] اس خیال کے پیشرو ہیں۔ مگر انگریزی حکما، ہابس[4] اور لاک[5] کے عہد سے اس نظریہ کو فلسفہ میں خاص اہمیت حاصل ہوئی۔

روسو نے بھی ان تمام حکما کی طرح ریاست اور قانونی نظام کو معاہدۂ عمرانی کی مدد سے جائز ٹھیرایا ہے۔ اس کے ذہن میں معاہدۂ عمرانی کا جو تخیل ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: "ہم میں سے ہر ایک مشترک طور پر اپنی ذات اور اپنی قوتوں (صلاحیتوں) کو ارادہ اجتماعی کے حوالے کرتا ہے اور اس کے عوض ہم میں سے ہر فرد "کل" کا جزو لاینفک بن جاتا ہے"

روسو کو سمجھنے کے لئے ایک بات اچھی طرح ذہن نشین ہونا چاہئیے وہ یہ ہے کہ روسو ہابس کے علاوہ دوسرے فلسفیوں کی طرح جو معاہدے کو ریاست کی بنیاد قرار دیتے ہیں اس معاہدے کو تاریخی حیثیت نہیں دیتا۔ روسو کے ہاں تو اس معاہدے کی حیثیت محض ایک خیال کی ہے جس کے ذریعے قانون اور قانونی نظام کی تشریح ممکن ہو سکتی ہے اور ان کے جواز کی صورت پیدا کی جا سکتی ہے۔

مگر روسو کی تعلیمات کی جان "معاہدۂ عمرانی" نہیں بلکہ "ارادہ اجتماعی" ہے ارادۂ اجتماعی گویا اجتماعی ضمیر کا دوسرا نام ہے۔ اور جماعت اسی وقت آزاد ہے جب تک وہ صرف اپنے ضمیر کی آواز کے سامنے سر تسلیم خم کرتی ہے۔ روسو اجتماعی ارادہ اور مختلف افراد کے ارادوں کے مجموعے میں فرق کرتا ہے، اس لئے کہ ارادوں کا مجموعہ تو گویا انفرادی رایوں اور

---

(1) Richard Hooker, Laws of Ecclesiastical Polity (1594)

(2) Johannes Althusius, Politica (1603)

(3) Hugo Grotius, The Law of War and Peace (1625)

(4) Thomas Hobbes, De Cive (1642) and Leviathan (1651)

(5) John Locke, Two Treatises on Civil Government (1690)

مفادوں کا مجموعہ ہوگا اور اجتماعی مفاد کو انفرادی مفاد کا ہم معنی کبھی نہیں قرار دیا جا سکتا برخلاف اس کے ارادۂ اجتماعی کے پیش نظر مخصوص افراد کی بھلائی نہیں بلکہ فلاح اجتماعی ہوتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ارادۂ اجتماعی کو عملی جامہ پہنانے کی کیا صورت ہے؟ اس کی صورت روسو کے خیال میں صرف یہ ہے کہ حاکم و محکوم ایک ہوں یعنی حکومت عوام قائم ہو۔ اور جب سب برابر اپنے اوپر فرائض عاید کریں اور ہر فرد جماعت سے صرف اس چیز کا مطالبہ کرے جسے وہ خود دینے کو تیار ہو۔ تو یہ ظاہر ہے کہ ہر فرد اپنے عمل میں اجتماعی فلاح و بہبود کو مدنظر رکھے گا۔ اور اسی اصول میں مساوات، قانونی مساوات کا راز بھی پنہاں ہے۔ معاہدۂ عمرانی تمام شہریوں کے فرائض اور حقوق یکساں مقرر کرتا ہے۔

ارادۂ اجتماعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ پوری جماعت کا ارادہ ہو۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ تمام افراد کے ارادے کسی بات پر بالکل متفق ہوں۔ اس لئے کہ ارادے کو اجتماعی حیثیت رایوں کی تعداد کی بنا پر حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ اس مفاد کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے جو تمام افراد کو متحد کرتا ہے اور ارادے میں "اجتماعیت" پیدا کرتا ہے۔ اور یہی مفاد اجتماعی کا تخیل ہے جس کی مدد سے روسو قانون وضع کرنے کو جماعت کا حق قرار دیتا ہے۔

قانون کسے کہتے ہیں؟ روسو کے خیال میں قانون کسی خاص موضوع پر جو اجتماعی مفاد سے متعلق ہو ارادہ اجتماعی کے باقاعدہ اور علانیہ اظہار کا نام ہے گویا قانون ارادۂ اجتماعی کا محتاج ہے۔ اور جس قانون کو ارادۂ اجتماعی سے جواز حاصل نہ ہو وہ قانون کہلانے کا مستحق نہیں یہ حق صرف جماعت کو حاصل ہے کہ وہ قوانین وضع کرے، اس لئے کہ صرف اسی کو اپنی ضروریات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ پھر قانون کے لئے لازمی شرط یہ ہے کہ وہ کسی خاص شخص یا چیز سے متعلق نہ ہو۔ بلکہ اس کا اطلاق عام ہو۔

صرف ایک قانون ایسا ہے جس کے لئے کامل اتفاق آرا ضروری ہے، اور وہ معاہدۂ عمرانی ہے باقی تمام قوانین کثرت رائے سے وضع کئے جا سکتے ہیں۔ اسی بات سے روسو

پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ اکثریت کی مطلق العنان حکومت کا قائل ہے۔ مگر درامل یہ صحیح نہیں ورنہ روسو کے تمام نظریئے خاک میں ملجائیں۔ اکثریت کا ارادہ تو ہمیشہ صحیح اور اچھا ارادہ نہیں ہوا کرتا۔ ارادہ اجتماعی جیساکہ ہم پہلے بتا چکے ہیں ارادوں کے اتحاد و اتفاق کا نام نہیں۔ اس سے وہ ارادہ مراد ہے جس کے پیش نظر فلاحِ اجتماعی ہو۔ پس رائے دہی کا مقصد یہ معلوم کرنا نہیں کہ کسی مخصوص مسئلہ پر جماعت کی کیا رائے ہے۔ رائے دہی کی غرض اس سوال کا جواب حاصل کرنا ہے کہ کوئی خاص چیز فلاحِ اجتماعی میں ممد ہے کہ نہیں؟ رائے دہی کے موقع پر ہر فرد اس مخصوص مسئلے پر اس ارادہ کا اظہار کرتا ہے جو اس کے خیال میں ارادۂ اجتماعی ہے اور مجموعی حیثیت سے رائے دہی پر نظر ڈالنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ارادۂ اجتماعی کیا ہے۔ فرض کیجئے میں نے رائے دہی کے موقع پر اپنے ارادے کا اظہار کیا۔ مگر رائے دہی کے نتیجہ سے یہ معلوم ہوا کہ ارادۂ اجتماعی کچھ اور ہر تو اس کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ میں غلطی پر تھا۔ اور میں نے جسے ارادۂ اجتماعی خیال کیا تھا وہ دراصل ارادہ اجتماعی نہ تھا۔ پس جب روسو اکثریت کے فیصلہ پر گفتگو کرتا ہے تو اس کے ذہن میں ہمیشہ ایسی اکثریت کا فیصلہ ہوتا ہے جس کے پیش نظر مخصوص افراد یا جماعتوں کی فلاح و بہبود نہیں بلکہ فلاحِ اجتماعی ہو۔ اور ایسی صورت میں اکثریت کا فیصلہ صحیح بھی ہو سکتا ہے اور اچھا بھی اور اگر یہ نہ ہو تو پھر ریاست میں آزادی کا خاتمہ ہے اور آزادی کے خاتمہ کے ساتھ خود ریاست کا خاتمہ!

روسو سیاسی فرقوں اور جماعتوں کو ریاست کیلئے بڑے خطرے کا باعث سمجھتا ہے۔ اور اس کی وجہ وہ یہ بتاتا ہے کہ گو ہر سیاسی فرقے کا ایک اجتماعی ارادہ ہوتا ہے مگر پوری جماعت کے مقابلے میں اس "اجتماعی ارادہ" کی حیثیت محض انفرادی ارادے کی ہوتی ہے۔ سیاسی فرقوں کی وجہ سے سچا اجتماعی ارادہ مشکل سے پہچانا جاتا ہے۔ ان کا مفاد نہ تو انفرادی مفاد ہوتا ہے اور نہ پوری جماعت کا۔ وہ ایک بیچ کی چیز ہوتی ہے۔ اور جس ریاست میں صرف دو سیاسی فرقے ہوں وہاں پر تو ہمیشہ اس فرقے کے ارادے کو اجتماعی ارادہ تصور کیا جائے گا جسے اکثریت حاصل ہو۔ پس اگر سیاسی فرقوں کا وجود ناگزیر ہی ہو تو یہ بہتر ہے دو کی بجائے ایسے بہت سے فرقے ہوں۔

ہر ریاست میں روسو کے خیال کے مطابق اقتدار اعلیٰ کا ہونا ضروری ہے ۔ یہ اقتدار اعلیٰ غیر محدود ہے ۔ اس کے لئے سب کچھ جائز ہے' ہابس اور بلیکسٹن یہاں تک روسو کے ہم خیال ہیں۔ مگر روسو اور ان دونوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ ہابس کے خیال میں اقتدار اعلیٰ کا مالک بادشاہ بلیکسٹن کے خیال میں پارلیمنٹ اور روسو کے نزدیک خود جماعت ہے ۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ روسو فرد کو جماعت پر قربان کر دیتا ہے۔ یا وہ یہ کہتا ہے کہ جماعت کے مقابلہ میں فرد کو کوئی حقوق حاصل نہیں۔ وہ وضاحت سے بیان کرتا ہے کہ فرد اور جماعت دونوں کے ایک دوسرے پر حقوق بھی ہیں اور فرائض بھی۔ جماعت فرد پر صرف اس صورت میں فرائض عاید کر سکتی ہے جب وہ خود ارادۂ اجتماعی کی پابند ہو۔

روسو نے دستور اساسی کے جو اصول مقرر کئے ہیں ان میں اقتدار اعلیٰ اور حکومت (قوت عاملہ) کا فرق خاص حیثیت رکھتا ہے۔ اقتدار اعلیٰ کی مالک پوری جماعت ہے۔ برخلاف اس کے حاکم یا سلطان یا عامل وہ فرد یا افراد کا مجموعہ ہے جسے پوری جماعت کی طرف سے یہ خدمت تفویض ہوئی ہو کہ وہ ارادۂ اجتماعی کو جس کا اظہار قانون کی شکل میں ہوتا ہے' عمل کا جامہ پہنائے۔ روسو سے پہلے مختلف فلسفیوں نے حکومت کی تشریح "معاہدۂ محکومیت" کے ذریعے کی تھی جو حاکم اور محکوم میں طے پایا ہو۔ اور اس معاہدے کی بنا پر محکوم کے مختلف حقوق مقرر کئے تھے مگر روسو معاہدے کو حکومت کی نہیں ریاست اور سوسائٹی کی بنیاد تصور کرتا ہے۔ یہ معاہدہ محکومیت کا معاہدہ نہیں۔ اقتدار اعلیٰ جماعت کو معاہدۂ عمرانی کی بنا پر حاصل ہے ۔ برخلاف اس کے حاکم پوری جماعت (یعنی صاحب اقتدار اعلیٰ) کا نامزد کیا ہوا ہے ۔ اقتدار اعلیٰ جس کا استعمال قانون وضع کرنے کی صورت میں ہوتا ہے ناقابل تقسیم ہے اور اس لئے قانون وضع کرنے میں حکومت کو کوئی دخل نہ ہونا چاہیئے جس لمحے حکومت قانون وضع کرنے کے حق کو غصب کرے اسی وقت معاہدہ عمرانی ٹوٹ جاتا ہے اور معاہدۂ عمرانی کے ٹوٹتے ہی ریاست کے وجود کی اخلاقی یا قانونی علت باقی نہیں رہتی۔ حکومت کا کام صرف یہ ہے کہ وہ یہ دیکھے

کہ جو قوانین جماعت نے وضع کئے ہیں ان پر عمل ہوتا ہے نیز عام اصولوں کو خاص صورتوں اور واقعات پر منطبق کرے۔

اب تک جو کچھ کہا گیا اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ جمہوری حکومت کو روسو دوسری قسم کی حکومتوں پر ترجیح دیتا ہے۔ مگر وہ ریاست کی ظاہری شکل و صورت پر بہت زور نہیں چاہتا اور نہ حکومت کا کوئی ایسا تخیل پیش کرنا چاہتا ہے جسے ہر جگہ اور ہر زمانے کے لئے بہترین کہا جا سکے۔ پھر روسو کا جمہوری حکومت کا تخیل بہت وسیع ہے۔ اس کے خیال میں ہر وہ حکومت جو قانوناً جائز ہو جمہوری حکومت ہے جمہوریت لازمی طور پر اشرافیہ یا حکومتِ عوام کا نام نہیں۔ جمہوری اصول کا ہر اس ریاست میں وجود ہے جہاں ارادۂ اجتماعی یعنی قانون کے ذریعے حکومت ہوتی ہے اور اس صورت میں شاہیہ بھی بعض اوقات جمہوریت کی مرادف ہو سکتی ہے۔

روسو ایسا دستور تو پیش کرنے کے لئے تیار نہیں جو ہر جگہ اور ہر زمانے کے لئے موزوں ہو مگر اس کی رائے میں عام طور پر بہترین دستور کی صورت وہی ہے جب کہ قانون کا وضع کرنا اور اس پر عمل کرانا علیحدہ علیحدہ جماعتوں کے فرائض نہ ہوں۔ اور قانون کا وضع کرنا چونکہ پوری جماعت کا حق ہے اس لئے حکومت بھی پوری جماعت کو تفویض ہونا چاہئیے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پوری جماعت کی بلا واسطہ حکومت قائم ہو۔ مگر روسو کو اچھی طرح معلوم ہے کہ بلا واسطہ حکومت عوام کے تخیل کو عملی جامہ پہنانا کم از کم اس زمانے میں ناممکنات سے ہے۔ بلا واسطہ حکومتِ عوام کی لازمی شرط یہ ہے کہ ریاست بہت چھوٹی ہو۔ جہاں تمام شہری ایک جگہ جمع ہو سکیں۔ مگر اس زمانے میں صورت کچھ اور ہے۔ اس لئے جہاں تک حکومت کا تعلق ہے۔ روسو اس بات پر مجبور ہے کہ بلا واسطہ حکومت عوام کے تخیل کو قربان کرے اور حکومت کا حق جماعت کی منتخب کی ہوئی "اشرافیہ" کے سپرد کرے۔ اور یہ اشرافیہ افلاطون والی اشرافیہ ہو یعنی فلسفیوں اور حکما کی جماعت مگر جب قانون وضع کرنے کا سوال آتا ہے تو روسو جماعت کے نمایندوں کو اس کا آخری اختیار نہیں دیتا۔ برخلاف اس انگریزی نظریے کے جس پر مونٹیسکیو نے اپنی "روحِ قوانین" میں بہت زور دیا ہے اور جس کے مطابق قوم کے نمایندے جب ایک مرتبہ منتخب ہو گئے

تو پھر وہ سوائے اپنی ضمیر کے اور کسی کے سامنے جواب دہ نہیں، روسو نمائندوں کو اس بات پر مجبور کرنا چاہتا ہے کہ وہ مجالس وضع قوانین میں اپنے منتخب کرنے والوں کے خیالات کی لازمی طور پر ترجمانی کریں اور اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو انتخاب کرنے والوں کو اس کی معقول طریقہ سے روک تھام کرنے کا حق ہونا چاہئے۔ وہ قانون جو ارادۂ اجتماعی کے خلاف ہو چاہے اسے قوم کے نمائندوں نے ہی وضع کیا ہو، باطل ہے۔

ایک دلچسپ سوال یہ ہے کہ روسو اشتراکیت کا قائل ہے کہ انفرادیت کا؟ جو مصنف اسے اشتراکیت کا حامی خیال کرتے ہیں وہ اس کی تصنیف "انسانی عدم مساوات کے اسباب" کے ان الفاظ کو بہت اہمیت دیتے ہیں جو اس نے "موجودہ سوسائٹی کے بانی" کے متعلق کہے ہیں۔ وہ شخص جس نے پہلے پہل زمین کے ایک قطعہ پر قبضہ کر کے یہ کہا کہ یہ میری ملک ہے اور جس کے اس دعویٰ کو دوسرے احمقوں نے بے چون و چرا تسلیم بھی کر لیا وہ روسو کے خیال میں ہماری موجودہ سوسائٹی کا اصل بانی ہے۔ "کتنے جرائم، جنگوں، قتل و غارتگری، مصائب اور آلام سے بنی نوع انسان کو نجات ملتی اگر کوئی شخص حد بندی کے پتھر اکھاڑ پھینکتا یا کھائیوں میں مٹی بھر دیتا اور اپنی قوم کو مخاطب کر کے یوں چلا اٹھتا: اس دھوکہ باز کی بات ہرگز نہ مانو، تمہارا بس خاتمہ ہے اگر تم یہ بھول گئے کہ زمین کی پیداوار کے مالک تم سب ہو اور زمین کسی کی ملک نہیں" بلاشبہ اس عبارت کے آخری حصے سے اشتراکیت کی بو آتی ہے۔ لیکن روسو کی پوری تعلیمات کو اگر سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ نہ اشتراکی ہے اور نہ شخصی ملکیت کو قطعی طور پر ریاست کے حق میں قربان کرنے پر تیار۔ وہ تو ریاست کو صرف اس حد تک دست اندازی کی اجازت دیتا ہے جس حد تک فلاح اجتماعی اس کی طالب ہو، اور جس کی ضرورت کا خود جماعت کو احساس ہو۔ وہ اپنے مقالہ "معاشیات" میں یہاں تک کہتا ہے کہ "اس میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں کہ ملکیت تمام مدنی حقوق میں سب سے زیادہ ناقابل دست اندازی ہے اور یہ بعض اعتبارات آزادی سے بھی زیادہ اہم ہے" اور "ملکیت معاشرتی نظام کی صحیح معنوں میں بنیاد ہے اور فرائض شہریت کی بھی ضامن"

"انسانی عدم مساوات کے اسباب" اور "معاشیات" میں روسو متضاد باتیں کہتا ہوا نظر آتا

ہے، مگر دراصل ایسا نہیں۔ ملکیت کا حد سے تجاوز سیاسی نظام کو درہم برہم یا کم از کم خراب کرنے کے لئے کافی ہے۔ روسو اس خطرے سے اچھی طرح آگاہ ہے جس کا ایسی صورت میں رونما ہونا یقینی ہے جب ریاست میں ایک طرف تو چند افراد کی ایک جماعت دولت سے مالا مال ہو اور دوسری طرف ایک بڑی جماعت بھوکوں مر رہی ہو۔ ایسی صورت میں ریاست کی بنیاد غیر مستحکم ہوگی اور کسی اجتماعی احساس کا وجود نہ ہوگا۔ جس قدر ان جماعتوں میں دولت و افلاس کا فرق بڑھتا جائے گا اسی قدر قوانین بے کار ہوتے جائیں گے اور اس لئے "یہ حکومت کے اہم ترین فرائض میں سے ہے کہ مال و دولت کی حد سے زیادہ کمی زیادتی کو دور کرے"۔

ہم اختصار کے ساتھ روسو کے فلسفۂ سیاست پر نظر ڈال چکے۔ اس فلسفہ کی اہمیت کا اندازہ کچھ اس سے ہو سکتا ہے کہ جدید فلسفہ کا سب سے بڑا امام (کانٹ) اپنے تمام سیاسی اور عمرانی نظریوں کے لئے، خود اپنے قول کے مطابق، روسو کا رہین منت ہے۔ اور روسو کے فلسفہ کا دنیا کے "عمل" پر جو اثر ہوا اس کی گواہی بلا استثنا فرانسیسی انقلاب کی ہر تاریخ دیتی ہے۔

تصوّر باری کا ارتقا

۲

شرکت اور وحدانیت — اب اس امر پر غور کرنا ہے کہ کثرتیت (بت پرستی یا شرک) سے وحدانیت (توحید) کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ اس میں بھی وہی اصول عمل کرتے ہیں۔ مذہبی شعور کے اولین درجے میں جس نوعیت کی وجدانی تشبیہہ کام کرتی ہے حقیقت میں وہ شخصی وجودوں کا تصور نہیں پیدا کرتی۔ شخصی وجود میں بوقت واحد متخالف و متبائن صفات ہوتی ہیں۔ حیات شخصی گویا ایک سر رشتہ ہے جس میں نہ صرف متخالف و متبائن صفات ہم سلک ہوتی ہیں بلکہ اوقات و لمحات میں بھی ربط و تعلق پیدا ہو جاتا ہے جن میں یہ صفات وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ اس نوعیت کی صفات کا قائم کرنا کسی قدر روحانی ترقی پر منحصر ہے، جس کی مثال زیادہ تر طفلانہ مدارج میں نہیں ملتی۔ کیونکہ بچوں اور وحشیوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی شے کے صرف ایک ہی پہلو یا صفت کی شناخت کر سکتے ہیں ہوقت اور مخصوص اصنام کے مرتبہ سے بلند ہو کر جزئی تجربات کی مدد سے ایک کل کی تعمیر کرنا خاصی صلاحیت کا کام ہے۔ اس لئے کہ شخصی وجود ایک ہی حیثیت یا ایک ہی صفت میں تحویل نہیں ہو سکتا۔ دوسرے الفاظ میں ایسے تصورات قائم کرنے کی قابلیت پیدا ہونی چاہیئے جن سے کسی فرد کی خصوصیات متمیز ہو سکیں۔ ایک منفرد وجود کے مثالی (typical) تصور سے مراد ایک ایسا تصور ہے جو اس وجود پر مختلف شیون و حالات میں یکساں طور پر صادق آ سکے۔ اور ایسے تصورات قائم کرنا بڑے کمال کی بات ہے، کیونکہ منفرد شخصیتوں کی ماہیت عموماً نہ صرف پیچیدہ ہوتی ہے بلکہ ان میں وسعت بھی پیدا ہوتی رہتی ہے لہذا یہ تصورات لازمی طور پر نامکمل ہوتے ہیں۔ شخصی وجودوں کی نسبت ہمارے تصورات اکثر صورتوں میں مصنوعی اور مبہم ہوتے ہیں، جن کی تصدیق تمام تر مشاہدے سے نہیں ہو سکتی۔ اور کسی شخصی وجود کی ذاتی خصوصیات کی نسبت ہمارا علم اعتقاد پر مبنی ہوتا ہے نہ کہ معلومات پر۔

اصنام کی صفات میں گہرائی کا آغاز | جس طرح کسی فرد کا جزئی مشاہدہ اور جزئیات کے تصور سے نکل کر مثالی تصورات کے عالم میں داخل ہونا نفسیاتی اعتبار سے عالم تصورات کی ایک اہم ترین ترقی ہے اسی طرح موقت اور مخصوص اصنام کا ایسے اصنام میں تبدیل ہو جانا جو بجا طور پر شخصی کہلانے کے قابل ہوں تاریخ مذہب میں ایک اہم ترین عروج ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب مذہب حیاتیت سے کثرتیت میں منتقل ہو گیا ہے۔ اس نوبت پر مقدس وجودوں اور مظاہر فطرت میں، جن کے وہ لازم تھے، نمایاں امتیاز قائم کیا جاتا ہے۔ اور خود ان معبودوں کو زیادہ قیمتی اور گہری صفات سے متصف کیا جاتا ہے۔ اس منزل میں مذہب و ایمان کی قابلیت پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ایک شخص اور اس کے انکشاف میں اضافت مکانی قائم ہو گئی ہے، جو ان ادنیٰ مدارج میں نمودار نہیں ہو سکتی جن پر ہم غور کر چکے ہیں۔ اصنام اور مظاہر فطرت جو اب تک بلا امتیاز پر ایک دوسرے کے وابستہ تھے، اب متمایز ہو جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آخر الذکر میں معروضی مشاہدہ اور تحقیق کی زیادہ قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس انتقال سے مذہبی عقاید کا مرتبہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ یہ اصنام اب زیادہ گہری اور قیمتی صفات سے متصف ہونے لگے ہیں اور بعض مظاہر فطرت براہ راست انہی کے مظاہر سمجھے جاتے ہیں۔ انسان اب پہلی مرتبہ غیر مرئی عالم میں قدم رکھتا ہے۔ یوسنر نے اس امر پر بے حد زور دیا ہے کہ ایک خاص منزل ارتقاء (مثلاً بت پرستی) میں اصنام اسم خاص حاصل کرتے ہیں۔ اس سے پہلے مخصوص اصنام کی طرف انہی صفات سے اشارہ کیا جاتا ہے جو ان سے منسوب ہوتی ہیں اسم خاص اسی وقت قابل فہم ہوتا ہے جب کہ متعدد شیون و صفات ایک واحد تصور میں جمع ہو جائیں تاریخ کی رو سے یہ بھی ٹھیک طور پر نہیں بتایا جا سکتا کہ کثرتیت کا آغاز کب سے ہوا۔ کیونکہ ہم معلوم کر چکے ہیں کہ مخصوص اور موقت معبودوں میں بھی تشبیہی میلان اور پوشیدہ قوت موجود تھی، اور اسی وجہ

---

۱ (پچھلا صفحہ) Höffding: Psychology. V. B. 9; vi. c. vii. 6. E. B

۲ Höffding: The Philosophy of Relegion. iii p. 142

سے تا آخر الذکر اصنام کی واضح مثالیں پیش کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

عبادت قدامت پرست ہے مورخین مذہب عبادت کے قدامت پسند اور تحدیدی اثر کو شد و مد کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے حیاتِ احساسی کا پتہ چلتا ہے کیونکہ احساس کو عبادت میں پناہ ملتی ہے۔ اگر کسی خاص خطے یا قوم کی عبادت ایک خاص معبود میں مرتکز ہو جائے تو یہ دیوتا کسی ایسے معبود کے قبول و اختیار میں سدراہ ثابت ہوتا ہے جو زیادہ قوی اور دقیق صفات سے متصف ہو تصورات پر عبادت کے اثر کی درخشاں مثال خود لفظ الٰہ ہے جس کے معنی لسانیات کے اعتبار سے ہیں وہ جس کی عبادت کی جاتی ہے، تصور الٰہی اور طریق عبادت میں تعلق ہونے کی وجہ سے اگر آخر الذکر میں کوئی بنیادی تغیر واقع ہو تو لازمی طور پر اول الذکر میں بھی ترمیم ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ منظم عبادت اکثر تغیر و تبدل کو گوارا نہیں کرتی۔ اسی لئے قدیم تصورات جب قدیم رسم و رواج سے وابستہ ہو جاتے ہیں تو زیادہ عرصہ تک قائم رہتے ہیں اور قدیم رسم و رواج اپنے ہم عصر تصورات کے بعد بھی باقی رہتے ہیں (مثلاً دوران حج میں صفا و مروہ کے درمیان دوڑنا اور منیٰ میں سنگ باری کرنا) اس صورت میں صرف عادت رہ جاتی ہے اور احساس قدیم عادت سے آسانی کے ساتھ دست بردار نہیں ہوتا۔ اس دور میں قدیم و جدید احساسات کے مابین زبردست کش مکش جاری رہتی ہے یعنی قدیم احساس کا میلان یہ ہوتا ہے کہ سارے شعور پر چھا جائے اور اس پر اپنا رنگ چڑھا دے اور جدید احساس چاہتا ہے کہ خود شعور میں سما جائے اور سب کو متاثر کرے۔ اس طرح دونوں میں ایک کش مکش جاری رہتی ہے اس لئے کہ جو احساسات روایات کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں وہ توسیع کا میلان رکھتے ہیں، اور اگر وہ جدید احساس پر قابو نہ پا سکیں تو کم سے کم کوشش کرتے ہیں کہ ان کو اپنے رنگ میں رنگ کر تبدیل ہیئت کرلیں اگر ناگزیر صورتوں میں قدیم تصورات برقرار نہیں رہ سکتے تو جدید تصورات کے مقابلہ میں خود ہی اپنی ہیئت بدل دیتے ہیں۔

عمل انتخاب وترکیب وتکمیل لیکن عالم تصورات پر احساس کا تحدیدی اور امتناعی اثر آئینہ کا صرف ایک رخ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جدید تجربات اپنے اندر ایسا سریع النفوذ اثر رکھتے ہوں کہ انتخابات

تکمیل کی بدولت قدیم تصورات میں خود بخود ترمیم ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب اصنام شعور کے حق میں یکساں قیمتی نہیں رہتے۔ جن مخصوص اصنام میں زیادہ مستقل اور قوی احساسات پیدا کرنے کی سب سے زیادہ قابلیت ہوتی ہے ان کو دوسروں پر تفوق حاصل ہوتا ہے ان کی طرف خاص طور پر توجہ کی جاتی اور ان کو خاص حیثیت دی جاتی ہے دوسرے اصنام کے ساتھ ان کا مقابلہ ترک کر دیا جاتا ہے اور ذہن کسی ایسی بات پر زور نہیں دیتا جس سے مقابلے کا خیال تک پیدا ہو۔ اب ایک غیر شعوری عمل تکمیل جاری ہو جاتا ہے۔ اس انتخاب و استکمال کے ساتھ قدرتی طور پر عمل ترکیب بھی جاری رہتا ہے۔ کیونکہ اور جتنے آثار اور قابل قدر صفات دیوتاؤں کی اعلیٰ صفات سے کچھ بھی مناسبت یا تعلق رکھتے ہیں ان سب کو اس تکمیل یافتہ دیوتا میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ اب اس کو ایک خاص قدر و قیمت کا حامل سمجھا جاتا اور اس کے بعد جو بھی نئی صفت تجربے میں آئے اس کو اس سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ ہر عظیم الشان دیوتا کے تخیل میں انتخاب، تکمیل و ترکیب سے کام لیا جاتا ہے۔

اخلاقی مذہب، مذہب فطرت کی تکمیل یافتہ صورت ہے۔ جو اصنام مستحسن اور مشترک صفات (مثلاً تحفظ خاندان و قبیلہ و قوم) کے محافظ سمجھے جاتے ہیں ان کو خصوصیت کے ساتھ تباین اعمال کا موجب سمجھا جاتا ہے جب انسان دوسروں کی صحبت کے اثر سے یا خود اپنے ہی اندر خیر و شر میں تضاد و تباین محسوس کرتا ہے اور یہ تضاد و تباین اس کے شعور میں نمایاں جگہ لے لیتا ہے تو وہ ان کے کمال سے اپنے دیوتا کو متصف کر دیتا ہے۔ یہ تکمیل پذیر تشبیہہ اخلاقی نقطۂ نظر سے نہایت اہم ہے۔ کیونکہ نوع انسان کو اسی کی بدولت وہ نورانی اور مقدس مثالیں ہاتھ آئی ہیں۔ جن کو اس نے مشعل راہ بنایا ہے۔ اس طرح مذہب فطریت سے اخلاقی مذہب حاصل ہوتا ہے۔ تاریخ مذاہب میں اس انتقال کو عظیم ترین اہمیت حاصل ہے لیکن یہ انتقال بھی سابقہ انتقالات کی طرح قوانین بالا کے مطابق وقوع میں آتا ہے۔ اگر قوت رعد و برق کا تجربہ نہ ہوتا تو بجلی کے دیوتا کا کون قائل ہوتا؟ اسی طرح اگر یہ نہ معلوم ہوتا کہ حقایق زندگی میں خیر بھی ایک حقیقت ہے تو کوئی متنفس بھی معبودوں کی نیکی اور اچھائی پر ایمان نہ لاتا۔ اصنام کو اخلاقی اقدار حیات کا حامل سمجھنے سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ انسان ان اقدار کا معترف ہو چکا ہے۔

عملِ مقابلہ ان اجتماعی، انتخابی، تکمیلی اور ترکیبی اثرات کے علاوہ، جن کو احساس، ترقی تصورات میں استعمال کرتا ہے، ابھی عالمِ احساس کے اندر مقابلے کے اثرات کی اہمیت پر غور کرنا باقی ہے۔ دو عالموں کے مقابلے کا ردعمل ان تصورات پر ہوتا ہے جو ہر حالت کے ظہور یا تحریک کا باعث ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک غایت مقرر کر لی گئی ہے تو خیالی کمال، اور مفکر کی محدود انسانیت کے تقابل کی بدولت یہ غایت ایک بلند تر سطح پر پہنچ جائے گی۔ اس کے برعکس غور و فکر سے غایت میں جتنی وضاحت بڑھتی جاتی ہے مفکر کی محدودیت بھی اسی قدر نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ دور مقابلہ خدا کے تصور کے ارتقا میں بےحد اہمیت رکھتا ہے۔

تناسخ جو دائرہ تصورات کلیۃً اصنام سے متعلق ہے اس کے باہر تناسخِ ارواح کا عقیدہ احساسات کے انتخابی اور انتقالی اثر کی ایک اچھی مثال ہے۔ اس خیال کا کہ روح موت کے بعد، دوسرے جسم میں منتقل ہو جاتی ہے، غالباً کوئی ماخذ نہیں ہے۔ یہ خیال تو معمولی حیاتیت سے متعلق ہے جو ترقی کے ایک خاص زینے پر دنیا کی تمام اقوام میں پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ شخصی بقا کو ابتدا ہی میں مشکل ہی سے مذہبی اہمیت حاصل رہی ہوگی۔ یہ عقیدہ نہ صرف مشرقی ایشیا کی اقوام میں بلکہ افریقہ، آسٹریلیا، اور گینی کے باشندوں، نیز اہلِ گرین لینڈ اور شمالی امریکہ کے قبائل میں بھی پایا جاتا ہے۔ البتہ ویدی عہد میں ہندوستان کے مذہب نے تناسخ کے مسئلہ میں اہم حصہ لیا تھا۔ اپنشد میں اس کو بہت اہمیت دی گئی ہے لیکن ہندوستان کے ابتدائی مذاہب میں اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اور حامیان تھیاسوفی (Theosophy) اس کو قوانینِ فطرت اور اصولِ ارتقا کی بنیاد پر قائم کرنے کی بے سود کوشش کر رہے ہیں۔

کثرتیت ایک نفسیاتی معمہ ہے اب ہم پھر کثرتیت کی طرف لوٹتے ہیں، اس کی ترقی نفسیاتی اور تاریخی واقعات کی ایک گتھی ہے جس کو سلجھانا سخت دشوار ہے۔ تاہم اس امر کو تسلیم کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ عالمِ مذاہب کے اندر وہی نفسیاتی اور منطقی قوانین عمل کرتے ہیں، جو حیاتِ ذہنی کے دوسرے عوالم میں کارگر ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کثرتیت ہمارے سامنے ایک نفسیاتی معمہ

پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ انسان کئی متضاد مقدس ہستیوں کی اطاعت کر سکے بلکہ بعض اوقات ایک صنم دوسرے کا ضد ہوتا ہے۔ گویا ایک صنم کا خیال دل میں جمانا دوسرے کا نقش مٹانے کے مرادف ہے۔ اس مشکل کا حل غالباً یہ ہے کہ انسان تجربہ اور احساس کے وقت اپنے پیش نظر تصور میں اس قدر مستغرق رہتا ہے کہ اسے مقابلے کا موقع تک نہیں ملتا۔ شاید اسے دوسرے اصنام کے تصور کی فرصت بھی نہیں ہوتی۔ جو تصورات قوی اور گہرے احساس کے لمحوں میں ہم پر عمل کرتے ہیں ان کا موازنہ اور مقابلہ بعد کے فکر و غوض سے ممکن ہے، اور تناقضات کا علم بھی اسی وقت ہوتا ہے۔ جب تک ان تناقضات کو دور نہ کیا جائے حیات نفسی کو اطمینان و سکون نصیب نہیں ہو سکتا۔ اور جب تک جدید تجربات ان تمام مسائل و مشکلات کو نظر انداز کرنے پر مجبور نہ کر دیں جو غور و فکر کی بدولت ہم پر منکشف ہوئے تھے ہم اسی پس و پیش میں رہتے ہیں۔ مذہبی ارتقا کی تمام منزلوں میں یہی پیش آتا ہے۔ ہمیشہ ایک جبری میلان موجود ہوتا ہے کہ متضاد و متبائن تصورات میں جو معروضی احساس کے مختلف تجربات سے پیدا ہوں، یکسانی پیدا کی جائے۔ کثرتیت کی اس مشکل کو، جیسا کہ اس سے پہلے ذکر آ چکا ہے، اس طرح حل کیا جاتا ہے کہ تمام اصنام کو ایک ہی نسل کے ارکان قرار دیا جاتا ہے اور ان کی ایک علیحدہ دنیا فرض کی جاتی ہے وغیرہ۔ اس طرح یہ مشکل آسانی سے دور ہو جاتی ہے۔ اور انسانی تعلقات کی مثالوں سے ان کی کثرت کو ایک رشتہ میں مربوط کر دیا جاتا ہے اور پھر انسان اور اصنام کے درمیان بھی یہی تعلقات قائم کئے جاتے ہیں۔ مثلاً خدا کے لئے آدمیوں کا باپ اور بادشاہ وغیرہ کے الفاظ استعمال کرنا۔

<u>اقوام کے اختلاط اور ارتباط سے مذہب میں ترقی ہوتی ہے</u> | کسی قوم کی مذہبی ترقی محض اسی کے تجربات پر منحصر نہیں رہی ہے۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ وہ تمام تصورات جو دوسری اقوام کے اختلاط سے یا ان کے ماتحت آ جانے سے پیدا ہوتے ہیں باہم مخلوط ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ اقوام کے اختلاط سے ہر مذہب ترقی کرے۔ درحقیقت اس سے ادنیٰ مذہب میں ترقی ہوتی ہے اور اعلیٰ مذہب میں کچھ نہ کچھ تنزل ہو جاتا ہے۔ مثلاً اسلام میں جا بجا گرد و پیش سے ایسی چیزیں داخل ہو گئی ہیں جو شعار اسلام سے بالکل بعید ہیں۔ آغاز اسلام ہی میں عبداللہ بن سبا یہودی اور اس کے ہم خیال جو اسلام قبول کرنے کے

باوجود سابقہ معتقدات پر قائم تھے حضرت علی کی محبت کے اظہار میں اتنا غلو کرنے لگے کہ حضرت علی کو خدا کے عہدے پر پہنچا دیا۔ ابن سبا کا دعویٰ تھا کہ حضرت علی میں خدا حلول کر گیا ہے[1] بعض جاہل صوفیہ یا متصوفین خدا کے ایک مقدس اور بزرگترین بندے کو، جس کو خدا نے آخری مرتبہ رسالت کے لئے منتخب کیا تھا، "احمد بے میم" اور "عرب بے عین"[2] سے تعبیر کرنے لگے۔ اور اسی ضلالت اور گمراہی کا نام تصوف رکھا۔ عیسائیوں کی اختلاط کی بدولت تیسری صدی سے اسلام میں رومن کیتھولک نظام داخل ہو گیا اور پیری مریدی کے سلسلے خوب پھیلے۔ اس نظام کا اساسی عقیدہ یہ ہے کہ خدارسی یا خداشناسی بالواسطہ ہی ممکن ہے۔ جو اسلام کے سراسر منافی ہے لیکن اکابرین صوفیہ نے اس سے فراہٹ کر اپنے لئے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ ان بزرگان طریقت نے یہ مسلک اس لئے اختیار کیا کہ سلوک میں ایک باخبر رہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور سالک اس راستے کے خطرات سے بچنے کے لئے اپنے واسطے ایک تجربہ کار رہبر تلاش کر لیتا ہے لیکن یہ اپنی متلاشیان حق کے لئے ہے جو خدا طلبی میں سرگرم و سرگرداں رہتے ہیں حافظ نے اس کو اس طرح ادا کیا ہے۔

بمے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید　　　که سالک بیخبر نبود زراہ و رسم منزلہا

بہر حال متاخرین میں پادریوں کے نظام کی تقلید یعنی آج کل کی نام نہاد پیری مریدی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ الا ماشا ءاللہ۔ ایرانی قوم خیال پرور، حسرت زدہ، اور غمناک سرشت رکھتی ہے اور درد کی چاشنی گویا اس کی فطرت میں داخل ہے اسی لئے اس نے نوحہ و ماتم کو مذہب کا ایک عنصر بنا دیا۔ ہندوستان ہی کو لیجئے۔ یہاں کے عام مسلمانوں کی مذموم بدعتیں شخصیت پرستی[3]، قبر پرستی[4]، صدر پرستی[5] اور

---

[1] اس خیال کے حامیوں کو حلولیہ کہتے ہیں [2] یہ دونوں فقرے ایرانی تراش خراش کے ہیں لیکن عام طور پر مشہور ہے کہ یہ دونوں احادیث ہیں۔ [3] اسلام نے بزرگوں کی تعظیم و احترام کی تلقین کی ہے۔

[4] ابن تیمیہ نے قبر پرستی کو بت پرستی کا پیش خیمہ قرار دیا ہے۔

[5] شیخ صدر الدین امروہوی۔

نیچے وہ موم معیار اسلام پر ہرگز پوری نہیں اتر سکتیں غرض جب اقوام آپس میں اتحاد پیدا کرتی ہیں تو ان کے بے شمار اصنام بھی آپس میں مخلوط ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ ایک مورخ نے اس دعوے میں یہاں تک غلو کیا ہے کہ جب تک مختلف مذاہب آپس میں متصادم نہ ہوں کہیں مذہبی ترقی نہیں ہوتی[1] اس اعتبار کر مذہبی غایات کی راہِ ترقی تنگ و تاریک اور پیچیدہ ہو جاتی ہے کیونکہ احتمالِ ترکیب و تشبیہ اور تاثراتِ مقابلہ و توسیع کی تعداد بے حد و بے شمار ہو جاتی ہے

وحدانیت تک انسان کی کس طرح رسائی ہوئی | عالم اصنام کا تخیل کثرتیت (شرک) اور وحدانیت (توحید) کی درمیانی کڑی ہے۔ کثرتیت کے وحدانیت میں منتقل ہونے کی دو صورتیں ہیں جو آخر کار ایک دوسرے میں ضم ہو جاتی ہیں۔

(۱) عالم اصنام میں ایک خاص صنم دوسرے اصنام پر تفوق و برتری حاصل کرتا اور اس کے بعد باقی تمام اصنام بلکہ غیر اقوام کے اصنام سے بھی فضیلت میں بڑھ جاتا ہے۔ اور بالآخر یہی خدا ایک واحد خدا مانا جاتا ہے۔ یہ عموماً خدا کے تخیل کے تنزیہ اور اس میں گہرائی پیدا کرنے کا نتیجہ ہے۔ یا اس کے برعکس خدا کے تصور کا تنزیہ اور گہرائی انسان کی رہنمائی وحدانیت کی طرف کرتی ہے

۲۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی صنم کے تصور میں خود بخود ترقی ہو جائے۔ اور یہ تصور خاص طور پر کسی مخصوص صنم کے تخیل میں گہرائی پیدا کرنے یا تقویت پہنچانے پر مبنی نہ ہو بلکہ اس کا اساس وہی الٰہی (مقدس) عنصر ہو جو تمام اصنام میں مشترک ہے۔ الٰہی عنصر سے مراد وہ عنصر ہے جس نے سب سے پہلے دیوتاؤں کو دیوتا بنایا اور جو مختلف اصنام میں مختلف حیثیتوں سے جلوہ نما رہا۔ پہلی نوعیت کی ترقی سب سے پہلے اسیریائی، بابلی، مصری اور اسرائیلی مذاہب میں ہوئی۔ اسرائیلی مرسلوں نے ارتقاء وحدانیت ایک مکمل اور تاریخی اعتبار سے نہایت اہم مثال دنیا کے سامنے پیش کی اور اسلام (مذاہب وحی کے) اسی سلسلہ کی آخری کڑی اور ان کی مختتم اور مکمل صورت ہے۔

---

[1] Tiele: Elements of the science of Relegion i p236

مذاہب عربی | اس وقت تک ہیں جتنے مذاہب وحی کا ثبوت ملا ہے وہ تمام تر سامی النسل پیغمبروں سے متعلق ہیں جن میں زیادہ اولو العزم پیغمبر ایک طرف بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے اور دوسری طرف حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں رسول عربی، جو مسلمانوں کے عقاید کی روسے خاتم النبیین ہیں۔ اسرائیلی وحدانیت کا ارتقاء ارتقائے یہوہ کے مرادف ہے جس نے ایک خاص اور قومی خدا کے مرتبہ سے ترقی کر کے ایک عالمگیر خدا کا مرتبہ حاصل کیا۔ اس کے باوجود بنی اسرائیل نے یہوہ کو اپنی قوم کے لئے مختص کر رکھا تھا اور غیر کو اس کی عبادت میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ عام طور پر پیغمبر کا مقصد صرف یہی نہیں ہوتا کہ قوم یا اس کے پیشواؤں کے دنیاوی سود و بہبود کے اسباب دریافت کرے۔ بلکہ اسے دنیا کے عارضی تعلقات و واقعات سے ماورا اپنی قوم کی اخروی اور ابدی خوشحالی کی فکر دامنگیر ہوتی ہے۔ مگر رسول عربی کی فقید المثال علو مرتبت کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ ان کی تبلیغ کسی خاص قوم، یا ملک یا کسی خاص زمانے کے لئے مختص نہیں بلکہ تمام افراد انسان سے متعلق ہے پیغمبر کی ذات میں ایک وجد آور جذبہ جاگزیں ہوتا ہے جو دنیا کے عظیم الشان واقعات و حوادث سے اس کے اندر موجزن ہوتا ہے۔ اور اس میں یہ قوت بھی ودیعت ہوتی ہے کہ اپنی قوم کے تصورات غائی کی اہمیت کو جتلائے اور خود بھی ان کی توثیق و تصدیق کرے۔

ہم ان دو مختلف نقطہ ہائے نظر میں امتیاز کر سکتے ہیں جو اسرائیلی وحدانیت کے اساس ہیں۔ ان میں سے ایک کو عالم کے حوادث عظیمہ سے بےحد متاثر ہوا ہے اور دوسرا اخلاقی مقاصد اور اس کے مسائل و مباحث سے۔ لیکن ان دونوں میں اس امر کی جد و جہد کی گئی ہے کہ ایک جدید ماحول میں بھی انہی روایاتی مذہبی تصورات کو برقرار رکھا جائے جو ان کو کبھی اعلیٰ مدارج پر پہنچانے میں کامیاب ثابت ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب قوم کی خود مختاری جاتی رہی تو یہوہ اس کے ساتھ تباہ ہونے سے بچ گیا۔ اب وہ خالص قومی خدا نہ رہا بلکہ سارے عالم کا خدا بن چکا تھا۔ اس لئے کہ سابقہ تصورات اب اس سے وابستہ نہیں تھے بلکہ وہ اعلیٰ اخلاقی تصورات کا حامی اور سرپرست تسلیم ہونے لگا تھا۔ اسی وجہ سے اس پر قوم کی بدقسمتی کا اثر نہیں پڑا۔ بلکہ اس کو اپنی قوم کے مقابلے میں اس قدر حیرت انگیز تفوق و برتری حاصل ہوئی کہ تاریخ میں ایسی مثالیں بہت کمیاب ہیں۔ بنی اسرائیل کے پیغمبروں نے ہمیشہ اس امر کی کوشش کی ہے کہ نوع

انسان کی توجہ مادیت و ظاہریت سے ہٹا کر باطنیت و اخلاق کی طرف مبذول کرائی جائے۔ یہاں تاریخی اور اخلاقی نقطہائے نظر ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ لیکن اسرائیلی انبیا کے زمانے میں جو کام ادھورا رہ گیا تھا اس کی تکمیل رسول عربی کے زمانے میں ہوئی۔ اسلام کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے پیش نظر سابقہ مذاہب کا نمونہ نہیں ہے بلکہ ایک اعلیٰ نصب العین کے مطابق مذہب کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا گیا ہے۔ جس کا ثبوت اس کی عالمگیر اخوت و مساوات میں، اور فطرت کے ساتھ اس کی مطابقت میں ملتا ہے۔ نیز اسلام کا اللہ اخلاقی تصورات کی ہمہ گیری اور ان کی باطنیت کو تمام قومی تحدیدات سے ماوراء لے جاتا ہے۔

غرض دنیا کو کامل وحدانیت تک پہنچنے میں بڑا عرصہ لگا۔ اس کی یہ نعمت عظمیٰ بے تگ و دو اور بے جد و جہد نصیب نہیں ہوئی لیکن دنیا اس عظیم الشان اور مقدس ترین ہستی کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتی جس کا آفتاب رسالت فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہو کر سارے عالم پر جلوہ افگن ہوا۔ اسلام نہ صرف سابقہ مذاہب وحی کی ترکیب کامل ہے بلکہ اس نے دنیا کے سامنے مکمل ترین وحدانیت اور نہایت جامع مذہب پیش کیا ہے۔ اور ایجابی مذاہب میں یہی ایک مذہب ایسا ہے جس نے زندگی کے اقدار سے کامل بحث کی ہے۔ رسول عربی کا ظہور ایسے زمانے میں ہوا جب کہ نوع انسان بے شمار ٹھوکریں کھا چکنے اور ارتقاء کی کٹھن منزلیں طے کر چکنے کے بعد اس قابل بن چکی تھی کہ خدا کے ساتھ دلی رابطۂ اتحاد اور غیر محدود تعلق قائم کر سکے۔ غرض عالم مذاہب میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جو نوع انسان کو توحید کی مکمل ترین تعلیم دیتا ہے۔ اور اسلام کا خدا ہی وہ خدا ہے جو انسانوں کے وحدت پرست قلوب کو کامل اطمینان و تشفی بخش سکتا ہے اس لئے کہ دنیا اب ترقی کے اس زینہ پر پہنچ گئی ہے۔ جہاں کثرتیت کا رنگ نہیں جم سکتا[1] گو اب بھی دنیا میں ادنیٰ سے ادنیٰ اور بت پرست مذاہب موجود ہیں لیکن

---

[1] مذاہب کی پارلیمنٹ کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے جو ۱۸۹۳ء میں شکاگو میں منعقد ہوئی تھی اس کا صدر کینن لکھتا ہے کہ تمام مذاہب کے مقابلے سے تصفیہ کن ثبوت مل چکا ہے کہ وحدانیت (توحید) ہی خدا کا بہترین تصور پیش کرتی ہے"

اس کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ وحدانیت کی آواز ان بت پرست اقوام کے کانوں تک نہیں پہنچی بلکہ ان میں توحید کو قبول کرنے کی قابلیت اور صلاحیت بھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔

مذاہب وحی کے مقابلہ میں ہندوؤں اور یونانیوں کی ترقی دوسری سمت میں ہوئی۔ ہندوؤں میں کوئی خدا عالمگیر نہیں۔ ان کی نظر و فکر اس قوت کی جانب مبذول ہوئی جن کی بنا پر اصنام کو الہٰی مرتبہ اور اعلیٰ حیثیت حاصل ہوئی تھی۔ برہما کو ابتداءً ساحری اور عبادت کی تخلیقی قوت مانا جاتا تھا لیکن بعد میں خود مبدء ہستی قرار دیا گیا۔ اگر سوال کیا جائے کہ برہما کا حقیقی مفہوم کیا ہے تو بجز اس کے اور کچھ نہ کہا جائے گا۔ کہ وہ اس روح سے مشابہ ہے جس کا احساس ہر شخص کو اپنی ذات کے اندر ہوتا ہے۔ وحدانیت کی طرف اس قوم کا رجحان سب سے پہلے اپنشد کے عہد میں اصول حسنی کی حیثیت سے ہوا لیکن یہ وحدانیت سے ابھی کوسوں دور ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بت پرستی میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ یونانیوں میں وحدت کے میلان کو صرف فلاسفہ نے ترقی دی۔ زینوفینیز ایک ایسے مبدء واحد تک جا پہنچا ہے جو کسی ذی حس تخیل کا معروض نہیں بن سکتا۔ لیکن اس نے کثرتیت پر اخلاقی حیثیت سے بھی تنقید کی تھی۔ افلاطون نے زیادہ تر اسی آخر الذکر نقطہ سے اپنی فکر کا آغاز کیا تھا۔

<u>اسلام</u> اب اسلام کی چند خصوصیات پر اس حیثیت سے غور کیا جائے گا کہ وہ مذاہب وحی کی سب سے آخری کڑی ہے، سب سے مکمل اور سب سے بڑا توحیدی مذہب ہے۔

اسلام نے نہ صرف ایک واحد اور عالمگیر خدا کا ممکن سے ممکن اور لطیف سے تصور پیش کیا ہے اور باطنی اور اخلاقی حیثیت سے مذہب کو معراج کمال پر پہنچا دیا ہے۔ بلکہ عالم مذاہب میں یہی ایک اکیلا ہی مذہب ہے جو تمام اقدار حیات کی کامل حفاظت کرتا ہے۔ اسی نے دینی اور دنیاوی زندگی میں سابقہ مذاہب کی انفرادیت کو مٹا کر مذہب کو اجتماعی اور معاشرتی اساس پر قائم کیا، جو عالم مذہب میں ایک نئی چیز ہے۔ اسی نے فطرت اور فوق الفطرت کے فرق کو مٹایا۔ اسی نے مذہب کو آسان، مطابق فطرت اور تمام شعبہ ہائے زندگی کے لئے ہمہ گیر بنایا۔ تاریخ مذاہب میں سب سے پہلی مرتبہ انسان اور انسانیت پہ بے انتہا زور دیا۔ علم اور ایمان، عقل اور ما فوق العقل کے امتیاز کو دور کیا۔ نیز ذہنی اور اخلاقی فضیلت

کی بجائے زندگی کے تمام شعبوں پر اس طرح چھا گیا کہ اب اسلام میں یہ تمیز نہیں ہو سکتی کہ مذہبی کیا ہے اور غیر مذہبی کیا ہے۔ بلکہ مذہب میں اتنی جامعیت پیدا کر دی گئی ہے کہ ہر وہ چیز جو مذہبی ہے فطرت، اخلاق اور عقل کے مطابق ہے۔ مذہب کا یہ زاویۂ نظر تاریخ مذاہب میں عدیم النظیر ہے۔ اس لئے اس کی عالمگیر اخوت و مساوات اور اس کی غیر معقول جامعیت پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک کہ اس کے باطنی پہلو، اس کے اعلیٰ معیار زندگی، اس کی وسعت نظر، اور اس کی لچک اور صورت پذیری کو پہلے ہی سے ذہن نشین نہ کر لیا جائے۔ اگر دوسرے مذاہب کے معیار یا کسی مثال کو پیش نظر رکھ کر اسلام کا موازنہ کیا جائے گا تو اس کی حسن و خوبی اور اس کی افضلیت و اکملیت کا ہرگز اندازہ نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ اسلام کے معیار پر ہر مذہب کو جانچا جا سکتا ہے لیکن کوئی مذہب اس کے معیار کا کام نہیں دے سکتا۔ اس لئے کہ اس کا معیار دوسروں سے بہت بلند ہے۔

توحید اسلام نے نہ صرف خدا کی وحدانیت کی تعلیم دی ہے بلکہ تقریباً ان مسائل سے بھی ثنویت منادی ہے جو عام طور پر ثنوی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اسی لئے مفکرین اسلام مذہب میں کسی ثنویت کو گوارا نہیں کرتے۔ چنانچہ مبدء و حقیقت کائنات کی وحدت بھی مذہب ہی کے حدود میں داخل ہے۔ لیکن مذاہب کی یہ ثنویت کوئی مفروضہ نہیں بلکہ نتیجہ ہے، سبب نہیں بلکہ مسبب ہے۔ وحدتی مذاہب کی ثنویت پر کئی حیثیتوں سے نظر ڈالی جا سکتی ہے اور اس کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ خیر و شر کے نقطۂ نظر سے انسان اپنے تجربے اور مشاہدے سے نیکی اور بدی کا وجود پاتا اور ان میں امتیاز کرنے لگتا ہے لیکن جب ان متضاد چیزوں میں مطابقت پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے تو اپنی نامعقولیت کی وجہ سے اس معمے کو یوں حل کرتا ہے کہ نیکی کا خدا الگ ہے اور بدی کا الگ۔ اس کی بیّن مثال ایرانی مذہب میں ملتی ہے جس میں نیکی کا خدا ارمزد اور بدی کا اہرمن[1] تھا۔ اسلام کی رو سے کائنات میں علی الاطلاق شر کا وجود نہیں ہے۔ بلکہ عالم انسان میں نیکی اور

---

[1] اور یہ بالآخر دونوں یزدان میں ضم ہو جاتے تھے۔

بدی کا اضافی مفہوم ہے۔ اور انسان کی فطرت ناقص ہونے کی وجہ سے اس کے افعال بھی ناقص ہوتے ہیں۔ اور اسی نقصان کو بدی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نیکی اور بدی دونوں خدا ہی کی طرف سے ہیں مگر ارادے کے بعد اعمال انسانی میں اختیار کو دخل ہونے سے شر کا ذمہ دار خود انسان ہے۔

۲۔ فلسفہ اور مذہب نے انسان کے تخیل میں ذہن اور مادہ، جسم اور روح، روح اور فطرت میں تفریق پیدا کرکے ایک ناقابل حل مشکل پیدا کر دی ہے۔ جسم عارضی اور فانی ہے، روح ایک ناقابل فنا حقیقت ہے اور جسم سے جدا ہو کر بھی کسی نہ کسی صورت میں اور ایک نہ ایک حیثیت سے باقی رہیگی گویا دونوں کی حقیقت جدا ہے۔ بعضوں نے اس کی تقسیم روح، حیات اور جسم میں کرکے تثلیث پیدا کر دی ہے۔ اسلام نے نہ صرف فطرت اور مافوق الفطرت کی تفریق مٹا کر اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی ہے بلکہ دونوں کو خدا کی مخلوق اور اسی کی صفت قرار دیکر ان میں وحدت پیدا کر دی ہے۔ دوسرا عنصر یہ ہے کہ جس طرح جسم کے لئے روح مددگار ہے اُسی طرح روح پر آثار خارجی مترتب ہونے کے لئے جسم مددگار ہے۔ اور جسم اصل میں روح کا ایک خارجی اثر صورت اور مظہر ہے یا صوفیائے اسلام کے خیال کے بموجب خدا کے علم کے مطابق اس کی صفات منفعلہ پر جب صفات فاعلیہ عمل کرتے ہیں تو اس سے جسم یا آثار خارجی ظہور میں آتے ہیں۔ قرآن کی ظاہری تعلیم کی رو سے علمائے مذہب حیات ما بعد الموت کو جسمانی قرار دیتے ہیں۔ خواہ یہ مثالی صورت ہی کیوں نہ ہو۔ بعض مفکرین اسلام نے مادہ کو روح کی پیداوار قرار دیا ہے[1]۔ جس سے یہ ثنویت مٹ جاتی ہے۔ ان کی اس توجیہ کہ ساری حقیقت حیات ذہنی کی ارتقا ہے یہ مراد ہے کہ تمام نفسیاتی زندگی کا انحصار جسم اور جسمانی حالات پر ہے۔ اس سے یہ مراد ہے کہ جسم یا مادہ سے جدا نفسیاتی زندگی نہیں قائم ہو سکتی کیونکہ فطرت میں حیات نفسی بذات خود کہیں قائم نہیں ہے، اور نہ کہیں جسم اور روح میں تفریق ہوئی ہے۔ یہ سب انسان کے ذہنی تصورات

---

[1] جلال الدین رومی۔

قالب از ما ہست شد نے ما ازو　　　　بادہ از ما مست شد نے ما ازو　(مثنوی)

اور اسی کے امتیازات ہیں جن کی معروضی حقیقت کچھ نہیں ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ آثار خارجی ق کی تفصیلات ہیں۔

۳۔ معاشرتی۔ اس کی نوعیت محض تاریخی ہے۔ یعنی یہ کہ مذہبی اور دنیاوی امور میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ مذہبی اور دنیاوی زندگی دو جداگانہ حقایق ہیں۔ لیکن اسلام نے دنیاوی اور مذہبی زندگی میں کوئی فرق باقی نہیں رکھا جو دنیاوی زندگی خدا کے خوف، جذبات کے بہترین استعمال اور فطرت و عقل و اخلاق کے مطابق ہو وہی روحانی زندگی بھی ہے اور وہی مذہبی بھی۔ اسلام کی رو سے زندگی کا کوئی شعبہ دائرۂ مذہب سے خارج نہیں بشرطیکہ وہ ان اعتبارات سے خارج نہ ہو۔ عام طور پر ہم جس کو دنیاوی زندگی کہتے ہیں وہ مذہبی نقطۂ نظر سے سلبی زندگی ہے نہ کہ ایجابی۔ اس کے علاوہ اسلام نے معاشری یا اجتماعی (اور اخلاقی) زندگی کے بہترین اصول سکھائے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ افراد انسانی کو اپنی فطری صلاحیتوں کے نشو و نما کا بہترین موقع عطا کیا ہے۔ اسلام کی اجتماعی قوت اور عالمگیر اخوت و مساوات کا یہی وہ راز ہے جس نے دنیا کو حیرت میں ڈال رکھا ہے[۱]۔ کالا ہو یا گورا، امیر ہو یا فقیر، مہذب ہو یا غیر مہذب، عالم ہو یا جاہل، بادشاہ ہو یا رعیت۔ مشرق کا رہنے والا ہو یا مغرب کا، شمال کا رہنے والا ہو یا جنوب کا سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اسلام کی یہ زنجیر اتنی قوی ہے کہ سارے نوع انسان کو ایک ہی سلسلے میں منسلک کر دیتی ہے

۴۔ علم اور ایمان کی ثنویت یعنی علم اور ایمان دو متضاد چیزیں ہیں۔ یہ بڑا معرکۃ الآرا مسئلہ ہے جس کو سند (وحی) سے قریبی تعلق ہے اور اس مسئلے پر اب تک برابر بحث جاری ہے لیکن اسلام میں یہ ایک طے شدہ مسئلہ ہے۔ یعنی مذہب میں کوئی جزء ایسا نہیں ہے جو دائرہ علم سے خارج سمجھا جائے

---

[۱]۔ یہ وہ درِ یتیم ہے جو اب تک مغرب کے غواصانِ فکر کے ہاتھ نہیں لگا ہے کاش یورپ مذہب اسلام اختیار کرے۔ یہی اس کی تمام داخلی اور خارجی مشکلات کا واحد اور ممکن حل ہے یہی وہ مسیحا نفس ہے جو اس کی تمام اخلاقی کمزوریوں اور مالی مشکلات کے امراض کو دور کر کے کامل شفا بخش سکتا ہے۔

بے سوچے سمجھے یا خلاف عقل کوئی چیز تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ ایمان وہی ہے جو صحیح علم کی بنیاد پر قائم ہو۔ حتیٰ کہ "یومنون بالغیب" بھی علم ہی پر منحصر ہے۔ اسی لئے اسلام کو مطابق عقل کہا جاتا ہے۔ اسلام نے کسی ایسے عقیدے کی تکلیف نہیں دی جو ناقابل فہم اور خلاف عقل ہو۔ علم اور ایمان میں کوئی فرق نہیں اور نہ ان میں تفریق ممکن ہے۔ کیونکہ انسان کی نفسیاتی ذات سے کسی عنصر کو اس طرح علیحدہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اور تمام عناصر سے بالکلیہ غیر متاثر رہے۔ ایمان خود ایک قسم کا قوی علم ہے، کیونکہ وہ اس معروض کی ماہیت پر منحصر ہے جس پر خود وہ قائم ہے۔ اور علم بھی ایک قسم کا ایمان ہے۔ کیونکہ اس کا دارومدار زیادہ تر کامل علم کی غیر متحقق غایت پر ہے، جو تمام ذہنی ارتقا کا داخلی اصول ہے۔ انسان کی حیات نفسی کے مختلف عناصر اور ان کی ترکیب کو ایک ایک کرکے گنانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کا وجود بھی فی نفسہٖ جدا جدا پایا جاتا ہے۔ قرآن ہر چیز میں عقل انسانی سے استشہاد کرتا ہے:۔

افلا تعقلون؟	کیا تم اس بات کو نہیں سمجھتے؟
افلا تذکرون؟	کیا تم اس سے یادداشت حاصل نہیں کرتے؟
فہل من مدکر؟	کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟
افلا تفکرون؟	کیا تم غور و فکر نہیں کرتے؟
افی اللہ شک فاطر السموٰت والارض؟	کیا تم کو خدا کے متعلق کسی قسم کا شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

۵۔ اس کے بعد ایک اور اساسی ثنویت مذہب میں پائی جاتی ہے جس کے ارتفاع کی کوشش میں نوع انسان نے اپنی پوری قوت صرف کردی ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔

الف۔ خدا کی ماورائیت۔ خدا کائنات اور خاص کر انسان سے الگ اور ماوراء ہے۔ وہ عالم پر فرمانروائی کرکے اپنے منشا اور مشیت کی تکمیل چاہتا ہے۔ انسان کی اخلاقی درستگی اور اس کی نجات اس کے ارادے میں ہے اور وہ اس کی تکمیل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اسلام میں داخلیت و ماورائیت دونوں ہم پلہ ہیں۔ اور قرآن سے اس کی جابجا شہادت ملتی ہے۔

اب، آیا خدا کی وحدت کے مفہوم میں یہ موضوع بھی داخل ہے کہ خدا کامل حقیقت کا مرادف ہے، یا وہ مبدء ہے جس پر ساری حقیقت کا مدار ہے۔ اکثر منکرین اسلام کا دعویٰ ہے کہ توحید اسلام مبدء اور حقیقت کی ثنویت کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ خدا کی وحدت کے مفہوم میں مسئلہ آخرالذکر بھی داخل ہے یعنی کائنات میں ایک ہی بالذات حقیقت موجود ہے۔ مسئلہ وحدت الوجود انہی آخری مسائل سے بحث کرتا ہے۔

وحدت الوجود | جب آخر میں وحدانیت اور وحدت الوجود کے تعلق پر ایک سرسری نظر ڈال لینی چاہئے جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ ابتدائی وحدانیت کا مفروضہ قوی بنیاد پر قائم نہیں ہے۔ اور نہ قرین قیاس ہے۔ البتہ اس کو الہیت مطلقہ کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ وحدانیت مذہب کی متاخر صورت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بلاشبہ مذہب کی روح اور اس کا تصور توحیدی مذہب ہی میں بدرجۂ اتم ظاہر ہوسکتے ہیں۔ کثرتیت مذہبی اغراض و مفاد کو منتشر کردیتی ہے۔ انسان کو اپنے بہبود کا یقین اور خدا پر بھروسہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ ایک اور صرف ایک ہی خدا پر ایمان ہو اور اس کا کوئی مقابل، کوئی حریف اور کوئی ضد نہ ہو۔ اور کامل قدرت اور جمیع صفات اسی ایک ذات میں داخل ہوں جب ہی انسان میں خوف و رجا مستحکم ہوسکتا ہے جو مذہب کا اساس ہے۔

وحدانیت شعورِ مذہبی کا کمال ہے۔ جب تک ایک خدا پر یقین نہ آئے مذہبی اور اخلاقی اقدار کی حفاظت وصیانت اور ان کی کافی ضمانت نہیں حاصل ہوسکتی۔ اگر کائنات کا ایک ہی خدا ہو تو کل اقدار حیات کی حفاظت کا بھی یقین ہوگا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ مذہب کا معراج کمال ہے۔ خدا کی وحدانیت کو تسلیم کرنے سے یوں تو مذہب کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ لیکن انسان کی فطرت وحدت پسند واقع ہوئی ہے وہ اپنی ہر فکر میں وحدت کا متلاشی اور عالم کی اس کثرت اور گوناگونی میں ایک وحدت حقیقی کا جویا ہے۔ وہ جب تک وحدت کو نہ پالے چین نہیں لیتا اس سے ظاہر ہے کہ تلاش وحدت ترقی یافتہ انسان کے غور و تامل کا نتیجہ ہے۔ اس عالم کی کثرت میں تلاش و جستجو کرتے کرتے وہ آخر اس منزل پر جا پہنچا ہے کہ اگر خدا ایک ہے تو حقیقت و مبدء کائنات بھی وہی ہے اور ایک

ہی ہے۔ کوئی ترقی یافتہ انسان ثنویت کو گوارا نہیں کرسکتا لہذا اس کے حق میں ناگزیر ہوجاتا ہے کہ مبدء کائنات اور خدا میں تطبیق دے کہ خدا ہی کو مبدء کائنات قرار دے تاکہ عالم میں کہیں ثنویت باقی نہ رہے یہی وحدانیت کی آخری اور انتہائی صورت۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہئے کہ وحدت الوجود کا مسئلہ ہمیشہ مذہبی نوعیت کا ہوتا ہے۔ وحدت الوجود کی کئی اقسام اور کئی مدارج ہیں۔ اس کے نقطۂ آغاز کی طرح اس کے تاریخ میں بھی اختلاف ہے۔

اگرچہ وحدت وجود کا مسئلہ دور ترقی کی حالیہ پیداوار ہے، لیکن ارتقاء کی ابتدائی منازل میں کم از کم اس کی علامات پائی جاتی ہے۔ ابتدائی انسان کے دھندلے شعور میں سب سے پہلا نقش اس کا بیٹھا ہوگا کہ اس سارے کارخانۂ عالم میں کوئی قوت ہے جو عمل کر رہی ہے۔ ہندوؤں کے 'رتا' اور کرما کے تخیل میں تمام اشیاء کے پس پردہ ایک ایسی قوت کا تصور پایا جاتا ہے جو اٹل قانون کی مدد سے کارفرما ہے۔ قدیم چینی 'تاؤ' (Tao) کے تصور میں کائنات کی ایک ابدی تنظیم کا خیال موجود ہے۔ یونانی 'موائیرا' اور ایرانی 'اشا' کا بھی یہی تصور ہے۔ لیکن جب عالمگیر مبدء کا عقیدہ کثرتیت کے رنگ میں ظاہر ہوا تو اس تصور کا موجب ہوتا ہے کہ تمام دیوتاؤں کے پس پردہ ایک مشترک قوت ہے۔ اور اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مختلف دیوتا ایک حقیقت واحد کی مختلف صورتیں ہیں۔ چنانچہ مصر کی سلطنت وسطیٰ میں غور و فکر نے مختلف خداؤں کو 'را' کے مظاہر قرار دیا ہے۔ وحدت الوجود کا یہ میلان زیادہ تر ترقی کے ان منازل میں تقویت حاصل کرتا ہے جب کہ ان کے دیوتا محدود و متعرف نہیں ہوتے اور ان کی صفات معین نہیں ہوتیں۔ ویدکے دیوتا بھی اسی نوعیت کے تھے۔ کیونکہ ایک کی صفات آسانی سے دوسرے کے حق میں منتقل ہوجاتی تھیں۔ اسی طرح عمل انتقال سے اپنشد اور ویدانت کی وحدت وجود (ادویت) قائم ہوئی جس میں تمام طبعی مظاہر ایک وجود حقیقی میں منتقل ہوجاتے ہیں۔ برہما اور آتما، روح اور وجود مطلق باہم ایک ہی اصل مذہبی وحدت وجود زیادہ تر تائلی ترقی کا نتیجہ ہے جو عقل کے تقاضے سے پیدا ہوتی ہے

<u>خلاصہ</u> فلسفۂ مذہب کی رو سے یہ بتانا مقصود تھا کہ تصور باری میں ارتقا کا عمل سلسلۂ زماں

میں ہی نہیں ہوا بلکہ خدا کے تصور کی اطمینان بخش توضیح میں بتدریج توسیع ہوتی آئی ہے۔ اور اس کی ترقی پذیر، لطیف تر اور معنی خیز صورتیں بتدریج نمایاں ہوتی گئی ہیں۔ نیز یہ کہ وحدانیت عالم مذاہب کی سب سے ترقی یافتہ اور سب سے آخری صورت ہے، جو مذہب کا معراج کمال ہے۔

مومن کا طنزیہ کلام

عام طور پر "طنزیات" کے ذیل میں تمام ظریفانہ تحریریں شامل کی جاتی ہیں اور کل ظریف انشا پردازوں کا شمار "طنزیین" کی صف میں کیا جاتا ہے۔ خود ٹھیکرے ظرافت اور طنز میں کوئی امتیاز نہیں قائم کرتا مگر میری ناقص رائے میں ان دونوں میں نہایت نازک فرق ہے۔ طنز زیادہ سے زیادہ ظرافت کی ایک شاخ قرار دی جا سکتی ہے۔ اس کا مقصد کبھی محض تفریح و انبساط ہوتا ہے اور کبھی اس سے بلند تر مقصد یعنی ظرافت کے پردے میں اصلاح و تربیت۔ عام ہنسنے ہنسانے والی تحریروں میں جس مقام سے کسی پر چوٹ شروع ہو، کوئی چبھتا ہوا، مزیدار یا اچھوتا فقرہ کسا جائے، خواہ پھولوں کی چھڑی سے ذرا "خبر" لی جائے یا دل کھول کر "مرمت" ہو وہیں سے طنز کا آغاز ہوتا ہے بعض لوگ اس کی ایک اور تعریف کرتے ہیں یعنی طنز ایک طرز انشا، ایک خاص انداز بیان کا نام ہے جس میں "دور کی کوڑی لائی جائے" لکھنے والے کو جو کہنا ہے اسے اس طرح کہتا ہے گویا مقصود اس کا بالعکس ہے لیکن طنز کو صرف ان نظروں میں دیکھنا اس کی وسعت کو محدود کرنا ہے۔ طنز کے لئے ندرت کا ہونا بھی لازمی ہے ندرت بیان اور ندرت معنی دونوں ورنہ بہ صورت دیگر وہ ایک سطحی، پست، اور رکیک چیز ہو کر رہ جائے گی اور اعلیٰ درجہ کے لٹریچر میں جگہ پانے کی مستحق نہ رہے گی۔

یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں بالخصوص انگریزی زبان میں طنز ایک نہایت وسیع اور خلص صنف ادب شمار کی جاتی ہے جس کی خود اپنی علیحدہ صنفیں ہیں اور ان کے ہاں طنزیہ لٹریچر بہ افراط موجود ہے۔ انگریزی کے سب سے پہلے شاعر چاسر سے لیکر بائرن اور آخر آخر میں ہمارے اپنے زمانے میں برنارڈ شا اور چیسٹرٹن تک کم و بیش ہر زمانے میں چوٹی کے طنز گو شعرا و نثر نگار موجود رہے ہیں۔ ان کے ہاں طنز سے بڑے بڑے اصلاحی کام لئے گئے ہیں۔ یہ موضوع بجائے خود ایک دوسرے مضمون کا محتاج ہے جس کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔ اردو زبان میں بھی طنز موجود ہے لیکن

یہ صرف چند خاص امور تک محدود ہے اور اس سے بہت ہی شاذ اصلاح و ہدایت کا کام لیا ہے۔ اور ایسے شعرا یا انشا پرداز تو بہت کم ہیں جنھوں نے اس صنف تحریر کی ترقی و تہذیب ہی کو اپنی ادبی زندگی کا مقصد قرار دے لیا ہو۔

اس سے مطلب نہیں کہ ہمارے ہاں ظریف انشا پردازوں یا شاعروں کی کمی ہے۔ نہیں ابتدائی زمانے ہی سے ہمیں ہجوگو شعرا اور مزاحیہ نگاروں سے سابقہ رہا ہے لیکن سچی اور پاکیزہ طنز ان کے ہاں برائے نام ہے یہ مضمون ایک شاعر کی نسبت ہے اس لئے بالفعل صرف شاعری ہی میں طنز کو تلاش کرنا ہے۔ اردو کی شاعری میں ہمیں کافی ظریف شاعروں کے نام ملتے ہیں جعفر کی "زٹلیات" سے قطع نظر کی جائے تو میر ضاحک، بقا، فدوی، مکین کے ناموں کے علاوہ سودا، انشا، مصحفی، غالب، مومن، اور آخر آخر میں حضرت داغ جن کا بے مثل شعر

دیکھنا پیر مغاں حضرت زاہد تو نہیں کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پس خم مجھ کو!

ہر خوش مذاق اور زندہ دل سخن سنج کے زبان پر ہے اور ان کی چلبلی شوخ اور چٹ پٹی طنز کی دلکش مثال ہے، ریاض خیرآبادی اور قبلہ میر اکبر حسین اکبر مرحوم کے اسمائے گرامی پیش پیش ہیں موخرالذکر بزرگ اس فہرست میں سب سے آخر لیکن خالص ظریفانہ حیثیت سے سب پر فائق ہیں موجودہ دور کے ایک اور ظریف شاعر حضرت ظریف کا نام بھی امتیازی حیثیت رکھتا ہے لیکن ان سب شعرا میں سے حضرت اکبر کو چھوڑ کر جنھوں نے طنزیات کا وہ وسیع مفہوم سمجھا جو سمجھنا چاہیئے اور جو اسے دوسری زبانوں میں حاصل ہے اور طنز کو زندگی، مذہب، سیاست، معاشرت، تہذیب، تمدن غرض حیات و ممات کے مختلف اور لاتعداد پہلوؤں پر ناقابل تقلید اور قابل رشک طریقے سے حاوی کر دیا اور حضرت ظریف سے قطع نظر کر کے جن کی شاعری کی خصوصیت علیحدہ ہے دیگر شعرا نے کبھی کبھی ہنسنے ہنسانے کے لئے اور صرف ایک خاص حد تک طنز سے کام لیا۔ ان سب شعرا کا میدان کارزار کم و بیش غزل ہے جس میں تلاش سے طنزیہ اشعار بھی مل جاتے ہیں زیادہ کیا تمامتر شیخ، عصر، واعظ، محتسب، یا ناصح پر چوٹیں ہوتی ہیں۔ مزے میں آ کر یہ حضرات ان بیچارے

غریبوں کو رسوا اور ذلیل کرنے کے ساتھ خود بھی تہذیب اور حسن ذوق کی حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں اور سنجیدگی کو بالائے طاق رکھ کر ناک پر انگلی رکھ کر مٹکنے لگتے ہیں۔ ہمیں ان کے اس طرز سے کوئی شکایت نہ ہونا چاہیے اور انھیں کے زمانے کے مذاق سے انھیں جانچنا چاہیے یہ ابتدائی اور غیر تربیت یافتہ دور قوموں کی تاریخ کی طرح ادب اور شاعری کی تاریخ میں پایا جانا بھی بالکل مطابق فطرت ہے ...... ان مختصر حدود کے اندر بھی سودا سے قطع نظر جنھوں نے اس چیز کو امتیاز بخشا اور جن کی طنز میں زہر ہلاہل بھرا ہے مومن کو ہمارے نزدیک "طنزیات" میں ایک خاص حیثیت حاصل ہے سودا کو بعض اور وجوہ سے بھی علیحدہ کرنا پڑتا ہے۔ اول تو وہ طنز کو غزل میں بہت کم جگہ دیتے ہیں یا وہ اسے ایک مستقل حیثیت دے کر نظم کی صورت میں پیش کرتے ہیں دوسرے ان کے موضوعوں کا دائرہ اس محدود دائرہ سے زیادہ وسیع ہے اور وہ اس فرض کو محض رسما اور تبرکاً جیسا کہ اور شعرا کا دستور ہے نہیں ادا کرتے بلکہ یہ چیز ان کا حصہ ہو گئی ہے اس حیثیت سے وہ بہت بلند درجہ پر ہیں اور مومن ان کی گرد کو نہیں پہنچتے۔ ساتھ ہی سودا اعتدال سے بھی گذر جاتے ہیں اور ایسے پیچھے جھاڑ کے لوگوں کے پیچھے پڑتے ہیں کہ ان سے دامن چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے ان کی طنز کے مار شاہی شیر بچے کے مارے سے کم نہیں؛ ان کی طنز کی زد سے لوگ اس طرح خائف رہتے ہیں جیسے شہباز کے پنجے سے کمزور پرند۔ برخلاف مومن کے کہ طنز ان کا پیشہ نہیں ہے اور ان کے ہاں ایسی بے اعتدالی نہیں پائی جاتی۔ وہ بہت احتیاط سے اور بچ بچ کر اپنے حریفوں پر وار کرتے ہیں ان وجوہ کی بنا پر سودا اور مومن کا کوئی مقابلہ نہیں۔ حضرت ریاض خیرآبادی کی "طنزیات" بھی خاصا لطف رکھتی ہیں۔ اور حقیقت میں موجودہ شعرا کیا شعرائے سابق میں بھی ان کے مخصوص اوصاف و انداز میں ان کا کوئی مقابل نہیں لیکن ان کے ہاں بھی شوخی و بے باکی و ہوسنا کی کبھی کبھی ہمیں آنکھ اور کان بند کر لینے پر مجبور کرتی ہے۔

مومن کے شاعرانہ کمال کی داد میں عام طور پر بخل سے کام لیا گیا ہے۔ اصل میں بہت کم لوگوں نے اس کے کلام کا مطالعہ کیا ہے اور جنھوں نے پڑھا بھی انھوں نے صرف اس کے تغزل

سے کام رکھا۔ حالانکہ مومن کے کلام کی خصوصیات مختلف ہیں اور کئی پہلوؤں سے اس کی شاعری پر تنقید ہو سکتی ہے یہ بے توجہی غالباً ضرورت سے زیادہ غالب پرستی کا نتیجہ ہے جس کی روز افزوں اور لازوال شہرت نے گو وہ کتنی ہی حق بجانب اور بجا کیوں نہ ہو اس دور کے دوسرے شعرا کے کارناموں کی عظمت کو گھٹا دیا ہے۔ مومن کی عدم شہرت کا راز اس کی کم مائگی نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے حالی یا ڈاکٹر بجنوری جیسا نقاد نہیں نصیب ہوا۔ غالب کے ایک بہت بڑے شاعر ہونے میں شک نہیں آج مجھ جیسے ادنیٰ طالب علم کا اس کے کمال کا اعتراف نہ کرنا میری اپنی کم نظری اور بدتوفیقی کی دلیل ہوگا۔ سب سے پہلے مجھے اس امر کا اظہار کرنا ہے کہ مجھ سے زیادہ خوش عقیدگی اس کے ساتھ کم لوگوں کو ہوگی۔ اس کے ادراک، الہام، بلند نظری اور اعلیٰ تخیل میں کسے شک ہو سکتا ہے لیکن اس کی عظمت کا اعتراف و احساس دوسرے شعرا کی طرف سے بے اعتنائی برتنے کی وجہ نہیں ہو سکتی۔ حقیقتاً اردو شاعری کا یہ دور بھی عجیب و غریب دور گذرا ہے جس میں غالب، مومن، ذوق، اور شیفتہ جیسے سخنورانِ باکمال نے دادِ سخن دی۔ ان میں سے ہر شاعر اپنے اپنے کمال میں لاثانی ہے اور ہر ایک سے واقف اور لطف اندوز ہونے کے لئے برسوں کی ریاضت درکار ہے مومن بھی ان زندۂ جاوید ہستیوں میں سے ایک ہے جس کی شاعری کے چند در چند خصوصیات میں سے ایک خصوصیت اس کی "طنزیات" بھی ہیں۔

حسب معمول مومن کی طنزیات بھی غزل میں ملتی ہیں اور ان کے بھی وہی محدود موضوع ہیں جن پر اور شعرائے طبع آزمائی کی ہے مثلاً ناصح پر چوٹ، واعظ پر بوچھار، رقیب کی ملامت و بدخواہی، محتسب سے چھیڑ چھاڑ لیکن انھوں نے یہ کام ایسے اہتمام سے کیا ہے اور ان کی طنز میں ایسا مزہ ہے اور ایسے ایسے نادر طریقوں اور امتیازی اندازِ بیان سے انھوں نے ان سب حضرات کی خبر لی ہے کہ معلوم ہوتا ہے انھیں اس کا خاص شوق تھا اور اس میں انھیں بڑا مزہ آتا تھا بالخصوص ناصح اور واعظ سے تو ان سے ایک منٹ کو نہیں بنتی وہ ان کی وجود کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ایسی بھی کیا بدظنی! وہ بیچارے تو ان کی ہمدردی اور دل سوزی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں اور یہ اس کے

برعکس ان کے نام سے بیزار ہو جائیں۔ مگر ہیں اس سے کیا۔ مومن کے خیر خواہوں یا بدخواہوں کو خود مومن سے زیادہ کون جان سکتا ہے؟ مانا کہ ان کی رفاقت بے لوث ہے مگر یہ عشق وہ بُری بلا ہے کہ عاشق کو خود معشوق سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

اک درد ہو بس آٹھ پہر دل میں کہ جسکو　　تسکین دعا سے ہو نہ تخفیف دوا سے!

ہمیں تو ان کے ناصح شفیق ہمیشہ منہ کی کھاتے نظر آئے۔ مومن کے مزاج میں بڑی مستقل مزاجی ہے۔ وہ انکو منہ نہ لگانے کے بجائے ان کی معصومیت سے لطف اٹھاتے ہیں۔ گھوم گھام کر وہ حضرت ناصح یا واعظ کی خدمت میں پہنچ جاتے ہیں۔ انھیں ایک طنزیہ تمسخر آمیز سلام کرتے ہیں اور ان کی صحبت سے لطف اندوز اور تازہ دم ہو کے آگے بڑھتے ہیں۔ دس پانچ منٹ حسن و عشق یا ادھر ادھر کی باتیں کیں اور حضرت ناصح سے ایک خاص پرلطف طرز سے مصافحہ کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حسن وعشق کا ذکر بھی خیر سے انھیں حضرات کو جلانے اور تڑپانے کے لئے کرتے ہیں۔ ناصح کا نام آیا اور ان کے چہرے پر شگفتگی دوڑ گئی۔ ...... ثبوت لیجئے! کم و بیش ہر غزل میں دو چار رجعہ عشقیہ اشعار کے بعد وہ ان حریفوں پر وار کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی عام خصوصیت یعنی انداز بیان کا انوکھا پن جو ان کی شاعری کی جان ہے یہاں بھی ہر قدم پر موجود ہے اور اس وصف نے ان کی طنزیات کو اور زیادہ دلکش، بامعنی اور پرلطف بنا دیا ہے۔ تعجب ہو کہ مومن کے کلام کی اس خصوصیت پر کسی کی نظر نہ گئی۔ حالانکہ اس کے ہاں یہ طنزیات دبی ہوئی، چھپی ہوئی رہنے کے بجائے اجاگر اور ابھری ہوئی معلوم ہوتی ہیں اپنے بیان اور معنی دونوں کی ندرت کی وجہ سے وہ پہلی نگاہ میں نظر آجاتی ہیں۔

اب میں ان طنزیہ اشعار کا ایک مختصر انتخاب علیحدہ علیحدہ عنوانات کے تحت میں پیش کرتا ہوں۔ مومن کے کلام میں بالعموم حسب ذیل موضوعات پر طنزیات ملتی ہیں۔

۱۔ مذہب و تقدس، اس موضوع پر ان کی طنزیات زیادہ تر مقطعوں میں ملتی ہیں جہاں وہ اپنے تخلص کی رعایت سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتے ہیں اور کوئی نہ کوئی بات ضرور پیدا کرتے ہیں

اس کے پردے میں کہیں واعظوں سے نوک جھوک اور کہیں بتوں سے چھیڑ چھاڑ ہوتی رہتی ہے۔

دشمن مومن ہی رہے بت سدا　　　مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا

مومن کا مقطع ان کی غزل کی جان ہوتا ہے یہ بات بہت کم شعرا کو نصیب ہوئی ہے۔ بہت سے شعرا تو محض غزل مکمل کرنے کے لئے مقطع کہتے ہیں۔ مومن کا مقطع اس قدر مشہور ہے کہ یہاں اس کی مثال پیش کرنا بے کار معلوم ہوتا ہے تاہم یہ چند مقطعے ملاحظہ ہوں۔

ذکر شراب و حور کلام خدا میں دیکھ　　　مومن میں کیا کہوں مجھے کیا یاد آ گیا

کعبہ سے جانب بت خانہ پھر آیا مومن　　　کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زنہار لگا

بت خانے سے نہ کعبے کو تکلیف دے مجھے　　　مومن بس اب معاف کہ یاں جی بہل گیا

اللہ ری گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر　　　مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

ہو گئے نام بتاں سنتے ہی مومن بیقرار　　　ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں

مومن تم اور ذکر بتاں اے پیر و مرشد خیر ہے　　　یہ ذکر اور منہ آپ کا صاحب خدا کا نام لو

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن　　　آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

خدا کی بے نیازی ہائے مومن　　　ہم ایماں لائے تھے ناز بتاں سے

۲. مومن کی طنزیات کا خاص میدان واعظ اور ناصح شفیق پر چوٹ کرنا اور ان کی فضیحت کرنا ہے۔ اسی میدان میں ان کی ظرافت اور زندہ دلی کے جوہر کھلتے ہیں۔ دیکھئے کس کس رنگ میں اور کن کن پہلوؤں سے ان حضرات کی خبر لی گئی ہے۔ اگر اس کے عنوانات قائم کئے جائیں تو تفصیل و تشریح نہ صرف طوالت کا بلکہ لطف کی کمی کا باعث بھی ہو جائے گی۔ قابلِ غور بات انداز بیان اور مضمون دونوں کا انوکھا پن ہے جس خصوصیت کی طرف مضمون کی ابتدائی سطور میں توجہ دلائی جا چکی ہے۔

ہاں تو کیوں کر نہ کرے ترکِ بتاں اے واعظ　　ایسی حوریں تری قسمت میں کہاں اے واعظ
منتظر ہے کسی بت کا جو نہیں تو کیوں ہے!　　مجلسِ وعظ میں ہر سو نگراں اے واعظ
سچ ہے کافر تری تقریر سے کیوں کر نہ جلیں　　شعلۂ آتشِ دوزخ ہے زباں اے واعظ
ڈر مری آہ سے ظالم، نہ جلا جی کر نہیں　　یہ جہنم سے تو کم شعلہ فشاں اے واعظ
اہلِ جنت سے کرو دل بری حور کا ذکر　　ایسی باتیں کوئی سنتا نہیں یاں اے واعظ
کیسی آرام پس مرگ مگر کافر تو!　　اہلِ اسلام کا ہے دشمنِ جاں اے واعظ

شرم کی بات نہیں ہے یہ، اثر ہو کیوں کر
نہ میں مومن ہوں تو پیرِ مغاں اے واعظ

نچوڑیں گے ہم اپنا دامن تر　　جہنم میں ہے اے واعظ اگر آگ

توبہ کن عشق سے فرمائے ہے واعظ　　یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہو

"فرمائے ہے" کے ٹکڑے نے کیا مزہ دیا۔ ایک تو شعر کے یوں ہی کیا کم لطیف معنی تھے اس پر یہ طرزِ بیان! اسی طرح کا ایک اور شعر ہے

اس وسعتِ کلام سے جی تنگ آگیا　　ناصح تو میری جان نہ لے دل گیا گیا

"وسعتِ کلام" کی وسعت ملاحظہ ہو اور پھر اس کی نشتر زنی ممکن نہیں کہ وار خالی جائے اور ایسی چوٹ کھا کر ناصح جاں بر ہو سکے۔ رعایت کے متلاشی "وسعت" کے ساتھ "جی تنگ آگیا" میں خوبی

کا ایک اور پہلو نکال سکتے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں "جان نہ لے" کا ٹکڑا کس قدر بلیغ ہے۔ ایک مطلب تو یہ ہوا کہ تو مجھے پریشان نہ کر، میرا سر نہ کھا۔ دوسرا اور لطیف تر پہلو یہ نکلا کہ دل تو محبوب کی نذر ہوا اب جان تو لیتا نظر آتا ہے۔ پورا شعر کس قدر دلکش، بلیغ اور پر لطف ہے۔

میں تو دیوانہ تھا اسکی عقل کو کیا ہوگیا　　قیس کہتا ہے مجھے ناصح کو سودا ہوگیا

ناصح کی دیوانگی کس طرح ثابت کی ہے۔ کیا خوب!

پوچھنا حالِ یار ہے منظور　　میں نے ناصح کا مدعا جانا

ناصح یہ گلہ کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا　　تو کب مری سنتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
ناصح کو جو چاہوں تو ابھی ٹھیک بنا دوں　　پر خوف خدا کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ٹانکنے چاکِ گریباں کو تو ہر بار لگا　　ہاتھ کٹواؤں جو ناصح رہے اب تار لگا

اس میں بھی خاص بات یہ ہے کہ مومن کو چاک کے ٹانکنے پر کوئی اعتراض نہ تھا مگر وہ ناصح کی اس سینہ زوری پر کہ وہ ہر بار ٹانکتا ہے برہم ہیں اب تو محض ضد کی وجہ سے وہ ایک تار بھی ثابت نہ چھوڑیں گے۔

کچھ اور مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

کوئی سنتا ہی نہیں بکتا ہے کیا دیوانہ وار　　میرے دل کے ساتھ ناصح کا بھی کیا جا لگی

کچھ نہیں نظر آتا آنکھ لگتے ہی ناصح　　گر نہیں یقین حضرت آپ بھی لگا دیکھیں

لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شبِ فراق　　ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

اثر ہوتا ہے کب ہم سے وفاداروں کو اے ناصح فغاں سے پیشتر تم خجلت تقریر تو کھینچو

ارے ناصحو آ ہی گیا وہ فتنۂ ایام لو ہمکو تو کہتے تھے بھلا اب تم تو دل کو تھام لو

عشق میں ناصح بھی ہے کیا مدعی جرم ثابت ہو گیا انکار سے

پند گو اب تو ہی فرما کس کو سودا ہے کون اور کی سنتا نہیں اپنی ہی بکتا جائے ہے

بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے

ہم حال کہے جائیں گے سنئے کہ نہ سنئے اتنا ہی تو یاں صحبت ناصح کا اثر ہے

منھ کو نہ سیا ناصح کی بخیہ گری اتنی لوں میں بھی ابھی لیتے ہر پردہ دری تنی
یہ کون کہے اس سے کی ترک وفا میں نے کر تو ہی ذرا ناصح پیغام بری اتنی

اچھے موقع پر ناصح کی یاد آئی اس کو پیغامبر بنا کر بھیج رہے ہیں۔

نہ کرنی تھی نصیحت اسکے بیٹھے پر قیامت کی عجب فتنہ ہے ناصح بھی کہ یہ فتنہ اٹھاتا ہے

ناصح "فتنہ" ہو یا نہ ہو شاعر کے فتین ہونے میں کوئی کلام نہیں جس نے ایسا موقع پیش کیا۔ اور لیجئے
اب کے تو ناصح صاحب بری طرح پھنسے

کیوں کہا تھا یہ کہ بکتے بکتے سر پھرنے لگا اب تو باندھونگا میں ناصح اسکو بھی زنجیر سے

۲۔ تیسرے درجہ پر ان کی وہ طنزیات ہیں جو انھوں نے محتسب یا رقیبوں پر کہی ہیں اور جو تعداد میں

نسبتاً بہت کم ہیں۔ بایں ہمہ لطف سے خالی نہیں۔ مثلاً :-

خاک میں حیف یہ شراب ملے محتسب بادہ خوار ہونا تھا

محتسب وہم ہے تو پہلے پلا دیکھ مجھے نہ لنڈھا، پی لے، نہ ناب ہے، زہراب نہیں

رندوں پہ یہ بیداد خدا سے نہیں ڈرتا اے محتسب ایسا تجھے کیا شاہ کا ڈر ہے

پس شکستن خم صبر محتسب معقول گناہ گار نے سمجھا گناہ گار مجھے

غیر نکلا ترے گھر سے، گئی اس وہم میں جان غل ہوا چور کا اس کوچہ میں گر آخر شب

ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب! غیر اور تم بھلے، بھلا صاحب!

"بھلا صاحب" نے کیا بات کی، شعر کو سچی طنز کا ایک تیز نیچہ بنا دیا۔

۴۔ شاذ و نادر شعرائے ہم عصر پر بھی طعن و تشنیع ملتی ہے لیکن وہ زیادہ قابل اعتنا نہیں یہ ہے ایک مختصر سا انتخاب مومن کے ان اشعار کا جو اسے طنزیہ کی صف اوّل میں لا بٹھلاتے ہیں مزید لطف اندوزی کے لئے شائقین مومن اس کے دیوان سے رجوع فرمائیں۔ اسی طرح اس کے کلام میں مختلف قسم کی خوبیاں ہیں جن میں سے بعض پر بشرط فرصت، پھر کبھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔

عربوں کے آثار

دنیائے علم و عمران میں !

دنیا میں عرب نامی ایک قوم نمودار ہوئی۔ علم و اخلاق سے تہی مایہ، تہذیب و تمدن سے عاری۔ اور فنون و صنائع سے ناواقف۔

پاس ہی روم و ایران کے قصر فلک بوس اپنی عظمت و ہیبت کا اعلان کر رہے تھے۔ ان کی تہذیب و تمدن کا خورشید جہانتاب ایک عالم پر ضیا بار و کرم گستر تھا۔ لیکن عرب کا کاشانہ، محروم تھا وہ جاہل تھے، تند خو تھے۔

لیکن دیکھئے! دیکھئے! وہ قوم ایک عالم پر چھا گئی، کشور کشائی اور ملک گیری میں کوئی اس کا ہم نبرد نہ رہا۔ علم و حکمت کی طرف جب متوجہ ہوئی تو یونان کے اسفار و اوراق کو کھنگال کر نئے علم نئے فلسفے، اور نئے نظریات سے علم و حکمت کی دنیا میں تہلکہ ڈال دیا، تعمیر و صنائع کی طرف توجہ مبذول ہوئی، تو الحمرا اور قصر زہرا کی بنیادیں پڑ گئیں، غرض عرصۂ حیات کے جس گوشہ میں داخل ہوئی، مظفر و منصور، دنیا کے جس چپہ چپہ پر قدم رکھا۔ فاتح و کشور کشا، کی حیثیت سے، علم و فن کی جس محفل میں داخل ہوا تو صدر نشین مسند علم و فن کے امتیاز خصوصی سے۔

گرچہ تھے صفحۂ ہستی پہ ہم اک حرف غلط   لیک لٹے بھی تو اک نقش بٹھا کے اٹھے۔

دنیا زود فراموش ہے، عربوں کے ملکات و فضائل لوگوں کے ذہن و دماغ سے محو ہوتے جا رہے ہیں، لہٰذا "یاد دہانی" کے طور پر اگر کبھی کبھی وہ داستان پارینہ زیب قرطاس و قلم ہوتی ہے تو مضائقہ کیا ہے؟

صفحات ذیل مصر کے مشہور علمی رسالہ "المقتطف" میں شائع ہوئے ہیں، ترجمہ نذر ناظرین ہے۔

* یہ پیش نظر رہے کہ رسالہ کا ایڈیٹر مسلمان نہیں عیسائی ہے

(رئیس احمد جعفری ندوی)

ایک صدی کے اندر ہی اندر عربوں نے متعدد ممالک پر قبضہ کرلیا، یہاں تک کہ چین جیسے دور دراز مقام پر بھی ان کی فوجیں نظر آنے لگیں، نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے نام سے دنیائی قومیں لرزہ براندام ہوگئیں۔

ملک گیری سے جب ان کی طبیعت سیر ہوگئی تو انھوں نے علم وفن کی طرف توجہ کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس میدان میں بھی وہ سب سے آگے نظر آنے لگے، ایک طرف سلطنت عباسیہ کا آفتاب نصفت و اقبال مائل بہ غروب تھا، تو دوسری طرف علم وحکمت کا مہر درخشاں طلوع ہو رہا تھا اور آگے چل کر حکومت مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی، بہت سے خود مختار عناصر پیدا ہوگئے لیکن علمی ترقیوں کو جب بھی فروغ حاصل رہا، پہلے اگر ایک مرکز تھا، تو اب علم وفن کی سرپرستی کے متعدد مراکز ہوگئے۔

عربوں نے اسی پر اکتفا نہیں کی کہ مختصر مدت میں یونان، فارس، اور ہندوستان کے مختلف علوم وفنون کو عربی میں ترجمہ کرلیا ہو، بلکہ انھوں نے ان میں وسعت پیدا کی، جدید اضافے کئے، اور نئے نظریات قائم کئے، جو آج تک حضارت فرنگ کے لئے اساس کا کام دے رہے ہیں۔

فن تاریخ میں عربوں نے ایسا امتیاز حاصل کیا تھا کہ علماء مغرب کے لئے وہ آج تک مایۂ حیرت و استعجاب ہے، دوسری اقوام وامم کے مقابلہ میں عربوں کے مولفات کو جو ترجیح حاصل ہے وہ ہر شخص کو معلوم ہے، مثلاً کشف الظنون کو لیجئے، جس میں کتب وفنون کے اسماء سے متعلق مفصل معلومات پیش کئے گئے ہیں، ان کی تعداد جن کا کتاب میں ذکر ہے ۱۳۰۰ تک پہنچتی ہے۔ اور پھر شروح و اختصارات وغیرہ مستزاد۔ اور وہ تاریخی کتابیں جو سال وسنین کی حسن ترتیب کے اعتبار سے قابل ذکر ہیں، مثلاً طبری، ابن اثیر، ابو الفدا، یا جو اقوام وممالک کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئیں مثلاً مسعودی، فرمی، ابن خلدون، وغیرہ، اس قبیل کی کتابیں تو حد شمار سے خارج ہیں[1]۔ ایسے ایسے مولف ومصنف بھی تھے

[1] زیدان۔ تاریخ التمدن الاسلامی ج ۳۔ ص ۹۳۔

جو اپنی عبارت کی روانی و شگفتگی اور حسن استدلال کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔ اکثر عرب مورخوں کو علماے مغرب نے "حکمت گر" تسلیم کیا ہے یورپ کے علمی حلقے اس وقت تک ان کتابوں سے مستفید ہو رہے ہیں۔ ابن خلدون ہی کو لیجیے، اس نے اپنی مشہور تاریخ کی تالیف اور ترتیب میں ممالک و مساکن کا خاص طور سے خیال رکھا ہے، مغرب اور اندلس کے متعلق اس نے ایسے ایسے معلومات پیش کیے، جہاں تک کوئی بھی نہ پہنچ سکا، تاریخ ابن خلدون کا مقدمہ خاص اہمیت رکھتا ہے، یورپ کے ایک مشہور عالم کا قول ہے "ابن خلدون کا مقدمہ فلسفۂ تاریخ سے لبریز ہے، کوئی بھی وہاں تک نہ پہنچ سکا، جہاں تک ابن خلدون کی طبع بلند پہنچی ہے، بلکہ میں تو کہتا ہوں روم یونان کے علما بھی اس کی گرد کو نہیں پہنچتے"۔

فن جغرافیہ میں بھی عربوں کو تقدم کا شرف حاصل ہے، پہلے تو انھوں نے یونان وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ کیا، ترجمے کے بعد انھوں نے اس فن کو اور بھی وسیع کیا، اپنے مشاہدات و تجربات سے اضافہ کیا، اس لئے کہ یہ قوم خود ایک جہانگیر قوم تھی، بطلیموس کی بہت سی غلطیوں کی تصحیح عربوں ہی نے کی ہے[1] اور یہ عرب ہی تھے جو صحرائے افریقہ تک پہنچ گئے، اور بلاد سوڈان میں بھی اپنے جھنڈے گاڑ آئے، گذشتہ اقوام سے عرب اس باب میں بھی ممتاز ہیں کہ انھوں نے فن جغرافیہ میں بہت سی کتابیں اپنے مشاہدات و تجربات سیاحت سے متعلق تالیف کیں۔ زمین کے جو نقشے بنائے ان میں بھی ایک اسلوب بدیع کے مالک ہوئے، ان کے لئے یہ فخر کافی ہے کہ کرہ پر نقشہ کھینچنے کا اصول سب سے پہلے انھیں نے معلوم کیا، خط نصف النہار کا طول درجہ معلوم کرنے میں بھی عرب ہی سب سے اول رہے۔ مشہور عرب جغرافیہ دانوں میں مسعودی، بیرونی، ادریسی، یاقوت، مقریزی، قزوینی، اور ابن بطوطہ سے ہر شخص واقف ہے۔ ان سب میں ادریسی کی شخصیت وہ تھی کہ بارہویں صدی عیسوی میں تو اس کا کوئی ہمپایہ پیدا نہیں ہوا ادریسی ہی نے روجر بادشاہ صقلیہ کی فرمائش سے ایک کتاب "نزھۃ المشتاق فی اختراق الآفاق" تالیف کی، جس میں بلاد و ممالک کا نہایت تفصیلی تذکرہ تھا، اس کے علاوہ اس نے روجر کیلئے

---

[1] زیدان۔ تاریخ التمدن الاسلامی ج ۳ ص ۱۸۱

ایک نقشہ بھی تیار کیا تھا جس میں اس زمانے کے تمام قابل ذکر اقالیم کو دکھایا گیا تھا، ادریسی کی وہ شخصیت ہے جو جغرافیۂ اسلام اور جغرافیۂ فرنگ کے درمیان حلقۂ اتصال کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب تراث الاسلام میں ہے کہ

"بادشاہ روجر کا ایک مسلمان عالم سے جغرافیہ پر کتاب لکھانا، اور نقشہ بنوانا، اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمان اس زمانے میں علمی اعتبار سے اپنے تمام اقران و امثال میں ممتاز تھے"

بعض لوگوں کا خیال ہے عرب بس نقل و ترجمے کے ماہر تھے، علوم و فنون میں انھیں براہ راست کوئی دست رس نہیں حاصل تھی، یہ تحقیق انیق انھی "یورپ زدہ" حضرات سے ظہور میں آتی ہے جن کا سارا علم و فن رہین منت ہوتا ہے استادان فرنگ کا، یا ہمارے وہ نوجوان اس قسم کے اقوال کا اظہار کرتے ہیں جو فرنگیت سے مرعوب و متاثر ہیں، ورنہ اس قول کا مہمل ہونا بالکل ظاہر و باہر ہے، وہ فرنگی علما، جن کو خدا نے عدل و انصاف کا مادہ دیا ہے، اس کے علی الاعلان معترف ہیں کہ عربوں نے نقل و ترجمے میں اپنی مہارت کا جو ثبوت دیا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ ہے خود انھیں علوم و فنون میں دستگاہ تھی،

یونانی، سریانی، کلدانی، وغیرہ میں طب پر جو سالہ تھا پہلے تو عربوں نے اسے حاصل کیا، پھر اس فن میں انھوں نے ترمیم و تغیر کیا، اور حک و اصلاح سے کام لیا بلکہ اضافہ و ایزاد کے بھی نہایت بے بہا نمونے چھوڑے، کتاب تراث الاسلام میں ہے۔

"عربوں نے طب یونانی میں بہت کافی اضافہ کیا۔ اور ان کا یہ اضافہ تجربہ پر مبنی تھا، جو اس کا ثبوت ہے کہ وہ طب سے رسمی اور نظری طور سے ہی نہیں واقف تھے، بلکہ علمی حیثیت سے بھی کافی ممتاز تھے"

اس بیان سے ان لوگوں کی تسکین ہو جانی چاہیئے جن کے خیال میں عربوں کا علم طب

لہ۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا مادہ Maps

لہ۔ کتاب تراث الاسلام Legacy of Islam

نظری تھا۔ اس فن میں ان کے بڑے قیمتی مولفات بھی ہیں، مثلاً ابن سینا کا قانون اور ابوالقاسم خلف بن عباس زہراوی اندلسی کی کتاب التصریف وغیرہ۔ ان کتابوں سے فرنگیوں نے اپنی نہضت جدید میں بڑے بڑے فائدے اٹھائے ہیں، اٹھارویں صدی عیسوی تک عربوں کی بعض کتابیں یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں داخل رہیں۔ عربوں میں جن لوگوں نے فن طب میں غیر معمولی مہارت حاصل کی، بہت ہیں جسے تفصیل مطلوب ہو طبقات الحکما، تراجم الحکما اور کشف الظنون وغیرہ کی طرف رجوع کرے، یہ بات بہرحال ثابت ہے کہ طب اور صیدلتہ میں عربوں نے نمایاں حیثیت حاصل کرلی تھی۔

اس طب کو ایک باقاعدہ نظام کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ ایک افسر اعلیٰ طلبہ کا امتحان لیتا تھا۔ ممتاز طالب علموں کو انعام بھی ملتا تھا، چنانچہ صرف بغداد میں بزمانۂ خلیفہ مقتدر باللہ ان کی تعداد آٹھ سو تک پہنچ گئی تھی، اور ان میں وہ ستر افراد مستثنیٰ تھے جو خدمت سلطانی کے لئے معمور تھے[1]

اس فن میں صرف مردوں ہی کو کمال نہیں تھا بلکہ عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش نظر آتی تھیں، مثلاً اخت حفید، اور اس کی دونوں بیٹیاں، ان عورتوں کو خاص طور سے عورتوں کے معالجہ میں کمال حاصل تھا[2]۔

موجودہ زمانہ میں جو طریقہ رائج ہے، عرب اس سے بے خبر نہ تھے، ان کے ہاں بھی باقاعدہ نبض دیکھی جاتی تھی، پیشاب کا معائنہ کیا جاتا تھا۔ اور وہ لوگ حکما، یونان کے افکار و آرا پر داد تحقیق و تنقید بھی دیتے تھے۔ یونانی کتابوں پر انھوں نے جو حاشئے لکھے، تعلیقیں تیار کیں، مفید اور مناسب اصلاحات کیں، ان کے علاوہ اور متعدد طریقوں سے وہ اس فن کو جلا دیتے رہتے تھے، وہ عرب ہی تھے جنھوں نے طب میں کلوروفارم جیسی چیزوں کو معالجہ کے لئے ضروری قرار دیا جس

---

[1] ابن ابی۔ طبقات الاطبا، ج ۱ ص ۲۲۲۔

[2] ابن ابی اصیبعہ۔ طبقات الاطبا۔

[3] آج کل جراحت کے لئے داغ دینا ایک ضروری چیز سمجھا جاتا ہے، اسی طرح وہ بھی کرتے تھے عرب ہی نے سب سے پہلے مرض سل میں ناخونوں کے ٹیڑھے ہو جانے کو ایک علامت کی صورت میں معلوم کیا، یرقان اور سفینہ کا علاج دریافت کرنے میں عربوں ہی کو شرف اوّلیت حاصل ہے جنون کے مرض میں افیون کے فوائد کا انکشاف بھی عربوں ہی کا رہین منت ہے، نزیف (بہتے ہوئے خون کو روکنے) کے لئے ٹھنڈے پانی کا تریڑا دینا بھی عربوں کی ایجاد ہے، شانہ اتر جانے کی صورت میں اسے بٹھانے کے لئے وہ بھی وہی طریقہ استعمال کرتے تھے جو آج کل رائج ہے[1]، اسی طرح جذام چیچک، کھسرا وغیرہ کی شکل وصورت اور خصائص وغیرہ کے متعلق عربوں نے تحریری سرمایہ پیدا کیا۔

طب کے درس اور مریضوں کے علاج کے لئے ایک خاص عمارت مخصوص ہوتی تھی جس کو "بیمارستان" کہتے تھے، اور جس طرح آج کل طبی درسگاہوں سے لوگ سند فراغت حاصل کرکے نکلتے ہیں وہاں سے بھی وہ طبابت کی سندلے کر نکلا کرتے تھے، علاج کے لئے جو عمارت مخصوص ہوتی تھی، اس میں ہر قسم کا ضروری سامان اور آلات موجود رکھنے کا کافی انتظام تھا، "نرسنگ" کے لئے ملازم تیمارداروں (خدم) کی ایک جماعت ہر وقت موجود رہتی تھی، جو امراض ان کے زمانہ میں معروف تھے، ان کے علاج کے لئے الگ الگ وارڈ (غرفہ) تھے،[2]

علم الجراحت سے متعلق تحقیق وانکشاف کا سہرا زکریا رازی کے سر ہے، اور ان لوگوں میں جنھوں نے عمل بالید (سرجری)، اور آلات وغیرہ کے استعمال میں خاص مہارت حاصل کرلی تھی، ابوالقاسم خلف بن عباس الزہراوی کو خاص امتیاز حاصل ہے[3]

صیدلۃ (دوا سازی) اور جڑی بوٹی کی تحقیق وتفتیش پر بھی عربوں نے خاص طور سے اپنی توجہ

---

[1] زیدان تاریخ التمدن الاسلامی ج ۳ ص ۱۸۰

[2] ابن ابی اصیبعہ۔ طبقات الاطبا، ج ۱ ص ۱۸۳

[3] ڈاکٹر احمد عیسیٰ۔ آلات الطب والجراحت عند العرب ص ۴۔۵

ہندوں کی، چنانچہ ہندوستان اور دوسرے ممالک سے اس باب میں نہایت وسعت قلب سے انھوں نے فائدہ اٹھایا۔ یورپ تک کو اس کا اعتراف ہے کہ فن دواسازی کے بانی ہونے کا فخر عربوں ہی کو حاصل ہے [1]۔ یورپ میں آج بھی بہت سی جڑی بوٹیاں انھیں ناموں سے معروف ہیں جو عربوں کے رکھے ہوئے ہیں۔

فن کیمیا کے بہت سے مرکبات عربوں ہی کی بدولت عالم وجود میں آئے، عمل تقطیر، عمل ترشیح عمل تذویب، بخارات بنا کے عرقوں کی کشید، قلمیں بنانا، الکحل تیار کرنا، یہ سب وہ چیزیں ہیں جنھیں پہلے پہل عربوں ہی نے جانا، پہچانا، بہت سی معدنی تیزاب اور نباتی قلویات (کھاری چیزیں) اور معدنی قلویات عربوں ہی نے معلوم کیں۔ ان تمام چیزوں میں وہ مجتہدانہ نظر رکھتے تھے کہ بہت سے قدیم کیمیاوی نظریات کو انھوں نے باطل کر دکھایا۔

ارباب نظر سے یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ بارود کو مرکب کی صورت میں عربوں ہی نے پیش کیا، ابن اثیر کا قول ہے کہ "عربوں نے بعض ایسی دوائیں ایجاد کی تھیں کہ اگر وہ لکڑی پر مل دی جائیں تو آگ ان پر اثر نہیں کرتی تھی شیشے کی صنعت میں بھی عربوں نے اپنے کمال کا سب سے اعتراف کرایا، ہمیں یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ علم نباتات میں بھی عربوں نے ایک استاد کی حیثیت اختیار کرلی تھی، اس علم میں ابن بیطار، اور رشید الدین ابن الصدری غیر فانی شہرت کے مالک ہیں، موخرالذکر کو اس فن کی تحقیق و تجسس کا یہاں تک سودا تھا کہ

"ان کے ساتھ ہمیشہ ایک مصور رہتا تھا، جب وہ گھاس پات اور جڑی بوٹی کی تحقیق کے لئے نکلتے تو مصور کے پاس ہر طرح کے رنگ اور مسالے موجود رہتے تھے، جب رشید الدین ایسے مقامات پر پہنچتے تھے جہاں نباتات کی فراوانی ہوتی تھی، تو وہ اس کا مشاہدہ کرتے تھے، تحقیق کرتے تھے، پھر مصور کو دکھاتے تھے، مصور اس کے رنگ، پتیوں کی تعداد، شاخوں اور جڑوں کا پورا پورا اندازہ کرکے

---

[1] زیدان۔ تاریخ التمدن الاسلامی ج ۳ ص ۱۸۱۔

بالکل اسی طرح اس درخت کی تصویر کھینچتا تھا اور ہو بہو اس کی نقل تار کے رکھ دیتا تھا اس سلسلہ میں رشید الدین نے نہایت دلچسپ طریقہ اختیار کیا تھا یہ کہ وہ پہلے مصور کو پودے کی بالکل ابتدائی صورت دکھاتے تھے، اس کی تر و تازہ صورت کی طرف متوجہ کرتے تھے، اور مصور اس کی تصویر لے لیتا تھا، پھر جب وہ پودا بڑھ جاتا تھا اس میں دانے آجاتے تھے، تو پھر اس کی تصویر لی جاتی تھی، پھر جب وہ پودا خشک ہو جاتا تھا اور گرنے کے قریب ہوتا تھا تو پھر اس کی تصویر لی جاتی تھی، اس تحقیق کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرتا کہ گویا وہ بچشم خود پودے کی اس نشو و نما اور تغیر و تبدل کا معائنہ کر رہا ہے، ظاہر ہے یہ تحقیق کتنی کامیاب اور مکمل ہوتی ہوگی[۱] میں نہیں سمجھتا کہ آج کل کے ماہرین علم نباتات ابن الصوری سے زیادہ تحقیق و تدقیق کا ثبوت دے سکتے ہیں۔

عربوں نے طبیعیات (فزکس) پر بھی اپنی محنت و کوشش صرف کی چنانچہ اس باب میں بھی نئی نئی بحثیں ان کی بدولت ہمیں نظر آتی ہیں پہلے تو انھوں نے یونانی کتابوں کا ترجمہ کیا، اور ترجمے کے بعد پھر اس فن میں انھوں نے حسب عادت وسعت کی، بہت سے مسائل کا اضافہ کیا، ان کی ترقی کا یہ عالم تھا کہ روز بروز اپنے لئے وہ نئی راہیں پیدا کرتے رہے۔ انھوں نے ایسے آلات بنائے تھے کہ جن کے ذریعہ سے وہ ثقل نوعی تک کا حساب رکھتے تھے، ایسے ایسے پیمانے انھوں نے تیار کئے تھے کہ ایک گرام کے ۴ ۰۰۰۱ حصہ سے کم وزن کا فرق تک وہ معلوم کر لیتے تھے، نظریہ جذب کے متعلق بھی ان کے بہت سے اقوال ملتے ہیں[۲]، روشنی کے متعلق بھی ان کے مستقل نظریات ہیں کہ اس سے پہلے کسی کی رسائی ذہن وہاں تک نہ ہوئی تھی، بلکہ اس مسئلہ میں انھوں نے بہت سے اضافے کئے، یونانیوں کی صحت طلب آراء و افکار کی تصحیح کی اس مسئلہ پر اگر آج عربوں کے اضافے نہ ہوتے

---

[۱] ابن ابی اصیبعہ طبقات الاطبا ج ۲ ص ۲۱۹

[۲] ڈاکٹر صروف، بسائط علم الفلک ص ۲۲

تو یہ مسئلہ اس منزل تک نہ پہنچتا جہاں آج نظر آرہا ہے بعض ارباب نظر کا خیال ہے کہ اس مسئلے پر عربوں کے مقالات و نظریات ہی کی بدولت دوربین کی ایجاد عمل میں آئی[1]۔ امراض چشم اور ان کی تشریح کے متعلق بھی عربوں کا بہت سا تحریری مسالہ موجود ہے[2]

موسیقی میں وتر خامس عربوں ہی کی ایجاد ہے جسے زریاب نے اندلس میں اضافہ کیا تھا قانون بھی عربوں کا ایجاد کردہ ہے۔ اس کی موجودہ ترکیب (ساخت) فارابی کی دی ہوئی ہے[3] یہ مشہور قصہ تو اکثر کو معلوم ہوگا کہ فارابی نے ایک باجہ ایجاد کیا تھا۔ جو صرف دو لکڑیوں سے بنا تھا ان لکڑیوں کی ترتیب میں جب ذرا سا تغیر کر دیا جاتا تھا تو مختلف قسم کے راگ نکلنے لگتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ وہ سیف الدولہ کے دربار میں حاضر تھا، اس سے سوال کیا گیا کیا تم گانے بجانے سے کچھ ذوق رکھتے ہو؟ فارابی نے اثبات میں جواب دیا، پھر اپنی جیب سے ایک خریطہ نکالا، اسے کھولا، اور اس میں سے دو لکڑیاں نکالیں، انھیں ایک خاص انداز میں ترتیب دیا، اور بجانا شروع کیا، تو یہ حال ہوا کہ مجلس میں جتنے لوگ بھی تھے سب کلھنتے ہنستے برا حال ہوگیا، پھر ان لکڑیوں کی ترکیب میں ایک خاص تغیر کیا، اور بجانا شروع کیا، اب کی اہل مجلس پر راگ کے اثر سے گریہ طاری ہوگیا، اور ہر شخص بے حال ہوگیا، اس کے بعد پھر اس نے اپنی لکڑیوں میں ایک خفیف سا تغیر کیا، اور بجانے لگا، نتیجہ یہ ہوا کہ حضار محفل پر غنودگی طاری ہوئی، اور دربان تک خراٹے لینے لگا، فارابی نے لکڑیاں جیب میں رکھیں اور یہ جا وہ جا غائب ہوگیا تھا، آسمانی میں پرواز کا خیال بھی سب سے پہلے عربوں کو آیا، سب سے پیشتر اس معاملہ کی طرف جس کا ذہن منتقل ہوا، وہ عباس ابن فرناس تھا، نفح الطیب میں ہے کہ۔

---

۱ انسائکلوپیڈیا برٹانیکا، مادہ Light

۲ کاجوری۔ تاریخ الفزکس، ص ۲۳

۳ ابن خلکان ج ۲ ص ۷۷

۴ ابن خلکان ج ۲ ص ۷۷

"عباس نے اپنے جسم کو فضا میں اڑانے کی کوشش کی، پہلے تو اس نے اپنے بدن پر پرچڑھے پھر دو بازو بنا رکھے، جیسے چڑیوں کے ہوتے ہیں، اس کے بعد اس نے فضا میں کافی دور تک پرواز کی، لیکن یہ پہلا تجربہ اس کے لئے ایک حد تک تکلیف دہ ثابت ہوا، اترتے وقت اس کے جسم کے پچھلے حصے میں کچھ چوٹ آئی۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ پرندا ترتے وقت اپنے پچھلے حصہ سے زیادہ مدد لیتا ہے، عباس نے غلطی یہ کی کہ دم نہیں بنائی[۱]"

اب ہمیں چاہیئے کہ عربوں نے فن ریاضیات اور فلکیات میں جو ترقی کی تھی ایک نظر اس پر بھی ڈال لیں۔ ان دونوں مسئلوں پر علماء یونان اور ہندوستان کا جو تحریری مواد تھا اس سے استفادے کے بعد عربوں نے ان مسائل میں بھی قابل قدر اضافہ کیا۔ حساب میں عدد کے خواص اور دوسرے متعلقات پر انھوں نے سیر حاصل بحثیں کی ہیں، لفظ صفر بھی سب سے پہلے عربوں کے قلم سے نکلا، کسر عشری بھی عربوں ہی کا وضع کیا ہوا ہے، نو کا عدد گرا کے جمع کرنے کا اصول بھی عربوں ہی کی جانب منسوب ہے[۲]، ہندی ہندسوں کو انھیں نے نقل کر کے رواج دیا، خوارزمی نے اپنی ایک تالیف میں لکھا ہے کہ موجودہ ہندسے ہم کو ہندیوں سے پہنچے ہیں[۳] اور عربوں سے انگریزوں نے لئے ہیں۔

فن جبر و مقابلہ میں اگر یونانیوں کو کچھ درک تھا بھی تو بہت ناقص، ہم بلا خوف تردید یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ یہ فن بھی عربوں ہی کے وضع کردہ فنون میں سے ایک ہے، کاجوری کا قول ہے کہ جب اس پر نظر جاتی ہے کہ عربوں نے جبر و مقابلہ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، تو عقل حیران رہ جاتی ہے۔ سب سے پہلے لفظ جبر کا استعمال بھی عربوں نے کیا اور ان سے انگریزوں نے لیا، اس فن پر انھوں

---

[۱] المقری۔ نفح الطیب ج ۲ ص ۲۳۱

[۲] کتاب تراث الاسلام ص ۳۹۴

[۳] سمتھ کاربنگی۔ الارقام الہندیہ العربیہ ص ۵

نے مستقل نظریات بھی قائم کئے تھے جو اس وقت تک قائم ہیں، معادلات کے لئے حلول جبری و ہندسی بھی انھیں نے ایجاد کئے، درجۂ ثانیہ اور ثالثہ کے معادلات سے بھی انھوں نے سب سے پہلے دنیا کو روشناس کرایا۔ اس فن میں عربوں نے ایسی ایسی ایجادیں کیں کہ علماء فرنگ آج تک انگشت بدنداں ہیں۔ کاجوری کا قول ہے کہ معادلات تکعیبی کا حل [1] جو قطوع مخروط کے واسطے سے ہوتا تھا عربوں کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ درجۂ رابعہ کے معادلات کے بعض اوضاع بھی انھوں نے حل کئے [2]۔ مامون کے حکم سے محمد بن موسیٰ خوارزمی نے اس علم پر ایک کتاب شائع کی، جس نے بڑی شہرت حاصل کی جس سے ساری دنیا میں خوارزمی کا نام پھیل گیا، علماء فرنگ نے فن جبر پر جتنی کتابیں تحریر کیں وہ اسی کتاب پر مبنی تھیں، یہ کتاب فرنگیوں کے کورس میں بھی داخل رہی، اور ایک مدت دراز تک یہ لوگ اس سے استفادہ کرتے رہے، مثلثات میں بھی عربوں نے بہت جدت سے کام لیا، نسب مثلثہ کے عداد میں، عربوں ہی نے سب سے پہلے مماس کو داخل کیا [3]۔ تناسب جیوب کا قانون بھی عربوں ہی کے اکتشاف کا نتیجہ ہے، اور ان کے فخر کو یہ کافی ہے کہ کروی مثلثات کے حل کا عام قاعدہ انھیں نے بنایا۔ نظیر مماس، اور قاطع اور اس کی نظیر، ان چیزوں کے لئے جدولیں بھی سب سے پہلے عربوں نے تیار کیں اور واقعہ تو یہ ہے کہ علم المثلثات میں عربوں نے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی کہ پھر اس پر خاص طور سے کوئی اضافہ کیا جاتا چنانچہ علماء فرنگ کو بھی اس کا اعتراف ہے۔

فلکیات میں بھی عربوں نے اپنی ذہانت و قابلیت، اور ایجاد و اختراع کا ایک زمانے سے لوہا منوا لیا، انھوں نے سابق فلکی علماء کی طرح یہ نہیں کیا کہ نظریات ہی قائم کر کے رہ گئے ہوں، بلکہ انھوں نے اس فن کو عملیات میں داخل کر لیا، رصد وغیرہ کا قائم کرنا بعض نہایت اہم نظریات فلکی

---

[1] کاجوری۔ تاریخ الریاضیات، ص ۱۰۷

[2] " " "

[3] انسائکلوپیڈیا آف برٹانیکا، مادہ مثلثات (Trigonometry) و نصیر الدین طوسی۔ شکل القطاع، ص ۱۳۶

عربوں ہی کے طبع وقاد کا نتیجہ ہیں، انھوں نے بہت سے رصد خانے قائم کئے[1] اور ان میں منفعت بخش ارصاد کا انتظام کیا، اس فن میں انھوں نے ایسی مہارت کا ثبوت دیا کہ علمائے فلکیین دنگ رہ گئے، کوئی ان کی برابری نہیں کر سکا مغرب نے بھی عربوں کے تفوق کو تسلیم کیا ہے۔ یہاں تک کہ لالاند مشہور فرانسیسی عالم فلکی تبانی کو ان بیس علمائے فلکیین میں شمار کرتا ہے، جو اپنی مہارت وخصوصیات کے اعتبار سے ساری دنیا میں فرد ہیں[2]۔ زمین کی کرویت پر بھی عربوں کے بہت سے اقوال ملتے ہیں، ان کا یہ خیال بھی تھا کہ زمین ایک محور پر گردش کر رہی ہے، بڑی منفعت بخش زیچیں بھی انھوں نے ایجاد کیں، زمین کے لئے نقطۂ ذنب کی حرکت عربوں نے بیان کی، گرمائی اور سرمائی اعتدال کی قیمت میں بھی انھوں نے اصلاحیں کیں، فلک معدل النہار پر فلک بروج کے میل کی قیمت کا اندازہ بھی عربوں نے ہی کیا۔ اور تعجب خیز امر یہ ہے کہ اس میل کا حساب نہایت دقیق ہے، اپنی رصد میں انھوں نے ایک دقیقے تک کا حساب رکھا تھا[3]۔ آفتاب زمین سے کتنا بلند ہے؟ اس سوال کا جواب جو انھوں نے دیا تھا، وہ تقریباً وہی ہے، جو آج کل کے علمائے فلکیات دیا کرتے ہیں۔ آلات رصد میں اسطرلاب بھی عربوں کی ایجاد ہے۔ غرض اس فن میں انھوں نے غیر معمولی اضافے کئے، میں نے نبائط علم الفلک[4] میں دیکھا ہے کہ پچاس فیصدی ستاروں کے نام وہی ہیں، جو عربوں نے رکھے تھے، اور آج تک وہ فرنگی زبانوں میں برابر استعمال ہو رہے ہیں۔ اس فن میں ان کی مہارت اور کمال کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ بعض فلکی علماء نے ایسے مکانات بنائے تھے، جن میں آسمان تھا، آسمان پر تارے تھے، بادل تھے، بجلیاں تھیں، سب ہی کچھ تھا اور دیکھنے

---

[1] ملاحظہ ہو مقتطف، بابت ماہ جنوری ۱۹۳۱ء

[2] اسمٰعیل مظہر تاریخ الفلک العربی ص ۴۵۔ ۴۶

[3] اسمٰعیل مظہر " ص ۴۶

[4] فانڈیک۔ کتاب علم الهیئۃ ص ۱۲۷

والے کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سچ مچ آسمان کے نیچے کھڑا ہوا ہے[1] علمائے مغرب کا اس میں اختلاف ہے کہ حرکت قمر میں انواعِ خلا کے انکشاف کا سہرا کس کے سر ہے؟ بعض لوگ تیخو براہی کا نام لیتے ہیں اور بعض ابو الوفا کا[2] لیکن اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ اس انکشاف کا سہرا ابو الوفا کے علاوہ کسی اور کے سر نہیں ہے[3]۔

جب عربوں نے عیش وعشرت کے میدان میں قدم رکھا تو اس میں بھی وہ سبقت بازی لے گئے، ایک طرف اگر علوم وفنون میں انھوں نے اپنی نظریات وخیالات کی ندرت کاریوں سے ایک عالم کو محوِ حیرت بنا رکھا تھا تو دوسری طرف بزم وانجمن میں بھی وہ سب سے پیش پیش تھے، ان کی بزم آرائیاں آج تک لوگوں کی زبانوں پر اور کتابوں کے اوراق پر محفوظ ہیں، انھوں نے جب شعر وشاعری کی طرف توجہ کی تو اس میں ایسا کمال پیدا کیا کہ میدان میں کوئی حریف نہیں رہ گیا، جب موسیقی کی طرف ان کی نظر متوجہ ہوئی، تو ایسے راگ اور باجے ایجاد کئے کہ مرورِ ایام کے باوجود آج تک وہ باقی ہیں، جب انھوں نے تعمیر پر نظرِ عنایت کی تو ایسے ایسے قصور ومحلات تیار کر کے کھڑے کر دئے کہ دنیا میں جنت کا نمونہ قائم کر دیا، ان کی عمارتوں کی خوبی وخوشنمائی، سنگینی واستحکام اور تناسب وتناسق پر جب نظر پڑتی ہے تو عقل حیران رہ جاتی ہے، ایک نظر مصر کی عمارات، دمشق کی جامع اموی، اور اندلس کے قصور ومعابد پر ڈالو، تو عظمت اب بھی وہاں سجدہ ریز نظر آئے گی۔

الحمرا کی فرداً فرداً خصوصیات میں بیان کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا، لیکن میں نے اس کے متعدد اوصاف مقالات کتب میں پڑھے ہیں جو مشاہدے پر مبنی تھے اور ہر وصف ایک دوسرے

---

[1] المقری۔ نفح الطیب ج ۲ ص ۲۲۱

[2] کاجوری۔ تاریخ الریاضیات ص ۱۰۵

[3] کتاب تراث الاسلام ص ۳۹۵

سے علیحدہ، یہ نتیجہ ہے۔ الحمرا کی اعجوبہ زائیوں اور حیرت فروشیوں کا، اس کی عظمت اور جلال ہندسی (انجنیرنگ) کا کون انکار کرسکتا ہے؟ مغربی علما نے بھی الحمرا کے گن گائے ہیں اور اس کی نزاکت صنعت اور استحکام عمارت کا اعتراف و اقرار کیا ہے، فرنگیوں نے محلات اور کوشکوں کے نام "حمبرا" اور "کزارا" (یعنی حمرا اور قصر) رکھنا شروع کئے "حمبرا" (حمرا) کے معنی ہی ان کے یہاں اس قصر کے پڑ گئے، جو خوبصورت ہو، مضبوط ہو، اس کے اندر باغیچہ ہو، طرح طرح کے پھول ہوں، غرض ہر چیز سے آراستہ و پیراستہ ہو[1]

قصر حمرا، عربوں کی جاہ و حشم، اور عیش و تنعم کی ایک زندہ یادگار ہے، خوف طوالت کے خیال سے اشبیلیہ کے قصر کبیر اور اندلس کے قصر زہرا اور قصر زاہرہ وغیرہ کا ذکر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ قصر زہرا میں سنگ مرمر، اور دوسرے طرح طرح کے نادر پتھروں کو اس حسن و خوبی سے استعمال کیا گیا تھا کہ قوت بیان، اس کی تشریح سے عاجز ہے، اس میں سیکڑوں طلا، سرخ کی مورتیں تھیں، مثلاً عقاب ہرن، گھڑیال، شاہین وغیرہ، ان میں سے ہر مورت ہیرے جواہرات سے مرصع تھی، فوارے کی طرح اس کے منھ سے پانی نکلتا رہتا تھا[2]

یہ عمارتیں کیا بنیں ہمارے شعرا اور ادبا کے لئے ایک اچھا خاصہ میدان ہاتھ آگیا، مختلف شعراء نے اپنے اشعار میں، اور ادبا نے اپنی نثر میں ان عمارتوں کے کمالات و خصوصیات حسن و جمال تشریح و تعبیر، اور اصلی تصویر کھینچنے میں اپنا پورا زور قلم صرف کر دیا۔

سطور بالا میں فن تعمیر کی چند نادر مثالیں پیش کی گئیں۔ ان کے علاوہ عراق، شام، اور دوسرے ممالک اسلامیہ میں حضارت و تمدن کے جو نمونے عربوں نے قائم کئے، وہ ایسے ہیں کہ عصر حاضر کے بڑے بڑے علما بھی ان کا اعتراف کرتے ہیں، اسپین کے ایک بہت بڑے انجنیر کا بیان ہے کہ جب

---

[1] مجلۃ الکلیۃ جلد ۱۵۔ ص ۲۳۰

[2] " " "

میں مسجد قرطبہ کو دیکھتا ہوں، تو محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں سب سے بڑا اور اہم اور قابل ذکر نمونہ جو ہے، وہ یہی مسجد ہے، میرا خیال تو یہ ہے کہ دنیا اب تک اس مسجد کی نظیر نہیں پیش کر سکی" آگے چل کے وہ کہتا ہے کہ مختلف قسم کی صناعات میں اور پانی کو طرح طرح سے کاٹ کے نکالنے میں عربوں نے جو طریقہ اختیار کئے تھے، عہد حاضر کا فن اب تک وہاں نہیں پہنچ سکا لہ. فلسفہ میں عربوں نے جو کمال حاصل کیا تھا. اس سے ایک دنیا واقف ہے، کندی، ابن سینا، ابن ہیثم، اور ابن رشد وغیرہ ان اساطین میں ہیں کہ اب تک بہت سے دانشوران مغرب ان کی خوشہ چینی کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں.

عربی حضارت تمدن کے بحر بے پایاں کے یہ چند قطرے تھے، جو اس صحبت میں پیش کئے گئے، مغربی علماء نے عربوں کے عمران و تمدن پر بہت سیر حاصل بحثیں کی ہیں جن میں سے ہر ہر گوشہ ایک دفتر کی حیثیت رکھتا ہے فرنگی علماء نے جب کبھی عربوں کے آثار کی جستجو کی، تو ان پر یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ عرب ہر چیز میں سبقت لے جا چکے ہیں. ایک بڑے مغربی دانشور کا قول ہے" بہت سی ایجادات واختراعات کو ہم یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ یہ ہمارے ساعی کا نتیجہ ہیں. لیکن تھوڑے ہی عرصہ کی کاوش وجستجو کے بعد ثابت ہوگیا کہ ہمارا خیال غلط تھا، عرب ان چیزوں میں ہم سے مدت ہوئی بازی جا چکے ہیں"

پھر یہ بھی یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو ایسے قدر شناس مغربی علماء ہیں جو قدم قدم پر عربوں کی رہنمائی، اور دستگیری کے قائل ہیں، اور دوسری طرف ایسے حق ناشناس بھی جو اپنے زعم علم میں اس کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کرتے کہ اپنے ماٰخذ ومصادر کا تذکرہ کردیں اس لئے کہ اس میں عربوں کا ذکر آجائے گا اور اسے وہ پسند نہیں کرتے. لیکن ایسے انصاف پرور علماء بہرحال موجود ہیں جو نہایت فراخدلی سے عربوں کی علمی و عمرانی خدمات کا اعتراف خندہ جبینی

لہ المقری. نفح الطیب ج ۱ ص ۲۳۰

کے ساتھ کرتے ہیں۔

فلور یاں کا قول ہے کہ "اپنے زمانے میں عربوں نے علوم وفنون کی ترقی میں جو کچھ کیا، ویسا کوئی نہیں کر سکا، اگر ہم یہ کہیں کہ یورپ ان کے خدمات علمی کی بنا پر ہمیشہ انکا رہین منت رہا اور شاید رہے گا (مترجم) تو یہ مبالغہ نہیں ہے، بالخصوص تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی کی نہضت میں ان کی یہ خدمت ایک بہت بڑی عامل تھی۔"

بلاشبہ حضارت عرب ایک حلقۂ اتصال ہے یونان اور حضارت جدیدہ کے درمیان، وہ عرب ہی تھے جنھوں نے یونان وغیرہ کے علوم کو ضائع ہونے سے بچایا، وہی تھے جنھوں نے ان علوم وفنون کو عربی میں منتقل کیا، وہی تھے، جنھوں نے ان علوم وفنون پر اضافے کئے، اور بالآخر اسپین کی راہ سے یہ سارا سرمایہ یورپ پہنچا دیا۔ کاجوری اور سمت اعتراف کرتے ہیں کہ ریاضیات اور فلکیات میں عرب سب کے استاد تھے، بارون دی فو، کہتا ہے، "یونان نے جو علمی ورثہ چھوڑا، رومی اسے نہ قائم رکھ سکے، نہ اس کی قدر کر سکے، لیکن عربوں نے اس میراث کی حفاظت کی اور اسے درجۂ کمال تک پہنچا دیا یعنی یہی نہیں کہ انھوں نے اس میراث کو جوں کا توں باقی رکھا ہو بلکہ اسے ترقی کے سب سے بڑے درجے پر پہنچا دیا۔ انھوں نے اسے پروان چڑھانے میں اپنی پوری کوششیں صرف کر دیں، اور بالآخر انھوں نے وہ میراث عہد حاضر کو سپرد کر دی"

ڈاکٹر سارٹون نے جامع امریکیہ، بیروت میں ایک خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا۔

"بعض مغربی علماء خواہ مخواہ عربوں کی جلالت علمی کا اعتراف نہیں کرتے، قرون وسطیٰ عربوں نے علم وفن کو جو فروغ دیا، اس کا اقرار کرتے ہوئے وہ ہچکچاتے ہیں، کہتے ہیں، عربوں نے یونانی علوم فنون کو نقل و ترجمہ کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا، یہ ایک بہت بڑی غلط بیانی ہے۔ اگر ہم اسے فرض بھی کر لیں کہ نقل و ترجمہ کے علاوہ انھوں نے کچھ اضافے نہیں کئے تب بھی کیا یہ دنیا کی ایک عظیم الشان خدمت نہیں تھی؟ اگر ان کے ترجمے آج نہ ہوتے، تو ہم ترقی کی اس منزل پر نہ ہوتے بلکہ اب تک ہم قرون وسطیٰ ہی میں نظر آتے۔"

ڈاکٹر سارٹون کا یہ خیال بھی ہے کہ انکشاف سے اگر فائدہ نہ اٹھایا جائے تو اس کی حیثیت کچھ نہیں رہ جاتی لیکن جو انکشاف سے فائدہ اٹھائے، اس کو برتنا سیکھے اور سکھائے وہ بھی ڈاکٹر صاحب کی نظر میں اس کا مستحق ہے کہ اسے موجد مانا جائے چنانچہ فرماتے ہیں،

"قرونِ وسطیٰ میں عرب دنیا کے سب سے بڑے معلم تھے۔ عربوں کے نقل و ترجمہ کی حیثیت میکانکی نہیں تھی کہ لفظ پر لفظ رکھ دیا، یا ہو بہو چربہ اتار دیا، بلکہ ان کی چیزوں میں روح تھی، زندگی تھی۔ انھوں نے یونان سے علوم و فنون حاصل کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں کیا، اور ہندوؤں سے بھی بلا تامل انھوں نے قابلِ اخذ چیزیں حاصل کیں"

یہ ہے ایک مختصر سی داستان ایک گذری ہوئی قوم کی جو اگرچہ زندہ ہے، لیکن مرچکی ہے۔

مایا کے کھیل

رام بھروسے کا جمی کا جوان بیٹا پچھلے سال گرمیوں میں پولیس والوں کی گولیوں سے زخمی ہو کر مرگیا۔ وہ بے قصور تھا۔ گاؤں گاؤں کسانوں نے لگان کی تخفیف کے سلسلے میں جو بلوے کئے تھے اس سے اُسے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ بچارا بہن کی سسرال سے اپنے گھر واپس آ رہا تھا۔ راستے میں موضع یعقوب پور کے کسانوں کی بھگدڑ میں پھنس گیا۔ سامنے سے پولیس گولی چلا رہی تھی۔ اس کے بھی دو گولیاں لگیں۔ اور ایسی کاری کہ وہیں گاؤں کی سرحد کے پاس خیراتی کے کنوئیں کے قریب اس کی جان نکل گئی۔

رام بھروسے کی پکڑ دھکڑ ہوئی۔ حاکم کے سامنے پیشی ہوئی۔ مگر دو چار گاؤں کے بھلے مانسوں اور داروغہ جی کی گواہی صفائی سے رام بھروسے مظلوم قرار دیا گیا بیٹے کی جان کی قیمت سرکار سے ایک ہزار روپیہ ملی۔

پورے گاؤں پر بلوے کا تاوان لگا۔ پیسے والوں کا حال پتلا ہو گیا۔ عزت داروں کی بات میں دم نہ رہا۔ اب رام بھروسے پورے پکے ایک ہزار روپیہ کا مالک ٹھاکر بھوپ سنگھ کے دوارے آنے جانے لگا۔ پہلے بیگاریوں میں پکڑا جاتا تھا۔ ٹھاکر صاحب گاؤں کے نمبردار تھے۔ ان کے ہل چلانا پڑتے تھے۔ اور جو کبھی چلم کے لئے بنیا کو مانگ بیٹھتا تھا تو ٹھاکر صاحب کی گالیاں سہنی پڑتی تھیں۔ اب ٹھاکر صاحب پر گھٹتی پڑ رہی تھی۔ نمبرداری ٹوٹ چکی تھی اور رام بھروسے پر لچھمی جی ہنس رہی تھیں۔ اس لئے حالات کی صورت بدل گئی۔ آتے جاتے اگر رام بھروسے کا جمی ٹھاکر بھوپ سنگھ سے دوچار ہوتا۔ تو ٹھاکر صاحب "کہو سیٹھ" کہ کر بات کرتے اور جو ٹھاکر صاحب کے ڈیرے پر جانا ہو جاتا۔ تو ٹھاکر صاحب اپنے حقے کی چلم خود اتار کر رام بھروسے کو دیتے "لو ایک دو دم لگا لو"

دو چار سال تک یہی ڈھنگ رہے لیکن رام بھروسے کے ہاں لچھمی جی کا دل نہ لگا۔ دو چار نقصان ہوئے۔ پہلے سے کسانی جانتا نہ تھا۔ کاشتکاری کے داؤں پیچ اور اونچ نیچ سے واقف نہ تھا۔ کیرا بنا کسان اور کام نہ سنبھلا۔ دوسری طرف روپیہ کا نشہ سوار تھا۔ دو چار مقدمے ہوئے اس میں وکیل منشی اور اہلکاروں نے روپے کھائے۔ اور سرکار کا دیا روپیہ پھر سرکار کے خزانہ میں پہنچ گیا۔ مگر رام بھروسے کاچھی بالکل بگاری نہ بن سکا۔ چونکہ روپیہ چلے جانے کے بعد بھی کچھ چاندی کی ایسی چمک چھوڑ جاتا ہے کہ ہر ایک کا زور چلنا آسان نہیں رہتا۔ لیکن رام بھروسے پھر کیرے ہوگئے۔ فصل کا اناج اور دو آنے روز پر سوے دلدوں کے کھیت جوتنے لگے۔

ٹھاکر صاحب کی بہن کا لڑکا نائب تحصیلدار تھا وہ دوسرے ضلع سے تبدیل ہو کر نواب گنج کی تحصیل میں آگیا۔ نائب تحصیلدار کی میل ملاقات افسروں اہلکاروں سے تو ہوتی ہی۔ اب انھوں نے اپنے ماموں ٹھاکر بھوپ سنگھ کی بگڑی بات بنانی شروع کی تحصیلدار صاحب سے ملایا ڈپٹی صاحب کے سامنے پیش کرادی۔ داروغہ جی سے لحاظ ملاحظہ قائم ہو ہی گیا تھا۔ غرض کہ پھر ٹھاکر صاحب کا زور گاؤں میں بندھ گیا۔ نمبرداری مل گئی۔ نہر کا پانی ضلعدار صاحب کی مہربانی سے وقت پر ملنے لگ گیا۔ فصل اچھی ہوئی۔ چار پیسے ہاتھ میں آئے اور ٹھاکر صاحب کا گاؤں میں وہی رتبہ ہو گیا جو پہلے تھا۔ پھر رام بھروسے کاچھی ان کے کھیتوں پر کام کرنے لگ گیا۔ اور اب پھر وہ جب کبھی چلم کے لئے تمباکو مانگتا تو ٹھاکر صاحب پہلے کی طرح کہہ دیا کرتے کہ "ابے کاچھی کیوں اپنی ذات بھولتا ہے کیوں جوتے کھانے کی دل میں ہے"

پہلے تو رام بھروسے یہ ڈانٹ سن کر ڈر جایا کرتا تھا لیکن اب وہ کچھ مسکرا دیا کرتا ہے۔ اور جی ہی جی میں کہتا ہوا چلا جاتا ہے کہ "مانس کی کچھ نہیں یہ تو سب مایا کے کھیل ہیں۔"

کیفیات

وفورِ بیخودی میں بڑھ گیا ہوں سرحدِ دل سے
خیالِ دوست بھی آتا ہے اس منزل میں مشکل سے

نکلتی ہے تمنّا اس طرح ٹوٹے ہوئے دل سے
کہ جیسے شمع ہنگامِ سحر اٹھتی ہے محفل سے

وہ راحت ہے محیطِ عشق و طوفانِ حوادث میں
کہ دل ڈوبا سا جاتا ہے خیالِ قربِ ساحل سے

خوشا وہ دور جب دل تھا رہینِ رنجِ ناکامی
کہ اب تو زندگی ہے تلخ فکرِ برق و حاصل سے

مرے حق میں ہے تیرِ نیمکش بھی پرسشِ پنہاں
سمجھتا ہوں کہ وہ غافل نہیں ارمانِ بسمل سے

وہ خود بیں جو بہت نازاں تھا حسنِ دلربائی پر
اسے ہم اپنے دل میں کھینچ لائے جذبِ کامل سے

غمِ الفت کو دورِ زیست کا حاصل سمجھتے ہیں
یہاں تک اہلِ دل مسرور ہیں کیفیتِ دل سے

نہ پوچھو لذّتِ ذوقِ طلب راہِ محبت میں
دلِ دیوانہ مجھ کو دور ہی رکھتا ہے منزل سے

اٹھائیں گے کہاں تک زحمتِ دستِ جنوں وحشی
کہیں مضبوط ہے تارِ نفس طوق و سلاسل سے

دمِ نظارگیٔ حسن کس عالم میں پہنچے گا
وہ دیوانہ جو مجنوں ہو گیا ہو رنگِ محمل سے

تڑپنے بھی نہیں دیتی مری خوئے وفا مجھ کو
بہت جی گھٹ رہا ہے زحمتِ بازوئے قاتل سے

نشاطِ زیست کیسی؟ ہر نفس پر اب یہ عالم ہے
کوئی سر پھوڑتا ہو جس طرح دیوارِ حائل سے

جوابِ گرمجوشی سرد مہری ہی سہی کوکب
چراغِ کشتہ ہوں اب کیا کہوں یارانِ محفل سے

شاعرِ عظیم

ڈاکٹر جے. ٹی. سنڈرلینڈ انگریزی کے مشہور انشا پرداز اور صحافی ہیں کلکتہ کے مشہور رسالہ "ماڈرن ریویو" میں اکثر سیاسی مباحث پر ان کے بلند پایہ مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔
موصوف نے حال ہی میں ایک پارۂ ادبی عنوان بالا پر سپردِ قلم فرمایا ہے، جس میں ایک عقلمند فلسفی کی نظر سے "برگِ درختاں سبز" کو "معرفت کردگار کا دفتر" بنا کر دکھلانے کی کوشش کی ہے ایک مغربی ادیب کا یہ "عرفانی تخیل" خصوصاً اس دورِ مادیت میں قابلِ ستائش ہے ذیل میں اس کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے، جو امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

خدائے (عزّوجل)، شاعرِ عظیم ہے۔
کائنات اس کی نظموں کی غیر محدود کتاب ہے۔
فسانۂ ارتقاء اس کی پرشوکت اور حیرت انگیز رزمیہ نظم ہے۔
تواریخِ اقوام اس کے شاندار ڈرامے ہیں۔
طبقات الارض کے انکشافات یعنی چٹانوں کے بیان کئے ہوئے گذشتہ عہد قدیم کے قصے، اس کے مقدس مرثیے ہیں۔
پہاڑ خصوصاً عظیم الشان سر بفلک پہاڑوں کے سلسلے، اس کی بلند ترین نظمیں ہیں۔ بڑے بڑے تناور درخت اس کے مسبعات (SONNETS) ہیں۔
آفتاب کے طلوع اس کی حمد و ثنا کے قصائد، اور غروب اس کی عظمت، عبادت، اور پوجا کے پرسکون نغمے ہیں۔
ہواؤں کے قہقہے اور نالۂ و فریاد، گھنے جنگلوں اور صحراؤں میں اس کے غم اور مسرت کے

ترانے ہیں۔

سیکڑوں ریتیلے ساحلوں پر سمندر کی نرم آہیں اور سسکیاں اس کے نوحے ہیں۔ رعد و برق کے طوفان ہواؤں کے تیز رو سیلاب، گہرے کناروں اور پتھریلے ساحلوں پر بجرے پایاں کی امواج کا شور تلاطم اس کے پر سطوت گانے ہیں۔

آبشار اس کے قطعات ہیں۔

لہرانے والے چشمے اس کے بزمیہ اشعار ہیں۔

کنجوں میں چہچہانے والی چڑیاں اس کے دوہے ہیں۔

براعظموں اور سمندروں میں پرندوں کا حیرت انگیز سلسلۂ مسافرت (ہجرت) اس کی منظوم داستانیں ہیں۔

دنوں اور راتوں کا تغیر پذیر غیر منقطع، اور مخفی سلسلہ، اور موسموں کی مسلسل آمد و رفت، اس کے منظوم ناٹک اور بزمیہ ڈرامے ہیں۔

پھول، جو ہر جگہ زمین کو خوبصورت اور شاداب بناتے ہیں، اس کے سحر انگیز "نغمہائے بے الفاظ" ہیں۔

چشموں میں پانی کا ہنسنا اور لہریں لینا، چھپروں پر مینہ کی جھڑیوں کی بوچھاڑ؛

تتریوں اور شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ، اور فضا میں خوبصورت سپید پروں کی پھڑ پھڑاہٹ، جنھیں ہم برف کی قاشیں کہتے ہیں؛

چھوٹے پرندوں کا چہچہانا، جھینگروں کا شور مچانا، اور گڑھوں میں مینڈکوں کا ٹرانا۔

جگنوؤں کی آگ مچولی، پانی کی سطح پر بلبلوں کی درخشانی اور ستاروں کی جگمگاہٹ،

یہ سب اس کی "بچکانی نظمیں"، اس کے کنڈر گارٹن کے چھوٹے گیت، اور خوشدل بچوں کے لئے اس کی لوریاں ہیں۔

پہاڑیوں کے پوشیدہ گوشہ ہائے عزلت، اور گھنے جنگلوں کی خلوتیں ؛
چاند اور ستاروں سے مزین، رات کے وقت پرسکون آسمان کا منظر؛
پہاڑ کی چوٹیوں سے، کسی کے زیر قدم تمام دنیا کو سمیٹنے والے، وسیع نظارے، اور پراسرار سمند
کے کنارے، جہاں وسیع پانی لا متناہی آسمانوں سے ہم آغوش نظر آتا ہے، اور روح انسانی کی
وسعتوں کو ظاہر کرتا ہے ،

یہ سب اس کے خاموش نغمہ ہائے عبادت ہیں، جو ہمیشہ انسانوں کو روحانی امن اور سکون
اور زندگی کو شاندار بنانے والی اشیاء کے تصور کی دعوت دیتے ہیں۔

آپ کو اپنا نمبر خریداری یاد ہے؟

اگر یاد نہ ہو تو مہربانی فرما کر پتے کی چٹ پر لاحظہ کر لیجیے، خط وکتابت میں نمبر کے حوالہ سے
بڑی سہولت ہو جاتی ہے ورنہ بسا اوقات جواب دینا بھی مشکل ہو جاتا ہے براہ کرم اسے نہ بھولیے

مہتمم

نالۂ دلگداز کیفی بسال وصال والاجناب رئیس الاحرار
مولانا محمد علی مرحوم ۱۹۳۱ء ۱۳۴۹ھ

یہ تاریخ سیرت محمد علی میں شائع ہونے کے لئے آئی تھی مگر افسوس ہے کہ کتاب کے چھپ چکنے کے بعد پہنچی انشاءاللہ دوسرے ایڈیشن میں چھپ جائے گی۔ اس وقت ہم اسے ناظرین جامعہ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ د م ی

محمد باعلی باہم شہید ملک و ملت بود — بدنیا در ہزار و ہشت صد ہفتاد و شش آمد
پئے بہبودی اہل وطن ترک مناصب ساخت — پئے بہبود مسلم با حکومت پنجہ کش آمد
بزنداں اوفتاد۔ آزارہا برداشت غمہا خورد — مگر از پردلی اندر بلاہا شاد و خوش آمد
قوی شد بازوئے گاندھی بزور دست و بازویش — سپر انداز دست سلطنت از حمیتش آمد
ز ہندوستان بلندن شد پئے تاسیس آزادی — شبے کردہ تفکر تا صبح۔ رنجہ شد نفس آمد
رگ جاں درگسستہ اندراں حالت بجنت شد — دل عالم ز دست فرقتش در کشمکش آمد
چو فکر اتحاد عالم اسلام بے حد داشت — بہ تدفینش طلبہا از فلسطین و حبش آمد
بعلم و فضل و کانبیا[1] بود مصداقے — زہے مسجد اقصے ہماں اخیار فش آمد
بچہارم جنوری شد فوت پس از لرزہ رونے — بہ بالیں لحد آں مہر طینت با ہوش آمد
الٰہی دہ اماں پس ماندگانش را ازیں طوفاں — بہ گرداب است کشتی ناخدا در خواب خوش آمد

بگفت از بہر تاریخ وفاتش کیفی محزوں
بہ لندن مرد و در بیت المقدس مرقدش آمد
۱۹۳۱ء

---

[1] اشارہ بہ حدیث نبوی کی طرف علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل۔

جراثیم ملیریا کی تاریخ

سر رونالڈ روس کی وفات پر بعض اخبارات نے یہ بیان شائع کیا کہ ملیریا کے جراثیم سب سے پہلے ڈاکٹر رونالڈ روس نے دریافت کئے ہیں حالانکہ ان کا بیان حقیقت کے خلاف تھا کیونکہ اس کی دریافت تو ایک فرانسیسی ڈاکٹر لافران کی جد و جہد کا نتیجہ ہے جو ۱۸۸۰ء میں مکمل ہو چکی تھی۔ یہ ڈاکٹر فرانسیسی فوج متعینہ ٹونس الجزائر و مراکش کا طبیب تھا۔ فوج میں یہ مرض اکثر پھیلا رہتا تھا اس لئے اس نے اس پر توجہ کی اور اس کے اسباب دریافت کر کے چھوڑے۔

بہر حال اس جرثومہ کا انکشاف اخبارات کے اس بیان سے معرض اختلاف میں آگیا ورنہ یہ دونوں باتیں پہلے ہی سے معلوم تھیں۔ اور سر رونالڈ روس کی انکشاف کے متعلق مزید تحقیق یہ بھی تھی کہ انھوں نے جرثومہ ملیریا دریافت ضرور کیا تھا مگر وہ جرثومہ جو پرندوں میں ملیریا کا باعث ہوتا ہے نہ کہ انسانوں میں پرندوں کا ملیریائی جرثومہ انسانی ملیریائی جرثومہ سے مختلف ہوتا ہے مگر اختلاف واشتباہ کی بدولت ضرورت محسوس ہوئی کہ مسئلہ پر مزید تحقیق کی جائے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ بکٹیریا لوجی (علم جراثیم) کے ماہر خصوصی ڈاکٹر زکی خالد سے اس باب میں معلومات اخذ کی جائیں۔

چنانچہ آئندہ معلومات ڈاکٹر صاحب موصوف ہی کے رہین تحقیق ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے فرمایا کہ اس کی دریافت بھی عجیب و غریب دلچسپ کہانی سے کم نہیں ہے جس طرح پولیس اور سراغرسانی کے اخبار دلچسپی سے پڑھے اور سنے جاتے ہیں اس کی دریافت کی کیفیت بھی ایسی ہی دلچسپ ہے۔

تقریباً بیس سال سے متواتر مختلف اقوام کے ڈاکٹر اس کے تلاش میں سرگرداں تھے

اور ہر ایک نے اس کی کافی جانچ کی اور سب مختلف وقتوں اور مختلف مقامات پر تقریباً صحیح نتیجے پر پہنچے جو جو تکالیف اور مصائب انھوں نے ان دریافتوں میں اٹھائے ان کو ہم بخوف طوالت نظر انداز کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے یورپ، ایشیا، افریقہ ہر سہ براعظموں میں گشت لگائی ملیریا کے اسباب کو دریافت کیا اکثر مواقع پر موت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ گروہ اپنے اہل وعیال وطن و دوست واحباب سے دور علم کے شوق اور اس کی تحقیقات میں مصروف جنگلوں اور ایسے میدانوں میں جہاں ملیریا کثرت سے ہوتا ہے سفر کر رہا تھا۔ ان علماء میں مختلف اقوام کے لوگ شامل تھے جن میں انگریز فرانسیسی اور اطالوی سب تھے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ یہ مختلف اقوام اور مختلف الخیال علماء تھے لیکن طرز تحقیق سب کا ایک ہی تھا۔ میری رائے میں یہ حقیقی ہیرو تھے اور علم پر اور انسان پر ان کے کارناموں اور ان کی تحقیقات کا بہت بڑا احسان ہے۔ ان کی زندگی اور ان کے کارنامے ہمیشہ ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ آئندہ آنے والی بہادر قومیں ان کے نقش قدم کی پیروی کریں گی۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے دنیا اور اس کی جملہ دلچسپیوں کو چھوڑ کر تنہا جنگلوں کو اختیار کیا اور معلومات حاصل کی ان کی معلومات جب تک دنیا کو فائدہ پہنچاتی رہے گی ان کی کوششیں مشکور ہوتی رہیں گی۔ سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔

۱۸۸۰ء میں نوجوان ڈاکٹر لافیران (فرانس) نے خوردبین کے ذریعہ سے ملیریا کے مریضوں کے خون کا معاینہ کیا۔ یہ مریض الجزائر میں تھے اور یہ ڈاکٹر وہاں متعین تھا۔ ڈاکٹر نے خون کے سرخ ذرات میں نہایت چھوٹے جراثیم محسوس کئے۔

پانچ سال بعد ڈاکٹر گولگی نے یہ معلومات حاصل کی کہ یہ جراثیم مختلف قسم کے ہوتے ہیں اور خون کے ذرات سے نکل کر جسم پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کے نتائج اور اثرات بھی مختلف ہوتے ہیں یہ نکلنے

کھڑے ہونے اور لرزہ آنے کا سبب بھی اس نے بیان کیا اور یہ بتایا کہ عموماً مغرب کے وقت ہی ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کوخ گولگی اور سیلی کی متفقہ یہ رائے ہوئی کہ ملیریا کی متعدد قسمیں ہیں اور ہر قسم کے ملیریا کا تعلق اسی قسم کے جراثیم سے ہے یعنی جس طرح جراثیم مختلف النوع ہیں اسی طرح ملیریا بھی مختلف النوع ہے۔ اس جگہ سے جراثیم ملیریا کی بحث شروع ہو گئی۔ اور تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ قسمیں سب ہمارے ہی خون میں پرورش پاتی ہیں۔ اور پھر ہم کو ہی فنا کرتے ہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمارے سرخ ذرات خون سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں اور توالد و تناسل کے سلسلہ سے بڑھتے ہیں۔ جب کثرت ہو جاتی ہے تو نظام صحت کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔ جب ہم ملیریا میں مبتلا ہوتے ہیں تو ہمارے خون کے لاکھوں ذرات فنا ہو جاتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ملیریا کے مریض فقر الدم یعنی قلت خون کا شکار ہوتے ہیں۔ اب ایک سوال یہ ہے کہ یہ جراثیم کہاں سے آتے اور کہاں پیدا ہوتے اور کس طرح ایک سے دوسرے میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب ملیریا کا سبب دریافت ہو گیا تو پھر مفکرین نے اس مسئلہ پر غور کیا کہ مریض سے تندرست جسم تک یہ مرض کس طرح منتقل ہوتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر لا فیران (فرانس) اور ڈاکٹر کنگ (انگلستان) نے خیال کیا کہ مچھر کے ذریعہ سے یہ جراثیم مریض سے تندرست جسم میں منتقل ہوتے ہیں اور تندرست کو مریض بنا دیتے ہیں۔ لیکن ابھی یہ خیال تحقیق کا مرتبہ نہ حاصل کر سکا تھا۔

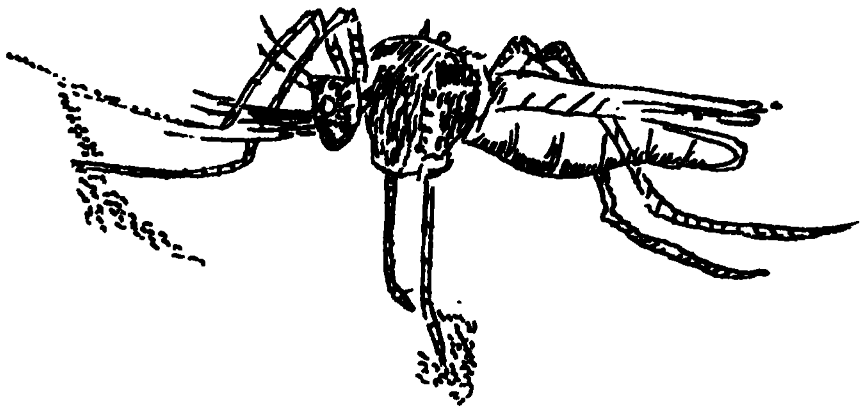
سرپے ٹرکیپ نے رائے قائم کی کہ یہ جراثیم مچھر کے معدے میں اتر جاتے ہیں اور پھر جسم انسان میں اس کے معدہ سے منتقل ہوتے ہیں۔ اپنا دور حیات مچھر کے جسم میں پورا کرتے بڑھتے رہتے ہیں اور پھر جسم انسانی میں مچھر کے ذریعہ سے جب وہ انسان کو کاٹتا ہے۔ منتقل ہو جاتے ہیں اس نظریہ کے مطابق جراثیم ملیریا کی زندگی کے دو دور تسلیم کئے جاتے ہیں پہلا دور جب کہ وہ مچھر کے معدے میں ہوتے ہیں دوسرا دور جب کہ وہ انسان کے جسم میں ہوں۔ جب انسان کے جسم میں ہوتے ہیں تو خون کے سرخ ذرات میں بڑھتے رہتے ہیں۔ مچھر کے جسم میں جب ہوتے ہیں تو اس کے معدے میں نشو و نما پاتے ہیں۔ اس نظریہ پر بہت سے دلائل دیئے گئے ہیں اور ان دلائل کو

معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظریہ بالکل درست اور قابل تسلیم ہے۔

ڈاکٹر روس نے ان نظریوں اور تحقیقاتوں کے بعد ثابت کیا کہ جراثیم ملیریا جو پرندوں پر اثر انداز ہوتے ہیں وہ بھی مچھر کے ہی معدے میں پرورش پاتے اور ترقی کرتے ہیں ان کی زندگی کے بھی دو دور ہیں پہلا دور جب کہ مچھر کے معدے میں ہوں دوسرا دور جب کہ پرندے کے خون کے اجزا سے اپنی غذا حاصل کریں۔

جس مچھر کے معدے میں یہ جراثیم پرورش پاتے اور زندہ رہتے ہیں اس کی شکل دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ایک سونڈ مثل ہاتھی کی سونڈ کے ہوتی ہے جس میں وہ جراثیم ہوتے ہیں جو تعدیہ سے پہلے پرندوں کے خون میں پائے جانے والے جراثیم کے مشابہ ہوتے ہیں یہ ہے وہ تحقیقات جو ڈاکٹر رونالڈ روس نے کی تھی۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم غلط بحث کر کے انسانی جراثیم ملیریا کا مکتشف ڈاکٹر رونالڈ روس کو نہ مان لیں اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر موصوف نے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ مریض سے تندرست تک ملیریا کا تعدیہ مچھر کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اس لئے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آئندہ تحقیقات کے لئے ایک بڑا راستہ پیدا کر دیا اور ملیریا کے اسباب تعدیہ پر بحث کرنے کی بہت سی سہولتیں پیدا کر دیں جس حد تک پرندوں کا تعلق ہے ۱۸۹۵ء میں ملیریائی جراثیم کا اکتشاف مکمل ہو چکا تھا مگر انسان میں ملیریا کی پیدائش اور تعدیہ کے اسباب معلوم کرنے کا سہرا دو اٹالین علماء گراسی اور بنامی کے سر تھا۔ انھوں نے ثابت کیا کہ تعدیہ انافلس مچھر کے ذریعے سے ہوتا ہے اس حقیقت کی توضیح کی کہ ملیریا کے جراثیم اپنی زندگی کے دونوں دور مچھر کے معدے اور انسان کے خون میں کس طرح پورے کرتے ہیں یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے۔ یورپ میں اٹلی ہی وہ جگہ ہے جہاں ملیریا پھیلانے والے مچھر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

مچھر جس کے جسم میں ملیریا کے جراثیم موجود ہیں





جراثیم ملیریا مچھر کے معدے میں اڑ رہے ہیں

تجربہ ہی سب سے بڑی دلیل ہے۔ تجربے اور مشاہدات ہی سے ہم کسی نظریہ کی کامل تصدیق کرسکتے ہیں یا انکار کرتے ہیں۔ دو انگریز علما نے اس طرف توجہ کی وہ اٹلی سے لندن ایسے مچھر لائے جن کے معدوں میں ملیریا کے جراثیم پرورش پا رہے تھے لندن میں جہاں ملیریا کا نام بھی نہ تھا چند تندرست اشخاص کو ان مچھروں سے کٹوایا۔ جب مدت معینہ گذر گئی ان اشخاص پر ملیریا کا اثر ہوا اور بیمار ہو گئے جب ان کے خون کا معائنہ کیا گیا تو ملیریا کے جراثیم پائے گئے۔ اس تحقیقات کے بعد اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ ملیریا جراثیم کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے اور یہ جراثیم مچھروں کے ذریعہ سے ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوتے ہیں! انسان نے کامل ایک چوتھائی صدی اس کی تحقیقات میں گذاردی آخر وہ گوہر مقصود حاصل کرسکا۔ باوجود اس مشاہداتی تصدیق کے غافل انسان اس پر یقین نہیں رکھتا اور بہت لوگ تو اس کو جانتے بھی نہیں کہ یہ کیا ہے اور کیوں ہوتا ہے ڈاکٹر زکی خالد کی رائے حاصل کرنے کے بعد دوسرے مشہور ماہر فن ڈاکٹروں سے ملیریا سے بچنے کے طریقے معلوم کئے گئے چنانچہ ڈاکٹر حسنین کی رائے حسب ذیل ہے۔

مچھر سے امراض ذیل کا تعدیہ ہوتا ہے۔

۱۔ ملیریا۔
۲۔ ڈینگو فیور
۳۔ فیل پا (انسان کی پنڈلی اس قدر موٹی ہوتی ہے جیسے ہاتھی کی) ۴۔ زرد بخار

اس کے تعدیہ سے محفوظ رہنے کے حسب ذیل طریقے ہیں۔

۱۔ جہاں تک ہوسکے اس مچھر کو اپنے گھر میں آنے نہ دو ایسے مقامات کو صاف رکھو جہاں عموماً اس کی سکونت رہے اور اس کو پناہ مل سکے۔

۲ جہاں تک ہوسکے مچھر دانی میں سویا کرو اور اس کے کنارے بستر کے نیچے دبے ہوں تاکہ مچھر کسی طرح بھی ان میں داخل نہ ہوسکے۔

۳۔ مچھروں کو جو تمہارے گھر میں ہیں بالکل فنا کر ڈالو۔

۴۔ جہاں تک ہو سکے گھر میں گندہ پانی جمع نہ ہونے دو موری اور نالیاں ہفتہ میں کم سے کم ایک مرتبہ صاف کی جایا کریں پانی اور پانی کے برتن ہمیشہ صاف رہیں اور جہاں مچھر پیدا ہوتے ہوں وہ جگہ عموماً نم دار ہوتی ہے وہاں صفائی کی طرف خاص توجہ رکھی جائے اور ایسی دوائیں چھڑکی جائیں جو مچھر کو فنا کر دیتی ہیں۔

۵۔ اگر مچھر سے کسی طرح بھی حفاظت ممکن نہ ہو تو پھر کونین کو استعمال کرنا چاہیئے۔ ایک یا دو خوراک ڈاکٹر کے مشورے سے ضرور استعمال کرتے رہنا چاہیئے۔

اگر کوئی شخص ملیریا میں مبتلا ہو جائے تو حسب ذیل ہدایات پر عمل کرنا چاہیئے

۱۔ فوراً ڈاکٹر یا طبیب سے رجوع کریں۔

۲۔ شفاء کامل کے بعد بھی تین ماہ تک کونین کا استعمال جاری رکھنا چاہیئے۔

۳۔ ایسے اشخاص کو جن پر مرض کا ایک دفعہ حملہ ہو چکا ہے دوسرے مریض اشخاص سے دور ہی رکھا جائے تاکہ وہ دوبارہ پھر اس کی زد میں نہ آئیں۔

امید ہے کہ ہمارا مضمون لوگوں کو ملیریا سے محفوظ رکھنے کے لئے اگر وہ ان ہدایات پر عمل پیرا ہوئے تو ضرور مفید ہوگا۔

دل کی آواز [1]

دل کی آواز ہے یہ درد کی فریاد نہیں — جگرؔ

سخت حیرت ہے یہ کس بزم میں آیا ہوں میں — اہل محفل کو بڑے غور سے تکتا ہوں میں
ایک صورت نظر آتی نہیں دیکھی بھالی — کون سے لوگ ہیں یہ جن میں کہ تنہا ہوں میں
بیکسی پر مری روتی ہے مری تنہائی — صفت شمع جب اس بزم میں جلتا ہوں میں
آہ دنیا! تری وسعت میں یہ کیا ہے کہ کوئی — نہ تو میرا ہے شناسا نہ کسی کا ہوں میں
ہم زباں ہے نہ کوئی اور نہ کوئی ہمراز — داستاں اپنی ہواؤں کو سناتا ہوں میں
پھینک دیتا ہوں فضاؤں میں ندائیں دل کی — اپنا دمساز کسی کو نہیں پاتا ہوں میں
کوئی دل سوز نہیں دہر میں اس دل کے سوا — اور اس دل سے بھی کم بخت بھڑکتا ہوں میں
برق کی لہر سی ہے ہر رگ و پے میں ساری — ہمہ تن نبض کے مانند تڑپتا ہوں میں
کچھ عجب حال ہے آشفتہ مزاجی کا مری — کبھی رو دیتا ہوں میں اور کبھی ہنستا ہوں میں
دل دھڑکتا ہے تو کانوں میں یہ آتی ہے صدا — رحم اے شدت احساس کہ پھٹتا ہوں میں
روح گھٹتی ہے جو اس تنگ قفس میں میری — صفت مرغ گرفتار پھڑکتا ہوں میں
سانس لیتا ہوں تو منہ سے نکلتا ہے دھواں — کون سی آگ ہے یہ جس میں کہ جلتا ہوں میں
کبھی تسکیں کے لئے ہے گل و گلشن کی تلاش — کبھی وحشت میں سوئے دشت بھٹکتا ہوں میں

---

[1] اس نظم کے قوافی کی نسبت اہل فن سے یہ عرض ہے کہ میں نے جان بوجھ کر اس غلطی کو جائز رکھا ہے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو اپنے ضمیر سے شرمندہ ہوتا۔ کیا غالب کا یہ شعر یاد دلانے کی ضرورت ہے۔

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے — نالہ پابند نے نہیں ہے۔

کوئی دیکھے مری اس وقت کی شوریدہ سری
در و دیوار سے جب سر کو پٹکتا ہوں میں

دلِ آگاہ بھی کیا چیز ہے اللہ! اللہ!
جب کلی کوئی چٹکتی ہے دہلتا ہوں میں

کون سی آگ ہے یارب نہ جلایا جس نے
روز و شب گو کہ اسی آگ میں جلتا ہوں میں

راکھ کر دی تپشِ عشق نے ساری ہستی
ایک شعلہ کی طرح پھر بھی بھڑکتا ہوں میں

کسی کروٹ کسی پہلو نہیں آرام مجھے
کون سا درد ہے یہ جس سے تڑپتا ہوں میں

چین آتا نہیں اک دم بھی جو دل کو یارب
کس کو اس پاپ کی بستی میں کھٹکتا ہوں میں

وہی بیزار ہیں اس دہر میں میرے دم سے
جن پہ دم دیتا ہوں جان چھڑکتا ہوں میں

چمنِ دہر کے ہر پھول کو چاہا، لیکن
وائے افسوس محبت کو ترستا ہوں میں

پھول پھر پھول ہیں کانٹوں کو بھی چوما میں نے
سب کی آنکھوں میں مگر پھر بھی کھٹکتا ہوں میں

میں کہ فطرت مری خود گل سے بھی نازک تر ہے
مجھ کو حیرت ہے کہ خاروں سے الجھتا ہوں میں

چھینٹ سے جس کی نجس ہو مرا ظرفِ عالی
ایسے پانی میں شب و روز نہاتا ہوں میں

کوئی دم ساز و ہم آہنگ و ہم آواز نہیں
کیوں نہ سر پھوڑ کے مر جاؤں کہ تنہا ہوں میں

آہ آؤں گا ترے دم میں نہ اب اے دنیا
مکر اور فن کو ترے خوب سمجھتا ہوں میں

اوپری دل سے مجھے چاہنے والے لوگو
پیار کہتے ہیں کسے اس کو سمجھتا ہوں میں

ظاہری آنکھ سے اے دیکھنے والو مجھ کو
کہتے ہو قطرۂ ناچیز ہوں، دریا ہوں میں

دیکھ لو غور سے مجھ کو کہ نہ پھر دیکھو گے
قطرۂ اشک تپتا ہوں، ڈھلکتا ہوں میں

میں نہ جانوں گا تمھیں کوئی نہ سمجھے گا مجھے
اپنی شوریدگیِ طبع میں یکتا ہوں میں

یوں نہ مایوس ہو تو اے دلِ شوریدہ مزاج
تیری اس شعلہ نوائی کو سمجھتا ہوں میں

کچھ دنوں صبر ابھی کر مرے پیارے وحشی
تیری محرومیِ تقدیر پہ کڑھتا ہوں میں

روح رہنے کی نہیں قالبِ خاکی میں جلیلؔ
توڑ کر اس کو نکل جائے گی کہتا ہوں میں!

تنقید و تبصرہ

کتب

طلسم زندگی ۔ نقوش مانی ۔ کلید عربی ۔ تعلیم زدہ بیوی ۔ تخت طاؤس ۔ پیغام رمضان

سرمایہ صحت ۔ آمن سی نقلی ۔ موازنہ صلیب و ہلال

طلسم زندگی از میاں بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لاء مدیر ہمایوں۔ مصور۔ تقطیع بڑی، حجم ۳۰۰ صفحے، لکھائی چھپائی عمدہ، کاغذ نہایت نفیس، جلد کپڑے کی جس پر خوشنما سنہری بیل بوٹے بنے ہیں۔ قیمت پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ: سید عبد اللطیف منیجر رسالہ ہمایوں، نمبر ۲۳ لارنس روڈ، لاہور۔

اردو دانوں میں کون ایسا ہوگا جو میاں بشیر احمد صاحب کے نام سے واقف نہ ہو۔ آپ ان معدودے چند لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی اردو ادب کی خدمت کے لئے وقف کر دی ہے۔ آپ ہی جیسے حضرات کی کوشش سے پنجاب میں اردو کو وہ فروغ حاصل ہوا ہے جو اسے کسی اور صوبے میں یہاں تک کہ صوبۂ متحدہ میں بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ آپ کا رسالہ ہمایوں برسوں سے زبان و ادب اردو کی اشاعت و ترقی کی سعی میں سرگرم ہے اور علاوہ اور خوبیوں کے اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ رسائل و اخبارات میں جو تو تو میں میں آئے دن ہوا کرتی ہے اس سے کوسوں دور رہتا ہے اور خاموشی سے اپنا کام کرتا رہتا ہے۔

"طلسم زندگی" میاں صاحب کے مختصر ادبی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے بعض رسالۂ ہمایوں میں شائع ہو چکے ہیں مگر اب ترمیم و تغیر کے بعد بالکل بدل گئے ہیں بعض بلکہ ایسے ہیں جو اس سے پہلے کہیں شائع نہیں ہوئے تھے۔ یہ مضمون چھ حصوں میں حسب ذیل عنوانات کے ماتحت مرتب کئے گئے ہیں۔

مناظر، صدائے روح، آئینۂ دل، جدوجہد، سرگوشیاں، خیالات پریشاں۔

ہر حصے کا سرورق نہایت خوشنما زنگارنگ نقش و نگار سے آراستہ ہے۔ مضامین کی تشریح گیارہ خوشنما تصاویر (جن میں سے بعض رنگین بھی ہیں) اور ایک کارٹون سے کی گئی ہے۔ میاں صاحب کے اسلوب بیان کی ندرت، بے ساختگی اور شگفتگی سے شائقین ادب ہمایوں کے ذریعے سے خوب واقف ہیں۔ اتنا کہہ دینا

کافی ہے کہ موجودہ مجموعے کے بیشتر مضامین میں یہ صفات پوری طرح موجود ہیں اور جا بجا ایک لطیف ظرافت نے اور لطف پیدا کر دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب وہ مقبولیت حاصل کرے گی جس کی وہ مستحق ہے۔

نقوشِ مانی | مجموعہ کلام جناب سید کلب احمد صاحب مانی جائسی۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۴۶ صفحے، لکھائی چھپائی پاکیزہ، کاغذ عمدہ، قیمت مع محصول ڈاک عہ۔ ملنے کا پتہ درج نہیں غالباً دفتر رسالہ تسنیم آگرہ ہوگا۔

حضرت مانی جائسی شعرائے عصر میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ یوں تو آپ کی مشقِ سخن کوئی چھتیس برس سے جاری ہے مگر بیس برس سے آپ کا کلام اردو کے ممتاز رسالوں اور خاص خاص مشاعروں کے ذریعے جوہر شناسانِ شعر سے خراجِ تحسین وصول کر رہا ہے۔ مگر ایک تو اس وجہ سے کہ آپ کم کہتے ہیں اور کم سناتے ہیں دوسرے اس وجہ سے کہ آپ کے کلام میں اردو روزمرہ کے ساتھ فارسی ترکیبیں کثرت سے ہوتی ہیں اور آپ کی طبیعت نے پامال مضامین کو چھوڑ کر معنی آفرینی کی راہ اختیار کی ہے آپ کی شہرت خواص تک محدود ہے۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ آپ کے کلام کا مجموعہ شائع ہو گیا اور باغِ سخن کے گل چینوں کو وہ پھول جن کی خوشبو سے وہ ایک ایک کر کے لطف اٹھا چکے تھے ایک گلدستے کی شکل میں مرتب ہو کر پہنچ گئے۔ ہم اس مجموعے پر اپنی طرف سے تنقید کرنے کی جگہ کچھ منتخب اشعار نقل کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والے خود ہی کلام کی خوبیوں کا اندازہ کر لیں۔

ایک نظم "فلسفۂ عشق" کے پہلے دو شعر ہیں۔

ہے عشق اک سودائے سر یا کاہشِ روح و رواں — یا لذتِ دردِ جگر یا حسرتِ آرامِ جاں
مجموعۂ آلام ہے، سوزِ دلِ ناکام ہے — یا موت کا پیغام ہے یا ہے بلائے جاں ستاں

"کارنامۂ حسن" کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔ اس نظم میں شاعر نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ حسن اپنا کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا جس چیز پر عشق کی نظر پڑ جائے وہی حسن بن جاتی ہے۔

یہ حسن یہ اک روشن لَو ہے نظارہ سوز و پرضو ہے — مگر اس کا نور اک پرتو ہے یعنی روشن بالذات نہیں
ہاں جس سے ہے روشن نام اس کا جس سے ہے یہ شہرۂ عام اس کا — یوں جس سے بڑھا اکرام اس کا وہ عشق ہے اور اس کا آئیں

بعض نظموں کے عنوانات یہ ہیں: رازِ بقا، سوگوارِ آرزو، پیامِ بہار، دیارِ دوست، کش مکشِ امید، فریبِ وفا، آہِ نارسا، خاکسترِ مشتعل۔

مناظرۂ حسن و عشق بڑے معرکے کی نظم ہے۔ اس میں وہی "اضافیتِ حسن" کی بحث ہے مگر خشک

منطقی انداز میں نہیں بلکہ دلکش اور دلنشیں شاعرانہ رنگ میں۔

غزلوں کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

خامشی چھا رہی ہے شیوہ پیکر تصویر کا — یعنی کیا کہنا کسی کی شوخیٔ تحریر کا

اثر دل دوز جو ان کی نگاہ اولیں میں تھا — الٰہی منتقل ہو جائے اب وہ میرے آنسو میں

یہ میں نے کب کہا تھا آپ کے ابرو نہیں قاتل — مجھے کچھ شک اگر تھا بھی تو دست نازنیں پر تھا

گلہ بے جا بھی کرتا ہوں کہ اس جلوے کا شائق ہوں — ندامت سے جو اک دن آپ کے روئے حسیں پر تھا

عمر تو صرف ہو چکی قید قفس میں باغباں — چھوڑ دے اب کہ مر رہوں ایک بہار دیکھ کر

پس نگاہ تم نے پہنچایا پیام دلبری — کچھ دہان تنگ سے ان کو بھی فرمانے تو دو

کانٹے ہی کانٹے بچھیں بستر پہ مانی تو سہی — آرزو کا ایک کانٹا دل میں چبھ جانے تو دو

زندگی سے موت تک ہے فاصلہ اک سانس کا — پھر بھی کیا معلوم کتنی دور ہیں منزل سے ہم

آہ بن جاتی ہے نشیمن سوز — برق جب جلوہ گر نہیں ہوتی

وہ ابھی ڈرتے ہیں ذکر نالۂ شبگیر سے — کیونکہ ناواقف ہیں ضبط آہ کی تاثیر سے

کچھ نہیں ماجرائے طور و کلیم — دل تھا یارائے دید لا نہ سکا

یاد بھی تو نے مجھ کی میری　　میں ترا بھولنا بھلا نہ سکا

بندہ آئینۂ خدائی ہے　　سجدہ شان جبیں مٹا نہ سکا

کلید عربی پہلا حصہ | از جناب خلیل احمد صاحب لکھنوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۰ صفحات، طباعت و کتابت اور کاغذ معمولی، قیمت ۲ر ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی یا دفتر رسالہ مپشوا دہلی۔

جناب مولانا قاری خلیل احمد صاحب بچوں کو عربی زبان کی تعلیم کے لئے جدید اصول پر چھوٹی چھوٹی ریڈروں کا ایک سلسلہ لکھ رہے ہیں۔ یہ اس کا پہلا حصہ ہے۔ اس میں آسان اور مفرد جملوں کی مشق کرائی ہے۔ آخر میں عربی افعال کی گردان کا ایک نقشہ بھی دے دیا ہے۔ امید ہے کہ یہ سلسلہ بچوں کے لئے مفید ہوگا۔

تعلیم زدہ بیوی | از جناب فضل حق قریشی دہلوی، تقطیع جیبی، ضخامت ۵۰ صفحات، کتابت وطباعت اور کاغذ متوسط، قیمت ۴ر ملنے کا پتہ: ساقی بک ڈپو، دہلی۔

یہ ایک مزاحیہ ڈراما ہے اور اس کا مقصد عورتوں کی غلط تعلیم و تربیت کے نتائج سے آگاہ کرنا ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ عورت میں محض غلط تعلیم و تربیت کے اثر سے کیسی اخلاقی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ وہ اپنے مڈل فیل شوہر سے کیا نامناسب برتاؤ کرتی ہے اور آزادی و تفوق کے زعم باطل میں کیا کیا گل کھلاتی ہے۔ آخر ایک اچانک حادثہ اس کی آنکھیں کھول دیتا ہے۔ تمام پچھلی باتیں سراب معلوم ہوتی ہیں اور وہ اپنے مڈل فیل میاں کے قدموں پر گر کر معافی مانگتی ہے۔ ڈراما اپنے مقصد میں کامیاب ہے اور کچھ دن ہوئے روشن تھیٹر دہلی میں کامیابی کے ساتھ اسٹیج بھی کیا جا چکا ہے۔

تخت طاؤس | از جناب مولوی محمد عبداللطیف خاں صاحب کشتہ قادری امرتسری فاضل ڈاکٹر زبان پرشین) بی۔ ایل۔ ای مؤلف "حیات عزیز"، ضخامت ۱۴۰ صفحات، کتابت و طباعت اور کاغذ اچھا تقطیع بڑی قیمت عہ۔ غالباً مؤلف سے مین پوری کے پتے پر مل سکے گی۔

اس کتاب میں جناب مولوی عبداللطیف صاحب کشتہ نے مشہور تخت طاؤس کے متعلق تاریخی

حالات جمع کر دیے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے بہت سے یورپین مورخین کے بیانات کی تردید کی اور بہت سی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے اور بقول جناب تبصرہ نگار بہت سے تاریخی انکشافات کئے ہیں۔

کتاب کے شروع میں ۱۰ صفحات میں جناب ظہیر الدین صاحب علوی وکیل نے تبصرہ و تعارف لکھا ہے جس میں بجائے کتاب پر تبصرے کے جو ایک تبصرہ نگار کا اصلی مقصد ہونا چاہئے زیادہ تر جناب مصنف کے حالات پر نہایت عقیدت مندانہ لہجے میں بحث کی گئی ہے۔ پھر خود جناب مصنف کا مقدمہ ہے جو ۱۶ صفحات کو محیط ہے۔ اس میں انھوں نے اس تصنیف کی وجوہ لکھی ہیں۔ مغلیہ عہد کی تمدنی ترقیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ کوہ نور ہیرے کے متعلق بعض مغربی مصنفوں کے بیانات کی تنقید کی ہے اور اس کتاب کے لئے مواد فراہم کرنے میں جو دقتیں پیش آئی ہیں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد تقریباً آٹھ صفحات میں کتب حوالہ کی فہرست ہے۔ اب اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ اس میں مختصر سی تمہید کے بعد شاہ جہاں کے مختصر حالات ہیں۔ پھر تخت طاؤس کے متعلق حالات و تاریخی انکشافات ہیں۔ اس سلسلے میں بھی بعض غیر ضروری چیزیں بیچ بیچ میں آگئی ہیں۔ کتاب میں سب سے زیادہ اہم چیز اس کے ذیلی حواشی ہیں۔ مصنف نے اس میں دل کھول کر اپنی محنت اور وقت صرف کیا ہے۔ اکثر مقامات پر ایک ایک نوٹ تین تین صفحوں میں سمایا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جناب کشتہ نے اس سلسلے میں بہت مفید معلومات یکجا کر دی ہیں اگرچہ بعض مقامات پر یہ حاشیے اصل کتاب کے لئے کچھ زیادہ مفید نہیں ہیں اور ایک دو سطروں میں کام چل سکتا تھا۔ بہرحال اصل کتاب تقریباً ۳۰، ۴۰ صفحوں میں آئی ہے اور باقی صفحات تبصرہ، مقدمہ اور ذیلی حواشی کی نذر ہو گئے ہیں۔ تاہم جناب کشتہ کی کوششیں قابلِ قدر ہیں اور امید ہے کہ تاریخ کے طالب علم اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ کتاب میں تخت طاؤس کی دو تین تصویریں بھی ہیں۔ جلد بھی خوبصورت ہے۔

پیغام رمضان | از جناب عبد المجید قریشی۔ ضخامت ۴۴ صفحات تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، کتابت و طباعت اور کاغذ متوسط، قیمت ۳؍۔ ملنے کا پتہ: دفتر اخبار ایمان، پٹی ضلع لاہور۔

جناب مؤلف اس کتاب کا مقصد دیباچے میں خود ہی تحریر فرماتے ہیں:

"میں نے اس رسالے میں صوم رمضان کی علمی، اقتصادی، تنظیمی اور سیاسی حیثیت ایک زندہ اور عملی تحریک ایک نظام عمل اور ایک قرار داد قانون کے طور پر واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور بتایا ہے

کہ مسلمان رمضان کو اپنی زندگی کے عملی پروگرام کے ساتھ جوڑ کر اس قدر عظیم اور بے مثال عملی فوائد حاصل کر سکتے ہیں، جو کسی تبلیغی، تنظیمی، سیاسی اور اصلاحی پروگرام سے حاصل نہیں ہو سکتے۔"

رمضان شریف کے فضائل و احکام کے سلسلے میں اردو میں بہت سے رسالے اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں مگر ہمارا خیال ہے کہ "پیغام رمضان" ان سب سے الگ اور نہایت مفید و کارآمد کتاب ہے۔ زبان صاف اور طرزِ بیان دلچسپ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہر مسلمان اس رسالے کو خرید کر سرمۂ بصیرت بنائے گا۔ آخر میں جناب قریشی نے اپنے اس ارادے کا اعلان کیا ہے کہ آئندہ سے تحریک سیرۃ النبی کے ساتھ ساتھ تحریکِ رمضان و قرآن کے لئے جدوجہد کا بھی آغاز کیا جائے گا۔ خدا انھیں اور سیرت کمیٹی کو اپنے اس ارادے میں کامیاب کرے۔

سرمایۂ صحت | از حکیم مولوی حافظ یوسف حسن خاں سوری، ضخامت ۲۵ صفحے، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶۔ کتابت و طباعت متوسط، کاغذ معمولی، قیمت ۴ر۔ ملنے کا پتہ: بابو محمد الیاس خاں صاحب سوری مکان مولوی یوسف حسن خاں سوری بہار شریف، بابو وجاہت حسین خاں صاحب محلہ سرار پور گیا۔

اردو زبان میں اب تک صحت و تندرستی کے موضوع پر کوئی ایسی کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہو۔ جناب حکیم مولوی یوسف حسن خاں صاحب نے یہ مختصر سا رسالہ لکھ کر ایک بڑی کمی کو پورا کیا ہے۔ رسالے کی زبان نہایت آسان اور بچوں کے لئے مناسب ہے۔ امید ہے کہ یہ رسالہ عام مقبولیت حاصل کرے گا۔

آمدن سی نقطی | از جناب ابوالمحاسن متین، ضخامت ۴۰ صفحات، کتابت و طباعت اور کاغذ معمولی، قیمت ۲ر۔ ملنے کا پتہ: جناب غلام دستگیر صاحب تاجر کتب چارکمان حیدرآباد۔

جناب ابوالمحاسن متین صاحب نے آمدنامہ فارسی کو نئی ترتیب اور جدید طرز پر لکھا ہے۔ علاوہ اس کے شروع میں طریقۂ تدریس کے متعلق کچھ ہدایات لکھی ہیں اور کتاب کے آخر میں صرف و نحو کے مختصر سے قواعد بھی تحریر کئے ہیں۔

موازنۂ صلیب و ہلال | از جناب نکہت شاہجہاں پوری بی۔ اے آنرز۔ حجم ۲۳۶ صفحات، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶،

کتابت وطباعت متوسط کاغذ دبیز، قیمت عہ/، ملنے کا پتہ صدیق بک ڈپو لکھنؤ یا الناظر بک ایجنسی لکھنؤ۔

جناب نکہت نے اس کتاب میں موجودہ مغربی یا عیسائی تمدن سے مسلمانوں کی گذشتہ ترقیوں کا تقابل کیا ہے۔ آج کل کے مغرب زدہ نوجوان یورپ کی تمدنی ترقیوں سے مسحور ہیں اور اس امر سے بڑی حد تک ناواقف ہیں کہ ان کے اسلاف نے بھی کچھ نہ کچھ کارنامے انجام دیئے ہیں اور موجودہ ترقیوں کی اساس انھیں کی تمدنی کوششیں ہیں۔

شروع میں جناب مؤلف نے آٹھ صفحوں میں فہرست مطالب کے عنوان سے مضامین کی فہرست دی ہے۔ پھر ان کی تصویر اور "خطاب بانوجوانان ملت" کے عنوان سے ایک فارسی نظم ہے۔ اس کے بعد مقدمہ ہے اور پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ کتاب مختلف ابواب میں منقسم ہے۔ موٹی موٹی سرخیاں یہ ہیں: سرگذشت صلیب وہلال، اسلامی عظمت وجلال، معمورۂ حسن وعشق، موسیقی اور اسلام، یورپ کی ادبی روح اور اسلام، اسلامی علوم وفنون، اسلامی سائنس وطب یورپ میں، اسلام کی تجارت اور یورپ کی تمدنی تربیت، مصوری اور اسلام، اسلام اور تربیت یہود۔ پہلے باب میں انھوں نے دکھایا ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں یورپ جہالت و وحشت کی گمراہیوں میں مبتلا تھا اور اس کے مقابلے میں اندلس کے مسلمانوں کی ترقی نصف النہار پر تھی اور یورپ میں اسی راہ سے تہذیب وتمدن کی کرنیں پہنچیں۔ دوسرے اور تیسرے باب میں اندلس کے متمدن شہروں کا تذکرہ ہے۔ ان کی شان دار عمارتوں، باغوں، شاہی محلات اور محکمۂ انتظام کی تفصیل ہے۔ اسی سلسلے میں عورتوں کی آزادی، ان کی علمی وادبی سرگرمیوں کا تذکرہ ہے۔ چوتھے باب میں اس الزام کی واقعات و دلائل کے ساتھ تردید کی گئی ہے کہ مسلمان موسیقی کی ترقی میں حائل ہوئے۔ پانچویں باب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مغربی ادب بڑی حد تک اسلامی ادب سے متاثر ہے۔ شروع میں بہت سی عربی حکایتیں مغربی زبانوں میں ترجمہ کی گئیں یا ان کو سامنے رکھ کر قصے لکھے گئے۔ فرانس کے بہت سے گیت ہو بہو عربی جذبات کی نقل ہیں۔ فارسی ادب وشعر نے بھی مغربی ادب پر بہت اثر ڈالا۔ چھٹے باب میں اسلامی علوم وفنون کا تذکرہ ہے۔ اس میں مؤلف نے مسلمان مردوں اور عورتوں کے شاعرانہ ذوق اور ان کی علمی وادبی سرگرمیوں کا حال لکھا ہے۔ اور مشہور یونیورسٹیوں، کتب خانوں اور علمی اکادمیوں کے نام گنائے ہیں۔ صرف قرطبہ میں آٹھ ہزار پبلک اسکول تھے جن میں ہر خطے اور ہر قوم کے لوگ بلا تفریق مذہب وملت تعلیم حاصل کرتے تھے اور ان کے تمام اخراجات حکومت کے ذمے ہوتے تھے۔ پھر مسلمان علما کی علمی سرگرمیوں اور ان کی تصنیف وتالیف کا ذکر ہے اور فلسفہ، سائنس، طب، جغرافیے میں ان کی انتہائی ترقیوں کی تفصیل ہے۔

بقیہ ابواب بھی اسی قسم کی علمی تحقیقات سے لبریز ہیں۔ کتاب میں زیادہ تر موازنہ اندلس کے حالات سے کیا گیا ہے اس لئے کہ وہی مغربی قوموں سے زیادہ قریب ہے اور اسی کے تہذیب و تمدن کا اثر مغرب پر براہ راست پڑا۔ مؤلف نے ان تاریخی حقائق کے ثبوت میں اکثر و بیشتر خود مغربی مصنفین کے بیانات پیش کئے ہیں اور شروع سے آخر تک اس کا التزام رکھا ہے۔ کتاب کی تالیف میں مصنف نے نہایت محنت و کاوش سے کام لیا ہے اور نہایت قیمتی معلومات فراہم کردی ہیں۔ زبان نہایت صاف و سلیس اور پیرایۂ بیان دلچسپ ہے۔

رسائل

ہونہار سالگرہ نمبر۔ دستور

ہونہار سالگرہ نمبر | اڈیٹر فیاض حسین صاحب نسیم جامعی، چندہ سالانہ تین روپے، فی پرچہ ۴ر، اس پرچہ کی قیمت ۹ر، مقام اشاعت دہلی۔

یہ پرچہ جناب فیاض حسین صاحب نسیم (جامعی) چوتھے سے نویں درجے تک کے طلباء کے لئے نکالتے ہیں اور نہایت محنت اور سلیقے سے مرتب کرتے ہیں۔ مضامین میں خاصا تنوع ہوتا ہے۔ علاوہ بریں ہر ماہ فوٹو بلاک اور دستی تصویروں کا بھی انتظام ہے۔ زیر نظر نمبر کی ضخامت ۱۰۰ صفحات ہے۔ اس میں قصے کہانیاں، مضامین نظم و نثر، صنعت و حرفت، کشیدہ کاری، معمے، لطیفے، فوٹو بلاک کی اور دستی تصاویر اور کارٹون غرض بچوں اور بچیوں کی دلچسپی اور تفریح کے لئے ہر قسم کا سامان موجود ہے۔ ٹائٹل بہت خوشنما اور دیدہ زیب ہے۔ قیمت باوجود ان تمام خوبیوں کے صرف ۹ر۔

دستور ہفتہ وار | اڈیٹر آزاد دہلوی، ضخامت ۲۴ صفحات، تقطیع الہلال کی، قیمت سالانہ ؎، فی پرچہ ۲ر، مقام اشاعت دہلی۔

یہ پرچہ تین مہینے سے نکل رہا ہے اور خوشی کی بات ہے کہ برابر ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ جناب آزاد صاحب اسے بڑی سنجیدگی اور سلیقے سے مرتب کرتے ہیں۔ علمی، ادبی، تفریحی مضامین، نظمیں، افسانے غرض ایک ہفتے وار پرچے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ سب اس میں موجود ہوتی ہیں۔ قومی اور ملکی معاملات پر اظہار خیال بھی نہایت سنجیدگی سے کیا جاتا ہے۔ تقریباً ۸، ۱۰ صفحے ہر پرچے میں فوٹو بلاک کی تصاویر کے بھی ہوتے ہیں۔

دنیا کی رفتار

ہندوستان

نوشتۂ تقدیر انتظار کی گھڑیاں شکل سے کٹتی ہیں مگر خدا خدا کر کے صبح امید کے انتظار میں پریشانی کی راتیں گذر گئیں اور ۱۰ مارچ کو ہندوستان کا "نوشتۂ تقدیر" یعنی آیندہ دستور اساسی کے متعلق حکومت برطانیہ کی تجاویز شائع ہوگئیں! جن لوگوں کو آخری گول میز کانفرنس کی کارروائیاں اور وزیر ہند کی آخری تقریر یاد ہے ان کے لئے "قرطاس ابیض" کوئی ایسی بات نہیں جو خلاف توقع ہو۔ البتہ افسوس ہر شخص کو ہے کہ جو آئینی دستور سرکار نے ہمارے لئے تجویز کیا ہے اس پر چل کر 'سوراج' کی منزل مقصود تک یہ ملک شاید قیامت تک نہ پہنچ سکے گا۔

... ...

جو تجاویز اس وقت پیش نظر ہیں غالباً پہلی گول میز کانفرنس کے انعقاد سے پہلے ہی تیار ہو چکی تھیں لیکن ان کی اشاعت کے لئے مناسب وقت اور موقعے کا انتظار تھا۔ اسی میں تین سال لگ گئے اور آخر وقت تک یہ کسی کو نہ محسوس ہونے دیا گیا کہ 'وقت گذاری' کی جا رہی ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے بڑے بڑے مدبرین کے لئے طرح طرح کی دماغی عیاشیوں کا انتظام مسلسل تین سال تک رکھا گیا اور 'تبادلۂ خیالات' ہوتا رہا یہاں تک کہ حکومت کو اپنی مدمقابل جماعت کے بازو بظاہر جب شل ہوتے نظر آئے تو اطمینان کی سانس لے کر اپنی 'خلوص نیت' اور 'نیک ارادوں' کے ثبوت کے لئے وہ تجاویز شائع کی گئیں جن پر ہندوستانی اور برطانوی نمایندوں نے گویا کہ زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے کیا ہے۔

مگر ابھی تک چونکہ حکومت کو فریق مخالف کی طرف سے کلی اطمینان نہیں ہے اس لئے صرف حکومت کی تجاویز ہمارے سامنے آئی ہیں جو پہلے ایک منتخب کمیٹی کے سامنے چھان بین کے لئے پیش کی جائیں گی۔ اس کے بعد مسودۂ قانون تیار ہوگا اور پارلیمنٹ کی منظوری کے لئے پیش کیا جائے گا۔ منتخب کمیٹی نے اگر مناسب ترمیمات نہ قبول کیں تو پھر پارلیمنٹ سے رشتۂ امید وابستہ کرنا پڑے گا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دستور اساسی اپنی آخری صورت میں کب نافذ ہوگا۔

... ...

حکومت کی تجاویز کا خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ "گورنمنٹ آف انڈیا" ایکٹ منسوخ کر دیا جائے اور اس کی جگہ ایک نیا قانون "کانسٹی ٹیوشن ایکٹ" یا دستوری قانون کے نام سے منظور کیا جائے۔ اس ایکٹ کے مطابق ایک وفاقی نظام حکومت ہندوستان میں قائم کیا جائے۔ وفاقی مجلس برطانوی ہند کے منتخب اراکین اور دیسی ریاستوں کے نامزد نمائندوں پر مشتمل ہو۔ مرکزی وفاقی حکومت کا رکن رکین اور حاکم اعلیٰ گورنر جنرل ہوگا اور اس کی حیثیت بادشاہ کے نمائندے کی ہوگی۔ گورنر جنرل کی مشیر اور معاون وزرا کی ایک کونسل ہوگی جو چند شرائط کے ماتحت مجلس کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ ہوگی۔ گورنر جنرل کا تقرر شاہی سند سے عمل میں آئے گا۔ جہاں تک دیسی رجواڑوں اور شاہ انگلستان کے معاملات کا تعلق ہے گورنر جنرل کو بحیثیت "وائسرائے" بھی کچھ اختیارات حاصل ہوں گے مگر ان کا کوئی ذکر دستوری قانون میں نہ ہوگا۔ مرکز میں اور صوبجات میں تمام حاکمانہ اختیارات اصولاً ملک معظم کو حاصل ہوں گے مگر عملاً مرکز میں گورنر جنرل اور صوبجات میں گورنران کو تفویض کر دئے جائیں گے۔ مرکز میں وفاقی ذمہ دار حکومت کے قیام کے لئے تین شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے (۱) کل دیسی ریاستوں کی مجموعی آبادی کا نصف حصہ جس کو کم از کم کل دیسی ریاستوں کی نشستوں میں سے نصف نشستوں کا حق حاصل ہو وفاق میں شرکت کے لئے آمادہ ہو جائے (۲) رزرو بنک قائم ہو جائے (۳) پارلیمنٹ کے ہر دو ایوان ملک معظم سے درخواست کریں کہ وفاقی ذمہ دار نظام حکومت کے قیام کے لئے فرمان شاہی صادر کیا جائے۔

... ...

وفاقی حکومت اگر قائم ہو جائے تو مرکزی حکومت کے چند شعبہ جات کا انتظام بہ "تحفظات" گورنر جنرل سے متعلق رہے گا اور وزرا کو ان شعبہ جات کے معاملات میں کسی قسم کا دخل نہ ہوگا۔ یہ "مخصوص" شعبے تین ہیں، اول فوج، دوسرے معاملات "خارجہ" تیسرے کلیسا کا انتظام۔ جہاں تک ان تین شعبوں کا تعلق ہے گورنر جنرل براہ راست ملک معظم اور پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ بقیہ امور میں گورنر جنرل وزرا کے مشورے کے مطابق کام کرے گا اور اس لئے وزرا مجلس کے سامنے جواب دہ قرار دئے گئے ہیں۔ مگر یہاں بھی گورنر جنرل کو بات بات پر دخل دینے کا اختیار دیا گیا ہے تاکہ گورنر جنرل اپنی ذمہ داری پر جس وقت چاہے کسی شعبے کے انتظام میں مداخلت کر سکتا ہے۔ اختیارات دو قسم کے ہوں ایک "اختیارات خصوصی" اور دوسرے "اختیارات تمیزی"۔ اختیارات خصوصی حسب ذیل حالات میں بغیر وزرا کے مشورے کے استعمال کئے جائیں گے:۔

(۱) جب ملک میں نقض امن کا خطرہ ہو۔
(۲) اقلیتوں کے مفاد کو نقصان پہنچے۔
(۳) سرکاری اسامیوں کے معاملے میں ناانصافی کی جائے۔
(۴) دیسی ریاستوں کے معاملات میں دخل دیا جائے۔
(۵) حکومت کا اعتبار اور ساکھ خطرے میں ہو۔
(۶) تجارتی کاروبار میں نسل ورنگ کے امتیازات قائم کئے جائیں۔
(۷) گورنر جنرل کے متعلقہ امور فوج، معاملات خارجہ اور انتظام کلیسا کے سلسلے میں جب ضرورت ہو۔

مذکورہ بالا اختیارات خصوصی کے علاوہ گورنر جنرل کو کچھ اختیارات تمیزی بھی حاصل ہوں گے اور ان اختیارات کے استعمال کرنے کے لئے بھی گورنر جنرل وزراء کے مشورے کا پابند نہ ہوگا۔ تفصیل درج ذیل ہے:۔

(۱) گورنر جنرل وفاقی مجالس کے انعقاد، التوا، اور برخاست کرنے کا حق رکھتا ہے۔
(۲) مسودات قانون کو منظور کر سکتا ہے یا منظوری دینے سے اجتناب کر سکتا ہے یا ملک معظم کی منظوری کے لئے روک سکتا ہے۔
(۳) اگر ضرورت ہو تو وفاقی مجالس کا مشترکہ اجلاس منعقد کر سکتا ہے۔
(۴) مجلس کے فیصلے کے خلاف اپنا فیصلہ صادر کر سکتا ہے۔
(۵) مجلس میں مباحثوں کو درمیان سے روک سکتا ہے۔
(۶) اپنی مخصوص ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مجالس کے قواعد وضوابط میں اضافہ اور ترمیم کر سکتا ہے۔

... ...

وفاقی مجلس کے دو ایوان ہوں گے اور دونوں کے اختیارات مساوی ہوں گے سوائے اس کے کہ میزانیہ کا مسودہ پہلے ایوان عام میں پیش کیا جائے گا۔ ایوان عام میں زیادہ سے زیادہ ۳۷۵ ارکان ہوں گے۔ اس میں سے ۱۲۵ ارکان دیسی ریاستوں کے نمائندے ہوں گے باقی برطانوی ہند کے نمائندے جن کا انتخاب براہ راست ہوا کرے گا۔ ایوان خاص میں ارکان کی کل تعداد زیادہ سے زیادہ ۲۶۰ ہوگی

جن میں سو نمائندے دیسی ریاستوں کے، ۲۰۰ منتخب نمائندے برطانوی ہند کے (جن کا انتخاب صوبجاتی کونسلوں کے ذریعے ہوا کرے گا) اور دس ارکان کو گورنر جنرل نامزد کیا کرے گا۔

یہ ایک مختصر خاکہ ہے وفاقی طرز کے ایک ذمہ دار بلکہ غیر ذمہ دار نظام حکومت کا جو ہندوستان کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ جہاں تک صوبجات کا تعلق ہے جدید دستور کے مطابق دو نئے صوبے سندھ اور اوڑیسہ قائم کرنے کی تجویز ہے۔ اس طرح برطانوی ہند ۱۱ صوبوں میں منقسم ہو جائے گا، ہر صوبے میں ایک گورنر بادشاہ کے نمائندے کی حیثیت سے حاکم اعلیٰ ہوگا، اور اس کو بھی وہی اختیارات خصوصی حاصل ہوں گے جن کا ذکر گورنر جنرل کے اختیارات کے سلسلے میں ہو چکا ہے لیکن صوبجات میں حکومت کا کوئی شعبہ تنہا گورنر کے سپرد نہیں کیا جائے گا بلکہ وزرا کی ایک کونسل ہوگی جو تمام امور کی ذمہ دار ہوگی اور صوبجاتی مجلس کے سامنے جوابدہ بھی ہوگی۔ گورنر اگر اپنے اختیارات خصوصی سے کبھی کام لے گا تو اس کی ذمہ داری وزرا پر نہ ہوگی۔

... ...

صوبجاتی کونسلوں میں اراکین کی تعداد اور فرقہ وارانہ نمائندگی کے متعلق جو فیصلہ وزیر اعظم نے ۴ اگست ۱۹۳۲ء کو کیا تھا وہ علیٰ حالہ قائم رہے گا۔ بنگال، بہار اور صوبہ متحدہ میں مجلس کے دو ایوان ہوں گے اور باقی صوبجات میں صرف ایک ایک لیکن قانون اساسی میں یہ گنجائش رکھی جائے گی کہ اگر کسی صوبے میں ایوان کی ضرورت ثابت ہو تو دوسرا ایوان قائم کر دیا جائے یا اگر کہیں دو ایوان غیر ضروری ثابت ہوں تو ایک ایوان توڑ دیا جائے۔

صوبجاتی اور مرکزی حکومت کے درمیان مداخل کی تقسیم حسب ذیل تجویز کی گئی ہے۔

۱۔ (الف) وہ مدات آمدنی جو کلیۃً مرکزی حکومت کو دی گئی ہیں۔ محصول در آمد (علاوہ محصول نمک)، ریلوں کی آمدنی، زر و بنک اور ٹکسال زر کا منافع، مرکزی حکومت کے ملازمین پر انکم ٹیکس کی آمدنی، اور مشترکہ سرمایہ دار کمپنیوں پر محصول کی آمدنی۔

(ب) جو مرکزی حکومت وصول کرے گی لیکن اس آمدنی کا کوئی حصہ صوبجات کو بھی دیا جا سکتا ہے۔ محصول برآمد، نمک پر چنگی کی آمدنی، تمباکو اور دیگر منشیات پر محصول آبکاری (اس میں شراب کی چنگی شامل نہیں ہے۔)

۲۔ (الف) وہ مدات آمدنی جو کلیۃً صوبجات کو دی گئی ہیں۔

مالگذاری۔ شراب اور دیسی ادویہ کا محصول آبکاری۔ اسٹامپ کی آمدنی۔ جنگلات اور دیگر مدات کی آمدنی جن کا تعلق اب تک صوبجات سے رہا ہے۔

(ب) ٹرمنل ٹیکس کی آمدنی صوبجات کو دی گئی ہے مگر مرکزی حکومت کو اختیار دیا گیا ہے کہ اس پر اضافہ کر کے مزید رقم خود وصول کرے لیکن اس قسم کا اضافہ ۱۲ ½ فی صدی سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔

... ...

ایک وفاقی عدالت بھی قائم کی جائے گی جو عند الضرورت دستوری قانون کی توضیح اور تاویل کر سکے اور مرکزی اور صوبجاتی اور ریاستی حکومتوں کے مابین اختلافی مسائل کا فیصلہ کر سکے۔ وفاقی عدالت ایک چیف جج اور چند ججان پر مشتمل ہوگی جن کا تقرر ملک معظم کی طرف سے ہوگا۔ اس عدالت میں صوبجاتی ہائی کورٹ کے فیصلوں کے خلاف مرافعہ بھی دائر کیا جا سکے گا۔

... ...

وزیر ہند کی کونسل آف انڈیا اپنی موجودہ شکل میں نہ رہے گی اس لئے کہ "اس کی کوئی ضرورت آئندہ نہ ہوگی" مگر چونکہ وزیر کو بہرحال اپنے فرائض بطریق احسن انجام دینے کے لئے چند مشیروں کی ضرورت ہوگی اس لئے وزیر ہند کو اختیار دیا جائے گا کہ کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ چھ مشیر اپنی مدد اور مشورے کے لئے مقرر کرے۔

جہاں تک ملازمتوں کا تعلق ہے انڈین سول سروس، انڈین پولیس سروس، ریلوے، ڈاکخانہ اور کسٹم کی اعلیٰ اسامیوں پر تقررات، ترقی، تنزل اور برخاست کرنے کے اختیارات وزیر کو حاصل تھے اس لئے آئندہ بھی ان ملازمتوں کے حقوق کا تحفظ وزیر ہند کے سپرد کیا گیا ہے۔ انڈین سول سروس اور انڈین پولیس سروس کی اسامیوں پر تقرر آئندہ بھی وزیر ہند ہی کرے گا۔ باقی دیگر اسامیوں کا معاملہ ابھی زیر غور ہے۔

سرکاری ریلوں کا انتظام ایک بورڈ کے سپرد کیا جائے گا اور یہ بورڈ از روئے دستور اساسی قائم کیا جائے گا تاکہ مرکزی مجالس کی سیاست کا مضر اثر ریلوں کے تجارتی کاروبار پر نہ پڑے۔

... ...

یہ ایک مجمل خلاصہ ہے ہندوستان کے آئندہ نظام حکومت کے متعلق برطانوی حکومت کی تجاویز کا۔

ان تجاویز کا اب تک کسی حلقے سے خیر مقدم نہیں کیا گیا بلکہ ہر متعدد جماعت نے ان تجاویز پر اپنی مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ ہندوستان کا مطالبہ تھا کہ خود مختار اور ذمہ دار حکومت قائم کی جائے اور برطانوی نمائندوں سے سمجھوتہ یہ ہوا تھا کہ صوبجات میں مکمل خود مختاری دی جائے مگر مرکز میں چند تحفظات کے ساتھ خود مختاری دی جائے گی اور یہ تحفظات بھی خالص اور صریحاً ہندوستان کے مفاد کے لئے ہوں گے، اسی سمجھوتے کی بنیاد پر گول میز کانفرنس منعقد ہوئی تھی لیکن تجاویز شائع ہوئیں تو تمہید ہی میں گذشتہ سمجھوتے کے اندر یہ لفظی ترمیم نظر آتی ہے کہ تحفظات بجائے "صرف ہندوستان کے صریحی مفاد کے" "ہندوستان اور برطانیہ کے 'مشترکہ' مفاد کے لئے" تجویز کئے گئے ہیں۔ چنانچہ اگر وفاقی ذمہ دار حکومت قائم ہو بھی جائے (جس کی امید ایک مدت تک بظاہر نظر نہیں آتی) تو مجوزہ تحفظات کی بدولت نام کی بھی 'ذمہ دار' حکومت نہیں ہوگی بلکہ ایک انتہائی درجہ کی 'غیر ذمہ دار' شخصی اور مطلق العنان حکومت مرکز میں قائم ہو جائے گی جو صوبجات کی خود مختاری اور 'ذمہ داری' کو بھی خاک میں ملا دے گی۔

صوبجات میں دو عملی کا طریقہ ناکام ثابت ہو چکا ہے مگر اب اس کو دوبارہ مرکز میں آزمایا جا رہا ہے۔ گورنر جنرل اور گورنران صوبہ کی ضرب المثل مطلق العنانی جدید دستور کے نفاذ کے بعد عین آئین اور دستور کے مطابق ہو جائے گی۔ سول سروس اور انڈین پولیس سروس کو ذمہ دار وزرا کے تصرف اور اثر سے محفوظ رکھا گیا ہے تاکہ ان کی 'آہنی سیرت' میں آئندہ بھی کوئی لچک نہ پیدا ہو۔ ان اسامیوں کی ترقی اور تنزل کا اختیار وزیر ہند کے ہاتھ میں اس لئے دیا گیا ہے کہ اگر برطانوی اور ہندوستانی مفاد میں کوئی تصادم ہو تو یہ ملازمین برطانیہ کے ساتھ اپنی وفاداری کا ثبوت دیں اور حق نمک ادا کر سکیں۔

... ...

مرکزی حکومت کی مالیات کے اسی فی صدی حصے کا خرچ مطلق العنان گورنر جنرل کے ہاتھ میں ہوگا اور 'ذمہ دار' وزرا کو اس میں کوئی دخل نہیں دیا گیا ہے۔ باقی ۲۰ فی صدی جو 'ذمہ دار' وزرا کے ہاتھ میں دیا گیا ہے اس پر بھی گورنر جنرل کی کامل نگرانی رہے گی۔

حکومت کی تجاویز پر ایک نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کو آئندہ کے لئے یہ قوی اندیشہ ہے کہ ہندوستان اور برطانیہ کے مفاد میں ہمیشہ تضاد رہے گا۔ اسی لئے برطانوی حکومت مجبور ہے کہ اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے ہر قسم کے تحفظات دستور اساسی میں رکھے۔ ہندوستان کے دستور اساسی کی

ترتیب کی ذمہ داری ہندوستانیوں کی نا اہلی کی وجہ سے جب تک برطانوی حکومت پر ہے اس وقت تک "تحفظات"، اختیارات خصوصی اور اختیارات تمیزی کی تلوار اسی طرح ہمارے سروں پر لٹکتی رہے گی اس سے نجات اسی وقت ملے گی جب ہندوستان خود اپنے آئندہ دستور اساسی کی تشکیل کے لئے تیار ہو جائے گا۔

ممالک غیر

انگلستان، امریکہ اور معیشت عالم

برطانیہ کے وزیر اعظم اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے صدر میں جو گفتگو آج کل ہو رہی ہے اس کے نتائج پر ساری دنیا کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ گذشتہ دسمبر میں جب انگلستان نے امریکہ کو قرضہ کی ایک قسط ادا کی تھی اس وقت ایک تحریر اس مضمون کی بھیجی تھی کہ اب ان اقساط کا ادا کرنا ممکن نہ ہوگا اور خود قرض خواہ کے لئے ان کی ادائگی بہت مضر ثابت ہوگی۔ اس کا جو جواب امریکہ نے ۱۰ دسمبر کو دیا تھا اس میں یہ بات تسلیم کی تھی کہ "موجودہ کساد بازاری کے زمانے میں کہ ہر چیز کی قیمت بہت گھٹ گئی ہے اس قرض کا بوجھ قرض داروں کے لئے بہت بڑھ گیا ہے[1]" اور یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ "اس مسئلہ کو دنیا کی معاشی حالت کے روبراہ لانے سے بہت گہرا تعلق ہے جس سے برطانیہ اور امریکہ دونوں کے اہم اغراض وابستہ ہیں۔" اس تحریر میں یہ بھی جتا دیا گیا تھا کہ صدر جمہوریہ آمادہ ہیں کہ "برطانوی حکومت سے مل کر سارے معاملے پر از سر نو غور کریں اور زر رائج اور شرح مبادلہ کو استوار بنانے، تجارت کو فروغ دینے اور قیمتوں کو بڑھانے کی تدابیر سوچیں" لیکن نیت یہ تھی کہ اس غور و جستجو کے معنی یہ نہیں کہ قرضہ بالکل

---

[1] ناظرین آسانی سے اس کو سمجھ لیں گے کہ اجناس کی قیمت گھٹنے سے قرض دار کا بوجھ کیسے بڑھ جاتا ہے! اجناس کی قیمت گھٹنے کے معنی ہیں کہ زر کی قیمت بڑھ گئی ہے۔ جس چیز کے لئے پہلے زیادہ روپیہ دینا ہوتا تھا اب کم روپے سے وہی چیز حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر کسی کسان پر دس روپے قرض ہوں اور گیہوں کا نرخ ۸ سیر کا ہو تو وہ یہ قرض دو من گیہوں بیچ کر ادا کر سکتا ہے۔ لیکن اگر نرخ ۲۰ سیر ہو جائے تو اسی قرض کی واپسی کے لئے اسے پانچ من گیہوں بیچنے پڑیں گے۔ اس لئے قیمتوں کے گھٹنے سے قرض دار کا بوجھ بڑھتا اور قیمتوں کے بڑھنے سے اس کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔

معاف کر دیا جائے بلکہ ہونا یہ چاہئے کہ امریکی مال کے لئے منڈیاں پیدا کرکے اور اسلحہ کے مجنونانہ مقابلے کو ختم کرکے اس کی تلافی کی جائے۔

امریکہ کے سابق صدر اور موجودہ صدر میں آئندہ طرز عمل کے متعلق اختلاف تھا۔ مسٹر ہوور چاہتے تھے کہ قرضہ جنگ اور دوسرے معاشی مسائل کو اسلحہ کے مسئلے سے وابستہ کر دیں۔ مسٹر روزولٹ اسے مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ اب تمام مسائل پر کھلے دل سے گفتگو ہوگی اور ممکن ہے مسٹر میکڈانلڈ اور مسٹر روزولٹ کا تدبر اس معاشی گتھی کو سلجھانے کی کوئی تدبیر نکال سکے۔ دنیا کا بڑا حصہ چاہتا ہے کہ قرض کا یہ قصہ ختم ہی ہو تو اچھا۔ ذیل کے اعداد سے کچھ اندازہ ہوگا کہ قرض دار اب کہاں تک اس قرض کے بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار ہیں۔ جب پچھلی قسط واجب الادا ہوئی تھی تو مندرجہ ذیل قرض داروں نے ادائگی سے معذرت کی۔

۱. فرانس	۱۹,۲۶۱,۴۳۲,۵۰ ڈالر
۲. بلجیم	۲,۱۲۵,۰۰۰,۰۰ ڈالر
۳. پولینڈ	۳,۳۰۲,۹۸۰,۰۰ ڈالر
۴. ہنگری	۴۰,۷۲۹,۳۵ ڈالر
۵. استھونیا	۲۶۶,۳۷۰,۰۰ ڈالر

لیکن کیا امریکہ اپنا قرضہ معاف کر دے گا؟ اس کے جواب کے لئے ذرا امریکہ کی موجودہ حالت پر نظر کرنی چاہئے۔ خود مسٹر روزولٹ صدر جمہوریہ کا اندازہ ہے کہ ان کے ملک میں بے کاروں اور بے روزگاروں کی تعداد ۱۵ ملین ہے! قومی آمدنی میں تین سال کے اندر ۴۰ ہزار ملین ڈالر کی یعنی ۵۰ فی صدی کی کمی ہوگئی ہے!! پچھلے ڈھائی برس میں سرکاری میزانیے میں ۵۰۰۰ ملین ڈالر کا خسارہ ہو چکا ہے اور اس وقت ۱۲۰ ملین ماہانہ کے حساب سے اس خسارے میں اضافہ ہو رہا ہے!! شکاگو اور فلے ڈلفیا جیسے بلدیے دیوالہ نکال چکے ہیں۔ غیر منقولہ جائداد پر قرض اتنا بڑھ گیا ہے کہ اندازہ کرنا مشکل ہے؛ زرعی زمینیں رہن رکھ رکھ کر کسان ۱۲ ہزار ملین ڈالر سے کچھ زیادہ ہی قرض لے چکے ہیں اور ان کے مال کی قیمت اتنی گر گئی ہے کہ اس قرض کا بوجھ ۳۰ ہزار ملین ڈالر کے قرض کے برابر ہے۔ سرکاری امداد کے باوجود ۱۹۳۲ء میں ۱۴۰۰ بنکوں نے دیوالے نکالے اور اگر حکومت نے تقریباً ۵۰ کروڑ ڈالر بنکوں کی مدد کے لئے نہ نکالے ہوتے تو نہ جانے اور کتنے بنکوں کا یہی حشر ہوتا۔

ان ناساعد حالات نے عام طور پر تو اب تک امریکہ کو اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ وہ باقی دنیا کے

جھگڑوں سے الگ تھلگ رہ کر اپنے خانگی مصائب کے دور کرنے کی تدبیر کرے اور اس خیال نے معیشت عالم سے ایک بیزاری سی پیدا کر دی ہے جو نہ دنیا کے لئے مفید ہے نہ خود امریکہ کے لئے۔ ان معاشی معاملات پر امریکہ کی رائے عامہ متحد نہیں ہے۔ بنک والوں اور معاشی ماہروں کا ایک چھوٹا سا گروہ ہے جو چاہتا ہے کہ امریکہ کو اب یوں روٹھنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ قرض پر اصرار کرنے سے اگر تجارت ختم ہوئی جاتی ہے اور دنیا کی معاشی حالت کے سدھرنے کا امکان نہیں رہتا جس کے بغیر امریکہ کی حالت کا درست ہونا بھی محال سا ہے تو بہتر یہ ہے قرض کو ہی ختم کیا جائے۔ لیکن اس گروہ کا اثر امریکہ میں کچھ زیادہ نہیں۔

دوسرا گروہ جو خاصا با اثر ہے اور اہل سیاست نیز جرائد بھی جس کے بہت سے حامی ہیں وہ کہتا ہے کہ دنیا کی زبوں حالی سے چشم پوشی کرنا نہ صحیح ہے نہ مفید۔ دوسرے ممالک کی بات ماننی چاہیے اور قرض داروں کا بار ہلکا کرنا چاہیے مگر اس کے عوض کچھ لینا بھی چاہیے۔ یہ لوگ "سے و انگبین" کی لاگ چاہتے ہیں، تاجر ہیں، سودا کرتے ہیں۔ اس کے سب سے بڑے نمائندے سابق صدر ہوور ہیں۔ اپنی آخری تقریروں میں سے ایک میں انھوں نے صاف صاف فرمایا تھا کہ "میں قرضوں کو یکسر منسوخ کرنے کا حامی نہیں میرا خیال ہے کہ امریکہ قرضے کی نقد واپسی کے معاملے میں جو بھی مزید قربانی کرے اس کی تلافی کسی اور طریقے سے دنیا کی منڈیوں میں ہونی چاہیے"۔

لیکن عام امریکن شہری قرض معاف کرنے کی تجویز کو تو سننا ہی نہیں چاہتا اور اس سودے کے بھی خلاف ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ مسئلہ زیر بحث آیا اور یورپ کے شاطر سیاسی ہمیں چل دے جائیں گے۔ قرض قرض ہے اور ادا ہونا چاہیے۔ یہی گروہ تعداد میں سب سے زیادہ ہے اور اگر جدید صدر معاشی حالات میں خوشگوار تبدیلی کے وسائل کی تلاش میں ہوں تو اسی اکثریت کو سمجھانا سب سے زیادہ دشوار کام ہوگا۔ مگر دنیا کی معاشی زبوں حالی اور خود امریکہ کی معاشی حالت دونوں انھیں مجبور کریں گی کہ کوئی نہ کوئی تدبیر نکالیں۔ اس لئے کہ یہ بات ثبوت کی محتاج نہیں رہی کہ اگر اس قرض کے معاملے میں امریکہ نے دوسرے ممالک کے ساتھ رعایت نہ کی تو آج نہیں تو کل ساری دنیا کا معاشی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ ہمارا خیال ہے کہ امریکہ بادل ناخواستہ قرض داروں کے لئے بہت کچھ رعایتیں کرے گا، اپنے لئے کچھ رعایتیں منڈیوں میں حاصل کرے گا، پونڈ اور ڈالر میں غالباً کوئی شرح مبادلہ مستقل مقرر کر دی جائے گی، زر رائج کی مقدار بڑھانے کیلئے قیمتوں کو بڑھانے کی تدابیر کی جائیں گی، چاندی کو غالباً پھر نظام زر میں دخل ہوگا، اور انگلستان اور امریکہ

کی متحدہ مساعی آئندہ عالمی معاشی کانفرنس میں معیشت عالم کو بہت کچھ سہارا دے سکیں گی۔

ہٹلر کا پروگرام ہٹلر کے انتخاب کے متعلق ہم کسی پچھلی اشاعت میں لکھ چکے ہیں۔ اس زمانے میں اخبارات میں جرمنی کے متعلق بہت کچھ شائع ہوتا رہا۔ یہودیوں پر جو مظالم ہوئے اور ہو رہے ہیں ان کا حال سن کر ساری دنیا حیرت میں رہ گئی۔ یہودیوں نے ان مظالم کے خلاف جو بین الاقوامی تحریک منظم کرنا چاہی ان کا حشر بھی اچھا نہ ہوا اور ہٹلر کی جماعت نے یہودیوں کے مقاطعے کا ایسا سخت پروگرام پیش کیا کہ بالآخر یہودیوں نے گفت و شنید سے معاملے کو طے کرنا پسند کیا۔ ہٹلر کی پارٹی نے ان مظالم سے اپنے بے شمار وعدوں میں سے کم سے کم ایک تو پورا کر ہی دکھایا اور کچھ عرصے کے لئے اپنے ساتھیوں کو مطمئن کر دیا۔ ضمناً یہ فائدہ بھی ہوا کہ یہودیوں سے سمجھوتے کے معاوضے میں بڑی بڑی رقمیں وصول کر کے پارٹی کی مالی حالت کو زیادہ مستحکم کر لیا گیا تاکہ اگر پروگرام کے دوسرے حصوں کے نفاذ میں سرمایہ داروں سے اختلافات پیدا ہوں تو پارٹی کو روپے کی کمی بے بس یا کمزور نہ کر سکے۔

ہٹلر نے سیاسی زندگی میں اس تیزی سے ترقی کی ہے کہ ایک افسانہ سا معلوم ہوتا ہے اور ہر شخص اسے اپنے مذاق کے موافق سمجھتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر اس کے مقاصد کو اس کی زبان ہی سے ادا کیا جائے تو بہتر ہے۔ صدر اعظم ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد ہٹلر نے ایک بڑی معرکۃ الآرا تقریر میں اپنی حکومت کے مقاصد ۱۲ دفعات میں یوں بیان کئے تھے:۔

(۱) ہمارے پروگرام کی پہلی دفعہ تو یہ ہے کہ ہم جھوٹ نہیں بولنا چاہتے! یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ قوم کے سامنے آ کر بے سوچے سمجھے وعدے کرنے سے احتراز کیا ہے۔ تم میں سے کوئی میرے خلاف یہ شہادت نہیں دے سکتا کہ میں نے کبھی کہا ہے کہ ہماری قوم کی تعمیر نو صرف چند دنوں کا کام ہے۔ میں نے ہمیشہ یہی کہا ہے اور یہی کہتا ہوں کہ جرمن قوم کی حیات نو کا مسئلہ در اصل قوم کی داخلی قوت اور صحت کا مسئلہ ہے۔ جس طرح میں نے تقریباً ۱۴ برس اس تحریک کے لئے کام کیا ہے، یکسوئی اور استقلال کے ساتھ، ساتھیوں سے ان ۱۲ ملین تک پہنچنے کے لئے، اسی طرح اب ہم سب مل کر کام کریں گے جرمن قوم کو پھر سے زندہ کرنے کا۔ اور جس طرح آج مجھے اور میری تحریک کو جرمن سلطنت کی قیادت تفویض ہوئی ہے اسی طرح ہم اس جرمن سلطنت کو پھر زندگی اور بڑائی دے کر دنیا کی قیادت لائیں گے اور اس مقصد سے کوئی چیز ہمیں

باز شد کرسکے گی۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ میں تم سے یہ وعدہ نہیں کرتا کہ قوم کی تعمیر نو کا یہ کام خود بخود ہو جائے گا۔ ہم تو اس کے لئے کام کریں گے ہی لیکن ساری قوم کو اس میں ہمارا ہاتھ بٹانا ہوگا۔ یہ کبھی یقین نہ کرنا کہ آزادی، خوش حالی، زندگی ہمیں یکایک آسمان سے مرحمت ہو جائیں گی۔ ان سب کی جڑ اپنا ارادہ اور اپنی محنت ہے۔

(۳) تیسرے یہ کہ اس سارے کام میں ہمارے لئے ایک حقیقت، ایک عقیدہ دلیل راہ ہوگا اور وہ یہ کہ کبھی پرائی مدد پر بھروسا نہ کرنا، کسی ایسے کی مدد پر جو ہماری اپنی قوم سے نہ ہو۔ جرمن قوم کا مستقبل بس خود ہم پر منحصر ہے۔ خود اپنے کام سے، خود اپنی مشقت سے، خود اپنے استقلال سے ہم ابھریں گے جس طرح دوسری قومیں اور ایک دفعہ خود جرمن قوم خود ابھری تھی۔

(۴) چوتھی بات یہ کہ زندگی کے آئین ہمیشہ ایک سے رہتے ہیں چنانچہ ہم اپنی قوم کی تعمیر نو کا کام بے جان نظریوں سے نہیں لیں گے جو کسی پردیسی کی کھوپڑی سے نکلے ہوں بلکہ ان ازلی قوانین کے مطابق اس کام کو کریں گے جو تجربہ اور تاریخ ہمیں بتلاتے ہیں اور جنھیں ہم خوب جانتے ہیں۔

(۵) اور ان قوانین کو ہم ایک پانچویں دفعہ میں یوں پیش کرتے ہیں: ہماری زندگی کی اساس دو عناصر پر ہے جن سے کوئی ہمیں محروم نہیں کر سکتا۔ نسل اور زمین، قوم اور ملک یہی دو چیزیں ہیں جن سے ہم قوت حاصل کریں گے اور انھیں پر اپنے فیصلوں کی بنیاد رکھیں گے۔

(۶) ہمارے جہاد کا مقصد اسی پانچویں دفعہ سے مشتق ہے یعنی اس قوم اور اس ملک کا قیام و بقا۔ اس قوم کی بقا اس علم کی بنا پر بس یہی ہماری زندگی کا مقصد ہو سکتا ہے۔ ہم محض تخیلات کے لئے زندہ نہیں رہتے محض نظریوں کے لئے نہیں، سیاسی جماعتوں کے دور از کار پروگراموں کے لئے نہیں۔ نہیں، ہم تو جیتے ہیں اور مرتے ہیں جرمن قوم کے لئے، اس کے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے، مستقبل میں اس کے جہاد حیات کی کامیابی کے لئے اور ہمیں یقین ہے کہ اسی طریقے سے ہم اس چیز میں بھی مدد دے سکتے ہیں جسے دوسرے اتنا میٹھ پیش رکھتے ہیں یعنی امن عالم، کہ اس کے لئے پہلے مضبوط قوموں کی ضرورت ہے جو اس کی حفاظت کر سکیں! تمدن عالم، کہ اس کی بنیاد قوموں کے تمدن ہی پر ہو سکتی ہے؛ اور ایک عالمی معیشت، کہ اس کا تصور بھی اسی وقت ممکن ہے کہ قومی قومی معیشتیں اس کی حامل ہوں۔ ہم اپنی قوم سے شروع کرتے ہیں اور اسی طرح دنیا کی ترتیب نو میں مدد دے سکتے ہیں، کہ نظم و ترتیب عالم کی عمارت میں ہم خود ایک مضبوط پتھر بنیں۔

(۷) ہاں، ایک بات اور۔ وہ یہ کہ چونکہ ہم اپنی قوم کی بقا اور اس کے جہادِ زندگی کو کامیاب بنانا اپنا مقصد جانتے ہیں لہٰذا ہمیں اسباب زوال کو ہٹانا ہوگا اور قوم کے مختلف طبقوں میں صلح کرانی ہوگی اور یہ کام ہفتوں میں یا مہینوں میں نہیں ہو سکتا جب ۷۰ برس تک انتشار کی کوششیں جاری رہ چکی ہوں۔ ہاں، یہ مقصد ہے جس سے ہم کبھی روگردانی نہ کریں گے، علاوہ اس نئی جمعیت کی تعمیر میں کوشاں رہیں گے اور انتشار کے اسباب کو مٹاتے رہیں گے

(۸) ان طبقوں میں صلح کرا کر ہم آگے بڑھیں گے اور اس متحدہ قوم کو اس کی قوت کے اصلی منبع تک پہنچائیں گے اور تعلیم کے ذریعے اپنے بچوں کے ذہن میں خدا پر یقین اور اپنی قوم پر اعتماد پیدا کرائیں گے۔

(۹) پھر ہم آگے بڑھیں گے اور اس قوم کی عمارت جرمن کسان کے کندھوں پر کھڑی کریں گے کہ کسان ہی ہر قومی زندگی کی بنیاد ہے۔ میں جو جرمنی کے مستقبل کے لئے جہاد کر رہا ہوں تو مجھے لازماً جرمن زمین اور جرمن کسان کے لئے جہاد کرنا ہے۔ یہی ہمارے شہروں کی آبادی کے لئے آدمی دیتا ہے۔ یہی صدیوں سے ہماری قوت کا منبع ہے اور اس کی بقا لازمی ہے۔

(۱۰) اس کے بعد ہماری قومی زندگی کا دوسرا اہم عنصر ہمارے مزدور ہیں۔ وہ مزدور جو آئندہ اس قوم میں اجنبی کی طرح نہ رہیں گے جنہیں قوم پھر اپنے میں لے لے گی اور جن کے لئے سب دروازے کھل جائیں گے کہ وہ جرمن قوم کے مجاہد کی حیثیت سے جرمن جمیعۃ قومی میں شریک ہو سکیں۔

(۱۱) ہم جرمن قوم کی قوت ذہنی کو نشو و نما کے مواقع دیں گے، شخصیت کی قدر بڑھائیں گے اور فرد کی قوت تخلیق کو پھر اس کا ازلی حق دیں گے، زوال آمادہ جمہوریت کے مظاہر کا خاتمہ کر دیں گے اور ان کی جگہ اس حقیقت کو دیں گے کہ ہر بڑی چیز صرف انفرادی شخصیت کی قوت سے پوری ہوتی ہے اور ہر وہ چیز جسے باقی رکھنا ہے پھر انفرادی شخصیت کے سپرد کرنی چاہئے۔

(۱۲) اس پارلیمنٹی جمہوری نظام کی مخالفت سے ہمارے پروگرام کی بارہویں دفعہ نکلتی ہے یعنی اپنی قومی زندگی کو صاف ستھرا بنانا:

زندگی کے ہر شعبے میں ستھرائی، انتظام ملکی میں صفائی، سیاسی زندگی میں ستھرائی، تمدنی زندگی میں ستھرائی۔ ہم جرمنی کی عزت کو پھر سے قائم کریں گے۔ اپنے دلوں میں حریت کا جذبہ پیوست کریں گے، اپنی قوم کو حقیقی جرمن تمدن سے بہرہ یاب کریں گے، حقیقی جرمن موسیقی، حقیقی جرمن طرز تعمیر، حقیقی جرمن آرٹ سے کہ انہیں کے ذریعے ہماری روح ہمیں واپس ملے گی۔ ہم اپنی قوم کی عظیم الشان روایات کی تعظیم کرائیں گے، انہی کے کاموں

کو اجاگر کریں گے، اپنی تاریخ کی بڑی بڑی شخصیتوں کی یاد تازہ کریں گے۔ ...... ہم اپنے نوجوانوں کے دلوں میں ان لوگوں کی عظمت پیدا کریں گے جنھوں نے ہماری قوم کی زندگی اور اس کے مستقبل کے لئے سب سے بڑی قربانی پیش کی تھی ...... ہم نوجوانوں میں اپنی فوج کی عظمت پیدا کریں گے کہ یہ اس کی عزت کریں اور اسے جرمن قوم کا سب سے بڑا اظہار قوت سمجھیں ...... لہذا یہ پروگرام گویا ہر شعبۂ زندگی میں احیاء قومی کا پروگرام ہوگا، ہر اس چیز اور شخص سے بے زار جو قوم کے خلاف ہے، ہر اس کا دوست اور بھائی جو ہماری اور اپنی قوم کے احیاء کے لئے کوشاں ہے۔"

ممالک اسلامی

ایران | حکومت ایران اور اینگلو پرشین آئل کمپنی کے جھگڑے کا مختصر ذکر جنوری کے رسالے میں آچکا ہے قارئین کرام کو تفصیلی حالات معلوم کرنے کا شوق ہوگا۔ ۲۶ نومبر ۱۹۳۲ء کو ایرانی مجلس وزرا کا ایک جلسہ ہوا جس کی صدارت خود شاہ ایران نے فرمائی اور اس میں یہ طے ہوا کہ "آئل کمپنی" کو جو مراعات حاصل ہیں انھیں فسوخ کر دیا جائے۔ یہ ٹھیکا ۱۹۰۱ء میں ولیم۔ کے۔ ڈارسی کو ملا تھا۔ ایک قلیل نقد رقم اور سالانہ منافع کے ایک حصے کے بدلے میں ڈارسی کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ پانچ شمالی صوبوں کے علاوہ تمام ایران میں مٹی کے تیل کی تلاش کرے، اسے نکالے اور اس تیل اور اس کی تمام مصنوعات کو جہاں چاہے لے جائے۔ دو برس کے بعد ان مراعات سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایک کمپنی قائم ہوئی اور ۱۹۰۹ء میں "اینگلو پرشین آئل کمپنی" نے ڈارسی سے تمام حقوق حاصل کر لئے۔

۱۹۱۲ء میں کمپنی کو مزید سرمایے کی ضرورت ہوئی۔ اس وقت تک حکومت برطانیہ کو بھی اپنی بحری فوج کے لئے تیل کی کثیر مقدار کے حاصل کرنے کی ضرورت کا احساس ہو چکا تھا۔ اس لئے حکومت نے اتنا سرمایہ فراہم کر دیا کہ کمپنی کے بیشتر حصے اس کے ہاتھ میں آگئے۔ یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ ۱۹۲۴ء تک حکومت برطانیہ نے اس سرمایے کا سہ چند پا لیا جو اس نے اس کمپنی میں لگایا تھا۔ اس دوران میں پیداوار میں بہت اضافہ ہو گیا ۱۹۲۱ء کے ½ ۱۱ لاکھ ٹن کے مقابلے میں ۱۹۲۷ء میں پیداوار ۴۸ لاکھ ٹن اور ۱۹۲۹ء میں ۵۹ لاکھ ٹن ہوئی۔ اس کے بعد کمی شروع ہوئی چنانچہ ۱۹۳۲ء میں پیداوار ½ ۵۰ لاکھ ٹن ہوئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ قیمتیں بھی کم ہو گئیں اور اس طرح نفع صرف ۸۰ لاکھ ڈالر رہ گیا۔

ایرانی حکومت کا حصہ کمپنی کے نفع میں ۱۶ فی صدی ہے سنہ ۱۹۲۱ء میں اسے تین لاکھ ڈالر ملے تھے، ۱۹۲۷ء میں یہ رقم بڑھ کر ۶ لاکھ ڈالر ہوگئی سنہ ۱۹۳۰ء میں ۴۵ لاکھ ڈالر ملے لیکن سنہ ۱۹۳۱ء میں ۱۰ لاکھ ڈالر سے زیادہ حکومت ایران کو نہیں ملے اور یہی کمی سنہ ۱۹۳۲ء میں بھی جاری رہی۔ اس کمپنی کو بوجہ ایک برطانوی کمپنی ہونے کے حکومت برطانیہ کو ایک بڑی رقم محصول آمدنی کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں یہ رقم تقریباً سہ چند تھی اس رقم کی جو حکومت ایران کو منافع کی صورت میں ملی تھی۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ حکومت ایران کی آمدنی میں ایک بڑی رقم کی کمی پڑ گئی بلکہ یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ ایک ایسے کاروبار سے جو ایران کی سرزمین پر کیا جاتا ہے اور وہ بھی ایران کی فطری دولت کے بل بوتے پر اس سے خود حکومت ایران کے مقابلے میں حکومت برطانیہ کو زیادہ نفع حاصل ہوتا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا ایرانی حکومت نے کمپنی سے معاہدے پر نظر ثانی کرنے کی بابت گفت وشنید شروع کی تھی اور اس کی وجہ یہ بتائی تھی کہ ۳۰ برس میں حالات بالکل بدل گئے ہیں کمپنی کے ارباب حل وعقد نے اسے منظور کیا اور ایک سال ہوا دوسرا معاہدہ ہونے والا ہی تھا کہ گفت وشنید جاری نہ رہ سکی۔ ایران کے وزیر مالیات نے ٹھیکے کی منسوخی کا باقاعدہ اعلان کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ حکومت ایک ایسا نیا معاہدہ کرنے پر آمادہ ہے "جس کی بنیاد دونوں فریق کے حقوق پر ہو"۔

ایرانی حکومت کی اس کارروائی سے انگلستان میں ہل چل مچ گئی۔ ایرانی تیل سے متعلق تمام برطانوی حقوق کے چھن جانے سے برطانوی بحری فوج کے لئے بڑی مشکلات پیدا ہو جائیں گی اگرچہ ان مشکلات میں ان حقوق کی وجہ سے جو برطانیہ کو عراق میں حاصل ہیں کچھ کمی ضرور ہو جائے گی۔ بظاہر تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ حکومت ایران کو ایسی یک طرفہ کارروائی کا حق نہیں حاصل تھا اور اس نے ایک ایسا معاہدہ منسوخ کر دیا جس کی میعاد ابھی تیس سال تک باقی ہے۔ لیکن بین الاقوامی مناقشات کا فیصلہ اسی آسانی اور سادگی سے نہیں کیا جا سکتا جس سے دو اشخاص کے باہمی جھگڑے طے کئے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل لحاظ ایرانی قوم کی ذہنی کیفیت ہے۔ یہ قوم ان تمام دیرینہ قیود سے آزادی چاہتی ہے جو گذشتہ حکومت کے زمانے میں ایران پر کسی طرح بھی عائد ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ انگلستان کے خلاف جذبات میں کچھ غیر معمولی جوش نظر آتا ہے جس کا اظہار اس واقعے سے بھی ہوتا ہے کہ حکومت ایران نے برطانوی ہوائی جہازوں کو اپنی سرزمین پر اڑنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

۲ر دسمبر ۱۹۳۲ء کو حکومت برطانیہ نے اینگلو پرشین آئل کمپنی کی طرف سے ٹھیکے کی منسوخی پر باقاعدہ سرکاری سطح سے احتجاج کیا۔ اس کے جواب میں حکومت ایران نے اپنے حقوق کا اعادہ کیا اور یہ بھی اعلان کیا کہ کمپنی کی املاک کو اگر اس زمانے میں کوئی نقصان پہنچے گا تو حکومت اس کی ذمہ دار نہ ہوگی۔ اس اعلان کے خلاف برطانوی دارالعوام میں ۵ دسمبر کو نائب وزیر امور خارجہ نے بہت سخت تقریر کی اور اس میں کہا کہ برطانوی حکومت کمپنی کی جائداد یا کاروبار کے کسی نقصان کو برداشت نہیں کر سکتی اور وہ کمپنی کے مفاد کی حفاظت کے لئے تمام جائز طریقوں سے کام لے گی۔ اس کے بعد ۸ر دسمبر کو یہ اعلان ہوا کہ حکومت برطانیہ اس معاملے کو عدالت عالم کے سامنے پیش کرے گی اور اس دوران میں تمام جائداد کی حفاظت کی ذمہ دار حکومت ایران ہوگی۔ اگر حکومت ایران حفاظت نہ کر سکے گی تو حکومت برطانیہ خود حفاظت کی تدابیر اختیار کرے گی۔

حکومت برطانیہ کی اس مداخلت پر ایران میں بہت خفگی کا اظہار کیا گیا اور تین دن کے غور و فکر کے بعد مجلس وزرا نے جس کی صدارت خود شاہ ایران نے کی تھی حکومت برطانیہ کی تحریر کا جواب دیا۔ اس جواب میں ٹھیکے کی منسوخی کے ۹ وجوہ گنائے گئے تھے اور عدالت عالم کے حق سماعت کی اس بنا پر تردید کر دی گئی تھی کہ یہ جھگڑا ایک حکومت اور ایک نجی کمپنی کے درمیان ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ حکومت ایران نے یہ بھی ظاہر کیا کہ وہ جمعیت اقوام کے سامنے حکومت برطانیہ کی دھمکی اور دباؤ کی شکایت پیش کرے گی۔
۱۴ر دسمبر کو حکومت برطانیہ نے خود ہی اس قضیے کو جمعیت اقوام کی مجلس کے سامنے پیش کیا اور اس طرح عدالت عالم سے رجوع کرنے کے خیال کو ترک کر دیا۔ ۱۵ر دسمبر کو ایرانی پارلیمنٹ کے ایک مباحثے کے دوران میں وزیر امور خارجہ نے یہ بیان کیا کہ حکومت ایران کی یہ کارروائی نہ تو حکومت برطانیہ کی مخالفت پر مبنی ہے اور نہ کسی غیر ملکی شخص یا جماعت کی مخالفت پر بلکہ ایرانی قوم اپنے حقوق کو حاصل کرنا چاہتی ہے اور ان کے حاصل کرنے کے لئے وہ ہر ممکن طریقہ اختیار کرے گی۔ حکومت ایران نے نظامت جمعیت اقوام سے یہ درخواست بھی کی کہ مجلس کی نشست ملتوی کر دی جائے تاکہ ایرانی نمائندوں کو تیاری کرنے اور جنیوا پہنچنے کا موقع مل سکے۔
۱۹ر دسمبر کو مجلس میں اس مسئلے پر کچھ ابتدائی گفتگو ہوئی اور عارضی طور پر ۲۳ر جنوری بحث و مباحثے کی تاریخ مقرر کی گئی۔
۲۰ر دسمبر کو ایرانی پارلیمنٹ نے ٹھیکے کی منسوخی کی تصدیق کی۔ حسین خاں علائی جو پہلے امریکہ اور فرانس میں ایرانی سفیر رہ چکے ہیں اور جو ایران کے بہترین مدبر سمجھے جاتے ہیں ایرانی وفد کی سرکردگی کے لئے منتخب ہوئے۔ وزیر امور خارجہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ حکومت برطانیہ کی مداخلت بے جا کی وجہ سے ایرانی حکومت اور اینگلو پرشین کمپنی میں کوئی

وہ ستا سمجھوتا نہ ہو سکا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ حکومت ایران نے کسی خارجی اثر سے متاثر ہو کر اس ٹھیکے کو منسوخ نہیں کیا ہے اور نہ ایرانی قوم کمپنی کی جائداد کو غصب کرنا چاہتی ہے بلکہ وہ تو صرف منافع میں سے اپنا واجبی حصہ لینا چاہتی ہے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اسی دن جب کہ وزیر امور خارجہ نے ان معتدل خیالات کا اظہار کیا ایرانی پارلیمنٹ نے ترکی سے دوستی اور غیر جانبداری کے ایک معاہدے کی تصدیق کی اور اٹلی سے جنگی جہاز اور جرمنی سے فوجی ہوائی جہاز منگانے کا فیصلہ کیا۔

مجلس جمعیت اقوام کے سامنے ۲۶ جنوری کو سر جان سائمن برطانوی وزیر امور خارجہ اور مرزا علی اکبر خاں داور ایرانی وزیر عدل کے درمیان اینگلو پرشین آئل کمپنی کے قضیے پر ایک دلچسپ مباحثہ ہوا۔ سر جان سائمن کا دعویٰ تھا کہ مراعات کی منسوخی ناجائز ہے اور اس وقت تک کوئی گفت و شنید نہیں ہو سکتی جب تک حکومت ایران حکم منسوخی کو واپس نہ لے لے۔ ایرانی مقرر نے یہ کہا کہ مجلس کو اس مسئلے کی سماعت کا اختیار ہی نہیں ہے اور نظیر میں خود حکومت برطانیہ کے رویے کو پیش کیا جو اس نے فنستان کے خلاف ایک قضیے میں جو جہاز رانی سے متعلق تھا اختیار کیا تھا۔ اس موقع پر حکومت برطانیہ نے یہ دلیل پیش کی تھی کہ فنستان نے برطانوی قانون کے مطابق خود انگلستان میں پوری چارہ جوئی نہیں کی تھی۔ داور نے کہا کہ اسی طرح اس موجودہ مسئلے میں اینگلو پرشین آئل کمپنی نے ان تمام مواقع سے فائدہ نہیں اٹھایا تھا جو اسے ایرانی عدالتوں میں حاصل تھے۔ سر جان سائمن نے جواب دیا کہ ایرانی عدالتوں میں چارہ جوئی سے کیا فائدہ جب خود ایرانی پارلیمنٹ نے منسوخی کی تصدیق کر کے ایک ایسا قانون نافذ کر دیا جس کی پابندی ایرانی عدالتوں پر فرض ہے۔ ایرانی وزیر نے اس کا یہ جواب دیا کہ ایرانی پارلیمنٹ کی تصدیق سے محض اظہار اعتماد مقصود تھا اور عدالتوں کے اختیارات پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس کے بعد مجلس کی نشست اس لئے ملتوی ہو گئی کہ فریقین کو باہمی گفت و شنید کا موقع دیا جائے۔ اس سلسلے میں چیکوسلوواکیا کے وزیر امور خارجہ نے بہت مدد کی اور بالآخر ۳۰ جنوری کو یہ اعلان کیا گیا کہ ایک عارضی سمجھوتا ہو گیا ہے۔

اس سمجھوتے کی دفعات یہ ہیں کہ برطانوی اور ایرانی حکومتیں اپنے قانونی حقوق کو محفوظ رکھتی ہیں لیکن فی الحال مجلس جمعیت اقوام کے سامنے اس مسئلے کے فیصلے پر اصرار نہیں کرتیں اور اسے آئندہ مئی تک ملتوی کرتی ہیں۔ اس درمیان میں کمپنی حکومت ایران سے نئے مراعات حاصل کرنے کی غرض سے فوراً گفت و شنید شروع کر دے گی۔ کمپنی اس زمانے میں اپنا کاروبار جاری رکھے گی۔ اگر گفت و شنید ناکام ثابت ہوئی تو یہ مسئلہ پھر مجلس کے سامنے پیش ہوگا۔

شذرات

پچھلے مہینے جامعہ ملیہ کے دائرے کے ایک رکن محمد عثمان صاحب اپنے عزیزوں اور رفیقوں کو داغِ جدائی دے گئے۔ مرحوم مدرسہ تحتانیہ کے معلم اور بچوں کے دار الاقامہ کے نگراں تھے اور اپنے احساسِ فرض، ذوقِ عمل اور حسنِ اخلاق کی بدولت جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ میں حقیقی معنی میں ہر دل عزیز تھے۔ ان کا جوش اور خلوص ان کے شاگردوں اور رفیقوں کے لئے نمونے کا کام دیتا تھا۔ کسی ضروری کام سے رخصت پر گھر تشریف لے گئے تھے۔ وہاں یکایک نمونیا میں مبتلا ہوئے اور دو تین دن کے اندر انتقال کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ہمیں مرحوم کی والدہ ماجدہ اور دوسرے اقربا سے دلی ہمدردی ہے اور ہم صمیم قلب سے دعا کرتے ہیں کہ خدا مرحوم کی مغفرت کرے اور ان کے عزیزوں، رفیقوں اور شاگردوں کو اس صدمۂ جانکاہ میں صبر عطا فرمائے۔ جامعہ کے ایک استاد نے مرحوم کی تاریخ وفات کہی ہے جو درج ذیل ہے۔

عثماں کہ نسبتش بہ محمدؐ قریب بود | بافرطِ شوق خود بہ جوارِ نبیؐ شتافت
پرسید سالِ رحلت او دل ز فکرِ من | "مرحوم شد محمد عثماں" جواب یافت

۱۳۵۱ھ

اپریل میں جامعہ کو ڈاکٹر سر محمد اقبال، عبد اللہ یوسف علی صاحب اور مولانا سید سلیمان ندوی کے خیر مقدم کا شرف حاصل ہوا۔ ایسے بزرگوں کی تشریف آوری ہم لوگوں کی نظر میں وہی قدر رکھتی ہے جو دوسروں کے نزدیک اربابِ جاہ و حکومت کے نزولِ اجلال کو حاصل ہے۔ مدرسہ عام معاشرے کا ایک ادارہ ہے اور اس کے ساتھ بے شمار رشتوں سے مربوط ہے۔ مدرسے کے اساتذہ اور طلبہ کو معاشرے کے نمائندوں یعنی مشاہیرِ قوم کی زیارت اور ان کی صحبت کے فیض سے بصیرت اور ہدایت کے علاوہ برکت اور تقویت بھی حاصل ہوتی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان مشاہیر میں سب سے زیادہ عقیدت مدرسے کے طلبہ اور اساتذہ کو اربابِ علم و فضل سے ہونا چاہیے کیونکہ ان کی اقلیم کے حکمراں یہی لوگ ہیں۔ بےشک اراکینِ سلطنت کا احترام بھی ایک قدرتی جذبہ ہے مگر اسی ملک میں جہاں سلطنت قومی اور ملکی ہو۔ ہندوستان میں تو یہ جذبہ عموماً اعلیٰ مقاصد کی بجائے ادنیٰ اغراض پر مبنی ہوتا ہے۔ سچے دل سے اگر قدر ہوتی ہے تو انھیں حضرات کی جو ذاتی جوہر رکھتے ہیں اور اسے ملک و قوم کی خدمت میں صرف کرتے ہیں

مولانا سید سلیمان صاحب ابتدا سے جامعہ پر نظر عنایت رکھتے ہیں اور پہلے بھی کئی بار تشریف لاکر ہم سب کو اپنے بزرگانہ اخلاق سے گرویدہ کر چکے ہیں۔ اس مرتبہ آپ اردو اکادمی کی دعوت پر تشریف لائے تھے۔ ۱۱ اپریل کے جلسے میں آپ نے "مسلمانوں کی آیندہ تعلیم" کے موضوع پر ایک فاضلانہ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں عام تعلیم اور خاص مذہبی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے موجودہ تعلیم پر تنقید تھی اور اس کی اصلاح کی صورتیں بتائی گئی تھیں۔ موصوف کے خیالات اس بحث پر بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ جمہور ملت کی دینی اور تعلیمی ضروریات کا جو اندازہ آپ کر سکتے ہیں وہ محکمۂ تعلیم کے افسر یا فن تعلیم کے ماہر ہرگز نہیں کر سکتے کیونکہ ان حضرات کو نہ عام مسلمانوں کی معاشرتی حالت کے مطالعے کی طرف توجہ ہے اور نہ اس کا موقع حاصل ہے۔ ہم اس خطبے کو مئی اور جون کے جامعہ میں شائع کریں گے اور اس کے بعد بہت جلد یہ علیحدہ رسالے کی صورت میں چھپ جائے گا۔

اس سال یہ اردو اکادمی کا پہلا جلسہ تھا کیونکہ جنوری اور فروری میں رمضان کی وجہ سے کوئی جلسہ نہیں ہو سکا اور مارچ میں ہمارے اور کل قوم کے معزز مہمان حسین رؤف بے صاحب کے لکچر ہوتے رہے۔ اب انشاءاللہ اگست سے دسمبر تک ہر مہینے جلسے ہوں گے اور اس کمی کی پوری طرح تلافی ہو جائے گی۔

علامہ اقبال جامعہ سے ہمیشہ ہمدردی فرماتے رہے ہیں چنانچہ ۱۹۲۶ء میں جامعہ کی امداد کے لئے قوم سے جو اپیل کیا تھا اس پر صرف پانچ چھ بزرگوں کے دستخط تھے جن میں علامہ موصوف بھی شامل تھے۔ مگر ہم لوگوں کی بدقسمتی سے آپ کو ابھی تک جامعہ میں تشریف لانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ پچھلے مہینے کے آغاز میں آپ ایک دن چائے کی دعوت میں تشریف لائے اور اس کے بعد لاہور سے زحمت سفر اٹھا کر خاص اس غرض سے دہلی آئے کہ رؤف بے صاحب کے دوسرے لکچر میں صدارت فرمائیں اور چونکہ تیسرے لکچر کے صدر ڈاکٹر سپرو صاحب تشریف نہیں لا سکے اس لئے اس میں بھی آپ ہی نے مسند صدارت کو زینت بخشی۔ اسی زمانے میں جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ کی التجا پر آپ نے وعدہ فرمایا کہ تھوڑے ہی دن کے بعد پھر تشریف لا کر اہل جامعہ کو اپنی تقریر سے مستفید فرمائیں گے۔ ۵ اپریل وہ مبارک تاریخ تھی جب آپ نے اس وعدے کا ایفا کیا۔ ۵ بجے شام کو آپ نے جامعہ کی انجمن اتحاد کا سپاسنامہ قبول فرمایا اور اس کے جواب میں محبت اور شفقت کے جو کلمے ارشاد کئے وہ ہم لوگوں کے دل سے کبھی محو نہ ہوں گے۔ اس کے بعد ۵½ بجے شب کو آپ نے اپنے سفر یورپ کے حالات پر تقریر

خیالات جس کا عنوان آپ نے "لندن سے غرناطہ تک" قرار دیا تھا۔ اس کے سب سے دلچسپ حصے دو تھے۔ ایک وہ جس میں آپ نے فرانس کے مایۂ ناز فلسفی برگساں سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا دوسرا وہ جس میں آپ نے جدید اسپین کے حالات بیان فرمائے خصوصاً اس رجحان پر روشنی ڈالی جو وہاں کے باشندوں کو آج کل اسلامی تمدن کی طرف ہے۔ آپ کے خیال میں جو لوگ تہذیب اور معارف اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے اسپین میں جا کر رہنا ناگزیر ہے اور انھیں وہاں کی حکومت اور وہاں کے ارباب علم سے ہر طرح کی مدد ملے گی۔

علامہ موصوف کی صحبت سے تھوڑے عرصے میں کئی بار مستفید ہونے کے سبب سے وہ عقیدتمندانہ ذاتی روابط جو جامعہ کے بہت سے استاد اور طالب علم آپ سے رکھتے تھے اور گہرے ہو گئے اور مجموعی حیثیت سے اس قومی ادارے سے آپ کا رشتہ تعلق اور مستحکم ہو گیا۔ امید ہے کہ آئندہ آپ جب کبھی دہلی تشریف لائیں گے تو جامعہ کو اپنا گھر سمجھ کر یہیں قیام فرمائیں گے اور ہمیں خدمت اور استفادے کا موقع دیں گے۔

عبداللہ یوسف علی صاحب جناب شیخ الجامعہ کی دعوت پر تشریف لائے اور آپ نے نہایت غور سے جامعہ کے ہر شعبے کو دیکھا اور ہر چیز کے متعلق بہت تفصیل سے سوالات کئے۔ آپ کا یہ معائنہ خالص تنقیدی نظر سے تھا اور اس میں رعایت کو بہت کم دخل تھا۔ شکر ہے کہ اس کا نتیجہ ہمارے حسب مراد نکلا اور آپ نے ہر طرح اطمینان اور استحسان کا اظہار فرمایا۔ اس وقت آپ دہلی میں مزید قیام نہیں کر سکتے تھے اس لئے جامعہ میں کوئی تقریر نہ کر سکے مگر آپ نے وعدہ فرمایا ہے کہ موسم سرما میں یورپ سے آنے کے بعد ہم لوگوں کو اپنے خطبے سے مستفید کریں گے۔

جن حضرات کو اردو زبان کی اشاعت اور ترقی کی فکر ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ طباعت اور رسم خط کا مسئلہ کتنی زبردست اہمیت رکھتا ہے۔ ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ پتھر کی چھپائی زمانے کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی اور اگر اردو زبان کو دوسری زبانوں کا مقابلہ کرنا ہے تو ٹائپ کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ نسخ کا ٹائپ اردو میں مدت سے موجود ہے مگر وہ مقبول نہیں ہوا کیونکہ نستعلیق کی دلکشی ہماری نظروں اور دلوں کو اس قدر مسحور کر چکی ہے

کہ ہمارے اس کے کوئی خط ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ مدت سے حکومت حیدرآباد کی سرپرستی میں نستعلیق ٹائپ بنانے کی کوشش ہو رہی ہے اور اس میں بہت کچھ کامیابی بھی ہو چکی ہے مگر ابھی وہ ٹائپ جو حیدرآباد میں بنا ہے تجارتی حیثیت سے گراں پڑتا ہے اور اسے عام رواج حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہمیں یہ معلوم کرکے نہایت مسرت ہوئی کہ ایس اینڈ قریشی صاحب جو طباعت خصوصاً ٹائپ سازی کے ماہر ہیں اور مدتوں سے اس مسئلے کی تحقیق علمی اصول پر کر رہے ہیں ایسا ٹائپ بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو خوبصورت اور دیدہ زیب بھی ہے اور اسی کے ساتھ ان شرائط کو بھی پورا کرتا ہے جو تجارتی حیثیت سے کامیاب ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس ٹائپ کو طیار کرنے کے لئے ایک کارخانہ "قابل اطمینان نستعلیق ٹائپ فاؤنڈری" کے نام سے قرول باغ دہلی میں کھولا ہے۔ اور اس کارخانے کو چلانے کے لئے ایک کمپنی ایک لاکھ روپیے کے سرمایے سے قائم کی ہے جس کے حصے دس دس روپیے کے رکھے گئے ہیں۔ ہم نے قریشی صاحب سے گفتگو کرنے کے بعد اس امر کا پورا اطمینان کر لیا ہے کہ قریشی صاحب اس فن کے ماہر ہیں اور نہایت محنت اور صبر کے ساتھ علمی اور عملی اصول پر کام کرتے ہیں اس لئے ہمیں قوی امید ہے کہ ان کا بنایا ہوا ٹائپ فنی حیثیت سے مکمل ہوگا۔ البتہ اس پر رائے دینے کے ہم اہل نہیں ہیں کہ نستعلیق ٹائپ کو تجارتی حیثیت سے کہاں تک کامیابی حاصل ہو سکتی ہے اور اس کمپنی کا نظم و نسق کیسا ہے۔ بہرحال ہم ان سب حضرات سے جنھیں اردو زبان کی بقا اور ترقی منظور ہے پرزور سفارش کرتے ہیں کہ قریشی صاحب سے مل کر یا خط و کتابت کے ذریعے اس کمپنی کے متعلق اپنا اطمینان کرلیں اور پھر اس کے حصے خود بھی خریدیں اور اپنے دوستوں کو بھی خریداری پر آمادہ کریں۔ زبان کی سچی خدمت کا یہ نہایت عمدہ ذریعہ ہے۔

شاعری کے قدردانوں، تاریخ اسلام کے شائقوں بلکہ ان لوگوں کو جو اسلام کے نام لیوا ہیں یہ سن کر مسرت ہوگی کہ حضرت حفیظ جالندھری کے شاہنامۂ اسلام کی دوسری جلد بھی طیار ہو گئی ہے اور عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ یہ جلد بھی دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں جنگ بدر، فتح مکہ اور اس کے بعد کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ پہلی جلد کو جو قبول عام حاصل ہوا وہ شاید ہندوستان میں اس صدی کی بہت کم کتابوں کو نصیب ہوا ہوگا۔ گھر گھر یہ کتاب پہنچ گئی ہے۔ بچے بچے کی زبان پر اس کے شعر ہیں۔ لوگ اسے جلسوں میں سناتے ہیں، چھوٹے چھوٹے حلقوں میں پڑھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علاوہ شاعرانہ خوبیوں کے اس کا ہر شعر جوش اور خلوص میں ڈوبا ہوا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ دوسری جلد بھی ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی تاکہ مصنف کو اس سلسلے

کی تکمیل کا حوصلہ ہو۔ کتاب کے معمولی ایڈیشن (غیر مجلد) کی قیمت تین روپے اور خاص ایڈیشن (مجلد منقش مطلا) کی قیمت ساڑھے بارہ روپے ہے۔ کتب خانہ شاہنامۂ اسلام، انار کلی، لاہور سے مل سکتی ہے۔

اس مہینے ملک و ملت کے سر سے ایک ایسے بزرگ کا سایہ اٹھ گیا جس کا نظیر زمانہ بڑی مشکل سے پیدا کرے گا۔ سید حسن امام مرحوم کی ذات میں علم و فضل، جاہ و مرتبت، دولت و ثروت کے علاوہ حب وطن اور درد قوم کی صفات بھی بدرجہ اتم موجود تھیں اور ملک کا ہر طبقہ آپ کے تدبر اور خلوص کا معترف تھا۔ سیاست میں آپ حریت پسندانہ پالیسی پر عامل رہے۔ چنانچہ نیشنل کانگریس کی صدارت پر بھی فائز ہوئے۔ آخر میں آپ سیاسی معاملات سے علیحدہ رہتے تھے مگر پھر بھی آپ کی ہمدردی اور آپ کے مشورے سے قومی تحریک کو قابل قدر مدد ملتی رہتی تھی۔ آپ کی وفات ساری قوم اور سارے ملک کے لئے نہایت سخت حادثہ ہے اور آپ کے عزیزوں خصوصاً والد بزرگوار اور صاحب زادوں کے لئے تو ایسی جاں کاہ مصیبت ہے جس کے برداشت کرنے کی قوت خدا ہی دے سکتا ہے، بندوں کے حد اختیار بلکہ حد خیال سے باہر ہے۔ ہم دل سے مرحوم کی مغفرت اور پسماندگان کی تسکین کی دعا کرتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

علی گڑھ میگزین

مدیر

آلِ احمد سرور بی ایس سی

علی گڑھ میگزین نہ صرف طلباء کے تمام رسائل پر یک گونہ فوقیت رکھتا ہے بلکہ اسکے اور رسائل میں بھی اسے ایک امتیازی درجہ حاصل ہے کیونکہ مشرق و مغرب کے بہترین اسعدین کا بہترین نمونہ بھی ہے۔ بصیرت افروز مقالے اور اعلیٰ ترین تنقیدیں اسکی زینت ہوتی ہیں۔ مغربی زبانوں سے بہترین تراجم برابر درج ہوتے رہتے ہیں اور اردو کے تمام ممتاز شعراء کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔

اگر دنیائے ادب میں علی گڑھ کی ترقی دیکھنا ہو تو علی گڑھ میگزین ملاحظہ فرمائیے

قدیم طلباء کے لئے مادر کالج کی یاد تازہ کرنے کے لئے اس سے اچھا پرچہ نہیں۔

علم و ادب کے شائقین ضرور اس کے خریدار بنیں۔ سالانہ چندہ ساڑھے تین روپے معہ محصول جس میں سالنامہ بھی شامل ہے نمونے کا پرچہ ۸

منیجر علی گڑھ میگزین مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ دہلی

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے؛ پی ایچ۔ ڈی۔

جلد ۲۰	بابتہ ماہ مئی سنہ ۱۹۳۳ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر رسالہ جامعہ سے شائع کیا۔

مسلمانوں کی آیندہ تعلیم

یہ خطبہ جناب مولانا سید سلیمان ندوی نے اردو اکادمی کے جلسے میں ۱۱ اپریل ۱۹۳۳ء کو پڑھا تھا۔ ہم اسے دو قسطوں میں تمنٰی اور جوان کے پرچوں میں شائع کریں گے۔ اس کے بعد انشاء اللہ بہت جلد یہ علیحدہ رسالے کی صورت میں چھپ جائے گا۔

دوستان و عزیزان جامعہ! آج سے آدھی صدی پہلے مولانا شبلی مرحوم نے علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک جلسے میں "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" پر ایک مضمون پڑھا تھا جو نہایت مقبول ہوا تھا۔ اب آدھی صدی کے بعد ضرورت ہے کہ "مسلمانوں کی آیندہ تعلیم" کے مسئلے پر غور کیا جائے۔

اُسی زمانے میں سر سید مرحوم نے مسلمانوں کے انحطاط کا سبب اور اس کا علاج مسلمانوں کے اہل دماغ طبقے سے پوچھا تھا۔ بہت سے صاحبوں نے اس کا سبب جہالت اور اس کا علاج "تعلیم جدید" کو قرار دیا تھا۔ چنانچہ نصف صدی تک ہم نے اس فیصلے پر آنکھ بند کرکے عمل کیا اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہے۔ اب نصف صدی کے بعد پھر اس سوال کی ضرورت ہے کہ ہم کو کس قسم کی جدید تعلیم چاہیئے۔ ان پچاس برسوں میں ہم نے صرف تعلیم تعلیم پکارا ہے اور ایک منٹ کے لئے بھی اس پر غور نہیں کیا ہے کہ کیسی تعلیم؟

ترک موالات کی پچھلی تحریک پہلا موقع تھا جس میں مسلمان نادانستہ طور سے اچانک اس موڑ پر پہنچ گئے جہاں ان کو اس کا فیصلہ ضروری ہوگیا ورنہ ہلاکت کا عمیق غار ان کے پاؤں کے نیچے تھا۔

اب یہ کوئی چھپا راز نہیں کہ تعلیم کے مسئلے پچاس برس پہلے کے مقابلے میں اب بالکل اور نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ پہلے جدید تعلیم کی ضرورت کا سب سے بڑا سبب سرکاری نوکریاں تھیں اور یہ یقین تھا کہ سرکاری نوکریوں کا دروازہ اسی کنجی سے کھلے گا، لیکن اب یہ مسئلہ اس صورت کے بجائے اس صورت میں ہے کہ نئی تعلیم کی ضرورت اس لئے ہے کہ "پیٹ" کا سوال اسی سے حل ہوگا۔ پچاس

برس کے بعد مولانا حالی کا یہ طعنہ واقعے کی شکل میں ہمارے سامنے آگیا۔

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کماکر　　وہ کھوئے گئے اور تعلیم پاکر

مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اوسط ہرسال آگے بڑھ رہی ہے آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ سے مولانا شبلی نے اپنے وطن کے دوستوں کو یہ مبارکباد بھیجی تھی کہ

"اب کی پٹنہ محمڈن اسکول سے جو خاص مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے آٹھ لڑکے انٹرنس میں پاس ہوئے، جن میں پانچ مسلمان ہیں۔" (مکاتیب اول صفحہ ۳، طبع دوم)

اور اب یہ حال ہے کہ ہرسال انٹرنس اور میٹرک کیا اس سے وہ چند گریجویٹ ہو رہے ہیں، تاہم اب کیا مسلمانوں کا انحطاط کم ہوگیا اور وہ اب ترقی کر رہے ہیں؟ مولانا شبلی مرحوم جب مولویوں کے مدرسوں کو چھوڑ کر علی گڑھ کالج آئے تھے تو وہاں کے طلبہ کو دیکھ کر حسب ذیل فقرے لکھے تھے :۔

"یہاں آکر میرے خیالات مضبوط ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے۔ مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں، یہاں ان چیزوں کا ذکر نہیں آتا، بس خالی کوٹ پتلون کی تماشا گاہ ہے۔ ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی۔ اے کی نسبت یہ خیال دلاتے تھے کہ وہ مذہبی باتوں کو تمامتر ضعیف ثابت کر دیں گے، لاحول ولا، وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی سمجھ نہیں سکتے۔"

"سید صاحب (سرسید) نے اکثر مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو کسی مجمع میں کچھ کہہ سکے یا لکھ سکے، صرف تین شخصوں کو مستثنیٰ کرتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انگریزی ان کے دماغوں میں کچھ تبدیلی نہیں پیدا کرتی۔"

یہ خط ۱۸۸۳ء کا ہے جس کو اب پورے پچاس برس ہوئے۔ کیا تھوڑے تغیر کے ساتھ مسلمانوں کی جدید تعلیمی کیفیت یہی نہیں ہے؟ اصل یہ ہے کہ ہم نے جب جدید تعلیم کی اشاعت کا کام شروع کیا تو یہ سمجھے کہ گویا اے بی سی ڈی ہمارے کامیابیوں کے خزانے کی وہ کنجی ہے جو کبھی الف لیلہ کے علی بابا کو ہاتھ آگئی تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں ہم کو تعلیم کی حقیقت پر ایک لمحہ غور کرنا چاہیے۔

تعلیم | تعلیم کے لفظی معنی سکھانے کے ہیں اور ہم اپنی زبان میں اس کے معنی سیکھنے سکھانے کے لیتے ہیں اور اس سے مراد پڑھنے اور لکھنے کا فن سیکھنا ہے اور آج کل اس کے معنی اس سے بھی زیادہ محدود ہیں یعنی انگریزی زبان میں لکھنے اور پڑھنے کو ہم تعلیم کہتے ہیں۔ ہم نے اب تک باب بار جب تعلیم کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس سے مراد وہ سرکاری تعلیم لی ہے جو عام یونیورسٹیوں کے ماتحت دی جاتی ہے۔ دوسرے معنوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ لکھنے اور پڑھنے کا وہ ہنر یا پیشہ جو سرکاری نظام کے ماتحت سکھایا جاتا ہے۔

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرنا چاہیے کہ کسی زبان کے چند حروف کو لکھنا اور ان کو پڑھ لینا اسی طرح کا ایک ہنر یا پیشہ ہے جس طرح نجاری، لوہاری، معماری اور دنیا کے دوسرے پیشے ہیں۔ اگر کوئی اس حرف شناسی کے ہنر یا پیشے سے ناواقف ہے تو وہ اسی طرح موردِ الزام ہو سکتا ہے جس طرح اس بات پر کہ وہ نجاری یا لوہاری یا معماری کا کام کیوں نہیں جانتا۔ موجودہ عہد سے پہلے کبھی کسی قوم کی ترقی اور تنزل کے مسئلے میں یہ چیز حدِ فاصل نہ تھی کہ اس میں فی صدی کتنے لوگ لکھنے اور پڑھنے کا پیشہ جانتے ہیں۔ کیا جب عربوں نے رومیوں اور ایرانیوں کو شکست دے کر تاج و تخت پر قبضہ کیا وہ اپنی فی صدی تعلیم میں اپنے حریفوں سے بڑھ کر تھے۔ پھر جب انھیں عربوں کو سسلی میں نارمنوں نے اور اندلس میں اسپینیوں نے اور عراق و خراسان میں تاتاریوں نے شکست دی تو وہ فی صدی تعلیم میں ان نارمنوں، اسپینیوں اور تاتاریوں سے کم تھے۔

خود ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک طرف سکھوں نے اور دوسری طرف مرہٹوں نے دبا کر ان کے نظامِ حکومت کو درہم برہم کر دیا تو سکھ اور مرہٹے اس وقت مسلمانوں سے فی صدی تعلیم میں بڑھ کر تھے؟

عزیزو! یہ "فی صدی" کا لفظ بھی ان منتروں میں ہے جن کو یورپ کے سیاسی ساحروں اور جادوگروں نے اپنی محکوم دنیا میں پھونک رکھا ہے اور اب ہم اس سے اتنے مسحور ہو گئے ہیں کہ ہر چیز کو اسی جادو کی ترازو سے تول کر جانچتے اور مانتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قوم کی قوت اور طاقت اس کی کمیت اور تعداد میں نہیں بلکہ اس کی کیفیت میں ہے۔ اگر کہیں صرف تعداد کی کثرت قوت کی مرادف ہوتی تو ۵۰ ہزار انگریز ۳۵ کروڑ ہندوستانیوں پر حکومت نہ کر سکتے اور نہ چار کروڑ جاپانی چالیس کروڑ چینیوں کو ہر قدم پر شکست دیتے چلے جاتے۔

قوم کی ترقی کا راز ان واقعات سے جو مشاہدات ہیں یہ راز خود بخود فاش ہو جاتا ہے کہ قوم کی ترقی کا راز فی صدی کا جادو نہیں بلکہ اس قوم کی قومیت کی معنوی روح اور ذہنی قوت میں ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ قوم کے سامنے اس کی زندگی کا کوئی متفقہ اور متحدہ مقصد ہو، اس کے افراد اپنے ذاتی اور شخصی اغراض زندگی کے ساتھ ساتھ من حیث المجموع ایک مشترک مقصود زندگی رکھتے ہوں جس کے حصول میں اس کا ہر چھوٹا بڑا، امیر غریب، عورت مرد غرض اس قوم کا ہر فرد پوری طرح مصروف و منہمک ہو اور اسی کی دھن میں اس کا جینا، مرنا، اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا سب کچھ ہو اور ہر فرد کو یہ متحدہ مقصد اتنا عزیز ہو کہ جب کبھی اس کے سامنے اس کے ذاتی اور شخصی مقاصد اس کے مشترکہ قومی مقصد سے متصادم ہوں تو بے تأمل وہ اپنے تمام ذاتی مقاصد اور شخصی فوائد یہاں تک کہ خود اپنے وجود کو بھی اس پر نثار کر دے۔

اٹھارھویں صدی کے ہندوستان کی تاریخ میں جو واقعات پیش آئے ان کی تحلیل کیجیے تو اس راز سے خود بخود پردہ اٹھ جائے گا کہ ارکاٹ، سرنگاپٹم، پلاسی، بکسر، لکھنؤ اور دلی میں مٹھی بھر انگریز ہندوستانی ریاستوں اور سلطنتوں کو اس آسانی سے کیوں کر توڑ پھوڑ کر رکھ دیتے تھے۔ ایک طرف ایک متفقہ مقصد، متحد قوت اور منظم طاقت تھی، دوسری طرف منتشر افراد اور پراگندہ اشخاص تھے جن میں سے ہر ایک کا مقصود الگ اور مطلب جدا تھا۔ کہیں اگر کوئی خاندان حکمراں تھا تو اس کے مختلف افراد بھی اس ریاست کی گدی اور مسند کے لئے باہم نبرد آزما تھے۔ آرکاٹ اور بنگال کی نوابیوں میں کیا یہی پیش نہیں آیا، حیدر علی اور ٹیپو جنھوں نے اپنے سامنے ایک مضبوط مقصد رکھا تھا، دیکھئے کہ ان کی یہ ذہنی مضبوطی ان کی جسمانی اور فوجی مضبوطی کی صورت میں کس طرح ڈھل گئی تھی اور اس وقت تک اس "آہنی انسان" کی قوت میں کمزوری نہیں آئی جب تک اس کے خاندان اور دربار میں وحدت کی جگہ شخصی مقاصد اور ذاتی منافع کی کثرت نہ آ گئی۔ مذہب کی اصطلاح میں اسی "ذہنی وحدت مقصد" کا نام **ایمان** ہے جس کے بغیر کسی عمل کو اعتبار کا درجہ نہیں مل سکتا۔

اخلاق اور کیرکٹر کی مضبوطی جس کے بغیر کسی قوم کی معنوی زندگی کا وجود ہی نہیں ہو سکتا بہت کچھ اسی مقصد عزیز کی گراں بہا متاع کی حفاظت، بقا، ترقی اور استواری کی خاطر وجود میں آتی ہے۔ ایثار،

قربانی، عزم، استقلال، بیباکی، بہادری اور موت سے بے خوفی اسی طلسم کے روحانی اسرار ہیں۔ یہ حقیقت میں وہ
جرس ہے جس کی آواز پر قوموں کے قافلے اپنے سفر طے کرتے ہیں اور کامیابی کی منزل کا پتہ لگاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ہماری قوم کا اس دنیا میں کوئی بھی متحدہ مقصد ہے؟ اگر نہیں ہے تو وہ قوم نہیں
بلکہ جانوروں کا گلہ اور حیوانوں کا جھنڈ ہے۔

غور سے دیکھئے اسی ملک میں ہندو قوم آباد ہے۔ اس پر انقلابات کے بیسیوں دور گذر چکے
ہیں صدہا سال کی حیرانی و سرگردانی کے بعد اس نے اب اپنی زندگی کا ایک مقصد قرار دے لیا ہے،
ان کے چھوٹے سے لے کر بڑے تک، نوکری پیشے سے لے کر آزادی طلب تک، غریبوں سے لے کر
دولت مند مہاجنوں تک، محکوموں سے لے کر ان کے رئیسوں اور راجاؤں تک، اور سب سے بڑھ کر یہ
کہ ان کے کانگریسیوں سے لے کر خوشامدیوں تک ہر ایک نے اپنے سامنے کم از کم ایک متحدہ مقصد رکھ لیا ہے
اور وہ مخالفت کی ہر قوت کو ٹھکرا کر اور عائق و مانع کی ہر دیوار کو ہٹا کر ہندو ذاتوں کو واحد قوم بنانا اور اس
کے تمام پچھلے خصوصیات کے ساتھ اس کو اس ملک میں مستقل وجود بخشنا۔ اب اس قوم کی ہر کوشش ہر راہ
سے اسی ایک منزل مقصود پر آکر ختم ہوتی ہے۔ اس کے اہل سیاست کی کوشش یہ ہے کہ اس کو سیاسی
خود مختاری اور اس ملک پر حکومت کی پوری ذمہ داری بخشیں۔ اہل تعلیم اس کو تعلیمی ذرائع سے حاصل کرنے
کے لئے اس کے علم وفن کے پیمانے کو اونچا کر رہے ہیں، اصلاح معاشرت کے کارفرما اس کو معاشرتی
اور تمدنی طریقوں سے آگے بڑھا رہے ہیں، اہل دین اس کی دینی وحدت کی دھن میں ہیں، اہل علم اس
کے معلومات کا خزانہ بھر رہے ہیں، اہل ادب اس کے لئے ایک واحد زبان کی تخلیق میں مصروف ہیں، انتہا
یہ ہے کہ اس کے مجبور قیدی بھی ذاتوں کی تفریق کے خلاف حصول وحدت کے لئے پس دیوار لڑ رہے ہیں،
الغرض "قومی وحدت" کی تشکیل کی جتنی صورتیں اور تدبیریں ہیں قوم کے مختلف کارکن اور کارفرما اپنے اپنے
مذاق کے لحاظ سے ان میں سے ہر ایک کی تکمیل میں مصروف ہیں اور ان میں سے ہر ایک یہ جانتا ہے
کہ دوسرا بھی دوسری راہ سے وہیں جا رہا ہے جہاں وہ خود جانا چاہتا ہے اس لئے راہ رو اور راہ بر
باہم دست و گریباں نہیں۔

الغرض قوم کی زندگی کے لیے سب سے پہلی چیز "وحدتِ مقصد" کا وجود ہے۔ یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے ارد گرد قوم کے تمام افراد کے اعمال چکر کھاتے ہیں، حکمراں اپنی حکومت کے تخت پر، واعظ اپنے منبر پر، سپاہی اپنے میدان میں، اہلِ پیشہ اپنے بازار میں، عالم اپنی درس گاہ میں، صناع اپنی کارگاہ میں، اخبار نویس اپنے دفتر میں، یہاں تک کہ اس کے مجرم اور ڈاکو بھی اپنی کمین گاہ میں اپنے دوسرے کاموں کے ساتھ اسی ایک مقصد کے لیے جیتے اور مرتے ہیں۔

تعلیم کا پہلا مقصد، مقصدِ زندگی کی تبلیغ

تعلیم کا پہلا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ قوم کے افراد میں اس کے واحد مقصد کی تبلیغ اور تکمیل کا فرض انجام دے۔ قوم کے ہر فرد میں بچپن سے اس مقصد کی صحت کا یقین اور اس کی رفعت اور بلندی کی تقدیس اور اس کے حصول اور بقا کی خاطر ہر آزمایش اور امتحان میں پڑنے کی غیر متزلزل جرأت پیدا کرے۔

ہم کو پہلے سوچنا چاہیے کہ اول مسلمانوں کے سامنے اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے ان کی زندگی کا کوئی مقصد ہے بھی۔ اگر ہے تو ہندوستان کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک کوئی درس گاہ اپنے سامنے وہ نصب العین رکھتی ہے۔

ہمارا پچھلا نظامِ تعلیم کتنا ہی برا سہی، لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کے سامنے ایک مقصد تھا، اور وہ مذہب کی خدمت اور اس کے زیرِ سایہ علوم و فنون کی تحصیل۔ اس مقصد کا اثر یہ تھا کہ تعلیم ہمارے نظامِ زندگی میں ایک دنیوی نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ تھا، یہاں تک کہ کتابیں اور کتابوں کے اوراق بھی ہمارے نزدیک مقدس اور ادب اور احترام کے قابل تھے، ہمارے اندر مذہب کی شیفتگی اور عقیدت تھی اور اس کی خدمت کے لیے ہر علم و فن کو سیکھتے تھے اور پڑھتے تھے۔ ہم نے فلسفہ یونان سے اور ریاضیات ہندوستان سے سیکھا اور اسی طرح دوسرے عقلی علوم بھی دوسری غیر مسلم قوموں سے لیے، اگر غور سے دیکھیے کہ ہمارے اسلاف نے ان میں پوری اصلاح و ترمیم کرکے ان کو اپنے نصابِ درس میں اس طرح رکھا کہ وہ آج تمامتر اسلامی علوم معلوم ہوتے ہیں۔ ارسطو اور افلاطون کا فلسفہ جو کہتے ہیں کہ دہریت سکھاتا ہے جب وہ ہماری مشرقی درسگاہوں میں پڑھایا جاتا ہے تو پہلے اعوذ باللہ اور پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر شروع کیا جاتا ہے، خدا کا نام آتا ہے تو

یچر اور فطرت کے بے حس اور بے جذباتی ناموں سے اس کی تعبیر نہیں ہوتی بلکہ واجب تعالیٰ، باری تعالیٰ اور مبدءِ فیاض کے فلسفیانہ لیکن با ادب ناموں سے اس کی تعبیر کی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فلسفہ پڑھنے کے باوجود مشرقی درس گاہوں کے طلبہ میں بے دینی یا مذہبی بے حسی پیدا نہیں ہوتی۔

جب ہمارا فلسفی مصنف اپنے فلسفے کا آغاز کرے گا تو قرآن پاک کی اس آیت کی تعلیم کو اپنی غرض بنائے گا کہ وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی نیکی دی گئی)، جب ہیئتِ فلکیات کا درس دے گا تو تمہید میں وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ اور رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا اور لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ اور فلکیات کی دوسری مناسب آیتوں کو پہلے پیش کرے گا۔ جغرافیے کی کتاب لکھے گا تو کہے گا کہ یہ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ کی تفسیر ہے۔ علم طب پڑھائے گا تو شِفَاءٌ لِلنَّاسِ اور العلم علمان علم الادیان وعلم الابدان کو دیباچے میں ذکر کرے گا۔ فلکیات کی ایک کتاب کا مصنف امام غزالیؒ کے اس فقرے کو طغرائے فخر بنا کر آگے بڑھتا ہے (من لم یعرف الھیئة والتشریح فھو عنین فی معرفة اللہ تعالیٰ (اور جس نے ہیئت اور علم تشریح کو نہیں جانا تو وہ خدا کی معرفت میں نامراد ہے)۔ غرض جس علم و فن کو بھی ہماری کتابی تعلیم ہمارے سامنے رکھتی تھی اس کو اپنے مقصد میں رنگ کر پیش کرتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر عقلی علم و فن اور ہر دنیاوی صنعت و ہنر بھی سرتاپا دین اور یکسر مذہب کے پیکر میں جلوہ گر ہوتا تھا۔ ہمارے اساتذہ آج کل کے علمی دکان دار اور دنیاوی پیشہ ور کی حیثیت نہیں بلکہ وارثِ پیغمبر، نائبِ رسول اور روحانی باپ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس لئے ہر شاگرد اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ وہ استاد کے رنگ میں رنگ کر ظاہر ہو اور استاد بھی آج کل کی طرح اپنے کام کو داد و ستد کا معاملہ اور ایک ہاتھ سے لینے اور دوسرے ہاتھ سے دینے کی ڈیوٹی اور مزدوری کا پیشہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایک مقدس کام اور دینی فریضہ۔ اس لئے اس راہ میں ان سے وہ وہ ایثار اور قربانی کے مظاہر مناظر پیش ہوتے تھے جن کو آج کل لوگ مشکل سے باور کر سکتے ہیں۔

آج کل کی تعلیمی تاریخ میں یہ کوئی انوکھی بات نہیں کہ چند روپیوں کی خاطر استاد اس کالج سے اُس کالج اور اِس یونیورسٹی سے اُس یونیورسٹی میں دوڑے پھرتے ہیں اور صرف بڑی تنخواہ کو اپنی عزت کا

ذریعہ جانتے ہیں اور ہمہ وقت پانچ پانچ دس دس روپے کے اضافوں کی خاطر زمین و آسمان کے قلابے ملاتے رہتے ہیں۔

لیکن ہماری پچھلی تعلیمی تاریخ میں یہ واقعے بداخلاقی اور دون ہمتی کی مثال سمجھے جاتے تھے، اول تو تعلیم پر اجرت اور معاوضہ لینے ہی کو وہ تقویٰ اور دیانت کے خلاف سمجھتے تھے اور پھر لیتے بھی تھے تو وجہ کفاف سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ وہ بڑے بڑے علما جن کے ناموں کی عزت ہمارے دلوں میں ہے انھوں نے دس دس اور پندرہ پندرہ روپیوں پر اپنی زندگی بسر کر دی ہے اور لطف یہ کہ وہ اپنے اس ایثار کو ایثار کہہ کر لوگوں پر اپنے احسان کا بار بھی نہیں رکھتے تھے۔

تعلیم کے لئے وطن سے باہر نکلنا اور خصوصاً بیرونی ملکوں میں جانا آج ہمارے لئے تعجب انگیز سمجھا جاتا ہے لیکن ایک وہ زمانہ بھی گذر چکا ہے جب ہماری نگاہوں کے سامنے زندگی کا مقصد اور حیات کا نصب العین تھا تو علم کی طلب میں نہ تو خشکی کی مسافت اور نہ تری کی ہولناکی ہماری ہمتوں کو پست اور ہمارے ارادوں کو کمزور کرتی تھی۔ محدثین نے ایک ایک حدیث کی خاطر مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق تک کی سرزمین کو چھان ڈالا تھا۔ بخارا کا یتیم محمد بن اسماعیل بخاری اپنی بیوہ ماں کے زیرسایہ ترکستان سے عرب جاتا ہے اور واپسی میں عراق، ایران اور خراسان کے ایک ایک مشہور شیخ کی درس گاہ کو چھان ڈالتا ہے۔ مصر کے طالب العلم خراسان آتے ہیں، خراسان کے مصر جاتے ہیں، اسپین اور سسلی سے چل کر عراق و مصر و شام و عرب آتے ہیں اور مصر و شام سے اسپین جاتے ہیں۔ بیت المقدس کے ایک عالم طاہر المتوفی ۵۰۷ھ نے علم کی طلب میں بغداد، مکہ، مدینہ، تنیس، دمشق، حلب، جزیرہ، اصفہان، نیشاپور، ہراۃ، جرجان، آمد، استرآباد، بوشنج، بصرہ، دینور، ری، سرخس، شیراز، قزوین، کوفہ، موصل، مرو، نہاوند، ہمدان، واسط، اسدآباد، اسفرائین، آمل، اہواز، بسطام، خسروباد وغیرہ شہروں کی خاک چھانی۔ جغرافیے میں دیکھیے یہ شہر افغانستان کے شہر ہرات سے لے کر ترکستان، خراسان، ایران، عراق اور شام تک پھیلے ہوئے ہیں۔

محمد بن مفرج اموی اندلسی کی راہ طلب میں یورپ، افریقہ، اور ایشیا تینوں براعظموں کے شہر داخل ہیں۔ اسپین کا شہر قرطبہ، افریقہ کا شہر مصر اور ایشیا کے شہر دمشق، صنعاء، اور زبید (یمن)، ان کے

تعلیمی مقامات ہیں۔ ولید اندلسی پیدا تو یورپ کے شہر قسطہ (سراگوزہ) میں ہوئے لیکن اندلس سے لے کر خراسان تک کو چہ گردی کی۔ ابو محمد عبداللہ بن عیسیٰ بن ابی حبیب اندلسی علم اور وزارت کے خانوادے سے تھے، وہ اسپین سے فارغ ہو کر اسکندریہ اور مصر آئے، پھر مکہ گئے، پھر عراق میں داخل ہوئے اور بغداد میں مقیم رہے، پھر خراسان کی راہ لی اور نیشاپور اور بلخ میں قیام کیا، پیدا اسپین کی خاک میں ہوئے اور ۵۴۸ھ میں افغانستان کے شہر ہراۃ میں پیوند زمین ہوئے۔ حسین بن احمد پیدا قرطبہ میں ہوئے اور ۴۹۶ھ میں یمن کی سرزمین میں دفن ہوئے۔

تاج الدین سرخسی ۵۲۲ھ میں پیدا خراسان کے شہر سرخس میں ہوئے، نشو نما شام میں ہوئی اور وفات ۵۹۴ھ میں اندلس میں پائی۔ نحو کے مشہور امام ابو علی قالی پیدا عراق کے شہر دیار بکر میں ہوئے، پھر تعلیم و تعلم کی خاطر ملکوں کی سیر کرتے بغداد اور موصل سے چل کر اسپین میں جا کر دم لیا اور ۳۵۶ھ میں قرطبہ میں وفات پائی۔ ابن المقری اصفہان کے محدث تھے انھوں نے اصفہان، بغداد، موصل، حران، عسقلان، کوفہ، تستر، مکہ، بیت المقدس، دمشق، صیدا، بیروت، حمکہ، رملہ، واسط، عسکر مکرم، حمص، رقہ اور مصر تک چار مرتبہ آمد و رفت کی۔ کہتے ہیں کہ ابن فضالہ کی ایک تصنیف کے نسخے کی خاطر ستر مرحلے سفر کے طے کئے اور اس کی حالت یہ تھی کہ اگر کسی نان پز کے سامنے ایک روٹی کے معاوضے میں اس کو پیش کیا جاتا تو وہ اس کو قبول نہ کرتا۔

حماسہ کے مشہور شارح تبریزی کا یہ واقعہ سننے کے قابل ہے کہ وہ پیٹھ پر کتابوں کا پشتارہ باندھے جب پیادہ اپنے وطن سے ابو العلا معری کی خدمت میں شام پہنچے ہیں تو پسینے سے کتابوں کی یہ حالت تھی کہ ان کا ایک ایک ورق دوسرے سے چپک گیا تھا۔

آج یورپ کی مشہور یونیورسٹیوں کو دنیا کے گوشے گوشے کے طالب علموں کو دیکھ کر ہم دنگ رہ جاتے ہیں لیکن اگر پچھلے عہد کی دکھانے والی دوربینیں ہوتیں تو آپ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، دمشق، صنعاء، قاہرہ، بغداد، بخارا، ہراۃ، اور نیشاپور میں ان سے بھی زیادہ حیرت انگیز منظر دیکھ سکتے۔

میں اس عہد کی صرف دو درسگاہوں کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ایک کوفہ میں حضرت امام ابو حنیفہ کی درسگاہ اور دوسری مدینہ منورہ میں امام مالک کی۔ امام ابو حنیفہ کے حلقۂ تعلیم میں مکہ، مدینہ منورہ،

دمشق، بصرہ، واسط، موصل، جزیرہ، رقہ، نصیبین، رملہ، مصر، یمن، یمامہ، بحرین، بغداد، اہواز، کرمان، اصفہان، حلوان، استرآباد، ہمدان، نہاوند، ری، قومس، دامغان، ترمذ، ہراۃ، نہتار، خوارزم، سیستان، مدائن، مصیصہ اور حمص کے طلبہ شریک تھے۔ ذرا نقشے میں ان شہروں کے بعد مسافت پر نظر ڈال لیجئے۔

امام مالک کی درسگاہ مدینہ منورہ میں ہے۔ حالت یہ ہے کہ دنیا کے گوشے گوشے سے موجیں اٹھتی ہیں اور یثرب کی پہاڑیوں سے آکر ٹکراتی ہیں۔ عرب کے شہروں میں مکہ معظمہ، صنعاء، عدن، طائف، یمامہ، ہجر، حضرموت، زبید، فدک، شام کے شہروں میں سے ایلہ، دمشق، عسقلان، غلاط، مصیصہ، بیروت، حمص، طرسوس، رملہ، نصیبین، حلب، بیت المقدس، اردن، صور اور انطاکیہ اور عراق کے شہروں میں سے بغداد، بصرہ، کوفہ، حران، موصل، جزیرہ، واسط، انبار، رقہ، رہا، اور ممالک عجم میں سے جرجان، کرمان، ہمدان، رے، طالقان، نیشاپور، طبرستان، طوس، مدائن، قزوین، قومستان، جیلان، آمد، کردستان، دینور، سیستان، ہراۃ، بخارا، سمرقند، خوارزم (خیوا)، مرو، سرخس، ترمذ، بلخ، نسا، مشرق ہو چکا اب مغرب کی طرف چلئے۔ مصر کے شہروں میں سے قاہرہ، اسکندریہ، فیوم، اسوان، تنیس اور شمالی افریقہ اور اسپین کے شہروں سے افریقیہ، تونس، قیروان، برقہ، طرابلس، مراکش، طلیطلہ، بسطہ، باجہ، قرطبہ، سرقسطہ، اور اٹلی کی سسلی اور ایشیائے کوچک کے سر تا دا زمیر، سے طالب العلم آ اور جا رہے تھے۔

ان واقعات کو سنتے وقت یہ بھی ذہن میں رہے کہ اس وقت دنیا میں نہ آج کی طرح ریلیں تھیں جنھوں نے ایک شہر کو دوسرے شہر سے ملا دیا ہے اور نہ دخانی جہازات تھے جنھوں نے ایک ملک کو دوسرے ملک سے جوڑ دیا ہے اور جو برسوں کے سفر کو ہفتوں میں اور مہینوں کے راستوں کو دنوں میں اور دنوں کی مسافت کو گھنٹوں میں طے کرتے ہیں اور وہاں نہ ڈاک اور تار کے یہ انتظامات تھے جو گھر بار اور اہل وطن کی خبریں دمبدم پہنچاتے رہتے ہیں اور نہ یہ ہوٹل اور مسافر خانے تھے جو مسافروں کو گھروں سے زیادہ آرام پہنچاتے ہیں اور نہ کوک کمپنی کا وجود تھا جو رقی سے پہاڑنک کا انتظام آپ کے لئے شہر شہر کرتی پھرتی ہے۔

لیکن ایک لمحہ ٹھہرئے۔ یہ گذشتہ عہد کی داستان کہن استخواں فروشی کے لئے آپ کو نہیں سنائی گئی ہے بلکہ اس سوال کے جواب کے لئے کہ وہ کون سا جذبہ تھا جو ان طالب علموں کو اس زمانے میں اس

طرح کوچہ بہ کوچہ، شہر بہ شہر اور ملک بہ ملک لیے پھرتا تھا کہ نہ ان کو پہاڑ روکتے تھے، نہ جنگل ڈراتے تھے، نہ دریا عائق ہوتے تھے، پھر کیا جوش و خروش تھا جو ان کو اس راہِ طلب میں اس طرح بے چین اور مضطرب رکھتا تھا۔

ہیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نداشت   دانہ می چیدم "تا" آں روز کہ خرمن داشتم

عزیز و! وہ صرف ان کا وہ مقصدِ زندگی اور نصب العین تھا جس کو "دین کا ولولہ" اور "مذہب کا جوش" کہتے ہیں۔ یہ ان کی زندگی کی روح تھی اور ان کی حیات کا مقصد۔ ان کے قبضے میں یہی بجلی کا وہ خزانہ تھا جس سے ان کی تعلیم، تمدن، تجارت، صنعت، سلطنت، حکومت، فتوحات، غرض ایک بامراد قوم کے وہ تمام کارخانے جو زندگی کے مختلف شعبوں سے عبارت ہیں، چل رہے ہیں۔

اس سے دوسرے درجے پر جو جذبہ ہے وہ سیاست ہے۔ اگر اسلام میں دین خود سیاست ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ سیاست کا جذبہ کا راس میں دین کے تحت ہے۔ ایک اللہ کے ماننے والے خواہ وہ کالے ہوں یا گورے، ایشیائی ہوں یا اروپی سب کے سب سلطنت میں برابر کے حصے دار ہیں۔ اسلام میں صلح و جنگ اور فتوحات کی ترقی، تجارت، ملک گیری اور قوموں کو غلام بنانے کی نیت سے نہیں بلکہ اگر ہے تو صرف اس لئے ہے کہ انسانوں میں قومیت، وطنیت اور رنگ وروپ کی مختلف برادریوں کی جگہ ہم خیالی کی ایک برادری قائم ہو جائے۔ انسانوں کے درمیان طبعی اور فطری تفرقوں کو "ملیت" کی بنیاد نہ قرار دیا جائے جو کبھی ٹوٹ اور مٹ نہیں سکتے بلکہ ان خیالات و ذہنیات کو قرار دیا جائے جس کو سوچنے اور سمجھنے کے بعد ہر انسان بدل سکتا ہے۔

توحید اسلام کی وہ روح ہے جس نے دین کے علاوہ سیاست کا کام بھی انجام دیا اور کم از کم بارہ برس تک اس نے ہر میدان میں اسلام کے علم کو بلند رکھا ہے، اسلام کا ہر سپاہی تن تنہا تلوار ہاتھ میں لے کر نکلتا تھا اور چند روز میں نومسلموں کی ایک جماعت اپنے ساتھ لے کر دنیا کے کسی نہ کسی گوشے میں اپنی سلطنت کھڑی کر لیتا تھا۔ افریقہ میں، بحری جزیروں میں اور مختلف ملکوں کے دور دراز گوشوں میں اس طرز سیاست نے بڑی بڑی ریاستیں اور حکومتیں کھڑی کر دیں۔ اسی طرح غلاموں کو اسلام کی آزادی سے

مالامال کرکے ان کو شمشیر زنی، کشور کشائی اور تخت نشینی کا اہل بنا دیا۔ مصر میں غلاموں کی سلطنت صدیوں تک اسی طرح چلتی رہی ہے۔ اسپین اور مراکش کے فاتح یہی بربری نومسلم ہیں جنھوں نے بارہا شمالی افریقہ میں حکومتیں کیں۔

وہ کون سا جذبہ تھا جو نومسلم ترکوں، تاتاریوں اور مغلوں کو ایک عالم کے زیر سایہ منظم کرکے چین کی دیواروں سے لے کر قسطنطنیہ کے سواحل تک کے ملکوں پر ان کو بارہا حکمراں بناتا رہا۔ سبکتگین ایک معمولی ترک غلام سپہ سالاری تک پہنچتا اور پھر غزنی میں بیٹھ کر وہ خاندان پیدا کرتا ہے جو ہندوستان پر سو سال تک چھایا رہتا ہے، غور کے نومسلم جو محمود ہی کے مسلمان بنائے ہوئے ہیں، وہ اٹھتے ہیں اور آندھی کی طرح غزنی سے لے کر بحر ہند تک پر قابض ہو جاتے ہیں۔

ان مثالوں سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ میں یہ دکھاؤں کہ اسلام نے کیوں کر دین ہونے کے ساتھ سیاست کا فرض انجام دیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ اسلام کا جذبۂ دین بجائے خود اس قدر پُرزور اور قوی ہے کہ اس کو اپنی زندگی کے لئے کسی الگ سیاسی قوت کا سہارا ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔

۵ عشق خود راہ است وہم خود منزل است

بایں ہمہ اس حقیقت سے تغافل نہیں برتا جا سکتا کہ یورپ نے دو سو برس سے مشرقی قوموں اور اسلامی ملکوں میں جو فشار برپا کر رکھا ہے اس کے لئے یہ لازمی ہو گیا ہے کہ ایک ملک کی بسنے والی تمام قومیں اور جماعتیں باہم ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اس طرح دوش بدوش کھڑی ہوں کہ حریف ہماری صفوں کو چیر کر درہم برہم نہ کر سکے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ اسلامیت اور وطنیت کو ٹکرانے کے بجائے اسی طرح ان میں تطبیق دی جائے جس طرح ہم عقل و نقل اور معقول و منقول کو تطبیق دیتے ہیں۔ غلط فہمی سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلامیت اور وطنیت باہم ایسے حریف ہیں جن میں کبھی صلح نہیں ہو سکتی۔ اسلامیت کے حامی ہر چیز میں مسلمانوں کی علیحدگی کے خواہاں ہیں اور وطن کی دوسری قوموں سے مل کر متحدہ محاذ کے بجائے محاذ کو تقسیم کرکے اس کی حفاظت اور مدافعت کے فرائض کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری

طرف وطنیت کے طرف اور اس تفریق و امتیاز کے لئے مذہب کو ذمہ دار سمجھ کر اسلامیت کے جذبات سے تہی کئے پر آمادہ ہو رہے ہیں۔ پہلے کا نتیجہ اگر وطن کی خدمت سے قصور ہے تو دوسرے کا نتیجہ مذہب سے بیزاری ہے اور یہ دونوں نتیجے ہم کو ہلاکت اور بربادی کی طرف لے جا رہے ہیں حالانکہ جس طرح عقل ونقل کی تطبیق ممکن ہے ایسے ہی دین اور وطن کی تطبیق بھی ممکن ہے۔ ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت اور جمعیۃ العلماء کے نظریۂ سیاست نے اس امکان کو واقعے کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ کیا ۱۹۲۰ء کا خلافتی اس عہد کے کانگریسی سے کسی حیثیت میں پست تھا اور موجودہ عہد تحریک میں جمیعتی خادمان وطن کانگریسی خدمت گذاروں سے کسی بات میں کم ہیں؟ حالانکہ سب کو پتہ ہے کہ جمعیۃ العلماء سرتاپا مذہبی جماعت ہے اور باایں ہمہ وطنی خدمات میں خالص وطن پرستوں سے کسی درجے کم رتبہ نہیں۔

میرے نزدیک جس طرح ندوۃ العلماء کی درسگاہ عقل ونقل کی تطبیق ہے، جامعہ ملیہ اسلامیت اور وطنیت کی تطبیق اور اسی لئے یہ دونوں درسگاہیں مسلمانوں کی آیندہ تعلیم میں بہت بڑا اثر رکھیں گی۔

میرے نزدیک جب تک ہندوستان کے مسلمان اسلامیت اور وطنیت کی کشمکش کا بہترین فیصلہ نہ کریں گے اس ملک میں ان کا مستقبل حد درجہ خطرناک رہے گا۔

ہندوستان میں اسلامیت اور وطنیت کی مصالحت اور تطبیق

ان تمام ملکوں میں جہاں مسلمانوں کو تعدادی اکثریت حاصل نہیں ہے، ان کے دینی اور وطنی فرائض میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ خالص مذہبی اور قومی امور و مسائل میں اپنی وطنی حکومت کے زیر سایہ نیم خودمختاری حاصل کر کے ملک کے عام سیاسی وانتظامی امور و مسائل میں اپنے دوسرے ہم وطنوں کے ساتھ اشتراک عمل کریں۔ صاف لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کے اپنے مذہبی و تمدنی مسائل میں جن سے قومیت عبارت ہے ان کی وطنی حکومت ان کو اپنے زیر سایہ خودمختاری عطا کرے اور دیگر عام ملکی سیاسی انتظام و مسائل میں وہ دیگر فرزندان وطن کے دوش بدوش ایک متحدہ نظام کا جزو ہو کر اپنی تعدادی حیثیت کے مطابق اشتراک عمل کریں۔ موجودہ سیاسی اصطلاح میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک طرف مسلمان اپنے لئے بلاشرکت غیرے "کلچرل اٹانومی" حاصل کریں اور دوسری طرف عام ملکی سیاسیات میں وہ اپنے

ہم وطنوں کے ساتھ شریک رہ کر اپنی آبادی کے مطابق حقوق اور نمایندگی پر قناعت کریں۔ اس طرح مسلمانوں کی ایک امتیازی قومی حیثیت بھی قائم ہو جاتی ہے اور دوسری طرف ان پر وطنی اتحاد کے توڑنے کا الزام بھی قائم نہیں ہوتا۔ جن مذہبی و قومی اغراض و مصالح کی حفاظت کی خاطر وہ نمایندگی اور انتخاب نمایندگی کی علیحدگی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ بجائے خود علیحدہ نمایندگی سے طے ہوں گے اور پھر دوسری طرف عام سیاسیات میں ان کو دوسروں سے نہ کوئی رعایت چاہنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ استحقاق سے زیادہ مطالبے کی بھیک مانگنے کی ذلت اٹھانی پڑتی ہے اور نہ لوگوں کو عام ملکی معاملات و سیاسیات میں ان کی مخصوص قومی معاملات میں علیحدگی کی بنا پر ملکی تفرقے کا خیال پیدا ہو سکتا ہے۔

اس طرح مسلمانوں کی دو مجلسیں ہوں گی، ایک خالص اسلامی جو ان کے خالص اسلامی امور و معاملات کا فیصلہ کرے گی اور دوسری مخلوط مجلس خواہ وہ مخلوط ہی انتخاب سے ہو جو عام ملکی مسائل کا تصفیہ کرے گی۔

ہم نے جہاں تک ان مسائل پر غور کیا ہے ہم کو اس سے زیادہ بہتر حل اس مشکل مسئلے کا نظر نہیں آیا، یقیناً کسی ایسے نظام کے جزئیات کو طے کرنے اور اس کو بنا کر کھڑا کرنے میں جو پہلے سے ملک میں رائج نہ ہو ایک اجنبیت محسوس ہوتی ہے مگر جس طرح پر نئی اصلاحات کے ہر نظام کو بالآخر ہم طے کر کے عمل میں لاتے ہیں اسی طرح اس پر بھی ہم عمل کر سکتے ہیں۔

اس مختصر تشریح سے یہ ظاہر ہوگا کہ ہندوستان میں ہماری قومی زندگی کے حسب ذیل مقاصد ہیں:

۱۔ پیغام اسلام کی تعمیل، حفاظت اور بقا۔

۲۔ اس ملک کے لئے ایک عام جمہوری نظام حکومت کا قیام۔

۳۔ اس عام ملکی جمہوریہ کے ماتحت خالص "اسلامی کلچرل اٹانومی" کا قیام۔

یہ وہ مقاصد ثلاثہ ہیں جن کو ہم اپنی قومی زندگی کی روحِ عمل قرار دے سکتے ہیں۔ ان کے لئے جد وجہد، اشاعت و تبلیغ اور بالآخر کامیابی اور کامیابی کے بعد ان کی حفاظت اور بقا ہماری قومی زندگی کا مستقل پروگرام ہو سکتا ہے۔

شاید اس موقعے پر مجھ سے اپنے موضوع سے ہٹنے کی بازپرس کی جائے لیکن اگر میری تقریر

کا پہلا حصہ حاضرین کے ذہن نشیں ہے تو یقیناً وہ میری طرف سے اس باز پرس کا جواب دے سکتے ہیں۔

میرے نزدیک تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ قوم کے بچوں کو ان کی زندگی کے قومی مقاصد کی تلقین اور تفہیم کرے اور ان کے اندر ان مقاصد کی یقینیت کی روح پیدا کرکے ان کو سراپا عمل بنائے۔ دنیا میں آج جہاں کہیں کوئی قومی حکومت ہے اسی اساس تعلیم پر ان کی قومی عمارت کی بنیاد قائم ہے۔ انگلستان میں جس طرح آکسفورڈ اور کیمبرج انگریزوں کے تعلیمی مرکز ہیں اسی طرح ان کے نظری سیاسیات کے مرکز بھی ہیں۔ وزیر اعظم سے لے کر معمولی رکن پارلیمنٹ تک ان درسگاہوں کے 'حلقوں میں آکر اپنی سیاسیات کے نظریوں کو بیان کرتا اور وہاں کے طالب علموں کو آئندہ کی سیاسی ذمہ داری کے لئے تیار کرتا رہتا ہے۔

اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ موجودہ نظام حکومت نے ہندوستان پر سب سے بڑا ظلم کیا کیا ہے تو میں کہوں گا کہ اس کا سب سے بڑا ظلم اس ملک کے بچوں کی بے مقصد تعلیم ہے جس نے پوری قوم کی زندگی کو بے مقصد بنا دیا ہے اور دنیا میں ایک ایسی قوم کی تخلیق کی ہے جس کی زندگی کی کوئی غایت نہیں ہے۔ سبب کھلا ہوا ہے۔ انگریزی حکومت نے اس ملک کی تعلیم کو قومی تعلیم و تربیت کی نظر سے نہیں بلکہ سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا۔ اس کو ضرورت ہوئی کہ مسلمانوں کی اور دوسری قوموں کی اس روحانی زندگی پر موت طاری کردی جائے جس سے قومی و مذہبی عصبیت پیدا ہوتی ہے اور اس کے لئے ضروری ہوا کہ اس تعلیم کو ہر قسم کی مذہبی اور قومی تعلیم کی اسپرٹ سے خالی کردیا جائے۔

دوسری طرف اس کو اپنی سلطنت کے چلانے کے لئے ایسے کم قیمت دیسیوں کی ضرورت تھی جو اس کے محکموں کے دفتری کاروبار کو سنبھال سکیں۔ اس لئے ایک ایسا نظام تعلیم جاری کیا جس میں کوئی زندگی نہ تھی اور علوم میں سے بھی صرف وہ چیزیں سکھائی جائیں جن کی ضرورت آئندہ بننے والے کلرک (بابوؤں) کو پیش آسکتی ہے۔

اسکول تک ہم کو کیا سکھایا جاتا ہے؟ ایک ایسی بدیسی زبان جس کے ذریعے سے ہم اپنے افسروں سے گفتگو کرسکیں اور ان کے لئے ان کی زبان میں ان کے لئے مواد مہیا کرکے رکھ سکیں، اور جغرافیہ جس میں زیادہ تر ہم یہ جانیں کہ وہ دنیا کے کون کون سے براعظم، جزیرے اور ٹاپو ہیں جہاں وہ عَلم لہراتا ہے جس کا

آفتاب دنیا سے کبھی نہیں ڈوبتا' ہو تاریخ جس میں ہم کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ قوموں نے کیوں کر ایک دوسرے پر ظلم کیا ہے تاکہ اس ملک کی قومی تفریق کا ناسور کبھی بھرنے نہ پائے۔

ہندوستان کی تاریخ کا وہ حصہ جس میں ہندوستان کی انگریزی شہنشاہی کے بنانے والے لارڈوں کا ذکر ہوتا ہے پڑھ کر بے انتہا ہنسی آتی ہے۔ ہر لارڈ نے اس ملک کی اصلاح کی خاطر جو تکلیفیں اٹھائی ہیں اور جو انتظامات کئے ہیں ان کا ذکر ہوتا ہے۔ پھر وہ رخصت ہو کر جب جاتا ہے اور دوسرا آتا ہے تو پھر انھیں مناقب کی تکرار ہوتی ہے۔ اس لغو طریقۂ نصاب کا جس قدر جلد ہندوستان سے خاتمہ کیا جا سکے اسی قدر بہتر ہے اور اس کے بجائے ہم کو وہ نصاب اختیار کرنا چاہئے جن سے ہمارے قومی متناصے کر جذبات کی پرورش اور تکمیل ہو اور قوم کو زندہ قوم سرگرم عمل قوم اور با مقصد قوم بنائے۔

ہم نے ہزاروں اور لاکھوں کے صرف سے ملک میں جا بجا اسلامی اسکول' اسلامی کالج بلکہ اسلامی یونیورسٹی قائم کی ہے لیکن اس سوال کا کوئی جواب ہے کہ قومی نقطۂ نظر سے اس قسم کے اسلامی اسکول' اسلامی کالج اور اسلامی یونیورسٹی کس قدر مفید ثابت ہوئے ہیں اور بے مقصد تعلیم کے سوا ان سے کیا فائدہ پہنچا ہے بجز اس کے کہ ان کے قیام سے چند مسلمان ماسٹروں اور پروفیسروں کی پرورش ہوتی ہے اور کچھ مسلمان طالب علموں کو کلاس میں جگہیں مل جاتی ہیں۔ مگر ان کو اس نظر سے اگر دیکھا جائے کہ یہ قوم کے ذاتی سرمایے سے سرکاری نظام تعلیم کی اشاعت کا فرض انجام دیتا ہے تو یہ بالکل لاحاصل معلوم ہوتے ہیں کہ قومی سرمایے سے جو اسکول اور کالج قائم ہوتے ہیں وہ قومی نتائج کے لحاظ سے سرکاری مدارس سے کس حال میں بہتر ہیں؟ اسی لئے میرے نزدیک سرکاری نظام تعلیم کی مجبورانہ پیروی کی حالت میں کہیں بہتر یہ ہے کہ ہم اس سرمایے کو طلبہ کے وظائف دینے اور شہروں میں صرف اسلامی دار الاقامے قائم کرنے میں صرف کریں کہ ان اسلامی اسکولوں اور کالجوں سے جو فائدہ پہنچنا ممکن ہے وہ درسگاہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ دار الاقامے کی حیثیت سے ہے۔

بہرحال یہ ایک جملۂ معترضہ ہے۔ کہنا یہ ہے کہ بے مقصد تعلیم سے قومی ترقی اور ملت کی زندگی کی توقع رکھنا پنجاہ سالہ تجربے کو جھٹلانا ہے اور اس تعلیم نے صرف نوشت و خواند کے ہنر کی تعمیم و اشاعت کے

لحاظ سے خواہ کسی قدر فائدہ پہنچایا ہو مگر قوم کی زندگی اور ملت کی سربلندی میں اس سے فائدے کے بجائے روزافزوں نقصان پہنچ رہا ہے۔ مذہبی مقصد زندگی سے تغافل کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ حروف لاایعنی جن کا زبان پر لانا بھی پہلے مشکل تھا اب وہ برملا ادا کئے جارہے ہیں اور قومی تخیل سے بے پروائی کا نتیجہ یہ ہے کہ قومیت کا شیرازہ بکھر رہا ہے اور خیالات و اعتقادات کی وحدت کی گرفت جس سے وحدتِ قومیت عبارت ہے ڈھیلی پڑتی جارہی ہے اور ایک ایسی قوم پیدا ہو رہی ہے جو ظاہر و باطن دونوں لحاظ سے حکمراں قوم کے تمدن کی صرف نقل ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے لئے ۱۹۱۱ء میں جس وقت ملک میں جوش و خروش برپا تھا مولانا شبلی مرحوم نے لاہور کے وفد میں اپنی وہ فارسی نظم پڑھی تھی جس کا ایک مصرع یہ ہے:-

کہ ایں سررشتہ تعلیم ما در دست ما باشد

لسان العصر اکبر مرحوم نے فوراً اس پر برجستہ جوابی نظم کہی تھی جس کے ایک مصرعے کے آخری الفاظ یہ تھے "گر دست شما دست شما باشد"۔ لوگوں نے شاید اس کو صرف شاعرانہ سوال و جواب پر محمول کیا ہو مگر بیس برس کے بعد معلوم ہو گیا کہ لسان العصر نے جو شبہ ظاہر کیا تھا وہ شبہ نہیں حقیقت تھا۔ اس طول بحث اور دراز نفسی کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے اب یہ حقیقت واقعہ بن کر سامنے آجانا چاہئے کہ ان کو پہلے اپنا قومی نقطۂ نظر اور ملی زندگی کا مقصد معین کرنا چاہئے اور اس پر اپنی تعلیمی عمارت کی بنیاد قائم کرنی چاہئے اور آیندہ ہماری درس گاہیں صرف نوشت و خواند کا حرفہ و پیشہ سکھانے کے لئے نہ ہوں بلکہ زندہ قوم کے افراد کی تخلیق اور آفرینش کے لئے۔

اسی لئے مسلمانوں کی آیندہ تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ ایسی درس گاہیں بکثرت قائم کی جائیں جو بامقصد ہوں اور ان کا سررشتہ واقعی مسلمانوں کے حقیقی ہاتھوں میں ہو۔ مسلمانوں نے اس ملک پر ایک ہزار برس تک حکومت کی مگر انھوں نے ہندوستان پر یہ ظلم کبھی نہیں کیا کہ یہاں کے کروڑوں دماغوں کی تربیت اپنے سیاسی ہاتھوں میں لے کر ان کو مذہبی و قومی جذبات سے یکسر خالی کردیں۔ اب ضرورت ہے کہ مسلمان اس نظام تعلیم سے علانیہ بغاوت کریں اور ایسی درس گاہوں کی بنیاد قائم کریں جو ان کو ان کی

زندگی کا مقصد بتائیں اور ان پر ان کی حیات ملی کے اسرار کھولیں

ایک زمانہ تھا کہ جب سرکاری نوکری ہی مسلمانوں کی زندگی کا تنہا مقصد تھی۔ اس وقت ملک کی عربی درس گاہوں پر یہ پھبتی کہی جاتی تھی کہ یہ اپاہجوں کے پیدا کرنے کی کلیں ہیں۔ اس طعن کو قبول کر لینے کے بعد بھی ہم یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بظاہر خواہ کسی قدر پست و مبتذل حالت میں ہوں تاہم وہ با مقصد ہیں اور اپنے مقصد پر ان کو ناز ہے اور زمانے نے بتا دیا کہ زمانے کی بے التفاتیوں اور بے توجہیوں کے باوجود وہ زندگی رکھتی ہیں اور آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ آج کل کے ایک بڑے سرگرم کانگریسی نے مجھ سے یہ کھلا اعتراف کیا کہ موجودہ قومی مقاصد کے سمجھنے میں اور ان پر عمل کرنے میں آزاد عربی مدارس کے تعلیم یافتہ غلام انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ سے بڑھ کر ثابت ہوئے۔ اس کا سبب بالکل کھلا ہوا ہے کہ آزاد عربی مدارس کی تعلیم کا مقصد سرکاری نوکری اور سرکاری اعزاز کی تلاش نہیں جو ہمارے ہر قومی حوصلے کو پست کر دیتی ہے۔

مسلمانوں کی علیحدہ تعلیم اوپر کے معروضات اگر ذہن نشیں ہوں تو اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں عذر نہ ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کی با مقصد تعلیم کے لئے یہ نہایت ہی ضروری ہے کہ ان کی قومی درسگاہیں بالکل الگ ہوں جہاں ان کو خاص ان کے مذہبی و قومی مقاصد کی بنا پر تعلیم دی جائے۔ ہمارے بہت سے مسلمان دوستوں کی یہ خواہش ہے کہ سرکاری کونسلوں میں ان کی نشستیں معین ہوں اور ان نشستوں کا انتخاب مخلوط نہ ہو تاکہ مسلمانوں کی مستقل ہستی قائم رہے۔ میرا خیال ہے کہ سرکاری نشستوں میں عدم مخلوط انتخاب سے کہیں زیادہ ضروری یہ ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت مخلوط نہ ہو تاکہ ان کی علیحدہ قومی ہستی فنا نہ ہو جائے اور ان کے قومی مقصد کی مستقل زندگی برباد نہ ہو جائے۔

اسی اصول کی بنا پر مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کا مسئلہ نہایت غور و فکر کے قابل ہے۔ مسلمان ملک کی دوسری قوموں کی طرح میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ٹیکس ادا کرتے ہیں لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کی تعلیم سے بہت کم فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اکثر میونسپل اور تحصیلی اسکول تقریباً ہندو اسکول ہیں۔ وہاں کی تعلیم کیا اپنی زبان کے لحاظ سے اور کیا اپنے جذبات کے لحاظ سے تمام تر ہندو ہے۔ مذہبی تعلیم سے وہ یکسر خالی اور جذبات ملی سے یکسر عاری ہیں ایسی حالت میں مسلمان طلبہ کا ان میں کم ہونا قدرتی بات ہے۔

یہ تو ان مدارس کا سلبی پہلو ہے' ایجابی پہلو یہ ہے کہ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ابتدائی مکاتب دیہاتی اور شہری ہندو آبادی کی ابتدائی تعلیم کے تمام تر کفیل ہیں مگر مسلمان ان مدارس و مکاتب سے بجا طور پر احتراز کر کے نہ تو خود اپنی طرف سے اور نہ سرکار کی طرف سے ابتدائی مکاتب کا اتنا وسیع سلسلہ اپنے قبضے میں رکھتے ہیں ایسی حالت میں دوسری قوم کے مقابلے میں مسلمانوں کا ابتدائی تعلیم میں کم ہونا بالکل کھلی بات ہے۔ یو۔ پی میں سرکاری اسلامی مکاتب کی اسکیم بھی اس لئے ناکام ہے کہ ان کے لئے بھی ان کے سررشتے کا خاص لازمی نصاب قبول کرنا ضروری ہے جو ہمارے اغراض کے مطابق نہیں۔

مکتبی تعلیم کا نظام | پورا ملک ابتدائی اسلامی مکاتب کے متحدہ نظام کے سلسلے سے بالکل محروم ہے جابجا شخصی یا جماعت کے چندوں سے کہیں کہیں بعض مکتب ہیں جن میں سے ہر ایک انفرادی طریق تعلیم اور الگ نصاب پر جاری ہے اور جو ہر قسم کی ترقی کی اسکیم سے محروم ہے۔ پورے ملک میں چھوٹے بچوں کا ایک بھی معیاری کتب نہیں جو چھوٹے بچوں کی مکتبی تعلیم و تربیت کا نمونہ پیش کرے۔ جامعہ ملیہ کے کار فرما دوستوں اور ندوۃ العلماء کے ارکان کے سامنے میں نے اس ضروری تجویز کو بار بار پیش کیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ جامعہ کے کارفرما ادھر توجہ کر رہے ہیں اور ان کے احاطے میں اس قسم کے معیاری مکتب کے بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ گورکھپور میں انجمن اجرائے مکاتب کے نام سے ایک مجلس نے چند سال سے کام شروع کیا ہے اور اس وقت تک چالیس مکتب ضلعے میں قائم کئے ہیں۔ اسی قسم کے اجرائے مکاتب کی ہر ضلعے میں ضرورت ہے جن کے پیش نظر صرف ابتدائی مکتبی تعلیم ہو اور ہمارا حق پہنچتا ہے کہ ہم میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں سے اپنے ان مکتبی سلسلوں کے لئے مالی امداد کا جائز مطالبہ کریں اور جب کبھی ہندوستان کے نظام حکومت کا آسمان و زمین بدلے ہم یہ مطالبہ کریں کہ مسلمانوں کی اس تعلیم کا پورا انتظام اس صیغے کے سپرد کیا جائے جس کا مطالبہ مسلمان اپنے مستقل قومی و مذہبی امور و معاملات کے سلسلے میں کر رہے ہیں۔

میری اس گذارش سے اس نتیجے تک پہنچنا آسان ہے کہ قومی تحفظ کے لئے مسلمانوں کے غیر مخلوط انتخاب کے مطالبے سے بہت زیادہ ضروری غیر مخلوط تعلیم کا مطالبہ ہے خصوصاً جب وہ وقت آئے گا کہ ملک میں جبری تعلیم کا نفاذ ہو اس وقت مسلمانوں کے لئے علیحدہ مستقل نظام تعلیم کی ضرورت آج سے

زیادہ عیاں ہو جائے گی۔

ضرورت ہے کہ بچوں کی ابتدائی تعلیم پر پوری توجہ کی جائے اور اس کے لئے تربیت یافتہ معلم تیار کئے جائیں اور بچوں کے نفسیات سے باخبر اہل قلم ان کی استعداد کے مطابق ایسا تدریجی نصاب بنائیں جو سادہ سے سادہ، سہل سے سہل ہو۔ "حمایت اسلام لاہور" کا نصاب بہت کچھ مقبول ہے مگر افسوس ہے کہ اس میں الفاظ کے استعمال میں بے احتیاطی برتی گئی ہے مثلاً دینیات کی پہلی ہی کتاب میں محتاج، پیغمبر وغیرہ الفاظ جو پانچ پانچ حرفوں سے مرکب ہیں استعمال کئے گئے ہیں۔ کیا بچہ آسانی سے ان کا تلفظ کر سکتا ہے۔ نصاب کے الفاظ چھوٹے چھوٹے آسان اور سہل ہوں۔ ان کی کتاب اس احتیاط سے چھاپی جائے کہ ہر نقطہ اور شوشہ اس طرح اپنی جگہ پر لکھا ہو کہ بچے کو اشتباہ نہ ہو۔

ابتدائی تعلیم میں دو اور مشکلیں حل کرنی ہیں، قرآن پاک کے پڑھانے کے آسان طریقے کی تلاش تاکہ قرآن پاک جلد سے جلد ختم ہو سکے۔ لوگ قرآن پاک پڑھانے کے لئے پہلے قواعد بغدادی یا یسرنا القرآن وغیرہ پڑھاتے ہیں اور اسی سے تعلیم کا آغاز کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ طریقہ غلط ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ پہلے بچے کو اردو پڑھائی جائے اور جب اردو رواں ہو جائے تو اردو عبارت عربی خط میں چند روز پڑھائی جائے۔ اس کے بعد قرآن پاک شروع کرا دیا جائے۔ اس سے کم از کم ایک سال کا وقت بچ جاتا ہے لیکن ضرورت ہے کہ بچوں کے لئے ایسے قرآن چھاپے جائیں جن میں خط کی بلکہ ہر حرف کی اور نقطے اور شوشے کی پوری احتیاط کتابت میں کی جائے تاکہ حروف اور نقطے بچوں کی نظروں میں مشتبہ نہ ہونے پائیں! اور ہر حرف کی صرف ایک ہی شکل پورے قرآن کی کتابت میں اختیار کی جائے تاکہ اختلاف صور بچوں کا ذہن اس حرف کے پہچاننے میں مشوش نہ کر دے۔

پھر اس پر بھی غور کرنا ہے کہ ہندوستانی زبان کے مفرد اور مرکب حروف اور الفاظ کے پڑھنے کی آسان سے آسان صورت کیا ہو سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ انجمن ترقی اردو کے سوا اور کسی نے ادھر توجہ نہیں کی ہے۔

بچوں کے لئے جو نصاب بنایا جائے اس میں شروع سے اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ ان کی مذہبی اور قومی روح کی تربیت کرے۔ بدیسی نظام تعلیم کی بے مقصد کتابیں جن میں چوہا اور بلی کے بے جوڑ

اور بے مزہ قصے ہمارے بچوں کے لئے وہ غذائے فاسد ہے جو جزو بدن نہیں ہوتی بلکہ ان کے دماغی ہاضمے کو ابھی سے خراب کر ڈالتی ہے اور ہم نے بار بار کہا ہے کہ بے مقصد تعلیم قومی زندگی اور ملی حیات کے لئے ایک ذرہ کارآمد نہیں۔

ہم ترکوں کو ملحد کہنے کے عادی ہیں لیکن بہر حال انھوں نے اتنا پورے یقین کے ساتھ سمجھ کر طے کر لیا ہے کہ اگر ہم کو زندہ رہنا ہے تو با مقصد قوم ہو کر زندہ رہنا ہے۔ چنانچہ اسی لئے انھوں نے اپنے سیاسی انقلاب کے ساتھ تعلیمی انقلاب کو ضروری سمجھا ہے۔ امریکہ کے ایک مشنری رسالے "مسلم ورلڈ" نے ترکی ابتدائی تعلیم کی ریڈروں سے ایک سبق نقل کیا ہے جو درج ذیل ہے:۔

"مذہب اسلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور ہمارے پیغمبر صلعم پر ایمان لایا جائے جنھوں نے ہم کو اسلام کی تعلیم دی۔ ہم اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلعم پر عقیدہ رکھنے کو ایمان کہتے ہیں اللہ تعالیٰ جس نے کائنات اور ہم کو پیدا کیا قدرت والا ہے۔ ہم پورے طور سے یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کیا ہے یا کیوں کر ہے وہ بہت بڑا ہے۔ . . .

بچو! تم دیکھتے ہو کہ ایمان لوگوں میں اتحاد پیدا کرتا ہے اور ان کو قوت اور مسرت بخشتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پیغمبر صلعم اور مذہب اسلام پر عقیدہ رکھنا مذہبی ایمان ہے۔

ہمارا ایک قومی ایمان بھی ہے۔ ہم ترک ہیں۔ ترک تہذیب یافتہ اور متمدن ہیں۔ ہمارا ملک ہمیشہ ترقی کرتا جائے گا اور ہمیشہ دشمنوں پر فتح یاب ہو گا۔ جس وقت ترک کا نام لیا جاتا ہے میرا سینہ فخر سے پھول جاتا ہے اور میرا سر بلند ہو جاتا ہے۔ میں ان لوگوں سے محبت کرتا ہوں جو میری قوم اور میرے ملک کے لئے مفید ہیں۔ جو میرے محبوب ملک کو نقصان پہنچاتے ہیں ان سے مجھے مطلق محبت نہیں۔"

اوپر کے اس ابتدائی سبق پر غور کیجئے کہ ترک مدبروں نے تعلیمی حقیقت کا پتہ کس طرح پا لیا ہے اور دین و وطن کے دوگونہ جذبات کو باہم کس طرح ایک دوسرے سے ہم آغوش کیا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جو قوموں کی ان کی منزل مقصود کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

(باقی آئندہ)

زیادہ عیاں ہو جائے گی۔

ضرورت ہے کہ بچوں کی ابتدائی تعلیم پر پوری توجہ کی جائے اور اس کے لئے ٹرینڈ معلم تیار کئے جائیں اور بچوں کے نفسیات سے باخبر اہل قلم ان کی استعداد کے مطابق ایسا تدریجی نصاب بنائیں جو سادہ سے سادہ، سہل سے سہل ہو۔ "حمایت اسلام لاہور" کا نصاب بہت کچھ مقبول ہے مگر افسوس ہے کہ اس میں الفاظ کے استعمال میں بے احتیاطی برتی گئی ہے مثلاً دینیات کی پہلی ہی کتاب میں محتاج، پیغمبر وغیرہ الفاظ جو پانچ پانچ حرفوں سے مرکب ہیں استعمال کئے گئے ہیں۔ کیا بچہ آسانی سے ان کا تلفظ کر سکتا ہے۔ نصاب کے الفاظ چھوٹے چھوٹے آسان اور سہل ہوں۔ ان کی کتاب اس احتیاط سے چھاپی جائے کہ ہر نقطہ اور شوشہ اس طرح اپنی جگہ پر لکھا ہو کہ بچے کو اشتباہ نہ ہو۔

ابتدائی تعلیم میں دو اور مشکلیں حل کرنی ہیں، قرآن پاک کے پڑھانے کے آسان طریقے کی تلاش تاکہ قرآن پاک جلد سے جلد ختم ہو سکے۔ لوگ قرآن پاک پڑھانے کے لئے پہلے قواعد بغدادی یا یسرنا القرآن وغیرہ پڑھاتے ہیں اور اسی سے تعلیم کا آغاز کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ طریقہ غلط ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ پہلے بچے کو اردو پڑھائی جائے اور جب اردو داں ہو جائے تو اردو عبارت عربی خط میں چند روز پڑھائی جائے۔ اس کے بعد قرآن پاک شروع کرا دیا جائے۔ اس سے کم از کم ایک سال کا وقت بچ جاتا ہے لیکن ضرورت ہے کہ بچوں کے لئے ایسے قرآن چھاپے جائیں جن میں خط کی بلکہ ہر حرف کی اور نقطے اور شوشے کی پوری احتیاط کتابت میں کی جائے تاکہ حروف اور نقطے بچوں کی نظروں میں مشتبہ نہ ہونے پائیں اور ہر حرف کی صرف ایک ہی شکل پورے قرآن کی کتابت میں اختیار کی جائے تاکہ اختلاف صور بچوں کا ذہن اس حرف کے پہچاننے میں مشوش نہ کر دے۔

پھر اس پر بھی غور کرنا ہے کہ ہندوستانی زبان کے مفرد اور مرکب حروف اور الفاظ کے پڑھنے کی آسان سے آسان صورت کیا ہو سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ انجمن ترقی اردو کے سوا اور کسی نے ادھر توجہ نہیں کی ہے۔

بچوں کے لئے جو نصاب بنایا جائے اس میں شروع سے اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ ان کی مذہبی اور قومی روح کی تربیت کرے۔ بدیسی نظام تعلیم کی بے مقصد کتابیں جن میں چوہا اور بلی کے بے جوڑ

اور بے مزہ قصے ہمارے بچوں کے لئے وہ غذائے فاسد ہے جو جزو بدن نہیں ہوتی بلکہ ان کے دماغی ہاضمے کو ابھی سے خراب کر ڈالتی ہے اور ہم نے بار بار کہا ہے کہ بے مقصد تعلیم قومی زندگی اور ملی حیات کے لئے ایک ذرہ کارآمد نہیں۔

ہم ترکوں کو ملحد کہنے کے عادی ہیں لیکن بہرحال انھوں نے اتنا پورے یقین کے ساتھ سمجھ کر لیا ہے کہ اگر ہم کو زندہ رہنا ہے تو با مقصد قوم ہو کر زندہ رہنا ہے۔ چنانچہ اسی لئے انھوں نے اپنے سیاسی انقلاب کے ساتھ تعلیمی انقلاب کو ضروری سمجھا ہے۔ امریکہ کے ایک شہری رسالے "مسلم ورلڈ" نے ترکی ابتدائی تعلیم کی ریڈروں سے ایک سبق نقل کیا ہے جو درج ذیل ہے:-

"مذہب اسلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور ہمارے پیغمبر صلعم پر ایمان لایا جائے جنھوں نے ہم کو اسلام کی تعلیم دی۔ ہم اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلعم پر عقیدہ رکھنے کو ایمان کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس نے کائنات اور ہم کو پیدا کیا قدرت والا ہے۔ ہم پورے طور سے یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کیا ہے یا کیوں کر ہے وہ بہت بڑا ہے۔ . . .

بچو! تم دیکھتے ہو کہ ایمان لوگوں میں اتحاد پیدا کرتا ہے اور ان کو قوت اور مسرت بخشتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پیغمبر صلعم اور مذہب اسلام پر عقیدہ رکھنا مذہبی ایمان ہے۔

ہمارا ایک قومی ایمان بھی ہے۔ ہم ترک ہیں۔ ترک تہذیب یافتہ اور متمدن ہیں۔ ہمارا ملک ہمیشہ ترقی کرتا جائے گا اور ہمیشہ دشمنوں پر فتح یاب ہوگا۔ جس وقت ترک کا نام لیا جاتا ہے میرا سینہ فخر سے پھول جاتا ہے اور میرا سر بلند ہو جاتا ہے۔ میں ان لوگوں سے محبت کرتا ہوں جو میری قوم اور میرے ملک کے لئے مفید ہیں۔ جو میرے محبوب ملک کو نقصان پہنچاتے ہیں ان سے مجھے مطلق محبت نہیں۔"

اوپر کے اس ابتدائی سبق پر غور کیجئے کہ ترک مدبروں نے تعلیمی حقیقت کا پتہ کس طرح پایا ہے اور دین و وطن کے دوگونہ جذبات کو باہم کس طرح ایک دوسرے سے ہم آغوش کیا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جو قوموں کی ان کی منزل مقصود کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

(باقی آئندہ)

غالب

مصنفہ سید عبداللطیف پی ایچ ڈی (لندن) مترجمہ سید معین الدین قریشی ایم اے (عثمانیہ)

غالب کو جس نظر سے دیکھئے وہ ایک عجیب و غریب تصنیف ہے۔ بہتر تو یہ تھا کہ اس کا اردو ترجمہ نہ کیا جاتا، اس لئے کہ کتاب کے 'خدوخال' اس کا نشوونما اور اس کی روح سراسر انگریزی ہے اور اردو میں اس کی حقیقت تک پہنچنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ مثلاً کتاب کا نام ہے "غالب کی حیات اور اردو شاعری کی تحقیقی تحسین"۔ یہ پورا جملہ اگر انگریزی عبارت میں نقل کیا جائے تو انگریزی داں طبقے کے لئے اس کا مضمون بالکل واضح ہو جاتا ہے یعنی "A critical appreciation of his life and Urdu Poetry" درآں حالیکہ اردو زبان میں 'تحسین' کا لفظ وہ مطلب پوری طرح ادا نہیں کر سکتا جو ہم معنی انگریزی لفظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ایک مثال ہے جو ۱۳۰ صفحے کے اس مختصر رسالے کے اکثر اجزا پر صادق آتی ہے۔ اور جن ابواب میں شعر، صوفیانہ رنگ اور شخصی رجحانات وغیرہ سے بحث کی گئی ہے وہاں یہ خاصی مضحکہ خیز صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جناب مصنف نے اپنے دیباچے میں یہ بات کھول کر رکھ دی ہے کہ جو لوگ یہ رائے رکھتے ہیں کہ انھوں نے اردو کے دامن میں پرورش نہیں پائی وہ قطعی غلطی پر ہیں۔ اور اگرچہ انھوں نے اس انکار کے بعد زباں دانی کا کوئی دعویٰ نہیں فرمایا ہے لیکن زبان وادب اردو کے متعلق اس عنوان سے اظہار خیال کیا ہے جس سے ان کی فطری بالغ نظری اس خاص میدان میں ایک معجزانہ حیثیت اختیار کر لیتی ہے یعنی وہ ادب و زبان کی ان گہرائیوں سے واقف ہیں اور ان سرچشموں کا کھوج نکالتے ہیں اور ان بلندیوں تک پہنچ سکتے ہیں جہاں اب تک اردو لکھنے اور بولنے والے لوگوں کی رسائی نہیں ہوتی۔ وہ معترض ہیں کہ "اپنی چار دیواری میں بیٹھ کر یہ حضرات اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اردو ادب ابھی عالم عنفوان میں ہے۔ وہ ابھی عبوری دور میں ہے اور شباب کی منزل مقصود کی طرف جادہ پیما، لیکن عنفوان اور عنفوان سے شباب تک پہنچنا دور کی بات ہے۔"

اب یہ دور کی کوڑی لانے کا کام انھوں نے اپنے ہی ذمے رکھا اور اپنے زعم باطل میں یہ سمجھا ہے

کہ کوئی دوسرا اس کا اہل نہیں۔ اسی دیباچے میں نقادانِ ادب اردو کو وہ ان الفاظ میں یاد فرماتے ہیں کہ "دیوانہ نگار اردو کی یہ بدذوقی روز بروز بڑھتی ہی گئی اور ادبی رائے زنی کے احساسِ تناظر کا گلا گھونٹتی رہی"۔ اس "احساسِ تناظر" کی حقیقت جناب مصنف نے واضح نہیں فرمائی۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے حقائق ان کی تصنیف کے آئندہ صفحات میں بے شمار نظر آتے ہیں اور ع مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تحریر کا بے اختیار یاد آجاتا ہے۔

باب اول میں جناب مصنف نے مولانا حالی مرحوم اور ڈاکٹر بجنوری دونوں پر یکساں تنقید فرمائی ہے اور خلاصہ اس کاوش کا یہ ہے کہ ان دونوں صاحبوں کو فنِ تنقید سے لگاؤ نہ تھا اور ڈاکٹر بجنوری باوجود مغربی تعلیم کے اپنے جوشِ عقیدت سے مجبور ہو کر گمراہی پر اتر آئے۔ آپ کو یہ بھی شکایت ہے کہ "حالی و بجنوری دونوں کے طرزِ تنقید میں ایک بڑا عیب یہ بھی ہے کہ ایک آدھ شعر سے وہ یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ غالب ہیئت داں اور فلسفی، واعظ اور عاشق سبھی کچھ تھا۔" حقیقت یہ ہے کہ ایک آدھ شعر میں فلسفے کا کوئی مسئلہ بیان کر دینا اور بات ہے اور شاعر کو فلسفی قرار دینا بالکل دوسری چیز۔ اگر کسی شعر میں یہ ممکن ہے کہ اس کے چھوٹے سے اعضائے ترکیب میں ایک مسئلہ ہیئت و فلسفہ کا یا حکمت و موعظت کی کوئی بات سما سکے تو یہ غزل کا کمال ہے اور اس کی صدہا مثالیں موجود ہیں لیکن اس حقیقت کی غلط تاویل کرنے کا کسی کو حق نہیں پہنچتا۔

باب دوم سے باب چہارم تک جناب مصنف نے اپنا زورِ قلم محض فنِ تنقید کی پرورش اور توضیح میں صرف فرمایا ہے اور یہ نہایت دلچسپ، مفید اور قابلِ قدر ہے۔ لیکن غالب کی زندگی اور غالب کی شاعری کو دیکھنے اور سمجھنے میں اس سے کہاں تک مدد مل سکتی ہے یہ ایک سوال ہے جس کے لئے ڈاکٹر صاحب کو اپنی کتاب پر نہیں بلکہ فنِ تنقید کے ان اصولوں پر دوبارہ نظر فرمانی چاہئے جن کی بنیاد پر "تنقیدی تحسین" کی یہ پوری عمارت تعمیر کی گئی ہے۔

اس مختصر رسالے کے ۲۰۰ صفحات اصولِ تنقید کو واضح کرنے کے لئے صرف کئے گئے ہیں اور کلامِ غالب کی تنقید صرف ۲۰ صفحے میں ہے۔ ان ۲۰۰ صفحات میں دیوان اور مکتوبات کی تاریخی ترتیب واضح کی ہے اور اس کی روشنی میں شاعر کی حیثیت اور اس کے مرتبے کو جانچنے کی کوشش کی گئی ہے اور اعتراض یہ ہے

کہ مولانا حالی نے "مطلق ماخذ کو تاریخی لحاظ سے ترتیب نہیں دیا اور کمال یہ ہے کہ باوجود اتنی مدت گزر جانے کے سید عبداللطیف صاحب نے یہ کارنمایاں انجام دیا ہے۔"

باب چہارم سے وہ حصہ شروع ہوتا ہے جس میں جناب مصنف نے غالب کی شاعری کو اس کے سوانح حیات کے اثر اور ماحول میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ واقعات زندگی سے ان کیفیات کا سراغ لگانا چاہتے ہیں جن کی اثر پذیری نے غالب سے شعر کہلوائے اور جن کا انعکاس مضامین شعر میں ہوا ہے۔ اسی کوشش میں غالب کی زندگی کے خاص اور اہم واقعات کو بنیاد قرار دے کر اس زمانے کے مکتوبات و غزلیات میں ان سے مترتب ہونے والے تاثرات کی تلاش کی گئی ہے۔ یقیناً یہ کوشش اور مشغلہ دلچسپ ہے لیکن یہ کام ایسے شخص کی دسترس سے باہر ہے جس نے بقول بعض حضرات "اردو کے دامن میں پرورش نہیں پائی بلکہ جنوبی ہند کی محض ایک غیر تربیت یافتہ بولی دکھنی کا آغوش یافتہ ہے"۔ اور یہ حقیقت اس وقت بھی ناقابل انکار ہے جب کہ وہ نفس غالب کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے "شعری عمل" کے لئے جداگانہ عنوانات قائم کر سکنے کا بھی اہل ہو مثلاً (۱) ابتدائی ہیجان (۲) القار (۳) تصور (۴) لفظیات شعر (۵) تنظیم شعر اور صورت شعر کے معیار قائم کر کے غالب کے شعر کو جانچنا دوسری بات ہے اور واقعات زندگی کا اشعار سے براہ راست تعلق نکالنا بالکل دوسری چیز جو بجز واقعاتی شاعری کے عام طور پر پورے وثوق کے ساتھ ثابت نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ غزل میں رسمی اوزان و قوافی ہیں اور ایسا مانوس طرز ادا کہ اس انبوہ میں سے دل کی پھانس چن لینا آسان کام نہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ صدہا سال سے ایشیائی ممالک میں دیوان حافظ سے لوگ تفاؤل کرتے ہیں اور ہر شخص اپنے مطلب کا "القار" بلکہ "حقیقت الامر" اور "واقعات آیندہ" ان ہی اشعار میں پالیتا ہے جو بالعموم ہر شاعر کے دیوان میں اسی مضمون پر اور اسی انداز میں لکھے گئے ہیں۔ پھر استعارہ و تشبیہ اور زبان کی نزاکتوں اور گہرائیوں میں الجھنے کے باوجود کسی متعین واقعے کو ان سے صحیح طور پر متعلق کر لینا آسان نہیں۔

مطلب ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو،
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

غزل کی ماہیت پر اگر دوسرے پہلو سے نظر کی جائے تو واضح ہوگا کہ وہ نہ مسلسل نظم ہے اور نہ قطعہ بلکہ غزل کا ہر شعر بجائے خود ایک مکمل مضمون ہے۔ ان چند مکمل مضامین میں سے ایک یا دو متعلق واقعات ہو سکتے ہیں اور باقی اشعار کا غیر متعلق ہونا ناگزیر ہے۔ پھر اس انتخاب کا طریقہ کیا ہوگا؟ کیا اس کے لئے بھی اول "مواد" پیدا کرکے "ماخذ" و "رہنما" تلاش کئے جائیں؟ کیا ان الفاظ کی مدد سے دل کے پردے کھل سکتے ہیں اور زندگی کی تاریکیاں منظر عام پر آسکتی ہیں؟ ڈاکٹر عبداللطیف کو اپنی ادبی بصیرت اور صحت مذاق پر کچھ اس بلا کا اعتماد ہے کہ وہ ان چند معیاروں سے جن کی وضاحت میں ان کی کتاب کا بڑا حصہ وقف ہے اس غمازی کا فرض ادا کرنا چاہتے ہیں جس کی اہلیت مبدء فیاض نے عام مخلوق میں ودیعت نہیں کی اس لئے کہ وہ شرافت نفس کو اپنی شان ستاری کا ایک پرتو قرار دے کر دنیا میں حسن اخلاق کا وجود قائم رکھنا چاہتا ہے تاکہ بدگمانی، تنگ نظری، دریدہ دہنی اور عیب جوئی ادبی تنقید کا نصب العین نہ بن سکے۔

باب پنجم اسی مسئلے کی تطبیق ہے جس میں "غالب کا زاویۂ نگاہ" زندگی کے متعلق" بیان کیا گیا ہے اور خارجی اثرات سے اس کی سیرت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس باب کا خلاصہ یہ ہے کہ جن واقعات نے "غالب کی دماغی رو بدل دی" وہ (۱) قمار بازی کے جرم میں سزائے قید اور (۲) واقعۂ غدر ۵۷ء ہیں۔ ان دونوں واقعات کا یہ اثر ہوا کہ غالب "مردم بیزار" ہوگیا اور گرچہ اسباب دنیا میں سے اکثر اس کو میسر تھے، علم و فضل کی قدردانی بھی ہوئی، خطاب و خلعت سے سرفراز ہوا اور شہرت و عزت بھی پائی، معاش کی تنگی نہ تھی، ہمدم و ہمساز بھی تھے "لیکن غالب کے ذہن کی ساخت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ نہ تو عطائے رحمانی کا شکر گزار تھا اور نہ کسی انسانی خدمات کا۔ خلاف مردانگی وہ ہمیشہ کڑھتا ہی رہا۔"

اگر ڈاکٹر صاحب کے بیان کردہ معیار تحقیق و اصول تنقید کو یہاں استعمال کیا جائے (جس کے لئے ہمیں ۲۰۰ صفحات لکھنے کی ضرورت نہیں) تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ابتک جس قدر ژرف نگاہی صاحب

ممدوح نے صرف فرمائی ہے وہ انھیں چند جملوں کے لکھنے کے لئے تھی ورنہ کلام غالب نہ اس قابل تھا کہ ڈاکٹر صاحب اس پر توجہ فرماتے اور نہ مرزا غالب کی سیرت جو ان واقعات سے متاثر ہو چکی تھی ایسی چیز تھی جس کو کوئی صاحب فکر و اہل قلم اپنی توجہ کا مرکز بنانے پر آمادہ ہوتا اس لئے کہ "خلاف مردانگی" کا ثبوت حاصل ہو جانے کے بعد کسی سلجوقی سپاہی یا بلند پایہ شاعر کے متعلق اگر کچھ کہا بھی جائے تو کیا۔

غالب کے جن اشعار سے اس نظریے پر اسقدر وثوق سے استدلال کیا گیا ہے ان کو یہاں نقل کرنا بے سود ہے اس لئے کہ خود جناب مصنف کو تسلیم ہے کہ "یہ جستہ جستہ اشعار ہیں جن میں شخصی عنصر شاید زیادہ نہ ہو" اس امر کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ ان اشعار میں شخصی عنصر نہیں ہے اس ادعا کے لئے جس بے دردی کا ثبوت جناب مصنف نے دیا ہے اس کی لے غالب کی "خلاف مردانگی" "بے اطمینانی" سے بھی بڑھ گئی ہے۔ اب ان اشعار کو بھی ملاحظہ فرمائیے جو اس دعوے کے ثبوت میں پیش کئے گئے ہیں۔ ان کی تعداد نو ہے اور اگرچہ حق انتخاب مجھے حاصل نہیں لیکن اس مضمون خاص پر یہ تین شعر بہترین ہیں:۔

مرے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں ۱ سوائے خون جگر سو جگر میں خاک نہیں

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب ۲ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

نومیدی ما گردش ایام نہ دارد ۳ روزے کہ سیہ شد سحر و شام نہ دارد

ان اشعار سے ڈاکٹر صاحب کی فکر رسا کا اندازہ کیا جا سکتا ہے!

دوسرا ثبوت مثنوی گہر بار ہے۔ اس کی حقیقت اور اس پر اعتراض کی نوعیت بھی خود ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔ سچ تو یہ ہے کہ 'جادو وہ جو سر پر چڑھ کے بولے' مرزا کا کمال بدیں کی نظر میں بھی جھلک اٹھتا ہے اور جس لطیف شاعرانہ تخیل کی مذمت کی جا رہی ہے وہی اس کا اعجاز ہے لیکن اب سید عبداللطیف صاحب کو سمجھانے والا کہاں سے پیدا کیا جائے۔ شاید ایسا دیدہ ور مرزا غالب کو بھی میسر نہ آتا کہ ع عنقارا بلند است آشیانہ۔ فرماتے ہیں کہ

"یہ ایک طویل مناجات ہے جس میں رحمت الٰہی کو جوش دلایا گیا ہے کہ اس کی انتہی

کمزوری کو بخش دے۔ اس مقام پر امید تھی کہ غالب کا سر نیاز جھک جائے گا کہ اس نے کفران نعمت کیا اور اپنی ان خداداد قوتوں کو خام مقصد کی تلاش میں ٹھکرا دیا جس سے وہ آشفتہ حال ایسران مصیبت کو مسرت و راحت کے لازوال نغمے سنا سکتا تھا۔ لیکن غالب ایسا کیوں کرنے چلا تھا۔ وہ پھر کر اشا خدا ہی کو مورد الزام قرار دیتا ہے کہ اس نے ظرف و حوصلے سے زیادہ غم اس کے حصے میں دے دیا یہاں تک کہ وہ عطیات ربانی کا دلی شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتا۔"

ڈاکٹر صاحب نے اصول تنقید بیان کرتے ہوئے بار بار اس خطرے سے آگاہ فرمایا ہے کہ چند اشعار سے کوئی عام نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ مثنوی ابر گہربار کے بھی چند ہی اشعار نقل کئے گئے ہیں اور جو نتیجہ نکالا گیا ہے وہ واقعے اور مضمون دونوں کے خلاف ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ (۱) غالب کا سر نیاز مناجات میں بھی نہ جھکا۔ (۲) خدا کو مورد الزام قرار دیتا ہے کہ اس نے ظرف و حوصلے سے زیادہ غم اس کے حصے میں دے دیا۔ اس سلسلے کے متعلق جو غلط فہمی ڈاکٹر صاحب کو ہوئی وہ بالکل قابل معافی ہے اس لئے کہ شاید ان کے لئے یہ دشوار ہے کہ مناجات میں شکایت اور شکوے کی نزاکت کو محسوس فرما سکیں اور غالباً یہ اس سے بھی زیادہ مشکل ہے کہ وہ اس جذبے تک پہنچ سکیں جس کی بنا پر دل شکستہ خدا سے شکایت کرتا ہے کہ "اس نے ظرف و حوصلے سے زیادہ غم اس کے حصے میں دے دیا"۔ یہ خدا کی شکایت ہے یا ظرف و حوصلے کی؟ ع

یہ آنسوؤں کی کمی نہیں ہے رعایت ظرف آستیں ہے

معلوم نہیں سید معین الدین قریشی صاحب جو "غالب" جیسی گراں مایہ تصنیف کو غالب کی زبان بولنے والوں تک پہنچانے کے ذمے دار ہیں محض "لفظیات" تک دلچسپی رکھتے ہیں یا کبھی انھوں نے ڈاکٹر عبداللطیف سے شکوۂ باری، شکوۂ فلک، شکوۂ دوست، شکوۂ عدو، شکوۂ ہجر وغیرہ وغیرہ مختلف اسالیب ادا کی نزاکت و خوبی پر گفتگو بھی فرمائی ہے۔ بہرحال ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ شکوہ شعر و سخن میں ہزاروں معنی پیدا کرتا ہے اور جو شخص طویل مناجات میں رحمت الٰہی کو جوش دلانے کے لئے شکوہ کرتا ہو اور وہ بھی زبان شعر میں تو یقیناً وہ "خدا کو مورد الزام نہیں قرار دیتا"۔ اور اگر شکایت و الزام صرف اسی قدر ہے کہ "اس

نے ظرف و حوصلے سے زیادہ غم اس کے حصے میں دے دیا" تو ظاہر ہے کہ یہ شکایت خود اپنی کوتاہی اور بے کسی کا اعتراف ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ اگر اردو اور فارسی زبان کے شعرا تک ڈاکٹر صاحب کی نظر ہو یا وہ کسی دوسرے واسطے سے ان تک پہنچ سکیں (جیسے کہ وہ ورڈس ورتھ، شیلے، براوننگ، آرنلڈ، شکسپیر، ملٹن تک پہنچے ہیں بلکہ ان شعرا سے گزر کر سینٹ پال تک بلند پروازی فرمائی ہے) تو ان کو معلوم ہوگا کہ یہ طرز کلام کسی شاعر کے لئے معیوب نہیں اور نہ وہ "مردم بے زاری" کی آخری حد ہے بلکہ

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

نیز اس مسئلے کے متعلق ایک قول فیصل ہے جس سے خواہ ڈاکٹر صاحب کی تسکین نہ ہو لیکن دوسرے لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں یعنی

با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار

ڈاکٹر صاحب کو شکایت ہے کہ مرزا مذہب کے معاملے میں اس قدر "صلح کل" کیوں ہے، اس نے وہابی فرقے کے خلاف کیوں لکھا، اپنے تئیں اثنا عشری کیوں کہتا ہے اور بعض شیعہ حضرات کے خلاف کیوں قلم اٹھایا اور انتہا یہ ہے کہ اس نے مندرجہ ذیل رباعی کیوں لکھی وہو ہذا

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری　　کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہووے صوفی　　شیعی کیوں کر ہو ماوراء النہری

ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں خود غالب کی کہی ہوئی موٹی بات بھی نہیں آسکتی کہ مذہب کے متعلق غالب کا یہ رویہ اس لئے تھا کہ وہ صوفی تھا اور اس کا اعلان اور اقرار کرتا ہے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ صوفی کے کیا معنی؟ تو صوفی کے خواہ کچھ معنی ہوں اور اس کے عقاید کچھ ہی کیوں نہ ہوں اس قدر یقینی ہے کہ وہ بے انتہا بے تعصب، وسیع نظر اور "صلح کل" ہوتا ہے اور پڑھا لکھا صوفی تو کچھ اس سے بھی زیادہ۔

اسی طرح غالب کی وطن پرستی کا معاملہ ہے۔ بے شک وہ انگریزوں کو پسند کرتا تھا، گورنروں اور کمشنروں کے لئے قصائد لکھے اور تعریفوں کے پل باندھ دئے لیکن وہ دلی کی بربادی اور ہندوستان کی سوگواری پر بھی آنسو بہاتا تھا۔ اگر اس عہد کے حالات جاننے والے لوگوں سے کبھی ڈاکٹر عبداللطیف کو

ملنے کا موقع ملے تو وہ اس متضاد جذبے کو بیشتر لوگوں میں پائیں گے۔ غالب اس معاملے میں منفرد نہ تھا اور نہ یکمینہ پن اور دنائت طبع کی دلیل تھی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے قطعی درست ہے کہ وہ موجودہ دور کا قوم پرور نیشنلسٹ نہیں تھا اور جن لوگوں نے اس کی وطن پرستی کے گیت گائے ہیں وہ بھی حقیقت سے بالکل دور نکل گئے ہیں۔

ڈاکٹر عبداللطیف نے "صوفیانہ رنگ" کا جلی عنوان قائم کیا ہے اور فرماتے ہیں کہ:

"غالب کے نئے نقادوں نے سنجیدگی کے ساتھ یہ بات بھی بتلائی ہے کہ وہ بڑا صوفی تھا۔ واللہ اعلم! کسی خیال کا ذہنی ادراک اور چیز ہے اور اس میں بس جانا اور بات۔ اس کے علاوہ ایسے تصوف جو صوفیانہ مسلک کے حامل ہیں غزل گو شعرا کی قدامت پسند دکان سخن میں عرصے سے موجود ہیں۔ دیکھئے خود غالب اس خصوص میں کیا کہتا ہے "آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف اور کچھ نجوم لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونیت طبع کے یہاں کیا رکھا ہے۔" محض اس بنا پر کہ غالب کے اشعار میں صوفیانہ خیالات پائے جاتے ہیں ہمیں یہ نتیجہ نہیں نکال لینا چاہئے کہ وہ صوفی تھا۔"

میں جناب مصنف کو بتانا چاہتا ہوں کہ غالب کے کسی نقاد نے آج تک یہ نہیں کہا کہ وہ "بڑا صوفی تھا" اور اس کہنے کے یہ معنی کبھی نہیں ہوتے کہ مرزا اسداللہ خاں غالب گلی قاسم جان والی مسجد میں فرغل لپیٹے ایک گوشے میں مراقب بیٹھے رہتے تھے، جب کبھی حالت استغراق میں افاقہ ہوتا ارادت مندوں کا مجمع ان کو گھیر لیتا اور سلسلۂ رشد و ہدایت جاری ہو جاتا تا آنکہ وہ نماز کے وقت اسی طرح شریک نماز ہوتے مگر کبھی صف اول سے قدم نہ بڑھاتے اور نہ زبان طعن و شکوہ دراز کرتے بعد عصر مسجد سے قدم باہر نکالتے اور ہزارہا ارباب حاجت پیچھے پیچھے نظر آتے لیکن وہ اپنی شان انکساری میں نہ گردن موڑ کر دیکھتے اور نہ کسی کو یہ جرأت ہوتی کہ آگے بڑھ کر اپنی احتیاج پیش کر سکے۔ پھر قدم شریف میں حلقہ قائم ہوتا اور نماز مغرب کے بعد ذکر جہر شروع ہو جاتا اور پھر یہ سرمستان حسن ازل اسی طرح آخر رات تک وہاں مشغول طاعت حق رہتے!! کیا صوفی کے صرف یہی معنی ہوتے ہیں؟

سخن شناس نۂ دلبرا خطا ایں جا است!

کاش ڈاکٹر صاحب کسی کاوش کی تکلیف نہ اٹھاتے اور نہ تحقیق کی الجھنوں میں بھٹکتے پھرتے۔ غالب نے جو کچھ کہا سچ کہا "آرایش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف اور کچھ نجوم لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونیت طبع کے یہاں کیا رکھا ہے۔" جس کسی نے غالب کو صوفی بتایا وہ ان ہی معنوں میں کہ اس کے اشعار میں مضامین تصوف پائے جاتے ہیں اور بقول ڈاکٹر صاحب یہ وہی اشعار ہیں جو "غزل کو شعرا کی قدامت پرست دکان سخن میں عرصے سے موجود ہیں" اور بس۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کو غالب کی سیرت اور اس کے ذاتی حالات میں دھبّہ لگانے کا جو شوق دامن گیر ہے اس کا تقاضا ہے کہ وہ بغیر سبب عیب پیدا کرتے ہیں اور افسوس یہ کہ یہ کام بھی ان کے بس کا نہیں، اس لئے کہ جس قدر دعاوی انھوں نے اس بحث کے سلسلے میں فرمائے ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس کا ثبوت وہ فراہم کر سکے ہوں۔ ابتداءً خارجی اثرات کی تلاش میں ڈاکٹر صاحب نے غالب کی ذات میں بٹہ لگانے کی کوشش کی ہے اور اپنی اس مکروہ ذہنیت کو تحقیقات علمی کا جامہ پہنا کر غالب کے باپ دادا کو اس لئے ذلیل قرار دیا ہے کہ ان کا پیشہ "اجورہ داری" تھا اور اس پیشے کی ارذل خصوصیات وراثتاً غالب کی سیرت کا جزو بن گئی ہیں لیکن وہ اپنی اس "تجویز" کو پایۂ تحقیق تک پہنچانے کے لیے دوسرے اہل علم کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ نظریۂ توریث کو تسلیم کرنے کے بعد غالب کے ذاتی عیوب اور ذہنی رکاکت کے ثبوت فراہم کریں اور اگر نظریۂ توریث کے قائل نہ ہوں تو دوسرے طریقوں پر ان عیوب کا سراغ نکال کر ان کو نمایاں کریں۔ لیکن غالباً عام طور پر اردو بولنے والے اس بنیادی اور نسبی عیب کی حقیقت نہ سمجھے ہوں جس کو مصنف نے "اجورہ داری" سے موسوم کیا ہے۔ ان کی تصنیف کے اکثر اجزاء کی طرح یہ بھی انگریزی لفظ Mercenary کا غیر معروف ترجمہ ہے جس کے معنی انگریزی میں جو کچھ بھی ہوں اردو میں مرزا غالب کے آبا و اجداد کے پیشہ سپہ گری کو ظاہر کرتا ہے۔ فن سپہ گری سے دنائت و رکاکت کو اس لئے وابستہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے دور انحطاط میں بعض اشخاص فوجی ملازمت قومی اغراض کے خلاف قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن اس زمانۂ ہیجان و ابتلا میں قومی اغراض

کیا تھیں یہ ایک وسیع سوال اور جداگانہ بحث ہے اور اس سے خود مصنف کو بھی بحث نہیں۔

باب ششم میں پر عظمت شاعری کو واضح کرنے کے لئے غیر ملکی نقادان فن کے مختلف اقوال نقل ہیں اور اس کے بعد غالب کے کلام پر اصل تنقید شروع ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ حصہ ہے جو سب سے زیادہ غیر دلچسپ اور بے معنی ہے۔ لہٰذا اس کے متعلق کچھ لکھنا خود ڈاکٹر عبداللطیف صاحب پر ظلم ہوگا اس لئے کہ نہ وہ اس مضمون سے دلچسپی رکھتے ہیں اور نہ اس کو سمجھنا چاہتے ہیں

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ڈاکٹر صاحب کی روایت کے مطابق غالب اور خدا کے تعلقات بھی اچھے نہ تھے ورنہ شاید یہ امید ہوتی کہ غالب کی یہ دعا جو اس وقت میرے واسطے سے ان کے لئے کی گئی ہے مقبول ہو جائے اور ان کو " اور دل " مل جائے تب کہیں یہ مشکل حل ہو سکے۔ کلام غالب پر جو تنقید کی گئی ہے اس کی ایک مثال بھی اگر پیش نظر ہو تو سطور بالا کی حقیقت واضح ہو سکتی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کے مکاں اپنا

"بتلایئے اس شعر میں کون سا فلسفہ ہے۔ اگر حیدرآباد سے کسی شخص کو لندن لے جانے کے وسائل حاصل ہو جائیں اور وہاں پہنچ کر سینٹ پال کی سب سے اونچی چوٹی پر جا بیٹھے تو وہ یقیناً قدیم لندن کی سرزمین پر ایک طائرانہ نظر ڈال سکے گا۔ لیکن اصل مرحلہ تو یہ ہے کہ پہلے وہ لندن جائے اور پھر اس کو وہاں کے مشہور و معروف گرجا پر چڑھنے کا موقع حاصل ہو۔ کیا غالب کو اپنی اس زندگی میں کبھی عرش کے آستانے تک بھی رسائی ہوئی؟"

میرے ایک دوست سوال کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو سینٹ پال تک تکلیف کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ کیا چار مینار جو گھر کے گھر ہی میں تھا اس قابل نہ تھا کہ اس کی مثال دی جا سکتی اور اگر عرش آشیاں ہونے کے لئے یورپ کا سفر ضروری تھا تو پھر ایفل ٹاور اس کام کے لئے زیادہ موزوں تھا کہ پیرس کی دلکشی اور مینار کی بلندی دونوں اپنی خصوصیات میں ممتاز ہیں۔ دوسرے یہ بھی دریافت طلب ہے کہ عرش کے لئے کوئی آستانہ ضروری ہے یا نہیں اور عرش اور اس کے آستانے میں کوئی

حدود اپنی ہیں یا ان دونوں کے لئے کوئی ایسا معیار ہے جس سے ذہن ان کی حقیقت تک پہنچ سکے مختصر یہ کہ عرش کسے کہتے ہیں اور اس کا آستانہ کیا چیز ہے ؟ کیا عبداللطیف صاحب اس کا جواب دے سکتے ہیں ؟

جیسا کہ ابتدا میں ظاہر کیا جا چکا ہے "غالب" نہ صرف انگریزی زبان میں مرتب کی گئی ہے بلکہ اس کی "ترکیب اعضا" طرز ادا، معیار تنقید غرض سب کچھ انگریزی ہے جس مغربی ذہنیت سے مصنف نے مشرق کے بلند پایہ شاعر پر نکتہ چینی کی ہے وہ سادگی کی دلیل ضرور ہو سکتی تھی اگر اس میں اپنی سیرت کی خصوصیات اور عالی ظرفی کے رجحانات کو دخل نہ دیا جاتا اس لئے کہ اب وہ کتاب ایک فتنے کی حیثیت رکھتی ہے جس سے بجز گمراہی اور فساد خیال کے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اور اصل انگریزی میں اس کی یہ خصوصیت اور زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے اس لئے کہ اردو ادب سے ناواقف مطالعہ کرنے والے مرزا غالب کی نسبت جو رائے قائم کریں گے وہ اصل حقیقت کے بالکل خلاف ہوگی۔ ہمیں حیرت ہے سید معین الدین قریشی پر کہ انھوں نے اپنی قابلیت اور وقت کا یہ مصرف کیوں نکالا کہ "غالب" جیسی کتاب کو اردو میں ترجمہ کر کے پیش فرمایا اور یہ حیرت محض اس لئے ہے کہ ترجمہ اچھا ہے اور زبان شگفتہ ورنہ جہاں تک ان کے جذبۂ شوق کا تعلق ہے وہ خوشی سے اس سعادت میں شریک ہوں اور غالب کو مطعون کرنے میں امداد فرمائیں لیکن شاید وہ واقف نہیں کہ اس کتاب میں مصنف کا طرز استدلال اور اظہار خیال آپ اپنی تشریح ہے اور مطالعے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ جناب مترجم نے غالب کو زیر بار احسان کیا ہے یا ڈاکٹر عبداللطیف کو رسوا کرنا چاہا ہے۔

"دکھنی کا آغوش یافتہ" بجائے "تربیت یافتہ" کے استعمال کیا گیا ہے (ص ب) "اجرہ دار" Mercenary کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے لیکن جس موقعے پر استعمال ہوا ہے وہاں نہ یہ مطلب ادا ہوتا ہے اور نہ سپاہی و عسکری کے معنوں میں یہ استعمال کیا جا سکتا ہے (ص ۶۰) ۔ ایک موقعے پر لفظ "خانہ ساز" کا عجیب و غریب استعمال ہوا ہے اور افسوس کہ اسی جملے میں غالب کی تعریف بھی کی گئی ہے خواہ وہ دشمن ہی کی زبانی کیوں نہ ہو۔ ملاحظہ ہو :-

"اس لحاظ سے اس کو اردو نثر کے خانہ سازوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔"

جناب مترجم نے غالباً انگریزی لفظ Architect کا ترجمہ فرمایا ہے لیکن اردو زبان میں "خانہ ساز" دوسرے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس کو فنِ تعمیر و بنائے مکان سے صرف دور کا واسطہ ہے۔ یا ایک دوسری جگہ لکھا ہے "جو صاحب اصل مسودے پر کام کرنا چاہیں" یہ جملہ زیادہ غیر مانوس نہیں لیکن اردو میں یہ مطلب دوسری طرز سے ادا کیا جاتا ہے محض انگریزی کی نقالی اردو کے لیے باعث فخر نہیں ہے۔ ایک موقعے پر لکھا ہے کہ "اب ہم پھر غالب کی طرف رجوع ہوتے ہیں" "رجوع کرنا" عام طور سے مستعمل ہے اور فصیح ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر عبداللطیف کی یہ تصنیف ذہنی غلامی کی مکمل مثال ہے۔ انھوں نے اس روح سے کام لیا ہے جو آج سے چند قرن پہلے یورپ کے تعلیم یافتہ افراد میں ظاہر ہوتی تھی اور جس کے بعض نمونے اب بھی ہمیں کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی، اقبال اور پھر سیاسی و اجتماعی تحریکات نے اس غلامی کے خلاف جہاد کیا اور مسلسل جد و جہد کے بعد اب عزت نفس کی حقیقت ہندوستانیوں پر کچھ کچھ منکشف ہو چلی ہے لیکن اس لعنت کے جراثیم امراض وبائی کی طرح کبھی کبھی سر اٹھاتے رہتے ہیں اور ڈاکٹر عبداللطیف کے اس کتابی پیکر میں یہی مادۂ فاسد اب پھر رونما ہوا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے کسی دوسرے موقعے پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

انھیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات ان کی
انھیں کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات ان کی
فقط مرا ہاتھ چل رہا ہے انھیں کا مطلب نکل رہا ہے
انھیں کا مضموں، انھیں کا کاغذ، قلم انھیں کا دوات ان کی

بلاغت اور اس کی مختصر تاریخ

قوت گویائی انسان کی ایک اہم ترین صفت ہے جس کے بغیر وہ اپنی تمدنی اور معاشرتی مشکلات حل نہیں کر سکتا۔ قدرت نے جس طرح ہر چیز کو حسن و قبح کے دو پہلو عطا فرمائے ہیں زبان کو اس فطری اور نیچرل تقسیم سے محروم نہیں رکھا۔

یہ قوت ہر شخص میں حسب قابلیت کم و بیش پائی جاتی ہے۔ بعض لوگ معمولی طریقے سے بھی اپنے دل کی بات دوسروں کو نہیں سمجھا سکتے اور بعض معمولی سے معمولی بات کو بھی اس خوبصورتی سے ادا کر سکتے ہیں جس کا سامعین پر اچھا خاصا اثر پڑتا ہے۔ زبان کے اسی خوبصورت پہلو کا نام بلاغت ہے۔

معاشرت انسانی کی مختلف ضرورتوں کے اعتبار سے جب کوئی زبان عالم وجود میں آتی ہے تو جس طرح ابتدا میں معاشرت کے طریقے سیدھے سادے اور بے تکلف ہوتے ہیں اسی طرح زبان بھی شروع شروع نہایت سادے لباس میں جلوہ نما ہوتی ہے۔ مبالغہ اور مضمون آفرینی کا کہیں پتہ نہیں ہوتا۔ تشبیہات و استعارات شاذ و نادر کہیں کہیں آجاتے ہیں۔ جس مضمون کو ادا کرنا ہوتا ہے اس کو بغیر کسی ایچ پیچ کے بے تکلف ادا کر دیا جاتا ہے۔ لیکن جوں جوں معاشرت کے طریقے وسیع ہوتے جاتے ہیں سامان زندگی میں تکلفات پیدا ہوتے جاتے ہیں، نفاست و لطافت بڑھتی جاتی ہے۔ اسی قدر زبان بھی تمدن کے ساتھ ساتھ عروج کرتی جاتی ہے، الفاظ میں تراش خراش پیدا ہو جاتی ہے، استعارات و تشبیہات میں نزاکت اور رنگینی آجاتی ہے، مبالغے میں زور اور مضمون نگاری میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔

عربی ادب میں جاہلیت کا کلام دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کوہ و صحرا، دشت و بیابان، دشوار گزار راستے اور مٹے ہوئے کھنڈر ان کے ادبی ذوق کے جولان گاہ تھے لیکن یہی جا دیہ پیما عرب جب حکومت اور دولت کے منصب رفیع پر فائز ہوئے تو ان کے کلام میں دقت آفرینی اور رنگیں بیانی کی کوئی حد نہیں رہی جس کا صحیح اندازہ متنبی، ابو نواس بحتری، ابو تمام وغیرہ کے کلام کا مطالعہ کرنے سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

ہر زبان کے لٹریچر سے بلاغت کو وہی تعلق ہے جو روح کو جسم سے ہے۔ کلام میں جان اسی وقت پڑتی ہے جب وہ بلیغ انداز سے ادا کیا گیا ہو اور سامعین پر کوئی خاص اثر ڈالتا ہو ورنہ ناقابل التفات سمجھ کر ٹھکرا دیا جاتا ہے۔

بلاغت چونکہ ایک فطری اور وجدانی چیز ہے اس لئے چند الفاظ میں اس کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں کی جاسکتی۔ گو متاخرین نے اس کو الفاظ کی زنجیروں میں جکڑ کے دریا کو کوزے میں بند کرنا چاہا ہے لیکن دراصل اس کے ذوقی اور وجدانی ہونے کی وجہ سے یہ راہ عمل غلط ہے بلکہ متقدمین کے مسلک کے مطابق اس کی حقیقت کا مختلف طریقوں سے سمجھنا دراصل صحیح ہے تاکہ ان سب کے مجموعے سے بلاغت کا ایک صحیح نقشہ پیش نظر ہو جائے۔

عربی علم بلاغت پر اگر گہری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ زمانۂ جاہلیت میں کسی بلیغ کلام کی جانچ پڑتال کے لئے کچھ قواعد مقرر نہ تھے بلکہ بلاغت کے ان طبعی اور فطری اصول پر جو قدرت نے ہر سخن فہم اور دقیقہ سنج طبیعت کو عنایت فرمائے ہیں کلام کے حسن و قبح کی جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔

اس فن کی تدوین کا خیال اس وقت پیدا ہوا جب دنیا کے سامنے داعیٔ حق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید پیش کیا اور ساتھ ہی اس کے اعجاز اور بلیغ ہونے کا دعویٰ بھی کیا۔ علمائے کرام نے اس دعوے کے ثبوت کے لئے اصول بلاغت کی طرف توجہ کی۔ عربی زبان میں ایک نیا دور شروع ہوا علوم و فنون مدون ہونے لگے اور عربی زبان کی گرامر مرتب کی گئی۔

سب سے پہلے حضرت علیؓ نے ابوالاسود دؤلی کو جو آپ کے شاگرد اور کبار تابعین میں سے تھے عربی گرامر کے چند قواعد کی تعلیم فرمائی۔ ابوالاسود دؤلی نے انھیں پر قیاس کرکے چند اور اصول مرتب کئے اور حضرت علیؓ کی خدمت میں پیش کرکے ان کی تصحیح بھی کرائی۔

علامہ ابن خلدون نے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

اول من کتب فیھا ابوالاسود الدؤلی من بنی کنانۃ ویقال باشارۃ علی	ابوالاسود دؤلی پہلا شخص ہے جس نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ

رضی اللہ عنہ ۔ | کے اشارے سے کیا تھا ۔ (مقدمہ ابن خلدون مصری صفحہ ۴۰۸)

کتاب کی شکل میں سب سے پہلے علامہ جاحظ (المتوفی ۲۵۵ھ) نے ایک تصنیف پیش کی جس کا نام "کتاب البیان والتبیین" ہے ۔ اس کا دوسرا نام "التبیین والتبیان" بھی ہے ۔

جاحظ اپنے زمانے کا بہت بڑا فاضل انشا پرداز تھا ۔ لوگ اس کو ادبار عرب کا سردار اور فصاحت وبلاغت کا امام مانتے ہیں ۔ ارباب علم و ادب میں شاید ہی کوئی شخص اس کے مرتبۂ کمال تک پہنچا ہو ۔

اس نے یوں تو مختلف فنون میں بہت سی بے نظیر کتابیں لکھی ہیں لیکن "البیان والتبیین" سے ان کو کوئی نسبت نہیں ۔ یہ اپنے موضوع پر بالکل اچھوتی سب سے بہتر کتاب ہے ۔ اس میں خطباء و شعراء کا کلام، دلچسپ حکایات و لطائف اور مواعظ کے نمونے بڑی خوبی سے جمع کئے گئے ہیں ۔

علامہ ابن خلدون نے فن ادب پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے :-

سمعنا من شیوخنا فی مجالس التعلیم ان اصول ھذا الفن وارکانہ اربعۃ وھی ادب الکاتب لابن قتیبہ و کتاب الکامل للمبرد وکتاب البیان والتبیین للجاحظ وکتاب النوادر لابی علی القالی وماسوی ھذہ الاربعۃ فتبع لھا و فروع عنھا

ہم نے اپنے اساتذہ سے علمی درسگاہوں میں سنا ہے کہ اس فن کے اصول وارکان صرف چار کتابیں ہیں ۔ ابن قتیبہ کی ادب الکاتب، مبرد کی کتاب الکامل، جاحظ کی کتاب البیان والتبیین اور ابو علی القالی کی کتاب النوادر ۔ ان چار کے علاوہ بقیہ کتابیں سب انھیں کی تابع اور فروع ہیں ۔

(مقدمہ ابن خلدون مصری صفحہ ۴۰۸)

اسی صدی ہجری میں عبداللہ بن المعتز عباسی (المتوفی ۲۹۶ھ) بھی تھا ۔ یہ اپنے عہد کا بہت بڑا نازک خیال اور بلیغ شاعر تھا ۔ اس نے بھی اس موضوع پر چند کتابیں لکھی ہیں جن میں سے کتاب البدیع سب سے زیادہ مشہور ہے ۔ یہ فن بدیع میں سب سے پہلی کتاب ہے ۔

علامہ جرجی زیدان نے اپنی کتاب "تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ" میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے

لکھا ہے کہ کتاب البدیع کا ایک نسخہ اب تک کتب خانہ اسکوریال میں موجود ہے۔ واللہ اعلم۔

چوتھی صدی ہجری میں قدامہ ابن جعفر بغدادی (المتوفی ۳۱۰ھ) نے تنقید نثر و نظم پر سب سے پہلے نقد الشعر اور نقد النثر دو مستقل کتابیں لکھیں جن میں سے نقد الشعر زیادہ مقبول ہوئی۔ آج کل بعض یونیورسٹیوں میں داخل نصاب ہے۔

اس کتاب میں نہایت خوبی سے شعر کی تعریف کی گئی ہے اور لفظ و معنی کی باہمی ترکیب کے اعتبار سے شرائط نظم مفصل بیان کئے گئے ہیں۔

قدامہ نے اور بھی بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں جن کا تذکرہ صاحب الفہرست نے صفحہ ۱۳۰ میں کیا ہے۔

کچھ عرصے کے بعد ابو ہلال عسکری (المتوفی ۳۹۴ھ) نے نثر و نظم کی تنقید کے سلسلے میں ایک اور قیمتی کتاب تصنیف کی جس کا نام کتاب الصناعتین ہے۔ اس کتاب میں نثر و نظم کے بلند پایہ انتخابات، چیدہ چیدہ اشعار، بلیغ سے بلیغ خطبے بہت ہی خوبی سے جمع کئے گئے ہیں۔ ایک ایک مسئلے کی متعدد مثالیں پیش کر کے فصاحت و بلاغت پر خوب خوب موشگافیاں کی ہیں اور بتایا ہے کہ ایک خطیب یا مضمون نگار اپنے لیکچر یا خامہ فرسائی میں کیوں کر کامیاب ہو سکتا ہے۔

مثلاً وہ اصول خطابت پر بحث کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ ایک مقرر کا فرض ہے کہ تقریر کرتے وقت اس کا دل قوی اور مضبوط ہو، اعضا ساکن اور مطمئن ہوں، زبان صاف اور شستہ ہو، آواز اچھی اور معتدل ہو، موقعے اور محل کے مناسب مضامین کا انتخاب کر سکتا ہو، سامعین کے مذاق اور میلان طبع سے واقف ہو، امرا، اور عوام کے مراتب کا لحاظ رکھتا ہو تاکہ سامعین کے جذبات برانگیختہ ہو سکیں۔

پانچویں صدی ہجری میں علامہ ابن رشیق قیروانی (المتوفی ۴۵۶ھ) نے ایک نہایت ہی بیش بہا کتاب لکھی جس کا نام کتاب العمدۃ فی الشعر و نقدہ ہے۔ اس کتاب کا نام ہی اس کا عنوان ہے۔ اس موضوع پر پہلے قدامہ ابن جعفر، ابو ہلال عسکری وغیرہ نے گو قابل قدر کتابیں لکھیں مگر جس خوبی اور وضاحت سے کتاب العمدہ میں اشعار پر تنقید کی گئی ہے کسی اور کتاب میں اس کی چوتھائی بھی نہیں۔ تنقید اشعار کے

سلسلے میں مختلف طریقوں سے اصول بلاغت منضبط کیے گئے ہیں۔ شعرار کی اصطلاحیں، ان کے خاص خاص عنوانات، ان کے باہمی مباحث، نظم ونثر کا مقابلہ، ان پر تنقید و نکتہ چینی کے طریقے، لطائف وظرائف، شعرار کے طبقات، ان کے باہمی امتیازات اور وہ تمام اصول جو صحیح طور پر بلاغت کے لئے دستور العمل بننے کے قابل ہیں تفصیل سے بتائے گئے ہیں۔ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں کئی جگہ اس کا ذکر کیا ہے اور آخر میں تنقید اشعار پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

وبالجملہ فہذہ الصناعۃ وتعلمہا مستوفیً فی کتاب العمدۃ لابن رشیق ۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ فن اور اس کا تعلم پورے طور پر ابن رشیق کی کتاب العمدہ میں پایا جاتا ہے۔ (مقدمہ ابن خلدون مصری صفحہ ۵۰۴)

اس دور کی آخری کڑی شیخ عبد القاہر جرجانی (المتوفی ۴۷۱ھ) تھا۔ یہ شخص علم کلام، علم نحو، علم فقہ کا امام اور فن بلاغت کا مؤسس مانا جاتا ہے۔ اس نے صحیح معنوں میں علم بلاغت کو جامۂ تدوین سے آراستہ کیا۔ اس کے منتشر اور پراگندہ شیرازے کو یکجا کر کے ہر ایک کے لئے جدا جدا فصول اور ابواب قائم کئے، فن معانی کو فن بیان سے علیحدہ کر کے دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغہ ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ کتابیں تصنیف کیں جن میں بجائے عقلی دلائل کے ادبی ذوق کا لحاظ رکھتے ہوئے نہایت ہی ادیبانہ انداز میں مثالیں پیش کر کے بتایا ہے کہ دیکھو اس کلام میں جو کچھ زور ہے وہ محض اس لئے کہ فلاں لفظ فلاں جگہ پر ہے یا فلاں لفظ فلاں لفظ سے مقدم یا مؤخر ہے۔ اگر اس ترتیب کو بدل دیا جائے تو کلام میں وہ خوبی باقی نہیں رہتی جو موجودہ حالت میں ہے۔

الفاظ کا باہمی تناسب اور ان کی نشست ہر کلمے کی دوسرے کے ساتھ موزونیت اور کھپت فصاحت کی جان ہے۔ کبھی دو کلمے ہم معنی ہوتے ہیں مگر کسی عبارت یا شعر میں ایک ہی کلمہ کھپ سکتا ہے اگر اس کے بجائے دوسرا کلمہ رکھ دیا جائے تو کلام میں بھدا پن پیدا ہو جاتا ہے اور جب کلام میں ایسے الفاظ جمع ہو جاتے ہیں جو باہم مناسبت رکھتے ہیں تو زبان میں خود بخود ان کے ادا کرنے میں ایک سلاست اور روانی پیدا ہو جاتی ہے جس کو علم بدیع کی اصطلاح میں انسجام کہتے ہیں۔ مگر صناعۃ لفظی و معنوی اور ان کے تمام اقسام اس قدر تفصیل سے بیان کئے ہیں کہ کسی شخص نے

اب تک ان مسائل پر اتنی وضاحت و خوبی سے خامہ فرسائی نہیں کی۔ پھر یہ بھی بتایا ہے کہ ایک کلام کو دوسرے کلام پر فضیلت محض انتخاب الفاظ کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ اس میں معنی کو بڑا دخل ہے۔ الفاظ سے جس قدر حصہ متعلق ہے اس کو فصاحت کہتے ہیں اور جن چیزوں کا تعلق معنی سے ہے ان کو بلاغت کہتے ہیں۔

چھٹی صدی ہجری تک متقدمین کا یہ مذاق باقی رہا وہ اس فن کے اصلی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیشہ اصول بلاغت ادیبانہ انداز میں بیان کرتے رہے تاکہ متعلم کو خطابت و صحافت میں کافی دستگاہ حاصل ہو جاوے اور وہ ہر موضوع پر تحریر و تقریر کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کر سکے۔

لیکن ساتویں ہجری میں جب ابو یعقوب یوسف سکاکی (المتوفی ۶۲۶ھ) کا دور آیا تو افسوس ہے کہ دریا کا رخ دوسری طرف پھر گیا۔ اس نے علم بلاغت کو منطقی رنگ میں رنگ دیا اور علوم ادبیہ کو پس پشت ڈال کر معقولات کا ایک بڑا طومار اضافہ کر دیا۔

متاخرین نے سکاکی کی کتاب "مفتاح العلوم" کو بہت سراہا۔ اس کے متعدد خلاصے اور حاشیے لکھے گئے اور فلسفیانہ رنگ میں اس کثرت سے شروح و حواشی پڑھائے جانے لگے کہ اصل فن کا کہیں پتہ نہیں رہا۔ جن میں علامہ تفتازانی (المتوفی ۷۹۱ھ) کی تصنیفات مطول اور مختصر معانی سب سے زیادہ مقبول ہوئیں اور مدت سے درس نظامی میں داخل ہیں جو اس وقت ہندوستان کے زیادہ تر مشرقی مدارس میں رائج ہے اور جس کی تحصیل کئے بغیر کوئی شخص عالم کہے جانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

زمانے کی رفتار اور جدید مذاق کے ساتھ ساتھ دنیا کی تمام چیزیں بدلتی جا رہی ہیں لیکن ہمارا عربی نصاب تعلیم جو آج سے صدیوں پہلے فلسفہ و منطق کے عروج کے دور میں تیار کیا گیا تھا آج بھی بلا کسی ترمیم و تنسیخ کے رائج ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عربی زبان باوجود ہماری مذہبی زبان اور ہمارے ذوق سے قریب تر ہونے کے ہم کو مدتوں میں ویسی نہیں آتی جیسی انگریزی زبان باوجود ایک اجنبی زبان ہونے کے تھوڑے عرصے میں آ جاتی ہے اس لئے کہ اس میں زمانے کے مذاق کے مطابق ایک روح ہوتی ہے جس کا ہمارے یہاں کہیں نشان تک نہیں ملتا۔

یہ سب کچھ دراصل اس بے نتیجہ طریقہ تعلیم کا اثر ہے جو بدقسمتی سے ہندوستان کے اکثر مدارس میں مروج ہے۔ عالم اسلامی علماء کے اس جمود اور کورانہ تقلید پر جس قدر بھی ماتم کرے کم ہے۔

جمالیہ عربک کالج (مدراس)

کالج کی مختصر تاریخ | ۵۰ برس کا زمانہ گزرتا ہے کہ جناب حاجی جمال محی الدین صاحب نے اس کالج کی بنا ڈالی تھی۔ شروع شروع میں یہ کالج عربی کا مدرسہ تھا جس میں عربی زبان میں بہت سے علم پڑھائے جاتے تھے جس طرح کہ ہندوستان کے دوسرے عربی مدرسوں میں تعلیم دی جاتی ہے۔

آج سے آٹھ سال پہلے حاجی صاحب موصوف کے سعادت مند فرزند سیٹھ جمال محمد صاحب ایم' ایل' اے نے اپنے مدرسے کے نصاب تعلیم میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا کر دی۔ وہ یہ کہ پرانے علوم کے ساتھ چند نئے علوم کی تعلیم بھی لازمی کر دی اور اسی وقت سے اس مدرسے کا نام "جمالیہ عربک کالج" ہو گیا۔

طریقۂ تعلیم | جمالیہ عربک کالج میں تعلیم کا طریقہ نہ بالکل جدید ہے اور نہ قدیم۔ انگریزی تعلیم کو لازمی قرار دینے کے باوجود مشرقیت کو برقرار رکھنے کا ہر وقت خیال رکھا جاتا ہے۔ زمانۂ قدیم میں تعلیم کے دو طریقے تھے۔ ایک تو یہ کہ استاد پڑھتا تھا اور طلبہ سنتے جاتے تھے اور ضروری اشارات اور بعض وقت استاد کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ اپنی کاپی میں لکھتے جاتے تھے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ شاگرد پڑھتا تھا اور استاد معانی اور ضروری بحثوں کی تشریح کرتا تھا۔ جمالیہ عربک کالج میں یہ دونوں طریقے عمل میں لائے جاتے ہیں۔ اسکول میں اکثر و بیشتر طلبہ ہی کو پڑھنا پڑتا ہے اور کالج میں یہ فرض استاد انجام دیتا ہے لیکن ایک تہائی کے قریب طالب علموں کو بھی قرأت میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ تعلیم حدیث کے سلسلے میں ایسا کرنا استاد و شاگرد دونوں کے لئے باعث سعادت سمجھا جاتا ہے۔

تقسیم نصاب | سردست جمالیہ کالج میں مدت تعلیم آٹھ سال رکھی گئی ہے۔ چار سال اسکول کے لئے اور چار کالج کے لئے۔ اسکول کے چار سالوں کی تقسیم اس طور پر کی گئی ہے کہ پہلے دو سالوں میں عربی زبان اور دینیات پر زور دیا جاتا ہے۔ اسکول کے تیسرے سال سے انگریزی بھی شروع کرا دی جاتی ہے۔ اسکول میں ذریعۂ تعلیم تامل زبان ہے مگر اسکول کے پہلے ہی سال سے اس بات کی کوشش کی جاتی

ہے کہ طلبہ کو اردو بھی آجائے۔ اس کے لئے شروع ہی سے اردو کا ایک گھنٹہ رکھا جاتا ہے۔

کالج میں ذریعۂ تعلیم عربی اور اردو زبان کو رکھا گیا ہے۔ کالج کے پہلے ہی سال سے اردو کی طرف خاص توجہ کی جاتی ہے جو کالج کے آخری سال تک باقی رہتی ہے۔ اسی کے ساتھ طلبہ کو انٹرمیں تک انگریزی حساب، اقلیدس، الجبرا، تاریخ ہند و انگلستان (تاریخ اسلام کے علاوہ) اور جغرافیہ وغیرہ کی بھی تعلیم دی جاتی ہے اور جس وقت طالب علم یہاں سے فارغ ہو کر نکلتا ہے تو عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ مذکورہ بالا علوم سے بھی بقدر ضرورت واقف ہوتا ہے۔

سال آئندہ سے ایک تجویز اور بھی زیر غور ہے کہ فارغ التحصیل طلبہ کو دو سال کی مدت اور دی جایا کرے۔ اس زمانے میں یہ طلبہ دینیات کے کسی ایک یا دو فنوں میں مہارت پیدا کریں۔ اسی کے ساتھ ان کو مذاہب عالم کا بھی مطالعہ کرایا جائے۔

مقصد تعلیم | جمالیہ عربک کالج کی خصوصیت اس کا مقصد تعلیم ہے۔ انگریزی اور عربی کے جداجدا اسکولوں کے قیام نے ان دونوں زبانوں کے جاننے والوں میں ایک خلیج حائل کر دی ہے۔ تحریک آزادی کے بہت زیادہ ترقی کر جانے کے باوجود عربی اور انگریزی تعلیم یافتہ طبقوں میں وہ اتحاد اور اتفاق نہ پیدا ہو سکا جس کی ضرورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے مذاق اور رجحان سے ناآشنا ہیں اور اسی وجہ سے وہ تفریق جو دونوں میں پیدا ہو گئی ہے کسی طرح نہیں مٹتی۔ سیٹھ جمال محمد صاحب کو اس چیز کا احساس تھا۔ اسی لئے موصوف نے ہندوستان کے بعض مخصوص علما کے علاوہ اپنے ممالک اسلامیہ کے سفر کے زمانے میں مصر میں علامہ طنطاوی (مصنف تفسیر جواہر) سے اس سلسلے میں تبادلۂ خیال کیا۔ علامہ موصوف نے علوم عربیہ کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کی تعلیم کی پرزور تائید کی۔ لہذا جمالیہ کالج میں عربی کے ساتھ ساتھ انگریزی وغیرہ کو نصاب تعلیم میں داخل کر لیا گیا تاکہ وہ تفریق بھی دور ہو جائے جو بدقسمتی سے تعلیم یافتہ طبقوں میں پیدا ہو چکی ہے اسی کے ساتھ علوم جدیدہ سے ضروری واقفیت پیدا ہو جائے تاکہ وقت کی ضروریات کا صحیح اندازہ کیا جا سکے۔ غرض کہ جمالیہ دین و دنیا دونوں کی تعلیم دینا چاہتا ہے اور جنوبی ہند میں جمالیہ کالج اسی نصب العین کو سامنے رکھتا ہے جو شمالی ہند میں جامعہ ملیہ دہلی کے پیش نظر ہے۔

دارالاقامہ | جامعہ کالج کے دو بورڈنگ ہیں۔ ایک بڑا بورڈنگ جس میں تقریباً ۵۵ طلبہ رہتے ہیں۔ بڑا بورڈنگ ایک شاندار عمارت ہے۔ اس کے اردگرد کافی کشادہ میدان ہیں۔ اس کے کمرے اس قدر چوڑے اور آرام دہ ہیں کہ ایک کمرے میں پانچ آدمی بآرام رہ سکتے ہیں۔ بورڈنگ کسی ایک استاد کی نگرانی میں دیدیا جاتا ہے اور استاد (نگران دارالاقامہ) کی آسانی کے لئے انتظام کی یہ صورت رکھی گئی ہے کہ ہر کمرے کے رہنے والے طلبہ میں سے کسی ایک کو مانیٹر مقرر کردیا جاتا ہے جو ان کے چال چلن، تعلیم، نماز اور کھیل وغیرہ کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ مؤدب (نگران دارالاقامہ) کی طرف سے سارے بورڈنگ کا ایک طالب علم کو ذمہ دار قرار دے دیا جاتا ہے جو تمام کمروں کے مانیٹروں سے ان کے ساتھیوں کے متعلق باز پرس کرتا ہے۔ عام نگرانی اس کا فرض منصبی ہوتا ہے۔ چھوٹے دارالاقامے میں پندرہ طالب علم رہتے ہیں اور اس میں بھی انتظام کی یہی شکل ہے۔

طلبہ کی انجمنیں | طلبہ کی دو انجمنیں ہیں۔ ایک کالج کی طرف سے جس کا نام لٹریری سوسائٹی ہے۔ ہر مہینے اس کی ایک میٹنگ ہوتی ہے جس کی اطلاع ناظر (پرنسپل) کالج اور انجمن کے سکریٹری (جو ایک طالب علم ہوتا ہے) کی طرف سے دی جاتی ہے۔ باہر کے مقررین بھی بلائے جاتے ہیں چنانچہ ابھی حال میں سٹرپال کو دعوت دی گئی تھی۔ یہ بزرگ مدراس کے مشہور عیسائی ہیں۔ آپ کی شخصیت اپنے مخصوص خیالات کے باعث تمام دنیا کے عیسائیوں میں بین الاقوامی شہرت حاصل کرچکی ہے۔ موصوف نے انگلستان سے واپسی پر سب سے پہلی تقریر جامعہ کالج میں کی۔ ہندوستان کے بعض مشہور علما و زعما بھی اپنی تشریف آوری سے اس سوسائٹی کو مشرف کرچکے ہیں۔

عام طور پر طلبہ خود ہی کوئی عنوان مقرر کرتے ہیں جس کے ماتحت موافق و مخالف خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس انجمن کے جلسوں میں اساتذہ بھی شریک ہوتے ہیں۔ اس انجمن کے جلسوں کی صدارت عموماً کوئی نہ کوئی استاد کرتے ہیں۔

دوسری انجمن طلبہ کی نجی انجمن ہے جس کا تعلق بورڈنگ سے ہے۔ اس انجمن کے جلسوں کی نگرانی مؤدب کرتا ہے اور وقتاً فوقتاً طلبہ کو ضروری ہدایات دیتا ہے لیکن طلبہ اپنی کارروائیوں میں بالکل

آزاد ہوتے ہیں۔ اس کے جلسوں میں مختلف زبانوں میں تقریریں ہوتی ہیں جس کی اطلاع پہلے سے دے دی جاتی ہے۔ عام طور پر تامل اور انگریزی اور کبھی کبھی اردو اور عربی میں تقریریں ہوتی ہیں۔

ورزش | ورزش اور کھیلوں کا بھی خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ شام کے وقت چھوٹے بڑے سب لڑکے کسی نہ کسی کھیل میں حصہ لیتے ہیں۔ عام طور پر طلبہ والی بال اور بیڈمنٹن کو زیادہ دلچسپی سے کھیلتے ہیں۔ کھیلنے کے لئے بڑے بڑے میدان موجود ہیں۔

عملی کام | اس کی بھی کوشش کی جارہی ہے کہ طلبہ کو کچھ عملی کام بھی کرنا چاہئے۔ اس کے لئے کچھ زمین ان کو دے دی گئی ہے جس میں وہ کچھ نہ کچھ کرتے ہیں۔ آج کل طلبہ اپنے بورڈنگ کے سامنے کے حصے میں ایک چھوٹا سا باغ لگارہے ہیں۔ فرصت کے اوقات میں تھوڑا سا وقت عملی کاموں میں بھی صرف کرایا جاتا ہے۔

کتب خانہ | کالج سے متعلق ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی ہے جس میں عربی کے مختلف فنون کی کتابوں کی اکثریت ہے۔ انگریزی، اردو اور تامل میں بھی بقدر ضرورت کتابیں موجود ہیں۔ کتب خانے میں عام طور پر وہی کتابیں ہیں جو درس وتدریس سے تعلق رکھتی ہیں۔ کالج کی طرف سے ایک مخصوص رقم ماہوار کتابوں کے اضافے پر صرف ہوتی ہے۔

ہندو اساتذہ | جمالیہ کالج کو مخصوص روایات کے ماتحت لانے کے لئے ہندو اساتذہ بھی رکھے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ وہ تمام رعایتیں روا رکھی جاتی ہیں جن سے مسلمان اساتذہ مستفید ہوتے ہیں۔ غالباً یہ جمالیہ کالج ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے مخصوص مقاصد کے مطابق بڑی فراخ دلی کے ساتھ اپنے ہاں ہندو اساتذہ کو بھی جگہ دیتا ہے۔

اساتذۂ کالج | جمالیہ کالج کے اسٹاف میں مندرجہ ذیل اساتذہ ہیں:-

(۱) مولوی عبدالوہاب صاحب بخاری، افضل العلماء، ایم۔ اے، ایل۔ ٹی (پرنسپل)

(۲) مولانا حسن محمد صاحب جمالی (۳) مولانا محمد یوسف صاحب جمالی (۴) مولانا محمد شریف صاحب جمالی

(۵) مولانا محمد حسین صاحب باقوی، افضل العلما (۶) مولوی رحیم احمد صاحب، افضل العلما، بی۔ اے۔

(۷) مولانا کمال الدین صاحب جمالی (۸) مسٹر ورداچاریا بی۔ اے (ہیڈ ماسٹر) (۹) مسٹر اللہ بچے۔ بی۔ اے، بی۔ ایل (۱۰) مسٹر پی۔ وی محمد صاحب بی۔ اے (۱۱) مسٹر ایس پرپاسیوم (۱۲) مسٹر عبدالصمد (۱۳) خلیل احمد

جمالیہ کی حیثیت | نصاب کی مخصوص تبدیلیوں اور ان میں خاطر خواہ کامیابی کی توقع پر جمالیہ عربک کالج کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جنوبی ہند کے مدارس بھی جمالیہ کو ایک کامیاب اور مفید درسگاہ سمجھتے ہیں۔

جمالیہ کا مستقبل | کالج کی صورت اختیار کر لینے کے بعد جمالیہ کے منتظمین اپنے کالج کو ترقی کے انتہائی درجوں تک پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا نصب العین دین و دنیا دونوں ہی ہیں۔ اس لئے ان کی جدوجہد دونوں چیزوں کے وابستہ کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

جمالیہ کے منتظمین کی ان بزرگوں سے جنھیں مسلمانوں کی تعلیم سے دلچسپی ہے یہ درخواست ہے کہ اگر وہ اپنے مفید مشوروں سے ہمیں مستفید فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے تو ان مشوروں کو خلوص قلب کے ساتھ قبول کیا جائے گا اور ہم ان کے شکر گزار ہوں گے۔

غول بیابانی

عرب کے نزدیک جن اور شیاطین میں فرق ہے بعض نے جن کو ایک جنس اور شیاطین کو دوسری جنس قرار دیا ہے۔ بعض نے یہ تفریق کی ہے کہ جن تو نیک اور طاہر روحیں ہیں اور موذی اور شریر روحیں شیاطین ہیں شیاطین جو زیادہ خبیث ہیں انھیں مارد کہتے ہیں۔ ان ماردین میں جو زیادہ زورآور و تنومند ہیں عفریت کہلاتے ہیں

جن کی تعریف شیخ الرئیس بوعلی سینا یوں کرتے ہیں کہ جن وہ حیوان ہوائی ہیں جو مختلف شکلیں اختیار کر سکتے ہیں۔ جنوں کو موت آتی ہے شیاطین کو نہیں آتی۔

حن (بجائے حطی) جنوں کا ایک قبیلہ ہے یا جنوں میں سے بچے، لفنگے، رذالے، کم ذات حن کہلاتے ہیں۔

شیصبان بھی جنوں کے ایک قبیلے کا نام ہے اور اپنے سرگروہ کے نام سے مشہور ہے۔

عرب جاہلیت کی خرافات میں سے ہے کہ آدھے آدمی اور آدھے جن ایسی خلقت کو شق کہتے ہیں

حن کے متعلق بھی ایک قول یہ ہے کہ انسانوں اور جنوں میں ایک درمیانی خلقت ہے۔

جس کا آدھا جسم سعلاۃ (دیونی ساحرہ جن) کا اور آدھا آدمی کا ہو اسے غُلوق کہتے ہیں۔ اور جس کا آدھا جسم آدمی کا اور آدھا فرشتے کا ہو اسے عِلیان کہتے ہیں۔

جُرہُم کی پیدائش کو آدمی اور فرشتے سے خیال کرتے ہیں۔ جرہم اس قبیلے کے سردار تھے جو یمن سے آکر حوالی مکہ معظمہ میں بس گئے تھے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے اسی قبیلے میں شادی کی تھی۔

پری اور آدمی سے جو نسل چلی ہے وہ نسناس سے نامزد ہے۔ سد آذربیجان کے اوپر نسناس اور ان کی نسل آباد ہے۔

پریوں اور یاجوج ماجوج کے متعلق خیال ہے کہ یہ بنات وحیوان کے ملنے سے پیدا ہوتے ہیں۔

حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ قریش رُوسا جن کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے قرآن شریف نے

ان کی اس بات کو بے عقلی ٹھہرایا۔

ذوالقرنین کے متعلق کہا کرتے تھے کہ اس کی ماں قبرے اور باپ عبرے تھا۔ قبرے کو فرشتہ اور عبری کو آدمی سمجھتے تھے۔ نکاح و جماع جن و انس میں واقع ہونا درست مانتے تھے۔

گھومنے پھرنے والے جنوں کو عرب نُظرہ بولتے ہیں۔

کوئی جنی (جن کا مفرد) یا جنّیہ جو کسی انسان کا پیچھا کرے اور ساتھ ساتھ پھرے اُسے تابع مؤنث ہو تو تابعہ کہتے ہیں۔

جو گھروں میں آدمیوں کے ساتھ رہتا ہے عامر کہلاتا ہے جمع عمار ہے۔

وہ جن جو بچوں کو چھیڑا کرتا ہے اسے ارواح کہتے ہیں (فقہ اللغۃ للثعالبی)۔

احقب ان جنوں میں سے ایک ہے جنھوں نے قرآن شریف سنا تھا۔

جنوں میں سے طاہر و نظیف و نیکو کار کو مَلَک سے تعبیر کرتے ہیں۔

شیاطین الجن میں سے جو مارد ہیں ان کی بھی نوعیں ہیں۔

انواع ذکور کے نام ہیں

عَیْہَران۔ دیو۔ عیاہیر جمع۔ قُطْرُوب یا قُطْرُب۔

انواع اناث کے نام یہ۔

غول۔ سعلاۃ۔ قطربہ و شہام ہیں۔

بیان مذکور سے معلوم ہوا کہ غول (جسے عرب مؤنث جانتے ہیں) جن ماردمیں سے ہے۔ یہ ساحرہ مشہور ہے۔ اردو زبان میں لفظ غول مذکر مستعمل ہے۔

غول طرح طرح کی شکلیں اختیار کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح سعلاۃ کو بھی یہ قدرت حاصل ہے یہ بھی ساحرہ مانی جاتی ہے۔ جنگل بیابان میں مسافر کو راستہ بھلا کر اور سنسان جگہ میں لے جا کر اسے مار ڈالنے کی بہت سی حکایتیں غول کی طرف منسوب ہیں۔

عرب اس روشنی کو بھی غول ہی سمجھتے تھے جو دور سے جنگل میں نظر آیا کرتی ہے۔ قبرستانوں اور مرگھٹوں

ہیں دیکھی جاتی ہے اس کے پاس تک پہنچو تو ہٹ کر ادھر اُدھر ہو جاتی ہے

غول کے خیال نے آہستہ آہستہ مدارج تخیل طے کئے۔ تصور نے اس کی شکل انسانی اور پاؤں گدھے جیسے بنائے حتیٰ کہ اس فرضی مخلوق کو بعض عربوں نے دیکھنے اور پہچاننے کا دعویٰ کیا۔

تَأَبَّطَ شَرًّا قدیم شعرائے عرب میں سے ہے۔ اس کے اشعار میں غول کا بہت ذکر آتا ہے یہاں تک کہ بیاباں نوردی میں اکثر مواقع پر غول آپ کے رفیق طریق رہے ہیں (اغانی جلد ۱۸ صفحہ ۲۰۹)

ایک مرتبہ ان سے غول نے شرارت کی ٹھانی۔ یہ تاڑ گئے اور تلوار کے ایک ہی بھرپور ہاتھ سے اس کے ٹکڑے کر دئے۔ قزوینی نے غول کو جن شیطنہ کی قسم سے قرار دیا ہے۔

حیوٰۃ الحیوان دمیری اور کتاب الحیوان جاحظ (مطبوعہ قاہرہ) میں غول کو عرب کی روایات مذکور کی بنا پر حیوانوں میں شمار کیا ہے۔ اس کی جمع غیلان اور اغوال آتی ہے۔

غول کی صفات مذکور کے لحاظ سے عربی زبان میں کئی لفظ پیدا ہو گئے ہیں مثلاً

تَغَوُّل طرح طرح کی صورتیں اختیار کرنا۔ پھر معنی میں اور عموم ہوا تو رنگ بدلنے، حالت بدل جانے اور کیفیت اور ہو جانے کے لئے بھی آنے لگا مگر ان معنوں میں بھی ذم لازم رہا۔ بری حالت سے اچھی حالت بدل جانے پر اس لفظ کا اطلاق نہیں ہوتا۔ چنانچہ کعب بن زہیر نے قصیدہ بردہ میں سعاد کو اس کے تغیرؔ تلون کے لئے، نہ تو غول سے تشبیہ دی نہ مصدر تغول کا کوئی صیغہ برتا حالانکہ غول اس تمہید کا قافیہ تھا۔

اغتیال کسی کو دھوکے یا پر اسرار طریق سے قتل کر ڈالنے کو کہتے ہیں۔ یہ بھی ہر آفت و ہلاکت پر مجازاً بولا جانے لگا مگر وہی جو کسی کے شامت اعمال کے نتیجے میں آئے۔

غول بھی ہر بھوت پریت کے لئے نہیں بولتے تھے یہ بیابان ہی کے لئے خاص تھا۔

اسلام آیا تو غول کے معنی میں بڑا عموم آگیا۔ اول تو غول کو جو ایک خاص ہیئت و صورت وہم نے دے رکھی تھی وہ مٹ گئی۔ حضرت نبی کریمؐ نے فرمایا کہ لَا غُوْلَ وَلَا صَفَر یعنی غول کی (جس کی ہیئت جسمانی تو انسانی اور پاؤں گدھے جیسے مانے جاتے تھے) کوئی اصلیت نہیں اور صفر کے مہینے کی نحوست بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ (لسان العرب صفحہ ۲۱)

اس فرمان سے عربوں کے توہم کا جو غول کے متعلق تھا ازالہ ہو گیا۔ البتہ وہ اب غول کو مجازی ہستی ماننے لگے مگر معتزلہ اس کے بھی قائل نہ رہے (کشاف کلکتہ صفحہ ۱۲۰۵)

اہل سنت کے محققین کہتے ہیں کہ اس حدیث میں جس طرح صفر کی نفی فرمائی ہے اسی طرح غول کی نفی فرمائی ہے۔ صفر کا مہینہ تو ہے مگر اس کی نحوست سراسر وہم تھی۔ اسی کا رد منظور ہے علی ہذا غول بھی ہے مگر اس کی بہیت کذائی اور مقام کا تعین بیابان سے خصوصیت یہ سب واہمہ تھا۔ اس کا ازالہ کر دیا۔ مثلاً جو اور راستوں میں ٹھگ آدمیوں کو حالت سفر میں دھوکے سے مار ڈالتے ہیں اور جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے لے لیتے ہیں۔ یہ غول ہیں۔ اسلام کے اثر سے اس لفظ کے معنیٰ میں بڑا انقلاب پیدا ہو گیا چنانچہ قطر المحیط بطرس البستانی میں غول کے معنی لکھے ہیں "وکل ما اغتال الانسان فاہلکہ فھو غول" یعنی ہر وہ شے جو انسان کو فریب دے اور اس کی ہلاکت کا موجب ہو جائے وہ غول ہے۔

ہر نقصان دہ چیز پر غول کا اطلاق اسلام نے عام کر دیا تاکہ عرب کا توہم باقی نہ رہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے الغضب غول الحلم۔ غضب حلم و بردباری کے لئے غول ہے۔

حادثات ارضی و سماوی وبا، مرض سب کو غول قرار دینا زبان نے جائز کر دیا۔ ایک حدیث میں آیا ہے اذا تغولت الغیلان فبادروا بالاذان۔ جب طرح طرح کے حادثے ہونے لگیں تو اذان اول وقت دیا کرو۔

(بادروا کے معنیٰ دو طرح سمجھے گئے ہیں ایک توجیہہ میں نے کی جس سے مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ اول وقت نماز پنجگانہ کی اذان دینے سے اور فرض جماعت سے ادا کر کے جو وقت ملے اس میں نوافل ادا کئے جائیں۔ آیۂ کریمہ "تَعَاوَنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃ" کا مفہوم ان معنیٰ کا مؤید ہے۔ دوسرے یہ کہ جب کوئی حادثہ رونما ہو تو جلد اذان دینے لگو کہ اس کی آواز سے بلائیں بھاگتی ہیں۔)

غرضکہ اسلام کے بعد عرب سے خیالی وہمی غول بالکل سدھار گیا اور زیر آشیانہ عنقا اس نے نشیمن اختیار کر لیا۔ کسی شاعر نے کہا ہے:۔

الغولُ والخِلُّ والعنقاءُ ثالثۃٌ ۔۔۔ اسماءُ اشیاءَ لم توجد ولم تکن

غول اور سچی دوستی اور سیدھے عنقا ایسی چیزوں کے نام ہیں کہ نہ وہ ہوتی ہیں نہ پائی جاتی ہیں۔

قرآن شریف میں لفظ غول بمعنی فین شراب جنت کی تعریف میں آیا ہے۔ "لا فیہا غول ولا ہم عنہا ینزفون" نہ اس میں ہلاکت ہوگی اور نہ وہ اس سے متوالے ہوں گے۔ یہاں غول کے معنی ہیں ایسے طریقے پر ہلاک کرنا کہ محسوس نہ ہو۔ (مفردات راغب)

اسی طرح شیطان کے معنی میں اسلام کے بعد عربی ادب میں بہت وسعت آگئی۔ چور کو بھی شیطان کہنے لگے۔ حضرت ابو ایوبؓ فرماتے تھے کہ شیطان میرے مچان سے کھجور چرالے جاتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں شیطان کا کھجور چرانا ثابت ہے۔

ایک شاعر نے تمام اہل شام کو شیاطین کہہ دیا ہے۔

ملائکۃ الارض اہل الحجاز و اہل الشآم شیاطینہا

اہل حجاز تو زمین میں فرشتے ہیں اور اہل شام شیاطین ہیں۔ (فرائد اللغۃ)

اردو میں غول کا مرادف وہم معنی چھلاوا ہے۔ یہ اگیا بیتال کے معنی پر بھی اور مختلف صورتوں میں روپ دکھلانے کے معنی پر بھی حاوی ہے۔ اردو میں بھی جن اور بدروحوں کی کئی اقسام ہیں:۔ دیو، جن، بھوت، پریت، چنڈال، آسیب، غول، پرچھانواں مذکر ہیں۔ چڑیل، ڈائن، بھائی، دیونی، بھوتنی مؤنث ہیں۔ پری بھی مؤنث ہے اور ایک حسین اور غیر موذی مخلوق ہے۔ دیو یہاں فارس سے آیا ہے۔ سرکش اور متمرد انسان کو بھی دیو کہہ دیتے ہیں۔ بھوت وہ بدروح ہے جو جسم چھوٹنے کے بعد دنیا میں ماری ماری پھرتی ہے۔ مجازاً غصے کو اور برے بدصورت آدمی کو بھی کہتے ہیں۔

پریت ہر ناپاک روح کو بولتے ہیں۔ وہ روشنی جو پیچھے پیچھے آتی ہے اس کو اگیا بیتال کہتے ہیں۔ کاف فارسی مشدد اور مخفف دونوں طرح ہے۔

چنڈال بھوت کی کمینی اور بدذات قسم ہے۔ ایک کمینے فرقے کا نام بھی ہے۔ آسیب بھی ہرمنی اور صدمے کے معنی پر آتا ہے۔

ڈائن اپنے بچوں کو آپ کھا جاتی ہے۔ زن جگر خوار، بدصورت عورت کو مجازاً کہتے ہیں۔

بہائی وہ روح جو خوشی اور غم کی باتیں کہہ کے بچوں کو سوتے جاگتے ہنساتی رلاتی ہے سہ
طرفہ غمگیں ہوں کہ روتی گئی وہ آہ شعور — آئی محفل میں بہائی جو ہنسانے مجھ کو

ایران، مصر، طرابلس اور ترکی میں بھی عام طبقے غول کو مانتے ہیں۔ انگریزی میں بھی لفظ غول (Ghouls) پہنچ کر منرنج ہو گیا ہے، اور ogres کا مرادف بن گیا ہے۔

الف لیلہ میں سندباد جہازی قصہ سیف الملوک قصہ وزیر حاسد میں جن و غول کا بیان آتا ہے۔

لین صاحب نے اپنی کتاب مصریینِ حاضر میں غول کا قبریں تلاش کر کے مردوں کی لاش کو کھا جانا وہاں کے عوام کا مسلمہ بتایا ہے۔

مقریزی نے خطط میں ایک روایت کی ہے کہ دیو اور غول داء الکلب کی بیماری عارض کر دیتے ہیں۔

طیارہ

آئیے آج ہم اس پر غور کریں کہ ہوائی جہاز کا وجود دنیا میں کیسے ہوا جس نے آج دنیا کو اپنی کرشمہ زیوں سے محوحیرت کردیا ہے۔ صدیوں سے لوگوں کے دماغ میں یہ خیال چکر لگا رہا تھا کہ وہ ہوا میں اڑنے کی کوئی نہ کوئی ترکیب معلوم کریں۔ چنانچہ اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ لوگوں نے کوششیں بھی کیں لیکن بے سود۔ ۱۷۸۲ء اور ۱۷۸۳ء میں دو بھائیوں مونٹ گولفیر (Mont Golfier) نے غبارے بنائے اور ان میں گرم ہوا بھر کر اڑائے جس میں انہیں کچھ کامیابی کی جھلک نظر آئی۔ تب تو ان کی ہمت بندھی اور ان میں سے ایک کو اس بات کی ہمت ہوئی کہ وہ خود کسی ایک غبارے میں بیٹھ کر اڑے۔ چنانچہ وہ کامیاب ہوا۔ پھر کیا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا غرضکہ اسی طرح لگاتار کئی سفر کئے گئے۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد ہائڈروجن کا ظہور ہوا جو اس مقصد کے لئے بہت زیادہ موزوں ثابت ہوئی۔ بہت بڑے بڑے غبارے تیار کئے گئے اور لوگوں نے اڑانا شروع کیا۔ اس طرح لوگوں نے ہوا میں اڑنے کا طریقہ تو معلوم کر لیا لیکن تقریباً سو سال تک یہ نہ معلوم کر سکے کہ غبارے کو قابو میں کیسے کیا جائے کیونکہ غبارے کے اڑنے کا دارومدار ہوا پر تھا اور جس طرف کو ہوا چلتی تھی اسی طرف کو وہ بھی اڑا چلا جاتا تھا اس طرح بہت سی جانیں بھی ضائع ہو گئیں۔

غبارہ کس طرح ترقی پذیر ہوا؟

باوجود ان تمام نقصانات کے لوگوں نے شوق کی وجہ سے اس بات کی کوشش جاری رکھی کہ کوئی عمدہ سے عمدہ طریقہ نکالا جائے۔ چنانچہ انہیں اس میں کامیابی بھی ہوئی اور رفتہ رفتہ وہ اس درجے پر پہنچے کہ ۱۹۰۱ء میں دو جرمن سائنس دانوں نے اپنے غبارے کو ۰، میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑایا۔ اس کے بعد سب سے لمبا سفر جو ڈیڑھ ہزار میل کا تھا ایک فرانسیسی نے ۱۹۱۳ء میں پیرس سے اڑ کر روس تک پہنچ کر پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ لوگوں نے ہوا کی لہروں اور گرمی و سردی کے درجوں سے متعلق اس قسم کے سفر سے بہت کافی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ یہ غبارے صرف اسی لئے نہیں

استعمال کیے گئے بلکہ ان سے جنگوں میں بہت کافی مدد لی گئی۔

سب سے بڑی کامیابی اس طرح حاصل کی گئی کہ غبارے کے ساتھ ایک ڈکری بنائی گئی اور اس میں ایک انجن لگا دیا گیا جس میں پروپلر (Propeller) اور تپوار (Rudder) دونوں لگے ہوئے تھے۔ اس طرح سے انھیں اتنی کامیابی تو حاصل ہو گئی تھی کہ وہ معمولی ہواؤں میں جدھر چاہتے جاتے لیکن اگر کوئی ہوا کا تیز جھونکا آتا تو پھر اس پر کامیابی حاصل نہیں ہوتی اور وہ اسی جھونکے میں یا تو تباہ ہو جاتے یا اسی کی سمت میں اس وقت تک اڑے چلے جاتے جب تک کہ اس کا اثر باقی رہتا۔

دوسرا کامیاب قدم ایک برازیلی سینٹوس ڈومونٹ (Santos Dumont) اور ایک جرمن کاؤنٹ زیلن (Count Zeppelin) نے اٹھایا۔ اس برازیلی نے ایک گوبھی کی شکل کا ایک غبارہ بنایا جس کا ایک گوشہ بڑھا ہوا تھا۔ اس نے ۱۹۰۱ء میں پیرس کے Eiffel مینار کے گرد نصف گھنٹے میں چکر لگایا۔ پھر وہ اس جگہ پر پہنچ گیا جہاں سے وہ پہلے روانہ ہوا تھا۔ اس کے صلے میں اسے بیس ہزار ڈالر بطور انعام دیے گئے۔ اس بہادر موجد نے اپنی توجہ اب ہوائی جہاز کی طرف منعطف کی اور اس پہلی چیز سے بالکل بے پروا ہو گیا۔ دوسرے فرانسیسیوں نے بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی اپنی کوششیں جاری رکھیں یہاں تک کہ ایک بوہری افسر میجر فان پرسی ول (Major Van Parseval) نے ایک غبارہ تیار کیا جس کو وہ اپنی خوشی کے مطابق ہر طرف لے جاتا تھا۔

کاؤنٹ زیلن کا تیار کردہ ایک بہت بڑا ہوائی جہاز

کاؤنٹ زیلن نے ایک جدید طرز ایجاد کیا۔ اس نے اپنے ہوائی جہازوں کا باہری حصہ بہت پتلے لوہے کا بنایا اور اندرونی حصے کو مختلف کمروں میں تقسیم کر دیا جو گیس کے تھیلوں سے بھرے رہتے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی خراب ہو جاتا تو دوسرے اسے اوپر ہی قائم رکھتے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں ایک نیا طریقہ چڑھاؤ کا معلوم کیا گیا دوسرے بہتر جہاز بنائے جانے لگے یہاں تک کہ ۱۹۱۰ء میں ایک سو میل کا سفر ایک گھنٹے سے کچھ زیادہ عرصے میں طے کیا گیا۔ اس سفر کو زیادہ اہمیت اس وجہ سے دی جاتی ہے کہ اس میں جہازراں کے ساتھ ساتھ دوسری سواریاں بھی تھیں۔ کاؤنٹ زیلن نے دوسرے بھی بہت سے جہاز بنائے جن سے بہت سے سفر کیے گئے ان میں

تھیوں کے علاوہ چوبیس سواریاں بھی ہوتی تھیں بعض بعض وقت جہاز پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جاتا تھا۔ جہاز بہت بڑے اور بہت زیادہ وزنی ہوتے تھے اور ان میں سے بہت سے طبند ہوا کی وجہ سے تباہ ہوگئے۔

دوران جنگ عظیم میں ان جہازوں کو جن کو زپلن نے بنایا تھا اور اب وہ زپلن کے نام سے مشہور ہوگئے تھے فوجی مقصد کے لئے استعمال کیا گیا۔ وہ اس قابل ہوگئے تھے کہ شمالی سمندر کو پار کرسکیں اور انگلستان کے مختلف حصوں پر بم گرائیں یا فرانس کے اوپر سے اڑکر پیرس پر حملہ کریں۔

ہوا سے بھاری مشین کا بننا

یہ تمام مشینیں جو اب تک تیار ہوئی تھیں سب کی سب ہوا سے ہلکی ہوا کرتی تھیں لیکن ان کی کامیابی کا بہت بڑا حصہ اس بات میں مضمر تھا کہ وہ ایک ایسی مشین تیار کریں جو ہوا سے بھاری ہو۔ بہت سے لوگوں نے اس سوال کے حل کرنے کی کوشش کی۔ اس سے قبل بہت سے لوگوں نے کہا کہ اونچائی سے اس طرح پھسلنا چاہئے جیسے کہ گلہریاں پھسلتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی کامیاب نہیں ہوا۔ انیسویں صدی کے آخری سالوں میں دوسرے بہت سے لوگ بھی اس کام میں مشغول تھے چنانچہ ایک جرمن اوٹولیلی تھل (Otto Lilienthal) اور ایک امریکی باشندہ اوکٹیو چینوٹ (Octave Chanute) نے ایک پھسلنے کا آلہ تیار کیا اور اس سے وہ پھسلنے میں کامیاب ہوگئے۔ اب وہ بہت بڑی بڑی جگہوں سے آسانی کے ساتھ اتر سکتے تھے۔ لیلی تھل اپنے مرنے سے قبل دو ہزار مرتبہ سے زیادہ اڑا ہوگا۔

مشہور و معروف انگریز موجد سر ہیرام میکسیم نے ایک مشین تیار کی جس میں ایک انجن لگا ہوا تھا۔ یہ ۱۸۹۴ء میں پہلی مرتبہ آزمائی گئی لیکن اس میں کوئی خرابی رہ جانے کی وجہ سے یہ تھوڑی ہی دور اڑ سکی اور سر ہیرام نے پھر تجربے کرنے چھوڑ دیئے۔ واشنگٹن کی انسٹی ٹیوٹ کے ایک پروفیسر ایچ۔ پی۔ لینگلے نے جو اس وقت اس سوال کا حل سوچ رہا تھا وہاں کی کانگریس کو مجبور کیا کہ وہ اسے پچاس ہزار ڈالر تجربوں کے لئے دے۔ اس نے بہت سی چھوٹی چھوٹی مشینیں بنائی تھیں جن میں انجن بھی لگے ہوئے تھے۔ وہ بغیر کسی آدمی کے ہوا میں اڑتیں۔ آخر میں اس نے ایک بڑی مشین بنائی تھی جس میں ہوا باز بھی بیٹھ سکتا تھا جب اس کو آزمایا گیا تو مشین اڑتے وقت دو مرتبہ خراب ہوگئی اور وہ ریزہ ریزہ ہوگئی۔ پروفیسر لینگلے نے وہ تمام رقم

جولے دیگئی تھی خرچ کرڈالی اور اس کی یہ ناکامی جرح تمسخر و مذاق کا سبب قرار پائی۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اس کے غم میں دل کی حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال کرگیا۔ وہ بالکل صحیح راستے پر تھا کیونکہ اس کی وفات کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اگر اس کی مشین میں چند تغیر کردیے جاتے تو وہ ضرور اڑتی۔ پروفیسر موصوف کے متعلق یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ اڑنے والی مشین کا ماہر تھا۔

اس کے بعد تقریباً تمام آدمیوں نے بازو کے سائز اور شکل کے متعلق بہت کچھ سیکھنے کی کوشش کی لیکن جن لوگوں نے اس بات کی کوشش کی کہ بجلی استعمال کریں انھیں یہ معلوم ہوا کہ مشین کی مجموعی طاقت بڑھانے کے لئے یہ بہت زیادہ وزنی ثابت ہوئی۔ اس وقت تک گیسولین انجن جسے ہم موٹروں میں دیکھتے ہیں بہت ترقی پکڑ چکا تھا۔ دو امریکیوں نے اس بات کا فیصلہ کیا کہ وہ اس سے ہوائی جہاز بھی چلا سکیں گے۔

دو امریکیوں کا اس مسئلے کو حل کرنا

اورل اور ولبر رائٹ دو امریکیوں نے ڈیٹن اور اوہیو میں سائیکلوں کی مرمت کے لئے دو کانیں کھول رکھی تھیں۔ انھیں موٹر سائیکل کا بھی کافی تجربہ تھا۔ انھوں نے ۱۹۰۰ء میں پھیلنے والے آلے سے تجربہ شروع کیا تاکہ وہ بازوؤں کی بہترین شکل و سائز معلوم کرسکیں۔ وہ شمالی کیروشیا کے سمندری ساحل پر گئے تاکہ ان کے کام میں کوئی مارج نہ ہو۔ آخرکار ۱۹۰۳ء میں ایک مشین بنائی گئی جو ہوا میں ایک آدمی سمیت ۵۹ سیکنڈ تک ٹھہری رہی۔ اس طرح مسئلہ حل ہوگیا۔ اس کے بعد پھر رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوتی گئی۔ رائٹ برادرس نے بھی اپنی کوششیں جاری رکھیں اور ۱۹۰۵ء میں ایک ۲۴ میل کا سفر طے کرکے بعد اپنی جگہ پر واپس آگئے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت بڑے بڑے سفر طے کئے گئے۔ ۱۹۰۸ء میں ولبر رائٹ نے بیمینس میں جو فرانس میں واقع ہے سب سے طویل سفر طے کیا جو ابھی تک کسی سے نہ ہو سکا تھا۔ اس نے ایک جہاز میں ۵۶ میل کا سفر طے کیا اور دوسرے میں وہ ۲ گھنٹے ۲۰ منٹ تک لگاتار ہوا میں مقیم رہا۔ ان دو امریکیوں نے اس کام کو بہ نسبت ایک تجربہ کار سائنس داں اور ایک ہوشیار کارکن کے نہایت خوش اسلوبی اور خوبصورتی سے انجام دیا۔

یکایک تمام دنیا نے اس بات کو معلوم کر لیا کہ ہوا پر بھی قبضہ کر لیا گیا اور وہ کس سے ؟ ایک بہت
معمولی چیز سے جس میں ایک مشین، پروپلر (آگے دھکیلنے کا آلہ) کے ساتھ لگی ہوتی ہے پھر کیا تھا تمام مہذب
ملک نے اڑنے والی مشین بنانی شروع کر دی۔ اس میں پیش پیش وہ لوگ تھے جو مشین کی تعلیم سے واقف
تھے چنانچہ انھوں نے بہت ہی کم عرصے میں کافی ترقی کر لی ہوائی جہاز جس میں دو بازو ہوتے ہیں اور اسے
انگریزی میں بائی پلین کہتے ہیں بنائے گئے اور بعض تین بازوؤں اور چار بازوؤں والے ہوائی جہاز
بھی بنائے گئے۔

لمبے فاصلے کی پہلی اڑان | سب سے پہلے فرانسیسیوں کو سرداری کے عہدے سے سرفراز کیا گیا۔
سانتوس ڈوموںٹ نے بہت سے غبارے اور ہوائی جہاز بنائے۔ ۱۹۰۹ء میں ایک ہمت ور فرانسیسی
بلیریوٹ نے آب رو د انگلستان کو کیلے سے ڈوور تک پار کیا جس کا فاصلہ ۲۱ میل ہے۔ اس کے بعد
انگریزوں کو جوش آیا اور ایک انگریز فارمن نے اڑ کر یہ معلوم کر لیا کہ اس کی کیا حالت تھی۔ جی ایچ کرٹس
امریکی باشندے نے یورپ اور امریکہ میں اپنی ہمت اور دلیری کی نمائش سے لوگوں کو اچنبھے میں
ڈال دیا تھا۔ مسٹر کرٹس نے بھی ایک ہوائی جہاز بنایا تھا جس کو ہائیڈروپلین کہتے ہیں (اگرچہ دوسرے
لوگ بھی اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر کام کرتے تھے لیکن ابھی تک کوئی کامیاب نہیں ہوا تھا) یہ ایک
بہت طاقتور جہاز ہوتا ہے جس کے سامنے اڑنے والی کشتیاں بھی مضبوطی سے بندھی ہوتی ہیں۔ یہ نہایت
آسانی سے پانی سے اوپر اٹھ سکتا ہے اور بغیر کسی خطرے کے اتر سکتا ہے۔ یہ درحقیقت ایک اڑنے والی
کشتی ہے۔

پہلے چند سالوں میں بہت سے جہاز رانوں نے اپنی جانیں ضائع کر دیں کیونکہ انھیں نہ تو
مشین سے کام کرنا آتا تھا اور نہ ہوا کی لہروں سے واقفیت تھی۔ بہت سے حادثات پیش آنے کے بعد
انھوں نے یہ معلوم کیا کہ جس قدر اوپر جائیں گے اسی قدر کم خطرہ ہے کیونکہ اتنی بلندی سے گرنے میں انھیں
وقت لگتا تھا اور وہ اس عرصے میں مشین کو دوبارہ ٹھیک کر لیتے تھے۔ اس میں سب سے زیادہ خطرناک
بات انجن کے کسی حصے کے ٹوٹ جانے سے پیدا ہو جاتی تھی جس کی وجہ سے ہوائی جہاز کی رفتار میں

رفتہ رفتہ کم ہوتی جاتی، پھر نیچے جھکتا اور بالآخر گر پڑتا تھا۔

جہاز راں گرنے سے محفوظ کیسے ہوگئے؟

فی زمانہ تجربہ کار جہاز راں جانتے ہیں کہ ایسے موقعے پر کیا کرنا چاہئے۔ وہ لیور (مشین کا ایک حصہ) کی مدد سے جو اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے ایلیویٹر (مشین کا حصہ) نیچے کر دیتا ہے جس کی وجہ سے جہاز کا اگلا حصہ بالکل نیچے کی طرف جھکتا ہے۔ تماشائیوں کو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاز بالکل تباہ ہوجائے گا لیکن وہ زمین پر پہنچنے سے پہلے لیور کو دوسرا چکر دیتا ہے اور اپنی مشین کو سیدھا کرتا ہوا آہستہ آہستہ زمین پر نیچے اتر جاتا ہے۔ اس سے بھی محفوظ ترین طریقہ یہ ہے کہ مشین کو گرتے وقت دائرے کی شکل میں گھماتے ہوئے اُتارے تاکہ جہاز راں آسانی کے ساتھ اپنے اترنے کی جگہ کا بہترین انتخاب کر سکے۔

دوسری طرف وہ تمام خطرات جو ایک مبتدی کو پیش آیا کرتے تھے رفع کر دئے گئے۔ چھ سال تک کوئی جہاز راں کسی ایسے خطرے میں جو ہوا کے تیز چلنے سے نمودار ہوجایا کرتے تھے گرفتار نہ ہوا۔ ایک دن ایک انگریز لیتھم نے اپنی مشین کو ایک خوفناک ہوا کے تند جھونکے میں ڈال دیا۔ چند منٹ تک وہ بری طرح سے اس جھونکے کے خلاف پھڑپھڑاتا رہا۔ یکایک مڑا اور ۹۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوا کے جھونکے سے نکل گیا۔ اس کے بعد ہی اس ہمت ور جہاز راں نے پھر اپنا جہاز اسی تند جھونکے میں لا ڈالا اور دس منٹ کے بعد اپنی کامیابی پر فخر کرتا ہوا اتر آیا۔

ایک جہاز راں جو کوہ آلپس کے اوپر سے گذر گیا

اس کے بعد کے سالوں میں چیوز نامی ایک شخص نے کوہ آلپس کی بلندی کو ہوائی جہاز سے پار کر کے تمام دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ اگرچہ اس نے کوہ آلپس کی دوسری جانب اترنے میں کسی خرابی کی وجہ سے اپنی جان دے ڈالی لیکن اس نے ثابت کر دیا کہ بلند سے بلند جگہ کو پار کرنا ناممکنات میں سے نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاز کے اوپر چڑھنے کی کوئی حد مقرر نہیں ہے لیکن جب جہاز راں دو اور تین میل کی بلندی پر پہنچتا ہے تو ہوا کا پھیلاؤ اسے مدہوش اور بیمار کر دیتا ہے۔ اوپر ہوا میں سردی بھی بہت ہوتی ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ایک جہاز راں بیس ہزار فیٹ کی بلندی پر جو تقریباً چار میل کے برابر ہے جانے میں کامیاب ہوگیا۔

پہلے پہل لمبے سفر کی اڑان مشکل تصور کی جاتی تھی کیونکہ ہوائی جہاز اتنے مضبوط نہیں ہوتے تھے کہ وہ اپنے ساتھ اس قدر ایندھن لے جاسکیں جو اس طویل سفر میں انجن کے لئے درکار ہو لیکن رفتہ رفتہ وہ اس مشکل پر حاوی ہوگئے اور لمبی اڑانوں میں سے سب سے پہلی اڑان ایک امریکی روگرس کے ذریعے ۱۹۱۱ء میں عمل میں آئی۔ وہ نیویارک سے اڑ کر کنیپاس پہنچا جو ۲۶۰۰ میل ہے۔ اس سفر میں اس کی مشین کی مرمت میں پندرہ ہزار ڈالر صرف ہوئے۔ جب وہ کنیپاس میں پہنچا تو اس کی مشین کا شاید ایک پرزہ بھی اپنی اصلی حالت پر باقی نہ تھا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد جبکہ وہ کیلیفورنیا کے ایک مقام لونگ برانچ پر سمندر کا کنارہ دیکھ رہا تھا کہ سمندر کی ہوا کے ایک تند جھونکے نے رڈر اور مشین کے پچھلے حصے کو بھگو دیا جس کی وجہ سے رڈر کا حرکت کرنا ناممکن ہوگیا۔ چنانچہ جب اس کی مشین گرنے لگی تو وہ ٹھیک نہ کرسکا اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔

ایک یادداشت کے ٹوٹنے کے بعد دوسری یادداشت

روگرس کی قائم کردہ یادداشت کے دو سال بعد ایک فرانسیسی ہیلم نے ۱۲۰۰۰ میل کا سفر ۲۹ دن میں طے کیا۔ اس طرح اس نے اپنی محنت سے پہلی یادداشت کی فاتحہ پڑھ دی۔ اب یہ ممکن ہوگیا تھا کہ ایک مشین ہوا میں ۱۲ گھنٹے آسانی سے ٹھہر سکتی ہے۔ اب تو لندن سے پیرس اور جرمن کے شہروں میں بغیر کہیں اترے ہوئے اڑ کر پہنچ جانا ایک معمولی سی بات تھی۔ لوگ ایک انگریز اور ایک فرانسیسی کے جہاز کا قصہ بیان کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ہوائی جہاز ایک ملک سے اڑ کر دوسرے ملک میں کس رفتار سے پہنچا تھا۔

اگلے وقت میں چالیس پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار ایک ہوائی جہاز کے لئے بہت بڑی رفتار سمجھی جاتی تھی اور آج کل یہ ممکن ہوگیا ہے کہ ایک شخص بذریعہ ہوائی جہاز ۱۲۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جاسکتا ہے اور خوش قسمتی سے ہوا بھی موافق ہو تب تو وہ ۱۵۰ میل یا اس سے بھی زیادہ فی گھنٹہ کی رفتار سے جاسکے گا۔

ایک جہازراں کے لئے ہوش وحواس کا قائم رکھنا بہت زیادہ ضروری ہے

حواس کا ٹھیک رکھنا اس شخص کے لئے جو اڑنا چاہتا ہے نہایت ضروری ہے اگر جہازراں نہ ڈرے تو حادثات بہت کم

وقوع پذیر ہوں گے۔ اس لئے آج کل اس جہاز کو مکمل مانا جاتا ہے جس کا چلانے والا بھی اس کے تمام کل پرزوں کو اپنے قبضے میں کرلے۔

چند سال پہلے ایک فرانسیسی ہوا باز دار دن میں اڑ رہا تھا کہ یکایک اس کی مشین کو ایک تیز ہوا کے جھونکے نے الٹ دیا۔ خوش قسمتی سے وہ ایک اچھی خاصی بلندی پر تھا اور ایک تسمے سے بندھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھا، مشین کو ٹھیک کیا اور آہستہ سے صحیح وسلامت نیچے اتر آیا۔ اس کے چند مہینے بعد ہی ایک دوسرے فرانسیسی نے اپنی مشین کو الٹ لیا اور اوپر سے نیچے پلٹا کھانے لگا۔ آج کل یہ ایک معمولی کرتب سمجھا جاتا ہے۔ ایک جہاز راں جس نے اس کو بار بار کیا کہتا ہے کہ جہاز کے اوپر سے نیچے پلٹا کھانے میں جب تم جھکاؤ سے روانہ ہوتے ہو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم خاموش بیٹھے ہو اور دنیا تمہارے گرد گھومتی ہے اور افق تمہارے قدموں کے نیچے غائب ہو جاتا ہے اور پھر دوبارہ تم اسے اپنے سر پر آتے ہوئے دیکھو گے۔ یہ تمام چیزیں اس قدر جلد ہو جاتی ہیں کہ تم ایک لمحے کے لئے نہیں سمجھ سکتے کہ کیا واقعہ پیش آیا اور تمہیں سوائے اس کے اور کوئی تکلیف نہ ہوگی کہ خون تیزی کے ساتھ آنکھوں میں دوڑنے لگے گا۔ اس سے بچنے کے لئے جہاز راں کو چاہئے کہ اوپر سے نیچے کی طرف ایک کرسی میں اپنے آپ کو ایک فیتے میں باندھ کر دوسری طرف لٹک جائے۔

انسان ہوا میں توازن قائم رکھنا بھول جاتا ہے۔

یہ ایک تعجب خیز امر ہے کہ انسان ہوا میں توازن قائم رکھنے کے خیال کو بھول جاتا ہے۔ جہاز راں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ کب اس کی مشین آگے یا پیچھے چلتی ہے لیکن اسے اس بات کی تمیز نہیں ہوتی کہ اس کی مشین دائیں یا بائیں جھکتی ہے۔ اپنی سطح کو وہ برابر قائم رکھنے کے لئے اپنے پاس ایک آلہ رکھتا ہے جس سے وہ بخوبی پتہ چلا لیتا ہے کہ اس کی مشین کس طرف کو جھکتی ہوئی ہے۔ زمین بھی اسے اپنی حالت محسوس کراتی ہے۔ جہاز راں کہرے میں جانے سے بہت ڈرتا ہے اس لئے کہ وہ وہاں پہنچ کر تمام اطراف کی اٹکل بھول جاتا ہے۔ ایک جہاز راں اپنا تجربہ بیان کرتا ہے کہ وہ یکایک کہرے میں آ پڑا جس سے وہ اس قدر پریشان ہوا کہ اس نے اپنی مشین کو الٹ لیا۔ اس کے باوجود بھی اسے اس کی تمیز نہ تھی کہ اس کا سر نیچے لٹک رہا ہے۔ لیکن جب فیتہ جس سے وہ

بندھا ہوا تھا کھنچ گیا اور اس کی جیب سے چیزیں نکل کر ہوا میں اڑنے لگیں تو اسے خیال ہوا کہ اس نے اپنی مشین الٹ لی ہے۔ پھر اسے سیدھا کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہوائی جہاز کو جو پہلا عملی جامہ پہنایا گیا وہ لڑائی کے مقصد کے لئے تھا۔ ایک جنرل کے لئے اس سے زیادہ اور کیا قیمتی چیز ہو سکتی ہے کہ وہ ہوا میں ایک میل کی بلندی پر اڑ کر اپنے دشمنوں کی نقل و حرکت کا بالکل اسی طرح معائنہ کرے جیسے کہ ایک شخص نقشے میں مقامات کو دیکھتا ہے۔

جنگ میں ہوائی جہاز کی سب سے بڑی اہمیت

دوران جنگ عظیم میں ہر ایک فوج اپنی اڑنے والی پلٹن کے ساتھ جس میں سو سو جہاز راں ہوتے تھے شامل ہو گئی تھی۔ ان میں سے چند بہت ور اسکاؤٹ تو وہی ہیں جنہوں نے اگلے وقت میں اپنے اپنے کرتب دکھلائے۔ اس زمانے میں اسکولوں کو خاص کر اسی لئے قائم رکھا گیا کہ لڑکوں کو جہاز رانی سکھلائی جائے۔ چنانچہ وہ تمام واقعات جن کو اڑنے والے اسکاؤٹوں نے تجربے سے معلوم کیا تاریخ جنگ عظیم کا سب سے زیادہ دردناک حصہ ہے۔

ہر روز علی الصباح اسکاؤٹ جہاز راں اپنے خیمے سے مشین میں باہر نکلتا اور ایک گول دائرہ بناتا ہوا وہ ایک میل کی بلندی پر چلا جاتا۔ بعض بعض مرتبہ وہ اکیلا نہیں بلکہ اپنے کسی ایک ساتھی کو بھی ساتھ لے لیتا جس کی جگہ اس کے آگے ہوتی۔ اس کا کام صرف یہ ہوتا تھا کہ وہ بیٹھے بیٹھے ان تمام حرکتوں کو جو اس کے نیچے ہوتی تھیں بغور ملاحظہ کرے۔ پھر یکایک مشین آگے جھپٹتی تھی اور ان مہلک چیزوں کو جو وہ اپنے ساتھ رکھتی تھی دشمنوں کی فوج میں پھینک دیتی تھی۔ فوراً ہی دشمنوں کی فوجی بندوقیں چلنے لگتیں جن کی گولیاں بلا مبالغہ پانچ پانچ میل تک اوپر جاتی تھیں اور رائفلیں لگاتار چھوٹنے لگتیں۔ اس عرصے میں وہ کم سے کم چار ہزار فیٹ سے زیادہ بلندی پر پہنچ جاتے۔ ایسے موقعوں پر وہ اکثر دشمنوں کی فوجوں کا فوٹو بھی لیا کرتے تھے۔

پھر وہ اوپر جا کر یہ نہیں کہ خاموش اڑا کرتے بلکہ اوپر ہی اوپر دشمن کے علاقے پر نظر بھی رکھتے اور جب موقع ہاتھ آتا نیچے جھکتے اور ایک بم یا تو کسی ٹرین پر جو بارود سے بھری رہتی یا کسی فوج پر پھینک کر مڑ جاتے۔ ادھر سب چیزیں جل کر خاک سیاہ ہو جاتیں۔ بعض بعض وقت ہوائی جہازوں کا آپس میں مقابلہ

بھی ہوتا تھا۔ یہ جہازرانوں کے لئے سب سے زیادہ خطرناک موقع تھا۔ ان میں سے ہر ایک کبھی چھپتا کبھی دائرے کی شکل میں ایک دوسرے کے گرد گھومنے لگتا۔ غرضکہ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا کہ اسے کوئی اچھا موقع ملے کہ وہ فوراً حملہ کردے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے کوئی نہ کوئی کامیاب ہوجاتا۔ ایک فرانسیسی مسٹر پیگوڈ جنھوں نے سب سے پہلے ہوائی جہاز سے اوپر سے نیچے چکر کھانے کا طریقہ معلوم کیا اس قسم کی بہت سی لڑائیاں لڑچکا ہے۔ ایک مرتبہ اس کی مشین بالکل بے کار ہوگئی اور وہ دشمن کے علاقے میں گرپڑا اور اس کی مشین گرتے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ یہ دیکھ کر اس کے اوپر ایک دشمن آپڑا۔ مسٹر پیگوڈ نے جس کے زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی فوراً جھپٹ کر دشمن کو جو ایک جرمن تھا مارا اور اس کے جہاز میں بیٹھ کر اپنے علاقے میں پہنچ گیا لیکن اس کے چند ہی ہفتے بعد مسٹر پیگوڈ کا اس کے کسی دشمن نے بندوق سے خاتمہ کردیا۔ اس کے چند دن کے بعد اس کی قبر پر ایک پھولوں کا ہار (جو عیسائیوں کے دستور کے مطابق مردے کے ساتھ بھیجا جاتا ہے) ہوائی جہاز سے گرا دیا گیا۔ ہار کے ساتھ ایک پٹھا دستیاب ہوا جس پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی "پیگوڈ جو اپنے دشمن کے ہاتھوں ایک بہادرانہ موت مارا گیا۔"

ہوائی جہاز کا آگے چل کر کیا حشر ہوگا کوئی نہیں بتلا سکتا۔ ہاں فلموں کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہوائی جہاز آگے چل کر گھر گھر اسی طرح پھرا کریں گے جیسے فی زمانہ موٹر چلا کرتے ہیں۔

الہامِ اقبال

دیکھ چکا المنی کوششِ اصلاحِ دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں عہدِ کہن کے نشاں

حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کنشت
اور ہوئی فکر کی کشتیٔ نازک رواں

چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں

ملت رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر
لذتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں

روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

آزادی

(ٹیگور کی ایک دلپذیر نظم سے متاثر ہو کر اشعار ذیل لکھے گئے)

جہاں ہر دل میں ہو جوشِ محبت ذوقِ غم خواری
جہاں ہر سر میں ہو سودائے ایثار و رواداری

جہاں مسلک ہو اخوت ہو مذہب شفقت و نصرت
جہاں ہو کفر بد عہدی، جہاں ایمان وفاداری

جہاں عنقا ہو نامِ امتیازِ خویش و بیگانہ
جہاں محسوس ہو فرقِ دل آزاری و دلداری

عطا کر دے خدایا ہم کو آزادی کی وہ منزل

جہاں چرچا نہ ہو پیچ و خمِ راہِ سیاست کا
جہاں ہو ہر طرف حق و صداقت کی عملداری

جہاں ہو امتیازِ رہنما و راہزن ظاہر
جہاں ہو سرفروشی لازم اوصافِ سرداری

جہاں ہر فرد ہو بے خوف استبداد باطل سے
جہاں ہو بچہ بچہ جاں نثارِ شانِ خودداری

عطا کر دے خدایا ہم کو آزادی کی وہ منزل

جہاں رونا نہ ہو تاریکیٔ جہل و ضلالت کا
جہاں گھر گھر ہو مہرِ علم و حکمت کی ضیا باری

جہاں مردانگی ہو نام حسنِ خلقِ انساں کا
جہاں ہر شخص ہو مفتونِ سلمائے نکوکاری

جہاں تابانیٔ جوشِ عمل سے دل فروزاں ہوں
جہاں ہو ظلمتِ عیش و تن آسانی سے بیزاری

عطا کر دے خدایا ہم کو آزادی کی وہ منزل

جہاں پایا نہ جائے فرقِ نسل و مذہب و ملت
جہاں نابود ہو جوشِ تعصب کی غلط کاری

جہاں اقوامِ عالم منسلک ہوں سلکِ الفت میں
خراسانی و ہندی تازی و چینی و تاتاری

جہاں شیر و شکر ہوں جذبۂ مہر و مروت سے
کلیسائی و موسائی و تسبیحی و زناری

عطا کر دے خدایا ہم کو آزادی کی وہ منزل

مطالبات

نگاہِ محبت فزا چاہتا ہوں　　مسافر ہوں اک رہنما چاہتا ہوں
تجلی نظر آشنا چاہتا ہوں　　تجھے جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہوں
ستم چاہتا ہوں جفا چاہتا ہوں　　کہ مشقِ طریقِ وفا چاہتا ہوں
نہ پوچھے کوئی مجھ سے کیا چاہتا ہوں　　کہ اپنے کئے کی سزا چاہتا ہوں
ابھی خام ہے کچھ مذاقِ تمنا　　کرم ہائے صبر آزما چاہتا ہوں
مجھے کوئی کافر مسلمان کر دے　　مجازِ حقیقت ادا چاہتا ہوں
دلا دے کوئی یاد، بھولا ہوں کس کو　　بتا دے کوئی ہائے کیا چاہتا ہوں
خریدار ہے کون دنیا میں دل کا　　کہاں اور کیا بیچنا چاہتا ہوں
خطا پر ندامت خطا در خطا ہے　　خطا کر کے داد خطا چاہتا ہوں
کیا ہے محبت نے گستاخ کتنا　　کہ تجھ سے تجھے مانگنا چاہتا ہوں
ہوس چاہتی ہے تجلیِ عریاں　　مگر میں نگاہ رسا چاہتا ہوں
جو قید مجاز و حقیقت اٹھا دے　　وہ کیفیت دل کشا چاہتا ہوں

تمنا مری اور محدود کوکب
مقامِ ورا الورا چاہتا ہوں

رقابت

نسیمہ کو اپنے شوہر کریم سے غیر معمولی محبت تھی۔ کریم کی شریک زندگی بن کر وہ اپنے آپ کو بہت ہی خوش قسمت سمجھتی تھی مگر قدرت ان دونوں کو ہمیشہ کے لئے جدا کرنا چاہتی تھی...... کریم کو اپنی بعض ضروریات کی تکمیل کے لئے وطن کو کچھ دنوں کے لئے خیرباد کہنا پڑا.... ریل کا سفر تھا گاڑی اپنی پوری رفتار سے چل رہی تھی کہ ایک اسٹیشن کے قریب لائن ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے پہیئے پٹری سے اتر گئے اور گاڑی الٹ گئی۔ ڈبوں کے ٹکرانے سے بہت سی جانیں ضائع ہوئیں کریم بھی انھیں جان دینے والوں میں سے تھا۔ لاش کو اس کے گھر پہنچایا گیا بیوی جس نے جلد ملنے کی آرزو میں شوہر کو ہنستے ہوئے الوداع کہا تھا اب حسرت و یاس کے ساتھ اس کا استقبال کر رہی تھی۔

لاشے کی ہمراہی میں ایک ڈاکٹر اور دو سپاہی تھے۔ میت کو ورثا کے سپرد کرتے ہوئے ڈاکٹر نے نسیمہ کے ساتھ بہت ہی ہمدردی کا اظہار کیا اور یہ نصیحت کی کہ نعش کو ہرگز نہ دیکھنا تاکہ اس کی وہ زندہ تصویر جو تم نے اسے الوداع کہتے وقت اپنے تصور میں قائم کی تھی ہمیشہ کے لئے تمہارے ذہن میں رہے۔ نسیمہ اس نصیحت کی تلخی کو برداشت نہ کرسکی، بے ساختہ اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی لیکن اس نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ مسرت و انبساط کا خاتمہ ہو چکا ہے اور اس لئے ڈاکٹر کے مشورے کو مان لینا ہی بہتر ہے کیونکہ مرحوم کے بے حس و حرکت اور ٹکڑے ٹکڑے جسم سے صحیح و سلامت جسم کی خیالی تصویر بدرجہا بہتر ہے۔

مرحوم گاڑی الٹنے کے بعد بھی چند منٹ تک زندہ رہے۔ ڈاکٹر نے کہا "اور جب ان کو اٹھایا گیا ہے تو ان کے ہاتھ میں ایک خط تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرنے سے پہلے انھوں نے اپنی بیوہ کے حق میں کوئی وصیت نامہ لکھا ہے۔"

نسیمہ نے والہانہ انداز میں ڈاکٹر کے ہاتھ سے خط لے لیا۔ خون آلود کاغذ میں پنسل سے

یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے "میں تمہیں خدا کے سپرد کرتا ہوں، دیکھو اُسے نہ بھولنا........"

یہ الفاظ ایک معما تھے۔ نسیمہ ان کے حل کرنے کی کوشش کرتی تھی مگر ناکام رہتی تھی۔ بس اس وقت سے اس کا یہ مشغلہ ہو گیا کہ ان الفاظ کو بار بار دہراتی اور حل کرنے کی کوشش کرتی۔ وہ مضطرب تھی کہ کس طرح یہ معما حل ہو اور یہ معلوم ہو کہ وہ کون عورت ہے جس کو میرا شوہر زندگی کے آخری اور نازک ترین لمحات میں بھی نہیں بھولتا۔

وقت گذر رہا تھا، حیرت و استعجاب اس کی رگ و پے میں سرایت کرتا جا رہا تھا اور صرف چند منٹوں کے غم و الم نے اسے برسوں کا بیمار بنا دیا تھا۔

جنازے کو اول منزل کرنے کے لئے مجلس عزا برپا ہوئی اور یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ نسیمہ نے ایک نقاب پوش عورت کو دیکھا جو مجمعے کے بالکل سامنے کھڑی ہوئی تھی، سراپا رنج و اندوہ کی تصویر معلوم ہوتی تھی........، تمام حاضرین کریم کی ناگہانی موت پر اظہار افسوس کر رہے تھے بعض لوگ مرحوم کی بیوہ کے ساتھ خود بھی شریک بین تھے لیکن اس نقاب پوش عورت کی کچھ ایسی بری حالت ہو رہی تھی جو دیکھی نہیں جاتی تھی،........ امام نے مجلس کو ختم کرنے کے لئے اپنی نصیحت آمیز تقریر شروع کی، نقاب پوش عورت شدت غم سے اس آخری حملے کو برداشت نہ کر سکی، پیر لڑکھڑائے اور دھم سے زمین پر رہی۔ کچھ لوگ دوڑے اور معبد سے باہر کھلی فضا میں لا ڈالا۔

نسیمہ کو یقین ہو گیا کہ میرے عزیز شوہر نے اسی عورت کے متعلق وصیت کی ہے، میرا فرض ہے کہ اس سے ملوں اور اس کے حالات معلوم کروں۔

نعش سپرد خاک کر دی گئی۔ نسیمہ اس حالت میں گھر کو پلٹی کہ چہرہ زرد تھا، کثرت گریہ سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ نسیمہ کے ساتھ ایک اور شخص بھی ہو لیا تھا جو رشتے دار تھا اور کریم کا دوست تھا، نسیمہ نے شوہر کی آخری وصیت کی اسے اطلاع دی اور اس سے خواہش کی کہ کسی طرح اس عورت کا پتہ چلائے جس کی حالت آج کے مجمعے میں سب سے زیادہ نازک تھی۔

کریم کی یاد نے دوبارہ بے قرار کر دیا، اس شخص نے بہت ہی مایوس ہو کر کہا "........غم

کی کیا حقیقت ہے میری رائے میں تو سب کو مرحوم کے ساتھ ہی دفن ہوجانا چاہئے تھا......نسیمہ کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی اور اس نے اس طرح اس شخص کی طرف دیکھا گویا کہہ رہی ہے کہ "......محبت کی کشمکش موت کی سختیوں سے کہیں زیادہ ہے......" ایک آہ سرد کے ساتھ کانپتی ہوئی آواز سے کہا"......کریم کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں اس عورت سے تعارف پیدا کروں اور اس کی خبرگیری کروں......کیا معلوم کہ اس کے پاس کریم کی بولتی چالتی یا قابل دید کوئی نشانی ہو"

"اس کے کوئی اولاد نہیں ہے" اس شخص نے کہا۔

نسیمہ۔کریم سے اس کے تعلقات کا تمہیں علم ہے؟

شخص۔ہاں! اس لئے تو میں عرض کررہا ہوں کہ اس قصے کو مرحوم کے ساتھ ہی دفن کردو تاکہ تمہاری زندگی اوراجیرن نہ ہو۔

یہ سنا تھا کہ نسیمہ کی سوزش قلب میں اور اضافہ ہوگیا لیکن اس نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ میں اپنے شوہر کی محبوبہ سے ضرور ملاقات کروں گی، گو مجھے ناقابل برداشت مصائب ہی کا کیوں نہ سامنا کرنا پڑے۔

تین دن کے بعد نسیمہ کے گھر ایک نوجوان لڑکی آئی جس کا نام امینہ تھا، سیاہ لباس زیب تن تھا، چہرے سے غم کے آثار ظاہر ہورہے تھے۔نسیمہ نے بڑے زور شور سے اس کا استقبال کیا اور اس کے ساتھ رہنے کی خواہش کی۔

نسیمہ کے عزیز واقارب کو یہ خبر پہنچی تو سب کے سب حیران ہوگئے۔کوئی نسیمہ کی وسیع القلبی کی تعریف کررہا تھا، کوئی اس نرمی پر اسے ملامت کررہا تھا لیکن نسیمہ شوہر کی وصیت کے پورا کرنے ہی میں ہر چیز سے زیادہ مسرت محسوس کررہی تھی۔

دن کا اکثر حصہ اس طرح پر گذرتا تھا کہ نسیمہ کریم کے متعلق امینہ سے گفتگو کرتی رہتی تھی۔دونوں میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ ایک دوسرے کا غم غلط کرے۔

ہر صبح کو دونوں ساتھ ساتھ مرحوم کی قبر پر جاتیں، کچھ دیر وہاں ٹھہر کر اپنی گذشتہ زندگی کی یاد

کرتیں اور پھر گھر لوٹ آتی تھیں جہاں ان کا سارا دن مختلف تذکروں میں گذرتا تھا۔ ہر ایک کریم سے اپنی محبت کی داستان کو اول سے آخر تک پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرتی تھی یا پھر کریم کے خطوط کو پڑھ کر سنایا جاتا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد یہ رد عمل شروع ہوا کہ نسیمہ امینہ کی داستان سنتی، اپنے شوہر کے خطوط جو امینہ کے پاس بھیجے گئے تھے، پڑھتی، .... دل میں ایک اضطراب پیدا ہوتا اور آنکھیں حسرت سے نم ہو جاتی تھیں ...... میں نے اس کے ریزہ ریزہ جسم کو دیکھنے سے اس لئے انکار کیا تھا کہ اس کی پیاری اور زندہ صورت میرے خیال میں موجود رہے لیکن اب میں دیکھتی ہوں کہ اس کی زندگی کس قدر آلودہ تھی، اس سے متعلق جو لفظ بھی سنتی ہوں وہ میرے دل پر تیر و نشتر کا کام دیتا ہے ..... میں اس سے محبت کرتی تھی، اس کے خلوص پر مجھے اعتماد تھا، میں اپنے آپ کو اس کی موجودگی میں بڑا خوش قسمت سمجھتی تھی ...... لیکن اب میں اپنے گذشتہ اعتماد پر متاسف ہوں ...... یہ سوچتے سوچتے نسیمہ کا دل پھر مایوسیوں سے بھر گیا، اس کی زندگی پھر مکدر ہوگئی، دل ہی دل میں نادم تھی کہ میں نے امینہ کو کیوں پاس رکھا اور ان رنج دہ واقعات کو کیوں سنا .... اسے امینہ سے ایک نفرت سی ہوگئی کیونکہ وہ نشانیاں جو امینہ کے حصے میں آئی تھیں وہ نسیمہ کے حق زوجیت کو چھیننے والی تھیں، اس کی گذشتہ کامرانیوں میں ایک طرح کا سرقہ تھیں۔

ایک صبح کو نسیمہ تنہا کریم کی قبر پر چلی گئی، پہنچی ہی تھی کہ امینہ کو آتے ہوئے دیکھا، اس کے ہاتھوں میں گلاب کے پھولوں کا ہار تھا جسے مزار پر چڑھاتے ہوئے اس نے نسیمہ سے کہا، کیوں بہن! آج تم اکیلی ہی چلی آئیں؟

نسیمہ نے بات کو کاٹتے ہوئے کہا' ہاں! .... اور اس وقت سے ہم ایک دوسرے سے قطع تعلق ہی کرلیں تو بہتر ہے۔

امینہ پر سکتہ سا چھا گیا لیکن پھر بھی اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا' ہاں! ہمیں اس وقت سے پہلے ہی علیحدگی اختیار کر لینا چاہئے تھی!

نسیمہ ۔ کاش .... کریم کی موت کے بعد تم سے میری ملاقات نہ ہوتی ....
..... سچ پوچھو تو آج دوبارہ کریم کو اپنے ہاتھوں سے کھو رہی ہوں ....
لیکن آج کا .... صدمہ .... اس کی موت کے دن کے صدمے
سے بدرجہا زیادہ ہے ۔

تنقید و تبصرہ

کتب

نوجوان ویرتھر کی داستان غم - حدیث ادب - تعلیم و نفسیات - موپاساں کا کلیہ قرأت۔

لالہ لاجپت رائے و نفسیات مذہب۔

نوجوان ویرتھر کی داستان غم | گوئٹے کا مشہور ناول مترجمہ ریاض الحسن صاحب ایم۔ اے۔ تقطیع ۲۲×۱۸/۱۶، حجم ۱۴۴ صفحے، مقدمہ مترجم ۱۰ صفحے۔ لکھائی چھپائی معمولی، کاغذ اچھا، قیمت ۱۲ مجلد ۱۔ شائع کردہ لٹریری سنڈیکیٹ نمبر ۱ بیلی روڈ الہ آباد۔

ویرتھر گوئٹے کی نوجوانی کے عہد کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ ان دنوں کچھ عمر کے تقاضے سے کچھ زمانے کی ہوا کے اثر سے گوئٹے رومانی رنگ میں سر سے پیر تک رنگا ہوا تھا۔ ہندوستان میں بھی موجودہ دور بگڑی ہوئی رومان پرستی کا دور ہے۔ اس لئے ویرتھر ہمارے عام مذاق سے ملتی جلتی چیز ہے اور اس کے ترجمے کو لوگ دلچسپی سے پڑھیں گے۔ یہ ایک نوجوان کا قصہ ہے جو احساس کی تیزی اور جذبات کی شدت کا شکار ہو کر نہ صرف مفید عمل سے بلکہ صحیح مشاہدے سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ ایک طرف اس کا حساس دل محبت اور انس سے معمور ہے جذبات لطیف کی ہلکی سے ہلکی آواز کو سنتا اور سمجھتا ہے حسن فطرت اور حسن انسانی کے گوناگوں جلووں کا لطف اٹھاتا ہے مگر دوسری طرف روزمرہ کی زندگی میں وہ واقعات کے صحیح تناسب کے اندازے سے معذور ہے، اس کی قوت ارادی اور قوت عمل عام معیار سے بہت کم ہے۔ اس کا عشق میں مبتلا ہو جانا سونے پر سہاگا ہو جاتا ہے۔ اس کا احساس وہ چند قوی اور ادراک، ارادہ اور عمل اسی نسبت سے ضعیف ہو جاتا ہے۔ اضطراب اور التہاب بڑھتے بڑھتے بلائے جان ہو جاتا ہے اور وہ خودکشی کر لیتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں گوئٹے نے خود اپنی ایک داستان محبت بیان کی ہے اور سوائے خودکشی کے اور سارے واقعات خود اس پر گذرے تھے۔

ترجمہ گو انگریزی کے واسطے سے کیا گیا ہے مگر انگریزی عبارت سے قریب رہنے کی وجہ سے اصل سے زیادہ دور نہیں ہوا۔ البتہ روانی جو اصل کتاب کی ایک بہت بڑی خصوصیت ہے ترجمے میں نہیں پائی

جاتی۔ کہیں کہیں الفاظ کا انتخاب اور جملوں کی ترکیب قابلِ اعتراض ہے۔ ذیل میں ہم چند نمونے پیش کرتے ہیں۔

صفحہ ۲۔ "میں اس کے متوفی مالک پر ایک اجڑے ہوئے کتاب خانے میں جو اس کی محبوب جگہ تھی اور آج میری ہے آٹھ آنسو بھی رو چکا ہوں۔"

صفحہ ۳۔ "جب گھاس کی پتیوں میں اس چھوٹی دنیا کا ترنم سن کر بے شمار کیڑوں اور مکوڑوں پر وقف تماشا ہوتا ہوں تو اس وقت میں اپنے نہاں خانۂ دل میں اس مجلی ہستی کی چمک پاتا ہوں جس نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا ہے اور جس کی ابدی رحمت ہماری زندگی کا ستون ہے۔"

صفحہ ۴۔ "درختوں کا جھرمٹ"۔ "بطریقی تمدن"۔

(Patriarch جب کلیسا کے ایک مخصوص مذہب کے معنی میں ہو تو اس کا ترجمہ بطریق کر سکتے ہیں ورنہ سردارِ خاندان، سردارِ قبیلہ یا سرِ قبیلہ۔ بطریقی کی جگہ سرِ قبیلی کہہ سکتے ہیں جو جامعہ عثمانیہ کی ایک کتاب میں استعمال ہوا ہے۔)

صفحہ ۵۔ "تم نے اکثر پریشان ہو کر میرے چہرے کی کیفیت انتہائی رنج سے انتہائی خوشی میں اور معمولی دلگیری سے تند جذباتی میں بہ سرعت بدلتے دیکھا ہے۔"

... ...

کتاب کے ساتھ مبسوط مقدمہ ہے جس کا نام خدا جانے کیوں "ابتدائیہ" رکھا گیا ہے۔ مقدمے میں گوئٹے کی زندگی کے حالات، اس کی تصانیف کا مختصر اور ویرتھر کا کسی قدر مفصل ذکر اور گوئٹے کے فلسفۂ حیات کا لباب ہے۔ اس سے بحیثیت مجموعی مقدمہ نگار کی وسعتِ مطالعہ اور دقتِ نظر کا ثبوت ملتا ہے اور کتاب کی اہمیت پوری طرح پڑھنے والوں کے ذہن نشین ہو جاتی ہے۔

حدیثِ ادب | حضرت احسان بن دانش کا دیوان تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۱۶۰ صفحے، لکھائی چھپائی اچھی، کاغذ اوسط درجے کا۔ قیمت عمہ مجلد عہ، شائع کردہ انجمن تعمیرِ ادب، ملنے کا پتہ: ذی شان بک ڈپو، مزنگ لاہور۔

حضرت احسان کاندھلہ ضلع مظفر نگر کے باشندے ہیں اور غالباً لاہور میں مقیم ہیں۔ آپ قاضی محمد ذکی صاحب ذکی کے شاگرد رشید ہیں جنھوں نے "اوائل عمری میں آپ کو زریں ارشادات سے احساس

لی دولت جاوید عطا کر کے فراق کی روح فرسا گھڑیوں کی سپرد کردیا۔" آپ کے کلام سے واقعی شاعرانہ احساس اور تاثر کا ثبوت ملتا ہے اور ایک عرصے کی مشق اور کاوش کا پتہ چلتا ہے۔ زیادہ تر غزل کے مروجہ رنگ کی پیروی ہے البتہ بعض اشعار میں مضمون پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور کہیں کہیں کوئی ایسا شعر بھی نکل آتا ہے جو اہل ذوق کو پھڑکا دیتا ہے۔ اس مجموعے میں آپ کے "دور اولیں" اور "دور ثانی" کی غزلیں ہیں اور چند قطعے اور رباعیات "من متفرق" کے عنوان سے۔ ذیل میں ہم چند منتخب اشعار درج کرتے ہیں:-

تول گیا کہ ڈھونڈھنے والے نہیں رہے　　ہنگامہ کیوں وہ اب سر منزل نہیں رہا

مرے جہان تمنا کا آسرا تو ہے　　تری تمام اداؤں کا مدعا ہوں میں

خدا کے لئے اب تو بالیں پہ آؤ　　دعا کر رہے ہیں دوا کرنے والے

کہاں کی منزل مقصود کارواں کیسا　　تری تلاش میں ہوں اپنی جستجو کے لئے

افسوس ہے کہ بعض اوقات حضرت احسان نے الفاظ کی صحت کا خیال نہیں رکھا۔ ذیل کے اشعار سے اس کا اندازہ ہو جائے گا:-

ع - چاندنی رات اور یہ قبرستاں کی سرزمیں

ع - ہٹا دے اس سیہ کارہ کا پہرا کعبۂ دل سے

اللہ اللہ سجدۂ پائے صنم کی کیفیت　　مجھ کو کعبے میں کبھی یہ محویت حاصل نہ تھی

ع - رب ارنی کی حدیں ضبط نے جب طے کرلیں

تعلیم و نفسیات | از میاں ظہور الدین احمد ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی، پروفیسر فلسفہ و منطق اسمٰعیل کالج اندھیری، تقطیع [illegible]، حجم ۴۵ صفحے، لکھائی چھپائی بہت معمولی، کاغذ اوسط درجے کا، قیمت ۸ر، غالباً مصنف سے مل سکتی ہے۔

یہ ایک لکچر ہے جو میاں ظہور الدین احمد صاحب نے بمبئی کارپوریشن کے اردو اسکولوں کے معلموں کے جلسے میں دیا تھا اور اب رسالے کی شکل میں شائع ہوا ہے۔ اس میں عام فہم الفاظ میں دلچسپ طریقے سے تعلیم کا حقیقی مقصد اور تعلیم اور نفسیات کا باہمی تعلق سمجھایا گیا ہے۔ مقصد کی بحث میں تعلیم کا تعلق اخلاق اور معاشرت سے خوبی کے ساتھ دکھایا ہے۔ اس کے بعد ان نفسی قوتوں کا ذکر ہے جو عملی تعلیم میں معاون ہوتی ہیں۔ ان کے وظائف کی تشریح ہے اور ان سے کام لینے کی تدبیریں بتائی گئی ہیں۔ علاوہ مدرسوں کے ان سب حضرات کو جو تعلیم کے مسئلے سے ذوق رکھتے ہیں اس رسالے کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

مونا وانا (ڈراما) | مصنفہ میٹرلنک، مترجمہ جلیل احمد صاحب قدوائی ایم۔ اے، تقطیع [illegible]، حجم مع فرہنگ ۱۴۲ صفحے، قیمت عہ

جلیل احمد صاحب قدوائی اس سے پہلے بھی یورپی زبانوں کے ادبی کارناموں کا ترجمہ کرکے اردو زبان کی خدمت کر چکے ہیں۔ مونا وانا ہمارے ادبی ذخیرے میں ایک اور قابل قدر اضافہ ہے۔ ڈراما کا موضوع ایک مشہور تاریخی واقعہ ہے اور میٹرلنک نے اس واقعے کو دلچسپ طریقے سے بیان کرنے کے علاوہ اخلاقی فرض کی کشاکش اور محبت کا بے باک دلوں پر افسوں پھونکنا بھی بہت خوبی سے دکھایا ہے۔ تاریخ سے جنھیں شوق ہے وہ اطالیہ کی سیاسی اور ذہنی فضا کے مشاہدے سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔

کلید قرارت | از مولانا خلیل احمد صاحب فاضل دینیات، سائز جیبی، حجم ۴۵ صفحات، قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ، دہلی۔ یا مولانا خلیل احمد صاحب جمالیہ عربک کالج پیمبور بارکس مدراس۔

فن تجوید و قرأت پر اس سے پہلے بھی اردو میں دو ایک رسالے نکل چکے ہیں لیکن مولانا خلیل احمد صاحب نے یہ رسالہ جدید اسلوب پر لکھا ہے۔ زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے اور ہر سبق کے آخر میں سوالات بھی دئے گئے ہیں۔ امید ہے کہ بچوں کے لئے یہ رسالہ مفید ثابت ہوگا۔

لاالٰہ الا اللہ | از مولوی محمد ادریس خاں صاحب نجیب آبادی تقطیع خورد، حجم ۵۰ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ معمولی، قیمت ۵ر ملنے کا پتہ: منیجر مکتبہ عبرت نجیب آباد۔

اس رسالے کا مقصد خود مصنف کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

"اس رسالے میں توحید باری تعالیٰ اور شرک کا بیان ہے تاکہ مسلمان شرکیہ عقاید و اعمال سے پرہیز کر سکیں۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اس رسالے میں "بداعمالیوں اور بدعقیدگیوں کا رد ہے لیکن کسی خاص شخص یا جماعت کو نشانہ نہیں بنایا گیا نہ کسی خاص شخص کا نام لیا گیا ہے، نہ کسی شخص یا جماعت کا خصوصی تصور اس رسالے کی نگارش و تالیف کے وقت ذہن میں موجود تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو رسالے کے مضامین کا اثر ناقص اور اس کے منافع کم ہو جاتے۔"

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں خواہ وہ ہندوستان کے ہوں یا کسی دوسرے ملک کے قرآن و حدیث سے بے توجہی بڑھتی جا رہی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ طرح طرح کے عقائد و توہمات نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا ہے جن کا صحیح اسلام سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ جناب مصنف کا مقصد اس رسالے سے یہی ہے کہ مسلمانوں کو اس دین مبین سے روشناس کریں جو قرآن و حدیث میں ہے۔ کتاب کی موٹی موٹی سرخیاں یہ ہیں، ہستی باری تعالیٰ اور شرک، اسلام، اختلاف مذاہب کی حقیقت، توحید فی العبادۃ، شرک کی حالت زار، مشرکین کے احوال و اقوال قرآن مجید کی روشنی میں، تمام مشرکوں کی ایک ہی آواز، قرآن مجید سے مشرکوں کا اعراض، کیا واقعی قرآن مجید کا سمجھنا سخت دشوار ہے، مسلم نما مشرکین کے اقوال و عقاید وغیرہ۔

یہ عنوانات بجائے خود کتاب کی اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے استدلال اور استناد اکثر و بیشتر قرآن مجید اور صحیح احادیث سے کیا ہے۔ طرز بیان بھی سنجیدہ، صاف، سلیس اور سلجھا ہوا ہے۔ مناظرہ کا رنگ اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں اس کتاب کا مطالعہ ہر مسلمان کے لیے مفید ہے۔

نفسیات مذہب | از جناب سید وہاج الدین صاحب بی۔ اے، بی۔ ٹی، استاد عثمانیہ کالج اورنگ آباد، تقطیع خورد، ضخامت ۲۰ صفحات، کتابت و طباعت اعلیٰ، کاغذ متوسط، قیمت ۴ر ملنے کا پتہ، مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی۔

یہ مقالہ پروفیسر وہاج الدین صاحب نے جنوری ۱۹۳۲ء میں اردو اکادمی کے جلسے میں پڑھا تھا۔

نفسیات مذہب بظاہر ایک خشک علمی مضمون ہے لیکن پروفیسر صاحب کے طرز بیان نے اس میں غیر معمولی دلچسپی پیدا کردی ہے۔ جامعہ کے پچھلے نمبروں میں اس مقالے کا ملخص بھی شائع ہو چکا ہے اس لئے ہم کسی تفصیلی تبصرے کی ضرورت نہیں سمجھتے ناظرین نے خود ہی اندازہ کر لیا ہوگا۔

رسائل و اخبارات

ترجمان القرآن۔ طبیب روحانی۔ بہار (ہفتہ وار)۔ محدث (ماہوار)۔ مالیات (ماہوار)۔

افسانہ (ماہوار)۔ گہوارۂ ادب

ترجمان القرآن | ایڈیٹر سید ابوالاعلیٰ مودودی، سائز جامعہ کا، ضخامت، ۸۰ صفحات، کتابت وطباعت اور کاغذ اعلیٰ۔ قیمت ھر سالانہ۔

ترجمان القرآن پر جامعہ کی کسی اشاعت میں ریویو ہو چکا ہے۔ دوسری جلد کے آغاز سے اس میں اہم تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ سائز بڑا کر دیا گیا ہے۔ ادارت مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کو تفویض ہوئی ہے مضامین میں بھی خاص تنوع ہے۔ کتابت وطباعت بھی اتنی بہتر ہے کہ غالباً اس سے بہتر حیدرآباد میں ممکن نہیں۔ ہم اس اعلیٰ علمی اور مذہبی رسالے کے مطالعے کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔

طبیب روحانی | ایڈیٹر پروفیسر واقف شمس الافاضل ضخامت ۵۰ صفحے، تقطیع ۲۰×۲۶/۸، چندہ سالانہ ؏، مقام اشاعت لاہور۔

یہ رسالہ لاہور کے مشہور عامل جناب کریم الدین صاحب کی سرپرستی میں نکلتا ہے۔ پہلے کچھ مجبوریوں کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ اب پھر جاری ہوا ہے۔

بہار ہفتہ وار | چیف ایڈیٹر لالہ رگھونا تھ رلئے ایم۔ اے۔ یہ ہفتہ وار رسالہ بچوں اور بچیوں کے لئے لاہور سے نکلتا ہے۔ زیر نظر نمبر لطیفہ نمبر ہے۔ اس میں بچوں کی دلچسپی کے لئے ہر قسم کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔ مولانا وحید الدین سلیم مرحوم کی ایک نظم (پیغام عمل) کے دو شعر جناب ایڈیٹر اکبر مرحوم کی طرف منسوب کر دئے ہیں۔

محدث (ماہوار) | ایڈیٹر عبدالحلیم ناظم صدیقی رحمانی حجم ۳۲ صفحات تقطیع ۲۶×۲۰ کتابت متوسط کاغذ معمولی، مقام اشاعت دار الحدیث رحمانیہ دہلی۔

یہ رسالہ دہلی کے مشہور مدرسہ دار الحدیث رحمانیہ کا آرگن ہے۔ جناب شیخ عطاء الرحمٰن صاحب اس کے مالک اور مولانا احمد اللہ صاحب شیخ الحدیث رحمانیہ نگراں ہیں۔ اس کا پہلا نمبر پیش نظر ہے۔ شروع میں 'مناسبات' کے عنوان سے جناب ایڈیٹر صاحب کا افتتاحیہ ہے اور اس میں اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد مضامین کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ مضامین سب مذہبی ہیں اور نہایت آسان اور سادہ زبان میں لکھے گئے ہیں۔ چند عنوانات یہ ہیں: توحید باری، موجودہ مسلمان اور قرآن، صحابہ کرام اور حب نبوی، محرم میں مسلمانوں کا حقیقی لائحہ عمل وغیرہ۔ عام افادے کی غرض سے رسالے کی قیمت کچھ نہیں رکھی گئی ہے صرف ۸ کے ٹکٹ دفتر میں بھیج دینے پر رسالہ غالباً سال بھر کے لئے مفت جاری ہو جائے گا۔

مالیات (ماہوار) | ایڈیٹر سید حفظ الرحمٰن ضخامت ۶۰ صفحات تقطیع ۲۶×۲۰ کتابت وطباعت اچھی، چندہ سالانہ ۲؍ مقام اشاعت دی پریمیر انشیورنس کمپنی لیمیٹڈ پٹنہ۔

ہندوستان میں بنکنگ اور بیمہ کا کاروبار روز افزوں ترقی پر ہے۔ یہ رسالہ انہیں چیزوں کے متعلق مفید معلومات بہم پہنچانے کے لئے جاری کیا گیا ہے۔ اس کے سرپرست بہار کے مشہور رہنما قاضی احمد حسین صاحب اور نگراں ایسی سید محمد جلیل صاحب ہیں۔

اس وقت ہمارے سامنے اس کا پہلا نمبر ہے۔ اس میں نثر و نظم کے کل ۱۹ مضمون ہیں اور تمام کے تمام کسی نہ کسی خصوصیت کے حامل ہیں۔ ان میں مالیات، بیموں کی تاریخ، ممالک اسلامیہ میں بیمہ کا رواج، بنکنگ، مسلمانوں کے مالی تنزل کے اسباب، صرف عامہ وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ غرض رسالہ اپنے مقصد کے اعتبار سے کامیاب ہے اور محنت سے مرتب کیا جاتا ہے۔ جن حضرات کو ان مسائل سے دلچسپی ہو ان سے ہم اس کے مطالعے کی سفارش کریں گے۔

افسانہ (ماہوار) | سرپرست جناب سردار سر سکندر حیات خاں سابق گورنر پنجاب، مدیران اعزازی ملک محمد اسلم خاں ایم۔ اے کینٹب و سردار موہن سنگھ ایم۔ اے، پی ایچ ڈی و سید عابد علی عابد ایم۔ اے، مدیر مسئول سید

نذیر نیازی صاحب بی۔اے (جامعہ)۔ قیمت سالانہ اعلیٰ ایڈیشن تین روپے معمولی دو روپیہ۔

یہ رسالہ فن افسانہ نگاری کو ترقی دینے کے لئے نکالا گیا ہے۔ شروع میں سر اکبر حیدری، سر فضل حسین، سید راس مسعود، سر جوگندر سنگھ، مسٹر گوکل چند نارنگ، ڈاکٹر ٹیگور وغیرہم کے پیغامات ہیں۔ اس کے بعد کوئی بارہ مضامین نظم و نثر ہیں۔ مضامین کی ابتدا تقریب سے ہوتی ہے۔ اس میں جناب ملک عبدالقیوم صاحب نے رسالے کے مقصد کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے:۔

"ہندوستان میں فن افسانہ نگاری کے نام لیوا زمانۂ قدیم سے موجود ہیں مگر ان افسانہ نگاروں کی تصانیف کا بیشتر حصہ ذوق سلیم سے گرے ہوئے اجزا پر مشتمل ہے۔ پس ضرورت ہے کہ اس فن کی ضرورت زمانے کے مطابق تجدید کی جائے اور شائقین فن کے لئے ایک خوان ادب ترتیب دیا جائے جس سے ایک طرف اردو ادب کے قرار و قیام میں مدد ملے تو دوسری طرف تہذیب اخلاق ایسے مہتم بالشان مقصد کی توسیع ہو..... الخ۔"

ہماری بھی دعا ہے کہ "افسانہ" اپنے ان اعلیٰ مقاصد میں کامیاب ہو۔ رسالے کا آغاز اچھا ہے امید ہے کہ آیندہ اور ترقی کرے گا۔

گہوارۂ ادب (مصور) | ایڈیٹر ایم۔اے سبزواری و شانتی نرائن ورما، ضخامت ۲، صفحات تقطیع ۲۰×۳۰، قیمت فی پرچہ ۶/، مقام اشاعت بھوپال۔

یہ الگزنڈرا (جہانگیریہ) ہائی اسکول بھوپال کا آرگن ہے اور غالباً سالانہ نکلے گا۔ مضامین نظم و نثر کی تعداد ۲۹ ہے۔ یہ مضامین زیادہ تر اسکولوں کے طلبہ ہی نے لکھے ہیں خصوصاً دسویں درجے کے لڑکوں کا حصہ زیادہ ہے۔ مضامین کی ترتیب میں ہر قسم کی دلچسپیوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ طلبہ کی بعض نظمیں خاص طور سے اچھی ہیں خصوصاً شکر نعمت اور جامعہ عثمانیہ۔ عزم انسانی کے عنوان سے ایک نظم مولانا فہمی ترمذی کی ہے اور بہت اچھی ہے۔ غرض رسالہ مجموعی حیثیت سے بہت بہتر ہے۔ ہم اس اسکول کے طالب علموں کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ان کی یہ ادبی کوششیں اسی طرح جاری رہیں گی۔

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

یورپ اور آنے والی جنگ؟ ابھی تین ہی برس ہوئے ہیں کہ دنیا کی تقریباً تمام متمدن قوموں نے مل کر ایک عہد کیا تھا (میثاق کیلاگ) کہ اب دنیا میں کبھی جنگ نہ ہوگی! آج دو براعظموں میں جنگ ہو رہی ہے!! ۴۲ قوموں نے متفقہ طور پر چین میں جاپان کے اقدام کو برا بتلایا مگر جاپان کی فوجیں چین میں شہر پر شہر فتح کرتی جاتی ہیں اور منچوریا کے علاوہ ملک کے بہت بڑے حصے پر قابض ہو چکی ہیں۔ آج سے تین سال پہلے موسیو بریان کی ریاستہائے متحدہ یورپ کا چرچا تھا۔ آج یورپی ریاستوں میں خفیہ معاہدے ہو رہے ہیں اور آنے والی جنگ کی پیش بندیاں۔ یورپی ممالک کے اخبارات اٹھا کر دیکھئے، معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم دوسری قوم سے خائف ہے اور خصوصاً جب سے جرمنی میں ہٹلر کی جماعت کو کامیابی حاصل ہوئی ہے جنگ کے امکان پر ہر طرف گفتگو ہو رہی ہے۔ آئیے دیکھیں کہ یہ اندیشہ اس قدر عام کیوں ہے؟

جرمنی سب سے پہلے جرمنی کو لیجئے۔ جرمنی نے صلحنامہ ورسائی کو کبھی بھی قطعی تسلیم نہیں کیا تھا۔ فاتحوں نے فتح کے خمار میں مفتوح پر ایسے شرائط عائد کئے تھے کہ کوئی خود دار قوم انھیں ہمیشہ کے لئے تسلیم نہیں کر سکتی تھی چنانچہ صلحنامے پر دستخط ہونے کے وقت سے جرمنی میں اس کے خلاف پیہم احتجاج ہوتا رہا۔ اس سے جرمنی کے مشہور مدبر اشٹریزیمان نے بہت کام بھی نکالا اور اپنی قوم کے لئے طرح طرح کی رعائتیں حاصل کیں مگر مفتوح قوم ہونے کا احساس، عدم مساوات کا برتاؤ، جرمنی پر جنگ کی ذمہ داری کا عاید کرنا یہ باتیں ایسی تھیں کہ ان کی تلخی اشٹریزیمان کی سیاسی کامیابیوں سے مٹ نہ سکتی تھی۔ ہٹلر نے وعدہ کیا کہ وہ جرمنی کے دامن سے یہ داغ دھو دے گا۔ جو لوگ بر سر اقتدار تھے وہ قومیت کے اس چڑھتے ہوئے طوفان سے ڈرا ڈرا کر دوسری دول سے جرمنی کے لئے رعائتیں حاصل کرتے تھے۔ رعائتیں مل جاتیں تو ہٹلر کی جماعت اسے اپنی ہی کامیابی سمجھتی، رعائتیں نہ ملتیں تو دوسری جماعتیں مطعون ہوتیں اور ہٹلر کو تقویت ہوتی۔ غرض پچھلے چند سال کے ہر اہم واقعے نے اس قومی اشتراکی جماعت کو قوت پہنچائی اور یہ بالآخر بر سر اقتدار آگئی۔ اسے حکومت نہ ملتی تو خالص کمیونسٹ جماعت فروغ پاتی اور

دونوں صورتیں امن عالم کے لئے یکساں مضر تھیں۔

ہٹلر کے پروگرام میں کئی مطالبات ہیں جن سے امن عالم بڑے خطرے میں ہے۔ ایک تو وہ جنگ عظیم کے صلحناموں میں بنیادی تغیر چاہتا ہے۔ دوسرے جرمن نوآبادیوں کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے۔ آسٹریا اور جرمنی کے اتحاد کا حامی ہے۔ تاوان جنگ کے مسئلے کو یکسر ختم کرنا چاہتا ہے اور پولینڈ کو جرمنی کا جو حصہ ملک کے نتیجے میں سے دے دیا گیا ہے اس کی واپسی کا طالب ہے۔

ان مطالبوں میں سے بعض تو ضرور پورے ہو جائیں گے۔ صلحناموں میں تو ایک ایک کرکے بے شمار تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ جنگ کی ذمہ داری والی دفعہ کے بدلنے میں دشواری ضرور ہوگی لیکن مادی ضرورات کے مقابلے میں کوئی ملک بھی اس اخلاقی معاملے پر کیوں مصر ہوگا! تاوان جنگ کا مسئلہ عملاً ختم بھی ہو چکا۔ البتہ اسٹریا اور جرمنی کا اتحاد اور پولینڈ سے اپنے ملک کی واپسی ایسے مسائل ہیں کہ ان سے بین الاقوامی سیاست میں سخت پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

آسٹریا سے جرمنی کے اتحاد کو فرانس پسند نہیں کرتا اور ۱۹۱۹ء سے برابر اس کی مخالفت کر رہا ہے۔ فرانس نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ اگر اسٹریا جرمنی کے ساتھ مل جاتا تو شاید ہٹلر کی حکومت کی نوبت نہ آتی اور اسٹریا کی جمہوری سیاسی جماعتوں سے جرمنی کی معتدل جماعتوں کو بہت سہارا ملتا۔ فرانس نے ہمیشہ یہ سوچا کہ اگر یہ اتحاد ہو گیا تو جرمنی کو اس سے زیادہ رقبہ مل جائے گا جتنا جنگ میں اس سے چھنا تھا۔ اور سوا چار کروڑ فرانسیسیوں کے مقابلے میں کوئی سات کروڑ جرمن ہو جائیں گے! چنانچہ علاوہ صلحنامہ ورسائی کے ان دفعات کے جن میں یہ اتحاد جمعیۃ اقوام کی متفقہ رائے کے بغیر ممنوع ہے اسٹریا سے کئی بار عہد لیا گیا ہے کہ وہ اس اتحاد میں شریک نہ ہوگا اور اسی اتحاد کو روکنے کے لئے فرانس اور چکوسلواکیا میں بھی باہم معاہدہ ہو چکا ہے۔

دوسری گتھی پولینڈ کی ہے۔ جرمن قوم پرستوں کا خیال ہے کہ ان کے ملک کا جو حصہ خواہ مخواہ پولینڈ کو دیا گیا ہے اس کی واپسی کی خاطر انھیں جنگ تک کرنی چاہئے۔ پولینڈ والے کہتے ہیں کہ یہ علاقہ حقیقتاً پولش ہے اور جب فریڈرک اعظم نے اسے جرمنی میں شامل کیا تو یہ صدیوں تک پولینڈ کے ہاتھ میں رہ چکا تھا۔ اس کی آبادی میں ۹۰ فی صدی سے اوپر پول بستے ہیں اور پولینڈ کے لئے سمندر تک پہنچنے کا یہی ایک راستہ ہے۔ پولینڈ کی حکومت نے اس علاقے سے بہتیرے جرمن زمینداروں کو نکال بھی دیا ہے اور قدم قدم پر جرمنوں کے لئے جو رکاوٹیں ہیں انھوں نے جرمنی میں جذبات کو اور بھی مشتعل کر رکھا ہے۔ ادھر ڈانزک

کا بندرگاہ جسے جرمنی سے الگ کر کے ایک خود مختار بلدیہ بنا دیا گیا ہے بالکل جرمن ہے اور ہر چند علیحدگی سے اس کی تجارت کو بہت ترقی ہوئی ہے مگر یہ جرمنی ہی میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ ان وجوہ سے بعض لوگ قیاس تک پیش گوئی کر چکے ہیں کہ یورپ کی آیندہ جنگ اسی علاقے میں شروع ہوگی۔



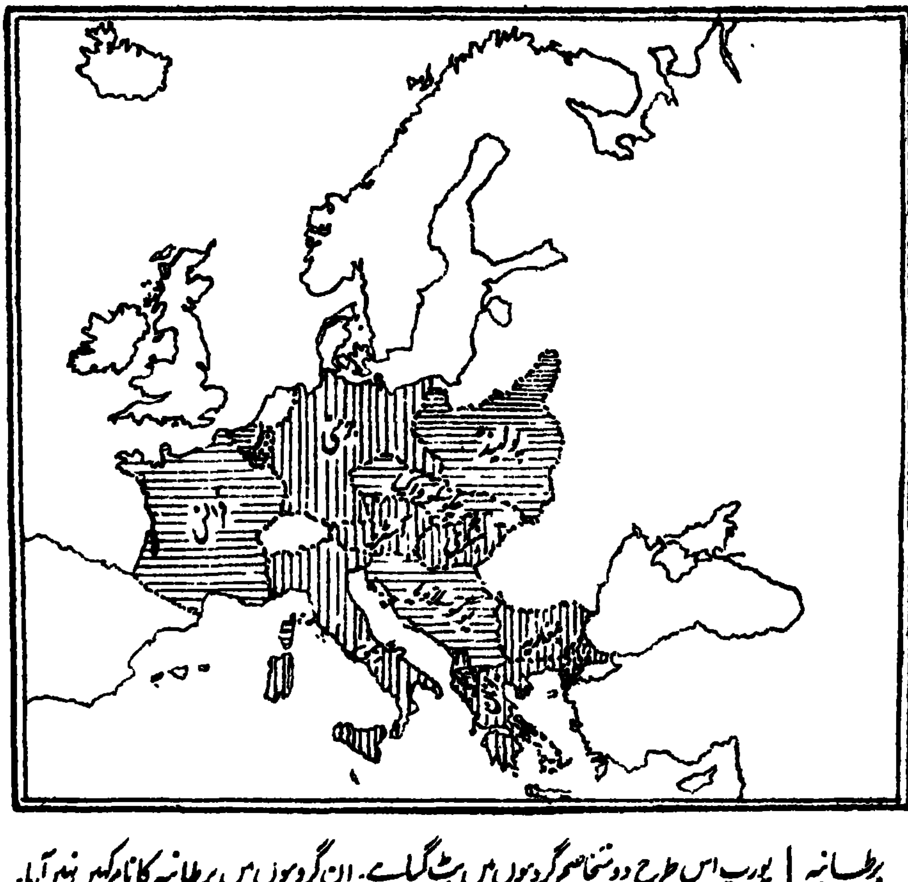
اٹلی | جدید اٹلی کی سیاسی تاریخ پر نظر ڈالیے تو اس میں دو مختلف رجحانات نمایاں معلوم ہوں گے بری رجحان اور بحری رجحان۔ کبھی اٹلی براعظم یورپ کی طرف رخ کرتا ہے اور اپنے مستقبل کو خشکی پر استوار کرنا چاہتا ہے اور کبھی بحر روم میں تفوق حاصل کر کے بحری عظمت حاصل کرنے کا خیال اسے آتا ہے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ اگر سیاست کی باگ کسی شمالی مدبر کے ہاتھ میں ہوتی ہے تو بری رجحان غالب ہوتا ہے اور کسی جنوبی کے ہاتھ میں ہو تو

بحری رجحان۔ کرسپی جنوبی تھا اسی لئے اٹلی نے جرمنی اور اسٹریا سے معاہدہ کر کے اتحاد ثلاثہ کی بنیاد رکھی تھی اور براعظم کی طرف سے یوں یکسو ہو کر بحر روم میں اپنا اثر بڑھایا تھا اور اسٹریا کے علاقوں پر دعویٰ چھوڑ کر اپنی افریقی نوآبادیاں حاصل کی تھیں لیکن ۱۹۱۵ء میں جب اٹلی اپنے ساتھیوں کو دغا دے کر فرانس اور انگلستان کے ساتھ جنگ میں شریک ہوا تو اس وقت بری رجحان ہی نے ہوا کا رخ پلٹا تھا اور ساحل ایڈریاٹک پر تسلط کی خواہش نے اٹلی کی سیاست کو بالکل بدل دیا تھا اور اس صورت حال کے پیدا کرنے میں مسولینی کا بڑا حصہ تھا جو شامل ہے! اٹلی کو ٹریسٹ، پولا اور فیوم کے بندرگاہ مل گئے اور اس کی سرحد بھی اتنی آگے بڑھ گئی کہ کوئی دس لاکھ سلافی اور کوئی ۳ لاکھ جرمن بھی اٹلی کی رعایا بن گئے!"

یہ بڑی کامیابی تو ہو ہی چکی پھر جب مسولینی برسر اقتدار آیا تو اس نے چاہا کہ اس کامیابی کو تو ہاتھ سے نہ جانے دے اور ہو سکے تو بحری کامیابی کی طرح ڈالے۔ چنانچہ جس شخص نے دو سال پہلے ایک وزارت کو اسی وجہ سے شکست دی تھی کہ وہ یوگوسلاویا سے معاملات صاف کر کے خشکی کی طرف سے یکسوئی چاہتی تھی، اسی نے یوگوسلاویا کے ساتھ معاہدے کی تصدیق کی اور ادھر سے توجہ ہٹا کر بحر روم کی سیاست کو مرکز توجہ بنایا۔ لیکن یوگوسلاویا نے ایسا نہ ہونے دیا اور فرانس سے معاہدہ کر لیا۔ چنانچہ اٹلی اب مجبور ہے کہ براعظم کے معاملات میں دخل دے اور مختلف دول سے تعلقات پیدا کر کے پھر ایک توازن توڑے یورپ میں قائم کرے اور جس فرانس کی خاطر اٹلی نے اپنے پرانے ساتھیوں کو چھوڑا تھا اسی کے خلاف پھر ساز باز کرے۔ چنانچہ آج اٹلی بھی مختلف صلحناموں اور معاہدوں میں ترمیم کا اتنا ہی حامی ہے جتنا کہ قوم پرست جرمنی اس لئے کہ اٹلی یہ نہیں چاہتا کہ اس کے ایک طرف فرانس ہو اور دوسری طرف فرانس کا دوست یوگوسلاویا اور براعظم میں اٹلی کا کوئی یار و مددگار نہ ہو! گویا یورپی سیاست میں ایک فریق تو وہ ہے جو صلحناموں میں بنیادی تغیر چاہتا ہے اور اس کی تدبیریں کر رہا ہے۔ اس میں اہم ملک جرمنی اور اٹلی ہیں اور ان کا ساتھ غالباً آسٹریا، ہنگری، بلغاریہ، یونان، البانیا اور ترکی دیں گے۔

فرانس | دوسرا گروہ وہ ہے جو جنگ کے بعد کی حالت کو دوام بخشنا چاہتا ہے۔ اس کا سرگروہ فرانس ہے اور ارکین پولینڈ، چیکوسلوواکیا، رومانیا، یوگوسلاویا اور بیلجیم۔ ان سب کے پاس کوئی ۱۷ لاکھ فوج تو مسلح تیار ہے اور کوئی سو اکرو ڑتربیت یافتہ محفوظ فوج ہے! یہ سب صلحناموں کو مقدس منوانا چاہتے ہیں اور ان کو برقرار رکھنے کے لئے میدان جنگ میں اترنے کو تیار ہیں لیکن باوجود اس فوجی قوت کے

حالت مضبوط نہیں ہیں جتنا لوگ خیال کرتے ہیں۔ پولینڈ کو روس اور یوکرینیا کی طرف سے پورا اطمینان نہیں ہے۔ چکوسلو ویکیا تو کے ملک کے دو طرف جرمنی علاقہ ہے اور یوگوسلاویا پر روپیہ اور فوجی معلموں کی وجہ سے فرانس کا سب سے زیادہ اثر ہے لیکن اس میں اندرونی مناقشات بے شمار ہیں اور اس کے چاروں طرف اٹلی کے ساتھی ہنگری، بلغاریہ، البانیہ اور یونان ہیں۔ فرانسیسی نظام کی یہ کمزوریاں بس اس طرح پوری ہو سکتی ہیں کہ فرانس کو بحر روم میں تفوق حاصل ہو لیکن وہاں اٹلی رقیب موجود ہے!



برطانیہ یورپ اس طرح دو متخاصم گروہوں میں بٹ گیا ہے۔ ان گروہوں میں برطانیہ کا نام کہیں نہیں آیا۔ اس لئے کہ برطانیہ کے شاطران سیاست ابھی دونوں سے الگ ہیں اور دونوں کے ساتھ۔ اگر جرمنی ذرا زور باندھتا ہے تو یہ اسے ڈانٹ دیتے ہیں کہ خبردار حد جائز سے آگے نہ بڑھو، اور فرانس کو خیال ہوتا ہے کہ ہمارے 'تحفظ' کی جو ذمہ داری انھوں نے اپنے سر لی ہے وہ کچھ تو پوری کر رہے ہیں۔ پھر یہ فرانس سے کہتے

ہیں کہ جرمنی کا یہ مطالبہ مانو ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی اور جرمنی سمجھتا ہے کہ یہ ہمارے دوست ہیں۔ یہ خود بظاہر جھگڑے سے الگ رہنا چاہتے ہیں اور دونوں کو سمجھاتے ہیں کہ لڑنا جھگڑنا بری بات ہے، اسلحہ کم کرو اور امن سے رہو۔ لیکن یہ صورت زیادہ دن چل نہیں سکتی۔ یہ فرانس سے بگاڑنا نہیں چاہتے کیونکہ فرانس کی دوستی انگلستان کے لئے سب سے قیمتی دوستی ہے۔ ایک انگریز مدبر کا قول ہے "فرانس ہمارے ساتھ ہو تو پھر کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا"۔ فرانس کہتا ہے کہ اگر تمہارے کہنے سے ہم نے اسلحہ کم کر دئے تو اٹلی اور جرمنی دو دن میں صلحناموں کو ختم کر کے رکھ دیں گے۔ لہذا برطانیہ اگر یہ کر سکے کہ پرامن طریق پر صلحناموں میں ایسی ضروری ترمیمیں کرا دے جس سے جرمنی اور اٹلی اور ان کے ساتھی کم و بیش مطمئن ہو جائیں اور پھر فرانس کو یقین دلا سکے کہ مزید ترمیم کی کوشش کی گئی تو برطانیہ اپنے روپئے اور فوج سے اس کی پوری مخالفت کرے گا تو شاید ان مسلح ٹولیوں میں تصادم ملتوی ہو جائے ورنہ سب سامان تیار ہے ایک چنگاری کی دیر ہے اور کوئی غیر متوقع واقعہ بھی چنگاری بن سکتا ہے!

جرمنی میں یہودی | ہٹلر کی قومی اشتراکی جماعت کے برسر اقتدار آتے ہی یہودیوں کے ساتھ بدسلوکیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ہے جو ابھی ختم ہوتا نظر نہیں آتا اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی میں بحیثیت جماعت کے یہودیوں کا وجود مشکل ہی سے قائم رہ سکے گا۔ ہسپتالوں سے یہودی ڈاکٹر برخاست کر دئے گئے ہیں، عدالتوں سے یہودی اہلکار علیحدہ کئے جا رہے ہیں۔ یہودی طالب علموں پر مدرسوں اور جامعات کے دروازے بند ہوتے جاتے ہیں۔ یہودی دکانوں سے لوگ مال نہیں خریدتے۔ یہودی مصنفوں کی کتابیں کتب خانوں سے نکال کر چوراہوں پر جلائی جا رہی ہیں۔ غرض یہودیوں کے لئے اس متمدن ملک میں زمین تنگ ہے۔

یہودیوں کے خلاف جرمنی میں اور تقریباً تمام مسیحی ممالک میں ایک تعصب تو ہمیشہ سے موجود ہے۔ اس کی تاریخی اصل بلاشبہ مذہبی ہے لیکن اس کی موجودہ وجہ زیادہ تر معاشی ہے۔ یہودیوں کی سیاسی بے سرو سامانی، ان کا اپنا وطن نہ ہونا، ان کی اپنی ریاست نہ ہونا یعنی سب وہ چیزیں جن کی وجہ سے ان پر آج یہ ظلم ممکن ہے اور ہمیشہ مسیحی دنیا میں ممکن رہا ہے یہی مغضوبیت جس کی وجہ سے وہ خدا کی وسیع زمین میں ہر جگہ پردیسی کی طرح رہتا ہے اسی میں اس کی معاشی ترقی کا راز بھی نہاں ہے۔ معاشی فروغ کے لئے پردیسی ہونے سے بڑی مدد ملتی ہے اور دنیا کی معاشی تاریخ میں ہر جگہ پردیسیوں کا بڑا حصہ ہے پردیسی کے سر پر روایات ملکی کا بار

نہیں ہوتا، مروت کی رکاوٹیں اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتیں، ہم مذہبوں کا خیال اسے کسی چیز سے نہیں روکتا۔ وہ جو چاہتا ہے کرسکتا ہے اور دولت کمانے کے لئے کوئی راہ اچھی ہو یا بری، اس پر بند نہیں ہوتی۔ ایک ملک سے دوسرے کو جاتے ہیں، ایک پیشہ بدل کر دوسرا اختیار کرتے ہیں، نفع اگر ایسے کاروبار میں حاصل ہو جو مفادِ عامہ کے خلاف ہے تو بھی اس سے نفع اٹھانے میں پردیسی کو تامل نہیں ہوتا۔ چنانچہ معاشی زندگی میں خالص نفع طلبی کی ذہنیت کو جو عہد جدید کے نظام سرمایہ داری کی مخصوص ذہنیت ہے پردیسیوں نے اور خصوصاً یہودیوں نے بہت مدد دی ہے۔ یہی بین الاقوامی تجارتی تعلقات قائم کرنے میں سب سے پیش پیش رہے ہیں۔ سامان تعیش، جواہر اور ریشم کی تجارت سے انھوں نے مغربی طرز معاشرت پر خاص اثر ڈالا ہے۔ دوسری طرف تمباکو، شراب، غلہ، اون اور شکر کی تجارت پر یعنی ان چیزوں کی تجارت پر بھی ان کا قبضہ رہا ہے جو بڑے پیمانے پر پیدا کی جاسکتی ہیں اور عام استعمال میں آتی ہیں۔ سوتی کپڑے، نیل اور روئی کی تجارت سے انھوں نے اکثر مغربی ممالک میں روایتی معیشت کو درہم برہم کردیا ہے۔ جہاں کہیں نو آبادیاں بسیں وہاں یہ پہنچے ہیں، نئی دنیا میں سب سے پہلے تاجر یہودی تھے۔ امریکہ کے سب سے پہلے صنعتی کارخانے یہودیوں نے قائم کئے غرض سرمایہ داری کے نظام معاشی کے نشو و نما میں یہودیوں نے اپنی تعداد سے کہیں زیادہ حصہ لیا۔

جرمنی میں یہودیوں کی کل تعداد ۶ لاکھ کے قریب ہے یعنی آبادی میں ایک فی صدی لیکن بڑے صنعتی کارخانوں کے نگرانوں اور منصرموں میں یہ کوئی ۱۴ فی صدی ہیں۔ بجلی کے بڑے کارخانوں کے مالکوں اور نگرانوں میں یہودی ۲۳ فی صدی سے اوپر ہیں، دھاتوں کے کارخانوں میں ۲۵ فی صدی، چمڑے اور ربر کے کاروبار میں ۱۳ فی صدی، بنک تو اکثر و بیشتر ان کے ہاتھ میں ہیں ـــــ اتی کی بڑی بڑی دکانیں تقریباً سب کی سب یہودیوں کی ہیں۔

یہ باتیں معمولی جرمن کو بہت کھلتی ہیں اور مذہبی اور نسلی تعصبات کے ساتھ یہ معاشی محرکات مل کر انھیں بہت قوی کردیتے ہیں۔ ہٹلر کی جماعت نے اس نفرت کو بہت کچھ اکسایا ہے اور پھر جرمن قوم کی ہر مصیبت کا ذمہ دار یہودیوں ہی کو ٹھہرایا ہے۔ سالہا سال سے نفرت کی اس آگ کو بھڑکایا جارہا تھا، اب اس کے شعلے قابو سے باہر ہوگئے ہیں۔ غالباً اکثر یہودیوں کو جرمنی سے رفتہ رفتہ ہجرت کرنی ہوگی اور خیال ہے جس ملک کی طرف یہ رخ کریں گے وہاں کی معاشی زندگی میں سرمایہ داری نظام کو غیر معمولی تقویت پہنچے گی۔ لیکن اس خانماں بردوش قوم کے ساتھ "بیسویں صدی" کی مہذب دنیا کا یہ سلوک انسانیت کے لئے درس عبرت کا کام دے گا!

ممالک اسلام

عرب سعودی | ابھی یہ حقیقت غالباً عام طور پر لوگوں کو نہیں معلوم ہے کہ ملک ابن سعود نے اپنے مقبوضات کا سرکاری نام اب بجائے نجد و حجاز کے "عرب سعودی" رکھ دیا ہے۔ یہ تبدیلی تو خیر لفظی ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ آج کل وہاں چند بہت اہم واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ مسٹر جان فلبی جو ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے ہیں اور ملک ابن سعود کے ذاتی دوست ہیں اس سال ایام حج میں مکہ پہنچے ہیں۔ وہاں کے حالات پر انھوں نے حال ہی میں ایک مضمون لکھا ہے جو لندن ٹائمز اور اسٹیٹسمین میں شائع ہوا ہے۔ اس کا اقتباس ہم یہاں پیش کرتے ہیں:۔

"عرب کی معاشی حالت کا دار و مدار اب تک حاجیوں کی تعداد پر رہا ہے۔ وہابی حکومت کے پہلے تین سال میں تو حالت اچھی رہی لیکن اس کے بعد عام کساد بازاری کی وجہ سے حاجیوں کی تعداد کم ہونے لگی۔ حکومت کے پاس پس انداز کچھ نہیں تھا اس لئے حالت دن بدن خراب ہی ہوتی گئی ۱۹۲۷ء سے دشواریوں میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ پہلے حاجیوں کی تعداد اوسطاً ایک لاکھ ہوتی تھی لیکن ۱۹۳۰ء میں یہ تعداد چالیس ہزار کے قریب رہ گئی اور دوسرے سال اس میں بھی کمی ہوئی۔ ۱۹۳۱ء کے موسم حج میں ایک اہم واقعہ یہ پیش آیا کہ صرافوں نے مل کر کچھ ایسی ترکیب کی کہ عربی فلس کی قیمت کم ہونے لگی۔ سرکاری طور پر ایک نقرئی ریال کے بدلے میں ۲۲ فلوس ملتے تھے لیکن اس دن ۶۰ تک نوبت پہنچ گئی۔ حکومت چاہتی تو نرخ بازی کو روک سکتی تھی مگر اس کے مشیر اچھے نہ تھے۔ روکنا تو درکنار اس نے خود اس حالت سے فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ ایک شاہی فرمان کے ذریعے سے ریال کی قیمت ۴۴ فلوس مقرر کر دی گئی اور حکومت کے نمایندوں نے چاندی کے بدلے فلوس خریدنے شروع کئے۔ تعداد تو ۴۴ مقرر تھی مگر انھیں بعض اوقات ایک ریال کے بدلے ۶۰ فلوس تک ملے۔ ایک دن تو یہ کیفیت رہی اور دوسرے دن حکومت نے یہ ستم ظریفی کی کہ ریال کی قیمت پھر ۲۲ فلوس کر دی۔ اس طرح حکومت اور صرافوں کو تو بہت فائدہ ہوا لیکن بیچارے غریب لوگ مارے گئے۔ یہی نہیں بلکہ عربی سکوں سے لوگوں کو ایک قسم کی بدگمانی بھی پیدا ہو گئی۔ بنکوں نے مقامی سکوں کو ہاتھ لگانا چھوڑ دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ریال کی قیمت کم ہوتے ہوتے اتنی رہ گئی جتنی اس میں چاندی تھی۔ پہلے ایک طلائی پاؤنڈ کے عوض صرف ۱۰ ریال ملتے تھے لیکن آج کل ہر جگہ آسانی سے ۲۰ ریال مل سکتے ہیں۔ اس طرح جن لوگوں کے

پاس صرف چاندی کے سکے تھے ان کے لئے اشیا کی قیمت گویا دوگنی ہوگئی۔

حاجیوں کی تعداد کم ہو جانے کی وجہ سے حکومت کی آمدنی بھی کم ہوگئی اور بڑی دقت پیش آئی۔ اس وقت حکومت کے ذمے تمام قرضہ ۳ لاکھ طلائی پاؤنڈ تو تھا ہی اس پر طرہ یہ ہوا کہ سرکاری ملازموں کی تنخواہیں باقی رہنے لگیں۔ نومبر ۱۹۳۱ء میں جو حساب لگایا گیا تو پورے چھ مہینے کی تنخواہیں باقی تھیں۔ اب حکومت کو بجز اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ قرضے کی ادائگی کے التوا کا اعلان کرتی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لیکن نہ تو دنیا کی عام کساد بازاری کم ہوئی اور نہ حاجیوں کی تعداد بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔ اس وجہ سے التوا کی مدت ختم ہونے کے بعد بھی حکومت نہ تو قرضے کی قسط ادا کر سکی اور نہ ملازموں کی تنخواہیں۔ یہ بات واقعی قابل قدر ہے کہ سرکاری ملازموں نے کوئی غیر معمولی صورت ناجائز آمدنی کی نہیں نکالی۔

اب حکومت کے لئے صرف دو صورتیں ممکن تھیں۔ یا تو وہ اتنا ہی پاؤں پھیلاتی جتنی چادر تھی یا چادر کو بڑھانے کی کوشش کرتی۔ دوسری صورت زیادہ دلکش تھی اور نئے وسائل کی تلاش بھی اتنا مشکل کام نہیں تھا جتنا کہ سمجھ لیا گیا تھا۔ یہ خیال عام طور پر پھیلا ہوا ہے کہ عرب کی معاشی حالت صرف حاجیوں پر ہی منحصر ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ دوسرے وسائل بھی موجود ہیں مگر اب تک عرب ان کی طرف محض اس لئے توجہ نہیں کرتے تھے کہ ان کے خیال میں ان وسائل سے صرف غیر ملکی کفار ہی کام لے سکتے تھے اور ان کی ہوس ملک گیری اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ ان کا داخلہ عرب میں بہر صورت خطرناک ثابت ہوتا۔ اب سخت احتیاج نے اس راسخ عقیدے پر نظر ثانی کرائی اور اس راہ میں پہلا قدم خود ملک عبدالعزیز بن سعود نے اٹھایا۔

تقریباً دو سال سے بعض خیالات گدگدی پیدا کر رہے تھے اور حکومت آہستہ آہستہ اس راستے پر چل رہی تھی جو اب تک ممنوع تھا۔ "رعایات" کو لوگ اب تک "غیر ملکی تجارتی اقتدار" کا مرادف سمجھتے رہے ہیں اور اس لئے انھیں ملکی آزادی کا منافی سمجھا گیا ہے۔ جدید طرز عمل سے ان خیالات کی تردید شروع ہوگئی ہے اور اس وقت جبکہ تباہی قریب تھی حکومت نے ایسی نئی تجویزیں پیش کی ہیں جن کی کامیابی تو ابھی بالکل یقینی نہیں ہے لیکن ان سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عرب ناسا عد حالات سے مغلوب ہونے والے نہیں ہیں اور ابھی ان میں زندگی موجود ہے۔ انھوں نے اپنے وسائل کو بڑھانے کا ارادہ کر لیا ہے اس لئے کہ یہی ایک صورت ان کے زندہ رہنے کی ہے۔ جہاں تک ممکن ہوگا "رعایات" صرف مسلمانوں کو دی جائیں گی لیکن جب غیروں کا داخلہ حکومت کے لئے مفید ہوگا تو انھیں بھی ایسے شرائط پر داخل کیا جائے گا جن سے عربی

آزادی میں خلل نہ پڑے۔

"اس طرح عرب میں ایک نیا باب کھل رہا ہے اور اس کی ابتدا مناسب طور پر ذرائع آمد و رفت کی ترقی سے ہوتی ہے۔ جدے اور مکے کے درمیان ریل جاری کرنے کا خیال نیا نہیں ہے۔ اس صدی کے شروع میں سلطان عبد الحمید نے قسطنطنیہ کو مرکز اسلام سے ریل کے ذریعے منسلک کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور ۱۹۱۴ء میں ریل مدینے تک پہنچ گئی تھی مگر مقامی عربوں کی مخالفت کی وجہ سے یہ کام آگے نہ بڑھ سکا۔ اب آخر کار اگر کوئی حادثہ نہ پیش آگیا تو ۱۹۳۵ء کے وسط تک جدے سے مکے تک ریل جاری ہو جائیگی۔ پہلا قدم اٹھ چکا ہے۔ "رعایات" ہندی مسلمانوں کی ایک جماعت کو اس شرط پر عطا ہوئی ہیں کہ پچاس برس کے بعد ریل اور اس کے تمام متعلقات حکومت کی ملک ہو جائیں گے۔ چھ مہینے میں مہتمم تعمیرات نیل پہنچ جائیں گے اور اس طرح بہت سے بے کاروں اور بھوکوں کے لئے کام مہیا ہو جائے گا۔

حکومت کی معاشی دشواریوں کا صرف ایک حل ہو سکتا ہے اور وہ ایک سرکاری بنک کا وجود ہے۔ شریف حسین بھی عرصے تک اس خیال میں رہے۔ بہت سے امیدوار اٹھے مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اب آخر کار سابق خدیو مصر عباس حلمی کی تجویز منظور ہوئی۔ سرکاری بنک کے قیام کے لئے ایک معاہدہ مرتب ہو گیا ہے اور اس پر سرکاری مہر بھی ثبت ہو چکی ہے۔ شرائط بھی ایسے ہیں کہ حکومت اور ملک کے لئے مفید ثابت ہوں گے۔ اب یہ امید کی جا سکتی ہے کہ جلد حکومت کا قرضہ ادا ہو سکے گا۔ محاصل درآمد وغیرہ بھی بار کفالت سے آزاد ہو جائیں گے۔ سابق خدیو نے اس تجویز کو اٹھا کر "مرکز اسلام" کی جو خدمت کی ہے اس پر وہ تمام عالم اسلامی کے شکریے کے مستحق ہیں۔"

سرکاری بنک کی کیا نوعیت ہوگی اور اس کے منافع کہاں سے آئیں گے؟ اس میں سود لیا اور دیا جائے گا یا نہیں اور ان کا سرمایہ کن پیداآور کاموں میں لگایا جائے گا یہ سب تفصیلات اس مضمون سے نہیں معلوم ہوتیں۔ جب تک ان کا علم نہ ہو کوئی رائے قائم کرنا قبل از وقت ہوگا۔

دوسرے ذرائع سے یہ خبر معلوم ہوئی ہے کہ ریل کے ٹھیکے پر تقریباً ۱/۲ ۲ لاکھ روپیہ سلطان ابن سعود کی حکومت کو پیشگی منافع کی صورت میں ملے گا اور سرکاری بنک کے لئے سابق خدیو عباس حلمی نے ۴۵ لاکھ ڈالر (تقریباً سوا کروڑ روپیہ) کے سرمایے کی ضمانت کی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سرمایہ اور کہاں سے آتا ہے اور اس نظام سرمایہ داری کا اثر عربوں پر کیسا پڑتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ غریب عرب

نہ تو اس نظام کی پیچیدگیوں سے واقف ہے اور نہ اسے اس سے کوئی فائدہ پہنچے گا۔ اب رہی حکومت سو اس کو تو نفع ضرور ہوگا مگر کون کہہ سکتا ہے کہ ایک دفعہ اس چکر میں پڑ کر وہ غریبوں کے مفاد کا بھی خیال رکھے گی۔ قعرِ دریا میں تختہ بندی کے بعد دامن کا تر نہ ہونا آسان نہیں ہے۔

شذرات

علوم اسلامیہ سے جو لوگ دلچسپی رکھتے ہیں وہ عرصے سے اپنی اپنی جگہ پر ایک ایسے مرکزی ادارے کی ضرورت محسوس کر رہے تھے جو ان علوم کی چھان بین کرنے والوں میں اتحاد عمل پیدا کر سکے۔ بیشتر حضرات تو اس خیال کو اپنے سینے میں چھپائے ہی رہے مگر لاہور کے اہل علم نے خیال پیدا ہوتے ہی اس پر عمل بھی شروع کر دیا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۳۲ء میں چند حضرات نے جمع ہو کر ایک ' ادارۂ معارف اسلامیہ ' کی بنیاد رکھی۔ یہ کام تو آسان تھا مگر مسلمانوں میں ایسے ادارے کی ضرورت کا احساس پیدا کرنا اتنا ہی مشکل ثابت ہوا اور چار برس کے بعد گذشتہ اپریل میں اس کی نوبت آئی کہ ادارۂ معارف اسلامیہ کا پہلا اجلاس منعقد ہو سکے۔

... ...

اس ادارے کے مقاصد یہ ہیں :-

(۱) ہندوستان کے تمام محققین اسلامیہ کے درمیان اشتراک عمل، اتحاد ذہنی و اجتماعی اور وسائل امداد باہمی کے قیام میں سہولتیں بہم پہنچانا۔

(۲) محققین کی ایسی مشکلات کو جو بسا اوقات ان کے مشاغل علمیہ میں پیش آتی ہیں، حتی الامکان رفع کرنے کی کوشش کرنا۔

(۳) محققین کو نتائج تحقیقات علمیہ کی اشاعت کی غرض سے جمع کرنا۔

(۴) بیرونی ممالک کے مستشرقین کو وقتاً فوقتاً افادۂ علمیہ کی غرض سے دعوت دینا۔

(۵) ارتقائے تمدن اسلامی کے سلسلے میں اسلام کی مختلف خدمات کو منظر عام پر لانا۔

(۶) عام طور پر اسلامی تحقیقات کے لئے قوم میں تحریص و تشویق کی تحریک جاری رکھنا۔

(۷) آمدنی کافی ہونے پر ایک دارالکتب، ایک دارالاشاعت اور ایک مشرقیات کا دارالنفائس (میوزیم) کھولنا۔

... ...

ان مقاصد کے اہم اور مفید ہونے میں کسے شک ہو سکتا ہے۔ اب تک تو ان سے بحث محض ایک

علمی بحث ہوتی مگر اب کہ اس ادارے نے پہلا اجلاس کر کے ایک عملی قدم بھی اٹھا دیا ہے ان مقاصد کی اشاعت اور حتی المقدور ان کے حصول کی کوشش نہ کرنا کسی طرح جائز نہیں ہے۔ "امم سابقہ کے عروج و زوال اور ترقی و تنزل کے افسانے آنے والی نسلوں کے لئے ہمیشہ سبق آموز ہوتے ہیں..... ان سے بڑھ کر کسی قوم کے لئے کوئی درس ترقی نہیں ہو سکتا۔ جب یہ ہے تو پھر ایک قوم کے لئے خود اپنے ماضی کی روایات کی تحقیق اور ان کے برقرار رکھنے کی سعی کتنی اہم ہو سکتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس کو ثابت کرنے کی کوشش تحصیل حاصل ہوگی۔

... ...

ادارۂ معارف اسلامیہ کا پہلا جلسہ ۵ / اپریل ۳۳ء کو پنجاب یونیورسٹی کے ہال میں منعقد ہوا۔ خلیفہ شجاع الدین صاحب صدر مجلس استقبالیہ نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور علامہ سر محمد اقبال نے باقاعدہ افتتاح فرمایا۔ اس موقع پر جناب موصوف نے جو تقریر فرمائی اس میں اس ادارے کے اغراض و مقاصد اور ان کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور تمدن عالم میں اسلامی تمدن کی حیثیت اجمالاً بیان فرمائی۔

ادارے کا یہ اجلاس دو دن تک جاری رہا اور کئی مضامین پڑھے گئے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے پورے مضامین نہیں پڑھے جا سکے اور چونکہ بیشتر حضرات نے اپنے مضمون کا کوئی خلاصہ تیار نہیں کیا تھا اس لئے سننے والوں کو کچھ بہت زیادہ فائدہ ان کی تحقیقات علمیہ سے نہیں پہنچا۔ امید ہے کہ آئندہ اجلاس میں نہ صرف حضرات منتظمین بلکہ اصحاب مضامین بھی اس نقص کی طرف توجہ فرمائیں گے۔ ایسے علمی جلسوں میں جہاں ہر شخص کا مضمون ایک مختلف شعبے سے متعلق ہوتا ہے عام افادے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ہر صاحب مضمون اپنے مضمون کا ایک خلاصہ قبل از وقت تیار کر کے بھیج دے اور وہ خلاصہ اجلاس میں شریک ہونے والوں کو پہلے سے دے دیا جائے تاکہ اگر انھیں کچھ بحث کرنا ہو تو وہ اس کے لئے تیار ہو کر آئیں ورنہ ان مضامین کو سنانے اور سننے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ ہر علمی مضمون پڑھ کر سنانے کے قابل نہیں ہوتا۔ یہ ممکن ہے کہ مضمون تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہو لیکن سنانے سے وہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے اور سننے والوں کو کوفت ہو۔ ایسے مضامین کے خلاصے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

... ...

ایک اور اہم نقص اس اجلاس کی کارروائی میں یہ تھا کہ صدر مجلس استقبالیہ کا خطبہ افتتاحی تقریر اور اکثر مضامین کی زبان انگریزی تھی۔ ان حضرات میں سے ہر ایک کی مادری زبان اردو ہے اور اگر یہ چاہتے

تو اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح اور بعض صورتوں میں تو یقیناً انگریزی سے بہتر طور پر اردو میں ادا کر سکتے تھے، لیکن ہماری ذہنی غلامی کی یہ ایک نہایت افسوسناک مثال ہے کہ ہم جب اپنے علوم و معارف کی ترویج کے لئے بھی اٹھتے ہیں تو ایک غیر زبان سے کام لیتے ہیں۔ اگر اس اجلاس میں علوم جدیدہ یا سائنس کے مسائل پر بحث کی گئی ہوتی تو ہم یہ کہہ کر اپنے دل کو تسکین دے لیتے کہ ابھی "ظرف تنگنائے" اردو "بقدر شوق" نہیں ہے اور اہل علم حضرات کے بیان کے لئے کچھ اور وسعت چاہئے لیکن اس ادارے کا نام تھا "ادارۂ معارف اسلامیہ" اور جن مسائل سے بحث کی گئی وہ تھے اسلامی تاریخ اور اسلامی آداب سے متعلق۔ پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو ہم دوسروں کے مقابلے میں اردو کی حمایت میں زمین اور آسمان کے قلابے ملاتے رہتے ہیں اور دوسری طرف خود اس زبان سے ایسی لاپروائی برتتے ہیں تو شیخ سعدی کا یہ قول یاد آتا ہے:۔

ہر کس از دست غیر نالہ کند   سعدی از دست خویشتن فریاد

... ...

ادارۂ معارف اسلامیہ کے اس پہلے اجلاس میں بجز ان دو نقائص کے اور سب محاسن ہی تھے۔ حسن انتظام، مہمان نوازی اور خوش اخلاقی ہر طرف نمایاں تھی۔ جلسے وقت پر ہوئے اور کامیاب رہے۔ سب سے زیادہ جو چیز پسند کی گئی وہ مخطوطات اور تصاویر کی نمائش تھی۔ اس نمائش کا انتظام بہت اچھا تھا اور چیزیں بہت سلیقے سے سجائی گئی تھیں۔ ان میں بعض قدیم مخطوطات کے علاوہ پروفیسر محمود شیرانی صاحب نے سکوں کا جو مجموعہ پیش کیا تھا وہ واقعی قابل دید تھا۔ ایسے اہم اور مختلف النوع سکے اتنی تعداد میں کسی عجائب خانے میں بھی مشکل سے ملیں گے چہ جائیکہ کسی ایک شخص کے ذاتی مجموعے میں۔ نمائش میں جو چیزیں رکھی گئی تھیں ان کی فہرست بھی اجلاس کی روداد کے ساتھ شائع ہونے والی ہے اس لئے ہم اس وقت تفصیلات سے احتراز کرتے ہیں۔ امید ہے کہ اس ادارے کا دوسرا اجلاس جہاں بھی ہوگا حضرات منتظمین اس قسم کی ایک نمائش کا بھی ضرور انتظام فرمائیں گے۔

... ...

ہمیں امید ہے کہ ادارۂ معارف اسلامیہ کی مجلس انتظامیہ کے اراکین جن میں علامہ سر محمد اقبال اور سر شیخ عبدالقادر بھی شامل ہیں اس ابتدا کے بعد خاموش نہ بیٹھیں گے بلکہ اس کے اغراض و مقاصد

کی ترویج جاری رکھیں گے اور اس کے لئے سرمایہ فرائم کرنے کی کوشش کریں گے۔ ادارے کے لئے ایک کتبخانے کا وجود ناگزیر ہے اور علوم اسلامیہ کا ایک ایسا کتب خانہ ہندوستان میں کہیں بھی نہیں ہے جس سے کام کرنے والوں کو ضروری کتابیں مل سکیں۔ ایسی حالت میں اس باب میں اور زیادہ جلدی کی ضرورت ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر علامہ اقبال، مجمع علمی دمشق، گب میموریل، رائل ایشیاٹک سوسائٹی، مجلس المانی مشرقی (D. M. G.) اور اسی قسم کے دوسرے ہندوستانی اور بیرونی اداروں سے درخواست فرمائیں تو وہ ضرور اپنی مطبوعات ادارے کے کتب خانے کے لئے بلا قیمت عطا کرنے پر راضی ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ حکومت مصر سے یہ درخواست کرنی چاہئے کہ عربی کتابوں کی ایک معتدبہ تعداد اس کتب خانے کو عطا کرے۔

… … …

ان سب انتظامات اور خط و کتابت کے لئے ضروری ہے کہ کوئی شخص مستقل طور پر اسی کام کے لئے متعین ہو۔ پنجاب یونیورسٹی کے اساتذۂ علوم مشرقیہ میں سے ہر شخص خود اپنے فرائض منصبی اور اپنے عملی مشاغل میں اس قدر مصروف رہتا ہے کہ ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ کافی وقت اس کام میں صرف کر سکیں گے زیادتی ہوگی۔ ہمیں امید ہے کہ اراکین مجالس انتظامیہ جلد سے جلد کم از کم اتنا سرمایہ تو ضرور ہی فراہم کر لیں گے کہ ادارے کے لئے ایک مستقل ناظم کا تقرر ممکن ہو سکے۔ اسی سلسلے میں ایک بات اور قابل لحاظ ہے اور وہ یہ کہ ادارے کے ہر عام اجلاس کے موقعے پر ایک عام کاروباری جلسہ بھی ہونا چاہئے جس میں ادارے کی ترقی کے لئے باہر کے لوگوں سے بھی مشورہ کیا جائے۔ اس سے نہ صرف یہ فائدہ ہوگا کہ بعض مفید مشورے مل جائیں گے بلکہ یہ بھی ہوگا کہ عام طور پر لوگوں کی دلچسپی میں اضافہ ہوگا اور وہ اپنی ذمہ داری کو زیادہ محسوس کریں گے

… … …

اس ادارے سے متعلق ہم نے جو اپنی رائے اس تفصیل سے پیش کی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے ہمیں بہت سی توقعات ہیں اور اس کی ترقی کا خیال ہمیں ہر وقت رہتا ہے۔ ہم ادارۂ معارف اسلامیہ کے ارباب حل و عقد کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کارکن اپنی استطاعت کے مطابق اسے ہر قسم کی مدد دینے کے لئے آمادہ ہیں اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہ ادارہ ہندوستان میں

علوم اسلامیہ کے احیا کا ذریعہ بنے گا۔

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند — شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

---

۱۵ مئی سے جامعہ میں کالج کی جماعتوں میں تعطیل ہوگئی اور یکم جون سے اسکول بھی بند ہو جائے گا۔ یکم اگست کو حسب معمول کالج اور اسکول دونوں کھل جائیں گے۔

... ...

جامعہ کے بعض اساتذہ تعطیل کے زمانے میں بھی اس آرام سے محروم رہتے ہیں جس کا انھیں سال بھر کی شدید محنت کے بعد استحقاق ہو جاتا ہے اور اپنا وقت زیادہ تر ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کرنے میں صرف کرتے ہیں تاکہ جامعہ کے مقاصد کی اشاعت کریں اور اس کے لئے مالی امداد حاصل کریں۔ عام دستور تو یہ ہے کہ قومی تعلیم گاہوں کی سفارت کا کام ملک کے متعدد رہنما انجام دیتے ہیں اور اساتذہ اس خدمت سے معذور رکھے جاتے ہیں لیکن جامعہ ملیہ مسلمانوں کی تعلیم گاہ ہے جن کے رہنما عموماً علمی کاموں سے پرہیز کرتے ہیں یا اگر ان کی طرف متوجہ بھی ہوتے ہیں تو اسی وقت جب ان کے ذریعے سے حکام وقت کا تقرب اور اعزاز و منصب حاصل ہونے کی امید ہو۔ جامعہ ملیہ کی خدمت کرنے میں سراسر زحمت ہے اور کسی قسم کے ذاتی فائدے کی امید نہیں اس لئے اگر یہ حضرات اس سے پہلوتہی کرتے ہیں تو کوئی تعجب نہیں لیکن چونکہ جمہور ملت جامعہ ملیہ کی ضرورت کو دل سے محسوس کرتے ہیں اس لئے ان کا دست فیض اکابر قوم کے توسط کے بغیر جامعہ کی مدد کے لئے خود بخود بڑھتا ہے۔ پھر بھی ہر کام کے لئے کرنے والوں کی ضرورت ہوتی ہے خصوصاً چندہ جمع کرنے کا کام اس زمانے میں اس قدر دشوار ہے کہ اس کے لئے بڑے مستقل مزاج، جفاکش، مخلص لوگ درکار ہیں۔ اس لئے جامعہ کے چند اساتذہ قریب قریب ہر سال تعطیل میں بھی راحت و آرام، بال بچوں، عزیزوں دوستوں کی صحبت کو چھوڑ کر نکل کھڑے ہوتے ہیں اور جہاں تک اپنی فرصت اور محنت اور قوم کی توفیق اور ہمت کفایت کرتی ہے ایک رقم جمع کر لیا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس سال یہ دھن کے پکّے تعطیل کے زمانے میں صوبہ متحدہ کا دورہ کر رہے ہیں تاکہ مختلف مقامات پر ہمدردان جامعہ کے حلقے قائم کریں۔

... ...

ہمدردان جامعہ کی تحریک جیسا ہم کسی پچھلے پرچے میں لکھ چکے ہیں گذشتہ سال اکتوبر سے شروع ہوئی

ہے۔اس کا مقصد یہ ہے کہ جن جن مقامات پر مسلمانوں کی آبادی ہے وہاں ان لوگوں کے حلقے قائم کئے جائیں جو جامعہ ملیہ کے تعلیمی نصب العین کے حامی ہیں۔ یہ حضرات ایک چھوٹی سی ماہانہ رقم جسے وہ نہایت آسانی سے ادا کر سکتے ہوں جامعہ کی امداد کے لئے دیتے ہیں اور یوں بھی ہر طرح کی کوشش ان خدمات کی تائید میں کرتے ہیں جو جامعہ ملیہ انجام دے رہی ہے۔ اس بار وسط مئی سے آخر جولائی تک اساتذۂ جامعہ کے وفود صوبہ متحدہ وغیرہ کا دورہ کریں گے۔اس وقت حسب ذیل پروگرام پیش نظر ہے اور حتی الامکان اس کی پابندی کی جائے گی:۔

مئی۔ آخری دو ہفتے: فرخ آباد، ایٹہ، مین پوری، بلند شہر۔

جون۔ پہلا اور دوسرا ہفتہ: سہارنپور، ڈیرہ دون، بجنور۔

" ۔ تیسرا ہفتہ: شملہ۔

" ۔ چوتھا ہفتہ: بارہ بنکی اور گونڈا۔

جولائی۔ اعظم گڈھ، جونپور، غازی پور، بلیا، مرزاپور، گورکھپور، بنارس، الہ آباد۔

ہمیں امید ہے کہ رسالۂ جامعہ کے قارئین کرام جو ان مقامات پر موجود ہیں ان وفود کی ہر طرح امداد کریں گے کیونکہ ان سے بڑھ کر جامعہ ملیہ کی تعلیمی اور ذہنی تحریک کا قدرداں کوئی نہیں ہو سکتا۔

... ...

اس وقت تک ہمدردانِ جامعہ کی تحریک کو خدا کے فضل سے اچھی کامیابی ہوئی ہے۔خاص شہر دہلی میں اس حلقے کے رکن پانچ سو سے زائد ہو چکے ہیں۔میرٹھ میں حلقہ قائم ہو گیا ہے اور شہر کے اکثر حضرات جو تعلیمی ذوق اور قومی درد رکھتے ہیں اس میں شریک ہو گئے ہیں۔علی گڈھ جو وفد گیا تھا اسے حسب توقع پوری پوری کامیابی ہوئی۔مسلم یونیورسٹی کے قریب قریب کل اساتذہ جو پہلے سے جامعہ کے حقیقی ہمدرد تھے اب اصطلاحی ہمدرد بھی بن گئے۔امید ہے کہ جناب شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شروع جون میں حیدرآباد تشریف لے جائیں گے۔وہاں جامعہ کے سچے بہی خواہ اور سرپرست بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں اس لئے یہ تحریک انشاء اللہ وہاں خوب سرسبز ہوگی۔

نذر دربار رسالت

شعرائے اسلام سے اپیل

میلاد کی محفلوں میں جو نعتیں عام طور پر پڑھی جاتی ہیں وہ اگرچہ عاشقان نبیؐ کے والہانہ جذبات کی آئینہ دار ہونے کے لحاظ سے قابل قدر ہیں لیکن بعض بعض اشعار کے مضامین اور تیور اپنے سوقیانہ اور بے باک پائے جاتے ہیں جو سلیم المذاق سامعین کو بار گذرتے ہیں بعض اشعار وفور محبت و عقیدت سے اس قدر لبریز ہوتے ہیں کہ حدود شریعت سے تجاوز کا لحاظ نہیں رہتا۔ اکثر نعت خواں اصحاب خود انتخاب کرنے سے معذور ہوتے ہیں اس لئے ارکان سیرت کمیٹی جالندھر نے محسوس کیا ہے کہ ایک مجموعہ نعت شائع کرنے کی ضرورت ہے جو پاکیزہ جذبات کا حامل ہو اور جس میں احترام نبویؐ کا مل طور پر ملحوظ رہے۔ سرکار کائنات صلعم کی حیات طیبہ کے ان روشن واقعات کی جانب لطیف اور پر کیف اشارات ہوں جن سے اقوام عالم کو فلاح دارین کا سامان میسر آیا اور حضورؐ کے رحم و کرم، عدل، بذل، شجاعت، فصاحت، عفو، فقر، امانت و دیانت، بردباری، تحمل، محبت، رواداری، مساوات اور ان جملہ اخلاق حمیدہ کا تذکرہ ہو جو انسانیت کی تکمیل کا باعث اور دنیا کے لئے مشعل ہدایت ہیں اور ذکر حبیب بھی اس انداز میں ہو کہ ہادیٔ برحق کی رفعت و عظمت، وابستگان دربار رسالت کی سعادت اور اسلام کی عالمگیر رحمت کا نقشہ پیش نظر کر کے مردہ قوم میں از سر نو روح پھونک دی جائے اور سازدل کے تار تار سے نغمۂ محبت نبویؐ پیدا ہو جائے لیکن ضعیف اور غیر مشتبہ روایات سے احتراز کیا جائے۔

اس مجموعے میں ایسی نظمیں بھی شامل ہوں گی جو حیات نبوی کے مختلف واقعات کے متعلق ہوں۔ ایک حصہ ایسی نعتوں اور نظموں کے لئے مخصوص ہوگا جو بچوں کے لئے آسان زبان اور پیرایے میں لکھی گئی ہوں۔ کچھ ایسی نعتیں اور نظمیں بھی ہوں گی جو بچیوں کے لئے لکھی جائیں اور ان سے وہ برکات ظاہر ہوں جو رسول کریمؐ کی ذات سے فرقۂ اناث کو حاصل ہوئیں۔

تمام نعت اور نظمیں ایسی بحروں میں ہوں جو ترنم کے لئے موزوں ہوں۔ انشاءاللہ یہ مجموعہ یوم النبیؐ سے قبل بہ اہتمام خاص، پاکیزہ کتابت، نفیس طباعت اور عمدہ کاغذ پر شائع ہو جائے گا۔ تمام شعرائے اسلام سے استدعا ہے کہ اپنی اپنی نعتیں اور نظمیں مرحمت فرما کر سعادت دارین حاصل کریں۔ بارگاہ رسالت کے لئے یہ نذر تیار ہو رہی ہے۔ ہر ایک شاعر جس کا ایمان ہو کہ نعت رسولؐ سرمایۂ سعادت ہے اپنے ایسے گلہائے اشعار لے آئے کہ فرقۂ شعرا کی جانب سے یہ گلدستۂ عقیدت مرتب ہو کر فخر عرب سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار رحمت میں پیش ہو۔ ایک پھول بھی منظور ہو گیا تو گلدستے کے تمام گل و گیاہ شرف قبولیت سے ممتاز ہو کر باعث نجات و فلاح دارین ہو جائیں گے

نیاز مند

پیرزادہ عبدالحمید بی اے، ایل ایل بی لیڈر میونسپل کمشنر سکریٹری سیرت کمیٹی شہر جالندھر (پنجاب)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ
دہلی

زیر ادارت

مولنا اسلم جیراجپوری　　ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے؛ پی ایچ۔ ڈی۔

جلد ۲ | بابتہ ماہ جون ۱۹۳۳ء | نمبر ۶

فہرست مضامین

محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا۔

مسلمانوں کی آیندہ تعلیم

(۲)

اخلاق کی تعمیر | تعلیم کا دوسرا حقیقی مقصد اخلاق کی تعمیر ہے۔ مذہب اور فلسفہ دونوں نے اس کو اصولاً مان لیا ہے کہ انسان بہت سی باتوں میں مجبور رہنے کے باوجود اپنے ارادے اور نیت کی آزادی بہرحال رکھتا ہے اور یہی آزادی اس کی ذمہ واریوں کی بنیاد ہے۔

غریب کشمکشِ جبر و اختیار میں ہے

لیکن انسانوں کے علاوہ دوسری مخلوقات اس کشمکش کے اختیار سے بھی محروم ہیں اور ان میں سے ہر ایک یا تو اپنی جبلت یا اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور محض ہیں اور ان لوازم، خصائص اور اثرات کی بجا آوری پر مضطر ہیں جن کے لئے ان کی خلقت ہوئی۔ آفتاب سے نور ہی ظاہر ہوگا، گلاب سے خوشبو ہی نکلے گی اور سنکھیا سے موت ہی صادر ہوگی۔ مگر انسان سے نور اور تاریکی، خوشبو اور بدبو، حیات اور ممات دونوں صادر ہوسکتی ہیں، اس کے اخلاق اور خصائل تربیت پذیر ہیں اور اسی لئے وہ تعلیم و تربیت کا محتاج ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہیے کہ کائنات کی ہر مخلوق فطرۃً اسی کام کے کرنے پر مجبور ہے جس کے لئے اس کے خالق نے اس کو پیدا کیا ہے لیکن انسان تھوڑا اختیار پاکر فعل اور ترک فعل کے درمیان ترجیح کا حق رکھتا ہے، اس لئے ضرورت اس کی پیدا ہوتی ہے کہ وہ پہلے ان اغراض کو سمجھے جن کے لئے اس کی خلقت ہوئی ہے اور پھر ان کی اغراض کے مطابق اپنے کام کو پوری مستعدی اور دیانت داری سے انجام دے۔ خلقت کے صحیح اغراض کے سمجھنے کا نام "تعلیم" ہے اور ان کے مطابق عمل کرنے کا نام "تربیت" ہے اور ان تربیتی اعمال کا نام "اخلاق" ہے۔ تعلیم کی بڑی غرض و غایت یہ ہے کہ ان اخلاق کی صحیح تعمیر کی جائے تاکہ وہ فرائض بخوبی ادا ہوں جن کے لئے وہ اس دنیا میں آیا یا بھیجا گیا ہے۔

ہماری موجودہ تعلیم جس طرح بے مقصد ہے اسی طرح یہ تمام تر بے اخلاق بھی ہے۔ ملک میں

مسلمانوں کی ایک درس گاہ بھی ایسی نہیں ہے جس نے اخلاق کی تعمیر اور تربیت کی اہمیت کو سمجھا ہو اور جس نے اپنی زندگی کا مقصد "با اخلاق انسان" کا پیدا کرنا قرار دیا ہو۔ اسی لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی عزت ہماری نگاہوں میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہے کہ نئی تعلیم کی درسگاہوں میں یہ پہلی درسگاہ ہے جس نے اس کی اہمیت کو سمجھا اور اس کی تکمیل کے لئے کوشاں ہے۔

عموماً اخلاق کے معنی ہماری زبان میں نہایت محدود ہیں۔ اخلاق کے لفظ سے ہمارا مقصود یہی محدود معنی نہیں بلکہ ان سے کہیں بڑھ کر وسیع ہے۔ اخلاق سے مقصود انسان کی قوت نفسی کی ایسی تربیت اور مشق ہے جس سے وہ اپنے شخصی، انسانی اور قومی فرائض کے ادا کرنے کی پوری استعداد اور صلاحیت پیدا کرلے۔ درسگاہ کا اہم فرض یہ ہے کہ اپنے احاطے کے اندر ایسی فضا اور ماحول پیدا کرے جو دنیا کی فاسد اور مسموم آب و ہوا سے محفوظ ہو کر صالح اور صحیح اور طاقت در آب و ہوا کی جگہ ہو۔ اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ اخلاقی حیثیت سے درسگاہ ایک قسم کا سینی توریم یعنی دارالصحت ہے جہاں فاسد جراثیم ہلاک ہو کر بیمار صحیح و تندرست ہو جاتا ہے۔

ہمارے گھروں کی اخلاقی و مزاجی کیفیت جس درجہ خراب اور فاسد ہے، اسی نسبت سے اس بات کی زیادہ ضرورت ہے کہ ہماری درسگاہوں کا ماحول زیادہ صالح، صحیح اور طاقت بخش ہو تاکہ گھروں کی مسموم فضا سے علیحدہ ہو کر رفتہ رفتہ ان افراد کی تخلیق ہو جو صحیح شخصی، انسانی اور قومی اخلاق و خصائل کے حامل ہوں اور اس طرح ایک دن وہ آئے کہ پوری قوم کی قوم ان اخلاق و فضائل سے متصف اور مزین ہو جائے۔

(۱) سادگی اور صفائی۔ ہماری درس گاہوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو سادہ لیکن صاف ستھرا رہنے کی اہمیت ذہن نشین کریں۔ صاف ستھرا رہنے کے معنی بیش قیمت کپڑے، اعلیٰ درجے کے مکان، اور قیمتی فرنیچر اور سامان کے نہیں ہیں۔ افسوس ہے کہ اکثر مسلمان بچوں نے اس کے یہی معنی سمجھے ہیں۔ اس کے دو برے نتیجے کھلے طور سے ہمارے بچوں میں پیدا ہیں، ایک یہ کہ وہ اپنی اندرونی صفائی کے بدلے ظاہری ٹیپ ٹاپ پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اسی بنا پر ان کی تعلیمی زندگی نہایت گراں ہے

اور وہ اپنے والدین کے لئے سراسر کوفت بنے ہوئے ہیں۔ دوسرے خود طالب العلم بھی اپنے حوصلے کے مطابق اپنی آمدنی نہ پانے سے ملول و غمگین رہتے ہیں جس کا اثر ان کی طبیعت کی تیزی اور ذکاوت پر بہت برا پڑتا ہے اور ان کا جو وقت اپنے تعلیمی مسائل اور مباحث کے یاد اور حل میں صرف ہوتا وہ ان کے بناؤ سنگار میں اور جو نہیں ہے اس کے حصول کی فکر اور ناکامی کے غم میں بسر ہوتا ہے۔

ہمارے طالب علموں کی زندگی سادہ لیکن صاف ستھری ہونی چاہئے۔ ان کو شروع ہی سے یہ بتانا چاہئے کہ تمہاری عزت تمہارے بیش قیمت کپڑوں اور اعلیٰ سامان سے نہیں بلکہ تمہارے بیش قیمت علم اور اعلیٰ اخلاق سے ہے۔ طالب علموں کے اندر بڑائی اور مسابقت کا معیار ظاہری نمائش اور آرائش کا سامان نہ ہو بلکہ اندرونی لیاقت اور قابلیت کا جوہر ہو۔

مسلمان طالب علموں کو جو مسرف اور نمائش پسند قوم کے افراد ہیں خصوصیت کے ساتھ یہ بات جتانی چاہئے کہ اب وہ وقت نہیں کہ ہم اپنے اسلاف کے بقیہ متمولانہ اثرات کی پیروی میں وہ گراں نمائشی زندگی اختیار کریں جو ہم کو اپنے والدین سے ورثہ میں مل رہی ہے کیونکہ وہ دولت ختم ہو چکی اور وہ تمول اب سراب ہے اس لئے اس کے نمائشی فخر و غرور کے اسباب کو بھی اب ختم ہو جانا چاہئے ورنہ یہ تعلیم ہمارے افلاس میں روز بروز اضافہ کرتی جائے گی اور قوم کی حالت ہر روز بد سے بدتر ہوتی جائے گی۔ اس کی مثالیں آج بہت سے خاندانوں میں ملیں گی کہ نئی تعلیم کی اس غلط تربیت نے ان خاندانوں کی مالی حالت کو کتنا نقصان پہنچایا ہے۔

دنیا کے دوسرے ملکوں سے بہت بڑھ کر ہندوستان کے مسلمانوں کو اس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے کہ وہ ایسی قوم کے دوش بدوش چلنے پر مجبور ہیں جو روزمرہ کی زندگی میں حد درجہ کفایت شعار اور سادہ واقع ہوئی ہے اس لئے اس کے ذاتی اور قومی مصارف ہمارے مقابلے میں بہت کم ہیں بنابریں اس کے پاس ہمارے مقابلے میں دولت کی فراوانی ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ جس خرچ میں ہم اپنے ایک بچے کو تعلیم دلا سکتے ہیں ہمسایہ قوم اپنے چند بچوں کو تعلیم دلاتی ہے۔ پھر دوہرا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے فضول کاموں کے لئے اپنے بزرگوں کی متروکہ جائدادوں کو قرض میں رہن رکھ کر بیچنے پر اور وہ اس کے خریدنے پر مجبور ہیں۔

آج کل عام طور سے یہ دیکھا جارہا ہے کہ ہماری درسگاہیں اپنی عمارت، اپنے سامان اور اپنے انتظامات میں میں نمائش پسندی میں مبتلا ہیں۔ ہماری گذشتہ تعلیم کے عہد میں ہماری مسجدیں ہمارے تعلیمی کمرے اور ہال اور مسجد کا فرش ہماری میزیں اور بنچیں اور کرسیاں تھیں۔ صرف انھیں دو مدوں کی کفایت کا اندازہ موجودہ گراں طریقۂ تعلیم سے بآسانی کیا جاسکتا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ہماری بہتر سے بہتر درسگاہ بہتر سے بہتر مقصدوں کے ساتھ قائم ہوتی ہے لیکن اس کے بانیوں کی ساری محنت زمین، اینٹ، اور چونے پر صرف ہو کر رہ جاتی ہے اور ان مبادی سے نکل کر غایت تک پہنچنا محال ہو جاتا ہے۔

ہمارے دارالاقاموں میں سب سے بہتر دارالاقامہ وہ سمجھا جاتا ہے جو اپنے طالب علموں کو سب سے بہتر اور قیمتی کھانا بہم پہنچائے اور ان کے رہنے کے لئے بہتر سے بہتر سامان اور کمرے مہیا کرے حالانکہ یہ تمامتر ہمارے پچھلے تماشائے دولت کا فریب نظر ہے اور یہی وہ عیش و تنعم اور ناز و نعمت کی زندگی ہے جو ہماری تباہی کی تمامتر ذمہ دار ہے۔

ان سب کے بجائے صرف ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ سادگی اور صفائی ہے۔ ہمارے نوجوانوں نے صفائی اچھے کپڑوں، فیشن ایبل بالوں، خوشبو، عطروں اور تیلوں کا نام رکھا ہے، حالانکہ وہ حقیقت میں گھر کی صفائی، کمروں کی صفائی، کپڑوں کی صفائی اور بدن کی صفائی کی اصلی دولت سے محروم ہیں۔ طالب علموں کو اس بات کی عادت سکھلانی چاہئے کہ وہ کیوں کر اپنا کمرہ، اپنا سامان، اپنے کپڑے اور بدن کو صاف رکھیں جس سے وہ جسمانی و ذہنی صحت اور وہ صفائی اور ستھراپن جو نصف دین اور اصلی تمدن ہے حاصل کریں۔

(۲) جفاکشی۔ اس کے بعد وہ سب سے بڑا اخلاقی جوہر جس کے حصول پر ہندوستان میں مسلمانوں کی آیندہ زندگی موقوف ہے وہ جفاکشی ہے۔ ہم نے اسلامی اصطلاحات میں جہاد کا نام سن کر اپنی روشن دماغی کے ثبوت میں کتنی دفعہ اس سے تبری ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اے عزیزانِ محترم! اب وقت ہے کہ ہم جہاد کی حقیقت کو عملاً سمجھیں اور برت کر دکھائیں۔ جہاد جہد سے مشتق ہے جس کے معنی محنت اور تکلیف کے ہیں۔ حق کی راہ میں ہم جو تکلیف اٹھائیں وہ ہمارا جہاد ہے۔ دنیا کی زندگی سکون پر نہیں، دائمی حرکت پر قائم ہے۔ غلط فہمی سے ہم یہ سمجھے ہیں کہ ہم جس قدر سکون پائیں گے اسی قدر آرام

اٹھائیں گے۔ پچھلے عہد کے ایک عجمی شاعر نے کہا تھا،

بقدرِ ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را دویدن رفتن استادن نشستن خفتن و مردن

لیکن حقیقت میں یہ زوال پذیر قوم کا فلسفہ ہے۔ راحت کے اس عجمی تخیل کے بالمقابل فصیح عرب کہتا ہے 'فی الحرکۃ برکۃ' جس طرح بھوک کے بعد غذا کا اصل لطف ملتا ہے اور جو آنکھیں بیدار رہی ہیں وہی خواب کی لذت سے آشنا ہوتی ہیں، اسی طرح محنت و مشقت کے بغیر آرام و راحت کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔ جب تک ہماری پیشانی سے محنت کا پسینہ ہمارے پاؤں پر نہ ٹپکے گا جو روٹی ہمارے ہاتھ آئے گی وہ ہمارے احساس کے ذائقے کو بھی تسکین نہیں دے سکتی۔

سست امیروں کی پرتکلف غذائیں ہی وہ جراثیم ہیں جو ان کی بیماریوں کو پیدا کرتے ہیں۔ ایک محنتی مزدور چونکہ پوری بھوک اور معدے کی پوری خواہش پر کھاتا ہے اس لئے ہر وہ کھانا جو اس کو وقت پر مل جاتا ہے وہ اس کی قوت کا سرمایہ اور اس کی صحت کا خزانہ ہوتا ہے۔

مسلمانوں کو بچپن سے محنت کا عادی ہونا چاہئے۔ ان کی طالب علمانہ زندگی میں یہ عادت ایسی پختہ ہو جانی چاہئے کہ وہ تمام عمر کے لئے اس دولت کو اپنے قبضے میں کر لیں تعلیم، امتحان کی تیاری، ورزش، سفر اور تعلیم کی فراغت کے بعد جس شاہراہ زندگی کو بھی اختیار کیا جائے وہ نوکری ہو، تجارت ہو، صنعت ہو ہر ایک میں یہی جوہر ان کا بہترین رفیق زندگی ہو سکتا ہے پچھلی دولت مندی کا خمار اب تک مسلمانوں پر چھایا ہوا ہے۔ ہماری درسگاہوں کا بہترین فرض یہی ہے کہ وہ مسلمان طالب علموں کے یہ ذہن نشیں کر دیں کہ اب تمہاری زندگی صرف تمہاری محنت، جفاکشی اور جانفشانی پر موقوف ہے، یہ دنیا ایک تلاطم خیز سمندر ہے جس سے نکل کر ساحل تک بسلامتی پہنچنا صرف تمہارے ہی ہاتھ پاؤں چلانے پر موقوف ہے۔

کون نہیں جانتا کہ اس عرصۂ کائنات میں زندگیوں کا ایک معرکہ برپا ہے اور ہر ایک مخلوق اپنے جینے اور بڑھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ قومیں اس دوڑ میں مصروف ہیں، افراد اس مسابقت میں سرگرم ہیں۔ وہی زندہ اور جیتا رہے گا جو اپنی محنت اور کوشش سے اس بازی کو جیتے گا اور جس نے ہاتھ پاؤں ڈال دئے اور نرم بستر کا جویا ہوا، دنیا اس کو مردہ سمجھ کر ایک گوشے میں ڈال دے گی اور افراد اور قومیں

اس کو رونقی ہوئی آگے بڑھ جائیں گی۔ زندگی کا فلسفہ صرف جہد و جہاد، محنت اور سخت کوشی ہے، بھوک کی برداشت شکم سیری کا سامان ہے اور موت کی تلاش زندگی کا سرچشمہ ہے۔ فَأُقْتَلُ ثُمَّ أُحْيىٰ ثُمَّ أُقْتَلُ فَأُحْيىٰ ثُمَّ أُقْتَلُ فَأُحْيىٰ۔

یہ جو کچھ کہا گیا شاعری نہیں روزمرہ کی حقیقت ہے۔ طالب علموں کو اپنے روزانہ کے ورزشی کھیلوں میں کیا یہ راز ہر شام کو علانیہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہی لڑکا جیتتا اور وہی فریق کامیاب ہوتا ہے جو جس قدر اس دن زیادہ محنتی اور زیادہ جفاکش تھا۔ یہ پوری دنیا ایک بڑے ورزشی کھیل سے بڑھ کر نہیں، اس میدان میں بھی اسی کی جیت ہے جو زیادہ محنتی اور زیادہ جفاکش ہے، کامیابی کی راحت انھیں کے لئے ہے جو اپنے کاروبار میں محنت اور جدوجہد کی تکلیف اٹھاتے ہیں۔

تمام قوموں میں سب سے زیادہ کامیاب، سب سے زیادہ خوش قسمت اور سب سے زیادہ قابل رشک وہ قوم سمجھی جاتی ہے جس کے ہاتھوں میں دوسری قوموں کی سلطنت کی باگ ہو لیکن کیا تاریخ کے اوراق نے اس حقیقت کو آپ پر منکشف نہیں کیا کہ یہ کامیابی، یہ خوش قسمتی اور یہ قابل رشک ہونے کی صلاحیت اس کو کتنی محنت، کتنی جفاکشی اور کتنی پے در پے جسمانی تکلیفوں اور اذیتوں کی برداشت کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ محمود نے سترہ حملوں میں پنجاب پر قبضہ پایا، شہاب الدین غوری نے ایک شکست کے بعد پورے سال بھر اپنے شکست کے وقت کے پہنے ہوئے کپڑوں کو تبدیل نہیں کیا، بابر نے کامل پندرہ برس پہاڑوں سے سر ٹکرایا۔ میں نے ان فقروں کو ہمیشہ کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ بدر و حنین کی سختیوں کو جھیلے بغیر قیصر و کسریٰ کے تخت سلطنت کی خواہش حماقت ہے۔ جس کو لال قلعے میں شاہجہاں کے تخت طاؤس پر جلوس کی ہوس ہو اس کو پہلے بابر کی طرح خشک پہاڑیوں میں سر مارنا چاہئے، کوہکنی کے بغیر "جوئی شیر" کا خواب دیکھنا دیوانگی ہے۔

آج یورپ کی قومیں دنیا کے طول و عرض میں سلطنت کا تخت بچھائے کوس لمن الملک بجا رہی ہیں لیکن اپنے سپاہیوں کے کتنے خون، اپنی دولت کے کتنے صرف اور اپنی محنت و جانفشانی کے کتنے مظاہرے کے بعد یہ سعادت ان کو نصیب ہوئی ہے۔ آج تجارتوں، صنعتوں اور کاریگریوں کی زندگی پر

یہ زندگی کتنی زندگیوں کی قربانیوں کے بعد حاصل ہوتی ہے، کروڑوں مزدور کان کنی میں لگے ہیں لاکھوں آلات کے بنانے اور چلانے میں مصروف ہیں، لاکھوں دن رات دوڑ دھوپ اور محنت اور تگاپو میں مصروف ہیں تب جا کر ان کی قوم کے سر پر سلطنت کا تاج ہے اور ان کے خزانوں میں معدنیات، تجارت اور صنعت و حرفت کی دولت ہے۔

بابر سے لے کر عالمگیر اول تک اور پھر بہادر شاہ اول سے لے کر بہادر شاہ ثانی آخری مغل بادشاہ دہلی تک کی زندگیوں پر غور و فکر کی نظر ڈالیے۔ کیا تین سو برس کی یہ تاریخ یہ حقیقت نہیں بتاتی کہ جنھوں نے تکلیف کی زحمت اٹھائی انھوں نے تخت سلطنت پر آرام کیا، اور جنھوں نے آرام کی خواہش کی انھوں نے عمر بھر زحمتوں اور تکلیفوں میں بسر کی۔

الغرض مسلمان طالب علموں کو یہ نکتہ اب کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ محنت اور جفاکشی ہی کی عادت وہ چیز ہے جو ان کی تعلیمی اور عملی دونوں زندگیوں میں ان کو کامیاب بنا سکتی ہے۔ جہاں قومی سلطنتیں اور قومی تعلیم گاہیں ہیں وہاں کے نظام تعلیم پر ذرا غور کرنے سے یہ نکتہ حل ہو سکتا ہے کہ ان کے نصاب تعلیم میں جو اہمیت کتابوں کو حاصل ہے اس سے کم اہمیت ان کے جسمانی کھیلوں اور مختلف ورزشوں کو حاصل نہیں ہے، میدانی کھیلوں کے علاوہ پہاڑوں پر چڑھنا، دریاؤں میں کشتی چلانا، دھوپ میں دوڑنا ہواؤں میں اڑنا وہ کون سی جانفشانی ہے جس کی مشق یہ قومیں اپنے حکمراں بننے والے افراد کو نہیں کراتیں۔ انگلستان کی بہترین درسگاہوں کے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور یہ نظر آیا ہے کہ ان ورزشی کھیلوں کی اہمیت وہاں تعلیم کے برابر ہی برابر ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہاں کی عام تعلیم گاہیں بھی تقریباً نیم فوجی ہیں۔ اسی سے ہندوستان کی تعلیم کا یہ نقص کہ وہ تمامتر نظری رہتی ہے، عملی نہیں وہاں دور ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کو اگر آیندہ ہندوستان کی سلطنت میں حصہ لینا ہے تو ان کو یہ نکتہ فراموش نہ ہونا چاہیے کہ آیندہ ان کو صرف نظری نہیں بلکہ عملی قوم بننا چاہیے اور یہ اخلاقی تربیت کے بغیر ممکن نہیں۔

(۳) **خود اعتمادی**۔ مسلمانوں کی اخلاقی تعمیر کا نہایت اہم عنصر اپنے افراد کے اندر خود اعتمادی کا جوہر پیدا کرنا ہے جس کے بغیر نہ کوئی شخص کامیاب ہو سکتا ہے اور نہ کوئی قوم۔ خود اعتمادی سے مقصود

اپنے اندر فیصلے کی قوت سے مستحکم عزم پیدا کرنا، اور پھر اس عزم کے مطابق خدا کے بعد خود اپنی ذات پر بھروسہ کر کے کام کو شروع کر دینا اور اس کو کامیابی تک پہنچانا ہے۔ قرآن پاک نے اس نکتے کو صرف دو لفظوں میں ادا کیا ہے "اِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہ (جب عزم کرلے تو پھر خدا پر بھروسہ کر) اس سے پہلے مشورے کا حکم ہے۔ مشورے کے بعد جو فیصلہ ہو جائے اس پر مستحکم عزم کی تاکید ہے، پھر اس عزم کے مطابق اس کو کر گذرنا اور اس کی کامیابی کے لئے خدا کی توحید اور نصرت پر بھروسہ رکھنا۔

مسلمانوں کا یہی جوہر تھا جس سے متصف ہو کر ایک غریب مسافر ہمت کی کمر باندھ کر تن تنہا کھڑا ہوتا تھا اور بحر و بر، دشت و جبل کو طے کر کے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کو چلا جاتا تھا۔ ایک یتیم طالب العلم گھر سے یکہ و تنہا نکلتا تھا اور سالہا سال تک ملک ملک کی خاک چھان کر ایک ایک شہر میں علم و فن کے ماہرین وقت کی صحبتوں اور درسگاہوں سے فیض پا کر اپنے وطن کو لوٹتا تھا، ذرہ ہو کر نمودار ہوتا اور پھر آفتاب بن کر چمکتا تھا۔ ایک باہمت سوداگر اکیلا اپنا ساز و سامان لے کر کبھی سندباد بحری اور کبھی سندباد بری بن کر نکلتا اور دولت کے جہاز اور کارواں سے لدا پھندا عراق، شام، اسکندریہ اور اسپین کی بندرگاہوں میں اترتا۔ ایک معمولی سپاہی اپنی تلوار لے کر نکلتا اور روئے زمین کی فضا کو چیر کر کہیں نہ کہیں اپنے لئے ایک حکومت و ریاست کھڑی کر لیتا۔

مسلمانوں کا یہ جوہر اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں ان سے کھو گیا۔ سن کر حیرت ہوگی کہ وہ بابر جس نے پندرہ برس کے سن میں تخت پر بیٹھ کر اور پھر بارہ ہزار کی فوج سے ہندوستان کو فتح کر ڈالا۔ اس کی اولاد جب لال قلعے سے بھیڑ کی طرح نکلی ہے تو اس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کس طرح اپنے ہاتھوں سے اپنی روزی کا سامان کیا جا سکتا ہے۔

والدین اپنے بچوں کے ساتھ اپنی بہترین محبت یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو تنہا کوئی کام کرنے نہ دیں، تنہا راستے میں نہ چلیں، راتوں کو اکیلے گھر سے باہر نہ نکلیں، کمروں میں رات کو تنہا سونے نہ پائیں۔ ایک بڑے عالم باپ کو میں نے دیکھا کہ اپنے جوان بیٹے کو کالج کی تعلیم کے لئے لکھنؤ اس لئے نہیں جانے دیتے تھے کہ یہ کالج میں پڑھنے جانے والا بچہ کہیں آتے جاتے راستے میں موٹروں سے کچل نہ جائے۔

امیر مسلمانوں کے گھروں میں یہ بات دولت مندی کی نشانی سمجھی جاتی ہے کہ انائیں اور کھلائیاں جوان جوان لڑکوں سے بھی علیحدہ نہ ہونے پائیں۔ ہم نے اٹھارہ انیس سال کے ایسے نواب زادوں کے واقعے سنے ہیں جن کو اس وقت تک نیند نہیں آتی تھی جب تک ان کی اتا بی بی ان کو پلنگ پر سلاتی نہ ہوں۔ آپ نے ایسے نواب زادوں اور امیر زادوں کو دیکھا ہوگا جو کسی درسگاہ کے دارالاقامے میں جب داخل ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ ان کو ناگہانی اتفاقات سے بچانے کے لئے اسٹاف کا اسٹاف ہوتا ہے۔

غریب مسلمانوں تک میں یہ بات عموماً دیکھی جاتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو خود تنہا اپنے کام کی ذمہ داری اٹھانے کی زحمت دینے پر بہت کم رضامند ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے بچے عزم و ارادے کے کچے، ہمت کے بودے اور استقلال کے کسنر ور ہوتے ہیں اور اس لئے تعلیم کے زمانے کے اندر اندر بھی وہ اتالیق اور ٹیوٹر کے سہارے کے بغیر نہیں چل سکتے اور تعلیم کے بعد بھی اپنے بل بوتے پر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ الغرض وہ بچپن میں انا اور کھلائی کے، تعلیم میں اتالیق اور ٹیوٹر کے، اور ملازمت میں سعی و سفارش کے محتاج ہوتے ہیں۔ زندگی کے ہر مرحلے میں ہر قدم پر ان کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر چلیں۔ ایسی قوم کے افراد کیا حکومت کی بلند چوٹی پر چڑھنے کی ہمت کر سکتے ہیں؟ کیا اسلامی ہندوستان کی تاریخ ہمارے سامنے نہیں۔ ان کی ترقی کا عہد وہ تھا جب بادشاہ کے زیر سایہ امرا کھڑے ہو کر ملک کا انتظام کرتے تھے اور ان کی تنزلی کا زمانہ جب آیا تو یہ شہزادے اپنے اپنے امیروں کے سہارے کھڑے ہو کر تخت پر بیٹھنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان امیروں نے ان کو اٹھا کر تخت سے دور پھینک دیا اور بالآخر تخت اور تخت نشیں دونوں کا خاتمہ ہو گیا۔

یورپ کی ترقی یافتہ قوموں کے افراد میں آج یہ جوہر ان کی انھیں درسگاہوں میں پیدا ہوتا ہے اور اسی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جس پرزے کو جہاں لگا دیجئے وہیں وہ کام دینے لگتا ہے۔ ایک فرنچ مصنف نے اینگلو سیکسن قوم کی ترقی کے راز پر فرنچ میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا ترجمہ عربی میں "سر تقدم الانکلیز السکسونیین" کے نام سے ہوا ہے۔ اس میں زیادہ زور اسی بات پر دیا گیا ہے کہ انگریز قوم کی ترقی کا بڑا راز یہی خود اعتمادی کا جوہر ہے۔ ایک اور فرنچ نے "بیسویں صدی کا امیل" کے نام سے

خطوط کی صورت میں ایک کتاب لکھی ہے، اس میں بھی بڑی خوبی سے یہ دکھایا گیا ہے کہ ماں کی گود سے لے کر کالج کی اعلیٰ تعلیم تک لڑکوں میں جس وصف کے پیدا کرنے کی کوشش کی جائے وہ خود اعتمادی ہے۔ ایک انگریز سپہ سالار کا یہ فقرہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہم نے انگلستان کے فٹ بال کے میدانوں میں خود اعتمادی اور ثبات و استقلال کا جو جوہر اپنے اندر پیدا کیا تھا وہی نپولین کے مقابلے میں ہمارے کام آیا۔

مسلمان ہندوستان میں جس تعدادی اقلیت میں ہیں اس کی تلافی صرف ان کی اخلاقی قوت اور عملی طاقت سے ہو سکتی ہے، اس لئے ہماری درس گاہوں کو اس ملک کے مسلمانوں کو آیندہ زندگی بخشنے کے لئے ضرورت ہے کہ وہ اپنے طالب علموں میں یہ قوت اور یہ طاقت پیدا کریں تاکہ وہ اپنے استحقاق سے اس ملک میں زندہ رہ سکیں اور اس مملکت کے نظام حکومت کے قیام اور استواری میں کسی طرح ان سے حکومت وقت کو بے نیازی نہ ہو سکے۔

اساتذہ | ہماری درس گاہوں میں جس چیز کی طرف سب سے کم توجہ کی جاتی ہے وہ استادوں کے انتخاب کا مسئلہ ہے۔ قومی درس گاہوں میں اس انتخاب کا معیار یہ ہے کہ جو کم تنخواہ لے، اور سرکاری درس گاہوں میں یہ کہ جو سب سے اونچی کاغذی سند رکھے اور "یوروپین کوالفکیشن" تو وہ منتر ہے جس سے ہر تعلیمی بھوت بآسانی بھاگ جاتا ہے۔ ہندوستان کا کیسا ہی تجربے کار سے تجربے کار، ماہر سے ماہر اور محقق سے محقق ہو مگر اگر اس کے پاس یورپ کی کسی درس گاہ کے دو نقطہ نہ ہوں تو اس کے مقابلے میں بیرونی تعلیم کا ہر ناتجربہ کار اور نوآموز ترجیح پائے گا۔ ہماری بڑی سے بڑی یونیورسٹی آج انگریزی، فرنچ اور جرمن استادوں کے ناموں کے جادو میں گرفتار ہے اور اس کو منہ مانگی تنخواہ دینے میں حاتمی فیاضی کے لئے تیار ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اب تک ہم نے اپنی تعلیم کا کوئی نصب العین مقرر نہیں کیا ہے بلکہ خود قوم نے بھی اپنی زندگی کا کوئی مقصد قرار نہیں دیا ہے، اس لئے استادوں کے انتخاب کا معیار صرف یہ رہ گیا ہے کہ اعلیٰ سند کا کاغذ، اور سات سمندر پار کے حکمراں اقوام کی گوری شخصیت، انتہا یہ ہے کہ عربی، فارسی اور تصوف کے پڑھانے کے لئے بھی ہم اپنی قوم کے کسی فرد پر اعتبار کرنے کے لئے اس وقت تک تیار نہیں جب تک پروفیسر

مارگولیتھ، پروفیسر براؤن، ڈاکٹر آرنلڈ اور ڈاکٹر اس کے دستخطوں کا کاغذ اس کے پاس نہیں۔

ہم نے اس سے پہلے مسلمانوں کے تعلیمی مقاصد کا جو خاکہ آپ کے سامنے پیش کیا ہے اگر وہ ذہن نشیں ہے تو آپ اس کا فیصلہ کرنے میں ایک ذرہ بھی تامل نہ فرمائیں گے کہ استادوں کے انتخاب کا معیار کاغذی سند سے بڑھ کر ان کی شخصیت میں ان مقاصد کا وجود ہے جن پر اس تعلیم گاہ کی بنیاد قائم ہے۔ اگر آپ کسی ایسی دو درسگاہوں کا باہم موازنہ کریں جن میں سے ایک ایسے استادوں کا اسٹاف رکھتی ہے جو اعلیٰ کاغذی سندوں کے تو مالک ہیں مگر ان مقاصد سے سرتاسر خالی ہیں اور دوسری گو اعلیٰ کاغذی سندوں کے لحاظ سے کم درجہ ہے مگر اس کے استاد اپنے اندر وہ جوہر رکھتے ہیں جو اس کے تعلیمی مقاصد کا حقیقی عنصر ہیں تو یقیناً عملی حیثیت سے دوسری پہلی سے کہیں زیادہ مفید ہوگی۔ کیا ہماری نئی اسلامی درس گاہیں استادوں کے انتخاب کے وقت یہ معیار اپنے سامنے رکھتی ہیں کہ ان میں سے کون زیادہ مسلمان، کون زیادہ راستباز، کون زیادہ مخلص، کون زیادہ محنتی، کون زیادہ جفاکش اور کون حقیقت میں مسلمانوں کے تعلیمی نصب العین کے پورا مطابق ہے! کیا کسی غیر قوم کے استاد سے یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ دوسری قوم کے حقیقی تعلیمی نصب العین کے مطابق اپنے کو بنائے گا اور خود اس کا نمونہ بن کر طلبہ کے سامنے آئے گا؛ ایسے استادوں کے زیر تعلیم و تربیت جن میں سے ہر ایک کا قبلۂ مقصود صرف دوسری قوم کی ظاہری نقالی ہو اور جن کا حوصلہ صرف سوٹ، کوٹھی، فرنیچر اور موٹر تک محدود ہو، ایسے لڑکوں کے پیدا ہونے کا خواب دیکھنا جو مسلمان ہوں، قوم پرور ہوں، سادہ ہوں، جفاکش ہوں اور مسابقت اقوام کی دوڑ میں اپنی برتری دکھا سکیں کہاں تک حق بجانب ہے۔ یہ ویسا ہی ہے جیسے کوئی احمق کاشتکار اپنے کھیتوں میں جو بو کر گیہوں کاٹنے کی امید رکھے اور اس سے بے خبر ہو کہ ع گندم از گندم بروید، جو ز جو۔

اسلامی اور وطنی نصب العین کا جو خاکہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جائے اور جس کو مسلمان اپنا قومی مقصد اور زندگی کا مطلوب بنا لیں وہی درحقیقت استادوں کے انتخاب کا معیار ہے۔

بوریا باف گرچہ بافندہ است　　　نہ برندش بہ کارگاہ حریر

ہماری پچاس برس کی تعلیمی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے پہلے تو اپنا کوئی تعلیمی مقصد متعین نہیں کیا اور نہ اس مقصد کے مطابق اپنے استادوں کا انتخاب کیا۔ مثال دیتا ہوں، ہم نے عربی پڑھانے کے لیے یورپ کے ایک بہترین مستشرق کو بلوایا وہ عربی فیلالوجی اور یوروپین عربی مطبوعات و مخطوطات کی پوری فہرست ہمارے بچوں کو رٹا سکتا ہے، مگر قرآن پاک کا وہ شغف اور تاریخ اسلام کا وہ ذوق قومی ہم کو کیوں کر عطا کر سکتا ہے جو نہ صرف یہ کہ اس کو نصیب نہیں بلکہ وہ اس سے منحرف ہے۔

ہماری اکثر درس گاہوں کے استاد صرف پیشہ ور معلم ہیں جنھوں نے اس پیشے کو صرف اس لئے اختیار کیا ہے کہ یہ بھی معیشت کا ایک ذریعہ ہے ورنہ درحقیقت وہ ہمارے قومی مقاصد تعلیمی نصب العین اور اسلامی ذوق سے سراسر محروم ہیں اور پھر ان سے ہم یہ احمقانہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ آیندہ ہمارے بچوں کو ہمارے قومی مقاصد تعلیمی نصب العین اور اسلامی ذوق سے بہرہ ور کر دیں گے۔

جامعہ ملیہ کو میں مبارکباد دیتا ہوں کہ اس نے اپنے استادوں کے انتخاب میں اس نکتے کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس نے انتخاب کا معیار اعلیٰ کاغذی سند کو نہیں بلکہ اپنے تعلیمی مقاصد کو رکھا ہے۔ فرض کیجئے کہ اگر اس درس گاہ میں ایک نہایت اعلیٰ قسم کے ایسے استاد کو لاکر رکھ دیا جائے جو گو یوروپین اسناد کا بڑا پوٹ اپنے قبضے میں رکھتا ہو گر اس کے تمام تر حالات و خیالات اور نشر و تعلیم ان مقاصد کے خلاف ہوں جن پر اس درسگاہ کی بنیاد ہے تو کیا ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب اس کو "جامعہ بدر" کرنے میں ایک لمحے کے لئے بھی اس کے فضل و کمال کے ان کاغذی دستاویزات کا پاس کریں گے؟ پھر کیا یہ کہ ہماری درسگاہوں کے معلم اپنے وجود، اپنی تعلیم اور اپنے فیض صحبت سے علانیہ ہمارے قومی مقاصد کی تضحیک، ہمارے مذہبی خیالات کی توہین اور ہمارے وطنی اغراض کی تلبیس کرتے ہیں اور پھر صرف اس لئے یہ گوارا کیا جاتا ہے کہ ان کے پاس کاغذی دستاویزات کا اچھا ذخیرہ موجود ہے۔

جوہر طینت آدم ز خمیر دگر است   تو توقع ز گلِ کوزہ گراں می داری

ارکان جامعہ سے بھی ایک بات کا برملا اظہار کر دینا ہے۔ ہم نے اب تک جامعہ ملیہ کو اسلامیت اور وطنیت جدید اور قدیم دونوں کی لطیف و معتدل آمیزش کا نتیجہ سمجھا ہے۔ اس لئے اساتذہ کے

انتخاب میں صرف "اخلاص و ایثار" کی سند اتنی زبردست نہیں کہ اس کے لئے اسلامیت کی نفی کردیں، یا وطنیت سے انحراف پسند کرلیں۔ اگر وطنی اغراض کے مخالف کو اس جامعہ میں علم نہیں باقی رہنا چاہئے، تو اسلامی اغراض کے مخالف کے لئے رواداری کیوں برتی جائے۔ اگر کوئی درس گاہ اس قسم کی رواداری برتتی ہے تو درحقیقت وہ اپنے مقاصد کی جڑ پر آپ کلہاڑی مارتی ہے۔ بہرحال اس بات کے اظہار میں ہم کو کوئی پس و پیش نہیں کہ ہماری یہ نوعمر درسگاہ اس اصول کو بہت کچھ اپنے سامنے رکھتی ہے اور دعا ہے کہ اس کے کارکنوں کو اپنے معیار کی سختی پر مزید استقامت نصیب ہو۔

علوم | ہم کو اپنی درس گاہوں میں کن علموں کو پڑھنا اور پڑھانا چاہئے؟ یہ وہ سوال ہے جس پر اب تک مسلمانوں نے کیا بلکہ ہندوستانیوں نے بھی غور نہیں کیا بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ہم ڈیڑھ سو برس سے جس تعلیمی شکنجے میں گرفتار ہیں، اس سے مجبور رہ کر ہم اس پر غور کر بھی نہیں سکتے۔ ہندوستان میں نئی تعلیم جن اسباب سے پھیلائی گئی ہے ان کو بیان کرنے میں برطانی مدبرین نے کبھی پس و پیش نہیں کیا ہے۔

(۱) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہندوستانیوں کے دلوں سے اپنی تہذیب و تمدن اور دین و مذہب کی عصبیت مٹ جائے۔ اس کے لئے اس کی ضرورت تھی کہ نصاب تعلیم کو ہر مذہبی اسپرٹ سے خالی رکھا جائے یہاں تک کہ اس میں خدا کا نام بھی نہ آنے پائے۔

(۲) بنگال کی ابتدائی مثالوں سے انگریزوں کو یہ دھوکا ہوا کہ یہ نئی تعلیم عیسائیت کی اشاعت میں معین ہوگی۔ اسی لئے گورنمنٹ کی طرف سے مشنری اسکولوں کی پوری حوصلہ افزائی ہوئی اور ان میں انجیل کی تعلیم داخل کی گئی۔

(۳) انگریزوں کو اپنی حکومت کی تنظیم میں ایسے ماتحتوں کی ضرورت تھی جو ان کے دفتروں کے لئے کچے مواد اور مسالوں کو ان کے مطالعہ، تجویز اور فیصلے کے لئے مرتب کرسکیں اور ان کو ان کی زبان میں معاملے کی صورت حال کو سمجھا سکیں۔

ان وجوہ سے جدید درس گاہوں کو پہلے تو مذہبی اور اخلاقی تعلیم سے یکسر خالی رکھا گیا، پھر ان میں صرف انھیں علوم کو داخل کیا گیا جو اس قسم کے ادنیٰ تعلیم یافتوں کو ان کے لئے مہیا کرسکے۔

ایسے محرروں، کلرکوں اور ماتحت افسروں کو سب سے پہلے تو انگریزی جاننا چاہیے تاکہ وہ ان کی زبان میں سلطنت کے معاملات اور کاغذات کو پیش کر سکیں، پھر ان کو حساب جاننا چاہیے جو ان کے دفاتر کے حساب و کتاب کو درست رکھ سکیں۔ چنانچہ جو نئی تعلیم ہندوستان میں جاری کی گئی اس کی اصلی بنیاد یہی دو چیزیں ہیں، انگریزی اور حساب، اس کے ساتھ تیسری چیز جغرافیہ ہے جس سے مقصود صرف اس قطعۂ ارض کا علم ہے جہاں سے آفتاب کبھی نہیں ڈوبتا، اور اس سے اُس سلطنت کی وسعت اور عظمت کے ساتھ اس کے مختلف ٹکڑوں کا جوڑ بھی معلوم ہو۔ چوتھی چیز تاریخ ہے جس کا مقصد اس ملک کی قوموں کے باہمی دشمنانہ تعلقات کی یاد کو ان کے دلوں میں تازہ رکھنا اور انگریزوں نے جیسا کہ وہ کہتے ہیں اس ملک میں ایک منظم عادل اور متمدن حکومت قائم کر کے اہل ملک پر جو احسان کیا ہے اس کو بار بار دہراتے رہنا ہے۔ چنانچہ حکومت وقت اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوئی اور اس نے ہندو مسلمانوں کے درمیان بغض و عداوت کی وہ آگ بھڑکا دی جو ہماری بہترین کوششوں کے باوجود اب تک بجھ سکی۔

اعلیٰ تعلیم کے دو حصے ہیں، فنون یعنی آرٹس اور علوم یعنی سائنس۔ یہ دونوں حصے حد درجہ ناقص ہیں۔ آرٹس میں جن فنون کی تعلیم دی جاتی ہے ان کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ سلطنت کے لئے ماتحت افسر حاصل ہوں۔ ابھی حال میں پٹنہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر کورٹنی ٹیرل نے پٹنہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں جو خطبہ پڑھا اس میں انھوں نے یہ بالکل بجا کہا ہے:

> "بی۔ اے یعنی 'بیچلر آف آرٹس' کس قدر مغالطہ آمیز فقرہ ہے۔ وہ کون سا آرٹ ہے جس میں ایک بی۔ اے مہارت حاصل کرتا ہے۔"

لے دے کر ایک تاریخ، دوسری انگریزی اور تیسری پولیٹیکل اکانمی جس کی مناسبت قانون خوانی اور وکالت کے خیال سے ہے، اور پھر نظری فلسفہ۔ علوم میں ایک عجیب ندرت یہ رکھی گئی ہے کہ "نظریات" کو اہمیت دی جائے اور "عملیات" سے پہلو تہی کی جائے۔ ہماری ایک بڑی درس گاہ میں سائنس کالج کی سب سے بڑی اہمیت علم حیوانات کی تعلیم ہے حالانکہ ہم ابھی علم انسان سے بھی آشنا نہیں۔ حیوانات کے خصائص اور زوجی فرائض کے علم سے بہتر ہمارے لئے یہ ہے کہ ہم یہ جانیں کہ ان میں سے

کس کا چپڑا ہم کس طرح کام میں لا سکتے ہیں۔

غرض انبے عمل اور نظری علوم کی تعلیم سے ممکن ہے کہ موجودہ حکام تعلیم کا یہ مقصد ہو کہ تعلیم یافتہ ہندوستانی اپنی زندگی گذارنے کے لیے حکومت وقت کے دست نگر رہیں تاہم یہ بھی اسی کا نتیجہ ہے کہ جیسے جیسے یہ تعلیم بڑھتی جاتی ہے لکھے پڑھے اپاہجوں کی تعداد بھی روز افزوں ہے اور چونکہ ہندوستان میں بے کاروں کے لئے کام مہیا کرنا حکومت کا فرض نہیں اس لئے اس کو اپنے طریق تعلیم میں تغیر کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔

حکومت کی ابتدائی تعلیمی پالیسی کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ ہندوستان میں اور خصوصاً مسلمانوں میں تعلیم کی ضرورت صرف نوکری کے حصول کے لئے ہے اور اب انقلابات نے ہماری آنکھوں سے یہ پردہ اٹھا دیا ہے کہ یونیورسٹیوں کی یہ تعلیم نوکریوں کے حصول میں بھی اب کارآمد نہیں رہی ہے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ آخر پھر اسی تعلیم کے پیچھے اب تک دوڑے چلے جانا کہاں تک صحیح ہے۔ اگر اس تعلیم سے سرکاری نوکریوں کا سہارا بھی ہو تو بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ سرکاری نوکریاں قومی افلاس کے دور کرنے کا علاج نہیں ہیں۔ وہ علوم و فنون جو حصول دولت کے اصلی ذرائع ہیں ان کی تعلیم ہمارے نظام تعلیمات سے قطعاً خارج ہے، عملی کیمسٹری، آلات سازی اور صنائع و حرفت کی تعلیم جن پر قومی روزی کا دارومدار ہے، ہمارے تعلیمی دائرے سے تمامتر باہر ہے، کہ اگر ان کی تعلیم یہاں ہو تو پھر ہندوستان انگلستان کی مصنوعات کا بازار باقی نہ رہے، ڈاکٹری ہم کو یہاں سکھائی جاتی ہے مگر دواسازی نہیں کہ اگر ایسا ہو تو پھر دواؤں کی قیمت میں ہندوستان اپنا سرمایہ انگلستان کو دینے پر کیوں مجبور ہو۔

اسکول کی پوری تعلیم میں سائنس کی تعلیم برائے نام ہی چھوئی جاتی ہے۔ جغرافیہ طبیعی، حفظان صحت اور طبیعیات کی دوسری چھوٹی چھوٹی باتوں کے سوا ان کو اور کچھ بتایا نہیں جاتا اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی لکھنے اور بولنے اور حساب جوڑنے کے سوا کچھ اور ان کو نہیں آتا۔ کالجوں کی اعلیٰ تعلیم میں انہیں خاکوں کو اور زیادہ ابھار دیا جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ ان مسائل پر پوری طاقت سے گفتگو کرنے کے لئے میں اپنے میں اہلیت نہیں پاتا اس لئے تفصیلات کو اپنے سے زیادہ لائق اشخاص کے سپرد کر کے صرف

چند سرسری اشاروں پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۱) سب سے پہلے یہ کہ کیا یہ غیر مذہبی اور غیر قومی تعلیم آیندہ جاری رہنا چاہئے؟ کیا ایسا نصاب تعلیم آپ کے لئے زہر نہیں جو مذہب واخلاق اور قومی تخیل کی روح سے یکسر خالی ہو؟

(۲) کیا نفس انگریزی زبان کا یہ معیار تعلیم کہ ہر ہندوستانی خاص انگریزوں کی طرح اس زبان میں لکھ پڑھ سکے اب بھی باقی رہنا چاہئے؟ یا اس قدر جاننا کافی ہے جس سے اس کے ذریعہ گفتگو، کاروبار اور حصول علم ممکن ہو۔

(۳) علوم میں ان سائنسوں کو جگہ دی جائے جن سے ہم کو عملی فائدہ پہنچے اور وہ ہمارے علم کے ساتھ ہماری دولت کو بھی بڑھا سکیں۔

ہمارے بچوں کو یہ پڑھایا جاتا ہے کہ گھڑی سے وقت کیوں کر پہچانیں، ٹکٹ لے کر ریل پر کیوں کر بیٹھیں اور ایک موٹر کا عام استعمال کیوں کر کریں، تار لکھ کر بابو کے ذریعے تار کیوں کر بھیجیں لیکن یہ نہیں پڑھایا جاتا کہ ہم گھڑی کیوں کر بنائیں، لوہے کو مٹی سے کیسے نکالیں، پھر لوہے کو کیسے صاف کریں، پھر کیوں کر ریل کی پٹریاں اور گاڑیاں اور پہیے اور انجن بنائیں، موٹر کے ٹکڑوں اور ان ٹکڑوں کے کو کیسے بنا کر جوڑیں۔ اسی مثال پر دوسری باتوں کو قیاس کیجئے۔

ہم اب تک پوری تیزی کے ساتھ اسکول کی تعلیم کے بعد کالج کی تعلیم کی طرف دوڑتے چلے گئے ہیں اور یہ سمجھتے رہے ہیں کہ بس اس کے بعد ہم کامیابی کی منزل کو پہنچ گئے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کالج کی گراں قیمت تعلیم میں ہم اپنے بچوں پر جس قدر صرف کرتے ہیں اکثر ایسا ہو رہا ہے کہ ان لڑکوں کو اس تعلیم کے بعد اتنی رقم بھی ماہوار ملنی مشکل ہے۔ ہمارے لڑکے بی۔ اے تک ایک بنی ہوئی شاہراہ پر پوری امنگ اور ولولوں کے ساتھ دوڑتے چلے جاتے ہیں اور ان کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سڑک کے خاتمے پر ان کو اپنی منزل کا پتہ مل جائے گا، مگر وہ جب وہاں پہنچتے ہیں تو دفعتہً منزل مقصود کی رفیع عمارت کے بجائے ایک عمیق غار ان کو نظر آتا ہے اور وہ ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اب سوچتے ہیں:

گذری جو گذرنی تھی اب چاہئے کیا کرنا

غور کرتے ہیں تو سرکاری نوکری کے سوا اپنے اندر اور کسی کام کی صلاحیت نہیں پاتے اس سے مایوس ہو کر بعض لوگ تو ذرا اکتا کر پھر آگے دوڑنا شروع کر دیتے ہیں یعنی ایم۔ اے کی تیاری میں لگ جاتے ہیں اور بعض قانون یاد کرتے ہیں یا ٹرنینگ کی فکر کرتے ہیں لیکن اب ٹرنینگ کا دروازہ بھی بند ہو رہا ہے اور قانون کے میدان میں جو بھیڑ بھاڑ ہے اس سے کون بے خبر ہے۔

ان واقعات نے یہ غور کرنے کا موقع دیا ہے جن کو علم علم کے لئے حاصل کرنا ہے آیا اُن کے لئے اس طریقۂ تعلیم میں علوم کی تحصیل کا سامان ہے اور جن کو علم کمائی کے لئے حاصل کرنا ہے کیا انھوں نے اس موجودہ طریقۂ تعلیم میں اپنی شکم سیری کا بھی کوئی فن سیکھا ہے؟

اب اس مسئلے میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں کہ ان چند لوگوں کے سوا جو علم کی واقعی تحصیل چاہتے ہیں یا علمی اور تعلیمی پیشے میں زندگی گذارنا چاہتے ہیں بقیہ افراد کو صرف اسکول کی تعلیم پر قناعت کرنی چاہئے اور اعلیٰ تعلیم کا فریب نہ کھانا چاہئے۔ اس تعلیم کے بعد ان کو کسی صنعت، حرفت، تجارت یا اور دوسرے ذرائع معاش کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ اعلیٰ تعلیم میں صرف انھیں کو جانا چاہئے جو واقعی علم کے شیدا ہوں اور تحقیق و تکمیل کے طالب ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ حکومت نے اس اعلیٰ تعلیم کو اپنے چند بلند عہدوں کے لئے انتخاب کا معیار مقرر کر لیا ہے اور انھیں کا لالچ قوم کی قوم کو اس کی طرف کھینچ رہا ہے مگر غور کے قابل بات ہے کہ یہ چند عہدے جو ہر صوبے میں دس بیس سے زیادہ نہیں، وہ ہزاروں اور لاکھوں مسلمانوں کو نہیں مل سکتے، جب چند سال کی دفتر گردی کے بعد بالآخر وہیں لوٹ کر آنا ہے تو پہلے ہی سے وہیں جانے کی تیاری کیوں نہ کی جائے؟

ہمارے ہاں تعلیم کی ایسی بندھی ہوئی اور محدود صورت اب تک ہے کہ خواہ لڑکے میں مناسبت ہو یا نہ ہو اور ان علوم سے ان کو وابستگی ہو یا نہ ہو بہرحال وہ ان کو پڑھنا ہے اور ان میں ان کو کامیاب ہونا ہے ورنہ آئندہ وہ کسی لائن میں بھی گھس نہیں سکتے۔ اس مجبورانہ طریق تعلیم نے ہمارے طلبہ کی ذہانتوں کا اور والدین کے سرمایے کا بے دریغ خون کیا ہے۔ آخر قوم کی یہ ذہنی خودکشی اور مالی فضول خرچی

کب تک جاری رہے گی اور کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ اس موجودہ تعلیمی نظام کے خلاف ہم اپنے لئے آپ ایک مستقل تعلیم کی بنیاد ڈال کر عملاً بغاوت کا اظہار کریں اور ان علوم کو چھوڑیں جن کا انتہائی مقصد عمدہ انگریزی سیکھنا ہو اور ان علوم کو اختیار کریں جن سے قومی تربیت کے بعد حصولِ زر کا طریقہ سیکھا جائے۔

ہم نے اس تعلیم کے متعلق کچھ نہیں کہا ہے جس کا مقصد علم کا حصول ہے کہ اس کے لئے سب سے پہلی شرط پیٹ کے سوال سے آزادی ہے۔ ہم نے اب تک یہ چاہا ہے کہ علم اور پیٹ دونوں مقصدوں کو ایک تعلیم کے اندر جمع کر دیں اور یہ ناممکن ہے۔ پیٹ کی تعلیم سے علم کی آسودگی حاصل نہیں ہو سکتی یہی سبب ہے کہ ہم نے مسلمانوں میں اس نئی تعلیم کے ذریعے سے کوئی بڑا مصنف، کوئی بڑا محقق، کوئی بڑا فلاسفر، کوئی بڑا مورخ، کوئی بڑا سائنٹسٹ، کوئی بڑا موجد، کوئی بڑا کیمسٹ، کوئی بڑا اسٹرانومر، کوئی بڑا میتھیمیٹیشین پیدا نہیں کیا، اور اگر اتفاقاً پیدا ہو بھی گیا تو اس نے علمی زندگی نہیں پائی کیونکہ علم کی صبر آزما اور سنگلاخ راہ سے کمال کی منزل تک پہنچنے کے بجائے جھوٹی پالیٹکس اور سرکاری نوکری کے ذریعے فخر و شہرت اور نام و نمود پیدا کرنے کا راستہ ان کو زیادہ آسان نظر آتا ہے اور علم کا تقاضا ہے کہ علم کے سوا اس کے طالب کا کوئی اور مقصود نہ ہو۔

تعلیم کی زبان سب سے آخری بات تعلیم کی زبان کا مسئلہ ہے۔ میں نے ابھی مسلم یونیورسٹی کے خطبے میں اس پر اپنے مفصل خیالات ظاہر کئے ہیں جن کے دہرانے کی حاجت یہاں نہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اس بدیسی زبان کی گرفت سے جو ۱۸۳۵ء میں ہم پر مسلط کی گئی آزادی حاصل کریں۔ یہ نکتہ بھلایا نہ جائے کہ ہم نے بدیسی زبان کے ذریعۂ تعلیم ہونے کی مخالفت کی ہے، نئے علوم اور کسی قوم کی علمی و ادبی زبان سیکھنے کی نہیں۔ علوم و فنون خواہ کتنے ہی نئے ہوں اور کسی قوم سے ان کو نسبت ہو، وہ کسی خاص زبان کے اندر محدود نہیں۔ مسلمانوں نے ہندوستان ایران اور یونان کے سب علوم و فنون سیکھے مگر اس طرح نہیں کہ انھوں نے اپنی تعلیم کی زبان ہندی یا ایرانی یا یونانی کر دی ہو بلکہ یہ کیا کہ ان تمام زبانوں کے علوم و فنون کو خود اپنی زبان میں منتقل کیا یا دوسروں سے منتقل کرایا اور اس اپنی زبان کے ذریعے لوگوں کو ان علوم و فنون کی تعلیم دی۔ آج اگر یورپ ہی کی تقلید کمال کی دلیل

ہے کوئی کسی پست سے پست یورپین قوم کی مثال دی جاسکتی ہے جس نے اپنی زبان کو چھوڑ کر دوسری علمی قوموں کی زبانوں کو علوم وفنون کی عام تعلیم کا ذریعہ قرار دیا ہو۔ کل بیت الحکمۃ نے بغداد میں جو کچھ کیا وہ کیا ہے، جو دارالترجمہ عثمانیہ میں آج نہیں ہوسکتا' جاپان نے انگریزی اور فرنچ کے ذریعے اپنے ہاں تعلیم نہیں پھیلائی اور نہ آج ترک تک با ایں ہمہ جدت پسندی جرمن اور فرنچ کو تعلیم کا ذریعہ بنا سے ہیں کیونکہ وہ اس نکتے کو سمجھتے ہیں کہ زبان کو قومیت کی تخلیق میں کیا اہمیت حاصل ہے۔

۱۹۲۰ئ میں فرانس جب شام کو امیر فیصل سے چھین کر اس پر قبضہ کر رہا تھا تو اس وقت اتفاق سے میں فرانس کے شہر ونیشی میں تھا۔ فرنچ اخبارات شام پر اپنے قبضے کے جو وجوہ بتا رہے تھے ان میں سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ "یہ وہ ملک ہے جہاں فرنچ زبان کے تین سو اسکول ہیں" یہی وہ اسکول ہیں جہاں شامی بچوں کے دلوں میں فرانس کی محبت کا بیج بویا گیا۔ یہ بیج بڑھا اور آج ایک تناور فرنچ حکومت کے سایہ دار درخت کی صورت میں شام میں موجود ہے۔

جامعہ کی چاردیواری میں اس اہمیت پر استدلال قائم کرنے کی ضرورت نہیں جو قوموں کی تکوین وتخلیق میں زبانوں کو حاصل ہے۔ مذہب کے بعد وہ زبان ہی ہے جو پوری قوم کو ایک متحد قوم بناتی ہے۔ وہ زبان جو کسی قوم میں ذریعۂ تعلیم نہ ہو کبھی سرسبز نہیں ہوسکتی۔ یہی سبب ہے کہ جہاں تک نئے تعلیم یافتہ افراد کا تعلق ہے ہماری زبانوں کو بہت کم امداد ملی ہے۔ وہ تعلیمی زبان نہ ہونے کی وجہ سے علوم وفنون کے خزانوں سے محروم ہے اور نئے علوم بدیسی زبان کے ایک ایسے پنجرے میں بند ہیں جہاں تک رسائی بے اس کے ممکن نہیں کہ پہلے ہم اس بدیسی زبان میں سالہا سال تک مہارت حاصل کرلیں پھر بھی ہمارے بچے ان علوم کی تہ تک باسانی اس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک ان علوم کے سمجھنے سے پہلے وہ اس زبان کی مشکل کو حل نہ کرلیں۔ مثال یہ ہے کہ آپ ان کو الجبرا یا حساب کا کوئی مسئلہ حل کرنے کو انگریزی زبان میں سوال دیتے ہیں۔ بچے کو پہلی مشکل یہ ہے کہ وہ اس سوال کی زبان کو سمجھے، پھر علم کی مشکل کو حل کرے' پھر بھی وہ اس کو اس آسانی سے نہیں سمجھ سکتا جس آسانی سے وہ اپنی مادری زبان میں سمجھ سکتا ہے اور سمجھ لینے کے بعد بھی اس کو مادری زبان میں دہرانے پر تو یقیناً

قدرت نہیں رکھتا کہ اس کے لئے اس کو پہلے مناسب الفاظ اور مصطلحات کے پیدا کرنے کی مشکل درپیش رہتی ہے۔

ہندوستان میں مسلمان نہ صرف یہ کہ مادری زبان میں علم کی تحصیل سے معذور ہیں بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ سرے سے مادری زبان سے محروم ہیں۔ ہندوستان زبانوں کا دنگل ہے۔ صوبہ وار زبانوں کو چھوڑ کر اردو ہندی کا ایک مستقل دنگل اس ملک میں قائم ہے۔ ہمارے وطنی بھائیوں نے اس اہمیت کو پوری طرح محسوس کرکے جو زبان کو قوم کے وجود میں حاصل ہے یہ عزم کرلیا ہے کہ وہ ہندی کو اپنی مادری نہ سہی تو علمی و ادبی زبان تو ضرور ہی بنالیں گے۔ لیکن مسلمان اب تک اس عزم اور فیصلے سے غافل ہیں اور ابھی تک انگریزی ہی بولنے، لکھنے اور پڑھنے کو کمال کا معیار جان رہے ہیں اور دوسری قوم سے مستعار مانگی ہوئی دولت پر فخر کرنا حماقت نہیں سمجھ رہے ہیں۔ اگر ہندوستان کو ایک قوم بننا ہے تو یہاں کی زبان کو بھی ایک ہندوستانی زبان بننا ہے اور یہ وہی زبان ہوگی جس کو ہندو مسلمانوں کی ملی جلی طاقت نے ایک ہزار برس کے میل جول سے اس ملک میں پیدا کیا ہے۔

اب تک ہم اس ساحرانہ فریب نظر میں پھنسے تھے کہ ان نئے علوم کی تعلیم بدیسی زبان کے سوا ہندوستان کی مادری زبان میں ہو ہی نہیں سکتی مگر یہ سحر اب ٹوٹ رہا ہے اور سرکار نظام کی بہادرانہ پیش قدمی نے اس جال کے ایک ایک تار و پود کو الگ الگ کردیا ہے اور ثابت کردیا ہے کہ یہ علوم کسی خاص زبان کے پابند نہیں۔ شراب کو جس پیالے میں بھی پیو وہ شراب ہے اور تلوار کو جس غلاف میں بھی رکھو وہ تلوار ہے۔ سوال ظرف کا نہیں مظروف کا ہے۔

مسلمانو! اٹھو اور ایک نئے تعلیمی نظام کی بنیاد رکھو۔ دنیا کا انتظار نہ کرو، وقت ہے کہ تم آگے بڑھو، دنیا خود تمہارے پیچھے آئے گی۔

ہم کو اس کا احساس ہے کہ آج کی گفتگو میں کچھ دل خراش باتیں بھی ہیں مگر سنجیدگی سے غور اس پر کرنا ہے کہ یہ سچی باتیں ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو زخموں پر کب تک اس ڈر سے نشتر نہ لگایا جائے کہ اس سے بیماروں کو تکلیف ہوگی۔

وآخر دعوتنا ان الحمد للہ رب العلمین۔

عربی اور فارسی شاعری کے امتیازات

غالباً اس بات پر تمام تذکرہ نویس متفق الرائے ہیں کہ ایرانی شاعری نے جس شاعری کو اپنا رہبر بنایا وہ صرف عربی شاعری ہے۔ بجز مسٹر براؤن کے دیگر تمام مستشرقین کی یہ متفقہ رائے ہے کہ اسلام سے پہلے ایران شاعری کے حقیقی مفہوم سے ناآشنا تھا۔

محققین یورپ نے حقیقت میں فارسی کی قدیم اور نایاب کتابیں جمع کرنے میں انتہائی جستجو اور تفحص سے کام لیا اور اس جستجو میں وہ بہت کچھ کامیاب بھی ہوئے لیکن قدیم فارسی شاعری کے متعلق چار چھ شعر سے زیادہ جمع نہ کر سکے حالانکہ واقعتہً ان پر بھی شاعری کا اطلاق صحیح طریقے پر نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی شعر ان میں سے دعائیہ فقرہ ہے جو دربار شاہی میں عرض و معروض کرنے سے پیشتر پڑھا جاتا تھا اور بطور دعا اور آداب دربار کے حکومت وقت کی جانب سے مقرر تھا بغیر اس کے پڑھے کوئی بات زبان سے نہیں نکال سکتا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ اس فقرے سے کلام کی موزونیت کا صاف طریقے سے پتہ چلتا ہے لیکن اس سے ان کے شاعر ہونے پر استدلال نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں شعریت کا فطری مادہ موجود تھا مگر اس کو صحیح راستے پر لگانے والا موجود نہ تھا۔ جب اسلام نے اس جوش کو ابھارا تو وہ خوب ابھرا۔

منم آں پیل دمان و منم آں شیر یلہ نام بہرام ترا و پدرت بوجبلہ

مذکورالصدر شعر کا شان نزول یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز بہرام گور شکار کھیل رہا تھا۔ صید کے زخمی ہونے پر بے ساختہ اور جوش و مسرت کے عالم میں پہلے مصرعے کے کلمات اس کے منہ سے نکل گئے۔ بیوی بھی ساتھ تھی اس کے منہ سے بھی اسی جوش و مسرت کے ساتھ دوسرا مصرع نکل گیا۔ بہرام کی پرورش اور تربیت کا اکثر حصہ عرب بادیہ نشینوں میں گذرا، عرب میں چونکہ اس وقت شاعری شباب پر تھی، ملک کا اصلی سرمایہ تفاخر صرف شاعری اور ملکہ شاعری تھا۔ برنا و پیر سب اسی ایک رنگ میں رنگے

ہوئے تھے، جو بات منہ سے نکلتی تھی اس پر موزونیت کا گہرا رنگ چڑھا ہوتا تھا، چلتے پھرتے طول طویل اور جوش آور قصائد کہہ دینا ان کے نزدیک "بازی طفلان" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

یہ تو ظاہر کیا جا چکا ہے کہ بہرام کا دماغ عربی شاعری اور اس کی خصوصیت سے متاثر ہو چکا تھا، بعضوں کی رائے کے مطابق وہ عربی میں شعر بھی موزوں کر لیا کرتا تھا۔ بہرحال اس نے عربی میں شعر موزوں کئے ہوں یا نہیں یہ بات ہمارے عنوان سے خارج ہے۔ جب انسان کسی چیز سے متاثر ہو جاتا ہے تو اسی قسم کی باتیں خود بخود اس کے منہ سے سوتے جاگتے نکلتی رہتی ہیں، ایک جاہل اور بدوی انسان بھی تعلیم یافتہ اور مہذب سوسائٹی میں بیٹھ کر گا ہے گا ہے اسی قسم کی باتیں بغیر علم و ارادے کرنے لگتا ہے۔ بہرام گور تو بادشاہ تھا اور سلاطین کا دماغ بھی اکثر شاہانہ ہوا کرتا ہے۔ اگر اس کے منہ سے غیر ارادی طور پر چند موزوں کلمات نکل گئے، تو اس چیز سے قبل از اسلام فارسی شاعری کے وجود پر استدلال نہیں کیا جا سکتا درآنحالیکہ پورا شعر بھی بہرام کی طرف منسوب نہ ہو۔ داخلۂ اسلام کے بعد سے آج تک کی فارسی شاعری کی تاریخ مع شعراء کے ناموں کے مکمل طریقے پر موجود ہے لیکن اسلام سے پہلے ایرانی شاعری کے متعلق اگر آپ کچھ معلوم کرنا چاہیں تو آپ کے ہاتھ کچھ بھی نہیں لگے گا۔ تہذیب و تمدن کی ترقی، آب و ہوا کی فرحت انگیزی اور ولولہ خیزی کا پتہ ضرور چل جائے گا لیکن شاعری کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہو سکتا۔

مملکت ایران کی عنان جب عباسیوں کے ہاتھوں میں پہنچی اور وزارت میں خاندان برامکہ کو اپنی حکمت عملیوں کی وجہ سے سیاہ سفید کا کلی اقتدار حاصل ہو گیا تو درپردہ عربی حکومت خالص ایرانی سلطنت کی حیثیت میں آ گئی جس طرح ہندوستان میں اسلامی حکومت خالص ملکی حکومت بن گئی تھی۔ ٹھیک اسی طریقے سے عباسیوں کے عہد میں خاندان "برامکہ" کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے عربی حکومت درپردہ ایرانی قالب میں ڈھل گئی تھی۔ حکومت کے بڑے بڑے محکموں پر ایرانیوں کا اقتدار چھایا ہوا تھا۔ یہی سیاہ سفید کے مالک بنے بیٹھے تھے۔ عرب خون پی پی کر رہتے تھے لیکن "برامکہ" کے اثر و اقتدار کی وجہ سے حرف شکایت بھی زبان پر نہیں لا سکتے تھے۔

ہندوستان میں جس طرح اسلامی حکومت کے اثر کی وجہ سے ہندو شعراء فارسی زبان میں

اپنے شاعرانہ جذبات کا اظہار کیا کرتے تھے اسی طرح ایرانی بھی بنو امیہ کے عہد میں عربی زبان میں شاعری کو اپنے لئے فخر اور رسائی دربار کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ "بنو امیہ" کے آخر عہد حکومت تک سرزمین ایران میں سینکڑوں شعراء پیدا ہوئے لیکن وہ سب کے سب عربی زبان میں واردات قلب بیان کرتے رہے۔ عباسیوں کے عہد میں جوں جوں فارسی روح عربی قالب میں داخل ہوتی گئی اسی قدر عربیت کے آثار بھی مفقود ہوتے گئے۔ ہندوستان میں فارسی زبان اس وقت تک باقی رہی جب تک حکومت کا کچھ بھی اثر رہا اگرچہ ملکی ماحول کے اثر کی وجہ سے وہ خالص ایرانی فارسی سے بہت کچھ مختلف ہو گئی تھی تشبیہات و استعارات، اور خیالات و واردات میں بھی کچھ اختلاف رونما ہو گیا تھا۔ یہاں کا پسندیدہ رنگ کچھ اور تھا اور خاص ایران میں کچھ اور بات مقبول تھی۔ ہندوستان میں یہ فروق ضرور رونما ہو گئے تھے لیکن کم از کم زبان اپنی جگہ پر تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ قائم رہی مگر ایران میں عربی کے قدم ڈگمگا گئے۔

خلیفہ مامون چونکہ ننہالی رشتے سے عجمی النسل سمجھا جاتا تھا فارسی اس کی مادری زبان ہو چکی تھی۔ فارسی گو شعراء پر اکرام و انعام کی بارش ہونے لگی تھی چنانچہ "عباس مروزی" کے ایک فارسی قصیدے کے صلے میں ایک ہزار دینار سالانہ مقرر کئے گئے تھے۔

دربار میں چونکہ ایرانی سیاست کارفرما تھی اس لئے عہد مامونی میں درباری زبان فارسی قرار پائی۔ تمام سرکاری کام بجائے عربی کے فارسی زبان میں ہونے لگے۔ ملکی تعصب کی یہ پہلی فتح تھی جس نے مفتوح ایرانیوں کے حوصلے بڑھا دئے۔ ملکی شعراء جن کے قبضے میں ملک و قوم کی حقیقی باگ ہوتی ہے انھوں نے ایک قدم اور بڑھایا۔ فارسی زبان سے بھی عربیت کو حذف کرنے لگے چنانچہ شاہنامے کی خالص فارسی زبان اسی عصبیت کے سلسلے کی ایک مضبوط کڑی ہے۔ اس تمام تفصیل کا اجمال یوں کیا جا سکتا ہے کہ ایران میں شاعری کی ابتدا داخلۂ اسلام کے بعد ہوئی۔ "بنو امیہ" کے زمانۂ خلافت تک ایرانی شعراء عربی زبان میں اپنا مافی الضمیر بیان کرتے رہے۔ "بنو امیہ" کا تختہ الٹ جانے کے بعد جب عباسی سریر آرائے سلطنت ہوئے تو انھوں نے فارسی علم ادب کو بہت کچھ ترقی دی اور اسی عہد میں ایرانی شاعری اپنے اصلی قالب میں آ گئی۔ اسلام کے ابر کرم نے جب دنیا کو سیراب کرنا شروع کیا تو علاوہ سچی خدا پرستی اور

ایمانداری کے مختلف علوم و فنون کی بارش بھی شروع کی۔ عرب کو جس چیز پر ناز تھا وہ ان کی فطری اور سچی شاعری تھی " ان من الشعر لحکمۃ " کی حقیقی تعریف انھیں کی عین فطری شاعری پر صادق آتی تھی۔ اسلام کے مبارک و مسعود قدم جہاں بھی پہنچے وہاں اس نے اپنی سچی شاعری کا سکہ ضرور جمایا۔

ایران کی سرزمین اپنی شائستگی و شادابی کی وجہ سے تمام دنیا سے بڑھی ہوئی تھی۔ تمام ملک حقیقی صورت میں تھا، زمین تختۂ گلزار بنی ہوئی تھی، ہوا اپنے اثرات کے لحاظ سے فرحت بخش، نشاط انگیز، ولولہ خیز، اور روح پرور تھی۔ اسی وجہ سے اس شاگرد نے تمام دنیا سے پہلے اپنے آپ کو استاد کے رنگ میں رنگ لیا اور یہاں تک محنت و ریاضت کی کہ بعض باتوں میں استاد سے بھی سبقت لے گیا۔

چونکہ استاد کی طرح شاگرد بھی حسب و نسب کے اعتبار سے نجیب و شریف تھا اس لئے اس نے اظہار تلمذ میں کسی قسم کا عار محسوس نہیں کیا۔ اس حقیقت کو سینکڑوں مختلف طریقوں سے ظاہر کیا ہے اور طرز ادا سے صرف اعتراف واقعہ ہی نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس اعتراف کی تہ میں جوش و خروش اور فخریہ انداز کا بھی پتہ چلتا ہے۔

شاعری دانی کدامی قوم کردند آنکہ بود   اول شاں امرا القیس، آخر شاں بوفراس (انوری)

شعرائے فارسی میں سے جس کسی کے دماغ میں عربی اشعار کا زیادہ ذخیرہ محفوظ ہوتا تھا وہ اپنے کو دوسرے ہمعصروں پر بانداز فخریہ فوقیت دیتا تھا اور حقیقت میں یہ تفوق اس دور میں اس کے لئے صحیح اور درست بھی تھا چنانچہ منوچہری جس کو ملک سخن کا فرماں روا ہونے کا فخر حاصل ہے اس فخر کو اس انداز سے بیان کرتا ہے:۔

من بسے دیوانِ شعرِ تازیاں دارم زبر
تو ندانی خواند "الاھبی بصحنک فاصبحینا"

یعنی اے مخاطب مجھ کو تو عرب کے بیسیوں دیوان ازبر ہیں اور تو "سبعہ معلقہ" کا وہ قصیدہ جس کا یہ مطلع ہے نہیں پڑھ سکتا۔

الاھبی بصحنک فاصبحینا
ولا تبقی خمور الاندرینا

حتی کہ مشہور شعرائے فارس کی تمثیل کے لیے جو شعراء پیش کئے جاتے تھے ان کا قرعۂ انتخاب بھی صرف شعرائے عرب کے نام نکلتا تھا۔ چنانچہ منوچہری نے ایک قصیدہ "ملک الشعراء عنصری" کی مدح میں لکھا تھا اس میں عنصری کا مقابلہ شعرائے عرب سے کیا ہے "تمثیلاً شعرائے عرب کا نام لے کر کہتا ہے کہ" وہ کسی صورت سے بھی عنصری کا مقابلہ نہیں کر سکتے"۔ عنصری کی تمثیل کے لئے اس کو صرف شعرائے عرب کا انتخاب کرنا پڑا حالانکہ اس دور میں خود فارس میں ایسے شعراء موجود تھے جن کو عنصری کی تمثیل میں پیش کیا جا سکتا تھا مگر چونکہ شعرائے فارس کے دماغوں میں شعرائے عرب کی سطوت چھائی ہوئی تھی اس لئے ان کی نظروں کے سامنے صرف شعرائے عرب ہی مختلف حیثیت سے جلوہ نما رہتے تھے۔ اگرچہ اس نے اس موقع پر شاعرانہ مبالغہ اور خوشامد سے کام لیا ہے لیکن ہمارے موضوع سے یہ تحقیق خارج ہے اس لئے ہم اس بات کا کوئی فیصلہ کرنا نہیں چاہتے ہمارا مقصود صرف یہ بات ظاہر کرنا ہے کہ شعرائے فارس نے ہر حیثیت سے شعرائے عرب کو اپنا استاد سمجھا۔

اوستاد اوستادان زمانہ عنصری   عنصرش بے عیب و دل بے غش و دینش بے فتن
شعر او چوں طبع او ہم بے تکلف ہم بدیع   طبع او چوں شعر او ہم با ملاحت ہم حسن
کو جریر و کو فرزدق کو ولید و کو لبید   رؤبہ و عجاج و دیک الجن و سیف ذی یزن
گو فراز آیند و شعر اوستادم بشنوند   تا عزیزے روضہ بینند و بلیسے نسترن
شعر او فردوس را ماند کہ اندر شعر او   ہر چہ در فردوس ما را وعدہ کردہ ذوالمنن

اس کے علاوہ اور بھی مختلف جگہ شاعران عرب کی استادی کا فخریہ انداز میں ذکر کیا گیا ہے:۔

شاعری عباس کرد و حمزہ کرد و طلحہ کرد   جعفر و سعد و سعید و سید ام القری
آنکہ گفتست "آذنتنا" آنکہ گفت "الا ہبی"   آنکہ گفت "السیف اصدق" آنکہ گفت "لی المنی"¹

---

¹ اس شعر میں منوچہری نے عربی کے چار مشہور شعراء کے قصائد کی طرف اشارہ کیا ہے اور مقصود صرف اظہار تلمذ ہے "آذنتنا" سے اشارہ ہے حارث بن "حلزہ الیشکری" کے اس مشہور قصیدہ کی طرف جس کا مطلع یہ ہے۔

آذَنَتْنَا بِبَیْنِهَا اَسْمَاءُ   رُبَّ ثَاوٍ یُمَلُّ مِنْهُ الثَّوَاءُ

عربی اور فارسی بحور میں زمین و آسمان کے فروق و امتیازات پائے جاتے ہیں۔ دونوں کی سوتیلیا

یعنی اسما (نام معشوقہ) نے اپنے ہجر کی اطلاع ہم کو دے دی ہے۔ بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی معیت سے طبیعت گھبرا جاتی ہے مگر "اسما" ان میں سے نہیں ہے۔ اس مشہور قصیدے کے دو شعر جذبات شجاعانہ میں بہت کچھ ترفع پیدا کرتے ہیں۔

لَا یُقِیمُ العَزِیزُہ بِالبَلَدِ السَّہلِ   وَلَا یَنفَعُ الذَّلِیلَ النِّجَارُ

یعنی شریف اور بہادر لوٹ مار کے خوف سے سہل الحصول مقام پر نہیں ٹھہرتا اور ذلیل انسان کو اعزت سے بھاگنا کوئی فائدہ نہیں دیتا۔

لَیسَ یُنجِی الَّذِی یُوَائِلُ مِنَّا   رَأسُ طَودٍ وَحَرَّۃٌ رَجلَاءُ

یعنی بھاگنے والے کو پہاڑ اور محفوظ جگہوں میں چھپنا ہم سے نجات نہیں دلا سکتا۔

"سبعہ معلقہ" کے سات مشہور قصیدہ نگاروں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ صف اول کے شعرا میں اس کا بھی شمار کیا گیا ہے۔ عراق عرب کا باشندہ تھا۔ ہجرت نبوی سے ۶۰ سال قبل پیدا ہوا۔ آخر عمر میں جذام میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کے قصائد میں بھی عرب کی عام بجزیت کا رنگ غالب ہے۔ زمانۂ جاہلیت کے دیگر شعراء کی طرح اس کا کلام بھی تفاخر ذاتی اور جوش نسبی سے مملو ہے جن کے جذبات کا دریا سا موجزن معلوم ہوتا ہے۔ قومیں اسی قسم کی شاعری سے زندہ رہا کرتی ہیں۔ یہ بدیہہ گوئی میں بھی اپنا نظیر آپ تھا۔ یہ قصیدہ بھی اس کی بدیہہ گوئی کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔ "ابو عمرو شیبانی" کہتا ہے کہ "اگر حارث اس قصیدے کو پورے ایک سال میں لکھتا جب بھی یہ قصیدہ اس کا شاہکار سمجھا جاتا۔"

"الاصمعی" سے اشارہ عمرو بن کلثوم کے قصیدے کے اس مطلع کی طرف ہے جس کا اس سے پہلے کے صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ وہ مطلع بھی سابق کے صفحات میں کسی جگہ لکھا جا چکا ہے۔

"السیف اصدق" سے اشارہ ہے ابو تمام کے اس مشہور قصیدے کے مطلع کی طرف جو اس نے فتح "عموریہ" کی تہنیت میں خلیفہ معتصم باللہ عباسی کے دربار میں پڑھا تھا جس سے دربار میں ایک سکوت کا عالم طاری ہو گیا۔

ایک دوسرے سے بہت ہی بعد اور فاصلہ رکھتی ہیں۔ قاعدے کے مطابق فارسی زبان کو اپنی سرحد پر قائم

السیف اصدق انباء من الکتب　　　فی حدہ الحد بین الجد واللعب

یعنی تلوار کتابوں کی نسبت زیادہ سچ بولتی ہے۔ اس کی باڑھ سنجیدگی اور تمسخر کی حد فاصل ہے۔ ابوتمام عہد عباسیہ میں خلیفہ معتصم باللہ کے دربار کا ایک زبردست شاعر تھا۔ اس کا نام تو حبیب تھا لیکن کنیت سے مشہور ہوا۔ باپ نصرانی الاصل شمار کیا جاتا ہے۔ جاسم نامی موضع میں جو کہ عروس البلاد دمشق کے مضافات سے ہے ۱۹۲ھ ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پیدا ہوا۔ مصر میں پرورش پائی۔ مشہور ہے کہ جامع مسجد مصر میں جمعہ کے روز نمازیوں کو مشک سے پانی پلایا کرتا تھا۔ بعض تذکرہ نویسوں کی رائے ہے کہ ایک "نجار" کے پاس رہا کرتا تھا اور اسی سے نجاری کا کام سیکھ لیا تھا۔ اس کا باپ مصر کے مشہور شراب فروشوں میں شمار ہوتا تھا حلیہ نگاروں کی رائے کے مطابق رنگ گندمی اور قد لانبا تھا۔ جمعیت کے لحاظ سے بھی بالکل اوسط درجے کا حکم رکھتا تھا۔ فصاحت و بلاغت اور شیریں کلامی میں دور دور مشہور تھا۔ زبان میں چونکہ لکنت کا اثر بہت تھا اس لئے حروف و الفاظ مشکل سے ادا ہوتے تھے۔ شہر "موصل" میں درمیان ماہ ذیقعدہ ۲۳۲ھ ہجری نبوی وفات پائی۔ قبر پر ایک قبہ بنوا دیا گیا تھا۔ ابوتمام اپنے عہد کا بے نظیر شاعر تھا۔ اس کو تقریباً چودہ ہزار اشعار برزبان تھے۔ بصرے میں عبدالصمد نامی ایک مشہور شاعر رہتا تھا۔ جب اس نے ابوتمام کے بصرے آنے کی خبر سنی تو اس کو اس بات کی بہت فکر ہوئی کہ کہیں اس کی آمد میری شہرت ربائی کا باعث نہ ہو اور لوگ بجائے میرے اس کی طرف متوجہ نہ ہو جائیں اس لئے اس مضمون کا ایک شعر لکھ کر اس کے پاس روانہ کر دیا کہ تیرا آنا میرے سر آنکھوں پر لیکن نہ تو تاب وصل ہی ہے اور نہ طاقت جدائی ہے۔ بڑوں کا ظرف بھی وسیع ہوتا ہے اس لئے اس شعر کو پڑھتے ہی بصرے جانے کا ارادہ فسخ کر دیا اور کسی دوسری طرف چلا گیا۔ یہ اپنے علم و فضل کے اعتبار سے متنبی کا ہم پلہ تھا۔ دیوان حماسہ جو عربی علم ادب کی جان سمجھا جاتا ہے اس کا انتخاب اسی نے کیا ہے۔ اس انتخاب کے متعلق اہل ادب کا متفقہ بیان ہے کہ ابوتمام کی شاعری کا کمال اس انتخاب سے جس قدر معلوم ہوتا ہے خود اس کے دیوان سے ظاہر نہیں ہوتا۔ فحول الشعراء اور الاختیارات نامی دو اور کتابیں بھی اس کی تالیف سے مشہور ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں بھی شعرائے جاہلیت کے مشہور اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ "سخن گفتن" سے

رہنا چاہیے' تھا لیکن فارسی شعراء نے باوجود اس امتیاز و فرق کے کثرت سے عربی قصائد پر قصائد کہے۔

بدان غرض من شعر گفتم کہ گفت است   ابو الشیص اعرابی' باستانی

"سخن فہمی" زیادہ مشکل سمجھی جاتی ہے۔ دوسروں کے تخیلات کی گہرائیوں کو پہنچ جانا حقیقت میں بہت بڑا کمال ہے۔ یہ مادہ ہر شخص میں ودیعت نہیں کیا جاتا اور نہ یہ ضروری ہے کہ جو شخص اچھا کہنے کی صلاحیت رکھتا ہو وہ "سخن سنجی" میں بھی اپنا نظیر آپ ہو۔ لیکن ہر کلیہ میں کچھ مستثنیات بھی ہوتے ہیں۔ ابو تمام کی ذات میں فطرت نے دونوں قسم کی خوبیاں ودیعت کی تھیں۔ اس کے شاعرانہ کمال کے متعلق کچھ لکھنا حقیقت میں آفتاب کو چراغ دکھانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ سخن فہمی کا اندازہ دیوان حماسہ سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک قیافہ شناس نے اس کی ذہانت و جدت اور فطانت و ذکاوت کو دیکھ کر کہا تھا کہ "اس کی عمر زیادہ نہیں معلوم ہوتی"۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ تقریباً چالیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ "ابو بکر صولی" نے اس کے تمام اشعار کو دیوان کی صورت میں بہ ترتیب حروف تہجی جمع کیا تھا۔ "علی بن حمزہ" اصفہانی نے بعد کو اس کا کلام انتخابی شکل میں مرتب کیا۔

"ابلی الھوی" سے اشارہ ہے "متنبی" کے قصیدے کی طرف۔ یہ چوتھی صدی ہجری کا بہت مشہور شاعر ہے۔ سرزمین عرب نے اس پایہ کا شاعر پیدا نہیں کیا۔ ویسے تو عرب کا ہر شاعر اپنے آپ کو مملکت شاعری کا شہنشاہ سمجھتا تھا لیکن حقیقت میں اس کو شریعت شاعری کا ایک اولوالعزم پیغمبر کہہ سکتے ہیں چنانچہ اس کو متنبی کہنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس نے دعوئے نبوت کیا تھا۔ قبیلۂ "کلب" پر اس کی نبوت کا جادو چل گیا تھا اگرچہ آخر میں اس نے توبہ کر لی تھی مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کا کلام اپنی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے "سحر مبین" کا درجہ رکھتا ہے۔ ایک مرتبہ سننے کے بعد سامع اس کی ساحریت سے کچھ ایسا مسحور ہو جاتا ہے کہ پھر اس کے سامنے کوئی رنگ نہیں جمتا۔

۳۳۷ھ میں سب سے پہلے امیر سیف الدولہ ابن حمدان کے پاس گیا۔ سیف الدولہ کی مجلس میں ہر وقت علماء و فضلاء جمع رہتے تھے۔ روزانہ علمی مباحث پر گفتگو رہتی تھی۔ ایک روز متنبی اور ابن خالویہ نحوی میں کسی مسئلے پر سخت بات چیت ہو گئی۔ ابن خالویہ نے لپک کر متنبی کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کیا۔ بدقسمتی سے خالویہ کے ہاتھ میں کنجی تھی وہ متنبی کے منہ پر اس زور سے لگی کہ خون بہنے لگا اور تمام کپڑے بھی خون آلود ہو گئے۔ سیف الدولہ نے چونکہ اس واقعے پر کچھ توجہ

اس کے علاوہ شعرائے فارس نے عربی مصطلحات اور امثال کو اس کثرت سے فارسی مصرعوں میں نظم کیا ہے جو ان کے تلمذ پر بلا استشہاد دلالت کرتے ہیں۔

نہیں کی اس لئے یہ خفا ہو کر مصر میں کافور اخشیدی کے دربار میں چلا گیا۔

متنبی بہت شان و شوکت اور دبدبے والا آدمی تھا۔ چنانچہ جب کافور کے دربار میں پہنچا تو ساتھ میں بہت سے زریں کمر غلام بھی موجود تھے اور خود کمر میں تلوار لٹکائے ہوئے تھا۔ کافور سے بھی نبھی نہیں اس لئے اس کی ہجو میں ایک قصیدہ لکھ کر کہیں بھاگ گیا۔ کافور نے اس کی گرفتاری کی بہت کوشش کی لیکن اس کا پتہ نہ چلا۔ چاروں طرف پھرتا ہوا ایران پہنچا۔ یہاں عضد الدولہ بن بویہ دیلمی کی مدح کر کے انعام و اکرام حاصل کیا۔ یہاں سے کوفے کا رخ کیا۔ راستے میں فاتک بن ابوجہل اسدی کی سپاہ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ متنبی چونکہ لڑنے کے ارادے سے روانہ نہیں ہوا تھا اس لئے اس کے پاس جمعیت بہت کم تھی اسی وجہ سے اس جنگ میں خود متنبی، اس کا بیٹا اور غلام مسمی مفلح نعمانیہ نامی مقام کے قریب موضع صافیہ میں مارے گئے۔ متنبی نے جب دشمن کا غلبہ دیکھا تو فوراً اس نے بھاگنے کا ارادہ کیا مگر اس کے غلام نے چلا کر کہا کہ اب بھاگنے کا موقع نہیں ہے کیونکہ متاخرین تمہارا یہ شعر سن کر ہمیشہ ہنسا کریں گے۔

فالخیل واللیل والبیداء تعرفنی　　　والسیف والرمح والقرطاس والقلم

اس کو بھی کچھ شرم آئی۔ پلٹ کھڑا ہوا اور مدافعانہ رنگ چھوڑ کر خود حملہ آور ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد مارا گیا۔ حقیقت میں یہ شعر ہی اس کے قتل کا باعث ہوا کیونکہ نہ یہ شعر موقعے پر یاد دلایا جاتا اور نہ وہ قتل ہوتا۔ ۳۰۳ھ میں شہر کوفہ محلہ کندی میں پیدا ہوا اور ۳۵۴ھ ماہ رمضان میں قتل ہوا۔ اس حساب سے اکیاون سال کی عمر پائی۔

اس کو نظم و نثر دونوں میں یکساں مہارت اور لغات پر زبردست عبور رہا۔ جو بات کبھی دریافت کی جاتی فوراً اس کا جواب دے دیا کرتا۔ بعض لوگ اس کے کلام کو ابو تمام اور دوسرے تمام متاخرین پر ترجیح دیتے ہیں اور بعض کے نزدیک ابو تمام کے بعد اس کا مرتبہ ہے۔ اس کا دیوان عربی مدارس کے آخری درجوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ طبیعت چونکہ دشوار پسند تھی اس لئے کلام میں تنگلاخی موجود ہے۔ بہت سے لوگوں نے

نکو گوئی، نکو گفتہ است در ذات | کہ "التوحید اسقاط الاضافات"
"قم باذنی" و "قم باذن اللہ" | ہر دو یک نغمہ آمد از لب یار
"انظرونا نقتبس من نورکم" کے گفت چرخ | کافتاب از آفتاب پیشت کند اقتباس
زلزلۂ قہر تو شان کردست | "زلزلۃ الساعۃ شیٔ عظیم"
آدم از نسبت وجود تو یافت | "انقصاص خلقتہ بیدی"
میر آب است و حق ہمی گوید | کہ "من الماء کل شیٔ حیّ"
بعد ازیں مح چہ بر زباں آرم | چہ کنم "آخر الدوا الکیّ"
مقتب قم شکست و بندہ سرش | "سن بالسن والجروح قصاص"

فارسی شاعری میں تلمیحات کا جتنا ذخیرہ ہے اس میں پچانوے فی صدی حصہ عربی تلمیحات کا شامل ہے۔ بحر عشق کے شناور و غواص جس قدر فارسی شاعری میں ممتاز نظر آتے ہیں وہ تقریباً سب کے سب عربی نژاد ہیں۔ مشکل سے دو فی صدی ایسے نظر آئیں گے جن کی پرورش اور تربیت کا فخر مادر ایران کو حاصل ہے۔

ویسے تو ایران کی سدا بہار سرزمین میں ہزاروں شاہان پری پیکر پیدا ہوئے اور لاکھوں عاشقان خستہ جگر نے ان کے انداز دلربایانہ پر اپنی قیمتی اور پیاری جانیں جان آفریں کے سپرد کیں مگر حقیقت میں وہ سوز و کیف اور سچائی ان میں نہ تھی جو صحیفۂ عشق میں ان کو ممتاز شخصیت کے ساتھ پیش کرے اور دنیا ان سے ایک "ہیرو" کی حیثیت سے روشناس ہوتی۔

یہی وجہ ہے کہ فارسی شاعری نے جن عشقیہ تلمیحات اور واقعات کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھا وہ مجنوں، لیلیٰ، سلمیٰ، وامق، عذرا، معبد، سعد، اسما، رباب، عزّہ اور ثبینہ کا انتخاب تھا۔

اس کے دیوان کی شرحیں لکھی ہیں۔ ایک شخص کا بیان ہے کہ میں نے متنبی کے دیوان کی چا مطول اور مختصر شرحیں دیکھی ہیں۔ اتنی شرحیں مشکل سے کسی کے کلام کی لکھی گئی ہوں

(مضمون نگار)

خاقانی شبگیرمیں شب ظلمت گرفتہ چوں دل عاشق — باشک دیدہ و آتش برنگ طرۂ عذرا

" نشاند برچمن ژالہ وماند از دمن لالہ — چناں از دل کشد نالہ کہ تعلد فرقت آسما

خاقانی اسمائے طبع من بکار ح ثنائے اوست — زاں فال سعد زاخترِ آسما برآورم

" محمل نموش، ناقۂ لیلیٰ بہ ترقدم — عرضِ نیاز او بزبانِ جرس کند

اور آخر میں پیچ کر ان الفاظ میں اس قدر وسعت و پہنائی پیدا ہو گئی کہ عاشق اور مجنوں، معشوق اور لیلیٰ مترادف المعنی الفاظ متصور ہونے لگے جیسے "لیلائے من" بمعنی "معشوق من" اور "مجنون تو" بمعنی "عاشق تو"۔

کام جویاں دامنِ معشوق دارند آرزو — ورنہ لیلیٰ[1] دست را خود دامنِ صحرا بس است

موسیٰ ام و راضی بہ تجلی نشوم — مجنونم[2] و خوش بوصل لیلیٰ نشوم

انبیائے بنی اسرائیل کے ہزاروں لاکھوں قصے اور واقعات فارسی شاعری کا "راس المال" ہیں اور یہی وہ واقعات ہیں جنھوں نے فارسی شاعری میں تلمیحات کا ایک گراں مایہ ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ نوح کا طوفان، موسیٰ کا عصا، اسمٰعیل کی قربانی، ادریس کا تدبر، خلیل کی بت شکنی، ایوب کا صبر، سلیمان کا تخت، عیسیٰ کا اعجاز، زکریا کی روپوشی، داؤد کا نغمہ، یوسف کا حسن، یعقوب کا ہجر اور ان کے متعلقات مثلاً یدبیضا، وادیِ ایمن، تجلی طور، چاہِ یوسف، تعمیر کعبہ، گلزار خلیل، حجر اسود، فسانۂ زلیخا، مصر کی عزیزی، پیرہن یوسف، فرعون کی غرقابی اور موسیٰ کی پرورش حقیقت میں یہ تمام باتیں فارسی شاعری کی جان ہیں۔ چند مثالوں سے یہ تمام باتیں اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں گی۔

ہر دم مرا بعیسیٰ تازہ است حاملہ — زاں مژدے چو مریم عذرا برآورم — خاقانی

نہاں خانۂ دماغ میں مضامین جدید موجود ہونے کا اشارہ "عیسیٰ تازہ" سے کیا ہے اور اسی مناسبت سے دوسرے مصرعے میں لفظ "مریم" کا اضافہ کیا ہے۔

---

[1] بمعنی عاشق [2] بمعنی معشوق

زیں روئے چوں کرامت مریمؑ بباغ عمر ۔۔۔ از نخل خشک خوشۂ خرما برآورم (خاقانی)

حضرت "مریمؑ" کو جب دردِ زہ شروع ہوا تو آپ خرما کے ایک خشک درخت کے نیچے تشریف لائیں اور وہیں حضرت عیسیٰؑ کی ولادت ہوئی۔ ان کی برکت سے وہ درخت سرسبز اور ثمردار ہوگیا لیکن شاعر نے یہاں پر "نخل خشک" سے "قلم" اور "خوشۂ خرما" سے اپنا "شیریں کلام" مراد لیا ہے۔

چہ عقلؑ را بدست امانی گرو کنم ۔۔۔ چہ ارّہ بر سر زکریاؑ برآورم

زکریا علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خالو تھے۔ جب ولادت عیسیٰؑ پر یہودی درپے آزار مریمؑ ہوئے تو زکریاؑ نے عیسیٰؑ اور مریمؑ کو یوسف نجار کے ہمراہ مصر پہنچا دیا اور خود مفقود الخبر ہوگئے۔ جب مریمؑ و عیسیٰؑ بیس برس کے بعد واپس آئے تو زکریاؑ بھی آگئے۔ یہودی چونکہ زکریاؑ سے ناراض تھے اس لئے ان کے قتل کا ارادہ کرکے حملہ آور ہوئے۔ زکریاؑ بھاگے۔ مشہور ہے کہ راستے میں ایک درخت تھا۔ اس سے انھوں نے پناہ چاہی۔ درخت پھٹا اور زکریاؑ اس میں داخل ہوگئے اور درخت پھر برابر ہوگیا۔ بعض کہتے ہیں کہ جبا کا گوشہ باہر رہ گیا تھا اور بعض کے نزدیک شیطان نے یہودیوں کو زکریاؑ کا درخت کے اندر ہونا بتایا اور یہودیوں نے جب درخت کو آرے سے چیرا تو اسی کے ساتھ زکریاؑ کے بھی دو ٹکڑے ہوگئے۔

خاقانی نے اس شعر میں "عقل" کا اشارہ "زکریاؑ" سے اور "امانی" کا "کنایہ" آرے سے کیا ہے۔

ہمہ شبہائے غم آبستن روز طرب است ۔۔۔ یوسفؑ روز بچاہ شب یلدا بینند (خاقانی)

حضرت یوسفؑ کو ان کے بھائیوں نے کنویں میں ڈال دیا تھا۔ پھر ایک قافلہ ان کو نکال لے گیا اور وہ عزیزِ مصر ہوگئے لیکن شاعر یہاں پر "یوسف روز" کا کنایہ آفتاب سے کرتا ہے۔

آبائے علوی مرا خصم چوں خلیلؑ ۔۔۔ بانگ ابا ز نسبت آبا برآورم

ابراہیم خلیل اللہؑ کے باپ دادا آپ کی توحید پرستی کے سخت دشمن تھے۔ وہ آپ کو اپنے قدیم طریقوں پر چلانا چاہتے تھے لیکن آپ نے مستقل مزاجی سے ان کے رسوم وغیرہ کے طریقوں کو ٹھکرا دیا اور صاف الفاظ میں اعلان کردیا "واعتزلکم وما تدعون من دون اللہ" (میں تم کو اور ان کو جنھیں تم علاوہ خدا کے پکارتے ہو چھوڑتا ہوں) لیکن شاعر نے اس موقع پر "آبائے علوی" سے استعارہ کیا ہے افلاک

یا سبعہ سیارہ کی طرف کیونکہ ان کی تاثیر اور اربعۂ عناصر (امہاتِ سفلی) کے تاثر سے موالید ثلاثہ وجود میں آتے ہیں۔ مطلب اس شعر کا یہ ہوا کہ جس طرح خلیل اللہ کے "آبا" ان کے دشمن تھے اسی طرح یہ آبائے علوی میرے بھی دشمن ہیں اور جس طرح ابراہیم خلیل اللہ نے اپنے آبا کو چھوڑ دیا تھا اسی طرح میں بھی ان آبائے علوی سے ترکِ تعلق کروں گا۔

خارا چو مار بر شکنم و پس بیک عصا   دہ چشمہ چوں کلیم ز خارا برآورم

"بیک عصا دہ چشمہ" سے اشارہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک معجزے کی طرف جیسا کہ قرآن میں ہے "فقلنا اضرب بعصاک الحجر فانفجرت منه اثنتا عشرة عینا" (پس ہم نے (خدا نے) کہا (موسیٰ) سے کہ تم اپنا عصا پتھر پر مارو، پس ابل پڑے اس پتھر سے بارہ چشمے) لیکن شاعر اس موقعے پر مراد لیتا ہے کہ ترکِ آرائشِ دنیوی کے بعد میں صاحبِ کرامت و اعجاز ہو جاؤں گا۔ سارا مضمون شاعر نے موسیٰ علیہ السلام کے واقعۂ ضربِ عصا سے پیدا کیا ہے۔

اگر آج ان چیزوں کو فارسی شاعری سے علیحدہ کر دیا جائے تو فارسی شاعری کی حیثیت جسمِ بے روح یا گلِ بے رنگ و بو کی سی رہ جائے گی۔ اس کا زیادہ ترنشہ اور صہبائیت صرف ان چیزوں کے اثر و نفوذ اور آمیزش کا رہونِ منت ہے۔ ساری خوشنمائی اور آب و رنگ ان کے امتزاج پر قائم ہے۔ ان کو علیحدہ کرنے کے بعد اس عمارت کی ساری مینا کاری بے آب سی ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اگر نفسِ شاعری سے نظر ہٹالی جائے اور تمام فارسی لٹریچر پر بھی ایک اڑتی ہوئی نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت تارِ نظر کے سامنے آجاتی ہے کہ فارسی علم و ادب کی بنیاد ہی عربی زمین پر قائم ہوتی ہے۔ سینکڑوں تلمیحیں، تمثیلیں، کنائے، تشبیہیں اور استعارے عربی تخیل کے منت کش ہیں۔

اس کے علاوہ مذہبی اعتقادات و تخیلات کے متعلق جس قدر اصطلاحات پائی جاتی ہیں ان سب کا ماخذ عربی ہے مثلاً شرابِ طہور، جہاد، سدرہ، طوبیٰ، معراج، صراط، صورِ اسرافیل، توبہ، تکبیر، نامۂ اعمال، حور و غلمان، حوض و کوثر، جنت، دوزخ، معجزہ، یہ سب مذہبی اصطلاحات و تلمیحات ہیں لیکن اس سدا بہار سرزمین میں پہنچ کر سینکڑوں قسم کی خوشنما شاخیں ان سے پھوٹیں جس طرح اسرائیلی قصص و حکایات فارسی شاعری کی وسیع

دہ بعض عمارت کے لیے بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح عرب کی مذہبی مصطلحات بھی فارسی شاعری کے مرقعے میں رنگ آمیزی اور نقش و نگار کا کام دیتی ہیں۔ فارسی شاعری کے گلدستے کا سارا رنگ انھی چیزوں کے وجود پر قائم ہے۔ ملاحظہ ہو:-

چوں در تنور شرق پزد نان گرم چرخ — آواز روزہ بر ہمہ اعضا بر آورم (خاقانی)

لفظ روزہ کی مناسبت سے شعر مکمل کیا گیا ہے۔

چند از نعیم سبعہٗ الوان چو کافراں — کار جحیم سبعہٗ امعا بر آورم (خاقانی)

دوزخ کے سات طبقات مشہور ہیں اور آنتیں بھی سات ہیں۔ دوزخ ہمیشہ "ہل من مزید" کہتی رہتی ہے اور آنتیں بھی ہر وقت غذا حاصل کرنے کی فکر میں لگی رہتی ہیں۔ انھی طبقات دوزخ کی مناسبت سے اتنا وسیع و عریض مضمون پیدا ہوا۔

ہیچ اکسیر بہ تاثیر محبت نہ رسد — کفر آوردم و در عشق تو ایماں کردم
کفر و ایماں نبود شرط نظیری در عشق — بتو کافر نہ نماید کہ ولایت دارد (نظیری)

ان دونوں شعروں کی بنیاد صرف کفر و ایماں کے الفاظ پر قائم ہے اور ساری خوشنمائی بھی صرف انھیں الفاظ کے پردے میں مضمر ہے۔

در ظاہرم جنابت و در باطن است حیض — آں بہ کہ غسل ہر دو بہ یک جا بر آورم (خاقانی)

دونوں لفظ خاص مذہبی مصطلحات سے ماخوذ ہیں۔ حالانکہ "ناپاکی" کے لفظ سے اس مفہوم کو ادا کیا جا سکتا تھا۔

گر بد عشق بخاک سراندیب ادا کنم — کوثر ز خاک آدم و حوا بر آورم

دوسرے مصرعے میں دریا یا سمندر نہیں کہا بلکہ "کوثر" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ سمندر وغیرہ کہنے سے وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو لفظ "کوثر" کے مفہوم میں پنہاں ہے۔ "کوثر" کے پانی میں مذہبی معتقدات کی بنا پر جو شیرینی و لطافت ہے وہ دریا اور سمندر کے پانی میں نہیں۔ اگر یہ لفظ نہ کہا جاتا تو مفہوم میں اتنی وسعت و خوبی پیدا نہ ہوتی۔

عارف ہمہ اسلام خراب ست وہم از کفر — پروانۂ چراغ حرم و دیر نہ داند

اسلام، کفر، حرم یہ سب مذہبی مصطلحات ہیں اور انہی کے تخیل سے یہ معرکۃ الآرا شعر وجود میں آیا۔

دانم بیقیں، لطف تو بیش از قہر ست — زیرا کہ نعیم ہشت و ہفت ست جحیم (نادرا تبریزی)

"ہشت نعیم" اور "ہفت جحیم" کی مناسبت سے زیادتی لطف بر قہر ثابت کی گئی ہے اور ثبوت کے تمام لوازمات مذہبی معتقدات سے ماخوذ ہیں۔

حور و جنت جلوہ بر زاہد دہد در راہ دوست — اندک اندک عشق بر راہ آورد بیگانہ را

یعنی خشک طبع زاہد معرفت الٰہی کی طرف یوں نہیں مائل ہوتے اس لئے حور و جنت کا لالچ دیا جاتا ہے۔ اس لالچ سے جب وہ ذکر میں مشغول ہو جاتے ہیں تو پھر رفتہ رفتہ جذب الٰہی پیدا ہو جاتا ہے۔ حور و جنت کے الفاظ جو کہ اس شعر کا سرمایہ ہیں خاص مذہبی مصطلحات سے تعلق رکھتے ہیں۔

(باقی آیندہ)

پردہ

کیا کوئی ذی عقل اس بات کو تسلیم کر سکتا ہے کہ مذہب حق جس نے عورت کو غلامی کے درجے سے نکال کر آزادی کے درجے پر پہنچایا اس ظلم و تشدد کو روا رکھ سکتا تھا کہ عورت کو قدرت کی تمام نعمتوں حتیٰ کہ صاف اور تازہ ہوا سے بھی محروم کر کے جس سے جانور تک فائدہ اٹھائیں تنگ و تاریک قید خانوں میں تمام عمر کے واسطے بند کر دیا جائے۔ کلام مجید میں عورتوں کو باہر پھرنے کی اور مثل مردوں کے قدرت کی تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کی اتنی ہی آزادی دی گئی ہے جتنی مردوں کو دی گئی ہے یعنی دونوں کے واسطے باہر پھرنے کے متعلق یکساں الفاظ میں احکام نازل ہوئے ہیں "۲۴ : ۳۰ و ۳۱ قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم ویحفظوا فروجھم ذٰلک ازکیٰ لھم ان اللّٰہ خبیر بما یصنعون ٥ وقل للمؤمنٰت یغضضن من ابصارھن ویحفظن فروجھن ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا ولیضربن بخمرھن علیٰ جیوبھن ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن .... (اے نبی) کہدو ایمان والے مردوں سے کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور اپنے اعضائے جنسی کو چھپائیں، یہ ان کے واسطے پاکی ہے، تحقیق اللہ واقف ہے اس سے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ اور کہدو ایمان والی عورتوں سے کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور اپنے اعضائے جنسی کو چھپائیں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں بجز اس کے جو خود بخود ظاہر ہو اور اوڑھیں اپنا سر جامہ اپنے پستانوں پر اور اپنی زینت کو نہ ظاہر کریں سوائے اپنے شوہروں کے ...." اگر عورت کو مثل مردوں کے باہر پھرنے کی اجازت نہ ہوتی تو اس کے متعلق احتیاط کی ہدایت اس ہدایت کے ساتھ نہ بیان کی جاتی جو مردوں کے متعلق ہے اور نہ انہیں الفاظ میں بیان کی جاتی جن الفاظ میں مردوں کے متعلق بیان کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ نظریں نیچی رکھنے کی ہدایت اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے جبکہ گھر سے باہر نکلنے کی اجازت تسلیم کر لی جائے کیونکہ اپنے گھر میں نظریں نیچی رکھنے کے کوئی معنی نہیں نکلتے اور پھر خاص کر جب مرد اور عورت دونوں کے واسطے نظریں نیچی رکھنے کی ہدایت ہے تو وہ اسی حالت میں مفید ہو سکتی ہے جب

دونوں کی نظریں ملنے کا احتمال ہو اور نظریں ملنے کا احتمال اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب دونوں مکان سے باہر نکلیں یا اور کسی طریقے سے ایک دوسرے کے مقابل ہوں لہٰذا نظریں نیچی رکھنے کی ہدایت خود اس بات کی دلیل ہے کہ مرد اور عورت دونوں کو یکساں طور پر باہر نکلنے کی اجازت ہے۔ اگر عورت کو مثل مردوں کے باہر نکلنے کی اجازت نہ ہوتی تو آگے چل کر جو اس آیت میں ان لوگوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے جن پر عورت اپنی زینت بھی ظاہر کر سکتی ہے جن میں شوہر اور قریبی رشتہ دار اور غلام بھی شامل ہیں اس تفصیل کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس تفصیل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان مفصلہ اشخاص پر عورت اپنی زینت بھی ظاہر کر سکتی ہے اور جن اشخاص کی تفصیل بیان کی گئی ہے وہ وہی لوگ ہیں جو ایک خاندان میں شمار کئے جاتے ہیں اور عام طور پر ایک ہی مکان میں رہتے ہیں۔ اس لئے صاف الفاظ میں اس آیت کا یہ مطلب ہوا کہ عورت اپنے والدین یا شوہر کے گھر میں جہاں اس کے قریب ترین عزیز و اقارب رہتے ہیں اپنی زینت بھی ظاہر کر سکتی ہے لیکن اپنے عزیز و اقارب کے مکان سے باہر بازاروں یا دوست احباب کے مکانوں پر جب جائے تو اپنی نظریں نیچی رکھے اور اپنی زینت کو دانستہ یا ارادتاً ظاہر نہ کرے۔ زینت کے معنی بعض مفسرین نے جسمانی خوبصورتی کے لئے ہیں اور بعض نے زیورات کے لئے ہیں اور اس آیت کے آخری جملے سے بھی زینت کے معنی زیور ہی کے نکلتے ہیں جہاں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ " **ولا یضربن بارجلھن لیعلم ما یخفین من زینتھن** " (اور ان کو اپنے پیر زمین پر اس طرح نہ مارنے چاہئیں جس سے کہ ان کی پوشیدہ زینت ظاہر ہو) یہاں زینت سے وہی زیور مراد ہو سکتا ہے جو پیر مارنے سے بجے مثلاً جھانجیں وغیرہ۔ لہٰذا اگر زینت کے معنی صرف زیور ہی کے لئے جائیں جب بھی یہ مطلب بالکل صاف ہے کہ عورت کو گھر سے باہر نکلنے ہی کی حالت میں اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی زینت کو ارادتاً ظاہر نہ کرے کیونکہ اپنے باپ یا شوہر کے مکان میں جہاں وہ عام طور پر رہتی ہے وہ اپنی زینت بھی ظاہر کر سکتی ہے۔ اگر ہم زینت میں چہرہ بھی شامل کرلیں جیسا کہ بعض مفسرین کرتے ہیں تو اس آیت کے یہ معنی زیادہ قرین قیاس ہوں گے کہ عورت باہر نکلنے کی حالت میں صرف اپنا چہرہ اور ہاتھ پیر کھول سکتی ہے باقی اور جسم کی سجاوٹ کو خواہ وہ زیورات کے ذریعے سے ہو یا کسی اور ذریعے سے دانستہ یا ارادتاً دوسروں پر ظاہر نہ کرے کیونکہ کشمکش حیات اس

بات کی مقتضی ہے کہ انسان اپنا چہرہ اور ہاتھ پیر کھلے رکھے ورنہ اس کو اپنا کام سرانجام دینے میں مشکلات پیش آئیں گی۔ غرضکہ اس آیت پر جس پہلو سے نظر کی جائے عورت کا مثل مرد کے باہر پھرنے کا حق تسلیم کرنا پڑتا ہے اور یہی نہیں کہ محض باہر پھرنے کا حق تسلیم کرنا پڑتا ہے بلکہ چہرہ اور ہاتھ پیر کھول کر جد وجہد زندگی میں اپنے حسب حیثیت حصہ لینے کا حق تسلیم کرنا پڑتا ہے ورنہ اس آیت کی تمام ہدایتیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ خود آنحضرت صلعم نے اس کے متعلق فرمایا " عائشہ قالت دخلت اسماء بنت ابی بکر علیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وعلیہا ثیاب رقاق فاعرض عنہا وقال یا اسماء ان المرأۃ اذا بلغت المحیض لن تصلح ان یری منہا الا ھذا وھذا واشار الی وجہہ وکفیہ" ترجمہ اسماء بنت ابی بکر رسول اللہ صلعم کے پاس آئیں ان پر کپڑا باریک تھا۔ آپ نے ان سے رخ پھیر لیا اور فرمایا اے اسما عورت کو جب ایام ماہواری آنے لگیں یعنی وہ بالغ ہو جائے تو جائز نہیں کہ اس کا بدن دیکھا جائے سوائے اس کے اور اس کے اور اشارہ اپنے منہ اور ہتھیلیوں کی طرف کیا۔ ابوداؤد۔ اس حدیث نے آیۃ مذکورہ بالا کے معنی بالکل صاف کر دئے کہ عورت جب مکان سے باہر نکلے تو اس کا تمام جسم سوائے چہرے اور ہاتھ پیروں کے ایسے کپڑے سے ڈھکا ہونا چاہئے جس سے اس کے بدن کی زیب و زینت ظاہر نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے کلام مجید کی نوعیت ہی کے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے الفاظ پر زیادہ زور دیا اور روح یا جوہر کو پس پشت ڈال دیا۔ کلام مجید نے محض اصول زندگی بتلانے ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ان اصولوں کو سمجھانے کے لئے کچھ احکام عمل بھی پیش کئے تاکہ وہ اصول دیگر مذاہب کے اصول کی طرح محض زینت کتاب ہی نہ رہیں بلکہ عملی طور پر سمجھ میں آجائیں اور یہ لازمی بات تھی کہ جتنے نمونے عمل کے لئے پیش کئے جائیں وہ گرم ریگستانی جزیرہ نمائے عرب کی آج سے چودہ سو برس پہلے کی نیم وحشی قوم کے مقامی حالات، دماغی تصورات اور رسم ورواج کے مطابق ہی ہوں ورنہ وہ ان کے سمجھنے اور ان پر عمل کرنے سے قاصر رہتے۔ دنیا کا کوئی معلم ایک پہلی جماعت کے طالب علم کو جو ابھی ابتدائی تعلیم حاصل کر رہا ہے بی۔ اے کی جماعت کا نصاب کسی صورت سے نہیں سمجھا سکتا لہذا جنسی آزادی کو فطرت کے مطابق مفید بنانے کے لئے شرم وحیا کا اخلاقی اور بنیادی اصول سمجھانے کی غرض سے جو عملی احکام

کلام مجید میں نازل ہوئے وہ گرم ریگستانی جزیرہ نمائے عرب کی مقامی آب وہوا، رسم و رواج اور پوشاک کے اعتبار سے نازل ہوئے اور اس لیے پستان کو سر جامہ سے ڈھکنے کا لفظ استعمال کیا گیا اور زینت کو ارادتاً ظاہر کرنے کی ممانعت کے لئے پیر کو زمین پر مارنے کا لفظ استعمال کیا گیا لیکن یہ الفاظ محض تشبیہی ہیں۔ پستان کے ڈھکنے کے لئے اور بھی بہت سی چیزیں استعمال ہو سکتی ہیں جو جس زمانے اور جس ملک میں وہاں کی آب وہوا اور تہذیب کے مطابق رائج ہوں اور اسی طرح زینت کو ارادتاً ظاہر کرنے کی ممانعت سے صرف زیور کا بجانا ہی مراد نہیں لیا جا سکتا بلکہ وہ تمام مصنوعی جسمانی بناؤ سنگار اور تمام بے حیائی کی حرکات جن سے خواہشات جنسی کو تحریک ہوتی ہو مراد ہیں۔ لہذا اس تمام آیت کے مفہوم پر جب ہم کلام مجید کی تمام خصوصیات، زمانۂ نزول اور جائے نزول کو ملحوظ رکھتے ہوئے غور کریں تو سوائے اس کے اور کوئی مطلب نہیں نکل سکتا کہ عورت کو مثل مرد کے اپنا چہرہ اور ہاتھ پیر کھول کر باہر پھرنے کی عام اجازت ہے اور اپنے ملک کی مروجہ پوشاک پہن کر اور اپنے جسم کی اپنی حیثیت اور ملکی رواج کے مطابق زیب و زینت کر کے زندگی کے ہر جائز کام میں جائز حصہ اپنی لیاقت کے مطابق لے سکتی ہے البتہ اس کو ارادتاً کوئی حرکت اس قسم کی نہ کرنی چاہئے جس سے مرد کی خواہشات جنسی کو تحریک ہوتی ہو جس میں باریک پوشاک بھی شامل ہے۔

کلام مجید سے عورتوں کو مثل مردوں کے باہر پھرنے کی اور کشمکش حیات میں اپنی حسب حیثیت حصہ لینے کی اجازت ثابت کرنے کے بعد اور قول رسول اللہ صلعم سے اس بات کی تائید کرنے کے بعد کہ عورت اپنا چہرہ اور ہاتھ کھول کر اور ایسے کپڑے پہن کر جس میں جسم اندر سے نظر نہ آئے زندگی کے ہر کام میں حصہ لے سکتی ہے۔ اب ہم کلام مجید ہی سے یہ ثابت کریں گے کہ عورتوں کو مکان کے اندر مقید رکھنا ان کی بے عزتی کا مترادف ہے۔ کلام مجید میں یہ حکم نازل ہوا ہے " ۴ : ۱۵ والتی یاتین الفاحشۃ من نسائکم فاستشھدوا علیھن اربعۃ منکم فان شھدوا فامسکوھن فی البیوت حتی یتوفھن الموت اویجعل اللہ لھن سبیلا ۵ " اور تمہاری عورتوں میں سے جو فحش کی مرتکب ہوں ان کے واسطے اپنے درمیان سے چار گواہ لاؤ تب اگر وہ گواہی دیں تو ان عورتوں کو مکان سے باہر نہ نکلنے دو یہاں تک کہ

موت ان کو لے جائے یا اللہ کوئی دوسرا راستہ نکال دے۔" اس آیت کی رو سے عورت کو زناکاری کی پاداش میں چار مسلمانوں کی گواہی پر تمام عمر کے واسطے مکان سے باہر نہ نکلنے دیے جانے کی سزا تجویز کی گئی ہے۔ پس اگر عورت کو عام طور پر باہر نکلنے کی اجازت مثل مردوں کے نہ ہوتی تو اس کو مکان سے باہر نہ نکلنے دیے جانے کی سزا بے معنی ہو جاتی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عورت کو مکان سے باہر نہ نکلنے دینا یا اس کو مثل قیدی کے چاروں طرف سے بند کر کے ایک جیلخانے سے دوسرے جیلخانے میں برقعہ، ڈولی یا کسی اور بند سواری کے اندر لے جانا اس کی فحش جرم کی سزا کا مترادف ہے جو کہ صرف اسی حالت میں دی جا سکتی ہے جبکہ چار مومن اس بات کی گواہی دیں کہ یہ عورت فاحشہ ہے اور چار مسلمانوں کی گواہی کی شرط یہ ثابت کرتی ہے کہ عورت کی باہر پھرنے کی آزادی کو اسلام نے کس قدر قیمتی سمجھا ہے اور دوسرے یہ کہ چار مسلمانوں کی گواہی کی شرط خود اس قدر سخت ہے کہ ۹۹ فی صدی حالتوں میں چار مسلمان گواہوں کا ملنا قریب قریب ناممکن ہے جس سے یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ عورت کا باہر پھرنے کی آزادی کا حق کس قدر مقدس اور قابل قدر ہے کہ ۹۹ فی صدی حالتوں میں اس پر جرم زنا قائم ہو جانے کے بعد بھی اس کو اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔

کلام مجید اور حدیث سے عورتوں کو مثل مردوں کے باہر پھرنے کی عام اجازت اور ان کو اس سے بے وجہ محروم کرنا مردوں کا ظلم اور عورت کی فحش کاری کی سزا کے مترادف ثابت کرنے کے بعد اب ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ مسلمانان سلف میں پردے کا ایسا ہی رواج تھا یا نہیں۔ اس کے متعلق ہم چند تاریخی واقعات نقل کرتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عام ملکی امن کی حالت میں مسلمان عورتوں کو باہر پھرنے کی اتنی ہی آزادی تھی جتنی مردوں کو بلکہ یہاں تک کہ جنگ کے زمانے میں بھی عورتیں لڑائی کے کاموں میں مردوں کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ علامہ ابن خلدون نے اپنی کتاب ثانی جلد چہارم میں جنگ قادسیہ کے حالات بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ "صبح کے وقت بعد نماز فجر سعدؓ نے شہدا کو دفن کرایا اور زخمیوں کو عورتوں کے سپرد کیا۔ وہ ان کی تیمارداری میں مصروف ہوئیں۔" اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ خلیفہ دوئم حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں عورتیں جنگی شفاخانوں میں تیمارداری کا کام کیا کرتی تھیں۔ ہسپانیہ میں بھی جہاں آفتاب اسلام اپنی پوری تیزی کے ساتھ چمک رہا تھا عورتوں کی مثل مردوں کے باہر پھرنے کی مثالیں تاریخ

میں نظر آتی ہیں۔ فاضل ہم عصر الیس۔ خدا بخش اپنی کتاب " اسلامک سولزیشن " جلد اول میں تحریر فرماتے ہیں کہ " قرطبہ کی ایک مسلمان خاتون لبانا خلیفۃ الحاکم کی پرائیویٹ سکریٹری تھیں اور اشبیلیہ کے یعقوب الانصاری کی دختر مریم جامعۂ ہسپانیہ میں فصاحت نظم اور علم ادب کی معلمہ تھیں" جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زمانۂ سابقہ میں مسلمان عورتیں محض باہر ہی نہیں پھرتی تھیں بلکہ علوم و فنون میں بھی مثل مردوں کے کمال حاصل کرتی تھیں اور دوسرے مختلف قومی کاموں میں بھی حصہ لیتی تھیں۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء کے اردو کے " ریویو آف ریلیجنز" میں سید امیر علی مرحوم کی " تاریخ اسلام" کے کچھ اقتباس کا ترجمہ شائع ہوا ہے جو ہم بجنسہ اس مقام پر نقل کئے دیتے ہیں:-

> " عباسیوں کے ماتحت عورتوں کا درجہ قریباً وہی تھا جو امیہ خاندان کے ماتحت رہا۔ دراصل سخت پردے کا موجودہ طریق اس وقت تک رائج نہیں ہوا تھا جب تک کہ قادر باللہ حکمراں نہ ہوا کیونکہ اس بادشاہ کی مرضی یہ تھی کہ مسلمان زیادہ ترقی نہ کریں ورنہ منصور کے زمانے میں ہم پڑھتے ہیں کہ دو شاہی بیگمات جو دراصل اس کی بھتیجیاں تھیں زرہ بکتر پہن کر بازنطین کی لڑائی پر گئیں۔ رشید کے زمانے میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ عرب کی عورتیں گھوڑے پر سوار ہو کر جنگ کے لئے جاتی تھیں اور فوج کی رہنمائی بھی کرتی تھیں۔ مقتدر کی والدہ عدالت اعلیٰ کی صدر تھیں اور وہ نہ صرف درخواستیں سنتیں بلکہ سفیروں اور بیرونی ممالک کے معززین کو شرف باریابی بخشتیں اور متوکل کے زمانے تک عورتیں اپنی علمی اور سیاسی مجالس منعقد کرتی رہیں۔ رشید اور مامون کے عہد حکومت میں عورتیں علم و حکمت میں مردوں کا مقابلہ کرتیں، شعر و شاعری سے شغل رکھتیں اور ہر طرح سے سوسائٹی کی زیب و زینت تھیں۔ ملکہ زبیدہ ایک عالم فاضل عورت تھی اور ایک قابل سخنگو۔ اس نے رشید کو کئی ایک منظوم مکتوب ارسال کئے، اور جو خطوط اس نے مامون کو، اس کے لڑکے امین کی وفات کے بعد لکھے تھے ان سے بھی اس کی قابلیت ترشح ہوتی ہے۔ عبیدہ طنبوریہ جو مامون اور معتصم کے زمانے میں رہتی تھی کتاب " الاغانی"

کا مصنف لکھتا ہے کہ وہ ایک حسین و جمیل عورت تھی جس میں نیکی اور قابلیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کو طنبور بہت اچھا بجانا آتا تھا اور اس لئے اس کا نام طنبوریہ پڑ گیا۔ اس کو شعر بھی کہنے آتے تھے۔ فضل ایک سخن گو اور شاعرہ تھی۔ یہ متوکل کے زمانہ میں ہوئی ہے اور کچھ عرصے تک اس کے محلوں میں رہی ہے۔ متوکل کے انتخاب کے بعد اس نے شادی کر لی اور پھر بغداد ہی میں رہنے لگی۔ اس کی شاعری ہمعصر شاعروں سے مقابلہ کرتی ہے۔ شُہدا جو چھٹے سن ہجری میں ہوئی ہے بغداد میں تاریخ پر لکچر دیا کرتی تھی اور اپنی خوشخطی کے لئے مشہور تھی۔ زینب اُم المؤید مشہور مصنف تھی جو بارھویں صدی عیسوی میں ہوئی ہے۔ اس نے قانون کے علماء اور فضلاء سے اپنی قابلیت کی ڈگریاں حاصل کر لی تھیں اور قانون پڑھانے کے لئے لائسنس بھی لے لیا تھا۔ صلاح الدین کے زمانے میں تقیہ ایک عورت رہتی تھی جو احادیث پر لکچر دیا کرتی تھی۔ یہ بھی ایک نامور شاعرہ تھی۔ امیر اسامہ کے اوراق بتلاتے ہیں کہ عربوں کے عہد حکومت میں عورتوں کا درجہ کیا تھا۔ گیارھویں صدی کے پر آشوب زمانے میں جب مغربی ایشیا کی سیاسی اور معاشرتی حالت انحلال میں تھی عورتیں اپنی بہادری اور جرأت کے لئے شہرۂ آفاق تھیں۔

ان تمام تاریخی واقعات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ زمانۂ سابقہ میں عورت زندگی کے ہر کام میں حصہ لینے کے لئے مرد کی طرح سے قطعاً آزاد تھی اور کوئی پردے کا رواج نہ تھا۔ سید امیر علی مرحوم کے منقولہ بالا اقتباس سے صرف اس قدر واضح ہوتا ہے کہ قادر باللہ کے زمانے میں شاہی حکم سے مسلمانوں میں پردے کا رواج شروع ہوا۔ ممکن ہے قادر باللہ نے پردہ سختی کے ساتھ رائج کیا ہو لیکن جہاں تک فطرت انسانی کا تعلق ہے پردے کے رواج کی ذمہ داری انسان کی خواہش ملکیت و قبضے پر عاید ہوتی ہے۔ انسان میں یہ فطرتی مادہ موجود ہے کہ وہ کمزور چیز پر اپنی ملکیت اور قبضہ جتانے سے خوش ہوتا ہے اور مختلف ممالک میں اس ملکیت اور قبضے کی خواہش کا اظہار مختلف طریقوں سے ہوتا رہا۔ ہندوستان میں کمزور عورت کو خاوند کے مرنے کے بعد زندہ رہنے کے حق سے ہی محروم کر دیا گیا۔ یورپ میں عورت کو شادی کے بعد اپنے مال و متاع

پر بھی اختیار نہیں دیا گیا یہاں تک کہ اس کا نام بھی علیحدہ نہیں رہا بلکہ خاوند کے نام میں محو ہو گیا تاکہ یہ ظاہر ہو کہ وہ اپنے خاوند کی ملکیت ہے۔ چونکہ اسلام میں عورت کے ان حقوق کی تشریح کر دی گئی تھی اس لئے ملکیت اور قبضے کی خواہش پردے کی شکل میں نمودار ہوئی۔ اول اول چند متمول لوگ ہی اپنی عورتوں کو چار دیواری کے اندر مقید رکھ سکتے تھے، غربا کے لئے یہ عام طور پر ممکن نہ تھا کیونکہ وہ بغیر اپنی عورتوں کی امداد کے اپنی روزی پیدا نہیں کر سکتے تھے لیکن رفتہ رفتہ پردہ ایک امارت اور عالی نسبی کی دلیل ہو گئی اور چونکہ ہر انسان میں اپنے آپ کو دوسروں پر بڑا اور عالی نسب ظاہر کرنے کا مادہ ہوتا ہے اس لئے تھوڑے ہی عرصے میں پردہ بالکل عام ہو گیا۔ چنانچہ ہم آج بھی یہ دیکھتے ہیں کہ غربا اور نیچ قوموں میں پردہ عام نہیں ہے لیکن ان میں سے جہاں کوئی دولت مند ہو گیا اس کے یہاں فوراً پردہ شروع ہو جاتا ہے جو اس بات کی ایک نہایت روشن دلیل ہے کہ پردہ دولت مندی کے لوازمات میں سے ایک لازمہ ہے اور جب پردے کے رواج کو اتنا عرصہ گذر گیا کہ وہ ایک بزرگوں کی رسم ہو گئی اور اس کے رواج کے آغاز و اسباب کا دریافت کرنا ناممکن ہو گیا تو اس کے جواز کو ثابت کرنے کے لئے مذہب کی آڑ تلاش کی گئی جو ہر مکروہ رسم کے جواز کے ثابت کرنے کا آسان ترین اور مضبوط ترین ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور چونکہ امہات المومنین کی ایک مثال بھی موجود تھی لہٰذا پردے کو نہایت آسانی کے ساتھ دربار علمائے دین سے منظوری حاصل ہو گئی۔ پیغمبر خدا صلعم کا اپنی ازواج مطہرات کو پردے میں رکھنا یہ ثابت نہیں کرتا کہ آپ نے تمام عورتوں کو پردے میں رہنے کا حکم دے دیا ہے۔ تمام غیر محرم عورتیں آپ کے سامنے آتی تھیں اور آپ سے ہم کلام ہوتی تھیں، غزوات میں آپ کے ساتھ شریک ہوتی تھیں، نماز میں آپ کے ساتھ شریک ہوتی تھیں، زخمیوں کی تیمارداری کرتی تھیں وغیرہ وغیرہ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات کا پردے میں رہنا عام مسلمان عورتوں کے واسطے نمونے کے طور پر پیش نہیں کیا گیا تھا بلکہ جس طرح سے کہ آپؐ کے اور بہت سے افعال ضرورت وقت اور مقامی حالات کے مطابق اپنے فرائض پیغمبری ادا کرنے کے لئے تھے اسی طرح سے ازواجات مطہرات کو پردے میں رکھنا بھی تھا۔ پیغمبر خدا صلعم کی سوانح عمری کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے فرائض پیغمبری ادا کرنے کے لئے جو وسائل اختیار کئے ان میں سے ایک وسیلہ یہ بھی تھا کہ آپؐ نے حتی الوسع کبھی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی دل شکنی

نہیں کی چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کی خواہش اور خوشی کے مطابق آپ نے حضرت عائشہؓ سے ان کی صغرسنی ہی میں نکاح کرلیا اور حضرت عمرؓ کی دل دہی اور تسکین کی خاطر ان کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ سے جو کہ بیوہ ہو گئی تھیں اور جن کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ نے قبول نہیں کیا تھا خود اپنا نکاح کرلیا۔ اسی طرح سے آپؐ نے حضرت عمرؓ کی خواہش اور خوشی کے مطابق ازواج مطہرات کو پردے میں بھی رکھا لیکن آپؐ کے یہ دونوں فعل یعنی حضرت عائشہؓ سے ان کی صغرسنی میں نکاح اور ازواج مطہراتؓ کو پردے میں رکھنا مختص بالزمان تھے جن کی اصلی غرض و غایت صرف عرب کے اس زمانے کے دو سب سے زیادہ سربرآوردہ اور بااثر لوگوں کو اسلام کے ساتھ زیادہ وابستہ کرنا تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ حضرت عمرؓ نے ازواج مطہرات کو پردے میں رکھنے کی کیوں خواہش ظاہر کی اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آپؓ کا رجحان طبیعت تھا کہ جن کو خدا نے امہات المومنین فرمایا اور دیگر عورتوں پر فضیلت دی ان میں اور دوسری تمام عورتوں میں کچھ ظاہری امتیاز بھی ہونا چاہیے لہذا اس فضیلت کے اظہار کے لئے یہ مناسب سمجھا گیا کہ ان پر غیر محرم کی نگاہ نہ پڑنے پائے۔ پس ازواج مطہرات کا پردے میں رکھنا صرف دیگر عورات پر ان کی فضیلت کی بنا پر تھا نہ کہ پردے کو ایک اسلامی شعار بنانے کی غرض سے۔ اگر ایسا ہوتا تو خود آپؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ نکاح کے بعد اپنا گھر کا کام کرنے کے واسطے باہر نہ نکلا کرتیں۔ حضرت فاطمہؓ کا اپنے خانگی کاموں کے لئے باہر نکلنا حتیٰ کہ پانی تک خود ہی بھر کر لانا اس بات کی نہایت مستحکم دلیل ہے کہ پردہ اسلام میں کوئی مذہبی شعار نہیں ہے۔ پیغمبر خدا صلعم نے جس طرح مقتضائے وقت کے لحاظ سے اپنے فرائض پیغمبری ادا کرنے کے لئے ایک وقت میں نو نو اور دس دس بیویاں رکھیں اسی طرح سے ازواج مطہرات کو بھی پردے میں رکھا۔ پس جس طرح سے کہ آپ کا ایک وقت میں نو نو اور دس دس بیویاں رکھنا عام مسلمانوں کے واسطے اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ وہ بھی ایک وقت میں محض اپنی خواہشات نفسانی کی خاطر نو نو اور دس دس بیویاں رکھیں اسی طرح سے آپ کا صحابہ کے اصرار سے امہات المومنین کی عام عورتوں پر فضیلت ظاہر کرنے کے لئے انھیں نگاہ مردم سے پوشیدہ رکھنا عام مسلمانوں کے واسطے اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ وہ بھی اپنی عورتوں کو عام حالات میں بغیر کسی خاص سبب کے پردے میں رکھیں۔ بہرنوع یہ بات اب کسی مزید ثبوت کی محتاج نہیں رہی کہ عام امن و امان

کی حالت میں جیسی کہ آج کل ہمارے ملک میں ہے عورت کے حق آزادی کو بلا وجہ ضبط کرنا احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرنا ہے اور جو چیزیں مذہب حق کے خلاف ہیں وہ قدرتی طور پر انسان کے لئے مضر اور اس کی ترقی میں سدراہ ہوں گی۔ اگر ہم پردے کے تمام مضرت رساں اثرات کا بیان پر ذکر کریں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے اس لئے ہم چند مخصوص اور بیّن نقصانات کے بیان پر اکتفا کریں گے۔

(۱) پردے کا سب سے پہلا نقص یہ ہے کہ غالباً پردہ نشیں عورتیں سو فی صدی تمام عمر بیمار ہی رہتی ہیں۔ وہ جانتی ہی نہیں کہ اعلیٰ قسم کی جسمانی صحت کیا چیز ہے اور اس سے کیسی خوشی حاصل ہوتی ہے جس کے مقابلے میں دوسری تمام خوشیاں ہیچ ہیں اور ان پر یہ کیا وحشیانہ ظلم ہے کہ وہ بیماری اپنے مرض کا علاج تک نہیں کر سکتیں کیونکہ ہمارے ہندوستان میں اسی پردے کی بدولت ابھی لیڈی ڈاکٹر تو اتنی تعداد میں موجود نہیں کہ ہر جگہ اور ہر وقت کم خرچ کے ساتھ میسر آسکیں جن سے عورتیں اپنی بیماری کا مفصل حال بیان کر سکیں اور اپنا جسم دکھا سکیں اور مردوں سے نہ تو۔ وہ اپنا حال بیان کر سکتی ہیں اور نہ ان کو اپنا جسم دکھا سکتی ہیں لہٰذا وہ تمام عمر بیمار ہی رہتی ہیں اور سڑ سڑ کر بسا اوقات تھوڑی ہی عمر میں مرجاتی ہیں۔ کیا اس طرح سے مسلمان اپنی عورتوں کی تمام عمر کی بیماری کا سبب اور بالآخر ان کے قتل عمد کے جرم کے مرتکب نہیں ہو رہے ہیں۔

تازہ اور خوشگوار ہوا جو صحت کے لئے لازمی چیز ہے اور جو قدرت نے امیر غریب چرند و پرند سب کے لئے یکساں بنائی ہے اس سے نہ صرف ہماری عورتیں ہی چوبیس گھنٹے محروم رہتی ہیں بلکہ پردے کے مکانوں میں رہنے کے باعث مردوں اور بچوں کا بھی زیادہ تر وقت انھیں تاریک اور غلیظ جیل خانوں میں گذرتا ہے جہاں دھوپ اور تازہ ہوا بھی جاتے ہوئے شرماتی ہے اور اس کا جو مضرت رساں اثر غیر محسوس طور پر بتدریج ہماری موجودہ اور آئندہ نسلوں کی عمر، قوئے اور صحت پر پڑتا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب ہماری اولادیں کمزور قوئے کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں اور پھر اس پر ان کی پرورش تنگ و تاریک اور غلیظ مکانوں میں اصول حفظان صحت سے ناواقف اور توہم پرست جاہل عورتوں میں ہوتی ہے تو وہ اس زندگی کے دشوار گذار راستے میں کیونکر کامیابی کے ساتھ سفر کرنے کے قابل بن

سکتی ہیں اور کس طرح دیگر اقوام عالم کے مقابلے میں جو ہم سے بدرجہا بہتر حالت میں زندگی بسر کرتی ہیں اور قدرت کی ہر نعمت سے مقابلتاً زیادہ فائدہ اٹھاتی ہیں، اپنی ہستی کو قائم رکھنے کے قابل ہو سکتی ہیں اور کیوں کر اپنے حقوق کی حفاظت کر سکتی ہیں۔

(۲) دوسرا نقص پردے کا یہ ہے کہ مزاج اور طبیعت کے مطابق زن و شوہر کا انتخاب قطعی ناممکن ہے جس کی وجہ سے اکثر حالتوں میں ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی ضرورت پیش آتی ہیں اور دونوں صورتوں میں زن و شوہر کیا بلکہ تمام خاندان کی زندگی ہمیشہ کے لئے تلخ ہو جاتی ہے اور جو شادی کا اصلی مدعا ہوتا ہے یعنی محبت اور خوشی کے ساتھ زندگی بسر کرنا وہ بالکل فوت ہو جاتا ہے اور پھر اس کے جو مضر نتائج نکلتے ہیں ان کا کوئی صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات کس قدر مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ محض معمولی استعمال کی چیزیں تو پسند کر کے لی جائیں لیکن ایک تمام عمر کا رفیق زندگی جس پر تمام آیندہ زندگی کی خوشیوں کا دارومدار ہے زبردستی گلے ڈال دیا جائے۔

(۳) تعلیم نسواں میں جو رکاوٹیں اس پردے کی بدولت پیدا ہوتی ہیں وہ محتاج بیان نہیں اور پھر طبقۂ اناث کی جہالت کا اثر جو بچوں کی نشو و نما اور تعلیم و تربیت پر پڑتا ہے وہ اس قدر افسوس ناک ہے کہ اس پر جس قدر غم کیا جائے تھوڑا ہے۔ نفسیات کا یہ مشہور مسئلہ ہے کہ بچپن میں جو باتیں انسان کے دماغ پر نقش ہو جاتی ہیں اور جو عادتیں قائم ہو جاتی ہیں انھیں سے اس کا کیرکٹر بنتا ہے۔ ہماری خاندانی اور معاشرتی زندگی کی جو اس وقت ابتر حالت ہے اور ہم میں جو قابل نیک اشخاص اور فدائیان قوم و ملت کا فقدان ہے اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ ہماری نشو و نما ناقص ترین حالات میں ہوتی ہے، ہماری جاہل اور توہم پرست عورتیں ہمارے بچوں کے دل میں کسی اخلاقی خوبی کا شوق پیدا نہیں کر سکتیں اور پھر گلیوں کے مکتبوں میں نیم ملاؤں سے تعلیم پا کر تو ان کے دماغ مصنوعی نیکیوں سے ایسے بھر جاتے ہیں کہ ان میں پھر قدرتی نیکیوں کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ لہذا یہ پردہ محض ہماری عورتوں ہی کو تعلیم سے محروم نہیں رکھتا بلکہ ہماری اولاد کو بھی قومی اور معاشرتی زندگی میں کوئی مفید حصہ لینے کے قابل نہیں بننے دیتا۔

(۴) پردے کا اہلی زندگی پر نہایت ہی افسوسناک اثر پڑتا ہے۔ زن و شوہر ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ اپنی اپنی تفریح اور دلبستگی کے ذرائع تلاش کرتے ہیں۔ عورت تو پردے میں قید ہونے کی وجہ سے اسی چہار دیواری کے اندر کسی نہ کسی طرح اپنا دل بہلانے کی کوشش کرتی ہے مگر مرد اس بات پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے مقامات پر جائے جہاں وہ دوسری عورتوں سے اپنی طبیعت بہلا سکے کیونکہ اول تو اس کی منکوحہ عورت ۹۹ فی صدی حالتوں میں اس کی طبیعت کے موافق ہی نہیں ہوتی دوسرے دونوں کے دماغی تصورات اور معیار زندگی میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے اور تیسرے خانگی رسوم زن و شوہر، باپ بیٹا اور بھائی بہن کے درمیان بے تکلفی پیدا کرنے سے مانع ہوتے ہیں یہاں تک کہ زن و شوہر ساتھ ساتھ کھانا بھی نہیں کھا سکتے حتیٰ کہ باتیں بھی نہیں کر سکتے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس پردے کی بدولت مسلمان اہلی زندگی کی نعمتوں اور خوشیوں سے ایسے محروم ہو گئے ہیں کہ ان کو ان نعمتوں اور خوشیوں کا کوئی تصور ہی باقی نہیں رہا۔ زناکاری، شراب خواری اور اسی قسم کی دوسری برائیاں مردوں میں زیادہ تر اسی وجہ سے پھیلتی ہیں کہ اول تو وہ اپنے تنگ اور غلیظ پردے کے مکانوں میں اپنے خالی اوقات میں ٹھہر نہیں سکتے دوسرے اہلی زندگی اپنی قدرتی نعمتوں سے خالی ہونے کے باعث ان کے لئے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی اور تیسرے یہ کہ مکان کے باہر بھی پردے کی وجہ سے زن و شوہر ایک ساتھ تفریح نہیں کر سکتے۔ اگر مرد کے خالی اوقات خاندان کے ممبروں کے ساتھ خواہ مکان کے اندر خواہ مکان کے باہر سیر و تفریح میں بسر ہوں تو مرد و زن دونوں ان تمام برائیوں سے بچ سکتے ہیں جن میں وہ پردے کے باعث مجبوراً پڑ جاتے ہیں۔

(۵) پردہ عورت کی فطرت کے بھی خلاف ہے۔ ہم نے تاریخی واقعات سے اوپر ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں جب عورتیں تعلیم حاصل کرتی تھیں تو ان میں پردے کا کوئی رواج نہ تھا بلکہ وہ بھی قومی زندگی کے ان کاموں میں جن کے لئے وہ موزوں ہوتی تھیں پورا پورا حصہ لیتی تھیں۔ زمانہ قریب کی ترکی اور مصر وغیرہ کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے کہ جب وہاں کی عورتیں تعلیم یافتہ ہو گئیں تو انھوں نے بھی پردے کو ترک کر دیا۔ خود ہمارے ہندوستان میں برادران اہل ہنود کی زمانہ حال

کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ ان کے یہاں بھی عورتوں میں جس قدر تعلیم عام ہوتی جاتی ہے اسی تناسب سے پردہ اٹھتا جاتا ہے یہاں تک کہ مسلمان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ ان میں بھی تعلیم یافتہ عورتوں میں پردے کے خلاف تحریک شروع ہو گئی ہے۔ ان تجربات سے صرف یہی ایک نتیجہ نکل سکتا ہے کہ عورت فطرتاً پردے کو پسند نہیں کرتی بلکہ اس کو مردوں نے پردے پر محض اس وجہ سے مجبور کر رکھا تھا کہ وہ تعلیم یافتہ ہونے کے باعث اپنے فرائض و حقوق سے واقف نہ تھی تعلیم حاصل کرتے ہی وہ اپنے فرائض و حقوق سے واقف ہو گئی لہٰذا اس کی فطرت کے خلاف جو مردوں نے اس پر قیود عاید کر دی تھیں اور جن کو وہ اپنی جہالت کے باعث قبول کئے ہوئے تھی ان کو اس نے فوراً توڑ کر پھینک دیا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ پردہ عورت کی فطرت کے خلاف ہے اور جو چیز فطرت انسانی کے خلاف ہے وہ اس کے لئے مضر ہے اور جو چیز فطرت انسانی کے خلاف یا اس کے لئے مضر ہے وہ اسلام کے خلاف ہے کیونکہ اسلام خود نام ہے "دین الفطرت" کا اور وہ انسان کی فطری خواہشات کو روکنے کے لئے نہیں آیا ہے بلکہ ان کی صحیح رہنمائی کے لئے آیا ہے۔

غرضکہ پردہ پر جس پہلو سے نظر ڈالی جائے اس میں برائیاں ہی برائیاں نظر آتی ہیں۔ فطرت کے خلاف، احکام الٰہی کے خلاف اور منشاء رسول کے خلاف ثابت ہوتا ہے اس لئے اس کو جلد سے جلد ترک کر دینا مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی ترقی کے واسطے لازمی چیز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مرد و عورت کے جنسی تعلقات کی راہ نہایت پر خطر ہے لیکن کیا انسان کی تمام زندگی ہی خطروں سے بھری ہوئی نہیں ہے۔ محض جنسی آزادی کے بے جا استعمال کے مضر نتائج کے خوف کی وجہ سے پردے کی آڑ میں پناہ لینا اور اس کے صحیح استعمال کے بہترین فوائد سے خود کو محروم کر لینا کوئی انسانی صفت نہیں ہے بلکہ انسان کے واسطے ننگ کا باعث ہے۔ زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرنے میں غلطی کرنا ان سے بھاگنے کی غلطی کرنے سے بدرجہا بہتر اور انسان کے شایان شان ہے کیونکہ ان کا مقابلہ ہی کرنے سے ہم میں مقابلے کی طاقت پیدا ہو سکتی ہے اور ان پر کامیابی حاصل کرنے کے ذرائع دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ ان سے بچنے اور بھاگنے کا سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ نہیں کہ ان میں اور اضافہ ہو اور ایک روز وہ ہم پر ایسے

غالب آجائیں کہ ہماری زندگی کا ہی خاتمہ کر دیں لہذا اگر ہمیں حقیقی معنی میں زندہ رہنا ہے تو زندگی کی مشکلات کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے اور ان پر فتح حاصل کر کے اپنی ترقی کی راہ کو صاف کرنا چاہیے۔

ورنہ یوں تو جس قدر عمدہ اور مفید چیزیں دنیا میں موجود ہیں اور روز بروز دریافت ہوتی جاتی ہیں ان کا اگر بیجا طور پر استعمال کیا جائے تو وہ بجائے مفید ہونے کے نہایت مضر اور خطرناک بن جاتی ہیں۔ گیس اور بجلی ہی کو لے لیجئے اگر ان کا بیجا استعمال کیا جائے تو آناً فاناً نسل انسانی کو تباہ کر دیں لیکن کیا انسان نے محض ان کے بے جا استعمال کے مضر نتائج کے خوف کی وجہ سے ان سے فائدہ اٹھانا چھوڑ دیا ہے۔ پھر جب ایسی مہلک چیزوں سے جن کا بے جا استعمال لاکھوں انسانوں کو چشم زدن میں ہلاک کر سکتا ہے۔ انسان نے فائدہ اٹھانا نہیں چھوڑا بلکہ ان کے مضر نتائج کا مقابلہ کرتے کرتے بالآخر ان کو مسدود اور محدود کرنے کے ذرائع دریافت کر لئے اور ان پر غلبہ حاصل کر لیا تو پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جنسی آزادی کے بیجا استعمال کے مضر نتائج کا مقابلہ کر کے اور ان کو مسدود اور محدود کرنے کے ذرائع دریافت کر کے ان سے گیس اور بجلی کی طرح فائدہ اٹھانے کی بجائے مسلمانوں نے کیوں ایسی مکروہ چیز کی پناہ لے رکھی ہے جس میں سوائے نقصانات کے اور کوئی فائدہ نہیں اور جو مزید برآں اس ایک خطرے سے بھی پورے طور پر محفوظ رکھنے کے قابل نہیں ہے جس سے بچنے کے لئے بہترین فوائد کی قربانی کر کے اس کی پناہ لی جاتی ہے۔

ان حالات کی موجودگی میں کوئی سنجیدہ اور غیر متعصب مسلمان اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ جنسی آزادی کے بہترین فوائد حاصل کرنے کے لئے اس کے بعض مضر نتائج کا مقابلہ کرنا اور ان پر فتح حاصل کرنا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ ان سے روپوش ہو کر پردے کی آڑ پکڑنا اور اپنی قومی زندگی کو مجروح کرنا البتہ اس آزادی کے بیجا استعمال کے جو مضر نتائج ہو سکتے ہیں ان سے تحفظ کا انتظام کرنا چاہیے جس طرح بجلی کی روشنی سے لوگ تاریک مقامات میں کام کرتے ہیں ٹریم کار اور دیگر مشینیں اس کے ذریعے سے چلائی جاتی ہیں اور بہت سے دوسرے مفید کام اس کے ذریعے سے لئے جاتے ہیں لیکن اس کے ہر استعمال میں اس کے مضر نتائج کے اثرات سے بچنے کا پیشگی انتظام کر لیا جاتا ہے۔ اسی طرح

سے جنسی آزادی سے بھی اس کے قدرتی فائدے اٹھائے جا سکتے ہیں اور اس کے بیجا استعمال کے مضر نتائج سے محفوظ رہنے کا انتظام بھی کیا جا سکتا ہے۔

حامیان پردہ اپنے خیالات کی تائید میں سب سے بڑی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ جنسی آزادی سے فحش اور حرام کاری بڑھ جاتی ہے اور اس کی مثال میں یورپ اور امریکہ کی اقوام کی حالت پیش کرتے ہیں کہ چونکہ ان قوموں میں جنسی آزادی ہے اس لئے ان میں فحش اور حرام کاری کی کثرت ہے۔ ہمارے دوستوں نے کبھی اس بات پر غور کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی کہ آیا مذکورہ بالا اقوام میں فحش اور حرام کاری کی کثرت جنسی آزادی کے باعث ہے یا ان کا کوئی اور سبب ہے۔ حامیان پردہ کا یہ استدلال محض قیاسی ہے۔ خود یورپ اور امریکہ کے مشہور ترین ڈاکٹر اطلبی اور ماہرین نفسیات جنھوں نے اپنی تمام عمر فحش اور حرام کاری کے اسباب کی تحقیقات میں بسر کی ہے سب اس بات پر متفق ہیں کہ فحش اور حرام کاری کا سب سے بڑا سبب شراب ہے کیونکہ اس کو پی کر انسان کا دماغ نیک و بد کی تمیز کرنے کے قابل نہیں رہتا اور اس لئے شراب خور نشے کی حالت میں وہ کام کر گذرتا ہے جس کو وہ صحیح حالت میں کبھی نہیں کرتا اور محض یہی نہیں بلکہ تندرستی کو بھی سب سے زیادہ خراب کرنے والی چیز بھی شراب ہی ہے۔ بایں ہمہ مسلمانوں کو جہاں تک ان کا اپنی ذات سے تعلق ہے اس دشمن انسان شراب سے اتنا خوف نہیں ہے کیونکہ ان کے یہاں یہ مذہباً حرام ہے تاہم کسی چیز کے مذہباً حرام ہو جانے سے وہ اس سے بالکل بے خوف نہیں رہ سکتے اوّل اس لئے کہ بہت سے مسلمان بھی اس کو استعمال کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں دوسرے اس لئے کہ ایک مسلمان کا بحیثیت مسلمان ہونے کے یہ بھی ایک فرض ہے کہ وہ کل نسل انسانی کو ان برائیوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے جو اس کی نسلی بہبودی میں سد راہ ہیں لہذا جنسی آزادی کے مضر نتائج کے انسداد اور نیز نسل انسانی کو ہلاکت سے بچانے کے لئے ہر سچے مسلمان اور محب انسان کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ شراب کا کم از کم ہندوستان میں بننا اور دیگر ممالک سے منگانا قطعی طور پر بند کرانے کی کوشش کرے۔

دوسرا سبب فحش اور زنا کاری کا ناواقفیت ہے۔ ہندوستان تو خیر ابھی تعلیم میں بہت پیچھے ہے خود یورپ اور امریکہ وغیرہ میں جہاں تعلیم بالکل عام ہے لوگ عام طور پر اعضائے جنسی اور تعلقات جنسی کے

متعلق قطعی ناواقف ہیں۔ کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ مدرسوں میں طلبا کو حفظانِ صحت کے متعلق انسان کے تمام اعضائے جسمانی کی ساخت، ان کے افعال، ان کی بیماریاں، ان کے جا و بے جا استعمال کے فوائد نقصانات غرضیکہ ہر قسم کی تشریح بتائی جاتی ہے مگر وہ اعضائے انسانی جن کو بنانے میں خدا کو شرم نہ معلوم معلوم ہوئی اور جن پر اس نے بقائے نسل جیسی اہم چیز کا انحصار رکھا ان کا نام انسان نے جنسی شرم گاہیں رکھا ہے اور ان کے متعلق طلبا کو اسی قسم کی تفصیلی معلومات بہم پہنچانا جیسی دیگر اعضائے انسانی کے متعلق پہنچائی جاتی ہیں محض غیر ضروری ہی نہیں سمجھا بلکہ ان کو نجس اور گناہ آلود چیزیں خیال کر کے ان کا بیان تو کیا ان کا نام لینا بھی گندگی، فحش اور اخلاقی جرم تصور کر لیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے نوجوان چونکہ اعضائے جنسی اور تعلقات جنسی کے متعلق کوئی صحیح معلومات نہیں رکھتے اس لئے وہ قدرتی طور پر ان کا بے جا استعمال شروع کرتے ہیں۔ لہذا جنسی آزادی کے بے جا استعمال کے خطرات سے بچنے کا دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ ہمارے مدرسوں میں اول تو حفظانِ صحت کے مضمون ہی کو زیادہ اہمیت دینی چاہیے اور اعضائے جنسی اور تعلقات جنسی کے صحیح اور جائز استعمال پر تو اس قدر زیادہ زور دینا چاہیے کہ جو طلبا معیارِ اخلاق پر پورے نہ اتریں ان کو نہ تو کامیابی کی سند مل سکے اور نہ قومی اور سرکاری ملازمتیں مل سکیں اور نہ وہ سماج میں عزت کی نظر سے دیکھے جائیں۔ خدا نے جتنی چیزیں بنائی ہیں وہ سب پاک ہیں۔ ہم خدا کے متعلق کبھی یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ وہ کوئی نجس یا ناپاک چیز پیدا کرے گا۔ اور جتنی چیزیں خدا نے بنائی ہیں اگر ان کا صحیح اور مناسب استعمال کیا جائے تو وہ انسانی ترقی، خدا کی خوشنودی اور مقصدِ آفرینش کی تکمیل کا باعث ہوتی ہیں مگر یہ انسان ہی ہے جو خدا کی بخشی ہوئی مقدس نعمتوں کو ان کا غلط اور بے جا استعمال کر کے نجس بنا دیتا ہے اور پھر وہ بجائے رحمت کے اس کے لئے زحمت بن جاتی ہیں اور برکت سے لعنت بن جاتی ہیں۔ لہذا اعضائے جنسی بجائے خود کوئی نجس یا گناہ آلود چیزیں نہیں ہیں وہ بھی مثل دیگر اعضائے انسانی کے اعضا ہیں اور عمل تعلقات جنسی کی خواہش بھی کوئی نجس یا گناہ آلود خواہش نہیں ہے وہ بھی بھوک پیاس نیند اور دیگر فطری خواہشات کی طرح ایک فطری خواہش ہے جس کا پورا کرنا انسان کا فرض ہے مگر جس طرح سے وقت بے وقت کھانے، ضرورت سے کم یا زیادہ کھانے، دیر ہضم اور مصنوعی

غذائیں کھانے شرابیں وغیرہ پینے یا اور دوسرے طریقوں سے ان خواہشات یا دیگر اعضائے انسانی اور خواہشات فطری کا بے جا اور غلط استعمال کرنے سے انسان کی تندرستی اور اخلاق خراب ہو جاتے ہیں اور وہ انسانی ترقی اور نسلی بہبودی کے لئے مضر ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے اعضائے جنسی اور عملی تعلقات جنسی کے بھی غلط اور بے جا استعمال سے نہ صرف انسان کی جسمانی تندرستی اور اخلاق ہی خراب ہوتے ہیں بلکہ اس کا انسانی اجتماعی ترقی اور نسلی بہبودی پر بھی ناقابل تلافی مضر اثر پڑتا ہے۔ بہرحال اگر دیگر اعضائے انسانی کے متعلق تفصیلی تعلیم کا یہ منشا ہے کہ انسان ان کا صحیح اور مناسب استعمال کرے اور اگر حقیقت میں یہ تعلیم کچھ مؤثر ہوتی ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اعضائے جنسی اور تعلقات جنسی کے متعلق تفصیلی تعلیم ویسی ہی مؤثر نہ ہو۔ یہ کوئی ہمارا قیاسی استدلال نہیں ہے بلکہ روزمرہ کا مشاہدہ اور تاریخی تجربہ ہے۔

تعلیم اس دنیا میں ایسی چیز ہے کہ وہ انسان کو جیسا چاہو بنا سکتی ہے۔ ہمارے بچوں کو عورت کی عزت و تکریم کی تعلیم ہی نہیں دی جاتی بلکہ برعکس اس کے اس پر ظلم و تشدد کرنا اور اس کو اپنے سے کمتر سمجھنا سکھایا جاتا ہے۔ اگر ایک ہندو بچپن کی تعلیم کے اثر سے بڑا ہو کر بھی گائے کو ایک مقدس ہستی سمجھ سکتا ہے اور اس کی حفاظت کے لئے انسانی خونریزی کر سکتا ہے، اگر ایک عیسائی بچپن میں صلیب کی عزت کرنا سیکھ کر اس کی محبت میں اپنی جان تک قربان کر سکتا ہے، اور اگر ایک مسلمان لڑکپن کے زمانے میں مزار یا تعزیے کی تحریم و تکریم کی تعلیم حاصل کر کے اس کی بے حرمتی کرنے والوں کا خون بہانا ثواب سمجھ سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اگر ہم اپنے بچوں کو بچپن ہی سے عورت کی عزت کرنے کی اور اس کی عصمت کی حفاظت کرنے کی کم از کم ایسی ہی تعلیم دیں تو وہ جوان ہو کر اس کا ویسا ہی احترام اور اس کی عصمت کی ویسی ہی حفاظت نہ کریں جیسی دوسری چیزوں کی جنہیں وہ مقدس سمجھتے ہیں کرتے ہیں۔

تیسرا سبب ان معاشرتی برائیوں کا یہ ہے کہ عورت نے اتنے عرصے تک اپنے آپ کو مرد سے علیحدہ رکھا ہے کہ جب کبھی دونوں ایک دوسرے سے اتفاقیہ مل جاتے ہیں تو ان کی جنسی خواہش بھڑک اٹھتی ہے۔ اگر دونوں فرقوں کی تعلیم ایک خاص عمر تک ایک ہی جگہ ہو تو روزمرہ کے آزادانہ طور پر ملنے جلنے سے جذبات جنسی کی تحریک خود بخود کم ہو جائے گی اور یہ نفسیات کا بالکل کھلا ہوا مسئلہ ہے

جس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں۔

چوتھا سبب ان فواحش کا ہماری مصنوعی غذائیں ہیں۔ نہایت مرغن اور مقوی اور مسالے دار غذائیں اور بکثرت گوشت کھانے سے انسان میں عملی تعلقات جنسی کی خواہش بہت زیادہ مشتعل ہوتی ہے اور یہی نہیں بلکہ معدہ بھی خراب ہوتا ہے اور سینکڑوں قسم کے امراض اور کمزوریاں پیدا ہوجاتی ہیں لہذا ہم کو محض ان معاشرتی برائیوں سے بچنے ہی کے لئے نہیں بلکہ عام تندرستی بھی قائم رکھنے کے لئے اپنی قومی غذا میں مناسب تبدیلی کرنی چاہیئے اور ہندوستان کے ماہرین طب کی ایک مجلس کے ذریعے سے ایک ہندوستانی قومی غذا ایسی مقرر کرنی چاہیئے جو انسان کے واسطے قدرتی طور پر سب سے زیادہ مفید ہو اور ویسے بھی ہر تعلیم یافتہ انسان اس بات کو جانتا ہے کہ قدرتی اور سادہ غذا انسان کے واسطے بہترین غذا ہے لیکن تاوقتیکہ اس پر ماہرین طب کی مہر ثبت نہ ہو اور اس کو ایک قومی غذا کی حیثیت نہ دی جائے اس کی ترویج بہت دشوار ہے۔

بہر حال جو لوگ احکام الٰہی اور فرمان رسول کے خلاف پردے کو اسلامی تعلیم بتلاتے ہیں اور اس کی حمایت اس بنا پر کرتے ہیں کہ وہ فحش اور حرام کاری سے محفوظ رکھتا ہے تو ان کی تسلی کے لئے مذکورۂ بالا دلائل کافی ہیں مگر اب سوال یہ ہے کہ موجودہ حالت میں پردے کی رسم کس طرح بند کی جائے اور عورت کو اس کا اسلامی اور انسانی حق جو صدہا سال سے مسلمان مردوں نے غصب کر رکھا ہے کس طرح واپس دیا جائے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ آج ہی اس طبقے کو غیر مشروط طور پر مثل مردوں کے باہر پھرنے کی اجازت دے دی جائے۔ موجودہ صورت میں جبکہ عورت خود اپنی اور ہماری نگاہوں میں بھیڑ بکری سے زیادہ نہیں ہے اور جبکہ صدیوں تک تنگ و تاریک قید خانوں میں مرد کی غلامی کرتے کرتے اس کے ذہن سے آزادی اور مساوات کا تصور ہی محو ہوگیا ہے اس کو یک بیک مکمل آزادی دے دینا ایک خوفناک انقلاب پیدا کر دے گا جو سماج کے واسطے نہایت مضر ثابت ہوگا۔ تمام قومی اور ملکی اصلاحیں بتدریج عمل میں آتی ہیں۔ لہذا اس کی بہترین صورت یہ ہوسکتی ہے کہ جس وقت تک عورت مناسب طور پر تعلیم یافتہ ہو اور ہماری اولاد میں بچپن کی تعلیم سے عورت کو ایک مقدس ہستی

تصور کرنے کے قابل ہوں اس وقت تک وہ صرف اپنے کسی ایسے عزیز یا رشتہ دار کے ساتھ باہر جا سکتی ہے جس کے ساتھ اس کا نکاح ناجائز ہے۔ اور یہ تجویز بھی ہم اپنی طرف سے پیش نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ آج سے چودہ سو برس پہلے اس مقدس ہستی نے فرمایا تھا جس کا خطاب "رحمت للعلمین" ہے "لا یخلون رجل بامرأة الا ومعها ذو محرمة فقام رجل (ترجمہ: کوئی مرد تنہائی میں کسی عورت کے پاس نہ رہے سوائے اس حالت کے جبکہ اس کا خاوند یا کوئی اور رشتہ دار جس کے ساتھ نکاح جائز نہ ہو اس کے پاس ہو۔" السنۃ النسائی۔

غزل

بر در دوست جبہ سا گشتم — خاک پا گشتہ بے بہا گشتم
خاک گشتم براہ او صد شکر — در خور تاج نقش پا گشتم
در نگاہش تبسمے دیدم — در پئے عرض مدعا گشتم
آتش عشق کرد رسوایم — خاک گردیدہ کیمیا گشتم
من بریدم ز ننگ و نام و نسب — چوں بعشق تو مبتلا گشتم
آہ مجنوں کشید و من با او — در او دیدہ ہمنوا گشتم
بود شاہی بفقر ہائے عبث — در پئے سایۂ ہما گشتم
ذکر عشق و جنوں خود کردم — وائے بر من کہ خودستا گشتم

شوخیِ نقش پائے او شیوا
دیدہ فارغ ز رہنما گشتم

ناول کیا ہے؟

ناول کا لفظ جس کثرت سے مختلف قسم کے قصوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اس پر نظر رکھتے ہوئے اس کے حدود کو متعین کرنا اور پھر اس کی کوئی جامع تعریف کرنا آسان نہیں۔ حسن و عشق کے قصے ڈاکوؤں کی حکایتیں، جعل سازیاں، زمانے بھر کی وارادات و روایات سے لے کر نصیحت کے کرن پھول بھی ناول ہی کے حدود میں رکھے جاتے ہیں۔ ناول کی متعدد تعریفیں کی گئی ہیں جن میں سے بغرض وضاحت یہاں تحریر کی جاتی ہیں۔

"Marion Crawford" نے ناول کی تعریف یوں کی ہے "یہ ایک جیبی تھیٹر ہے جس کے پردے، ساز و جملہ لوازمات اسی میں بند ہیں"

والٹر بلینٹ لکھتا ہے:

"ناول کی وسعت خود ذات انسانی سے کم نہیں۔ ناول نگار عورتوں اور مردوں کا مطالعہ عمیق نظروں سے کرتا ہے۔ اس کا تعلق ان کے افعال، ان کے خیالات اور خامیوں، ان کی عظمت و بلندی، غرض ان کی مکمل ذات سے ہے۔ دنیا کے بے شمار حسین اشکال اپنی متلون مزاجی، خوف یا احساسات یا غلبے سے قلب انسانی پر تموج برپا رکھتے ہیں۔ یہ سب ناول کے موضوع ہیں۔ مختصر یہ کہ اس کا موضوع خود انسان ہے۔"

بعضوں کے نزدیک صرف کسی قصے کا کسی طریقے سے بھی اظہار کر دینا ہی ناول ہے بعض کردار کی ارتقائی ترقی یا ان کی انفرادی ہستی کی بلند یا نمایاں شخصیت کو ناول کی بلندی تر کا ذریعہ خیال کرتے

اس مضمون میں دیگر ناول نگاروں کے خیال کے علاوہ اکثر پریسٹلے ہی کے خیالات سے استفادہ حاصل کیا گیا ہے۔ (حامد)

ہیں لیکن یہ سب ناول کو سمجھنے اور غور کرنے کے لئے مختلف زاویۂ نگاہ ہیں نہ کہ مکمل طور پر ناول کی تعریفیں۔

بقول پریسٹلے "ناول کی جو کچھ تعریف میں پیش کر سکتا ہوں وہ یہ کہ ایک قصہ جو نثر میں بیان کیا گیا ہو اور اس میں خصوصیت کے ساتھ خیالی کرداروں اور خیالی واقعات سے بحث کی گئی ہو ناول ہے"

اس میں شک نہیں کہ بہت سے ناول ایسے ہیں جن کے کردار تاریخی ہیں مثلاً عزیز ورجینا، جعفر عباسیہ یا شرر کے دوسرے ناول لیکن یہ واضح رہے کہ ان میں بہت کچھ قصوں کی حکایتیں بیان ہوئی ہیں نہ کہ اصل حقیقتیں۔ یہ ضرور ہے کہ کتاب کے کل اثرات ذہن انسانی کو انھیں تاریخی واقعات کی طرف لے جاتے ہیں جو کسی زمانے میں رونما ہوئے تھے۔ لیکن یہاں نتائج سے تو بحث نہیں۔ کون کہتا ہے کہ شاعرانہ صداقت یا ناول نگار کی صداقت مہمل ہے۔ غرض تو صرف اس قدر ہے کہ یہاں بھی واقعات سے زیادہ قصوں پر زور دیا گیا ہے۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ بعض تاریخی ادبیات میں بھی تخیل کا وہ زور موجود ہے کہ ان تاریخی کتابوں اور تخیلی نثر میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن کیا ضروری ہے کہ ان دونوں میں ایک حدِ فاصل کھینچی جائے جب ان دونوں کا بین فرق صاف ظاہر رہتا ہے۔

پریسٹلے کی اس تعریف سے ابھی قصے کا مفہوم صاف نہیں ہوا لیکن وہ اس کی وضاحت یوں کرتا ہے کہ "خود لفظ قصہ اس قدر جامع ہے کہ اس کے حدود کا انحصار مشکل ہے۔ قصے کو اتنے مختلف نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ طبیعت الجھ جاتی ہے۔ بعضوں کے نزدیک قصہ حیات انسانی کا آئینہ ہے بعضوں کے خیال میں یہ ان کے اطوار کا مظہر۔ بعض اس کو بھی کردار کا اسٹیج خیال کرتے ہیں اور بعض اس کو فلسفۂ حیات کے معلوم کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ کبھی قصے یا ناول کو اس لئے بھی پڑھا جاتا ہے کہ خود ناول نویس کی ذات کو سمجھا جائے۔" نقادوں کی ان مختلف آراء پر غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکثر ایک خیال کو دوسرے پر ترجیح دے کر دوسری حقیقتوں کا خون کر دیتے ہیں۔ انگریز ناول نویسوں نے صرف کردار یا کیرکٹر کی شخصیت اور اس کے نمو پر ناول کا دارومدار رکھا ہے۔ ڈکنس اس لئے بہتر ہے کہ اس نے سینکڑوں نئی شخصیتیں اپنے ناول میں پیدا کر دیں۔ اس لئے انگریزی نقادوں کا خیال ہے

کہ اگر صرف ایک معیار رکھا جاوے جس پر تمام ناول جانچے جاسکیں تو صرف کردار نگاری کی خوبی یا برائی پر منحصر ہوگا کیونکہ کوئی ناول ان کے نقطۂ نظر کے مطابق اچھا نہیں ہو سکتا جب تک اس میں کردار نگاری کے جوہر نہ دکھائے گئے ہوں"۔

لیکن اردو ناولوں کے جانچنے کے لئے ہر معیار کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان میں روحانیت کے عناصر زیادہ تھے اور وہ اخلاق و پند پر ناول کا دارومدار سمجھتے تھے، پھر وہ دن بھی ہندوستان میں گذرے ہیں کہ اپنی معشوقہ کو خوش کرنے کے لئے یہاں کے ادیبوں نے طلسم ہوش ربا کے جواب میں بوستان خیال کی سی کتابیں لکھ ڈالیں۔ پھر اردو نے جب فارسی و عربی سے فیض حاصل کیا تو انھیں کے تمثیلی قصوں کو شمع ہدایت بنایا۔ اور الف لیلیٰ کے ترجمے ہوئے۔ انگریزوں کی حکومت آئی اور مغربی خیالات کے اثرات ادب پر پڑے تو مغربی ناول نویسوں کے معیار پر ناول لکھے گئے۔ جب ادب نے اس مختصر زمانے میں اس قدر پلٹے کھائے ہوں وہاں ناول کو صرف مغربی معیارِ کردار نگاری پر جانچنا کس قدر فاش غلطی ہے۔

اس لئے پرسیٹلے کہتا ہے کہ "میں تخیل کی جولانی پر کل قصوں کو جانچنے کے لئے تیار ہوں کیونکہ ہر زمانے میں اس کی ہمہ گیری زمانے کے مطابق رہی ہے اور آج بھی کردار نگاری اسی تخیل کا نتیجہ ہے۔ ناول کے مفہوم کو سمجھنے میں اکثر نقادوں سے جو غلطی ہوئی ہے وہ یہ کہ وہ ناول نگاری کو بھی سائنس کے اصولوں سے جانچنا چاہتے ہیں۔ آج طبیعیات کے بہت سے نظریے غلط ثابت ہو گئے لیکن فیلڈ نگ کے ناول، طلسم ہوش ربا اور میرامن کی باغ و بہار قابل ترک نہیں۔ آج شرر کا طرز بیان زیادہ مقبول نہیں۔ ان کے تاریخی ناولوں کی یہ صورت موجودہ زمانے کو زیادہ مرغوب نہیں لیکن آج بھی فیلڈ نگ، امن و شرر ہم میں زندہ ہیں۔ ہم ان کے ناولوں یا قصوں کو پڑھتے ہیں اور حظ حاصل کرتے ہیں۔ کیا یہ لوگ صرف اس لئے بھلا دینے کے قابل ہیں کہ انھوں نے کردار نگاری پر زیادہ زور نہیں دیا۔ کون جانتا ہے کہ ایک زمانہ وہ بھی آجاوے کہ اردو میں بھی اوسکر والڈ کے مقلد آواز بلند پکاریں کہ ناول صرف انبساط قلب کے لئے ہے اور اس کا کوئی معیار نہیں۔ آج بھی اس کے اشارات

مل رہے ہیں۔ اس کی آوازیں فضا میں پھیلتی معلوم ہوتی ہیں لیکن خاموشی سے اور کبھی کبھی اگر آج یہ اپنے ناول نویس اسی طرح خارج کئے گئے ہوتے یا کئے جاویں تو صرف وہی حضرات باقی رہ جائیں گے جو زمانے کے مقلد ہیں اور اسی کی راہ پر چل رہے ہیں یا جن کی کتابیں پریس سے ابھی نکلی ہیں حالانکہ قصے کی ہمہ گیری تو یہ ہے کہ وہ زمانے کے ساتھ ساتھ عمل داریوں کی عمل داریاں فتح کرتا چلا جاتا ہے۔ ہاں ایک مخصوص ناول نویس اس طرح ترقی نہیں کرتا اس کے لئے عروج بھی ہے اور زوال بھی۔ یہاں ایک دوسری غلطی کا تدارک بھی کردینا ضروری ہے۔ بعضوں نے سمجھ لیا ہے کہ ناول کو ہمیشہ اس کے اصولوں سے جانچنا چاہئے نہ کہ نتائج سے لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ کسی کام کو نتائج سے الگ جانچا نہیں جاسکتا۔ اخلاقیات کا عام مسئلہ ہے کہ نیت اور اعمال یعنی Motive اور Consequence) دونوں کو دیکھنا ضروری ہے۔

اس طرح ناول ایک وسیع نام ہے جو اگرچہ انگریزی ادب کے ساتھ اردو میں آیا لیکن خود انگریزی میں ہر قسم کے قصوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اس لئے یہاں بھی اس کی ہمہ گیری کو محدود کرنا غلطی ہے۔ ناول کے جانچنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی بلندی تخیل کو اس کا معیار بنایا جائے اور کسی غیر جزوی تعریف کی بنا پر کسی ناول نگار کے چیتھڑے نہ اڑائے جائیں۔

ناول کو کسی محدود معنی میں استعمال کرنا غلطی ہے۔ اس کی قلمرو بھی اسی قدر وسیع ہے جتنا خیال کا۔ اگر ایک شخص ناول کو کسی خاص اصول کے تحت دیکھتا ہے تو حقیقتاً وہ اپنے نقطۂ نظر سے اس کو سمجھنا چاہتا ہے نہ کہ اصل ناول کے مفہوم سے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ خود ناول کی وسعت میں ایسے ذاتی نقطۂ نظر سے کمی پیدا نہیں ہوسکتی۔

نظیر

آپ کا نام ولی محمد اور نظیر تخلص ہے۔ آپ محمد فاروق کے بیٹے تھے۔ دہلی میں ۱۷۲۹ء میں پیدا ہوئے تقریباً اس زمانے میں جب نادر شاہ دہلی پر حملہ آور ہوا۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت آپ اپنی ماں اور نانی کو لے کر آگرہ چلے گئے اور محلہ تاج گنج میں جو تاج محل کے نزدیک ہی واقع ہے آباد ہو گئے۔ آپ کی شادی محمد رحمٰن کی لڑکی مسماۃ تہور بیگم کے ساتھ ہوئی جس کے بطن سے ایک لڑکا خلیفہ گلزار علی اور ایک لڑکی امامی بیگم پیدا ہوئے۔ آپ کی فارسی استعداد معمولی تھی اور کسی قدر عربی سے بھی آپ واقف تھے، فن خوش نویسی بھی جانتے تھے۔ آپ فقیر منش اور آزاد طبع تھے، دنیاوی جاہ و دولت کی مطلق خواہش نہ تھی۔ نواب سعادت علی خاں والی اودھ نے آپ کو لکھنؤ طلب کیا مگر آپ نہیں گئے، اسی طرح بھرت پور بھی جانے سے انکار کر دیا۔ اوائل عمر میں متھرا گئے اور وہاں معلمی کی نوکری کر لی مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد اکبر آباد واپس آ گئے۔ یہاں آ کر آپ نے لالہ بلاس رام کے لڑکے کو پڑھانا شروع کیا اور آپ کی تنخواہ ۱۷ روپے ماہوار مقرر ہو گئی۔

آخر عمر میں فالج گرا اور اسی مرض میں بہت کبر سنی کی حالت میں ۱۶ اگست ۱۸۳۰ء کو انتقال فرمایا۔ ایک شاگرد نے آپ کی تاریخ وفات اس مصرعے سے نکالی ہے ع ”مخمس بے سر و پا، بیت بے دل، فرد بے سر شد۔“ خ ۶۰۰ + م ۴۰ + پ ۲ + بیت ۴۰۰ + ر ۲۰۰ + د ۴ = ۱۲۴۶ھ۔ اس حساب سے آپ کی عمر نوے اکیانوے برس ہوتی ہے۔

آپ جوانی میں بہت رنگین مزاج تھے۔ عشق و عاشقی کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ ایک طوائف سے جس کا نام موتی تھا تعلق تھا۔ بعد ازاں گزشتہ گناہوں سے توبہ کر کے آپ ایک صوفی صافی ہو گئے تھے۔ آپ بہت پرگو شاعر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے دو لاکھ سے زیادہ شعر کہے تھے مگر وہ سب کلام تلف ہو گیا۔ اب بھی جو کچھ موجود ہے اس کی تعداد ۶ ہزار اشعار سے کم نہیں۔ چونکہ آپ اپنے کلام کو

محفوظ نہیں رکھتے تھے اس لئے جو کچھ آپ کا کلام ہماری نظر سے گزرتا ہے وہ سب لالہ بلاس رام کی کاپیوں سے نقل کیا گیا ہے۔

آپ صوفی مشرب تھے لہذا آپ کے کلام میں تعصب سے نفرت اور وہ وسعت خیال پائی جاتی ہے جو اہل اللہ کا خاص جوہر ہے۔ آپ مذہبی مناقشات سے مبرا تھے اور تمام مذاہب کو اچھا سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو اور مسلمان دونوں آپ سے دلی محبت رکھتے تھے۔ انتقال کے وقت آپ کے جنازے کے ساتھ ہزارہا ہندو گئے، اور اپنی رسم و رواج کے مطابق نہایت ادب اور احترام سے اس کو لے گئے۔

کلام پر تبصرہ جو کلیات نظیر ہمارے پیش نظر ہے وہ مولوی عبدالغفور شہباز عظیم آبادی کا ترتیب دیا ہوا ہے۔ اس میں تقریباً ایک ہزار اشعار اردو غزلیات کے ہوں گے۔ نظیر کو غزل گویوں کی صف میں شمار کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا کیونکہ آپ کی غزلیں اگر غزل کے معیار سے پرکھی جائیں تو آپ کو دوسرے درجے کے غزل گویوں میں بھی مشکل سے جگہ مل سکتی ہے۔ ہم آپ کی غزلوں میں بھی وہی آزاد منشی اور الفاظ کی صحت و سقم سے بے پروائی دیکھتے ہیں جو آپ کے دیگر اصناف سخن میں پائی جاتی ہے۔ بلا لحاظ اس امر کے کہ کوئی لفظ پایۂ تہذیب سے گرا ہوا ہے اور بلا خیال اس بات کے کہ مضمون شعر رکیک اور سخیف ہو گیا ہے آپ نے ہر قسم کے اشعار کہے ہیں جن میں سے بعض فحش اور قابل مواخذہ ہیں۔

عُمَّی اور نَظَّری کو عُملی و نُظری باندھا ہے :-

اک دم میں ہوا ہو گئے سب عُلمی و نُظری ۔۔۔ تھے یاد جو اسباب و علامات تو پھر کیا

یکبارگی کی جگہ اکبارگی باندھے گئے ہیں ع وہیں اکبارگی جوش جنوں نے دل کو للکارا۔

اضطراب کی بجائے اضطرابی لکھے گئے ہیں:-

گلے لپٹنے میں یوں شتابی کہ شل بجلی کے اضطرابی ۔۔۔ کہیں جو جھمکا چمک چمک کر کہیں جو لپکا تو پھر جھپاکا

جھپکی کا مذکر جھپاکا بھی خوب ہے۔

ایک جگہ پیام کیا لکھا ہے حالانکہ پیام دیا ہونا چاہئے حالانکہ اس مصرعے میں پیام دیا

بھی ٹھیک نہیں ہے۔ بجائے پیام کلام ہونا چاہیے:۔

کیا جو یار نے ہم سے پیام رخصت کا ۔۔۔ تو دم نکل گیا سنتے ہی نام رخصت کا

یہ بھی ممکن ہے کہ کاتب کی غلطی سے کلام کے بجائے پیام لکھا گیا ہو۔

واؤ عطف کے ساتھ ایک لفظ واحد اور دوسرا جمع لکھا ہے۔ جب جمع اردو قاعدے سے بنائی گئی ہے تو اس کو واؤ عطف کے ساتھ استعمال کرنا غلطی ہے اور دو فقروں کو تو واؤ عطف سے کبھی ملانا ہی نہ چاہیے:۔

دو دن اگر ان آنکھوں نے دنیا میں کی جاں بر ۔۔۔ کی ناز و اداؤں کی اشارات تو پھر کیا

پھر اڑ گئی اک آن میں سب حشمت و سب شان ۔۔۔ لے شرق سے تا غرب لگا بات تو پھر کیا

شاید فحش اور رکیک اشعار کی مثالیں پیش کرنا ضروری خیال نہ کیا جائے گا کیونکہ نظیر کا کلام کافی مشہور ہے اور اس قسم کے اشعار بھی سب کو معلوم ہیں لہذا ان سے درگزر کرتا ہوں۔ مرتب کلیات نے بعض فحش اور گندے الفاظ کی جگہ خالی چھوڑ دی ہے اور نقطے لگا دئے ہیں اور بعض جگہ ایسے لفظوں کو علیحدہ علیحدہ حروف سے ظاہر کیا ہے۔ اس سے قارئین کرام سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے اشعار پیش کرنے سے یہ خاکسار کیوں قاصر رہا۔

نظیر نے اردو زبان میں ایسے الفاظ بھی داخل کئے ہیں جو زبانوں پر تو تھے مگر تحریر میں نہیں آتے تھے کیونکہ ثقات ان کا استعمال مکروہ جانتے تھے۔ مثال کے طور پر چند الفاظ لکھتا ہوں چنچل چھبیلا، گکڑوں کوں، ٹٹروں ٹوں،

صبح جب بول اٹھا مرغ سحر گکڑوں کوں ۔۔۔ اٹھ گئے پاس سے وہ، رہ گیا میں ٹٹروں ٹوں

جھپ سے،

دکھلا حنائی دست لیا جھپ سے دین و دل ۔۔۔ کیا دست رس ہے دیکھئے اس دست گاہ کو

گلے کی نڑی، کمیرا بمعنی مزدور، مزدورا، اٹیرن، اٹیرا وغیرہ وغیرہ۔

یہ الفاظ یا اس قسم کے دیگر الفاظ اگر نظموں میں موقع اور محل کے لحاظ سے استعمال کئے جائیں

تو مضائقہ نہیں۔ غزل میں ایسے الفاظ بہت کھٹکتے ہیں۔ ان سے احتراز ہی لازم ہے۔ شاید میاں نظیرہی پہلے اور آخری شخص ہیں جنھوں نے غزل میں اس قسم کی بدعنوانیوں کو جائز رکھا۔

متروکات بھی آپ کے کلام میں بے حد ہیں بعض بعض جگہ تو آپ وہ الفاظ لکھ جاتے ہیں جو دورِ اول اور دورِ دوم کی یاد دلاتے ہیں مثلاً تمن بجائے تُم، ش ومانند۔ معمولی متروکات یعنی جو آپ کے زمانے کے دیگر شعرائے کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں ان کا ذکر ہی کیا مثلاً اس کے تئیں بجائے اس کو، موندا بجائے بند کیا، بھر نظر بجائے نظر بھر، دوانہ پن بجائے دیوانہ پن وغیرہ۔

محاورات اور ضرب الامثال بھی آپ نے زیادہ تر ایسی ہی استعمال کی ہیں جو نرالی اور اعجوبیت کی شان لئے ہوئے ہیں:-

وہ چاندنی میں جو ٹک سیر کو نکلتے ہیں — تو مہ کے طشت میں گھی کے چراغ جلتے ہیں

بگولے اٹھ چکے تھے اور نہ تھی کچھ دیر آندھی میں — کہ ہم سے یار سے آ، ہو گئی مٹھ بھیڑ آندھی میں

فدا جو دل سے ہیں اس شوخ سبز رنگوں پر — یہ کافران کی بھی چھاتی پہ مونگ دلتے ہیں

ہوا ہوں خشک میں یاں تک کہ حضرت مجنوں — یہ مجھ سے کہتے ہیں اور اپنے ہاتھ ملتے ہیں

مرے ہے اگر جوئے شیر تم بھی زری پوش بن — دودھ چھٹی کا لے یاد دلانے چلو

لائے تھے ہم تو عمر ٹیا پاں لکھا دے — جب سیاہی پر سفیدی چڑھی تب خبر پڑی

ع باپ نے پدڑی نہ ماری بیٹا تیر انداز ہے۔

آپ نے بعض غزلیں مسلسل لکھی ہیں۔ اس قسم کی غزلوں کے صرف مطلعے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

اسی کی ذات کو ہے دائما ثبات و قیام — قدیم و حق و کریم و سمیع و منعام

عیش کر خوباں میں اے دل شادمانی پھر کہاں — شادمانی گر ہوئی تو زندگانی پھر کہاں

کل نظیر آیا چمن میں اک عجب رشک چمن — گل رخ و گلگوں قبا و گل عذار و گل بدن

کہا جو ہم نے ہمیں در سے کیوں اٹھاتے ہو — کہا کہ اس لئے تم یاں جو غل مچاتے ہو

آپ کے یہاں زبان کی سادگی کے باوجود بعض فارسی تراکیب خوب ہیں مثلاً چند ترکیبیں تحریر کرتا ہوں: حسن بالادست، ہوس آشنا، ندرت مآب، قدم تراش (قدم تراشنا)۔

واماندگانِ راہ تو منزل پہ جا پڑے — اب تو بھی لے نظیر یہاں سے قدم تراش

روکشِ برگِ سمن، حیرت زدہ، ناز آفریں، عزت پناہ وغیرہ۔

جھڑکی ہے اس نے ہم کو خفا دیکھ کر کہا — کیا ناپسند کرتے ہو اس رسم و راہ کو
جاتے ہیں جھڑکیوں میں ہماری وہ لذتیں — جو چاہ میں سمجھتے ہیں بہتر نگاہ کو
گر عار ہے کچھ اس میں تمھیں تو میاں نظیر — لے جاؤ اپنے اس دلِ عزت پناہ کو

اگرچہ ہم آخر میں اپنے قاعدے کے مطابق آپ کے بہتر منتخب اشعار غزلیات میں سے پیش کریں گے تاہم یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ہم نظیر کو دراصل غزل گو شاعر نہیں مانتے۔ ہمارے نزدیک نظیر کا کمال جو کچھ ہے وہ ان کی نظموں میں ہے۔ مرتب کلیات نے ان کے مخمس، مسدس، مثمن، معشر، ترجیع بند، ترکیب بند، تضمینیں سب کو دبستان نظیر سے موسوم کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کا یہ دبستان تا قیامت جاری رہے گا۔ ہم ان کی اس رائے سے متفق ہیں۔ سچ یہ ہے کہ نظیر کو جو قدرت اردو زبان پر حاصل ہے اور جس عمدگی اور خوبی کے ساتھ وہ اپنے مطالب موقع اور محل کو پیش نظر رکھ کر بیان کر جاتے ہیں اچھے اچھے شاعر بھی وہاں درماندہ نظر آتے ہیں۔

نظیر کا احسان ہماری اردو زبان پر یہی نہیں کہ انھوں نے بہت زیادہ الفاظ اپنے کلام میں جمع کر دئے بلکہ وہ اس وجہ سے اور زیادہ شکریے کے لائق ہیں کہ انھوں نے فطرت انسانی کا مطالعہ نہایت غور سے کیا جس کے مواقع ان کو حاصل تھے اور انھوں نے اپنے ذخیرۂ معلومات کو اپنی دلکش نظموں میں خوبی کے ساتھ سجایا۔ کثرت الفاظ کے ساتھ تو یہ عیب بھی ہے کہ بعض بھدے اور ان گھڑت لفظ داخل زبان ہو گئے لیکن جو نقشہ نظیر اپنی نظموں میں کھینچتے ہیں اور جو مرقع پیش کرتے ہیں اس میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو چھوٹی چھوٹی باتوں سے لے کر بڑی بڑی باتوں تک کا خیال ہے اور وہ بلا تکلف بے کم و کاست سب کچھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں

کہ بعض بعض جگہ وہ اپنے خیالات دہرا دیتے ہیں اور الفاظ کی نشست اور حشو و زوائد کی مطلق پروا نہیں کرتے مگر بعض نظمیں تو ایسی عمدہ اور صاف ہیں کہ کوئی نقص ان میں نہیں ہے۔

بات یہ ہے کہ نظیر نے جو کچھ لکھا ہے اپنی طبیعت کے تقاضے سے لکھا ہے۔ وہ ایک بڑے شاعر کیا معمولی شاعر بھی بننے کا خیال نہ رکھتے تھے۔ ان میں شاعری کا مادہ فطرت نے ودیعت کر دیا تھا۔ جس مضمون پر لکھنا چاہا قلم اٹھایا اور لکھ دیا۔ یہ کبھی خیال نہ کیا کہ ہمارے الفاظ یا خیالات پر سخن فہم و نکتہ داں حضرات کیا کہیں گے۔ اگر وہ اس امر کا لحاظ کرتے تو ان کی شاعری کی روح مقید ہو جاتی اور جو کچھ ان سے ظہور میں آیا ہرگز وجود میں نہ آتا۔ البتہ اگر وہ اپنے کلام پر نظر ثانی فرماتے تو عجب نہ تھا کہ جو خامیاں ہم کو نظر آتی ہیں وہ دور ہو جاتیں۔

نظیر کو ہماری نیچرل شاعری کا موجد سمجھنا چاہیے۔ آزاد اور حالی اس لحاظ سے نظیر کے مقلد ہیں کہ آخرالذکر نے وہ شاہراہ پہلے ہی تیار کر دی تھی جس پر آزاد اور حالی گامزن ہوئے۔ یہ سچ ہے کہ ان صاحبان نے اپنی نظمیں لکھنے میں نظیر کا مطلق چربا نہیں اتارا بلکہ انگریزی اور مغربی طرز بیان کا خاکہ کھینچا ہے اور اس کو مقامی رنگ دے کر ایک جدید شے ہمارے سامنے پیش کی ہے۔ لیکن اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اگر ہم پر انگریزی اور مغربی خیالات کا سایہ بالکل نہ پڑتا اور ہم صرف کلیات نظیر ہی دیکھتے رہتے تو ہمارے شعرا اس صنف شاعری کی طرف ضرور متوجہ ہو جاتے۔

نظیر کی نظمیں اپنے رنگ میں لاجواب ہیں۔ عنفوان شباب میں جس طرح وہ غلط کاریوں کے مرتکب ہوئے اسی طرح شاعری میں بھی وہ فحش کہنے پر اتر آئے لیکن جب مصرع شباب نے شیب سے بدل کی عروج گذر از زوال آیا تو آپ کی شاعری پستی سے بلندی کی طرف مائل ہوئی اور آخر کار اس درجے پر پہنچ گئی جس پر ہم اس کو آج دیکھتے ہیں۔ آپ کا جس قدر کلام رکیک اور فحش ہے یقیناً ابتدائی زمانے کا ہے۔ بعد میں زبان کے لحاظ سے جو بے راہ روی نظر آتی ہے وہ تو ان کی خاص صفت ہے ورنہ کلام میں پختگی اور متانت اسی وقت سے پیدا ہوئی جب وہ ایک تجربہ کار اور معمر انسان ہو گئے۔ خیالات بدل گئے، زبان بدل گئی اور معرفت پیدا ہو گئی۔

نظیر اور انشا میں یہی فرق ہے کہ اول الذکر نے دنیا کا تجربہ کیا، آزادہ روی کے ساتھ سب سے ملے جلے، اپنے آپ کو کسی کے ہاتھ فروخت نہیں کیا، دنیا اور مال دنیا کو ہیچ سمجھا، جو کچھ کہا اپنی طبیعت کے تقاضے سے کہا، کسی کی فرمائش سے نہیں کہا۔ لیکن آخر الذکر نے ملازمت کے پیچھے اپنے آپ کو تباہ و برباد کرلیا۔ جو کچھ کہا دوسروں کی فرمائشوں سے کہا یا اس وجہ سے کہا کہ لوگ اس نوع شاعری کو بہت پسند کرتے ہیں۔ جس قدر فضل و کمال سید انشار میں موجود تھا اگر وہ اس کے اعتبار سے جدت اختیار کرتے تو یقیناً بہت بہتر ہوتے لیکن ان کو تو دنیا اور مال دنیا کے پیچھے یہ نظر ہی نہ آیا کہ

شاعری جزویست از پیغمبری

اول الذکر تو شباب کی بدعنوانیوں کے بعد سنبھل بھی گئے لیکن انشاء اللہ خاں تو روز بروز بد سے بدتر ہوتے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ رکیک اور فحش الفاظ و خیالات کے لکھنے میں دونوں برابر ہیں بلکہ نظیر انشار سے بھی اس بارے میں گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ لیکن آپ انصاف سے کہیے کہ ایک شخص جو متقطع صورت بنائے ہوئے ہو اور بھلے آدمیوں کا سا لباس پہنے ہوئے ہو اس کی زبان سے نالائم الفاظ بھی مکروہ معلوم ہوتے ہیں یا نہیں۔ برخلاف اس کے ایک رنگیلے' بانکے' نوجوان کی زبان سے بے پروائی کے ساتھ اگر فحش الفاظ بھی نکل جائیں تو وہ کیا اتنے ہی برے معلوم ہوں گے۔ پھر سید انشار تو جہاں سے چلے تھے وہیں رہے۔ نظیر کی ابتدا برے ماحول میں ہوئی لیکن انجام اچھا ہوا۔ سید انشار کا کلام از ابتدا تا انتہا یکساں ہے۔ وہی تمسخر اور ظرافت جو ابتدائی کلام کا طرۂ امتیاز ہے آخر عمر کے کلام میں بھی بدستور باقی ہے۔ خیالات اور الفاظ میں کسی قسم کی کوئی ترقی نظر نہیں آتی لیکن نظیر کے یہاں بالکل اس کے برعکس ہے۔ خیالات تو بے حد بلند اور ارفع ہوگئے ہیں۔ زبان میں البتہ کم فرق ہوا ہے۔ وہ آمد کی رو میں الفاظ کی عمدگی کو فراموش کر جاتے ہیں لیکن برجستگی قائم رکھتے ہیں۔ پھر بھی فرق ضرور ہے۔ خیالات کے ساتھ ساتھ اور بھی کچھ فرق نہ ہو تو فحش اور رکیک الفاظ تو خود بخود غائب ہوجاتے ہیں۔ غریب اور نامانوس الفاظ ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ قواعد شعر سے پہلے بھی بے پروائی تھی اب بھی اسے قائم رکھتے ہیں لیکن اس پر بھی بعض اوقات جب کوئی نظم فن کے اعتبار سے عمدہ

لکھ جاتے ہیں تو وہ بے نظیر ہوتی ہے۔ میرانیس بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں دکھا سکتے۔

ہمارے نزدیک جو اصحاب نظمیں کہنے کے شائق ہوں انھیں زبان دانی کے لحاظ سے کلام نظیر کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ان کو اپنی لیاقت خداداد پر بھروسہ کرکے شروع سے آخر تک نظیر کا کلام پڑھ لینا چاہیئے اور خذ ما صفا دع ما کدر پر عمل کرنا چاہیئے۔ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو نہایت عمدہ ہیں اور دیگر شعراء کے یہاں نہیں پائے جاتے۔ یہ شاعر ہندی الفاظ کو عمدگی کے ساتھ ادا کرنے کا بادشاہ ہے۔ اگر متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ان الفاظ کو اپنی اپنی نظموں میں شعرائے حال کھپائیں تو ان کی نظموں کی رونق دو بالا ہو جائے۔ نہ مجھ کو اتنی مہلت ہے، اور نہ یہاں اتنی گنجائش ہے کہ میں آپ کی نظموں کے نمونے پیش کروں۔ صرف دو چار عنوان پیش کرتا ہوں۔ شائقین کلام نظیر خود ملاحظہ کریں۔ بنجارے کی نظم، روضۂ تاج گنج، حمد کی تمام نظمیں، پیری کی سواری اور سفر آخرت کی تیاری، طلسم زندگی یا چونسٹھ گھڑی کا تماشا، مذمت دنیا، توکل و تجرید، توحید (یہ نظم نہایت عمدہ ہے)، دنیا دار المکافات ہے، دنیا دھوکے کی ٹٹی ہے، اسرار قدرت، آدمی کی نظم وغیرہ وغیرہ۔

اب ہم ذیل میں نظیر کی غزلیات کے بیشتر منتخب اشعار درج کرتے ہیں:۔

ہو کیوں نہ ترے کام میں حیران تماشا	یارب تری قدرت میں ہے ہر آن تماشا
شور افگنِ جنوں ہے جس جا نگاہ کرنا	رکھتا ہے کام ہمدم واں ضبط آہ کرنا
یہ غنچہ جو بے درد گل چیں نے توڑا	خدا جانے کس کا یہ نقش دہن تھا
گردش سے عشرت میں کٹی رات تو پھر کیا	اور غم میں بسر ہو گئی اوقات تو پھر کیا
جب آئی اجل پھر کوئی ڈھونڈا بھی نہ پایا	قصوں میں رہے حرف و حکایات تو پھر کیا
لے لے کے بلائیں مجھے یہ کہتی ہیں آنکھیں	"صدقے ترے، پھر ایک نظر مجھ کو دکھلا"
صحرا میں مرے حال پہ کوئی بھی نہ رویا	گر پھوٹ کے رویا تو مرے پانْو کا چھالا
اس ابروئے خم دار کی صورت سے عیاں ہے	خنجر کی شباہت، دم شمشیر کا نقشا
قاصد جو صنم نے دیکھ مرے خط کو کیا کہا؟	حرف عتاب یا سخن دل کشا کہا؟

ترے جمال کی سورج جھلک نہ دیکھ سکا
کھلی نقاب ہی جب تک نہ دیکھ سکا

گلی کی خاک بھی ہو کر نہ ٹھہرنے پائے
ہمیں تو آہ! فلک یاں تلک نہ دیکھ سکا

نظیرؔ اُس کے فضل و کرم پر نظر رکھ
فقل حسبی اللہ نعم الوکیلا

اس کے شرارِ حسن نے جلوہ جو اک دکھا دیا
طور کو سر سے پانو تک پھونک دیا جلا دیا

خرام ناز سے اس شوخ نے دامن کو جب جھٹکا
ہماری خاک نے کیا کیا ہوا کے ساتھ سر پٹکا

نظیرؔ آرام سے گر تجھ کو اس دنیا میں رہنا ہے
سوا اللہ کے ہرگز کسی سے دل کو مت اٹکا

شہرِ دل آباد تھا جب تک وہ شہر آرا رہا
جب وہ شہر آرا گیا پھر شہرِ دل میں کیا رہا

محو تدبیر ہیں ہم، لیک خدا ہی جانے
کون سا گل ہے پس پردۂ تقدیر کھلا

ادھر اس کی نگہ کا ناز سے آ کر لپٹ جانا
ادھر مڑنا، تڑپنا، غش میں آنا، دم الٹ جانا

دیکھئے جلوہ جو اس کے حسنِ بالا دست کا
حوصلہ اتنا کہاں اپنی نگاہِ پست کا

بے صدا آکر لگا اور ہو گیا سینے کے پار
یہ خدنگ صاف تھا کس بے نشاں کی شست کا

اک پردۂ ہستی نہ رہا جوں نظر آیا
وہ پردہ بر انداز ہمیں کیوں نظر آیا

اس مہرِ پر انوار سے شبنم کی طرح ہم
گم ہوتے گئے ہم کو وہ جوں جوں نظر آیا

سرسبز دل جلوں کو نہ ہرگز کرے فلک
دانہ کہیں اگا ہے جو آتش میں جل گیا

نہ گل اپنا، نہ خار اپنا، نہ ظالم باغباں اپنا
بنایا آہ کس گلشن میں ہم نے آشیاں اپنا

پہنچے نہ ذیل وصف میں دست اسکے عام کا
موصوف ہو جو خاص خدا کے کلام کا

ہم نے چاہا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد
وہ بھی کمبخت ترا چاہنے والا نکلا

دیکھ سبزوں کی طراوت کو زمیں پڑھتی ہے
آیۂ انبتہم اللہ نباتاً حسنا

چمن طرازِ حقیقی نے اپنی صنعت سے
کسی کو پھول بنایا، کسی کو گھاس کیا

وصل اس کا ہوتا، کیوں کر میسر
وہ نورِ جان تھا، میں آب و گل تھا

نہ آئی بو جو ذرا تیرے مصحفِ رخ کی
نسیم پھاڑ گئی آ کے ہر ورق گل کا

ہم وہ درخت ہیں کہ جسے دم بدم اجل
اترہ اِدھر دکھاتی اُدھر ہے تبرِ قضا

لائے خاطر میں ہمارے وہ دلِ مغرور کیا
جس کے آگے مہر کیا، مہ کیا، پری کیا، حور کیا

دل ہوا جس دن سے بسمل ابروئے دلخواہ کا
تھا وہی پہلا دن اس بسمل کی بسم اللہ کا

کیوں نہ عشرت دو چند ہو جو ملے
یارِ مہ چہرہ اور شبِ مہتاب

فرصتِ عمر، قطرۂ شبنم
وصلِ محبوب، گوہرِ نایاب

گردشِ آسماں میں ہم کیا ہیں
پرکا ہے میانۂ گرداب

جسم کیا؟ روح کی ہے جولانگاہ
روح کیا؟ اک سوار پا بہ رکاب

دل سا دُرِ یتیم بکا کوڑیوں کے مول
کیا کیجے، خیر یہ بھی خریدار کے نصیب

کچھ ہم کو امتیاز نہیں صاف و دُرد کا
لے ساقیانِ بزم، بیارید ہر چہ ہست

نظیر یار سے کیوں درد دل نہیں کہتا
سنا نہیں ہے وہ تو نے کہ سانچ کو کیا آنچ

رکھتے ہیں ہم شمس و قمر کا سا تفاوت
نورِ یدِ بیضا و کفِ پائے محمد

ہرگز نہ پلائے تو مجھے آنکھ بدل کر
ساقی ترے کوچے سے نہ جاؤں گا سنبھل کر

دنیا ہے اک نگارِ فریبندہ جلوہ گر
الفت میں اس کی کچھ نہیں جز کلفت و ضرر

بندے کے قلم ہاتھ میں ہوتا تو غضب تھا
صد شکر کہ ہے کاتبِ تقدیر کوئی اور

کفش برداری سے اس مہر کی چمکا ہے نظیر
ورنہ کیا خاک تھی اس ذرۂ بے قدر کی قدر

چشم بد دور اسی رُخ سے ہوئی تھی روشن
مشعلِ وادیِ ایمن، شجرِ طور کی شمع

مر کر بھی تہِ خاک نہ آسودہ ہوئے آہ!
اے عشق نہ تھے ہم ترے انجام سے واقف

ملنے کا پیام اس سے کہو جا کے عزیزو
جو اس کے نہ ہو وصل کے پیغام سے واقف

یار ملا جب اے نظیر میرے گلے، تو مل گئے
جسم سے جسم، جاں سے جاں، روح سے روح، دل سے دل

دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم
بس ترستے ہی چلے افسوس! پیمانے کو ہم

شہر میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

ان سنگ دل بتوں کا گلہ کیا کروں نظیرؔ / میں آپ اپنے شیشۂ دل کی شکست ہوں

تفرقہ ہوتا ہے ایسا بھی گل اندام کہیں ؟ / مے کہیں، شیشہ کہیں، ساقی کہیں، جام کہیں

دل کی بیتابی نہیں ٹھہرنے دیتی ہے مجھے / دن کہیں، رات کہیں، صبح کہیں، شام کہیں

چھوٹا سا خال اس رخ خورشید تاب میں / ذرہ سما گیا ہے دل آفتاب میں

طوفاں اٹھا، ہائے مرے دل میں سیل اشک / وہ دن خدا نہ لائے جو میں آبدیدہ ہوں

سرچشمۂ بقا سے ہرگز نہ آب لاؤ / حضرت خضر، کہیں سے جا کر شراب لاؤ

ہم سے تو آج بھی نہ ملا وہ نگار، آہ! / ہم عید کے بھی دن رہے امیدوار آہ!

جس کی آنکھوں نے کیا بزم دو عالم کو خراب / کوئی اس فتنۂ دوراں سے کہو "عشق اللہ"

مصحف رخ پہ ترے ابروئے پیوستہ نہیں / موقلم سے ید قدرت نے لکھا "بسم اللہ"

نہیں ہوا میں یہ بو نافۂ ختن کی سی / لپٹ ہے یہ تو کسی زلف پر شکن کی سی

کہاں تو اور کہاں اس پری کا وصل نظیرؔ / میاں تو چھوڑ یہ باتیں دوانہ پن کی سی

ہنسے، روئے، پھرے، رسوا ہوئے، جاگے، بندھے، چھوٹے / غرض ہم نے بھی کیا کیا کچھ محبت کے مزے لوٹے

ہماری روح تو پھرتی ہے معشوقوں کی گلیوں میں / نظیرؔ اب ہم تو مر کر بھی نہ اس جنجال سے چھوٹے

جو تو کہتا ہے اے غافل "یہ میرا ہے یہ تیرا ہے" / یہ جس کا ہے اسی کا ہے نہ تیرا ہے نہ میرا ہے

ترقی میں تنزل ہے، تنزل میں ترقی ہے / اندھیرے میں اجالا ہے، اجالے میں اندھیرا ہے

نظیرؔ اللہ اللہ! اس جہاں میں دم غنیمت ہے / کہاں ہم اور کہاں پھر تم کوئی دم کا بسیرا ہے

کل شب وصل میں کیا جلد کٹی تھیں گھڑیاں / آج کیا مر گئے گھڑیاں بجانے والے

بے زری، فاقہ کشی، مفلسی، بے اسبابی / ہم فقیروں کے بھی ہاں کچھ نہیں اور سب کچھ ہے

بیٹھے بٹھائے خلد میں ابلیس نے نظیرؔ / کیا دم دیا ہے حضرت آدم کو دیکھیے

زلف ہو بر سر احساں تو گرفتار کرے / چشم کی عین عنایت ہو تو بیمار کرے

جنت کے لیے شیخ جو کرتا ہے عبادت / کی غور جو ظاہر میں تو مزدور کی سوجھی

رباعیات مستغنی

ملا عبدالعلی صاحب مستغنی موجودہ شعرائے افغانستان میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ آپ دروک کے ایک معزز خاندان سے ہیں۔ آپ کے والد ملا رمضان علی صاحب امیر حبیب اللہ خاں کے استاد تھے۔ آپ کے اشعار سلیس اور رواں ہوتے ہیں۔ استعارات و تشبیہات سے آپ بہت کم کام لیتے ہیں۔ آپ کی چند رباعیات ناظرین جامعہ کی خدمت میں پیش ہیں۔

گروند بسے بلند عنوان ہنر عالی تر از افلاک بود شان ہنر
ما را نتواں گفت بجز باد بدست دستی نزدیم اگر بدامان ہنر

آب رخ ہر قوم ہنرمندانند اقبال دہندۂ وطن مردانند
ننگ ملک اند و عار ملت بجہاں آنانکہ سفیہ و دون و بے دردانند

نام وطن ار بلند سازی مردی گر جامعہ ارجمند سازی مردی
باللہ غلط است اینکہ گویند عوام شیر افگنی فیل بند سازی مردی

برخیز کہ بہر ملک کارے بکنیم خیر وطن آنچہ ہست بارے بکنیم
چیزے کہ بود مفید اولاد وطن آں پیشہ رویہ و شعارے بکنیم

مسعود کسے کہ نام نیکوئے برد — از اہل سعادت بجہاں گوئے برد
از گلشن اخلاق گلے دستہ نمود — از گلبن بے خار حیا بوئے برد

پر گل بود امروز گلستان وطن — صد شکر کنوں بلند شد شان وطن
ایں فرد وطن پرست ایں نادر عصر — شد چشم وطن، روح وطن، جان وطن

بے شغل وطن گر آب و ناں بے طلبی — سود یست کہ از جنس زیاں بے طلبی
جز کوری باطن نبود ہیچ دلیل — از گوش اگر کار زباں بے طلبی

عالم ہمہ جسم آمد و جان است عمل — سود ہمہ کس در دو جہان است عمل
اے ترک عمل نمودہ از بد عملی — آخر کہ ترا گفت زیان است عمل

شرط است پے اہل جہاں کوشیدن — خوب است ترا از دل و جاں کوشیدن
رفتن ز زمیں بآسماں نیست محال — سہل است بسے اگر تواں کوشیدن

برخیز دلا کہ وقت کار است کنوں — ہنگام گل و فصل بہار است کنوں
سیر چمن و رفتن گلگشت ضرور — بے کار تریں ننگ و عار است کنوں

کارے بکن اگر بخویش کارے داری — از خود بفشاں اگر غبارے داری
بے شغل بود حیات مشکل بجہاں — تا جاں بہ تن است کاروبارے داری

اقوام و ملل چو خویش و پیوند ہم رونے دو دریں جہاں کہ باشند ہم
ناسازی و بیگانگی از سر بنہند یارانہ برادرانہ سازند ہم

از اہل زمانہ مردم آزار بد است آدم صورت بسیرت مار بد است
در گلشن کائنات تا خار گل است خوب است بگل شبیہہ چوں خار بد است

تا رسم زیان و شیوۂ سودے ہست از اہل زمانہ چشم بہبودے ہست
ہر وقت زیاں سراغ سودے دارد امید ز آتش است تا دودے ہست

تا قید حیات کار می باید کرد سعی و عمل اختیار می باید کرد
از تنبلی کہ مردنش باید گفت گر عقل بود کنار می باید کرد

از علم علاج جہل باید کردن دشوار زمانہ سہل باید کردن
در ترک کمال و کار نا اہل مشو خود را بکمال اہل باید کردن

باید بجوانی غم پیری خوردن تا کے غم میری و تیری خوردن
باید خوردن رشک کمال و ہنرت نے رشک امیری و فقیری خوردن

تنقید و تبصرہ

کتب

جنگ و جدل۔ اصنام خیالی۔ تجدید عمل۔ چہیتا بھائی۔ فلسفۂ ارکان اسلام۔ سرگزشت ادب ترکی۔ ہماری قومی ضروریات۔ سیر الصحابہؓ جلد ششم

جنگ و جدل | مترجمہ سید سجاد حیدر صاحب بی۔ اے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۱۴۰ صفحہ۔ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ، قیمت ۱۲؍۔ ملنے کا پتہ: مسلم یونیورسٹی بک ڈپو، علی گڑھ۔

یہ ایک ترکی ڈرامے کا ترجمہ ہے ملک کے مشہور ادیب سید سجاد حیدر صاحب کے قلم سے۔ سید صاحب کا یہ احسان اردو ادب پر ہمیشہ رہے گا کہ آپ نے ترکی ادب کے بہترین نمونوں کو اپنی زبان میں منتقل کر کے اس کی توسیع میں مدد دی اور اپنے ہم زبانوں کو ترکوں کی سیرت اور زندگی کے مطالعے کا موقع دیا۔ مگر خدا جانے یہ ترکی قوم کی سنجیدہ، سپاہیانہ طبیعت کا عکس اس کے ادب میں نظر آتا ہے یا اس کے اہل قلم کے ذوق کی خصوصیت ہے یا سید صاحب کے ترجمے کا کرشمہ ہے بہر حال آپ کے جتنے ترجمے اردو میں شائع ہوئے ہیں قریب قریب سب کی زبان سخت اور کرخت اور اسلوب بیان بے رس نیبے لوچ ہوتا ہے۔ نہ تو روانی، شگفتگی اور سلاست کا لطف ہوتا ہے نہ شوکت وقار اور متانت کا۔ قصے میں جن مسائل کا ذکر آجاتا ہے ان کے ڈھانچ پر جذبات، واقعات، سیرت اور کردار کا گوشت پوست چڑھانے کی کوشش ناکام رہتی ہے۔ ترجمے میں سید صاحب اصل ترکی زبان کا لطف پیدا کرنے کے لئے لفظوں اور ترکیبوں کی ندرت سے کام لیتے ہیں جو بعض اوقات عجیب مضحک صورت اختیار کرتی ہیں۔ "جنگ و جدل" میں یہ سب خصوصیات پوری طرح نظر آتی ہیں۔ ہم نمونے کے طور پر ایک ٹکڑا پیش کرتے ہیں جس سے ان باتوں کا خفیف سا اندازہ ہو جائے گا۔

"مجدی۔ عورتوں کی تفریق اور ان کی قدر و قیمت کے متعلق میرا ایک اور معیار ہے۔ میں ان عورتوں کو شوپن کے والس سے تشبیہ دیتا ہوں...... ظاہرا ان میں فرق نہیں......

مگر تھوڑی سی تدقیق نظر سے تھوڑی سی معرفت سے، جس طرح شوپن کے رقص کی ممتازیت، شوق و اصالت ادا بہ مقابلہ اور رقصوں کے ظاہر ہونے لگتی ہے اور جس طرح اس کی روح اپنی نجابت اور صنعت سے انسان کو مسحور کر دیتی ہے...... جو لوگ عورتوں پر نقادانہ نظر ڈالتے ہیں اور ان کی نفاست و محاسن پر غور کرتے ہیں ان کے لئے عورتوں میں بھی ایسے ہی فرق نظر آتے ہیں...... ہم لوگ ایسی عورتوں کی معمولی عورتوں سے زیادہ روحی وجد سے پرستش کرتے ہیں۔"

ذرا خط کشیدہ الفاظ کے استعمال پر غور کیجیے۔

بہر حال ترکی قوم دنیا کی بڑی قوموں میں سے ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کو اس سے ایک خاص محبت ہے اس کا ادب ہمارے لئے یقیناً دلکشی رکھتا ہے۔ سید صاحب کے سوا ہندوستان میں بظاہر اس کا ترجمان اور کوئی نہیں، اس لئے اس کتاب کا مطالعہ ہمیں ضرور کرنا چاہیے۔ یہ ایک ادبی فرض ہے جس سے ہمیں کسی طرح مفر نہیں۔

اصنام خیالی | از جلیل احمد صاحب قدوائی ایم۔ اے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۵۲ صفحہ، لکھائی چھپائی اچھی، کاغذ اوسط درجے کا۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ: "کتابستان"، ۱۷ سٹی روڈ، الہ آباد۔

جلیل قدوائی کے نام سے شائقین ادب خوب واقف ہیں۔ آپ ان چند لوگوں میں سے ہیں جنہیں خدا نے شاعری اور انشا پردازی کا سچا ذوق بھی دیا ہے اور اس ذوق کی تربیت کی توفیق بھی دی ہے۔ آپ کی ہمت ترقی کی سعی میں ہمیشہ مصروف رہتی ہے۔ آپ کی طبیعت مطالعے اور غور و فکر کے ذریعے سے اپنی قوتوں کو بڑھاتی رہتی ہے۔ "اصنام خیالی" کے نام سے آپ کے افسانوں کا ایک اور مجموعہ شائع ہوا ہے۔ اس میں سے چھ طبعزاد ہیں، ایک تُرگنیف کے، ایک موپاساں کے افسانے کا اور چھ چیخوف کے افسانوں کے ترجمے ہیں۔ ترجمے کے لئے افسانوں کا انتخاب بہت اچھا ہے۔ جلیل صاحب کے حسن ذوق نے لفظی ترجمے کی پابندی کے ساتھ ساتھ اردو روزمرہ کا بڑی حد تک خیال رکھا ہے مگر آپ کا اصلی کمال طبعزاد افسانوں

میں نظر آتا ہے۔ ان میں قصے کا جز محض برائے نام ہے مگر معاشرت اور زندگی کی سچی تصویر، خیالات اور جذبات کی نفسیاتی تحلیل کچھ عجب دلکشی رکھتی ہے خصوصاً "مار پیٹ" اور "بے لطف زندگی" میں شدت احساس کے ساتھ ساتھ صناعانہ ضبط نے آرٹ کا حقیقی رنگ پیدا کر دیا ہے۔ کتاب کے ساتھ پروفیسر محمد مجیب صاحب کا فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں افسانہ نویسی کے فن پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے خصوصاً روسی افسانوں کی خصوصیات بڑی خوبی سے بیان کی گئی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب بھی جلیل صاحب کی اور کتابوں کی طرح بہت مقبول ہوگی۔

تجدید عمل | از مرزا عسکری علی خاں مجازی، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۸۴ صفحہ، لکھائی چھپائی معمولی، کاغذ نفیس۔ قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ: اردو بک اسٹال بیرون لوہاری دروازہ، لاہور۔

یہ کتاب لاہور کی اینٹی ریلیجس (مخالف مذہب) سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوئی ہے جس کے مقاصد یہ ہیں:-

(۱) ذہن کو توہمات کی تاریکی سے نکال کر روشن دنیا میں لانا۔

(۲) مقلدوں کو محقق بنانا۔

(۳) سوشل زندگی میں ہمرنگی پیدا کرنا۔

مصنف کے نزدیک یہ کتاب "سوسائٹی کا ایک جدید نظام" اور "مذہب کا ایک جدید آئیڈیل" پیش کرتی ہے مگر ہمارے خیال میں یہ محض ان کا حسن ظن ہے۔ اصل میں اس میں مذہب کے متعلق وہ شبہات جو ثبوتیت کے دور میں مغرب میں عام طور پر پیدا ہوگئے تھے بیان کئے گئے ہیں۔ ثبوتی نقطۂ نظر جس میں ہر چیز کے لئے حواس اور مشاہدے کی شہادت ضروری سمجھی جاتی ہے مذہب کیا کل وجدانی چیزوں سے انکار کرتا ہے اور انھیں انسان کے دور جہالت کی یادگار سمجھتا ہے۔ مگر کتاب میں یہ نقطۂ نظر ترتیب اور تسلسل کے ساتھ پیش نہیں کیا گیا بلکہ بعض منتشر خیالات مذہب کی نفسیاتی تحلیل اور ساخت گناہ اور ثواب، معجزات، ابطال تناسخ کے متعلق ظاہر کئے گئے ہیں جن میں کسی قسم کا ربط نہیں۔ مصنف نے عقیدے کی تعریف کی ہے

"وہ خیال جس میں استدلال کی شرکت نہیں ہوتی" اس کے لحاظ سے خود ان کے کل خیالات محض عقائد ہیں کیونکہ سوائے ابطال تناسخ کے اور کسی جگہ استدلال کا نام بھی نہیں۔ ایک مستقل باب بدھ مت کی تنقید کا ہے جس میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ یہ مت بہت اچھا ہے اور مصنف کو بہت پسند ہے مگر اس کا مطلق ذکر نہیں کہ یہ ہے کیا۔ غرض کتاب میں محض مذہب کے موجودہ تخیل کے متعلق چند شکوک بہت سطحی اور بے ربط طریقے سے ظاہر کر دئے گئے ہیں۔ "مذہب کا جدید آئیڈیل" اور "سوسائٹی کا جدید نظام" ہمیں ان ۴۴ صفحوں میں بار بار تلاش کرنے سے بھی نہیں ملا ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار نہایت سنجیدگی اور متانت سے کیا ہے۔ دوسرے مخالفین مذہب کی طرح طنز اور تمسخر سے کام نہیں لیا مگر اسی کے ساتھ اس بات کی شکایت ہے کہ چند سطحی مضامین کے متعلق اس قدر بلند آہنگ دعویٰ کرنا اور کیف الہامی" کے عنوان سے اس قسم کی خطیبانہ عبارت لکھنا جس کا آغاز "آہ! میرے زریں خیالات" سے ہوتا ہے بڑے اوچھے پن اور عامیانہ مذاق کی چیز ہے۔ یہ پنجاب کے بانیان مذاہب کے لئے جائز ہو مگر اس شخص کے لئے ہرگز روا نہیں جو "عقلیت" "انسانیت" اور "فلسفے" کا نام لے کر انجمن مخالفین مذہب کا علم بردار بنتا ہے۔ بہرحال کتاب میں ایک حصہ ایسا ضرور ہے جو غور سے پڑھنے کی چیز ہے اور جس سے اندازہ ہوگا کہ ہندوستان میں مذہب کو کس قسم کے حملوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ مجازی صاحب تو خیر بنے ہوئے محقق اور نقاد ہیں مگر ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے شکوک مذہب کے متعلق حقیقی غور و فکر پر مبنی ہیں اور جن سے حامیان مذاہب کو ایک نہ ایک دن سابقہ پڑے گا۔

چیتا بھائی | از مرزا فہیم بیگ چغتائی، تقطیع خورد، حجم ۵۲ صفحات، کتابت وطباعت بہتر، کاغذ متوسط، قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ: اردو بک اسٹال، بیرون لوہاری دروازہ، لاہور۔

مرزا صاحب نے اس کتاب میں اپنے اور اپنے بہن بھائیوں کے بچپن کے حالات نہایت ہی دلچسپ اور انوکھے انداز میں بیان کئے ہیں۔ زبان بالکل ٹھیٹھ اردو جو ہم روزمرہ اپنے گھروں میں بولتے چالتے ہیں۔ طرز بیان ایسا سیدھا سادا دلچسپ اور دلنشیں کہ کتاب شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے

چین نئے، بچپن کی بھولی بھالی شرارتیں، آپس کی لڑائیاں پھر صلح صفائی، ماں باپ کی محبت اور شفقت، بھائی بہنوں کی آپس کی محبت اور خلوص۔ ان سب چیزوں کا ایسا مطابق فطرت نقشہ کھینچا ہے کہ بچپن کی زندگی آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ بعض بعض جگہ ایسے رقت انگیز مناظر ہیں کہ بے اختیار آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں۔ البتہ مرزا صاحب بعض ایسے الفاظ یا محاورے استعمال کر گئے ہیں جو عام طور پر بولے نہیں جاتے مثلاً سربراہ (صفحہ ۵۸)، نیئے (صفحہ ۴۲)، میں نے اک کی نہ دھک۔ لوہے لگ گئے (صفحہ ۴۹)، گر ٹوٹی کی بوٹی نہیں (صفحہ ۹۴)، کچھ عجیب نیلا سا بھرا رہتا ہے (صفحہ ۱۱۰)، مکان تنور کی طرح ڈنڈک رہا تھا (صفحہ ۱۲۶)۔

کتاب کے آخر میں ایک فرہنگ بھی ہے جس میں تمام مشکل الفاظ کی تشریح کی گئی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب بچوں کے لئے تو دلچسپ ثابت ہوگی بڑے اور بوڑھے بھی اسے مزے لے کر پڑھیں گے خصوصاً ان لوگوں کے لئے یہ کتاب نمونے کا کام دے گی جو بچوں کے لئے بچوں کی زبان میں کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔

فلسفۂ ارکان اسلام | مصنفہ مولوی حافظ عبد الوکیل صاحب خطیب، تقطیع $\frac{20\times 30}{16}$، ضخامت ۳۲ صفحات، کاغذ، کتابت، و طباعت معمولی قیمت ۲۰؍ ملنے کا پتہ: کتب خانۂ وحدانیہ، نواب گنج، دہلی۔

اس کتاب میں مولانا حافظ عبد الوکیل صاحب نے ارکان اسلام روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ اور ان کے متعلقات کے فلسفے کی تشریح کی ہے۔ طرز بیان الجھا ہوا ہے اور عبارت قدیم طرز کی مولویانہ ہے۔

سرگزشت ادب ترکی | از سید ریاست علی صاحب ندوی، تقطیع $\frac{20\times 30}{16}$، ضخامت ۴۰ صفحات، کتابت عمدہ، کاغذ اور طباعت متوسط۔ قیمت ۳؍

یہ اصل میں ایک عربی مضمون کا ترجمہ یا ملخص ہے جو معارف کے کسی پچھلے پرچہ میں شائع ہو چکا ہے اور اب جناب ریاست علی صاحب ندوی نے حذف و اضافے کے بعد اسے رسالے کی شکل میں شائع کیا ہے۔

مضمون نگار نے ترکی ادبیات کی تاریخ اس خوبی و اختصار کے ساتھ بیان کی ہے کہ مختصری گنجائش میں عہد اول سے لے کر موجودہ دور تک کے حالات آ گئے ہیں۔ ریاست علی صاحب نے اس اہم مضمون کا ترجمہ کر کے ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔

ہماری قومی ضروریات | از جناب میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن)، تقطیع $\frac{17 \times 27}{8}$، حجم ۴۰ صفحات کتابت طباعت اور کاغذ متوسط۔ قیمت اور پتہ درج نہیں۔

یہ ایک فاضلانہ تقریر ہے جو میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن) مدیر ہمایوں نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس ۱۹۳۳ء میں پڑھی تھی۔

اپنی اس تقریر میں آپ نے بتایا ہے کہ ہندوستان ایک تراہا دیا سہ راہا ہے جہاں ہندوانی، اسلامی اور عیسائی تین بڑے تمدن آ کر ملتے ہیں۔ ان تینوں تہذیبوں کا اجتماع یہاں ایک مدت سے ہے اور ان میں اکثر تصادم بھی ہوتا رہتا ہے اس لئے ہمیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد آپ نے بتایا ہے کہ دنیا کی دوسری قومیں کیسے طوفانی دور سے گزر رہی ہیں۔ ان میں باہمی کشاکش گتھم گتھا اور اینچا تانی نے کس قدر خطرناک شکل اختیار کر لی ہے۔ ہندوستان کے مسلمان بھی اسی کشاکش حیات میں مبتلا ہیں اور اسی خطرناک دور سے گزر رہے ہیں۔ آج کل زندگی جدوجہد کا نام ہے اور وہی قوم زندہ رہنے کی مستحق ہوگی جو اس جدوجہد میں حصہ لے گی اور مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرے گی۔

اس کے بعد آپ نے مسلمانوں کا نصب العین بتایا ہے اس سلسلے میں آپ فرماتے ہیں کہ:۔

ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ ہم اسلام پر قائم رہ کر موجودہ زمانے میں اجتماعی اور انفرادی طور پر ایک کامیاب اور شاندار زندگی بسر کر سکیں۔ اس انتہائے کمال تک پہنچنے کے لئے ہمیں بعض رکاوٹوں کو دور کرنا ہے بعض پر سے محض پھاند جانا ہے، اور بعض کو ایک حد تک اپنے حسب منشا بنا کر کچھ انہیں تبدیل کرنا اور کچھ خود تبدیل ہو جانا ہے۔ اس کے بعد آپ نے اسلام کی کچھ اچھی باتوں، وحدت، اخوت، مساوات اور رواداری کی تشریح کی ہے اور بتایا ہے کہ دنیا آہستہ آہستہ انہیں زریں اصولوں کی طرف بڑھ رہی ہے۔ پھر

آپ نے زمانہ کی مقتضیات کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ مسلمانوں کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے اور کونسی شاہ راہ ان کے لئے مفید ہے۔ اس سلسلہ میں تعلیمی، معاشرتی، مذہبی غرض ہر قسم کے مسائل آگئے ہیں اور مقرر نے نہایت اعتدال کے ساتھ اور سلجھے ہوئے انداز میں ان پر بحث کی ہے۔ غرض پوری تقریر اسی قسم کے اہم اور مفید مسائل سے لبریز ہے۔ رسالہ کی زبان صاف اور طرزِ ادا دل نشیں ہے۔

سیر الصحابہ جلد ششم | از مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی رفیق دار المصنفین۔ حجم ۳۰۹ صفحات تقطیع ۲۰×۲۶/۸ کتابت، طباعت اور کاغذ بہترین، قیمت ـــــ ہے۔ ملنے کا پتہ: دار المصنفین اعظم گڈھ۔

شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی نے یہ جلد حضرت امام حسنؓ، حضرت امیر معاویہ، حضرت امام حسینؓ اور حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کے حالات میں لکھی ہے۔ تاریخ اسلام کا یہ عہد فتنہ و فساد کا عہد کہلاتا ہے۔ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت اور حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت سے اس فتنے کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس میں مسلمانوں کا شیرازہ منتشر ہو جاتا ہے۔ بنی امیہ اور بنو ہاشم کی سیاسی رقابتیں ابھر آتی ہیں اور ہزاروں لاکھوں مسلمان اس باہمی اختلاف و عداوت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ آخر حضرت امیر معاویہ اپنی سیاسی دانشمندی کی بدولت خلافت پر قابض ہو جاتے ہیں اور اسلام کی صحیح جمہوری حکومت کو قیصر و کسریٰ کی حکومت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ بہت سی اہل اور لائق شخصیتوں کے ہوتے ہوئے اپنے صاحبزادہ یزید کو اپنا ولی عہد منتخب کرتے ہیں اور لوگوں سے زبردستی اس کی بیعت کا عہد لیتے ہیں۔ ان کی یہی خطرناک غلطی اس واقعۂ ہائلہ کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے جو عام طور پر واقعۂ کربلا کے نام سے مشہور ہے۔ یزید کے انتقال کے بعد بنو امیہ کی حکومت کمزور پڑ جاتی ہے۔ اسی زمانہ میں حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ خلافت کے مدعی ہوتے ہیں لیکن بعض سیاسی فروگزاشتوں کی بدولت اپنی یقینی کامیابی کو ناکامی سے بدل دیتے ہیں اور اموی خلیفہ کے ایک جابر و ظالم حاکم کے ہاتھوں خاص مکہ میں شہید ہو جاتے ہیں۔

غرض یہ کہ مذہب نے مسلمانوں میں جو جوش و ولولہ، زور، ہمت و ارادہ کی جن قوتوں کو پیدا کر دیا تھا اور ترقی کی جو روح ان میں سرایت کر گئی تھی وہ اس وقت غلط راستے پر صرف ہو رہی تھی اور اگر

خدانخواستہ ، چندے یہی حالت رہتی تو یہ عظیم الشان طاقت آپس ہی میں ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی۔
پھر غلط عقیدت، دشمنی، عداوت اور تعصب نے بے سر وپا واقعات اور غلط اتہامات کی ایسی تہیں جما دی ہیں کہ صحیح حالات کا استقصا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو گیا ہے۔ شاہ صاحب نے حقیقۃً یہ بڑا کام کیا ہے کہ پوری کاوش و تحقیق کے بعد اس تاریک زمانے کی تاریخ مرتب کی ہے اور مذکور الصدر بزرگوں کے حالات جمع کر دئے ہیں۔

اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں جادۂ اعتدال سے تجاوز نہیں کیا گیا ہے۔ مؤلف کو خود اس کا احساس ہے چنانچہ دیباچے میں فرماتے ہیں:-

"در حقیقت ان بزرگوں کے حالات کا لکھنا بہت اہم اور نازک فرض ہے کیونکہ انھیں بزرگوں کے نزاعی امور نے مسلمانوں کے مختلف گروہوں میں بڑے بڑے سیاسی اور مذہبی اختلافات پیدا کر دئے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ تاریخی حقائق اور جذبات دو جدا جدا چیزیں ہیں اس لئے ان کے حالات اس طرح لکھنا کہ تاریخی حقائق کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے اور کسی جماعت اور کسی عقیدے اور خیال کے مسلمان کے جذبات کو اس سے ٹھیس بھی نہ لگے، بہت مشکل امر اور پانی سے کھیلنا اور دامن کو تری سے بچانا ہے۔ تاہم میں نے دونوں باتوں کو نباہنے اور قلم کو جادۂ حق پر قائم رکھنے کی پوری کوشش کی ہے"

اور اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اگرچہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بیان میں، ان کے جذبات میں ذرا رقت یا "ترقیق" پیدا ہو گئی ہے اور طرز بیان میں خطابت کا رنگ جھلکنے لگا ہے جو ایک تاریخی کتاب کے لئے موزوں نہیں تاہم یہ فرو گذاشت درگذر کے قابل ہے اس لئے کہ یہ موقع ہی ایسا جاں گداز ہے کہ انسان بمشکل اپنے جذبات و محسوسات قابو میں رکھ سکتا ہے۔

امیر معاویہ اور حضرت امام حسینؓ کے بیان میں جہاں انھوں نے یزید اور امیر معاویہ کی بہت سی غلطیوں کو تسلیم کیا ہے وہاں ان الزامات اور اتہامات کی تردید بھی کی ہے جو غالی اور متعصب لوگوں کی

طرف سے ازراہ عناد و تعصب ان پر لگاتے ہیں۔ مثلاً امیر معاویہ پر یہ سنگین الزام لگایا کہ انھیں کی سازش سے حضرت امام حسنؑ کو زہر دیا گیا۔ جناب مؤلف نے تاریخی دلائل سے اس کی تردید کی ہے اسی طرح انھوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ یزید بن معاویہ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا براہ راست ذمہ دار نہ تھا بلکہ یہ سب کارستانی عبداللہ بن زیاد کی تھی۔ یزید کو جب اس حادثہ کی خبر ہوئی تو سخت افسوس ہوا اور یہ افسوس اسے مرتے دم تک رہا۔ اسی قسم کے بعض اور الزامات کی انھوں نے اچھی طرح قلعی کھولی ہے۔

مؤلف کا طرز بیان بھی بہت صاف وسلیس اور پاکیزہ ہے؛ البتہ کہیں کہیں عربی کے ثقیل الفاظ استعمال کر گئے ہیں جنھیں عام لوگ عربی لغت کی مدد کے بغیر بمشکل سمجھ سکتے ہیں مثلاً ترفیق (صفحہ ۲۰)، مثالب (صفحہ ۹۱)، سبط وغیرہ۔ اسی طرح بعض اردو الفاظ کے متعلق ہمیں کچھ شبہ سا ہو گیا ہے مثلاً

تلواریں گٹھلی ہو گئیں (صفحہ ۵۲) (ہم اب تک صحیح لفظ گٹھل سمجھتے تھے)

حلق سوکھ رہی تھی (صفحہ ۲۱۴) (ہم اب تک حلق کو مذکر سمجھتے تھے)

لیکن ان معمولی فروگذاشتوں سے کتاب کے حسن میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے حالات میں اردو داں مسلمانوں کے لئے کوئی مستند کتاب موجود نہیں تھی، جناب مؤلف شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔

رسائل

بچہ ماہوار

بچہ ماہوار ایڈیٹر ایس عبداللہ قریشی محمود، تقطیع ۲۰×۲۶/۸، حجم ۴۴ صفحات، کتابت، طباعت اور کاغذ متوسط، چندہ سالانہ عہ۔ مقام اشاعت: پہاڑ گنج دہلی۔

یہ باتصویر رسالہ "بی بی طبی آیورویدک اینڈ یونانی ایسوسی ایشن دہلی" کے زیر اہتمام اور حکیم الوبی پرشاد صاحب ویدکی نگرانی میں نکلتا ہے۔ مضامین زیادہ تر طبی ہوتے ہیں۔ تنوع قائم رکھنے کے لئے دوسرے مضمون اور نظمیں بھی درج کی جاتی ہیں۔ رسالہ کا معیار اچھا ہے۔ امید ہے کہ ترقی کرے گا۔

دنیا کی رفتار

ممالکِ غیر

چینی ترکستان کی شورش

خبر کی آمد اور اسلامی اخبارات کی چہ میگوئیاں

گذشتہ اپریل میں جب چینی ترکستان میں مسلمانوں کی شورش کی خبریں مسلسل آنے لگیں تو اسلامی دنیا کی توجہ اس کی طرف ہو گئی۔ ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کے اسلامی اخباروں میں موٹی موٹی سرخیوں سے لمبے چوڑے مضامین لکھے گئے۔ اڈیٹر صاحبان نے اس 'تحریک آزادی' کے اسباب کے متعلق جو وسط ایشیا کے شمال مشرقی حصے میں اٹھی تھی بہت کچھ لکھ ڈالا۔ ان میں سے بعض نے اس کی تائید کی اور بعض نے مخالفت شروع کر دی۔ بعض صاحبان چاہتے ہیں کہ چینی ترکستان میں ایک جدید اسلامی سلطنت قائم ہو جائے اس وجہ سے نہیں کہ یہ اسلامی دنیا کے لئے ایک نئی قوت ہوگی بلکہ اس وجہ سے کہ یہ برطانوی ہند اور سوویٹ روس کے درمیان روک کا کام دے گی۔ بعض نے کہا کہ یہ شورش چینی حکومت کے خلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ چینی حکومت نے مسلمانوں پر بہت ظلم کیا ہے اس بنا پر نہیں کہ وہ اس قدر قوی ہے کہ کسی قوم پر ظلم کر سکے بلکہ اس بنا پر کہ وہ خود ضعیف اور مظلوم ہے۔ بعض نے کہا کہ چینی ترکستان کے مسلمان تمام اہم شہروں پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں ایک جمہوری حکومت قائم کر رہے ہیں بعض صاحبان نے مسلمانوں کی 'آزادی' کا اعلان کیا حالانکہ چینی ترکستان کے مسلمانوں نے کبھی اسلامی دنیا سے یہ نہیں کہا کہ اب تک وہ کسی غیر ملک کے غلام رہے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض صاحبان نے یہ بات بیان کی کہ چینی ترکستان کے مسلمانوں میں عرصے سے ایک خفیہ جماعت قائم تھی جس کا مقصد چینی حکومت کا جُوا اپنی گردن سے اتار کر پھینکنا تھا حالانکہ حکومت چین نے کبھی مسلمانوں کی گردن پر جُوا نہیں رکھا۔ نہ چین خاص کے مسلمانوں کو اس کی شکایت تھی نہ چینی ترکستان کے مسلمانوں کو۔ چینی حکومت (پہلے حکومت پیکن، اب حکومت نانکنگ) نے بار بار یہ اعلان کیا کہ جمہوریت چین پانچ قوموں کی مشترکہ حکومت ہے مسلمان بھی ان میں شامل ہیں قانون

کی رو سے چینی مسلمانوں کو پوری مساوات اور حقوق دے گئے ہیں اور وہ غیر مذہب والوں کے ساتھ دستور اساسی کی بنیاد پر ایک ہی صف میں کھڑے ہیں نہ ان کے ہاتھ میں ہتکڑیاں ہیں نہ ان کے پاؤں میں زنجیر۔ وہ ہر عہدہ نہایت آسانی سے پا سکتے ہیں بشرطیکہ اس کے حاصل کرنے کی لیاقت اور انجام دینے کی قابلیت رکھتے ہوں۔ وہ چین میں جمہوریت کے قائم ہونے کے وقت یعنی ۱۹۱۱ء سے آزاد ہیں۔ ان کو دوبارہ آزادی کے لئے جدوجہد کرنے کی ضرورت نہیں۔ چینی مسلمانوں کی ذہنیت یہ نہیں ہے کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی علیحدہ سلطنت چین کے اندر قائم کریں جبکہ ان کے برادران وطن بیرونی حملے کے خوفناک خطرے کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ یہ کہنا ناانصافی ہے کہ چینی حکومت مسلمانوں کے ساتھ ظالمانہ طور سے پیش آتی ہے۔ چینی حکومت نے ہر مذہب والوں کو آزادی دے رکھی ہے، وہ جو عقیدہ چاہیں رکھیں اور جس طرح جی چاہے عبادت کریں، چینی حکومت ہرگز مداخلت نہیں کرتی۔

اب رہی چینی ترکستان کی شورش یہ مقامی معاملہ ہے۔ یہ حکومت چین کے خلاف برپا نہیں کی گئی بلکہ صرف ایک حاکم کے خلاف۔ یہ معاشی وجوہ سے نہیں ہے جیسا کہ ڈاکٹر اقبال صاحب نے بیان کیا ہے نہ مذہبی جنون کی وجہ سے جیسا کہ اخبار مدینہ کا خیال ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ شورش برطانوی ہند میں روس کے خلاف مفید ثابت ہو جائے لیکن برطانیہ کا اس میں بلاواسطہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ چینی ترکستان میں سازش کرنیوالی کوئی خفیہ جماعت نہ تھی جیسا سرحد، پشاور کے ایک مضمون نگار نے کابل سے ایک مراسلے کے دوران میں کہا ہے اور نہ یہ کوئی وطنی تحریک ہے جیسا منصور جہاں گیر خاں نے الجہاد (قاہرہ) میں لکھا ہے۔ چینی ترکستان چین کا ایک مسلم صوبہ ہے، نہ کہ وسط ایشیا کی ایک مسلم ریاست۔ اس بیان سے جو ایک گمنام چینی شاہد نے کاشغر سے بھیجا تھا اور کلکتہ کے اسٹار آف انڈیا میں شائع ہوا تھا یہ مراد نہیں لی جا سکتی کہ چینی ترکستان میں ایک جدید مسلم ریاست پیدا ہو گئی بلکہ اس میں صرف اس شورش کے واقعات دکھائے گئے ہیں۔

۲۔ اسلام اور چین | اس خیال سے کہ چین کے اندر ایک علیحدہ اسلامی ریاست قائم کی جائے ممکن ہے باہر کے مسلمانوں کو کچھ روحانی مسرت حاصل ہو جائے لیکن یہ اس سرزمین میں اشاعت اسلام میں مدد نہیں دیگا۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ فوجی قوت سے فتوحات حاصل کی جا سکتی ہیں لیکن اشاعت اسلام نہیں ہو سکتی چینی

مسلمانوں کی قوت ادرحیثیت علیحدہ سلطنت کے قائم کرنے سے مستحکم نہیں ہوسکتی، بلکہ چینی حکومت کے ساتھ تعاون کرنے سے ۔ اسی غرض کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے کندھوں پر بھاری فرائض ہیں جنھیں پورے کرنا ہیں، وہ فرائض کیا ہیں؛ چینی قوم کو پستی سے نکالنا اور وطن کی خاطر جدو جہد کرنا۔ ان کی شان اور عظمت اپنے مکان کے گرانے میں نہیں ہے بلکہ اسی میں ہے کہ چینی قومیت کی عمارت تعمیر کریں۔ یہ عمارت ان کا مقدس معبد ہے جس میں ان کو نذر چڑھانا اور قربانی کرنا ہے۔ غرضکہ چینی قوم کے عروج سے ان کا عروج ہے اور اس کے زوال سے ان کا زوال ۔

چین کی موجودہ حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے چینی مسلمانوں کے کندھوں پر دو اہم فرائض ہیں ایک تو غیر مذہب والوں کے ساتھ ایک صف میں کھڑے ہو کر چین کی خاطر لڑنا اور دوسرے صحیح اسلامی تعلیم کو نہ صرف اپنے اندر پھیلانا بلکہ اپنے اور ہم وطنوں کے سامنے بھی پیش کرنا ۔ جہاں تک چینی مسلمانوں کی سیاست کا تعلق ہے، مجھے یقین ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ کیا قدم اٹھانا چاہئے اور کس طرح اپنے مفاد کی حفاظت کرنا چاہئے ۔ اس معاملے میں غیر ملکی مشورے کی ضرورت نہیں ہے ۔ جو لوگ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ چینی ترکستان میں ایک مضبوط اور طاقت ور مسلم ریاست قائم کی جائے تاکہ خطرے کے وقت چینی مسلمان وہاں جا کر پناہ گزیں ہوسکیں وہ یقیناً ہمارے شکریے کے مستحق ہیں لیکن وہ غالباً اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ اندرون چین میں کم وبیش تین کروڑ مسلمان پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی تعداد دیگر مذاہب کے مقابلے میں بہت تھوڑی ہے یعنی کل آبادی کی صرف پانچ فیصدی ہے ۔ فرض کیجئے کہ چین میں مذہبی تعصب اور ظلم کا دور شروع ہو جائے تو یہ لوگ کہاں بھاگ کر جائیں؛ چینی ترکستان جانا چاہیں تو وہ بہت دور ہے اور راستہ دشوار گذار ۔ باہر کے مسلمان ان کے بچانے کے لئے وقت پر نہیں پہنچ سکتے ۔ روسی ترکستان کی مثال ہمارے سامنے ہے ۔ جب وہاں کی مساجد ناچ گھر اور قمار خانہ بنائی گئیں اور مسلمان اپنے گھروں سے نکال دئے گئے تاکہ وہ عزیز وطن کو چھوڑ دیں یا اپنا مذہب بدل دیں تو اس وقت کسی مسلمان نے ان کی مدد کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ پھر کیوں کر یہ توقع کی جاتی ہے کہ چین میں جب مذہبی ظلم شروع ہوگا تو اسلامی دنیا کی مدد فوراً جا پہنچے گی۔ چینی مسلمان یہ نہیں چاہتے کہ یہی واقعات چین میں رونما ہوں۔ غرض اس وقت جو قدم وہ اٹھا سکتے ہیں

صرف اتحادِ چین کی طرف اٹھا سکتے ہیں نہ کہ انتشار کی طرف۔ ان کی ساری جد و جہد جمہوریت چین کی حمایت میں ہوگی تاکہ حکومت میں اور ان میں تعاون اور اعتماد قائم ہو جائے۔

بیرونی مسلمانوں کی اعانت اس وقت مفید ہو سکتی ہے جب ان کی کوشش کا رخ اسلام اور چینی قومیت میں ذہنی مصالحت پیدا کرنے کی طرف ہو۔ چینی مسلمانوں کو چینی حکومت سے علیحدہ ہو جانے کی ترغیب دینا نہ صرف چینی مسلمانوں کے لئے خطرناک ہے بلکہ خود اسلام کے لئے بھی مہلک ہے۔ یہ مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی تعلقات کو بگاڑنا ہے جس کا نتیجہ ہرگز اچھا نہیں ہو سکتا۔ موجودہ چین مسلمانوں کی فوج کشی کا میدان نہیں ہے بلکہ اسلامی تمدن کی نشو و نما کے لئے ایک زرخیز خطہ ہے۔ چینیوں کے ذہن میں اسلام کے زندگی بخش اصولوں کو جو نوع انسانی کی بقا اور تقویت کے ضامن ہیں جاگزیں اور راسخ کرنے میں بیرونی مسلمان بہت کچھ مدد پہنچا سکتے ہیں۔ یہ بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں طرح کیا جا سکتا ہے مثلاً مسلم علما چین کی سیاحت کریں اور چینی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلام پر تقریریں کریں۔ وہ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ چینی مسلمانوں کے ہاتھ سے وہاں کے ہر بڑے شہر میں اسلامی تمدنی ادارات قائم کرائیں تاکہ اسلام کے متعلق بعض غلط فہمیاں جو تعلیم یافتہ حلقوں میں پھیل گئی ہیں، دور کی جائیں اور اس وسیع سرزمین میں اسلامی معاشرت پھیلنے کی صورت پیدا ہو۔ وہ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ اسلامی علوم کی کتابیں چین کے تعلیمی مرکزوں اور اداروں میں بھیجیں۔ مزید برآں وہ چینی حکومت سے یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ چینی مسلمانوں کو سفیر یا قنصل کے طور پر اسلامی ممالک میں بھیجے تاکہ چین اور اسلامی ممالک کے درمیان تجارتی رشتہ اور مذہبی ربط پیدا ہو سکے۔

اگر ان چند باتوں پر عمل کیا جائے تو بیرونی مسلمان چین میں اشاعت اسلام کے کام کو بہت کچھ مدد اور قوت پہنچا سکتے ہیں اور چین میں مسلمانوں کی حیثیت اور زیادہ نمایاں اور مضبوط ہو سکتی ہے اور اس کے تعلقات دوسری قوموں کے ساتھ اور استحکام پا سکتے ہیں۔ چینی ترکستان کے معاملے میں خواہ اسلامی دنیا چین کے موافق ہو خواہ مخالف وہ نہ تو حکومت چین کو فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ ضرر، البتہ چینی مسلمانوں کی حیثیت میں ضرور فرق آتا ہے۔ اگر اسلامی دنیا چینی حکومت کے مخالف ہے تو اس صورت میں یقیناً یہ اندیشہ ہے کہ حکومت چین اپنے ملک کے مسلمانوں پر شک کرے گی اور انھیں نفرت کی نگاہ سے دیکھے گی۔ شک اور نفرت یہ دونوں

چیزیں سیاسی بے چینی کی جڑیں ہیں۔ چینی مسلمان یہ نہیں چاہتے کہ حکومت چین ان پر شک کرے اور انھیں نفرت کی نگاہ سے دیکھے۔ وہ ان باتوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور بیرونی بھائیوں سے بھی یہ التماس ہے کہ ان خیالات کے دور کرنے میں چینی مسلمانوں کی مدد کریں۔ اس غلط بیانی سے کیا فائدہ کہ چینی ترکستان کے مسلمانوں نے حکومت چین کے خلاف بغاوت کی ہے۔ نہ چینی ترکستان کے مسلمان حکومت کے خلاف ہیں اور نہ انھوں نے بغاوت کی ہے۔ یہ تھوڑی سی شورش ہے جو صرف ایک ذمہ دار شخص کے خلاف برپا کی گئی اور یہ مقامی معاملہ ہے۔

۲۔ **شورش کی جڑ** میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ حکومت چین کے خلاف بغاوت نہ تھی بلکہ صرف ایک فرد کے خلاف شورش تھی۔ یہ شورش نہ مذہبی جنون کی وجہ سے ہوئی، نہ کسی تعصب سے اور نہ سیاسی اغراض سے، نہ معاشی بے چینی سے، بلکہ شخصی مظالم کے خلاف نفرت اور بے زاری سے۔ اس کی تشریح میں آپ عجیب عجیب داستانیں سنیں گے جو الف لیلہ سے زیادہ دلچسپ ہیں مگر جو کچھ میں یہاں بیان کروں گا وہ کوئی من گھڑت قصہ نہیں ہے بلکہ واقعات ہیں جو چینی مسلمانوں کے ذریعے سے فراہم کئے گئے ہیں۔ اس سے آپ کو یہ حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ اس ڈراما کی اصلیت کیا ہے۔

سن کیانگ یا چینی ترکستان کی موجودہ شورش گورنر چن شوزن (Chin Shoozin) کی نااہلی اور ظلم کی وجہ سے برپا ہوئی۔ چن سن کیانگ کی گورنری پر ۱۹۲۸ء سے قابض رہا۔ وہاں کے مسلمان اس سے اس لئے بیزار ہیں کہ اس نے ان کے مفاد کو پامال کیا اور انھیں انتہائی نقصان پہنچایا۔ گورنر اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور بیزاری کا بیج اس وقت بویا گیا جبکہ اول الذکر یانگ چن شن (۱۹۲۰ سے ۱۹۲۸ تک چینی ترکستان کا گورنر رہا) کا سکریٹری تھا۔ گورنر یانگ کے ماتحت 'مانوشین' نامی ایک مسلمان بھی تھا جس پر یانگ کو بہت اعتماد تھا۔ یہ عام قاعدہ ہے کہ جس پر زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے وہ یا تو اپنے افسر کی خاطر قربانی کرتا ہے یا اس کے عتاب کا شکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مانوشین بھی گورنر کے شک و شبہ سے نہیں بچ سکا۔ وہ دل ہی دل میں یہ محسوس کرتا تھا کہ اگر میں نے مانوشین کو اپنی راہ سے نہ ہٹایا تو میری خیریت نہیں ہے۔ خاندان مانوشین کی کثرت تعداد نے اور اس محبت نے جو کہ سن کیانگ کے مسلمان مانوشین سے

رکھتے تھے یانگ چن شن کے دل میں اور بھی خطرہ پیدا کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ ما فوشین اپنے ہم مذہبوں کی مدد سے کسی نہ کسی دن اس کے عہدہ کو غصب کرے گا چنانچہ اس نے چن شوزن (موجودہ گورنر) کے ساتھ مل کر ما فوشین کی راہ میں جال بچھایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ما فوشین معہ اپنے فرزند کے گرفتار ہوا اور بغیر قانونی سماعت کے قتل کر دیا گیا۔

اس کی موت نہایت دردناک تھی۔ شمال مغربی چین کے مسلمانوں نے اس وقت یانگ چن شن کے خلاف شدید احتجاج کیا تھا اور ایک وفد حکومت پیکن کے پاس بھی روانہ کیا تھا لیکن حکومت نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی اور اس مقدمہ کا فیصلہ اب تک نہیں ہوا۔

بہرحال یانگ چن شن کو اپنے کرتوت کی سزا مل گئی۔ ۱۹۲۰ میں وہ ایک روسی اسکول میں انعام تقسیم کر رہا تھا کہ دفعۃً کسی خفیہ جگہ سے اس پر پستول چلایا گیا اور وہ زمین پر گر کر پھر اٹھ نہیں سکا۔ اس کے مقتول ہونے کے بعد اس کا سکریٹری چن شوزن گورنر بنا دیا گیا! مسلمانوں کے دل میں غصے کی چنگاریاں دبی ہوئی تھیں مگر ان کے بھڑکنے کے لئے کسی فوری اشتعال کی ضرورت تھی۔

۴۔ فوری سبب اس شورش کا فوری سبب یہ ہوا کہ چن شوزن نے حامی کے (Hami) مسلمانوں کی جائداد کے ضبط کرنے کا حکم دے دیا۔ حامی مشرقی سن کیانگ کا ایک اہم شہر ہے۔ مانچو کے زمانے میں سن کیانگ کا نظم و نسق بالکل جاگیرداری نظام سے مشابہ تھا۔ وہاں کے مسلمان اپنے 'وانگ' (سردار) رکھتے تھے۔ کل صوبے میں مسلمانوں کے آٹھ وانگ تھے جو اپنے اپنے مقام کے حکمراں تھے لیکن ان آٹھ مسلم وانگوں کا ایک بڑا رئیس ہوتا تھا جو شہر حامی میں رہا کرتا تھا اور وہی مسلمانوں کے امور کا نگراں تھا۔ غیر مسلموں کی معمولی سی مداخلت سے خطرناک نتائج پیدا ہونے کا امکان تھا۔ موجودہ گورنر نے مداخلت کی جرأت کی جس کی وجہ سے وہ نہ صرف اپنی گورنری کھو بیٹھا بلکہ اس کی جان بھی محفوظ نہیں ہے۔

۱۹۱۱ میں انقلاب چین کے بعد یہ جاگیرداری نظام سن کیانگ میں برقرار رہا۔ مسلم 'وانگ' اپنی حکومت کے معاملات میں بالکل خود مختار تھے۔ رعایا کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد قدرتی طور پر نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان کا اثر زیادہ وسیع ہو جاتا تھا اور حیثیت اور بڑھتی جاتی تھی۔ وانگ کا عہدہ ارثی ہوا کرتا تھا

اس زمانے میں یہ منصب شاہ مقصود کو ملا مگر وہ اپنے اسلاف جیسا نہ تھا اور سنگ دلی اس کی خاص صفت تھی جس کی وجہ سے لوگ اس سے بہت ناراض تھے اور بد دعائیں دیا کرتے تھے۔ آخر خدا خدا کرکے گزشتہ سال فصل ربیع میں اس کا انتقال ہوا۔ جانشینی کا سوال پیش آیا۔ قاعدے کے مطابق اس کے لڑکے شاکر کو "وانگ" کا عہدہ ملنا چاہیے تھا لیکن اس کی شخصیت اور اخلاق بھی اپنے باپ سے بہتر نہ تھا اور مسلمان اس کو اپنا وانگ بنانا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایک وفد گورنر سن کیانگ کے پاس جو ارومچی میں مقیم تھا روانہ کیا اور اس سے یہ درخواست کی کہ وانگ کے جانشین کا انتخاب نہ کریں۔ انھوں نے گورنر سے یہ وعدہ کیا کہ حکومت چین وانگ سے جو خراج لیا کرتی تھی اسے جمہور مسلمین خود ادا کریں گے۔ گورنر نے وفد کی درخواست منظور کرلی اور فیصلہ کردیا کہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی وانگ منتخب نہ کرے گا لیکن اس کے دل میں اور ہی کچھ تھا۔ دفعتہً اس نے ان جاگیروں کو جو حامی مسلمانوں کی ملکیت تھیں ضبط کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ مسلمانوں پر ایسی چوٹ پڑی جسے وہ چپ چاپ برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ چنانچہ وہ ٹڈی دل کی طرح اٹھے اور حامی کے فوجی صدر مقام پر ٹوٹ پڑے اور چشم زدن میں سارے چینی سپاہیوں کے ہتیار چھین کر شہر پر قابض ہوگئے۔

چن شوزن صوبہ کان سو ضلع ٹی ٹو کا باشندہ ہے اور اس کی فوج بھی زیادہ تر وہیں سے بھرتی ہوئی تھی۔ نام کے لئے فوج کے پانچ ڈویژن تھے لیکن ان کی تعداد پوری نہیں تھی۔ ان کے جسم کمزور، اخلاق خراب اور فوجی نظام اور تربیت بالکل مفقود تھی۔ جب کبھی اس صوبے میں اس قسم کی شورش رونما ہوتی تو وہ مدافعت نہیں کرسکتے تھے۔ مسلم والنٹیروں نے جو جدید آلات سے مسلح، رفتار میں تیز، حرکت میں تند، عمل میں چست تھے حامی پر قبضہ کرنے کے بعد مغرب کی طرف رخ کیا اور ایک حملے میں پھر شہر "چی لوین" کو فتح کرلیا۔ حامی کے ارد گرد جنگ کی خبر تیز ہوا کی طرح ارومچی، کاشغر اور آکسو میں پھیل گئی اور وہاں کے مسلمان بھی جہاد میں شریک ہوگئے۔ اس اثنا میں ماچونگ این نے جو کانسو میں مقیم تھا اور جس کی داستان ڈاکٹر اقبال نے اخبار کے نمائندوں کو سنائی ہے اپنی فوج کو سرحد عبور کرکے حامی کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔

یہ ظاہر ہے کہ صوبہ کاسن کانگ کی سرکاری فوج جو کمزور اور مقدار میں کم تھی ان مسلم والنٹیروں

کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی جو تین طرف سے ان پر آن پڑے۔ امدادی فوج کا اندرونی چین سے پہنچنا مشکل تھا، یہی وجہ تھی کہ مسلم والنٹیر جہاں کہیں پہنچتے تھے اس جگہ پر فوراً قابض ہو جاتے تھے۔ انھیں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی سوائے اس کے کہ ختن میں تھوڑی دیر مقابلہ ہوا۔ والنٹیروں کی تعداد ان کی فتوحات کے ساتھ بڑھتی جاتی تھی اور ان کی قوت میں مجمع کی کثرت سے اور اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ یہ لوگ ایک قبیلے یا نسل سے نہیں ہیں بلکہ مختلف قبیلوں اور نسلوں سے، جن میں سے تنگان (چینی)، کرغز (منگولی)، اور نمز (ترک) کا ذکر شملے کے سرکاری بیان میں کیا گیا ہے۔

۵۔ قبضہ کرنے کی غرض | پورے صوبے پر قابض ہو جانے کے بعد ان لوگوں نے کوئی علیحدہ مسلم ریاست قائم نہیں کی اور نہ چینی حکومت کے خلاف کچھ کیا۔ سن کیانگ کے مسلمان حکومت نانکینگ سے خفا نہیں ہیں اور نہ ان کو عام چینیوں سے نفرت ہے۔ انھوں نے فی الحال صوبے کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اس لئے کہ چینی افسر اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ سن کیانگ مسلمانوں کے زیر نگرانی چینی حکومت کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ اس صوبے میں روسی اور برطانوی اثر بہت کافی ہے مگر یہ ایک چینی صوبہ ہے جس کی حفاظت نہایت ضروری ہے تاکہ بیرونی ممالک اس کو میدان جنگ نہ بنائیں۔ منچوریہ کے واقعات بتاتے ہیں کہ چینی افسر اس قابل نہیں کہ وہ سرحد کی مدافعت کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ سن کیانگ کے مسلمان اس صوبے کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں اور انھوں نے چینی افسروں کو وہاں سے نکال دیا ہے مگر اس کا مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انھوں نے اپنی ایک علیحدہ ریاست قائم کر لی ہے۔

۶۔ حکومت نانکینگ اور سن کیانگ | میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ چینی حکومت کا سلوک مسلمانوں کے ساتھ ظالمانہ نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب یہ خبر آئی کہ چن شوزن کی بدسلوکی اور غیر منصفانہ پالیسی سے سن کیانگ کے مسلمانوں نے اس سے برہم ہو کر صوبجاتی فوجوں کے ہتھیار چھین لئے ہیں تو حکومت نانکینگ نے ان کو سزا دینے کا مطلق خیال نہیں کیا بلکہ یہ فیصلہ کیا کہ (۱) فوراً ایک کمشنر عامی روانہ کیا جائے تاکہ وہاں جا کر مسلمانوں کو سمجھائے، ان کی شکایتیں سن کر ان کا سدباب کرے اور انھیں یہ بتا دے کہ حکومت کو ان پر اعتماد ہے اور وہ ان کی بھلائی چاہتی ہے (۲) سوین شاہ وین اور ماجان شان کی فوج کو

حکم دیا جائے کہ وہ روس سے سن کیانگ میں داخل ہو جائے اور مسلمانوں کو امن قائم کرنے میں مدد دے اور (۳) سفید روسی جن کو چن شوزن نے سن کیانگ کی فوج میں داخل کیا تھا اور اس سے مسلمانوں میں ناراضی پھیل گئی تھی نکال دئے جائیں اور ان کی جگہ دیسی باشندے رکھے جائیں اور چن شوزن کو جو اس شورش کا بڑا اور اصلی ذمہ دار ہے وہاں کی گورنری سے ہٹا دیا جائے۔

ان فیصلوں کے مطابق حکومت نانکینگ نے نائب وزیر خارجہ' وانگ موسونگ' کو کمشنر عامی مقرر کرکے روانہ کیا ہے۔ روانہ ہوتے وقت محکمۂ امور تبت و منگولیا کے صدر نے ان کو ایک یادداشت دی ہے جن میں وانگ موسونگ کو امور ذیل کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

(۱) کمشنر عامی کو چاہئے کہ ذاتی طور پر ہر مسلم شہر اور قصبے میں جائے۔ وہاں کے حالات کی تحقیق کرے لوگوں سے دریافت کرے کہ ان کو کیا شکایت ہے، ان کو سمجھائے بجھائے' ان کا اعتماد اور ہمدردی حاصل کرے اور حکومت نانکینگ کی طرف سے ہمدردی کا پیغام ان کو پہنچا دے۔

(۲) یہ کہ کانسو اور سن کیانگ کے درمیان آمد و رفت کے لئے حتی الامکان سہولتیں پیدا کرنے کی کوشش کرے اور تعلیم عمومی[1] کی مخالف پالیسی کو جو عرصے سے وہاں کے گورنر نے اختیار کر رکھی تھی منسوخ کر دے۔

(۳) مقامی حکومت کے نظم و نسق کو درست کرنے کی کوشش کی جائے اور بھاری اور ناقابل برداشت محصول اور لگان منسوخ کر دیا جائے۔

(۴) عامی' تاچن' ارومچی اور کاشغر میں خبر رسانی کی آسانی کے لئے لاسلکی قائم کیا جائے۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) [5] یہ والنٹیروں کے دو کمانڈر ہیں۔ مؤخر الذکر مسلمان ہے جو منچوریا کی جنگ میں جاپان سے شکست کھا کر روس میں پناہ گزیں ہوا تھا۔ اخباروں میں یہ افواہ کہ چینی حکومت نے روس سے فوجی مدد طلب کی کہ ترکستان کی شورش کو دبائے قطعاً غلط ہے۔ اس کی حقیقت اصل میں یہ ہے۔

[1] اس کی تشریح آگے آئے گی۔

(۵) سفید روسی فوج سے نکال دیے جائیں اور ان کی جگہ دیسی باشندے داخل کیے جائیں۔

(۶) مسلمانوں سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنے نمایندے نانکینگ میں بھیجیں اور وہاں "دفتر امور مسلمانان سن کیانگ" قائم کرکے مرکزی حکومت کے ساتھ مسلم مسائل میں مشورہ کریں۔

(۷) سن کیانگ کی صوبجاتی حکومت سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ مسلم طلبہ کو مالی آسانیاں بہم پہنچائی جائیں تاکہ وہ اندرون چین کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے شریک ہوسکیں۔

(۸) یونیورسٹی کے طلبہ کی ہمت افزائی کی جائے کہ وہ سن کیانگ میں جاکر خدمت کریں۔

ان ہدایات سے یہ بالکل واضح ہے کہ حکومت نانکینگ نے اس معاملے میں دانشمندانہ حکمت عملی سے کام لیا ہے۔ یہ سب باتیں مسلم قایدوں کے نزدیک قابل قبول ہیں۔ گورنر کو ہٹا دینا اور سفید روسیوں کو فوج سے نکال دینا اس معاملے کے طے ہونے کے بنیادی شرائط ہیں۔ فوجی خدمات کے حق کو صرف دیسی باشندوں کے لئے محفوظ رکھنا مسلمانوں کے لئے ایک امتیاز ہے جس کے ذریعے سے وہ اپنے مفاد کی حفاظت کرسکتے ہیں اور غیر متوقع خطرے کی مدافعت بھی کرسکتے ہیں۔ "تعلیم عمومی کی مخالف پالیسی" کو منسوخ کردینے سے مسلمانوں کو یہ موقع مل سکتا ہے کہ وہ جدید ذہنی ترقی کی آزاد اور تازہ ہوا سے فائدہ اٹھائیں۔ چینی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کرنا اور چین کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ہمت افزائی کرنا کہ وہ سن کیانگ میں جاکر خدمت کریں باہمی تعاون اور اعتماد قائم کرنے کی بہترین تدبیر ہے۔

"تعلیم عمومی کی مخالف پالیسی" | یہاں تعلیم عمومی کی مخالف پالیسی کے متعلق چند سطریں لکھ دینا ضروری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سن کیانگ میں مسلمان آباد ہیں لیکن سیاسی اعتبار سے یہ چین کا ایک حصہ ہے اور یہاں کے انتظامات چینی گورنر کے ماتحت ہوتے ہیں۔ یہاں کے مسلمان تعلیم یافتہ بہت کم ہیں کچھ اس وجہ سے کہ ان کی طبیعت جدید علوم کی طرف مائل نہیں ہے یعنی وہ قدامت پسند ہیں اور کچھ اس وجہ سے کہ گورنر نے ایک "تعلیم عمومی کی مخالف پالیسی" نافذ کر رکھی ہے جس سے عوام کو ناقابل اور جاہل رکھنا مقصود ہے۔

۱۹۱۲ میں جبکہ مالین ای (Ma din yee) جو صوبہ ہونان (Hunan) کا ایک مسلمان ہے صوبہ کانسو کا وزیر تعلیم مقرر ہوا تو اس نے حتی الامکان اس کی کوشش کی کہ وہاں کے تعلیمی

حالات کو درست کرے۔ چنانچہ اس نے ماآن لانگ کو جو کانسو کا ایک عالی خاندان مسلمان تھا اپنے محکمہ میں بلایا تاکہ تعلیمی اصلاح میں اس کی مدد کرے۔ ماآن لانگ اس کے ماتحت ایک مذہبی تعلیمی کمشنر کی حیثیت سے رہا۔ اس نے مختلف مقامات میں نئے مدارس کھلوائے اور جدید تعلیم اور دینی تعلیم ایک ساتھ جاری کی۔ تھوڑی ہی مدت میں کثرت سے روشن خیال مسلم نوجوان مدرسے سے نکلے اور عام مسلمان تعلیم کی دولت سے مالامال ہوگئے۔ مالین ای نے کانسو میں تعلیمی پالیسی کے ذریعے سے ان نفرت انگیز اور برے جذبات کو ایک حد تک دور کیا جو اس زمانے کے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں موجود تھے اور جس کی بنیاد جنرل ٹسو چونگ تانگ نے ڈالی تھی جب وہ ۱۸۷۳ء میں یعقوب بیگ کی بغاوت کے استیصال کے لئے اپنا لشکر لے کر کانسو سے گزرے تھے۔ مالین ای کی خدمات کی یاد اب تک کانسو کے مسلمانوں کے دلوں میں تازہ ہے۔ کانسو کے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں جو ہم آہنگی اور باہمی خوشگوار تعلقات پائے جاتے ہیں وہ اس تعلیمی پالیسی کا ثمرہ ہے۔

اس کے بالکل برعکس چن شوزن نے اس روز سے جس روز اس نے سن کیانگ کی صوبجاتی حکومت کی باگ ہاتھ میں لی، "تعلیم عمومی کی مخالف پالیسی" جاری کی۔ اس پالیسی کا مقصد وہاں کے باشندوں کو جہالت اور ناخواندگی کی حالت میں رکھنا تھا تاکہ کوئی شخص امور سیاست میں حصہ نہ لے اور وہ برابر وہاں گورنری کرتا رہے۔ اس نے اس غرض کے لئے ہر ممکن ذریعہ استعمال کیا۔ سن کیانگ میں اخباروں کا داخلہ اور بچوں کا اسکول جانا بند تھا۔ نہ صرف جدید تعلیمی ادارات کا کھولنا روک دیا گیا بلکہ پرانے مدرسے بھی بند کر دینے پڑے۔ چینی اسکول اور دینی مدارس دونوں کا ایک ہی حشر ہوا۔ ان کے دروازوں میں قفل پڑ گئے اور استاد اور طالب علم منتشر کر دئے گئے۔ حکومت نانکنگ ان باتوں سے ناواقف نہ تھی لیکن ادھر دو سال سے متواتر جاپان کے ساتھ جنگ میں مشغول ہونے کی وجہ سے اس کو ایک لمحے کی فرصت بھی نہ ملی کہ سن کیانگ کے امور انتظامی کی طرف متوجہ ہو۔ یہ صوبہ دوری کی وجہ سے بالکل چن شوزن کی نگرانی میں چھوڑ دیا گیا تھا جس نے مسلمانوں کے مفاد کو اس طرح پامال کیا۔

مسلمانوں کے دلوں میں نفرت اور بیزاری کی چنگاریاں پہلے سے موجود تھیں۔ ان کے مشتعل

ہونے کے لئے صرف ہوا کا انتظار تھا۔ قدرت نے اس کا سامان کر دیا۔ سلم وانگ کی جانشینی کے مسئلے نے سن کیانگ میں آگ لگا دی۔ چن شوزن کے ظلم سے مسلمانوں کا غصہ بھڑک اٹھا اور انھوں نے استبداد کے خرمن کو جلا کر خاک کر دیا۔

یہ ہے چینی ترکستان کی شورش کی حقیقت۔ آپ کو اختیار ہے اسے مسلمانوں کی بغاوت سمجھئے یا اسلامی ریاست کا پیش خیمہ۔ مگر میرے خیال میں ان دونوں باتوں کی کوئی بنیاد نہیں۔

ممالک اسلامی

ترکی | ترکی میں آج کل قدیم اور جدید کا جو تقابل نظر آتا ہے اس کی مثال مشکل سے کسی دوسرے ملک میں ملے گی۔ قسطنطنیہ میں ایک طرف تو فٹ بال کی میچیں ہوتی ہیں اور دوسری طرف اونٹوں کی وحشیانہ لڑائی۔ مصطفےٰ کمال پاشا جب ملک کا دورہ کرنے اس غرض سے نکلتے ہیں کہ نئے کارخانوں کا معائنہ کریں اور ان کی ترقی کی راہیں نکالیں تو راستے میں صدہا دیہاتی قدیم قبائلی ناچ دکھا کر ان کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو یوں للکارتے ہیں "بھائیو! آج نہیں ناچے تو پھر کب ناچو گے"۔ ایک طرف بروصہ، سمرنا اور قسطنطنیہ میں حسن کے مقابلے ہوتے ہیں تو دوسری طرف ابادین کی عورتیں چارشف اور پارچہ میں لپٹی نظر آتی ہیں۔

اس گنگا جمنی کیفیت کو دور کرنے اور تمام ملک کو ایک رنگ میں رنگنے کی غرض سے انگورہ کے ارباب حل وعقد نے ایک 'تمدنی لائحۂ عمل' تیار کیا ہے۔ اس لائحۂ عمل کے تین پہلو ہیں، سیاسی، فنی اور ورزشی۔ میدان سیاست میں صدر جمہوریہ کی رائے کے مطابق ترکی قوم کے دو دشمن ہیں، ایک مذہبی قدامت پرستی اور دوسری اشتراکیت۔ اس جہاد کے لئے ڈیڑھ ہزار ذہنی رضاکار تیار کئے جا رہے ہیں۔ فن تقریر میں مہارت حاصل کرنے کے بعد یہ لوگ ملک کے ہر حصے میں بھیجے جائیں گے کہ جہالت کے خلاف جنگ شروع کر دیں۔ ارباب فکر کا خیال ہے کہ اب مذہبیت کا زور ختم ہو رہا ہے۔ خانقاہوں اور دوسری مذہبی جماعتوں کی تنظیم باقی نہیں رہی ہے اور پیشوایان مذہب اور طریق عبادت پر حکومت کی خاص نظر ہے۔ بخلاف اس کے

اشتراکیت آہستہ آہستہ زور پکڑ رہی ہے اور اس کے خلاف پوری قوت سے جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔ چالیس اشتراکیوں پر خفیہ طور پر مقدمہ چلایا جا چکا ہے اور انھیں سخت سزائیں بھی مل چکی ہیں۔ ان میں بعض ترک عورتیں بھی شامل تھیں اگرچہ زیادہ تعداد بلغاری جلاوطنوں کی تھی۔

ترکی قوم کی توجہ مذہب سے جو کبھی ان کا واحد سرمایہ تھا اور سیاست سے جس پر کچھ دنوں سے زیادہ زور دیا جا رہا تھا ہٹا کر اب فنون لطیفہ کی طرف مبذول کرائی جا رہی ہے۔ ناطق فلموں کی پہلی کارگاہ قائم ہوگئی ہے۔ اس میں تفریحی فلموں کے علاوہ ایسی فلمیں بھی تیار کی جاتی ہیں جن کا موضوع ترکی کی جنگ آزادی، مصطفے کمال پاشا کی جرأت اور خدمات، کسانوں کا ایثار اور قربانی کا جذبہ وغیرہ ہوتے ہیں۔ یہ کارگاہ بہرصورت مکمل ہے اور اس میں ترکی لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد ملازم بھی ہے۔ ان طبعزاد فلموں کے علاوہ غیر ملکی ناطق فلموں کو ترکی کا جامہ بھی پہنایا جاتا ہے۔ فنون لطیفہ کا شوق پیدا کرنے کے لئے اناطولیہ میں ۴۳ مجلسیں قائم ہو چکی ہیں اور عنقریب ان کی تعداد ۵۰ ہونے والی ہے۔ ان مجلسوں کے ماتحت ناٹکوں کی ترویج بھی ہو رہی ہے۔ مشہور شعرا نے "قومی" ناٹک لکھے ہیں جو ان مجالس میں دکھائے جاتے ہیں۔

تیسری مدیعنی ورزش کی طرف حکومت ہی نہیں بلکہ میونسپلٹیاں بھی توجہ کر رہی ہیں۔ وزیر تعلیمات نے ایک اعلان شائع کیا ہے جس میں شکار اور ورزشی کھیلوں کا شوق دلایا گیا ہے اور ایک غیر ملکی ماہر خصوصی کے تقرر کا بھی وعدہ کیا گیا ہے۔ اس طرح ہر پہلو سے کوشش کی جا رہی ہے کہ ترکی قوم مغربی عادات و اطوار اختیار کرے، اس کی دنیاوی دلچسپیاں زیادہ اور وسیع تر ہو جائیں اور قدیم محدود زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔

... ...

ترکی زبان کی ترتیب اور ترقی کے لئے جو تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں ان کا ذکر کسی پچھلے پرچے میں آ چکا ہے۔ اسی سلسلے میں گذشتہ سال صدر جمہوریہ نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ نماز میں بھی قرآن کا ترکی ترجمہ رائج کیا جائے لیکن کوئی سرکاری حکم نہیں صادر ہوا تھا اور اسی وجہ سے کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ اب اس سال ۵ر فروری کو بروصہ کی جامع مسجد میں پہلی دفعہ ترکی زبان میں اذان دی گئی۔ بعض راسخ العقیدہ لوگوں کو یہ بات ناپسند ہوئی اور انھوں نے مؤذن پر حملہ کر دیا۔ چند سرکاری ملازموں

نے اسے بچانے کی کوشش کی تو لوگوں نے ان کی بھی خوب خبر لی۔ بالآخر پولیس نے اس ہنگامے کو فرو کیا اور ۶۰ آدمیوں کو جن میں ۳۰ علما تھے گرفتار کر لیا۔ ان ملزموں کے مقدمے کی سماعت غالباً ایک فوجی عدالت کرے گی۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ بھی قابل لحاظ ہے کہ ۱۹۳۱ء میں ۲۰ آدمیوں کو اس جرم میں پھانسی دی جا چکی ہے کہ انھوں نے ترکی ٹوپی کے امتناعی حکم کے خلاف علم بغاوت اٹھایا تھا۔ اس موقع پر مصطفےٰ کمال پاشا اور عصمت پاشا تحقیقات کے لیے خود بروصہ پہنچے۔ وہاں سے واپس آکر ۷ فروری کو صدر جمہوریہ نے یہ حکم صادر کیا کہ اس تاریخ سے استامبول کی مساجد میں قرآن کا صرف ترکی ترجمہ پڑھا جائے گا اور اصل قرآن کا پڑھنا ممنوع قرار پائے گا۔ خیال ہے کہ یہ حکم جلد ہی ملک کے دوسرے حصوں میں بھی نافذ ہوگا اور اس طرح ترکی سے عربی زبان کا آخری اثر بھی دور ہونے لگے گا۔

... ...

ترکی کی معاشی حالت آج کل دنیا کے بیشتر ممالک سے اچھی ہے۔ کچھ عرصے پہلے یہ خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ آمدنی کی کمی کی وجہ سے حکومت کو رفاہ عامہ کے بعض کام ملتوی کرنے پڑیں گے لیکن حکومت نے بجائے اس کے ایک عام اندرونی قرضے کے ذریعے ان کاموں کو جاری رکھا اور ہمت نہ ہاری۔ اس قرضے کا بیشتر حصہ ریلوں کی توسیع اور تانبے کی کانوں کے کھودنے میں صرف ہوگا۔ ان دونوں کاموں سے ترکی حکومت کو بہت نفع حاصل ہونے کی امید ہے۔ ترکی کی عام مرفہ الحالی کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جہاں ۱۹۲۵ء میں تمام بنکوں میں پچاس لاکھ ترکی پاؤنڈ جمع تھے وہاں اس سال کے شروع میں چار کروڑ پاؤنڈ موجود تھے۔ مالی حالت کے بہتر ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قدیم عثمانی قرضوں کی ادائیگی سے متعلق جو گفت و شنید ہو رہی تھی اس میں ترکی حکومت کو کامیابی ہوئی اور اب قرضے کی مقدار بہت کم ہو گئی ہے۔ اگرچہ معاہدوں کی تصدیق ابھی نہیں ہوئی ہے لیکن یہ طے ہو گیا ہے کہ قرضہ بجائے ۱۰ کروڑ ۵۰ لاکھ ترکی پاؤنڈ طلائی کے اب صرف اسی لاکھ پاؤنڈ قرار پائے گا اور ۱۵ لاکھ کی جو رقم سالانہ ادا کرنی پڑتی تھی اور جس میں ہر سال اضافہ ہوتا جاتا تھا اب بالمقطع ۲ لاکھ ۷۰ ہزار سالانہ رہ جائے گی۔ اس معاہدے کی وجہ سے معاشی ترقی کی راہ بالکل صاف ہو گئی اور اب کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔

ایران | عرصے کی کشمکش کے بعد حکومت ایران اور اینگلو پرشین آئل کمپنی کے درمیان بالآخر سمجھوتا ہو ہی گیا۔ آخر وقت میں جب بالکل نا امیدی ہو گئی تھی شاہ ایران نے خود اس معاملے میں مداخلت کی اور معاملے کو سلجھا دیا۔ اس معاہدے کی رو سے حکومت ایران کو فی ٹن چار شلنگ اور منافع کا ۲۰ فی صدی ملے گا۔ یہ رقم کسی صورت میں ۷½ لاکھ پاؤنڈ سالانہ سے کم نہ ہوگی۔ محاصل سے بالکل استثنا کے عوض کمپنی پہلے ۱۵ سال تک ۲½ لاکھ پاؤنڈ سالانہ اور دوسرے پندرہ سال تک ۳ لاکھ پاؤنڈ سالانہ ادا کرے گی۔ اس کے بعد کی ادائگی کے لئے پھر معاہدہ ہوگا۔ پچھلے مطالبوں کی بے باقی کے لئے کمپنی فوراً دس لاکھ پاؤنڈ ادا کرے گی۔ یہ معاہدہ ساٹھ سال تک کے لئے کیا گیا ہے اور پہلا معاہدہ جو ۱۹۶۱ء میں ختم ہوتا منسوخ ہو گیا۔ اس جدید معاہدے کی رو سے کمپنی کو چاہئے کہ ۱۹۳۸ء تک اس تمام علاقے میں سے جو اس وقت اس کے پاس ہے ایک لاکھ مربع میل کا علاقہ اپنے لئے منتخب کرے۔ اس کے بعد صرف اتنی ہی زمین سے اسے تیل نکالنے کی اجازت ہوگی۔

اس معاہدے کی وجہ سے امید ہے کہ ایرانی حکومت کی آمدنی میں کافی اضافہ ہوگا اور آئے دن کے جھگڑوں سے بھی نجات مل جائے گی۔

شذرات

قارئین جامعہ یہ خبر سن کر خوش ہوں گے کہ جامعہ ملیہ کے وفد نے جو صوبۂ متحدہ کے دورے کے لئے نکلا ہے اب تک اچھی خاصی کامیابی حاصل کی ہے۔ دیرہ دون، سہارنپور، بجنور کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں ضلعوں کے صدر مقامات میں اور بعض مضافات میں حلقۂ ہمدردان جامعہ قائم ہو گیا ہے اور مجموعی طور پر تقریباً ایک ہزار سالانہ چندے کے وعدے ہو گئے ہیں۔ اب وفد بریلی اور آس پاس کے اضلاع میں گیا ہوا ہے اور امید ہے کہ آخر جولائی تک اپنے پروگرام کے مطابق سارے صوبے کا دورہ ختم کرلے گا۔ جامعہ ملیہ کے سالانہ مصارف کے لئے جس رقم کی اپیل جناب شیخ الجامعہ نے کی ہے اس کا قریب قریب ایک ربع شہر دہلی اور قریب کے مقامات سے جمع ہونے لگا ہے اور اہل دہلی کی فیاضی اور علم دوستی سے قوی امید ہے کہ جو تھوڑی سی کمی اس میں ہے وہ بہت جلد پوری ہو جائے گی۔ ہمیں امید ہے ایک ربع صوبۂ متحدہ سے، ایک ربع پنجاب سے، اور اسی قدر بقیہ ہندوستان سے وصول ہونے لگے گا۔ معمولی مصارف کی طرف سے اطمینان ہوتے ہی عمارت کے لئے چندہ شروع کر دیا جائے گا اور اس کا بار اپنے غریب بھائیوں پر نہیں بلکہ صاحبان ثروت پر ڈالا جائے گا۔ جیسی توجہ ملت اسلامی نے اپنی اس تعلیم گاہ کی طرف گذشتہ سال سے شروع کی ہے اگر یہ قائم رہی تو کچھ عجب نہیں کہ اس سال اکتوبر سے تعمیر کی طیاری ہونے لگے اور ۳۴ء کے وسط سے تعمیر شروع ہو جائے۔ زندہ قوموں کی ایک علامت یہ سمجھی جاتی ہے کہ سختی کے زمانے میں وہ اپنے بچوں کی تعلیم سے غافل ہونے کے بجائے اس میں پہلے سے زیادہ اہتمام کرنے لگتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان اس قیامت کی کساد بازاری اور معاشی پستی کے دور میں جامعہ ملیہ کی مدد کے لئے جو کچھ کر رہے ہیں وہ اس بات کی علامت ہے کہ خدا کے فضل سے ہم میں ابھی تھوڑی بہت زندگی باقی ہے اور زمانہ موافق ہو تو ہم ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے پیچھے نہیں رہیں گے۔

... ...

جناب شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ابتدائے جون میں بھوپال ہوتے ہوئے حیدرآباد تشریف لے گئے تاکہ ان مقامات پر حلقۂ ہمدردان جامعہ کی توسیع اور استحکام کا انتظام فرمائیں۔ جامعہ کو ان دونوں ریاستوں سے جو مقررہ امداد ملتی ہے اس کے متعلق بھی بعض معاملات تصفیہ طلب ہیں۔ شیخ الجامعہ صاحب کی درخواست پر ہمارے قدیم سرپرست جناب خواجہ عبدالمجید صاحب جن کے ہاتھوں سے اس تعلیم گاہ کی بنیاد مضبوط ہوئی اور جنھوں نے ہر نازک موقع پر اس کی دستگیری کی ہے ان کے ہمراہ تشریف لے گئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ان کی توجہ سے جامعہ کے مقاصد میں خاطرخواہ کامیابی حاصل ہوگی۔

آج کل عالم اسلامی میں چینی ترکستان کی شورش یا انقلاب کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے اور تمام مسلمانوں کو اس سے بے حد دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ عام خیال یہی ہے کہ اس خطے کے مسلمانوں نے چین سے قطع تعلق کر کے اپنی علیحدہ ریاست قائم کر لی ہے۔ علامہ اقبال اسے اپنی پیش گوئی کا پورا ہونا سمجھتے ہیں جو انھوں نے برسوں پہلے کی تھی "از خاک سمرقندے ترسم کہ دگر خیزد + آشوب ہلاکوئے ہنگامہ چنگیزے"۔

ہم اس پرچے میں "دنیا کی رفتار" کے حصے میں بدرالدین چینی کا جو کئی سال جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اب لکھنؤ میں اسلامیات کی تکمیل کر رہے ہیں، ایک مضمون اس مسئلے کے متعلق شائع کر رہے ہیں۔ یہ چین کے رسالوں سے ماخوذ ہے اور اس میں بدرالدین صاحب کی ذاتی معلومات بھی شامل ہے۔ ظاہر ہے کہ جو واقعات اس میں بیان کئے گئے ہیں وہ ہر طرح سے قابل اعتبار ہیں۔ البتہ رائے کے اظہار میں ممکن ہے کہ لکھنے والے کے قوم پرستانہ نقطۂ نظر کا اثر پڑا ہو۔ بہرحال جو خبریں یورپ کے ذریعے سے آتی ہیں اور جو رائے ہم لوگ اس کی بنا پر قائم کرتے ہیں اس کا قابل وثوق ہونا اور بھی مشتبہ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ بدرالدین صاحب اس مسئلے کے متعلق مزید معلومات حاصل کر کے ایک اور مدلل مضمون لکھیں گے جس سے عالم اسلامی کے اس معرکۃ الآرا واقعے پر پوری روشنی پڑے۔
